

دائیں سے پہلی قطار : نشتر جعفری . محمد مثنیٰ . کلام حیدری . ادیب حسن ادیب . شاہد احمد شعیب (دوسری قطار) [illegible]
عبدالصمد . حبیب الرحمٰن . ظہیر صدیقی . احمد یوسف . (تیسری قطار) شجر کاروی . حق اعظمی . انجم فاطمی . بدنام نظر . خورشید [illegible]
حسین شاہد . م . ق . خان . حسین اعظم . نواب حسن نواب . عبدالمنان . ضمیر الدین . منصور عالم (چوتھی قطار) عبدالقادر [illegible]
جاوید حیات . رحمٰن حمیدی . نثار احمد صدیقی . ڈاکٹر محمد حنیف

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس ججیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک شمارہ ——— تین روپے

سالانہ ——— چھتیس ۳۶ روپے

فون نمبر - 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبدالصمد

محتویات

اردو کو خصوصاً اور ہندوستان کو عموماً صرف ایک ماہ کے
عرصے میں دو بڑے صدمات اٹھانے پڑے ہیں۔

دسمبر میں جناب کلیم الدین احمد انتقال فرما کر تنقید کی دنیا
میں خلاء پیدا کر کے چلے گئے۔

اور اب ——!

۲۵ جنوری ۸۴ء کو مستند اور مثالی محقق جناب قاضی
عبدالودود صاحب بھی راہیٔ ملک عدم ہو گئے ——!

خدا پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

اور اردو کے لئے کام کرنے والوں کو حوصلہ دے کہ
وہ ان بڑی شخصیتوں کے صحیح وارث بن سکیں ——!

بارہ رنگوں والا کمرہ کے بعد

عبدالصمد

کا

دوسرا کہانیوں کا مجموعہ

پس دیوار

شائع ہو کر بازار میں آگیا ہے ـــ قیمت بیس۲۰ روپے

ہم سے طلب کریں :- دی کلچرل اکیڈمی جگجیون روڈ، گیا

-:۰:-

گولڈن جبلی

کلام حیدری

کی کہانیوں کا نیا مجموعہ

قیمت ـــ بیس۲۰ روپے

دی کلچرل اکیڈمی جگجیون روڈ گیا

باخبر

آس پاس

پرانی غلطی

جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ہندستان کی سیاسی افق پر ایک نو وارد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا قومی مزاج کچھ ایسا ہے کہ وہ صرف انھیں افراد کو سیاست میں صدق دلی سے قبول کرتا ہے جو اس کوچے کی خاک خوب چھان چکے ہوں۔ قومی تحریک ہمارا بڑا سرمایہ ہے۔ اور آزادی کے بیس پچیس برسوں بعد تک جو لیڈر ہمارے سامنے آئے وہ کسی نہ کسی طور پر اس تحریک سے منسلک رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو قومی تحریک کے دوران پیدا ہی نہیں ہوئے تھے یا طفل مکتب تھے۔ ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ لیڈر ہونے کے لئے پہلے جنگ آزادی کے ہیرو ہونے کی شرط پوری کریں۔ اتنے برسوں کے بعد اب یہ بات ممکن بھی نہیں ہے۔ لیکن قومی تحریک کے ذریعہ حاصل شدہ روایات مثلاً فرقہ وارانہ یکجہتی، ایثار، قربانی اور خلوص سے ہی اگر کوئی لیڈر روا قف رہے۔ تو یہی بہت غنیمت ہے۔

فاروق عبداللہ ان معنوں میں نو وارد کہے جاسکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے قابل فخر والد شیخ محمد عبداللہ کی طرح ہندستان کی قومی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ انہوں نے کشمیر کے عوام کو کس مپرسی کے عالم سے نکال کر وقار کی زندگی بسر کرنے کی جدوجہد میں براہ راست کوئی دخل نہیں دیا۔ پھر بھی فاروق عبداللہ کوئی ایسے بچے بھی نہیں۔ وہ ان تحریکوں کے دوران طالب علم تھے۔ اور ان سب کے نتیجے میں ان کے والد پر جو سختیاں اور ستم ہوئے وہ سب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس لئے بلا خوف وخطر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ قومی تحریک کی بیش بہا روایت سے بخوبی واقف ہیں۔ شیخ عبداللہ ایک بہت ہی دوررس اور معاملہ فہم آدمی تھے۔ فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین بناتے ہوئے ان کے سامنے بہت سی مصلحتیں رہی ہوں گی۔ ان کے داماد اور برسوں کے رفیق گل شاہ، بدعنوانی اور اقتدار کے ناجائز استعمال کے معاملے میں خاصے بدنام ہیں۔ اور وادی کے لوگ انہیں شیخ عبداللہ کے جانشین کی حیثیت سے قبول نہیں کرسکتے تھے۔ فاروق عبداللہ کا وزیر اعلیٰ ہونا اور پھر ہندوستان کی قومی سیاست میں ان کا داخل ہونا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ شیخ عبداللہ پنڈت جواہر لال نہرو کے عزیز دوست تھے۔ برسوں ہندوستان جیل میں گزارنے کے بعد بھی ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور رہا ہو کر جب شیخ صاحب دہلی آئے تو پنڈت جی اور ان کی صاحبزادی اندرا گاندھی نے خاندان کے ایک فرد کی طرح ان کا استقبال کیا۔ پنڈت نہرو کی ہی صاحبزادی اندرا گاندھی نے سابقہ حکومت کی غلطیوں کو محسوس کیا۔ اور شیخ عبداللہ کے

کاندھوں پہ وادیٔ کشمیر کے عوام کی حالت سدھارنے کی عظیم ذمہ داری ڈال دی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ بعد میں شیخ عبداللہ سے ان کے سیاسی تعلقات اچھے نہیں رہے پھر بھی ذاتی تعلقات میں دونوں نے رواداری کو راہ دی۔ شیخ صاحب کی وفات کے بعد جب ان کی جانشینی کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ اندرا گاندھی ہی تھیں جنھوں نے فاروق عبداللہ کو وزیر اعلیٰ بننے میں پوری مدد کی۔ اس کے بعد فاروق عبداللہ نے کئی بار ان سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا۔ انھیں اپنی بڑی بہن بتایا۔ اور انھیں اپنا رہنما تسلیم کیا جون ۱۹۸۳ء میں جب الیکشن ہونے والے تھے اس وقت کانگریس پارٹی اور نیشنل کانفرنس میں سیٹوں کے بٹوارے کے سلسلے میں اختلافات رونما ہوئے۔ اس سلسلے میں دونوں فریقین مختلف باتیں کہتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے اس کی خبر کسی کو نہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی سے فاروق عبداللہ اور اندرا گاندھی کے تعلقات بگڑ گئے۔ اندرا گاندھی نے اپنی پارٹی کی صدر اور رہنما ہونے کی حیثیت سے وادی میں انتخابات کے سلسلے میں خوب تقاریر کیں۔ اور ہر اس حربے سے کام لیا جو آج کی ہندستانی سیاست میں الیکشن جیتنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اتنے دنوں میں فاروق عبداللہ بھی ان حربوں سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ الیکشن جیتنے کی کوششوں میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وادی میں نیشنل کانفرنس کو غیر معمولی کامیابی ملی۔ جو فاروق عبداللہ کی ذاتی کامیابی سمجھی گئی۔ در اصل یہ سب کچھ شیخ عبداللہ کی شخصیت کا کرشمہ تھا۔ اور وادی کے لوگوں نے شیخ صاحب کے بیٹے کو ووٹ دیا تھا۔ اندرا گاندھی کی مخالف پارٹیوں نے فاروق عبداللہ کی فتح کو خوش آمدید کہا۔ انھیں اندرا کے خلاف محاذ بنانے میں بھی فاروق عبداللہ کی وجہ کر آسانیاں ہوئیں۔ انھیں مفت کا ایک مسلمان لیڈر بھی ہاتھ آیا۔ فاروق عبداللہ نے

کچھ تو جوانی کے جوش میں اور کچھ اقتدار کے نشے میں کچھ غیر ذمہ دارانہ بیانات بھی دیئے۔ ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ وادی میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے درمیان صف آرائی کی ایک صورت حال پیدا ہو گئی۔ کانگریس اس کوشش میں لگ گئی کہ کسی طریقے سے فاروق عبداللہ کو اکھاڑ پھینکیں۔ ان کے بہنوئی گل شاہ کو بھی ملا یا گیا۔ روز ہنگامے، لاٹھی چارج اور گولیاں چلنے لگیں۔ یہ تاثر پیدا کیا جانے لگا کہ فاروق انتظامیہ ناکارہ ہے۔ اس لئے اسے ختم کر دینا چاہئے۔ کلکتہ کے کانگریس اجلاس میں فاروق عبداللہ کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ اتنی دیر میں فاروق عبداللہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ وزیر اعظم اندرا گاندھی سے بہت مشکلوں کے بعد ملنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی والدہ محترمہ بیگم عبداللہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ پچاس منٹ کی گفتگو کے دوران انھوں نے اندرا گاندھی کے سامنے کیا کیا صفائیاں دیں۔ یہ تو ہم نہیں جانتے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس گفتگو کے بعد ان کے لہجے میں نرمی آئی ہے۔ کلکتہ کے اپوزیشن اجتماع میں انھوں نے صاف طور پر کہا کہ ان اجتماعات کا مقصد اندرا گاندھی پر ذاتی حملہ نہیں ہے بلکہ اپوزیشن کا اتحاد ہے۔ بہرکیف! یہ تو آگے معلوم ہوگا۔ کہ اس سلسلے میں کون کتنا مخلص ہے۔ اتنی بات صاف نظر آتی ہے کہ اندرا گاندھی کو اپنے کشمیری کانگریسیوں پر بے حد بھروسہ ہے۔ جن کا وہاں کے عوام پر رتی برابر بھی اثر نہیں۔ اس کا ثبوت الیکشن میں مل چکا ہے۔ یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کی حمایت سے نہیں، محض اندرا گاندھی کی حمایت سے وہ کشمیر کے اقتدار پر قابض ہو سکتے ہیں۔ اس لئے وہ ہر اوچھے ہتھیار کو استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح انھیں عوام کی حمایت ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی۔ کانگریس یہ طریقے بنگال میں اپنا کر ناکام ہو چکی ہے۔ کشمیر میں اگر یہ غلطیاں دہرائی جاتی رہیں تو کانگریس کو بہت ہی خراب حالات کا سامنا کرنا

پڑے گا۔ اندرا گاندھی کو چاہئے کہ فاروق عبداللہ کو ملا کر کشمیر میں ایک ایسی پالیسی طے کریں جو وہاں کے عوام کو بھی منظور ہو۔ اور مرکز، ریاست تعلقات بھی بہتر ہو سکیں۔

سیاسی نقشہ

ابھی یوپی، بہار، ہریانہ اور بنگال میں پارلیامنٹ اور اسمبلی کی کچھ نشستوں کے لئے ضمنی انتخابات ہوئے۔ جو کانگریس اور اپوزیشن دونوں کے لئے وقار کا سوال بنے ہوئے تھے۔ اپوزیشن کے دو بلاک ابھر کر سامنے آئے تھے۔ کانگریس کا دونوں سے مقابلہ تھا سیاسی پنڈتوں کا یہ خیال تھا کہ ان ضمنی انتخابات کے نتیجے پر الیکشن کا نقشہ مرتب کیا جائے گا لیکن ان انتخابات کے حیرت انگیز نتیجے سامنے آئے۔ پارلیامنٹ کی تین نشستوں میں سے دو پر کانگریس ہار گئی۔ اور یہ دونوں ہار بارہ ہزار اور چودہ ہزار ووٹوں پر ہوئی جو پارلیامانی انتخابات کے لئے بہت ہی کم ہیں۔ سونی پت کی نشست کانگریس نے جیت لی۔ اور اپوزیشن کی ایک اہم شخصیت دیوی لال کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسمبلی نشستوں پر آٹھ میں سے سات پر کانگریس کی جیت ہوئی۔ بہار کے وزیر اعلیٰ چندر شیکھر سنگھ تو بیالیس ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ اور ان کے سبھی مخالفین کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ عمومی طور پر میدان کانگریس کے ہاتھوں میں تھا اپوزیشن نے اتحاد اور بہتر حکومت کے سلسلے میں عوام کے ساتھ جو مذاق کیا اس کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑا۔ ووٹروں کے مزاج سے اس بات کا پتہ چلا کہ چندر شیکھر کی قیادت والے جنتا محاذ عوام کے لئے کسی حد تک قابل قبول ہے لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی اور لوک دل پر مشتمل جمہوری محاذ ہرگز نہیں۔ چرن سنگھ کو ہریانہ، یوپی اور بہار میں جو ہزیمت اٹھانی پڑی اس کی پیش گوئی ان صفحات میں کی جا چکی تھی۔ اس لئے ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ البتہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے لئے یہ سوچ و فکر کا لمحہ ضرور ہے۔ اب تاویل یہ دی جا رہی ہے کہ آر ایس ایس کے لیڈر نے کانگریس امیدواروں کی حمایت کی۔ اس تاویل کو کسی قیمت پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کانگریس نے امیدواروں کے چناؤ میں اپنا جو معیار بنایا ہے وہ آر ایس ایس کی فلاسفی سے ہرگز میل نہیں کھاتا۔ اور پھر آر ایس ایس کو کانگریس کی حمایت سے فائدہ بھی کیا پہنچ سکتا ہے۔ یہ بات بہت ہی خوش آئند ہے کہ کلکتہ اجلاس میں کانگریس نے سیکولرزم کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ اس طرح کانگریس کے ایک سیکولر جماعت ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

بلاشبہ یہ ضمنی انتخابات بہت اہم تھے۔ اور ان کے نتائج کی روشنی میں حکمران اور اپوزیشن جماعتوں کو ٹھنڈے دل سے اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ملے گا۔ الیکشن کی بات تو فی الحال ٹل گئی ہے۔ وزیر اعظم نے سنہ ۱۹۸۴ء میں اسے بعید از قیاس قرار دیا ہے اخباروں میں یہ بات آ رہی ہے کہ جنتا پارٹی چرن سنگھ کو ملانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور چرن سنگھ اینٹھ رہے ہیں۔ اگر جنتا نے اپنے محاذ میں چرن سنگھ کو شامل کر لیا تو یہ ایک بھیانک غلطی ہوگی جس کا خمیازہ جنتا پارٹی ایک بار بھگت چکی ہے۔ دوسری بار بھگتنے کے لئے تیار رہے۔

خود اعتمادی کی کمی

مشرق وسطی کے محاذ سے ایک دلچسپ خبر آئی ہے کہ فلسطینی رہنما یاسر عرفات نے حالیہ اندرونی جھگڑوں کے لئے روس کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ خاص طور پر یہ کہ فلسطینی محاذ میں ان کے مخالف گروہ کو روس کی حمایت حاصل ہے۔ اور روس ان کی جڑیں کھودنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اگرچہ یہ ایک سنسنی خیز واقعہ ہے لیکن اس پر زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ جب سے اسرائیل کا قضیہ شروع ہوا ہے۔ تب سے عرب ممالک دو واضح بلاکوں میں منقسم ہیں۔ ایک بلاک کی لیڈری امریکہ کے ہاتھوں میں ہے دوسرے کی روس کے ہاتھوں میں۔ یہ بلاک (بعض عرب ممالک کی حد تک) آپس میں لڑتے بھی رہے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان بلاکوں کے ممبروں میں آپسی تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ یعنی ایک بلاک کا ممبر دوسرے میں چلا گیا۔ اور پہلے کو مغلظات سنانے لگا۔ مصر کبھی روس کے حاشیہ برداروں میں تھا۔ اب امریکہ کا بہت بڑا حمایتی ہے۔ حافظ الاسد روس کے دوست تھے۔ اب امریکہ کے دوست ہوا کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں یاسر عرفات کا جو روس کے بہت بڑے حمایتی تھے روس ہی پر الزام تراشی کوئی بہت ہی تعجب کی بات نہیں۔

عرب ممالک کے پاس وسائل کی کمی نہیں۔ بلکہ خدا نے ان کو کچھ زیادہ ہی عطا فرمایا ہے لیکن وہ ان وسائل کا مصرف لینے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ یہ صلاحیت خداداد نہیں ہوتی بلکہ اپنے بازوؤں کے بل پر پیدا کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ امریکہ اور روس ان کے وسائل کو استعمال کرتے ہیں۔ اور انہیں عیش وعشرت کی بھول بھلیوں میں الجھا رکھا ہے۔ ان کا معاملہ ٹھیک وہی ہے کہ دو کووں کو کہیں سے پنیر کا ایک ٹکڑا ہاتھ لگ گیا۔ اور وہ لومڑی کے پاس تقسیم کے لئے گئے۔ لومڑی نے تقسیم کے بہانے پنیر چٹ کر لیا۔ اور دونوں فریق منہ دیکھتے رہ گئے یہاں لومڑی ایک نہیں دو ہے۔ فریقین بھی کئی ہیں۔ پنیر بھی اتنی زیادہ ہے کہ ایک بار چٹ نہیں ہو سکتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فریقین دم سادھے چپ چاپ لومڑیوں کو پنیر کھاتے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن کچھ بول نہیں سکتے۔

عربوں نے اللہ پر بھروسہ کرنے کا ہمیشہ زبان سے دعویٰ کیا۔ لیکن عمل میں وہ ہمیشہ امریکہ اور روس پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔ اپنے آپ پر انہیں کبھی بھروسہ نہیں رہا۔ وہ اجتماعی عدم خود اعتمادی کے بری طرح شکار ہیں۔ وہ اپنے اعتماد کی بحالی کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ اگرچہ ان کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جب امریکہ انہیں دھوکا دیتا ہے تو روس کو گالی دیتے ہیں۔ اور روس دھوکہ دیتا ہے تو امریکہ کو کوستے ہیں۔ یہ سب وہ اس وقت تک کرتے رہیں گے۔ جب تک وہ اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنا نہیں سیکھ جائیں گے اور اللہ کی مدد کے طالب نہیں ہوں گے۔ آج عربوں کی جو حالت ہے وہ ہر اس قوم کی ہو سکتی ہے جو اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کرتی۔

ڈکٹیٹرشپ

ایک صاحب ہیں خیر سے سرکار کے بڑے افسر رہ چکے ہیں۔ دلی میں نچلے درجے کے سرکاری نوکروں کی بحالی والے کمیشن کے چیرمین تھے۔ تو دلی کی ادبی اور ثقافتی انجمنوں کے روح رواں تھے۔ اور بے حد سوشل۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے سرکار کو ایک مناسب وائس چانسلر کی تلاش ہوئی تو نگاہ انہیں حضرت پر پڑی۔ اور اس طرح ان کے نام نامی اسم گرامی سے دنیا واقف ہوئی ـــــ سید حامد آئی، اے ایس، ان کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ ہوگئیں۔ کہ شاید اب اس بے آسرا اور بے سہارا دارالعلوم کے دن پھر جائیں۔ عرصہ کی محنت اور قربانیوں کے بعد اس کا اقلیتی کردار بحال ہوا تھا۔ لیکن کوئی واضح نقشہ سامنے نہیں آیا تھا۔ سید حامد چونکہ اس دارالعلوم کے پروردہ تھے کی ذات سے یہ امید بھی بندھی کہ وہ یونیورسٹی کے روپ کو نکھار دیں گے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اور یونیورسٹی میں امن و امان کی جو ایک فضا قائم تھی۔ وہ بھی وائس چانسلر صاحب کے آجانے سے ضائع ہو گئی۔

سید حامد صاحب نے یونیورسٹی کے تعلیمی اور انتظامی معیار کو بلند کرنے کے لئے کیا کاروائیاں کیں۔ ہم فی الحال اس پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں تو اس

بات پر دکھ ہے۔ کہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی جیسے باوقار ادارے کو ایک ایسا ضلع سمجھ لیا ہے جس کے وہ کلکٹر ہیں۔ اور اس اعتبار سے یونیورسٹی کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ جس دن سے حامد صاحب وہاں تشریف لے گئے ہیں۔ اسی دن سے طلبا کے ساتھ ان کی ٹھنی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جمہوریت کے نام لیوا اس دیش کے ٹھیکہ داروں کو ٹھیک داروں کو کیا ہو گیا ہے آخر بات کیا ہے کہ جمہوری طریقوں کو چھوڑ کر آمرانہ طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ حامد صاحب نے تعلیمی سال کو راستہ پر لایا، بہت اچھا کیا۔ انہوں نے ہوسٹلوں کو غلط عناصر سے پاک کیا بہت اچھا کیا۔ انہوں نے داخلے کے سلسلے میں معیاری اصول اپنائے، بہت اچھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان اچھے کاموں میں طلبا کی حمایت حاصل کرنے میں انہیں کیا قباحت تھی۔ مسلم یونیورسٹی کے طلبا مہذب طلبا ہیں۔ ان سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ بے جا ضد میں آکر کوئی ایسا کام کر بیٹھیں گے۔ جس سے یونیورسٹی کے وقار کو دھکا لگے۔ ہمارا مزاج جمہوری ہے۔ ہم کسی ایسے کام کو کبھی پسند نہیں کر سکتے جو غیر جمہوری طریقے سے کیا گیا ہو۔ چاہے وہ اپنے مفاد ہی کا کیوں نہ ہو۔ ضیاء الحق نے پاکستان کے حق میں کچھ ایسے کام ضرور کئے ہیں۔ جنہیں بلاشبہ اچھا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم اور خود پاکستانی عوام ضیاء الحق کو کبھی پسند نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ عوام کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کسی یونیورسٹی کی وائس چانسلر کی حیثیت ٹھیک وہی ہوتی ہے۔ جو کسی ملک میں وزیر اعظم کی ہوتی ہے۔ اور وزیر اعظم ڈنڈے سے حکومت نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کے ہاتھوں میں ڈنڈا ہوتا ضرور ہے۔ حامد صاحب تو زندگی بھر جمہوری ہندوستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کیا ہر جگہ انہیں ڈنڈے سے ہی کام لینا پڑا ہے۔؟ ●

بقیہ : تہذیب

بادیہ پیمائی ہی کرتا رہ گیا۔ اور فرہاد تہذیب کی حفاظت کرتے کرتے خود کشی کرنے پر مجبور ہو گیا

قصہ مختصر یہ کہ تہذیب قدم قدم پر ہماری کامیابی میں روڑے اٹکاتی ہے۔ یہ پُراسرار دوشیزہ ہے جو نہ معلوم کتنے بھولے بھالے معصوم لوگوں کو اپنے دام میں لاکر تباہ کر چکی ہے اور قیامت تک بھولے بھالے لوگوں کو زندہ درگور کرنے کا اس کا وحشیانہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ●

بقیہ ، وقت کے احاطے میں

کے ساتھ اور پھر تاریخیں سرعت کے ساتھ بدلنے لگتی ہیں فنکار کا قلم چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ وہ کیا پیش کرے، ماضی یا حال؟ حال اپنی زبان سے سچ کہہ رہا ہوتا ہے۔ ماضی تو افسانہ بن چکا ہوتا ہے۔ سچ کہے یا افسانہ پیش کرے۔ اسی کشمکش میں فنکار کا قلم اس کے ہاتھوں سے گر جاتا ہے۔ اور جب صبح ہوتی ہے تو نئے سال کا کلنڈر اسے نئی تاریخوں کے ساتھ جگا دیتا ہے اس وقت فن کار کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فن کتنا جھوٹا ہے۔ تاریخیں کتنی سچی ہیں۔ ان کے عدم میں بھی ان کا وجود ہے اور فن کار کا وجود بھی اس کے عدم کی نشاندہی کرتا ہے۔

کمرے کی روشنی تیز ہوتی ہے۔ باہر سے آواز آتی ہے

نیا سال مبارک ہو! ●

ڈاکٹر حسن آرزو

زاہدہ حنا

ستارۂ عطارد و برج میزان کی ادیبہ

یا صاحب العصر والزماں الاماں الاماں! جب زرد ہواؤں کی زرد آوازیں جب زاہدہ حنا کے افکار سے پھوٹتی نظر آئیں تو لوگ چونک گئے۔ سہم گئے اور تب خود پریشان ہوئے ——

قرۃ العین حیدر کے برعکس جن کا بھاری بھرکم نام [illegible] اور صنفِ لطیف کی ادبی الاعلیٰ نزاکتوں اور جو بن جانے والی کیفیتوں کے اوپر گذرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور ان کے عالمِ افسوں و افسانہ میں بہتے ہوئے چار پاک دریاؤں کی شناوری کرنے اور قابلیت کے پانچ پہاڑوں پر چڑھنے کے لئے قاری قبل ہی سے تیار رہتا ہے۔ حنا جیسا تخلص رکھنے والی لڑکی کے افسانوں کو کچھ لوگ پڑھنے سے اس لئے کتراتے کہ حنا وغیرہ کی رعایت سے لوگ اسے کوئی انتہائی رومانٹک قسم کی ادیبہ سمجھتے۔ جو ڈاکٹر گار کے کھنڈرات کی سیر کر کے واپس آئے گی۔ اور اس کے ہاتھ میں سانپ کی شکل جیسا شمع دان ہوگا۔ یا وادی قاف کی گہری نیلی جھیل میں سرخاب اور آبی جانوروں کا شکار کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگی۔ یا چنار کے درختوں کے سایہ میں بیٹھی ہوئی اختر شیرانی کی سلمیٰ بنی اپنے چچیرے اور ممیرے بھائیوں کے لئے اپنی حنائی انگلیوں سے سوئٹر، مفلر اور موزے بن بن کر انہیں بدحواس کرنے کے لئے اپنا وقت برباد کرتی نظر آئے گی۔

—— وقت نے جن کی آنکھوں کے سامنے ان صفحات کو کیسا الٹ کر رکھ دیا ہے جو وہ ان صفحات کو پلٹ کر اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتے۔ چناں چہ انہیں میں میرے ایک بزرگ دوست اور حنا کے عزیز بھی تھے۔ میں ہر چند انہیں سمجھاتا کہ بات ایسی نہیں آپ حنا کو پڑھ کر تو دیکھیں! لیکن وہ ٹال جاتے کبھی مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ اور کبھی حنا کے والد کا ذکر چھیڑ دیتے جب گھر میں حنا کی پیدائش ہوئی تھی اس راستہ سے وہ [illegible] ساتھ سفر کرتے تھے لیکن اب ہم نے ان سے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا —— بہر حال! آخر ہوا یہ کہ وقت انتظار بہت تھا ۱۹۸۳ء میں زاہدہ حنا کے افسانوں کا پہلا مجموعہ چھپ کر جب ہندوستان آیا تو میں نے اسے اپنے بزرگ دوست کے یہاں بھجوا دیا۔ میں کیوں ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن بات کچھ ایسی ہی تھی ——

کن لمحوں میں انھوں نے کتاب کھولی کہ وہ دفعتاً چونک پڑے۔ پھر وہ ملے جب حُبّ عشق، وصل، اور ہجر کی ڈھلانوں سے تیزی سے سرکتے ہوئے ان سے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کی بات کرنے لگے تو وہ سہم گئے۔ انھوں نے ان لمحات کو غور سے دیکھا جواب کچھ اور نئے ملے نہ تھے اور پھر —— جب ان زرد زرد آوازوں میں انہیں اپنی ہی آوازیں سنائی دینے لگیں تو الاماں الاماں کہتے ہوئے وہ خود پر شرمسار ہو رہے

تھے کہ حنا محض پر ؤ محمل ثابت ہوئی تھی ۔

بہرحال یہ کسی نقاد کا فیصلہ یا تنقیدی عمل نہ تھا۔ ایسا تخلیقی عمل جس نے تخلیق کا روپ دھار لیا ہو بلکہ یہ محض میرے بزرگ دوست کا ایک خیال تھا جسے وقت نے تہس نہس کر دیا تھا۔

وہ یہ بھول جاتے تھے کہ حنا محض برگ سبز نہیں استوار ہے سرخ گلاب کا، دوڑتے ہوئے خون کا، لپٹنا اور لپٹے رہنا اس کا مقسوم ہے اپنی اصلیت اور ماہیت میں یہ صرف "زاہدہ" ہے کبھی لباس سبز میں، کبھی لباس زرد میں۔ اس کے افسانے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ اس نے محض خون دل میں اپنی انگلیوں کو نہیں ڈبو دیا ہے کہ ——
میرے خیال میں یہ توعین راحت وصل کی منزل ہے بلکہ ہمہ دم اس کی انگشت تہا دست غزال کی آگ میں موم بتی کی طرح جلتی رہتی ہے کہ اس نے "اوکار کے علم پر ابھرتے ہوئے نقطہ" کو چھونے کی ناکام کوشش کی تھی۔ زاہدہ حنا محض داستان طراز نہیں محض افسانہ نگار نہیں۔ وہ انکاری ہے شدید انکاری
—— ؟

مبارک ہے سرزمین سندھ۔ مرام جس نے زاہدہ حنا کو جنم دیا۔ زاہدہ حنا ہجرت کے کرب سے آشنا ہوئی۔ تو اسے چیزوں کی اصل جاننے کی لپک پیدا ہوئی۔ اس لپک نے اسے مدینۃ العلوم کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے معجز شہر سے کٹ کر تیز تیز قدموں سے چل کر ساتوں راتیں بھی گذار دیں۔ جن کے بارے میں آسانی سے گمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور ساتویں رات میں اسے علم ہوا کہ وہ عشق کی منزل میں ٹھہری، درویشوں کے حلقہ میں شامل ہوئی پھر چرخ کی راہ اختیار کی اور اب وہ کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں ہے ان منزلوں کا شعور حاصل کرنے کے بعد اس نے جو افسانے لکھے ہیں۔ وہ "قیدی سانس لیتا ہے" میں مقید کر دیئے گئے ہیں —— حنا کا افسانہ "جل ہے سارا جال" کی تخلیق اردو افسانوں میں ایک نیک شگون کا باعث بنتی ہے۔ ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اردو ادب میں علم النجوم پر اس قدر کامیاب اور خوب صورت کہانی میں نے سب سے پہلی بار پڑھی۔ اور پھر پڑھی) اور یہ سوچتا رہا کہ مخفی علوم کو بنیاد بنا کر اس قدر بھرپور ترقی پسند کہانی بھی لکھی جا سکتی ہے ——
حنا نے یہ ثابت کر دکھایا کہ CLASSLESS سماج کی شدید خواہش اگر جدید اقتصادیات کے روشن صفحات کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہو سکتی ہے تو دوسری طرف یہ مخفیات علم النجوم جبنیات اور جبر کے آتش فشاں سینوں سے بھی لاوا کی شکل میں ابلتی ہوئی موجود ملتی ہے —— اصل یہ ہے کہ موضوعات ترقی پسند اور جدید اور رجعت پسند نہیں ہوتے فنکاروں سے تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ تحریکوں سے ہی فنکاری جنم نہیں لیتی۔ دیدہ بینا کے لئے "جل ہے سارا جال" محض علم النجوم کے موضوع اور تناظر میں لکھا ہوا ایک سپاٹ افسانہ نہیں بلکہ ایک طبقاتی کشمکش اور اس سے نجات حاصل کرنے کی شدید خواہش کا ایک واضح اور دلنشیں شعور بن کر سامنے آتا ہے ——
"اس کی گفتگو سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ سمندروں اور دریاؤں' اکویریم' کیسے بنائے جائیں۔ چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیوں سے الگ کیسے رکھا جائے" —— پھر یہ اندیشہ کسی ایک فرد کا نہیں، بلکہ ایک اجتماعی بیداری بن کر پگھلے ہوئے الفاظ میں افسانے کا آخری جملہ بن جاتا ہے

"میں دہل کر اپنی بیٹی کو دیکھتی ہوں اور ایک
ایسے اکیوریم کی خواہش کرتی ہوں جہاں وہ
نہ چھوٹی مچھلی کو نگل سکے اور نہ بڑی مچھلیوں
کا لقمہ بن سکے"

یہ افسانہ کہانی کار کو اس لئے بھی عزیز ہوگا کہ اس کے پہلے افسانوی مجموعہ کا نام "قیدی سانس لیتا ہے" اسی افسانے کے ایک فقرہ سے مستعار ہے اور یہ کہ اکیوریم میں بند ایک تنہا مچھلی ACHILLES TANG کی داستان سفر مکمل

انسانی تہذیب کا تیرتا ہوا سفر بن جاتی ہے جب وہ مچھلی کی چھو سے نگاہ ہٹا کر اس کا ڈومیسائل سرٹیفکٹ پڑھنے لگتی ہے جو ایکویریم کے سربراہ کی طرف سے جاری ہوا تھا جس میں مچھلیوں کے نام ہیں، عمریں ہیں، حسب نسب ہے، قومیں ہیں، گھر ہیں سمندر سے بند پانیوں تک ان کی ہجرتیں ہیں اور ہجرتوں کے بعد کے ADJUSTMENT ہیں۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے متوازی میں کہانی لکھنے والی کے وجود سے بھی بلبلے اٹھتے ہیں۔ اور بند پانی کی سطح پر آکر دم توڑ دیتے ہیں ——

وقت کے سمندر میں میزان کے پہلوؤں پر تیرتے ہوئے عطارد کی طرح ۵ اکتوبر کی پیدا حنا اپنے وسیع مطالعے اور مشاہدے کی خلیج میں سرکتی پھسلتی اس خوب صورتی سے علم النجوم کے گہرے سبز سبز پانی میں رساں رساں تیرنے لگتی ہے کہ قاری کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کس جزیرے بارے کس دریا میں پہونچا دیا گیا اور اب کون کون سے معاون دریاؤں کی تری بینی میں سرسرک رہا ہے —— ؟ یہ سحر کیا ہے ؟ اور سفینہ کہاں ہے ؟

فن کاری اور ایسی فن کاری بھلا اس کی تشریح تحلیل اور تعبیر کیا ہو سکتی ہے ؟ —— یہ حقیقت بتاتی ہے کہ افسانہ کے بھرپور فنی لوازمات کو برتنے کے باوجود اسے ایسی شفاف اور سبک شیشہ گری کی تکنیک سے گزارا گیا ہے کہ کہنا پڑتا ہے جیسے سارا اجمال کی فنکاری خود دوست سے سوا نازک دکھائی دیتی ہے۔

حنا اپنی پیدائش کے عدد کے اعتبار سے ستارہ عطارد کی زائیدہ ہے جو متعلق راس کا مالک ہے اور ماہ پیدائش کے لحاظ سے تلا واسی کے زیر حکم آتی ہے۔ عطارد والے ہر فن میں طاق ہر چمکتی چیز سے انہیں پیار، مخفی علوم سے خاص شغف رکھنے والے سیمابی کیفیت والے، پھدکنا، پھسلنا اور اختلافات کرنا ان کی فطرت بڑے پاکیزہ اور لطیف ذوق کے مالک اس لحاظ سے قدرت کی CALLYGRABHY کا لطیف

انہیں خط نستعلیق جیسے مدینۃ العلوم کا ہر تمام شاہراہوں —— گلیوں اور کوچوں کی خاک چھاننے میں انھیں لطف خاص ملتا ہے زحل والوں کی طرح مورخ، محقق اور دانشور ہوتے ہیں۔ مطالعہ مطالعہ اور مطالعہ —— کچھ کتابیں قرینے سے رکھی ہیں۔ کچھ پھیلی ہیں۔ سامنے بیاض کھلی ہے۔ داہنی جانب قلمدان رکھا ہے۔ سر پر علم کی دستار فضیلت، رنگ گندمی، چھریرا بدن، دو زانو قالین پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے ہیں۔ جیسے مغلیہ دبستان مصوری میں بیدل عظیم آبادی یا کوئی اور اتالیق شہزادوں کو تعلیم دیتا ہوا بڑا باوقار نظر آتا ہے ——

—— یہ ہے ستارہ عطارد کی قلمی تصویر ———

یوں تو زحل والے بھی بڑے غضب کے مورخ، محقق اور دانشور ہوتے ہیں۔ بلکہ حراثت دانشور، لیکن عطارد والوں میں وہ خشونت نہیں ہوتی جو زحل کا حصہ ہوتی ہے۔ ۸ کے عدد کا تعلق ہوتا ہے ایک میں گرمی اور حرارت ہوتی ہے۔ دوسرے میں قمر والی چاندنی اور تابانی، —— —— ایک پر تمام سپردگی طاری رہتا ہے، دوسرے پر حقانیت ———

حنا اپنے تمام سپردگی کا عہد و پیماں جب علم النجوم سے باندھتی ہے تو وہ ستاروں کی چال برتنا اور ان کے خواص جنم کنڈلی اور جنم راس نچھتر، ان کی باہمی موانست، مطابقت و موافقت دوستی اور دشمنی بدھ، وشا، نگ، اور سنیچر کی ساڑھ ستی کی باتیں کرتی ہے وہ مخفیات کا باقاعدہ مطالعہ علم اور شعور رکھتی ہے۔ ادراک اور وجدان دونوں ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ "جل بن سارہ جال" میں وہ تمکنت اسد جیسا سب لاثانی اور بے نظیر کردار گڑھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ یہ اس کے علم کا بھی کمال ہے اور فن کا بھی۔

تمکنت اسد برج حوت کی بھرپور علامت بن کر سامنے آتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ برج حوت جنس کے اعتبار سے مونث

مزاج آبی، خاصیت ٹھنڈی، سعد اکبر، ذات برہمن، رنگ زرد سیاہ، شمالی رتر۔ اس کا موتی کا زمرد یا سنگ سلیمانی ڈگری ۳۴۱ ۳۳۰ - ۳۶۰ اور نقشہ اس کے لیوز باہر دریا ہے اترا پھادر پد ہے، ریوتی ہو ہے۔ — — — اور علامت اس کی دو متوازی لیکن مخالف سمتوں میں تیرتی ہوئی مچھلیاں ہیں۔

تمکنت اصدر کا کردار واضح طور پر دو مخالف سمتوں کا کردا ہے ایک وہ جو اصل تمکنت ہے ایک وہ جو اس کا سوانگ ہے جو اصل نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے تمکنت ایک ایسا جسم ہے کہ بارے میں شہر میں کیسی کیسی باتیں نہ ہوتی تھیں کیسے کیسے اسکنڈل اس کے نام سے منسوب نہ تھے؟........

وہ ریگستان میں سراب کی طرح تھی کہ نظر آ جاتی تو پیاسے بھاگ کر جاتے تھک جاتے یا ہانپنے لگتے کیونکہ اس کا بدن بڑا خوبصورت تھا۔ اس کی شریانوں میں گرم اور چیتا ہوا خون بہتا تھا۔ اس کے جسم میں دہکتی ہوئی اور لو دیتی زرد پیلی اور سنہری مچھلیاں تیرتی تھیں وہ جب بہتر ساری باندھتی تھی تو دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا کہ اس کے پیالے ناف میں آدھی چھٹانک مکھن بڑی آسانی سے آ سکتا ہے — — —

اور تمکنت ایک ایسی عورت کے علم میں ہوتا کہ اپنے سلسلے کے تمام اسکنڈل ہوتے تو وہ ان میں وہ تمکنت رنج کی ایسا ناتی اور رنج سے ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی — — — چونکہ کہانی لکھنے والی اور تمکنت کا برسوں کا ساتھ تھا۔ لہٰذا وہ خوب جانتی تھی کہ تمکنت کو سوانگ رچانے کا شوق ہے۔ جھل کا سوانگ۔ اور آوارگی کا سوانگ لیکن مچھلی کی طرح پھسلتی ہوئی پانی کی طرح مضطرب ہنستے ہنستے بے حال ہو جانے والی، ساڑھ ستی کی باتیں کرنے والی تمکنت خود بھی جیسے سینی کی ساڑھ ستی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسے معلوم ہو گا یا نہ ہو گا اور اگر معلوم ہو گا بھی تو کیا خلل پڑتا ہے کہ علم النجوم کی رو سے برج حوت میں بھی سنی کی ساڑھ ستی لگتی ہے

بہرحال تمکنت کو جلد یا دیر میں یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ بھی، وقت کا چہرا ہے۔ اسے اقرار کرنا پڑا کہ معاملہ کچھ یوں ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے وقت اعداد میں بٹ کر ہر ذی شعور کو کھاتا ہے

میں وقت کا کھایا ہوا ہوں کاش میری ماں اور میرے باپ نے مجھے ہونے کا چارا نگلنے پہ مجبور نہ کیا ہوتا کاش اس رات وہ ایک دوسرے کی طرف سے منہ موڑ کر سو گئے جب میرے نہ ہونے کا سفر ہونا آغاز ہوا تھا" — — — — دراصل یہ ہونے یا نہ ہونے کی بات ہی تو فضول ہے، ہمالیوں بادشاہ اپنے عہد میں کیوں پیدا ہوا یا اکبر کے وجود سے ہی کیوں پیدا ہوا؟ جہانگیر کے وجود سے بھی تو پیدا ہو سکتا تھا۔ شاہجہاں کیوں پیدا ہوا کہ ایک کو تاریخ کا دور زریں نصیب ہوا دوسرے کو عالم جلا وطنی دیکھنا پڑا — — — — شہنشاہوں میں لینے والی دنیا تاریخ اور اس کے جبر کے مطالعہ سے بے نیاز تو نہ ہو گی کہ زبیدہ خانم کے نام کا اعداد صفر ۹ ہے جو مریخ سے منسوب ہے اور اپنی عسکریت لیپند نشے کے لیے مشہور ہے، سلاطین و امرا ان کے مال و لشکر، جنگ، قتل اور خون اور ان سب کا اصل اور شیر شاہی لشکر کا ہیرو ... بدبختی اور ہیروئن یا قونیہ کا ہے تا ہو المرزۂ خیز یہ مالس جس بے اماں کی گود میں پلا، بڑھا اور ختم ہوا — — — — ہم اسے جبر کہہ لیں، یا تقدیر یا اتفاق وقت کہہ دیں تو کیا خلل پڑتا ہے اور اگر اس کا کوئی نام نہ دیں تو بھی یہ کب کسی کا پیچھا چھوڑتا ہے — — — —

اپنی بیٹی آدم کو کھو دینے کے بعد تمکنت کی ویرانی، بربادی اور تباہی سے زیادہ حسرت ناک اس کا وہ وہم ہے۔ بالآخر جس میں وہ مبتلا نظر آتی ہے وہ نہیں جانتی کہ یہ اس کی غلطی نہیں بلکہ یہ بھی محض ایک بھرم ہے۔

" آدم کا ذہن رومان کے دھندلکوں اور سیرت کی تہہ داریوں میں چھپی ہوئی جنس کے خواب دیکھتا تھا یہ اس کی ماں کی غلطی تھی کہ اس نے

اپنی بیٹی کو کام شاستر اور انگ رنگ (؟)
نہیں پڑھوائی تھیں، کھجراہو اور بھوانیشور
کے مجسمے نہیں دکھلائے تھے۔ اور سب سے
بڑی بات تو یہ تھی کہ ال سدرم کے بارے
میں کچھ نہیں بتایا تھا جو اپنی محبوباؤں کو
کو یکساں برتتے تھے"

جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات کتنا چلوں کہ اس کہانی میں جنسیات کے موضوع پر لکھی ہوئی کتاب انگ رنگ (؟) کا حوالہ دو جگہوں پر موجود ملتا ہے جب کہ کتاب کا نام "انگ رنگ" نہیں بلکہ "اننگ رنگ" (ANANG RANG) अनंग रंग ہے کتنا فرق ہو جاتا ہے کتابت کی ذرا سی لغزش سے انگ جسم اور اننگ بے تجسیم ——— کام دیو دراصل اس نام کے پیچھے اساطیری روایت MYTH یہ ہے کہ جب کام دیو (جنسیات کا دیوتا) نے شنکر کو متوجہ کرنے کے لئے بسنت ہتو پیدا کر دی، پھول کھلے اٹھے، اور تو شنکر کو کنے پر مجبور ہو گئیں۔ تو شنکر نے کرودھ میں اپنی تیسری آنکھ کھولی، اور کام دیو جل کر بھسم ہو گیا تو اس کی شریک حیات رتی کے گریہ کرنے اور بلبلانے پر شنکر نے کام دیو کی زندگی تو واپس کر دی لیکن اسے جسم سے بے نیاز کر دیا۔ اب وہ ہمارے آپ کے اجسام میں گردش کرتا ہوا موجود ملتا ہے لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے کیونکہ اس کے پاس اپنا کوئی پیکر نہیں۔ وہ "اننگ" ہو چکا ہے یعنی بے تجسیم یا بے پیکر، چنانچہ اننگ سے مراد کام دیو بھی ہوتا ہے۔ جنسیات کا دیوتا ——— بہرحال کہنا یہ ہے کہ صرف کام شاستر، اور اننگ رنگ، پر ہی کیا منحصر ہے بلکہ کاتھ اپنشد چندوگیہ اپنشد، ماتری اپنشد، اور رتی رہس، یوگ درشن، ویشیک درشن، سنکھیا درشن، چرک شستر استھان، اور جنسی کے موضوع پر دوسری سنسکرت کتابوں کا مطالعہ کیا ہوا ورس وما اور کھجراہو، بھوانیشور، اور کنارک اور دیگر تانترک مندروں کے مجسموں کے تمام جنسیاتی مشاہدات مل کر بھی اور کسی لڑکی کو قدیم سنسکرت کتابوں میں بتائے ہوئے جنسیات کے ۶۴ گنوں سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے باوجود ہم اس جبر کو کیسے ٹال سکتے ہیں کہ کھیل سچ کر جانے کہاں بربت جاتا ہے سارا جال ——— اور سینی کی ساڑھے سیتی ——— کہ زمین سخت ہے آسمان دور ہے۔

لیکن اس دہلا دینے والے حادثے کے باوجود صبا کی بڑائی یہ ہے کہ وہ اپنے رویے میں محض FATALIST نہیں رہتی۔ بلکہ خواہشات اور کام کے سمندر میں غوطہ لگاتی نند آتی ہے کہ زندگی میں استمتاع کیسے پیدا کیا جائے۔ اور آنند واسنا کو منوارا کیسے جائے:

"میں دہلی کی رانی بیٹی کو دیکھتی ہوں اور ایک
ایسے انگوری کی خواہش کرتی ہوں جہاں نہ وہ
مچھلی کو پھانسنے والے انگار اور نہ ہی مچھلیوں
کا جال بن سکے" (صبا — ہے سارا جال)

کہانی کا یہ خاتمہ اسے بہت بلندی پر لے جاتا ہے۔

"جل ہے سارا جال" میں وقت کنڈلی مارے چھپا بیٹھا آرام سے اپنا شکار کرتا ہوا موجود ملتا ہے یہی حال ایک دوسرے افسانوں کا ہے۔ لیکن ———

"شیریں چشموں کی تلاش" زاہدہ حنا کا ایک کامیاب تجریدی افسانہ ہے یوں تو تمام کہانیوں کے بطن میں آپ کو وقت چھپا بیٹھا آرام سے اپنا شکار کرتا ہوا مل جائے گا۔ لیکن "شیریں چشموں کی تلاش" میں آنکھوں کی دیدبان میں وہ سامنے آکر آنکھ مچولی کھیلنے میں سرگرم ہو جاتا ہے وقت جو خطِ مستقیم ہے اور منفی مقابر سے جان چکا ہے۔ "شیریں چشموں کی تلاش" میں وہ علمی بنیادوں پر اعداد اور صفر کا کھیل لگا کر ہراساں ملتا ہے۔ حنا کے اس افسانے میں اعداد کو برتنے کی سعی ملتی ہے علم الاعداد میں نقطہ عدم ہے وجود اعداد میں (جو صفر کے بعد) ایک سے نو کی گنتی بن جاتے ہیں یعنی ایک سے نو کے اعداد تمام تسلسل زماں پر حاوی ہو جاتے ہیں جیسا

زماں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ جب تسلسل زماں ہے! ہاں، مطلق کی
بات پیدا ہوتی ہے تو وہ صفر کی بات ہو جاتی ہے۔ شونیہ کی بات ہو
جاتی ہے ازل سے پہلے کی ازلیت اور ابد کے بعد کی ابدیت ہو جاتی ہے
اعداد کی بات نہیں رہتی۔ برہماتر سے برہم کی بات ہو جاتی ہے فریب
حقیقت سے حقیقت مطلق کی بات ہو جاتی ہے۔

زاہدہ حنا کے اس افسانہ میں نقطہ اور اعداد کی بحث
دراصل ویدانت شاستر کی بحث ہے۔ شنکر آچاریہ اور سوامی
ویکانند کی بحث ہے۔ سندھو ندی کے تٹ پر بیٹھے ہوئے عظیم
ڈنڈیامن رشی کا جواب ہے۔ جو اس نے سکندر اعظم کے وزیر سیلوکس
کو دیا تھا، ابن رشد اور ابن عربی کی بحث ہے۔ جو عدد کل شئی بستر
کل ستم پر ہی ختم ہو سکتی ہے۔

ہستی، نیستی، اعداد، وقت وجود اور عدم کے اندیشہ
ہائے دور و دراز کو تو کاشی نگری کے کبیر نے اپنی اس ساکھی
میں بیان کر دیا ہے۔

جل بیچ کمبھ ہے کمبھ بیچ جل ہے باہر بھیتر پانی
پھوٹا کمبھ، جل جل ہی سمایا یہ تت کتھوں گیانی (کبیر)
پانی خواہشات کی علامت بھی ہے
لیکن بہتا پانی ؟
اور سمندر ؟
وقت کی علامتیں ہیں ———

اور زاہدہ کو سمندر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے لیکن وہ سرتا
پا کڑواہٹ ہے اس لئے وہ شیریں چشموں کی تلاش میں نکلتی ہے۔
اور بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کہ اس
کی ان باتوں پر یقین کیا جائے لیکن جب وہ یہ بتاتی ہے کہ لڑکیاں
جس عمر میں گڑیاں کھیلتی ہیں۔ میں اس عمر میں اردو فارسی کا کلاسیکی
ادب پڑھ رہی تھی" تو قیاس پردۂ یقین میں منہ چھپا لیتا ہے
——— جب وہ یہ بتاتی ہے" کہ آسمان کا رنگ
ابھی کچھ دیر پہلے گلابی تھا اور کہیں سنہری مائل نیلا، پھر اودا ہوا

کہ تاریکی نے ان رنگوں کو نگل لیا۔ تمام رنگ معدوم ہو گئے اور تمام
چہرے گم ہو گئے لیکن میں سمندر کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ پرجلال
اور پرشکوہ چہرہ، ہمیشگی کا چہرہ ...." تو یقین
کرنا پڑتا ہے کہ زاہدہ صرف ہمیشگی کا چہرہ ہی دیکھنا نہیں چاہتی
بلکہ وہ اس کی شکن شکن پیشانی کی لکیریں گننا چاہتی ہے۔
وہ علم النجوم کے بعد علم الاعداد سے اپنا واسطہ استوار کرنا چاہتی ہے
اعداد ہیبت زدہ کر دینے والے اعداد ——— حروف
کے پیچھے چھپے رہنے والے اعداد ——— وہ عدم
کی حقیقت بھی جاننا چاہتی ہے اور وجود کی بھی۔ ہستی کی بھی
اور نیستی کی بھی، عدد کی بھی اور صفر کی بھی۔

ضرب، تقسیم، جمع، تفریق کے رنگ منچ پر پگ گھنگھرو
باندھ میرا ناچتی ناچتی اور اپنے وجود کے نشیب میں ———
——— اور نشیب میں بھاگتی بھاگتی جب تھک جاتی ہے تو
اسے اعداد کی عظمتوں کا احساس جلیل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"کائنات نے اپنے آپ کو اعداد کی صورت میں
تحریر کیا ہے اور میں اس تحریر کو پڑھنا چاہتی
ہوں پر یوں ہے کہ میں اعداد کی عظمت سے
ہیبت زدہ ہوں اور چشم حیرت وا کئے ان
سالوں کو دیکھتی ہوں جو حقیقت کا پرتو ہیں
لیکن حقیقت کہاں ہے ؟ وہ شاید اعداد
میں مستور ہے ....
میں تقسیم و تفریق کی ضرب اور جمع کی اور اعداد
کی اصل جاننا چاہتی ہوں کہ اپنی اکائی کو
پہچانوں اور اس کائنات کے بارے میں کچھ
سمجھوں جو محض اعداد کی بساط ہے اور آخر
کار مجھے نگل جائے گی ....
نقطہ عرفان ذات کی ابتدا ہے اور انتہا
——— اس کی ازل سے پہلے کی

ازلیت اور ابد کے بعد کی ابدیت مجھے دہلا
دیتی ہے" (شیریں حیثیتوں کی تلاش)

زاہدہ حنا کا یہ افسانہ علم الاعداد کی نظریاتی بحث کو اس فنی خوبی سے اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جیسے زمان مطلق کے پہلو میں تسلسل زمان کی دھڑکنوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حنا کے ان افسانوں میں مخفی مفاہیم کی پیش کش، باطنی تجسس اور داخلی اوصاف کی تلاش اس کے اسلوب اور بیان کو بھرپور سرّیت اور رمزیت عطا کرتی ہے۔

زاہدہ حنا قلم و ادب کے گوناگوں اسالیب کی ملکہ ہے شاہناموں اور داستانوں سے لے کر جدید تجریدی اور اسطوری افسانوں کے مختلف اسالیب بیان پر اسے قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کا سمندر ہے اس کے پاس، قدرت کا عجیب فیض ہے جو اسے عطا ہوا ہے کبھی کبھی ایک ہی افسانہ کے مختلف SITUA-TION کے لئے وہ مختلف اسالیب بیان کو ایسی چابکدستی سے استعمال کرتی ہے کہ ہم کلاسکیت اور جدیدیت کی بدلتی ہوئی لکیروں میں امتیاز کرنے سے قاصر ہونے لگتے ہیں۔ پرت پرت اس اس کی تحریروں کو ہم علاحدہ علاحدہ بھی نہیں کر سکتے۔ بس قاری کی حالت 'دیدہ اختر کھلا' کی ہوتی ہے اور شش جہت ادبیات کا دفتر کھلا سامنے ہوتا ہے۔ —————— سرّیت کی کہکشاں کے جنگل میں عرفان کی آگ، عدم، وجود، دیوتاؤں کا شہر برباد اور ان کا شہر آشوب، انکار کا علم، حیات کا محراب سنابل، ہیکل سلیمانی اور میوطور سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ یہاں مخفی مفاہیم اور باطنی عذابوں اور ثوابوں، اندرون ذات کے کرب اور ذات کی نفی کا محض عریاں بیان STAT-EMENT نہیں ہوتا بلکہ فنی نزاکتوں کے ساتھ اقراری اور انکاری لوگوں کی ہیبت زدہ شبیہیں کھڑی کر دی جاتی ہیں غیرمرئی مرئی بن کر سامنے آجاتا ہے اور "بے نطق و بے صدا" کی آوازوں کی گونج سے دل دہلنے لگتا ہے۔ ملاحظہ ہوں ان فارسی فقروں کے الفاظ و تراکیب سے پیدا ہونے والی اٹھتی گرتی صوتی لہریں:

تو کہ فلس ماہی حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم
بنشیں چو طوطی دم بدم بشنو خروش نہنگ لا

اور:

"زمینوں اور آسمانوں میں گونجتی ہوئی اس آواز کو سن کر میں نے جانا کہ وہ حضرت حق ہے۔ جناب نقطہ ہے" —————— پھر ان جملوں کو سیاق و سباق کے واسطوں سے پڑھئے اور دیکھئے —————— اس کی نثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے اس کے یہاں دوسروں کے فقروں، مصرعوں اور اشعار کا ایسا برمحل استعمال نظر آتا ہے جیسے 'گلستاں، کھل جائے — امیّت میری جان، آنے لگے ہیں تیری میری خواب گاہ تک، (پانیوں میں سراب) زرد ہوائیں، زرد آوازیں) ہر شئے منقلب ہوں گی .... وہ عجیب گھڑی تھی کہ جس گھڑی میں درس نسخہ عشق کا، سپر صنم سازی۔ الفاظ کی بات تو ایک طرف، حنا کے تیر کے ہوئے حروف و الفاظ کے صنم خانوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے خواہ یہ اقراری ہوں یا انکاری:

"(وہی جناب نقطہ کی گونجتی ہوئی آواز جو)
آگے کی طرف جاتی تھی اور دراز داڑھیوں
خشونت زدہ چہروں اور ڈھیلی ڈھالی
عباؤں والے سنگ زنی کرتے اور آوازے
کستے اس کا پیچھا کر رہے تھے یہ وہ تھے جنہوں
نے اپنی تختیوں کو اپنے گھٹنوں سے توڑ دیا
تھا۔ اپنے قلم دریا برد کر دیئے تھے انھوں
نے اپنی دواتوں میں بھری ہوئی روشنائی
جوہڑوں میں انڈیل دی تھی..........
میں نے ان خشونت زدہ چہروں کو پہچانا
اور ہیہات کہا میں نے دیکھا کہ ان کے اور

ان ہی جیسے دوسرے اکاد یوں کے ستا ئے
ہوئے ان گنت روشن حروف سمندر پر تیرتے
ہوئے میری جانب آتے ہیں اور پھر کسی اور
طرف کو نکل جاتے ہیں . . . . ''

الفاظ تو الفاظ حنا کے قلم سے اگلی ہوئی گنتیاں ـــــــــ ریاضی کی جمع، تفریق اور اعداد میں بھی زندگی کی شرب موجود ملتی ہے یہ کسی جگہ ٹھہرتے نہیں بلکہ اپنے ہی اسلوب کے سمندر میں ڈوبتے بھی ہیں اور ابھرتے بھی ہیں ۔

"ضرب تقسیم اور جمع تفریق ، اعداد کائنات
کے دائرے میں جگنوؤں کی طرح بجھتے ہیں اور
کبھی شہابیوں کی طرح روشن لکیریں کھینچتے
ہوئے فنا کے اندھے کنوئیں میں اتر جاتے ہیں
اور کبھی نامعلوم کہکشاؤں میں بکھرے ہوئے
ان گنت سورجوں کے مانند جگمگاتے ہیں "
(شیریں چشموں کی تلاش)

حنا اپنے ماہ پیدائش کے لحاظ سے برج میزان یا تکلا واسی کے تحت آتی ہے چنانچہ اس کے اسلوبی نظام میں سب سے اہم چیز الفاظ پر اس کی گرفت ہے الفاظ کے استعمال پر جو قدرت حاصل ہے وہ اسے اس کی ہم عصروں یا اس کے ہم عصروں میں ممیز کرنے کے لئے کافی ہے ۔ وہ ایک ایک لفظ کو چھانٹ پھٹک کر الگ کرتی ہے ، مرصع ساز کی طرح ناپ ناپ کر اور تول تول کر استعمال کرتی ہے ، برج میزان کی یہ ادیبہ ترسیل ابلاغ کے اور رنگ زاروں میں بہت آہستہ قدم آتی ہے ۔ اور گل کر جاتی ہے ، پھونک پھونک کر پاؤں رکھتی ہے ۔ اور نقش مالی کھلا دیتی ہے "جل ہے سارا جال" میں وہ جنسیات پر کھل کر باتیں کر جاتی ہے لیکن ایسی علامتوں ، اصطلاحوں اور الفاظ میں اپنے مخفی مفاہیم کو بند کر دیتی ہے کہ فحاشی اور عریانیت تو دور کی باتیں ہیں دوسری ادیباؤں کی طرح کھلنڈراپن ، شوخی اور شوریدہ پن کا شائبہ تک نہیں گزرتا چنانچہ ادبی رشک [illegible] کا مضمون کافی تھا ، شوخی لب و قلم اور لذت کام و دہن پیدا کرنے کے لئے ـــــ ہزار تعبیر و تشریح بھی وہ پہلو داری نہیں کر سکتی تھی ۔ جو اس سنسکرت اصطلاح نے کر دی ۔ ان کی علمیت مخفی علوم کی اصطلاحوں کو بھی استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے اور ان کے ذہن کی خلاقی ان میں زندگی پیدا کر دیتی ہے اور وہ [illegible] وہ اصطلاحیں یا الفاظ نہیں رہتے ۔ چنانچہ "جل ہے سارا جال " اور "ناگہانی آباد" کے علاوہ وہ اپنے دوسرے افسانوں میں بھی تکرار کے ساتھ علم النجوم اور علم الکف کی اصطلاحیں استعمال کرتی ہے ، صرصر بے اماں میں ، آنکھوں کی ویرانی میں ، ساتویں مات میں ، بود نابود کا آشوب میں ، وہ شہادت کی انگلی کے بجائے اسے مشتری کی انگلی لکھتی ہے اور درمیانی بڑی انگلی کو زحل کی انگلی کہتی ہے ۔ ان افسانوں میں کسی ایک جگہ بھی اس نے انگشت شہادت کو شہادت کی انگلی کے الفاظ سے یاد نہیں کیا ہے ۔ لیکن شیریں چشموں کی تلاش میں جب وہ انکار کے علم پر عرفان کے ابھرے ہوئے ایک تنہا نقطہ کو چھونے کی کوشش کرتی ہے تو اس کی یہی مشتری کی انگلی انگشت شہادت بن جاتی ہے اور معنی کے زنجیر بننے لگتی ہے ۔ اب یہ علم الکف والی مشتری کی انگلی نہیں رہتی ۔ یہ زاہدہ کے انتخاب الفاظ کا کمال ہے ۔

وہ اپنے افسانوں میں جہاں کہیں باطنی تلاش و تجسس اور مخفی مفاہیم اور باطنی عذاب و ثواب کا بچھاوا (haunting) کرنے نکلتی ہے تو اس کے اسلوب میں عجیب سریت ، تہہ داری رمزیت ، اور کبھی تاباں ابہام پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے فن کے لئے بہت قیمتی ہوتا ہے ـــــــ اور جسے ہم اس کے لفظیات سے برستے کہرے کے خاموش جنگل کا جادو کہہ سکتے ہیں ۔ ●

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

یگانہ کی زمین میں فراق گورکھپوری کی ایک غزل

جس طرح ہندو صنمیات میں ہر دیوتا کو سب سے عظیم کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح اردو تنقید میں ہر شاعر کو عظیم ترین بالخصوص اس سے واصل بحق ہوتے ہی کہنے لگتے ہیں۔ یگانہ اور فراق دونوں فی الواقع بڑے بلند قامت شاعر تھے۔

جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو اردو شعر کا دُرِّ یتیم اور مرزا واجد حسین یاس و یگانہ کو گوہر یک دانہ کہنا کسی اعتبار سے غلط نہ ہوگا۔ دونوں نابغہ روزگار تھے نیز ولی را ولی می شناسد کے مصداق ایک دوسرے کی صلاحیتوں اور توانائیوں سے خوب واقف تھے، فراق کی شاعری کے متعلق یگانہ نے کہا تھا کہ:

> "فراق کی شاعری حقیقی شاعری کی بہترین
> مثال ہے ...... یہ میری زندگی کے آخری
> لمحات ہیں۔ دنیا سے جاتے ہوئے غزل کو
> فراق کے ذمے کئے جا رہا ہوں ..... جب
> ہم لوگوں کو لوگ بھول جائیں گے اس
> وقت بھی فراق کی یاد تازہ رہے گی"

پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی، لوگ یگانہ کو فی الواقع بھول گئے، ان کی گراں قدر تصنیفات مثلاً نشتر یاس، آیات وجدانی، ترانہ، گنجینہ، ادب خبیث، غالب شکن، غالب شکن دو آتشہ، شہرت کاذبہ، آیات وجدانی وغیرہ میں سے ایک بھی دستیاب نہیں ہے۔ زمانہ یگانہ جیسے بڑے شاعر کو بھول گیا۔ اگر نہیں بھولے تو فراق نہیں بھولے۔ ان پر روا رکھے گئے ناروا سلوک کی بنا پر اردو شاعری اور لکھنؤ تہذیب و ثقافت کے لئے بطور استعارہ تو یگانہ کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، مگر ان کی شعری صلاحیت و توانائی کو فراق نے اتنا یاد رکھا کہ یگانہ کی ایک غزل پر غزل کہہ کر "آج کل" اردو کے جون ۱۹۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ فراق نے اپنی غزل کے ساتھ یگانہ کی پوری غزل بھی شائع کرائی، غالباً اس لئے کہ کلام یگانہ نادر و نادستیاب ہے لہٰذا تقابلی مطالعہ کے لئے ان کی غزل کا پورا متن بھی ابھرے گا، فراق نے غزل ہذا کو الٰہ آباد میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں سنایا تھا۔ کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو بھی فراق گورکھپوری کے ساتھ تھے، تا دم واپسی فراق کا حافظہ کمزور نہیں ہوا۔ اردو فارسی کے ہزارہا اشعار ازبر تھے، بالخصوص رومانٹک اور وکٹورین انگریزی شعرا کے پسندیدہ نظموں کے حصے انہیں یاد تھے۔ اپنی غزل کے ساتھ انھوں نے یگانہ کی پوری غزل شائع کرائی، تقابلی نظر ڈالنے کے لئے پہلے یاس و یگانہ کی غزل

۵ قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نویدِ ناگہاں پہونچی ہے مرگ منتظر ہو کر
نگاہ شوق سے کیا گلوں کا دم گھٹتا ہے
مبادا رنگ دل واڑ جائے پامال نظر ہو کر
زمانے کی ہوا بدلی، نگاہ آشنا بدلی،
اٹھے محفل سے سب بیگانہ شمع سحر ہو کر
کہاں پر نارسائی کی ہے پرواتوں کی قسمت سے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر
مقدر اس مسافر کا طلب جس کی نہیں ہوتی
نصیبوں ہی ہو گا ہی گنہگار سفر ہو کر
جواب آیا تو کیا آیا صدائے بازگشت آئی،
دہن سے آہ نکلی مبتدائے بے خبر ہو کر
فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں
مسافر دردِ وطن خانہ بدوش رہ گزر ہو کر
عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
لہو کا گھونٹ اتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر
خود اپنے خاک و خوں میں لوٹ کر آوارہ دنیا
تڑپے اب گھاٹیں گور کے آلودہ تر ہو کر
خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہو گا
چھڑا ہے سازِ مستی مبتدائے بے خبر ہو کر
دیارِ بے خودی میں امتیازِ روز و شب معلوم
بلا آئی مستوں پر شام بے سحر ہو کر
رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں!
اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز در ہو کر
مبارک نام آزادی، سلامت دام آزادی
دعائیں دوں کسے یارب اسیر بال و پر ہو کر
عجب کیا وعدۂ فردا، بس فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آجائے نہ شام بے سحر ہو کر

نگاہ یاس کا عالم جو آگے تھا وہ اب بھی ہے
ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

یہ ہے وہ غزل یاس (جو بعد کو یگانہ چنگیزی تخلص کرنے لگے) جو فراق کے حافظے میں محفوظ رہی۔ اور ان ہی کے توسط سے آج قارئین کے سامنے ہے۔ اس غزل کے بیشتر اشعار معنوی، تجرباتی ابعاد و جہات سے بھرپور رہیں۔ بڑی شاعری کی سب سے بڑی پہچان بھی ہوتی ہے کہ زماں و مکاں سے ماورا، دانش و بینش مسرت و بصیرت کے تموجات اس میں پائے جائیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ بدلتا سماجیاتی و جمالیاتی تناظر بھی اس پر برا اثر نہیں ڈالتا، پشکن زار کے عہدِ حکومت کا شاعر تھا، مگر سوویت روس میں آج بھی اس کی شاعری کو ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے اقبال کی مسلم لیگ سے وابستگی کے باوجود ہندوستان میں ان کی شاعری کو گراں قدر تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ غیر شعوری طور پر اقبال کی شاعری سے غیر فرقہ وارانہ آہنگ ہی ابھرتا ہے۔

شعر یگانہ بھی ایسی ہی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے درج بالا غزل کا مطلع ہرچند کہ رسمی، ابہجری سے مزین و آراستہ ہے مگر اس کی معنوی کیفیت اور بصیرت کرن کرن غلطاں نظر آتی ہے مطلع ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے ؎

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نویدِ ناگہاں پہنچی ہے مرگ منتظر ہو کر

اسیر قفس کے لئے آمدِ بہار پر چلنے والی بادِ بہار انبساط و مسرت کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ تھوڑی دیر ہی کو سہی بے خود ہو کر اپنی حالت کو بھول سکتا ہے، مزید براں، باد بہاری پریشانی و پراگندگی میں اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ یہی حال اسیر قفس کا ہوا۔ بوئے مستانہ اس کے لئے پریشانی کا موجب ہو گئی۔ قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود اس کو بہاراں کا انتظار تھا۔ مگر اس کی بدبختی نے یہاں بھی گل کھلائے، خزاں نصیب تھا خزاں نصیب ہی رہا۔ کیونکہ بہار کے

ساتھ ہی اس کی موت جس کا اس نے عمر بھر انتظار کیا تھا۔ نوید ناگہاں بن کر آگئی۔ ہوئے مستانہ کا درد سر ہوجانا اور کیوں درد سر ہوجانا وغیرہ کی بھرپور وضاحت بہ تمام کمال ایجاز و اختصار کے ساتھ دوسرے مصرعے میں موجود ہے۔ غرض کہ لاجواب مضمون ہے اور طرز و اسلوب خالصتاً یگانہ ہے۔

فراق نے اپنی غزل میں اور یہ اچھا ہی کیا وہ ردیف جو یگانہ کی غزل میں ہے کم استعمال کئے۔ فراق کا مطلع ہے ؎

اڑے مہر و مہ و انجم غبار رہ گزر ہو کر
قدم مارا بشر بھی کہاں بے بال و پر ہو کر

آدمی کے بال و پر نہیں ہوتے مگر بایں ہمہ وہ خلاؤں کو چیرتا ہوا کہاں سے کہاں پہونچ گیا ہے اس نے چاند پر پہونچ کر وہاں کی سرزمین کو اپنے نقوش پا سے آشنا کر دیا۔ انسانی جد و جہد کی ظفریابی کی بہترین آئینہ داری فراق کے مطلع میں پائی جاتی ہے۔ نیز وہ دور حاضر کی آگہی و تکنک سے مالا مال ہے۔ ایک اچھے شعر کا معنوی رقبہ وسیع ہوتا ہے کیونکہ گفتہ خیال کے ساتھ ساتھ ذہنی و جذباتی متعلقات (ASSOCIATIONS) بھی چھلک کر اس میں شامل ہوجاتے ہیں۔ فراق نے اس شعر میں انسانی تاریخ کا پورا تناظر پیش کیا ہے فراق کے اس مطلع کے ساتھ یگانہ کا درج ذیل شعر بھی ملاحظہ ہو کیونکہ اس میں "بے بال و پر" بطور قافیہ لایا گیا ہے ؎

مبارک نام آزادی، سلامت دام آزادی
دعائیں دوں کسے یارب اسیر بال و پر ہو کر

کیا یہ شعر آج کی صورت حال پر محیط نہیں کہا جاسکتا۔ آزادی اگر دام تزویر کہیانے کا نام ہے تو اسیر بال و پر یعنی مجبور محض کیا کرے دوسرے مصرعے کے لہجے میں پر معنی ابہام مضمر ہے جس کو شعری صلاحیت کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے اس شعر کے ساتھ یگانہ کا یہ شعر ؎

عجب کیا وعدۂ فردا بس فردا یہ ٹل جائے
کوئی شام اور آجائے نہ شام بے سحر ہو کر

سیاسی منظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ نعرے بازیوں پر چلنے والی سیاست کب تک فلاح و بہبود کی بات کرتی رہے گی اور کب تک بہانہ سازیاں اس کو ظفریابی سے ہمکنار کرتی رہیں گی۔ دونوں شعر پہلو دار معنی و رمعنی خصوصیات کے حامل نیز کسی نہ کسی اعتبار سے ترجمان حقیقت بنے رہیں گے۔ مطلع کے علاوہ فراق کی غزل کے دوسرے اشعار یہ ہیں ؎

زمیں ہی کی صدائے بازگشت اڑتی ہوئی پہنچی
سر ایوان مذہب آسمانوں کی خبر ہو کر
ہمارے قتل سے تاریخ لاکھوں کروٹیں لے گی
نہایت طول کھینچے گا یہ قصہ مختصر ہو کر
حیات جاوداں کی کوئی غیبی مصلحت ہوگی
پیا جام ہلاہل کس لئے مشو نے امر ہو کر
معانی سے لدی رہتی ہیں شاخیں باغ دلوان کی
یہاں ہر شعر اگتا ہے نہال بار ور ہو کر!
یہی شان نزول شعر ہے تحریک وجداں کی
پڑی ہے اک کرن دل پر تیری پہلی نظر ہو کر
وہ شاعر درحقیقت ترجمان زندگانی ہے
حقائق زندگی کے جو سنائے چشم تر ہو کر
وہ نغمہ ہے جو ساز غم کے چھولے آخری پردے
وہی ہے شعر جو اترے دلوں میں نشتر ہو کر
کف پا آتے جاتے چوم لینے کو تو مل جاتے
تمنا تھی کہ رہتے ہم کسی کی رہ گزر ہو کر
سیہ بختان عالم جو امین سوز پنہاں تھے
شب ہستی میں روشن ہیں چراغ رہ گزر ہو کر
اتاریں گے دلوں میں لوگ سینوں میں جگہ دیں گے
جہاں بھی جائیں گے جائیں گے ہم تیری نظر ہو کر
بس اک پنہاں جراحت نے ہزاروں روپ بدلے ہیں
چمن میں خندۂ گل، سینوں میں زخم جگر ہو کر

جو سمجھا تو تو ہمیں تو جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔
کبھی گیسوئے رخ ہو کر، کبھی شام و سحر ہو کر
ہم اہل عشق ہیں جو کچھ ترے بل پہ کر بیٹھیں
خطا بھی کرتے ہیں تیری ادائے دلگند ہو کر!
ہماری عاشقی گم گشتگی دھوکا نہ دے تم کو
بہت ہم باخبر ہو جاتے ہیں کچھ بے خبر ہو کر
وہی آتش فشاں جو آفتاب صبح محشر ہے!
ڈھلا ہر شام کو ساقی کے پیمانے میں تر ہو کر
سر دریا یہ شام سیر کشتی کیا سہانی ہے!
ستاروں کی شعاعیں پڑ رہی ہیں تیری نظر ہو کر
سکوت ناز کا عالم بیاں ہو کس طرح گویا!
مٹ آئی ہیں لاکھوں داستانیں مختصر ہو کر
طریق گم رہی کو روند کر کیا مل گیا آخر
کوئی منزل نہ ہاتھ آئی گنہ گار سفر ہو کر
یہ رنگا رنگی، عالم اسی کا تو کرشمہ ہے
گنہ آدم کا کیوں رہتا گناہ بے اثر ہو کر
یہی اک راز سربستہ ہے بزم زندگانی میں
کہ ہم سب اجنبی ہیں آشنائے یک دگر ہو کر
غزل کیا بس لٹائے راز کا صورت پکڑ لینا
رہ نالی دے خبر ہو کر دکھائی دے نظر ہو کر
افق کے وقت کہ نام فراق اب تک چمکتا ہے
ہزاروں نام تھے جو بجھ گئے رقص شرر ہو کر

فراق اپنے ایک ایک شعر کو بہترین شعری کاوش سمجھتے تھے یا وہ انتخاب کے فن سے ناآشنائے محض تھے۔ بالعموم ایک زمین میں کہے سارے کے سارے اشعار پیش کر دیتے تھے۔ لہٰذا رطب و یابس ان کی ہر تخلیق میں ملتا ہے، مطلع پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ درج بالا اشعار کی بھیڑ بھاڑ میں چند در خور اعتنا معلوم ہوتے ہیں یہ ہیں ؎

یہ رنگا رنگی عالم اسی کا تو کرشمہ ہے
گنہ آدم کا کیوں رہتا گناہ بے اثر ہو کر

یعنی پیش نظر رنگا رنگی عالم گناہ آدم کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔ گناہ کا مقام اخلاقیات میں جو کچھ ہو حقیقت یہ ہے کہ گناہ منفی عمل نہیں ہوتا بلکہ تہذیب و ثقافت ساز توانائی سے بھرپور ہوتا ہے گوئٹے کے فاؤسٹ (FOUST) سے یہ نکتہ اردو حلقوں تک پہونچا ہے اور اس خیال کو اردو میں سب سے پہلے اقبال نے پیش کیا۔ غالباً فراق نے خیال یہ گوئٹے اور اقبال دونوں سے لیا ہے۔ بہر کیف شعر اچھا ہے مگر اب یہ خیال پیش پا افتادہ ہو چکا ہے۔

یہی اک راز سربستہ ہے بزم زندگانی میں
کہ ہم سب اجنبی ہیں آشنائے یک دگر ہو کر

لبنز اور فشطے (MONAD) کا نظریہ یورپ کے فلسفے میں خاص اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس سے بحث و تمحیص کے ہزار پہلو نکلے ہیں۔ WINDOWLESS MONADS یعنی فردیات بے دریچہ بھی ایک دلکش موضوع بحث بنا رہا ہے شاعر نے بزم زندگانی میں سب کو شامل بتایا ہے مگر بایں ہمہ ہم ایک دوسرے کے دل کی بات سے ناآشنا رہتے ہیں شعر خاصا ہے مگر چونکہ یہ خیال عام ہو چکا ہے لہٰذا شعر ہٰذا میں ندرت نہیں معلوم ہوتی۔

عمرانیات و بشریات اور اشتراکیت کا گہرا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ الٰہیات کا خمیر دراصل سماج ہی سے اٹھتا ہے۔ اور مذہب انسانی ادراک کے منازل میں بے حیثیت نہیں ہوتا، اخلاقیات کے دروبست کی تشکیل محض اضافی و نسبتی ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ اجمالاً یہ کہنا نادرست نہیں معلوم ہوتا کہ سماجی استحکام کے تخیلی وہ شاعرانہ اسلوب سے مزین کہی گئی باتوں کو لوگ کلام خداوندی یا دیو وانی (देववाणी) تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے فراق کا درج ذیل شعر قابل تعریف شعریت سے جگمگ معلوم ہوتا ہے ؎

زمیں ہی کی صدائے بازگشت اٹھتی ہوئی بینی
سر ایوان مذہب آسمانوں کی خبر ہو کر

سمانی صحیفوں پر یہ شاعرانہ طنز کا حامل تو ہے مگر وہی وجدانی
از فکر پر استوار ذہنیت اس شعر سے محظوظ نہیں ہو سکتی بلکہ سمجھ
ی نہیں سکتی ۔

فراق کا اب یہ شعر ملاحظہ ہو جس کا پس منظر صنمیاتی ہے ؎

حیات جاوداں کی کوئی غیبی مصلحت ہو گی
پیا جام ہلاہل کس لئے شو نے امر ہو کر

شو دراصل غیر ویدک دیوتا ہے ویدوں میں "شوم" کا مفہوم ذات
کی بجائے صفت سے ہوتا ہے ۔ ہندو صنمیات میں شو کو بطور دیوتا
تصور کیا جاتا ہے ۔ شو نے دنیا کو زہریلات یعنی مہلک خبائث
سے محفوظ رکھنے کے لئے ہلاہل پان کیا یعنی زہر ہلاہل جو امرت منتھن
سے دریافت ہوا تھا خود پی لیا ۔ سنسکرت میں شو سے مراد
[illegible] یعنی فعال توانائی ہوتی ہے ۔ جاوداں
ہونے کے لئے یعنی اپنے نام کو عمل پیرائی کے ذریعہ زندہ جاوید بنانے
کے لئے مخالف قوتوں سے متحارب ہونا پڑتا ہے ۔ یہی غیبی مصلحت
یعنی ارادی غیبیت تھی ۔ شعر ہذا کو سمجھنے کے لئے اتنی استعداد
کی ضرورت تفہیم کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے ۔ شعر اچھا ضرور
ہے لیکن عام فہم نہیں ہے ۔

غزل کیا بس نوائے راز کا صورت پکڑ لینا
سنائی دے خبر ہو کر دکھائی دے نظر ہو کر

پڑھ کر بیدل کا یہ شعر یاد آتے ہی ؎

دریں گلشن کہ رنگش ریختن از گفتگو بیدل
شنیدن ہاست دیدن ہا و دیدن ہا شنیدن

بے رنگ و بے مزہ معلوم ہونے لگتا ہے ۔ کیونکہ جیسا کہ بیدل نے
ایک دوسرے شعر میں کہا ہے ؎

در مکر بستن مضموں رنگیں لطف نیست
کم دہد رنگ از کسے بند حنائے بستہ را

لہٰذا فراق کا محولہ شعر "بس حنائے بستہ" ہے ۔
فراق کا یہ شعر ان کے سیاسی و سماجیاتی شعور کا آئینہ دار
ہے ؎

ہمارے قتل سے تاریخ لاکھوں کروٹیں لے گی
نہایت طول کھینچے گا یہ قصہ مختصر ہو کر

یعنی سیاسی اور سماجی بدعنوانیاں بے ردعمل نہیں رہ سکتیں ۔
خون ناحق ضرور رنگ لاتا ہے ۔ پاکستان میں بھٹو کو پھانسی کے
تختے پر لٹکا دیا گیا ۔ قصہ مختصر تھا ۔ مگر پاکستان میں ضیائی نظام
کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ غیر متوقع نہیں تھا ، ہندوستان
میں سطح در سطح جمہوریت خلاف تقویت پذیر بدعنوانیاں ہمیشہ
قائم نہیں رہ سکتیں ۔ تاریخ ضرور کروٹ لیتی ہے اس حقیقت
پر روشنی ڈالنے والا فراق کا شعر معنویت و اہمیت سے پر ہے
بہرکیف دونوں غزلوں کا تقابلی مطالعہ سیر حاصل موضوع
فراہم کرتا ہے میرا خیال تو یہ ہے کہ یگانہ اور فراق دونوں اردو
شعری منزل میں سنگ میل تصور کئے جاتے رہیں گے معذرت
کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ غالباً یہ دونوں شاعر غالب سے
بڑے شاعر تھے ۔ میری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے اردو تنقید
کی موہوم کمر کی بھرپور رنت اندھی اس وقت ہونے لگتی ہے جب
کچھ لوگ جذباتیت کی رو میں بہہ اٹھتے ہیں ۔ اور ذہنی حضرات
و تحفظات یعنی اپنی رائے کے خلاف کچھ سنتے ہی دلندیزی،
نیز بیہودہ گوئی پر اتر آتے ہیں ۔ فراق پر میرا انگریزی مضمون،
FIRAQ GORAKHPURI : AN IMPARS-
INDIAN AND جو -IONED POET
FOREIGR REVIES (15-31 DEC 82)
میں شائع ہوا اور فراق کی رباعیات پر اردو جرائد میں مطبوعہ
دو مضامین شاعر کی عظمت کے متعدد نکات پیش کرتے ہیں
یگانہ اور غالب کومپلیکس (GHALIB COMPLEX)
جو اردو ادب کے کسی شمارے میں شمول کیا تھا ۔ یگانہ کی خوبیاں

بقیہ صفحہ [illegible] پر

پروفیسر محمد بدرالدین

جائے بیدل، راج محل اور اسکے قرب و جوار کی بولیاں

راج محل جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے یکتائے زمانہ ہے یہ ہندوستان کی مشہور اور وسیع و عریض گنگا ندی کے کنارے پر واقع ہے پہاڑوں اور کہساروں سے گھرا ہوا یہ شہر اپنی مثال آپ ہے، یہاں کی معدنیات ہندوستان ہی میں نہیں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ معدنیات میں چونا مٹی اور کوئلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے مشرق جنوب میں گنگا ندی، اور شمال و مغرب میں پہاڑوں اور کوہساروں کا سلسلہ واقع ہے، وسطی حصے میں ہموار زمینیں ملتی ہیں جو قرب و جوار کے باشندوں کی کاشت و زراعت کے لئے مخصوص ہیں۔

تاریخی اعتبار سے بھی یہ جگہ اہمیت کی حامل ہے جو اپنے ماضی کے روشن پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہے۔ زمانہ اکبری کی مساجد میں اکبری مسجد اور راجہ مان سنگھ کا تعمیر کردہ سنگی دالان یہاں کی گذری ہوئی شان و شوکت کو بروئے کار لانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں شہر سے تھوڑی دور، شمال و مغرب کی جانب منگل ہاٹ نامی جگہ ہے، اور اس کے قرب و جوار میں چند اور مساجد اور دیگر اعلیٰ تعمیرات کھنڈروں کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔ جو ابھی بھی خموش طریقے سے اپنے ماضی کی جاہ و جلال کی یادوں کو تازہ کر رہی ہیں۔

مگر جائے افسوس ہے کہ ایسی قابل قدر و منزلت جگہ پر باضابطہ طور پر کتابیں نہیں لکھی گئی ہیں جو اس کے تاریخی و جغرافیائی اور لسانی ماحول پر روشنی ڈالنے میں معاون ثابت ہوں۔ البتہ تاریخ اور جغرافیہ کی کتب میں چند مفید باتوں کی طرف اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس جگہ کے تاریخی و جغرافیائی ماحول پر تحقیق و تفتیش ہو۔ اور علمائے متعلقہ اپنے ذوق جستجو کا کمال دکھا کر اس جگہ کو جدید ہندوستانی عوام اور حکومت کی نظرہائے التفات کا مرکز بنائیں کہ یہ جگہ ان کی توجہوں کی طلب گار ہے۔

بہرکیف! میرا مقصد یہاں کے جغرافیائی و تاریخی ماحول کی تفصیل پیش کرنے سے متعلق نہیں ہے۔ چنانچہ حسب عنوان چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ کسی بولی یا زبان کا تعلق انسانی سماج سے ہے۔ جب تک سماج میں کسی مخصوص زبان یا بولی کی بڑی یا خاطر خواہ آبادی زندہ رہے گی۔ اس کی زبان تہذیب اور تمدن تمام چیزیں بھی زندہ رہیں گی۔ کسی خاطر خواہ آبادی کا خاتمہ اس کی زبان اور بولی کی خاتمہ سے عبارت ہے دنیا میں ایسی حقیقتوں کی مثالیں علوم و فنون کی کتب میں ملتی ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کوئی زبان اپنی اصل یا اپنے معیار سے ذرا ہٹ کر زندہ رہ جاتی ہے تو اس میں وہ

توانائی و قوت باقی نہیں رہ پاتی جو کسی معیاری اور فروغ پذیر زبان میں ملتی ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کمزور ہوتے ہوتے ایک دن پھر بولیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر یہی بولیاں ترقی کرتے کرتے کسی دیگر زبان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے زبانوں کی یہی خصوصیات ان کی سرشت میں داخل ہیں۔ چنانچہ ان حقائق کے پیش نظر یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ سرزمین راج محل میں بھی کوئی معیاری اور ادبی زبان مروج رہی ہوگی۔ جو اپنے بولنے والوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ کمزور ہو کر رہ گئی ہوگی جو آج بھی مختلف شکلوں میں ملتی ہے۔

بہر صورت! میرا مقصد تحریر محض راج محل کے قرب و جوار کی بولیوں پر اظہار خیال کرنے سے متعلق ہے اس لئے ذیل میں یہاں کی چند بولیوں کی لسانی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ راج محل تاریخی و جغرافیائی اہمیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی و تمدنی اعتبار سے بھی رنگا رنگ اور بوقلموں ہے۔ یہاں کے قرب و جوار میں کئی بولیاں رائج ہیں۔ جن پر ہندی، اردو، سنتھالی، کول، منڈا، بنگلہ، اور پہاڑی زبانوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان بولیوں کو بھوجپوری اور میتھلی نے بھی متاثر کیا ہے۔

خاص راج محل شہر میں اردو اور ہندی زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں جنہیں ہندو اور مسلم دونوں مشترکہ طور پر بولتے اور لکھتے ہیں لیکن بول چال میں ان دونوں زبانوں کی صوتی و نحوی ادائیگی میں نمایاں فرق ملتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں کی صد جگہ لسانی اعتبار سے بہت ہی عجیب و غریب ہے اس کی لسانی خصوصیات کے ضمن میں چند باتیں عرض کی جا سکتی ہیں چنانچہ درج ذیل جملوں کی لسانی خصوصیتوں کو بغور دیکھا جا سکتا ہے۔

(الف) تیں کہاں جا ہا رے؟ (یعنی تم کہاں جا رہے ہو؟) لفظ تیں کا استعمال ضمیر فاعلی کے لئے خرد و کلاں کا لحاظ رکھے بغیر ہوتا ہے۔ 'کہاں' عام طور پر فصیح ہندی اردو کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ 'جا ہا رے' حال ناتمام کے لئے استعمال ہوا ہے جو 'جا رہے ہو' کے عوض میں آیا ہے۔

(ب) میں کو تو بلاہس تھا۔ (یعنی مجھکو تو بلایا تھا) پیش نظر جملہ میں ضمائر متکلم کی مفعولی حالت کے لئے 'مجھکو' کی بجائے 'میں کو' استعمال ہوا ہے۔ جو قواعدی نقطۂ نگاہ سے عجیب بات معلوم ہوتی ہے 'بلاہس تھا' ماضی بعید کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی بلایا کے رکن 'یا' کو 'ہس' میں بدل کر ادا کیا جاتا ہے اور 'تھا' کو فصیح اردو ہندی کی طرح ہی ادا کیا جاتا ہے۔

(ج) ارے چھوڑا ایں کو دیکھے نہ ملے ہے؟ (یعنی ارے لڑکے تم دکھائی نہیں دیتے؟) پیش نظر جملہ نفی اور سوالیہ جملہ ہے 'ارے چھوڑا' انداز تخاطب کو ظاہر کرتا ہے، تیں کو تم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ 'دیکھے نہ ملے ہے' (یعنی دکھائی نہیں دیتے) بھی قواعدی نقطۂ نگاہ سے عجیب ہے۔

اب آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ یہاں کی زبان اور بولی کس نوعیت کی ہے؟۔ زیر نظر مضمون میں چونکہ راج محل کے قرب و جوار کی تمام بولیوں اور زبانوں میں سے چند کا جائزہ لینا ہے۔ اس لئے اس ضمن میں مزید چند مقامی بولیوں کی لسانی خصوصیات کو مختصر طور سے پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اب راج محل شہر سے دور جنوبی و مشرقی کی جانب جیسے جیسے ہم بڑھتے جاتے ہیں تو بولیاں بھی متفرق ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہر آٹھ میل پر پانی کا مزہ اولتا بدلتا چلا جاتا ہے۔

بہر کیف! اس بڑے علاقے میں بالخصوص مسلم آبادی آباد ہے اور ہندو بھی یہاں کے لسانی ماحول کو رنگا رنگ کرنے

ین مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بڑی مسلم آبادی اپنے گھروں میں بنگالی زبان کے روزمرے کو استعمال کرتی ہے۔ یہاں کے روزمرے کی بولیوں میں مختلف لب و لہجے دوری محل کے اعتبار سے بھی بدلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مسلم آبادی عام طور پر معاشت کاری اور زراعت پر منحصر ہے۔ اور بعض لوگ تجارت اور چھوٹی موٹی حرفت پر گزر بسر کرتے ہیں۔ جو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے بہت غیر ترقی یافتہ ہیں۔ عام طور پر لوگ غریب ہیں۔ بہرکیف! ان کی بولی بنگالی کے روزمرہ کی بولی ہے جس میں عربی، فارسی، انگریزی، بھوجپوری، ہندی اور اردو وغیرہ زبانوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ علاقہ راج محل کے ماتحت بہار ریاست میں واقع ہے۔ اس لئے یہاں کی بولی کی دامن میں ذکر بالا زبانوں کے الفاظ گل بوٹے جڑے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اس بڑے علاقے میں مسلم آبادی کے علاوہ ہندو آبادی بھی قابل ذکر ہے۔ جس کی بولی، ہندی، بھوجپوری اور میتھلی سے متاثر ہے یہ لوگ بھی تہذیبی و تمدنی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ ان میں زیادہ تر لوگ مزدوری پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

لسانی اعتبار سے یہ علاقہ اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اس اعتبار سے درج ذیل جملوں کی لسانی خصوصیات مرکز فکر ہو سکتی ہیں۔ مثلاً۔ کی جی تومی دوخواس دیبا ائیلا، (یعنی کیا آپ درخواست دیکر آگئے؟) ایسے لب و لہجے کے جملے عام طور پر پہچانوں، اجنبیوں اور معزز لوگوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ کی جی، سوالیہ الفاظ ہیں۔ جو کیا کے مترادف ہیں۔ لفظ تومی، آپ یا تم یا دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ ادبی بنگالی زبان میں آپنی، بعض بزرگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لفظ دورخواس، فارسی لفظ درخواست کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دیبا، دیکر، کے معنی میں اور لفظ آئیلا، آگئے کے معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

"کھودا جینے تو کے بھالو راکھے" پیش نظر جملہ دعائیہ جملہ ہے فارسی لفظ خدا کو عجیب و غریب انداز میں ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی لفظ خدا کے غشائی مصمتے - (VELAR CONSONANT) 'خ' کی بجائے غشائی ہکاری آواز - (ASPIRATED SOUND) 'کھ' کو ذرا کھینچ کر کے ادا کیا جاتا ہے جیسا کہ پیش نظر لفظ 'کھودا' سے واضح ہوتا ہے۔ جینے اتفاقیہ طور پر استعمال ہوتا ہے تو کے، جدید اردو کے، آپ کو، تم کو، اور تم لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ ادبی بنگالی زبان میں یہ محض چھوٹوں اور عزیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو واحد حاضر کے لئے مخصوص ہے۔ بھالو راکھے۔ یہ دونوں الفاظ اپنے لب و لہجہ کے ساتھ فصیح بنگالی زبان میں بھی اسی طرح استعمال ہوتے ہیں۔

ہاستمار تو قدیرے اپنے چھیلو۔ (یعنی میری تقدیر میں یہی تھا) ہاستمار بھوجپوری زبان کے ہماتر کے تدرے بدلی ہوئی شکل ہے۔ اور معیاری بنگالی کا آمار ہے جو اردو کے ضمائر متکلم کی اضافت حالت یعنی میرا، ہمارا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو قدیرے معیاری اردو تقدیر میں کے لئے آیا ہے تقدیر بذات خود عربی لفظ ہے۔ جو غیر زبان میں جاکر صوتی تبدیلی کا شکار ہو گیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس علاقہ میں مسلمانوں نے اپنے مذہب کے اعتبار سے اپنی مادری زبان میں عربی، فارسی اور اردو زبانوں سے غیر محسوس طور سے لاتعداد الفاظ مستعار لئے ہیں۔ جو ان کی بولیوں کے اجزائے ترکیبی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان الفاظ کے صوتی نظام میں غیر زبان کے صوتی ماحول کے زیر اثر نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے جو عین قانون فطرت ہے۔

یعنی راج محل کے قرب و جوار کے دیہی علاقوں کے

ہندوؤں کی بولیوں میں دیگر زبانوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔
شلاً۔ ہمانئیں جبئی۔ (یعنی ہم نہیں جائیں گے)
تنٹی ادھر آوئی (یعنی ذرا ادھر آؤ)

پیش نظر جملوں کی لسانی خصوصیتیں بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لفظ 'ہما' ضمائر متکلم کی فاعلی حالت کے لئے آیا ہے۔ لفظ 'نئیں' نہیں کیلئے اور 'جبئی' جائیں گے کے لئے آیا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پیش نظر جملہ فعل نہی و مستقبل کی نمائندگی کرتا ہے اسی طرح اس جملہ کو دیکھئے

تنٹی ادھر آوئی (ذرا ادھر آؤ)

پیش نظر جملہ بھی خاصا دلچسپ ہے تنٹی ذرا کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ادھر بذات خود ہندی، اردو کا معیاری اور کثیر الاستعمال لفظ ہے۔ آوئی بھوجپوری کا اثر لئے ہوئے ہے۔

بہرکیف میں نے راج محل کے قرب و جوار کے دیہی علاقوں کی ایک بڑی آبادی کی چند بولیوں کا جائزہ اختصار کے ساتھ لینے کی کوشش کی ہے۔ اپنے تجربہ اور فیلڈ ورک کے نتیجے میں جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے اس کو قلم بند کرنے کے لئے عرصہ دراز تک سوچتا رہا تھا کہ اس موضوع پر اپنا خیال پیش کروں چنانچہ میں نے اس کے لئے ایک خام تحریری اقدام لیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زیر نظر مضمون میرے خواب دیرینہ کی تعبیر و تفسیر نہیں ہو سکتی البتہ چند سینس (SENCES) کی بازیافت ضرور ہے۔

چونکہ راج محل پر نہ تو مورخین اور علمائے جغرافیہ نے خاصا مواد تحریری روپ میں چھوڑا ہے اور نہ ہی ہمارے ماہرین لسانیات اور ارباب علم و فن نے یہاں کی زبان اور تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالی ہے۔ محض اس لئے کہ یہ ایک پچھڑے ہوئے ضلع صاحب گنج (اب ضلع کا نام سنتھال پرگنہ کی بجائے ضلع صاحب گنج حال ہی میں تجویز کیا گیا ہے۔ اور دفتری امور بھی اب یہیں انجام دیئے جا رہے ہیں) کے ماتحت آنیوالے راج محل سب ڈویژن کے باشندوں کی جہالت اور عدم واقفیت کی وجہ سے یہاں کی تہذیب و تمدن اور معاشی و سیاست اور ثقافت و زبان پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہاں کے لوگ محض کسی طرح ادھر ادھر کر کے جی لینا چاہتے ہیں۔ اور صرف جی لینا 'زندگی' سے عبارت نہیں۔

ان حقائق کے پیش نظر میں ملک اور بالخصوص بہار کے اردو و فارسی کے علما اور ماہرین لسانیات سے درخواست کروں گا کہ وہ راج محل کی تہذیبی و تمدنی زندگی کو تاریخی اور جغرافیائی پس منظر میں پیش کرنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس لئے کہ تواریخ و جغرافیہ کے علوم کے ابواب کو دولت مند بنانے کے لئے یہ ایک باضابطہ موضوع ہی ہے ساتھ ہی ادب و زبان کا مرکز عمل۔ اس ضمن میں راج محل کے قدیم کھنڈرات اور تعمیرات میرے موقف کی تائید میں اپنے آپ شواہد ہیں۔ ادبی اعتبار سے بھی یہاں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ بیدل جیسے شہرہ آفاق شاعر جنھیں عزت ادب فارسی کہہ لیجئے تو بیجا نہیں ہوگا، نے اس سرزمین میں تولد اختیار کیا۔ (بیدل عرصہ دراز تک بیدل عظیم آبادی کے نام سے موسوم رہے جس کی وجہ سے لوگ ان کو سرزمین عظیم آباد (پٹنہ) کی پیداوار قرار دیتے رہے لیکن جدید تحقیق و انکشاف نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ عظیم آباد نہیں، راج محل میں پیدا ہوئے۔ واضح رہے کہ یہی راج محل کسی زمانہ میں بنگال (فی الوقت مغربی بنگال) کے مشمولات میں تھا۔ لیکن اب یہ ریاست بہار کے ماتحت ہے) انہوں نے یہیں کی آب و ہوا میں زندگی کے حسین لمحوں کو گذارا۔ یہیں کے لسانی ماحول کا اثر قبول کر کے اپنی افتاد طبع کے پیچ و خم کو فارسی زبان کے ذریعہ سے تحریری شکل میں واضح کیا۔ آج دنیا میں اس ذات برگزیدہ کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ترکستان، ایران، افغانستان ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں ان کے شیدایان آج بھی موجود ہیں ایرانی جنھیں اپنی زبان و ادب اور اپنے ادبا و علما پر فخر

حاصل ہے وہ سبھی بیدل کی عظمت فن و فکر کو تسلیم کرتے ہیں۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں ان کے کلام کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ صرف یہی نہیں، اردو و فارسی کے قد آور ذات جسے غالب کہتے ہیں نے بھی ان کو اپنا استاد معنوی قرار دیا ہے اور طرز بیدل کی تقلید کو قیامت سے تعبیر کیا ہے چنانچہ غالب اظہار خیال کرتے ہیں کہ ؎

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

لیکن افسوس کناں ہو جائیے کہ راج محل میں خصوصاً ان کی زندگی اور کارناموں کی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی ہو رہی ہے البتہ ملک کے بیشتر اہم مقامات میں ان کی برسیاں منائی جاتی ہیں۔ ان کے کلام کے اجمالی خصوصیات کو سمینار اور سمپوزیم میں بروئے کار لانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ لیکن یہ کوششیں محض بیرون راج محل انجام پذیر ہوتی رہی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر راج محل کی تہذیبی و تمدنی زندگی کے پس منظر کو جاننے کی ضرورت محسوس ہو تو بیدل جیسی شخصیت کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کے محرکات کے مطالعہ کی بھی ضرورت پیش ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پردۂ خفا میں دبی پڑی باتیں واضح ہو جائیں گی۔ اور راج محل کی ایک بڑی آبادی کے دلوں میں بیدل کے لئے خاص محبت پیدا ہو جائے گی۔ اور ان کے کارناموں کو سمجھنے کے لئے اپنے گرد و نواح کے ماضی کی تمام باتوں کو جاننے کا تجسس بھی رقصاں ہو جائے گی۔ اور یہ اقدام اس وقت ممکن ہوگا جب ملک اور ریاست بہار کی حکومت اور صاحبان علم و فن یہاں کی تاریخ و جغرافیہ کو مرتب کرنے کا بیڑا اٹھائیں گے۔ میں ملک کے ان تمام ارباب علم و دانش اور بالخصوص صاحبان اردو و فارسی، جو متعلقہ زبانوں کے مختلف کاوزد کے لئے کوشاں رہے ہیں، کی توجہ اس حقیقت پر مبذول کرانا چاہتا ہوں، کہ وہ راج محل جیسی جگہ اور وہاں کی قد آور ہستیوں کے ماضی کے کارناموں کو بالتفصیل پیش کرنے کے اقدامات کریں، میں اردو اکیڈمیوں کے صدر اور سکریٹری اور جامعات اساتذہ اور منہد سے بھی گذارش والتماس کرتا ہوں کہ وہ ان باتوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی زحمت گوارہ کریں۔ اور ثمر آور و عملی اقدام بھی لیں۔ اور یہ بات اس وقت بنے گی جب یہیں کی سرزمین میں ہی بیدل کی برسیوں کی تقاریب، ان کے حالات زندگی، اور کارناموں پر مشتمل سمینار اور سمپوزیم وغیرہ کا عمل پذیر ہو۔ جس طرح ملک کی دیگر ریاستوں میں اجمالی یا جزوی طور پر کسی شاعر کی برسیاں اپنی جائے پیدائش اور اپنے وطن کے لوگوں کے درمیان ہی منائی جاتی ہیں۔ اسی طرح بیدل کی برسی یا ان سے متعلق کوئی بھی تقریب خاص راج محل میں ہی منعقد ہو تاکہ ان کی شخصیت زندگی اور فن و فکر سے متعلق تفصیلی معلومات اپنے ہم وطنوں کو بھی حاصل ہو سکیں۔ اور ایسے اقدامات کے زیر اثر تاثر و کیف قبول کر کے ان کو بیدل کے نقش قدم پر نہ سہی، ان کی منفرق ذات سے علمی اور ادبی سطح پر مستفیض ہونے کا موقع ملے، اور رکھے جانے اور کرنے کی ترغیب بھی حاصل ہو۔ ●

بقیہ دیوار کی کہانی

بھائیو! اس ٹوپی والے کی باتوں میں نہ آنا۔ وہ آدم اور حوا کی اولاد — یعنی ہمارے بھائی ہیں۔ ان کا قد ہم سے چھوٹا نہیں ہے۔ اور کان بھی بڑے نہیں ہیں۔ اور وہ دیوار بھی ٹوٹ گئی ہے۔

یہ کہتے ہوئے بوڑھا پھر ٹوپی والے سے مخاطب ہوا۔!

مٹا دو تاریخ کے ان اوراق کو جن میں تم نے یہ پڑھا ہے کہ وہ قوم آدم کے صلب سے ہے لیکن حوا کے بطن سے نہیں — اور ان کا قد چھوٹا ہے اور کان بڑے ہیں — مٹا دو میرے بھائی مٹا دو ان اوراق کو، اور یہ لکھ دو کہ وہ دیوار ٹوٹ گئی ہے۔ کیونکہ تاریخ لکھنے کا حق ہم کو حاصل ہے — یہ التجا کرتے ہوئے بوڑھے نے

تقی حسین خسرو (پاکستان)

قلاش

آج پھر اس نے زبیدہ سے سوال کیا تھا۔

اس نے زبیدہ سے ہمیشہ سوالات ہی کئے تھے۔ خود زبیدہ نے اس سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے سوالات پر جھنجھلائی بھی نہیں تھی۔ وہ بڑے تحمل اور صبر سے اس کے سوالات کا جواب دیتی۔

زبیدہ کے ہاں جیسے اس کے ہر سوال کا جواب موجود تھا حالانکہ جواب دینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اور سوال کرنا کتنا آسان! سوالات تو جیسے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ سوالات کے لئے کبھی جستجو نہیں کرنی پڑتی اور جوابات کے لئے ہمیشہ ہی جستجو کرنی پڑتی ہے۔ کاش جوابات بھی سوالات کی طرح طویل راستوں میں پڑے یا کسی موڑ پر بکھرے یا پھر شام کو کسی بارونق چورنگی کی ہری ہری گھاس پر چہل قدمی کرتے مل جاتے!

مگر آج اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ زبیدہ اس کے سوال پر کسی قدر گھبرائی تھی۔ گویا زبیدہ نے اس کی عادت کے باوجود اس سے اس سوال کی توقع کبھی نہیں کی تھی۔

زبیدہ کسی قدر چھوٹے قد کی، کسی قدر فربہ جسم کی تیس، پینتیس برس کی عورت تھی۔ اسے دراز قد لڑکیاں پسند تھیں۔ اس معاملے میں وہ خاصا روایت پسند واقع ہوا تھا۔ وہی سرو قد، بلکہ شمشاد قد، محبوب کا تصور جس کے پیچھے تمام گلشن کی فضا سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ اپنے کندھے پر قد ناپنے کی مشین لئے گھومتا تھا۔ جہاں کوئی لڑکی نظر آئی وہیں اس نے مشین کندھے سے اتاری، اور لڑکی کا قد بلا کوئی معاوضہ لئے "ناپ" ڈالا۔ اور لڑکی دراز قد نکلی وہیں گویا گلشن آباد ہو گیا۔ اس طرح کتنے گلشن آباد کئے تھے اس نے! مگر اس وقت وہ یہ نہ جانتا تھا کہ جو گلشن فضا میں آباد ہوئے ہیں وہ فضا میں ہی اجڑ جاتے ہیں۔ یہی وقت تھا جب سوالات نے پہلے پہل اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔ سوالات جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ الجھا ہی رہ گیا تھا۔ وہ تو اس کی ماں نے کرم کیا تھا۔ ورنہ وہ ان بے رحم سوالات کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ زبیدہ جیسے اس کے سوالات کا مجسم جواب تھی۔ سوالات جو دراز قدی نے جنم دیئے تھے۔ اور زبیدہ چھوٹے قد کی تھی۔ زبیدہ کو پا کر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے پاس سوالات کا ذخیرہ ختم ہو جاتا۔ مگر کمبخت اس کا ذہن جس کی بے شمار کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی ہے۔ ایک ننھا سا سوال سر نکالے جھانک رہا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی نظریں چرانے کی، تھوڑی دیر کے لئے اسے اپنی کوشش میں کامیابی بھی ہو گئی تھی۔ مگر وہ پھر وہ سوال جیسے کھڑکی سے باہر لٹکنے لگا تھا اسے ڈر لگا تھا کہ وہ دوسرے ہی لمحے ایک زبردست دھماکے کی آواز کے ساتھ زمین پر گر پڑے گا۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر اسے اپنی باہنوں میں جھیل لیا تھا۔

تمہاری شادی زبردستی تو نہیں کی گئی۔۔؟

یہ پہلا سوال تھا جو اس نے زبیدہ سے کیا تھا۔ اس سوال سے پہلے اس نے زبیدہ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ کوئی اور بات کرنے سے پہلے اپنے سوال کا جواب چاہتا تھا۔ سوال جس سے نظریں چرانے کی اس نے پوری کوشش کی تھی۔ اور ناکام رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے سوال پر زبیدہ نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ زبیدہ جو ایک حقیقت پسند اور عملی عورت تھی جیسا کہ اس نے بعد میں محسوس کیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس

کے سوال پر گھبرائی نہیں تھی ۔ زبیدہ بڑے سکون سے جواب دیا تھا
نہیں، مجھے آپ کی تصویر دکھائی گئی تھی ۔ میرے ماں باپ بہت روشن خیال ہیں ۔

زبیدہ کا جواب صاف تھا ۔ مگر پھر بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی ۔ اس نے زبیدہ سے مزید سوالات کئے تھے ۔

تمہیں وہ تصویر اچھی لگی تھی ؟

زبیدہ نے سر ہلا کر جواب دیا ۔ ہاں !

تمہیں یقین ہے وہ تصویر میری ہی تھی ۔ زبیدہ نے دوبارہ سر ہلا کر جواب دیا، ہاں !

اس نے محسوس کیا کہ اس کے تمام سوالات کے باوجود زبیدہ پرسکون تھی ۔ اس نے دفعتاً محسوس کیا ۔ یہ عورت یقین کی دولت سے کس قدر مالامال ہے ۔ اس نے زندگی پہلی دفعہ رشک محسوس کیا ۔ بے پناہ رشک، کاش اس دولت کا کچھ حصہ اسے بھی مل جاتا پھر زندگی کتنی آسان ہو جاتی اس کے لئے ۔

زبیدہ کو پاکر اس کی زندگی جیسے واقعی آسان ہو گئی تھی زبیدہ جو یقین کی دولت سے مالامال تھی اور وہ دولت مند بیوی کے ایک قلاش شوہر ہی کی طرح خود بھی دفعتاً دولت مند ہو گیا تھا ۔ زبیدہ کا یقین جیسے ایک پیڑ تھا ۔ ایک چھتنار پیڑ! جس کا سایہ سورج کی روشنی کا منت کش بھی نہ تھا ۔ اس نے اس چھتنار پیڑ کے نیچے جیسے اپنی چارپائی سجائی تھی ۔ اور پھر اس پیڑ کے سائے کے باہر موجود دنیا سے بے خبر ہو گیا تھا ۔ یا شاید یوں یوں ہوا تھا کہ اس کے لئے تمام دنیا جیسے اس چھتنار پیڑ کے سائے میں سمٹ آئی تھی ۔ مگر سائے میں گذاری ہوئی صدیاں کتنی مختصر ہوتی ہیں ۔ پلک جھپکتے ہی جیسے ایک جگ بیت جاتا ہے ۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا ۔ اور پھر اس کے ذہن میں کھڑکیاں اچانک ہی دوبارہ کھل گئی تھیں اور ان کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی سے ایک ننھا سا سوال اپنا سر نکالے جھانک رہا تھا ۔

ایسا اس وقت ہوا تھا جب وہ اپنے پہلے بچے کا باپ بنا تھا ۔ بچے کا باپ بننا کتنے بڑے اعجاز کی بات ہوتی ہے ۔ اپنی بزرگی کا احساس کتنی بے پناہ آسودگی کا باعث ہوتا ہے ۔ لگتا ہے جیسے کسی نے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا ۔ لگتا ہے جیسے ایک فقیر بے نام ٹیلہ سے بڑھ کر دفعتاً پہاڑ بن گیا ہے ۔ بہت اونچا اور عظیم الشان پہاڑ جس کی بلندی سے تمام دنیا ہتھیلی میں دکھائی دیتی ہے ۔ باپ بن کر آدمی ... دنیا والوں کی نظر میں بھی محترم ہو جاتا ہے ۔ یہ ایک ایسا احترام ہے ۔ جو صرف باپ ہی کے حصے میں آتا ہے ۔ اپنے بچے کے باپ کے حصے میں! وہ چنانچہ اس احترام کے احساس سے سرشار تھا ۔ اور کسی بلند و بالا قدیم درخت کی طرح فخر سے اپنا سر اٹھائے اپنے ارد گرد دیکھ رہا تھا مگر وہ ننھا سا سوال جو اس کے ذہن کی بے شمار کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی سے اپنا سر نکالے جھانک رہا تھا ۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی نظریں چرانے کی، تھوڑی دیر کے لئے اسے اپنی کوشش میں کامیابی بھی ہو گئی تھی ۔ مگر پھر وہ سوال جیسے کھڑکی سے باہر نکلنے لگا تھا ۔ اسے ڈر لگا تھا کہ وہ دوسر... لمحے ایک زبردست دھاکے کی آواز کے ساتھ زمین پر گر... تا ۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں جھیل لیا تھا ۔

بچہ کس پر گیا ہے ؟

وہ جانتے تھا کہ جو بچے باپ پر جاتے ہیں ۔ ان کی ولدیت واضح اور کسی قسم کی شک و شبہے سے بالاتر ہوتی ہے ۔

زبیدہ نے اس کے سوال پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا ۔ وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھی ۔ پھر اس نے اپنے خاص انداز سے سر ہلا کر جواب دیا تھا ۔

بچہ آپ پر گیا ہے ۔

اس نے مزید سوالات کئے تھے

یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟

اس کی ناک تو آپ ہی کی طرح اونچی ہے ۔ اور اس کا ماتھا آپ ہی کی طرح چوڑا ؟

تو یہ مجھ پر گیا ہے ؟

زبیدہ نے سر ہلا کر جواب دیا ۔

ہاں آپ پر ۔

تمہیں اس کا یقین ہے ۔ ؟

ہاں مجھے اس کا ایسا ہی یقین ہے جیسا مجھے خود اپنے وجود یقین ہے ۔

اس نے ایک دفعہ اور محسوس کیا ۔ یہ عورت یقین کی دولت سے کس قدر مالا مال ہے ۔ اور ایک بار پھر وہ دولت مند بیوی کے ایک تلاش شوہر ہی کی طرح خود بھی دفعتاً دولت مند ہو گیا تھا

اس دولت مندی سے تلاشی اور تلاشی سے دولت مندی کا سفر اس نے بار بار کیا تھا ۔ اور اب جبکہ وہ چھ بچوں کا باپ تھا اس نے محسوس کیا اس کے ذہن سے سوالات کا ذخیرہ جیسے ختم ہونے لگا تھا ۔ اس کی وجہ شاید اس کی عمر بھی تھی ۔ وہ بڈھا نہیں ہو گیا تھا ۔ مگر بہر حال سوالات کرنے کی عمر سے یقیناً آگے جا چکا تھا ۔ اب جیسے اس کی ذہن کی تمام کھڑکیاں ایک ایک کر کے بند ہونے لگی تھیں ۔ وہ خوش ہوا تھا کہ اسے اب سوالات سے نجات ملنے والی تھی ۔ سوالات جنھوں نے اسے ہمیشہ پریشان کیا تھا ۔ پھر کتنے چین سے گذرے گی اس کی زندگی ـــــ اب بچے بڑی سے بڑے ہو رہے تھے ۔ اس کی بیوی زبیدہ بھی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ حقیقت پسند اور زیادہ باعمل ہو چکی تھی ۔ اب اس کی یقین کی دولت میں اور اضافہ ہو گیا تھا ۔ اب جیسے وہ ایک چٹان تھی ۔ ایک بہت بڑی چٹان ، جس کے ساتھ وہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا وہ اکثر سوچتا اگر زبیدہ اس کی شریک حیات نہ ہوتی تو وہ کب کا اپنے سوالات کی ، اپنی بے یقینی کی نذر ہو گیا ہوتا ۔ وہ زبیدہ کے بارے میں جب بھی سوچتا ، تو اس کا دل بے پناہ شکر گذاری کے احساس سے بھر جاتا ۔ مگر پھر شکر گذاری کا یہ طویل دور بھی گویا پلک جھپکنے میں گذر گیا تھا شاید اس کے ذہن کی بے شمار کھڑکیوں میں سے کوئی کھڑکی بند ہونے سے رہ گئی تھی اور اس کھڑکی سے ...... اس نے بڑی کوشش کی تھی نظریں چرانے کی ، تھوڑی دیر کے لئے اسے اپنی کوشش میں کامیابی بھی ہو گئی مگر پھر وہ سوال جیسے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا تھا ـــــــــ اور اسے ڈر لگا تھا کہ وہ دوسرے ہی لمحے ایک زبردست دھماکے کی آواز کے ساتھ زمین پر گر پڑے گا ۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر اسے اپنی باہنوں میں جھیل لیا تھا ۔

میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گی ؟

پھر اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ زبیدہ اس کے سوال پر کس قدر گھبرا گئی تھی ۔ گویا اس نے اس کی عادت کے باوجود اس سے اس سوال کی توقع کبھی نہیں کی تھی ۔ اس نے سوچا زبیدہ اسے کس قدر چاہتی ہے کہ اس کی موت کا محض ذکر بھی اس کے لئے گھبراہٹ کا باعث ہے ۔ اس نے خیال کیا زبیدہ جواب میں کہیگی مریں آپ کے دشمن ، میں آپ سے پہلے نہیں مر جاؤں گی ؟

مگر زبیدہ بہت جلد سنبھل گئی ۔ اب جیسے اس کے اندر کی حقیقت پسند اور باعمل عورت جاگ اٹھی تھی ۔ عورت جو یقین کی دولت سے مالا مال تھی اس نے اپنے مخصوص پرسکون انداز میں جواب دیا ۔

وہی کروں گی جو آپ کی امی نے یا میری امی نے کیا تھا ۔

زبیدہ کی امی یا اس کی امی دونوں ہی اپنے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ایک لمبے عرصے تک زندہ رہی تھیں ۔ کہ زندہ رہنا ہی بڑی بات ہے ۔ مرنے والے کے ساتھ مر جانا کبھی بھی بڑی بات نہیں ـــــ اس نے محسوس کیا زبیدہ کا جواب کس قدر حقیقت پسندانہ تھا ـــــ اس جواب کے پیچھے زبیدہ کی وہی یقین کی دولت تھی ۔ ! دولت جس نے اسے ہمیشہ ہی تلاش سے دولت مند بنایا تھا ـــــ مگر اس دفعہ نہیں معلوم کیوں وہ زبیدہ کے جواب پر تلاشی سے دولت مندی کی طرف سفر نہ کر سکا تھا ۔ اس نے اپنی طویل شادی زندگی میں آج پہلی دفعہ اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہا ۔ کاش ! زبیدہ ایک حقیقت پسند اور باعمل عورت نہ ہوتی ، کاش ! زبیدہ یقین کی دولت سے مالا مال نہ ہوتی ـــــ مگر آج وہ ایک ایسا تلاش ہی تو تھا جس کی تلاشی میں زبیدہ کی دولت نے ہزاروں اضافہ کر دیا تھا

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

تھوتھا

جولو سرکار کو دیکھتے ہی خوشی سے رقیہ کی باچھیں کھل گئیں وہ خوشی سے بے قابو ہو کر یکایک اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہوتے وقت اس کا پاؤں اونچی نیچی زمین پر پڑ گیا جس سے اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ گرتے گرتے بچ گئی۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ رقیہ نے اتنے پرجوش انداز میں جولو سرکار کا استقبال کیا تھا۔ ورنہ عام طور پر یہ ہوتا کہ وہ بڑے اطمینان سے چبوترے پر بیٹھی رہتی۔ جولو سرکار کو دیکھ کر دھیرے سے مسکراتی، پھر کاغذ میں لپٹے ہوئے پان کے بڈے سے ایک پان نکال کر منہ میں ڈال لیتی اور زور سے چیخ اٹھتی۔

نور جہاں! اوئی نور جہاں! دیکھ کون آیا ہے؟

رقیہ کی آواز سن کر ایک پتلی سرنگ نما نیم تاریک کوٹھری سے نور جہاں اپنی گردن باہر نکال کر جھانکتی۔ اور جولو سرکار کو دیکھ کر سینے پر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی دروازے پر آ کر مسکراتی ہوئی کھڑی ہو جاتی۔

جولو سرکار نور جہاں کے مستقل گاہک تھے۔ ان کا پورا نام یوں تو جلال الدین سرکار تھا لیکن ہر خاص و عام میں وہ اسی نام سے مشہور تھے۔ جولو سرکار کی سونے چاندی کی دوکان تھی۔ سفید لنگی اور سفید کرتا پہنتے تھے۔ کرتے میں سونے کے بٹن کے ساتھ ساتھ سونے کی زنجیر جھولتی رہتی تھی۔ پاؤں میں سیاہ پمپ شو ہوتا۔ آدمی منچلے تھے اس لئے پہننے میں ان کے آٹھ دس پھیرے ضرور ہوتے تھے

رقیہ کے یہاں یوں تو اور بھی چار پانچ لڑکیاں تھیں۔ مگر جولو سرکار نے آج تک انھیں نگاہ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ نور جہاں کے مقابلے میں وہ سبھی زیادہ تندرست و توانا، قبول صورت اور کم عمر تھیں۔ لیکن جولو سرکار نور جہاں پر دل و جان سے فدا تھے۔

نور جہاں بوئے قد اور متناسب جسم کی سانولی سی عورت تھی۔ اور اس کی عمر بھی تقریباً ۳۰ سال تھی۔ اسے کپڑے پہننے کا بھی سلیقہ نہ تھا جس کی وجہ سے وہ اور بھی بھدی لگتی تھی۔ اور یہی بات دوسری کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، کہ جولو سرکار جیسا مالدار اور خوش پوشاک شخص جس کی عمر چالیس سال تھی۔ جسم فربہ تھا، توند نکلی ہوئی تھی، چاندی صاف تھی اور بالوں کی ایک جھالر سر کا احاطہ کئے ہوئے تھی اور جس کی سونے چاندی کی دوکان تھی۔ وہ اس بھدی سی عورت پر کیسے فریفتہ ہو گیا تھا۔ نور جہاں نے جولو سرکار پر کون سا ایسا جادو کر دیا تھا کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتے تھے؟

نور جہاں کی ہم پیشہ لڑکیوں نے بارہا جولو سرکار کو رجھانے کے لئے نت نئے انداز اختیار کئے۔ اپنی طرف مائل کرنے کی سو سو تدبیریں کیں۔ مگر جولو سرکار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ دن بہ دن ان کی دیوانگی شدت اختیار کرتی گئی۔ وہ کبھی نور جہاں کے لئے چوڑیاں خرید لاتے کبھی سینڈل اور کبھی ساڑھی کی قیمت دے جاتے۔ نور جہاں جب اپنی ہم پیشہ لڑکیوں سے جولو سرکار کی ان نوازشات کا ذکر کرتی تو وہ سب اس کی قسمت پر رشک کرنے لگتیں۔ یا حسد کی آگ میں جل اٹھتی اور ان کے دلوں میں جولو سرکار کو اپنا مہمان بنانے کی خواہش اور بھی شدت اختیار کر لیتی۔

جولو سرکار کی ان نوازشوں کی سبب سے رقیہ بھی نور جہاں پر بے حد مہربان تھی۔ دوسری لڑکیوں کو وہ بات بات میں جھڑکتی اور گالیاں دیتی رہتی تھی۔ کبھی کسی گاہک کو کمرے سے باہر نکلنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ شور مچا کر ایک طوفان کھڑا کر دیتی تھی۔ لیکن نور جہاں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اور یہ بات ان لڑکیوں کو اور بھی بری لگتی تھی۔ جولو سرکار کا جب بھی پھیرا ہوتا۔ رقیہ ان سے اتنے دنوں

ک نہ آنے کی شکایت کرتی۔ اور جولو سرکار ہمیشہ اپنی بے پناہ مصروفیت کا عذر پیش کر دیتے۔ پھر وہ نورجہاں کے ساتھ گھنٹوں اندھیری کوٹھری میں بند رہتے۔ اور رقیہ بڑے اطمینان سے سیمنٹ چبوترے پر بیٹھی پان چباتی رہتی۔ جولو سرکار جب اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلتے تو وہ ان سے آئندہ آنے کی تاریخ پوچھتی، جواب میں جولو سرکار اپنے کرتا کی جیب سے چند نوٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیتے۔ جسے وہ جلدی سے اپنے بلوز کے اندر ڈال لیتی۔ نورجہاں کو معاوضہ میں ملنے والی رقم کی صحیح تعداد اسے معلوم نہ تھی۔ لیکن اسے انعام میں ملنے والی رقم ہمیشہ بیس روپے سے زائد ہوتی تھی۔

رقیہ جولو سرکار کے حسن و اخلاق سے بے حد خوش تھی۔ اس بازار میں ایسے گاہک بہت کم آتے تھے، جو خاموشی سے آئیں، گھنٹہ دو گھنٹہ وقت گزاریں۔ اور خاموشی سے واپس چلے جائیں۔ ورنہ زیادہ تر گاہک ایسے ہی آتے تھے جو طے شدہ رقم دینے میں بھی سو ہنگامے کھڑے کرتے تھے۔ لڑائی جھگڑا کرنے پر اتر آتے تھے۔ اور کبھی کبھی بات اس قدر بگڑ جاتی تھی کہ معاملہ پولیس تک پہونچ جاتا تھا۔ رقیہ اس طرح کے ہنگامے قطعی پسند نہیں کرتی تھی۔

لیکن جولو سرکار ان سبھوں سے قطعی مختلف تھے۔ انہوں نے پہلے ہی دن رقیہ کے سامنے یہ شرط رکھی۔ کہ وہ جتنی دیر بھی کمرے کے اندر رہیں گے باہر سے نورجہاں کو کوئی بھی آواز نہ دے گا۔ اور جب تک وہ کمرے سے باہر نہ نکل جائیں۔ دوسری لڑکیاں اپنے اپنے گاہکوں کے ساتھ انتظار کرتی رہیں۔ اور کمرہ جلدی خالی کرنے کے لئے دروازے پر دستک بھی نہیں دیں گی۔

یہ بات نہ صرف اس بازار کے اصول کے خلاف تھی۔ بلکہ کاروباری اصول کے خلاف بھی تھی۔ اس کے علاوہ رقیہ کے پاس کمرہ صرف ایک تھا۔ اور لڑکیاں پانچ تھیں۔ مول تول کے بعد جب سودا طے ہو جائے تو گاہک سے جلد سے جلد قیمت وصول کر کے دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو جانا دکاندار کی عین فطرت ہے۔ یہ اصول ہوٹلوں میں، چائے خانوں میں، بازاروں میں اور قحبہ خانوں میں یکساں طور پر برتا جاتا ہے۔ گاہک کو بھی قیمت ادا کر کے مطلوبہ شئے حاصل کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔ بیکار وقت نہ تو دکاندار ضائع کرنا چاہتا ہے نہ گاہک۔ ایک خریدار پر زیادہ توجہ صرف کرنے میں دوسرے خریداروں کو بلا سبب انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح کاروباری نقصان بھی ہوتا ہے پھر جب مطلوبہ شئے ہر دکان میں موجود ہو تو بلا سبب خریدار بھی انتظار کرنے کی بجائے دوسری دکان کا رُخ اختیار کرتا ہے۔ بازار بہرحال بازار ہوتا ہے، خواہ کپڑے کا بازار ہو یا غلے کا مویشیوں کا بازار ہو یا بازارِ حسن، نفع اور نقصان کا حساب ہر جگہ ہوتا ہے چیز پسند ہو تو دام چکائیے اور چلتے بنئے۔ فروخت کرنا ہے تو قیمت لیجئے اور مطلوبہ شئے حوالے کیجئے۔ کاروبار میں گاہک سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ منافع سے غرض ہوتا ہے۔ سودا کھرا ہو تو خریداروں کی کمی نہیں ہوتی۔ جیب میں دام ہو تو مطلوبہ چیزوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ بیچنے اور خریدنے کا یہی نظام ہر جگہ رائج ہے۔

رقیہ نے اسی بازار میں اپنی پہاڑ سی جوانی گزار دی تھی۔ وہ گاہکوں کو پرکھنے کی بڑی اچھی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی تجربہ کار نگاہیں ایک نظر دیکھ کر ہی خریدار کے چہرے سے اس کی ذہنی کیفیت کا پتہ چلا سکتی تھی۔ اس نے اب تک ایسے گاہک زیادہ دیکھے تھے جو کم قیمت دے کر اپنی خواہش پوری کرنا چاہتے تھے۔ رقیہ ایسے گاہکوں کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے دروازہ کی طرف جانے کا اشارہ کرتی اور بُرا سا منہ بنا لیتی تھی۔

رقیہ نے جولو سرکار کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ کاغذ کے پُڑا سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا اور بڑی بے نیازی سے بولی ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن پچاس روپے دینے ہونگے۔

رقیہ کا خیال تھا کہ پچاس روپے طلب کرنے کے بعد بیس پچیس روپے میں تو سودا طے ہو ہی جائے گا۔ موت اور خریدار کا تو کوئی ٹھیک نہیں۔ اس عرصے میں اگر کوئی گاہک آ گیا اور انتظار کرنے کے سبب کسی دوسرے دروازے کے اندر داخل بھی ہو گیا۔ تو اس کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ یوں بھی ان چھوکریوں کی دن بھر،

کمائی بیس تیس روپے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جب کوئی چھوکری نئی نئی
آتی ہے تو کچھ دنوں تک اچھی کمائی کرلیتی ہے۔ اس کے بعد سبھوں کی اوسط
آمدنی ہی رہ جاتی ہے۔ اور رقیہ تو ان پانچ لڑکیوں کو اپنے دروازے
کی چوکھٹ میں کئی سال سے سجائے ہوئے تھی۔

جولوسرکار نے چند لمحے تک کچھ سوچا۔ اور رقیہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب جولوسرکار نے مطلوبہ رقم ادا کرنے کی حامی بھرلی۔

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر نورجہاں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جولوسرکار اندر سیڑھی کوٹھری کے دروازے تک پہونچے، اور دروازہ اندر سے بند ہوگیا۔

اپنے پندرہ سالہ کاروباری تجربہ کی بناپر رقیہ کو یقین تھا کہ جولوسرکار دو تین گھنٹہ ضرور صرف کریں گے۔ ایسے گاہک جو منہ مانگی قیمت ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنی قیمت وصول کرنے کے لئے زیادہ وقت بھی لیتے ہیں لیکن اس کے اندازہ کے خلاف جب جولوسرکار ایک گھنٹہ بعد ہی کمرے سے باہر آگئے تو رقیہ نے متجسس نگاہوں سے جولوسرکار کی طرف دیکھا۔ جولوسرکار کے چہرے سے پژمانیت اور آسودگی کے آثار نمایاں تھے۔

جولوسرکار کے پیچھے پیچھے نورجہاں بھی کمرے سے باہر نکل آئی اور رقیہ کے قریب ہی آکر کھڑی ہوگئی۔

پھر کب آئیں گے؟ اس نے جولوسرکار سے پوچھا۔

کہہ نہیں سکتا۔ جب بھی فرصت ملی۔ آجاؤں گا۔ جولوسرکار نے جواب دیا۔

جولوسرکار نے ایک نظر رقیہ کی طرف دیکھا اور کرتے کی جیب سے چند نوٹ نکال کر رقیہ کی طرف بڑھا دیا۔ یہ تمہارا حصہ ہے۔

رقیہ چند لمحوں تک متعجب سی جولوسرکار کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے جلدی سے نوٹ لے کر بلوز کے اندر ڈال لیا۔

جولوسرکار کے جانے کے بعد اس نے بلوز کے اندر سے نوٹوں کو نکال کر گنا۔ تو وہ پچیس روپے تھے۔

اس دن سے لے کر اب تک جولوسرکار نے کبھی کم قیمت ادا نہیں کی تھی۔ بلکہ ہمیشہ ہی دیتے جاتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ رقیہ ان سے بہت خوش رہتی تھی۔ خوش کیسے نہ رہتی۔ جبکہ دوسرے گاہک طرحدار لڑکیوں کو مشکل سے پانچ دینے پر بھی جلدی راضی نہ ہوتے تھے۔ جولوسرکار پابندی سے نورجہاں کی اتنی بڑی قیمت ادا کرتے آرہے تھے۔

ایک ہفتہ قبل جب نورجہاں ضد کر کے اپنی ماں سے ملنے چلی گئی۔ تو محض جولوسرکار کے خیال ہی سے رقیہ پریشان ہوگئی تھی۔ نورجہاں یوں تو دیکھنے میں بھدی لگتی تھی۔ لیکن اسے گاہکوں کو اپنے قابو میں رکھنے کا فن آتا تھا۔ اس کی ہم پیشہ لڑکیوں کے مقابلے میں نورجہاں کے مستقل گاہکوں کی تعداد زیادہ تھی۔ خاص طور پر جولوسرکار جیسے لوگ نورجہاں کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ جس دن نورجہاں اپنی ماں سے ملنے چلی گئی۔ اس کے دوسرے ہی دن اس کے پاس شیفالی آگئی۔ شیفالی کا رنگ یوں تو سانولا تھا۔ لیکن اس کا جسم چڑھے ہوئے کمان کی طرح تھا۔ بیضاوی چہرہ، پتلی پتلی بھنویں۔ اور آنکھیں ایسی مخمور، کہ جس کی طرف ایک ایک بار دیکھ لے تو گھائل ہوکر رہ جائے۔ اس نے دو تین دن ہی میں تہلکہ مچادیا تھا۔ نورجہاں کے مستقل گاہکوں کی پوری کھیپ اس پر فدا ہوگئی تھی۔ اور اپنے سارے پرانے رشتے توڑ کر شیفالی سے ناطہ جوڑ لیا تھا۔

نورجہاں کے جانے کے بعد رقیہ کو ہر لحظہ یہ خوف لگا رہتا کہ اس عرصے میں اگر جولوسرکار آگئے تو انھیں کیسے سنبھالے گی۔ نورجہاں کو نہ پاکر کہیں دوسرے گھر کا رخ نہ اختیار کرلیں۔ گاہک اگر ایک بار دوسری طرف مڑ گیا۔ تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ لیکن شیفالی کے آنے کے بعد اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اسے اطمینان ہوگیا تھا نورجہاں نہیں ہے تو کیا ہوا شیفالی تو ہے۔ اجولوسرکار شیفالی کو پاکر مزید خوش ہوں گے۔ اور ..... اور ..... ممکن ہے وہ نورجہاں سے بھی بڑی قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہوجائے اور اگر جولوسرکار کو شیفالی بھا گئی۔ تو کیا پتہ اس کے حصے کی رقم بھی بڑھ جائے۔

سبھی وجہ تھی کہ جولو سرکار کو دیکھتے ہی رقیہ خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔

جولو سرکار جب رقیہ کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تو اس نے حسب معمولی اپنی شکایت دہرائی ــــ اب کے آنے میں آپ نے بڑی دیر کر دی۔

ہاں، میں ذرا شہر سے باہر چلا گیا تھا، کل ہی واپس لوٹا ہوں

میرا دل کہتا تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گے، رقیہ نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

جولو سرکار نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور رقیہ سے پوچھا ــــ

نورجہاں کہاں ہے؟

وہ تو نہیں ہے۔ اپنی ماں سے ملنے گئی ہوئی ہے

نہیں ہے۔ جولو سرکار نے مالوسی سے پوچھا، کب گئی ہے؟

ایک ہفتہ ہو گیا۔ رقیہ نے جواب دیا ــــ لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کے لئے پہلے ہی سے انتظام کر رکھا ہے

جولو سرکار نے سوالیہ نگاہوں سے رقیہ کی طرف دیکھا۔

شیفالی، اوئی شیفالی، رقیہ نے آواز دی،

آئی آپا، شیفالی کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

چند لمحوں کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور پہلے ایک نوجوان نکلا، اور اس کے پیچھے پیچھے سینے پر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی شیفالی نکلی۔ جولو سرکار نے ایک نظر شیفالی کی طرف دیکھا۔ شیفالی تیزی سے رقیہ کے سامنے چبوترے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

آج آپ اسی کے پاس چلے جائیں۔ رقیہ نے جولو سرکار سے کہا۔ نئی نئی آئی ہے۔

جولو سرکار نے چند لمحوں تک کچھ سوچا، پھر دھیرے دھیرے اندھیری کوٹھری کی طرف چلے گئے۔

جولو سرکار کے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی رقیہ نے شیفالی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اور جب شیفالی کمرے کے اندر ــــــــ آئی تو اس کے پیچھے پیچھے رقیہ بھی کمرے میں داخل ہو گئی۔

کمرے میں حسب معمول نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں جولو سرکار جوتے اتار کر کھاٹ کے اوپر بچھے ہوئے گدے پر بیٹھ چکے تھے کھاٹ پر نیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ سرہانے کی طرف ایک گاؤ تکیہ اور دائیں بائیں دو تکیے رکھے ہوئے تھے۔ جن پر نیلے رنگ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

رقیہ نے کمرے میں داخل ہو کر شیفالی کو سمجھایا ــــ

سرکار صاحب جو بھی کہیں مان لینا۔ کوئی بدتمیزی مت کرنا۔ دیر بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔ جلدی بازی مت کرنا۔

شیفالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر رقیہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔

رقیہ دل ہی دل میں بے حد خوش تھی۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ سرکار صاحب مان گئے۔ اسے تو ڈر تھا کہ کہیں انکار نہ کر دیں۔ اب ان کے ہاتھ سے نکل جانے کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ ورنہ ان لوگوں کے مزاج کا کیا ٹھکانہ، کب بدل جائے۔ ویسے شیفالی جولو سرکار کو ضرور پسند آئے گی۔

رقیہ فرش پر بیٹھی پان چباتی رہی۔ اور دروازہ پر نگاہیں جمائے ہوئے جولو سرکار کے باہر انتظار کرتی رہی۔

کمرے میں دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اسے شیفالی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ شیفالی کی ہنسی کیا تھی۔ جیسے اندھیری کوٹھری میں جل ترنگ بج رہا ہو۔ رقیہ کا چہرہ فرط خوشی سے کھل اٹھا اس کا قیاس بالکل صحیح تھا۔ یہ لڑکی جولو سرکار کے چودہ طبق روشن کر دے گی۔ اس نے سوچا آج جولو سرکار خوش ہو کر اسے ایک بڑی رقم ضرور انعام دیں گے۔ پھر تو کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن یہ رقم کتنی ہو سکتی ہے؟ پچاس یا سو؟ نہیں سو بہت زیادہ ہے۔ مگر اتنی زیادہ بھی تو نہیں۔ وہ تو یوں بھی ہر بیٹھک میں اسے بیس تیس

چلے دستے ہی جاتے ہیں۔ اور آج کی تو بات ہی الگ ہے۔

شیفالی کی ہنسی سے بجتے ہوئے ہر جل ترنگ کی آواز پر رقیہ کے چہرے پر خوشیوں کی لہریں بکھرتی رہیں۔ اور کمرے کے اندر ہنسی کی آواز گونجتی رہی۔

نصف گھنٹہ بعد ہنسی کی آواز رک گئی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ اور جولو سرکار پسینے میں نہائے ہوئے کمرے سے باہر آگئے۔

جولو سرکار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر رقیہ پھر جلدی سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔ اور جب وہ اس کے بالکل قریب آگئے تو اس نے بڑی بے حیائی سے مسکراتے ہوئے جولو سرکار سے پوچھا ——

لو تن چالیر بیٹھا کیمن لاگلو ؟ (نئے چاول کا میٹھا کیسا لگا ؟)

اس کی توقع کے خلاف جولو سرکار نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے۔

رقیہ نے پلٹ کر شیفالی کی طرف دیکھا۔ رقیہ حیران تھی جولو سرکار کی ناراضگی کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کہیں شیفالی نے ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی۔

شیفالی ابھی تک دروازے پر کھڑی دوپٹہ سے منہ چھپائے ہوئے ہنس رہی تھی۔

رقیہ کو یکایک شیفالی کی اس حرکت پر غصہ آگیا ——

حرامجادی "لوگ ٹی چولو گیلو راگ کورے اور توئی ہاسچش" (حرام زادی وہ شخص خفا ہو کر چلا گیا اور تو ہنس رہی ہے ؟)

شیفالی رقیہ کی خفگی کا کوئی اثر لئے بغیر کھلکھلا کر ہنس پڑی —— راگ کورے جائی نائی آیا، راگ کورے جائی نائی (خفا ہو کر نہیں گیا ہے آیا، خفا ہو کر نہیں گیا)

رقیہ کا پارہ اور بھی اوپر چڑھ گیا —— وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی شیفالی کے قریب پہونچی، اور اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچتی ہوئی غصہ میں چیخی، خفا ہو کر نہیں گیا تو کیا خوش ہو کر گیا ہے۔ بول، بول حرامزادی، کیا خوش ہو کر گیا ہے۔

رقیہ بار بار شیفالی کی چوٹی کو جھٹکے دے دے کر کھینچ رہی تھی۔ لیکن شیفالی شدت درد سے چیخنے چلانے کی بجائے ہنسے جا رہی تھی۔

رقیہ نے تنگ آکر اس کی چوٹی چھوڑ دی۔ پھر اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا —— بے یار کی ؟ (معاملہ کیا ہے ؟)

شیفالی ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

لو تن چالیر بیٹھا کھا بو کیمنے آیا، او رجے دانت نئے تھو تھا، (نئے چاول کا میٹھا کیسے کھائے گا آپ کے اس کے تو دانت ہی نہیں تھو تھلا ہے)

رقیہ نے مڑ کر جولو سرکار کی طرف دیکھا۔

جولو سرکار رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے گلی پار کر رہے تھے۔ ●

بقیہ، یگانہ کی زمین میں فراق کی ایک غزل

پر بھرپور نئی روشنی ڈالنے والا مضمون تھا۔ فراق اقبال شکن تھے نہ یگانہ غالب شکن تھے۔ دونوں بہت بڑے شاعر تھے

یگانہ اور فراق دونوں پر عالمی عروضیات سے ناواقف محض بزعم خود عروض داں حضرات حملے کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ وہ عروض کو جامد و ساکت سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور مزید براں وہ اردو کے گھسے پٹے عروض کو صحیفۂ آسمانی کا درجہ دیتے ہیں جو ان غزلوں پر عروضی پیچ و خم اثر انداز نہیں ہوتے۔ بہرکیف اردو عروضیات کو کسی مجدد کی ضرورت رہی ہے۔ فراق اور یگانہ کا عروضیات سے متعلق کیا نظریہ تھا اس پر علاحدہ مضمون لکھنے اور لغایات غائر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ●

—— ۰ ——

خورشید حیات

وقت کے احاطے میں

۳۱ دسمبر کی رات، کمرے کی تنہائی، ٹیبل پر رکھا لیمپ، اور گذشتہ سال یعنی آج تک کا کلنڈر یہ سب کے سب عمومی طور پر اپنے نقوش قائم کئے ہوئے تھے ۔ کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کلنڈر جو اب تک ٹنگا ہوا تھا نیچے گر چکا ہے ۔ اور اس کی ساری تاریخیں غائب ہو چکی ہیں ۔ ہر تاریخ کے خانے میں کچھ تصویریں ہیں ۔ جو ابھی مدھم مدھم ہیں ۔ کسی دھندلکے میں ہیں ۔ ہر ماہ کا صفحہ خالی ہی خالی ہے ۔ آخر اتنی سرعت کے ساتھ یہ تاریخیں کہاں گئیں ۔

ابھی ابھی بارہ بجے سے قبل یہ سب تاریخیں موجود تھیں ۔ کلنڈر ٹنگا ہوا تھا ۔ اور ابھی بارہ بجکر کچھ سکنڈ ہی ہوئے تھے کہ یہ سب بڑی سرعت کے ساتھ غائب ہو گئیں، میرے کمرے میں کوئی آیا بھی نہ تھا ۔ اور نہ ہی میں نے کوئی کیمیکل کا استعمال ان تاریخوں پر کیا تھا

آخر یہ کہاں گئیں ۔ ؟

کیوں کھو گئیں ۔؟ ؟

میں ابھی خوفزدہ اور کچھ متحیر ہو کر یہ سب غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک بہت سارے واقعات کی تصویریں یکے بعد دیگرے کلنڈر کے مختلف صفحوں اور صفحے کے خانوں میں بننے لگیں ۔ سال گذشتہ اکاسی کا سال کتنے واقعات گڑھ کر چلا گیا ۔ بے شمار انسانوں کی لاشیں، مختلف طبقات کے مسائل اور ان مسائل سے ابھرنے والی کشمکش، یہ سب کچھ دھندلکے سے باہر آ رہا تھا ۔ کہیں کوئی رامو چیخ رہا تھا ۔ کہیں کوئی محمود آواز دے رہا تھا ۔ زندگی مر مر کر جی رہی تھی ۔ یا جینے کے لئے مر رہی تھی ۔ اور سیاست کے اسٹیج پر مداری اپنا کرتب دکھا رہے تھے ۔ کہانی بن رہی تھی کہانی مٹ رہی تھی ۔ ارمان جگ رہے تھے ۔ ارمان سو رہے تھے ۔ انسانوں کا خون ہو رہا تھا ۔ کہیں دنگا اور فساد سے انسانیت کراہ رہی تھی ۔ بہار شریف آواز دے رہا تھا ۔ وہ بہار شریف جہاں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کا شرف پھیلا ہوا ہے ۔ وہ بہار شریف جہاں ملک بیان نے بھی انسانیت کی تعلیم دے کر ہندو مسلم کا دل جوڑا جا رہا تھا ۔ وہاں سہاگ اجڑ رہا تھا ۔ اور کسی مسیح وقت کا گھر مقتل کی جگہ استعمال ہو رہا تھا ۔ دنگے کی آگ پھیلی، رہبران وقت باخبر ہوئے ۔ وزیر اعظم نے معائنہ کیا ۔ ان بولتی لاشوں نے خاموش زبان سے سب کچھ کہہ دیا ۔ مگر سچ میں کتنی تلخی ہوتی ہے ۔ اس کو کون برداشت کر سکتا ہے ۔ پھر حالات معمول پر آگئے ۔ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا ۔ وقت کی نبض اپنے رفتار پر آگئی ۔ اور تاریخیں بدلتی رہیں ۔ اکاسی، بیاسی میں بدلا ۔ اور بیاسی تراسی میں بدل گیا ۔ بیاسی نے اکاسی سے مقابلہ کیا ۔ کیونکہ وہ اکاسی سے پیچھے رہنے والا نہیں تھا ۔

نرودہ کے فساد نے بہار شریف کے فساد کا جواب دیا ۔ اور پھر سال کے اختتام پر دنیا والوں نے جواہر لال اسٹیڈیم میں کھیل کود کر جشن منایا ۔ بھوکے ننگے ہندوستان کو دلہن بنا کر پیش کیا گیا ۔ کیونکہ ازل سے تصنع ہماری قسمت ہے ۔ اب فی زمانہ تصنع کے مظاہرے کے بغیر کام ہی نہیں چلتا ۔ بھیک مانگنے سے ایڈ لینے تک کا مسئلہ بھیس پر ہی منحصر ہے ۔ بھیس بدل، بدل کر بھیک مانگو تاکہ کوئی جانے نہیں کہ تم فقیر ہو ۔ عمارت کی شان بھی قائم رہے اور فاقہ کا مسئلہ بھی حل ہوتا رہے ۔ ہم جدید قدیم لوگ جو بھول کر چکے وہ یقیناً ہم نہیں کریں گے ۔ بہار نے بھی فاقہ کشوں کے لئے لوٹ مار کا سامان مہیا کیا ہے ۔ اسی کی د

مہاتما گاندھی سیتو ہے۔

مہاتما گاندھی سیتو کتنی بدلی ہوئی تاریخوں کی یادگار ہے کتنی تاریخوں کو کھو دینے کے بعد حاصل ہوا ہے۔ شہیدوں کا یادگار معصوموں کے خون کا تحفہ، بہار کے نام تھا کہ اس نے اُتر اور دکھن کے فرق کو مٹا دیا تھا۔ فرق مٹانے کی کوشش تو نہ جانے صدیوں سے ہو رہی ہیں۔ اور ہمیشہ پیغمبران وقت نے اس کوشش میں اپنی جانیں گنوائیں ہیں۔ مہاتما گاندھی سیتو کی تعمیر میں اگر جانیں گئیں تو کیا ہوا۔ اتر دکھن کا فرق مٹ گیا۔ کیا یہ انسانیت کی کامیابی نہیں ہے۔ مگر کون ہے جو اس کامیابی کو گلے لگائے۔ ہم نے تحفہ قبول کیا۔ اور پُل پر لوٹ اور قتل کے لئے آسانیاں فراہم کردیں لٹیرے کل سے زیادہ مطمئن ہیں۔ ہم تو بہار کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور لوگ اس خواب کی تعبیر برعکس پیش کر رہے ہیں

تعبیریں تو برعکس ہوا کرتی ہیں خواب کون سا سچا ہوتا ہے؟

کون سا خواب سچا ہوا ہے ؟

مگر نہیں کچھ خواب سچے بھی ہوتے ہیں۔

سرکار نے اپاہجوں کے لئے کتنی سہولتیں فراہم کردی ہیں کبھی انھوں نے آزاد ہندوستان کا خواب دیکھا ہوگا۔ اور اپنے لئے سہولتوں کا بھی تو اس کیا ہوگا۔ جیلوں کے خواب تو سچے ہوئے۔

مگر میں ابھی یہ سب لاشعوری طور پر غور کر رہا تھا کہ اچانک سڑک پر سردی سے کراہتے ہوئے ایک انسان کی آواز آئی

یہ ایک لنگڑا بھکاری تھا۔ جو اپنے سونے کی ایک مخصوص جگہ فٹ پاتھ پر بنائے ہوئے تھا۔ آج کچھ دکانداروں نے میونسپلٹی والوں کو ملا کر فٹ پاتھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اب اس بھکاری کے لئے سونے کی جگہ باقی نہ تھی۔ اب وہ کسی دائمی سونے کی جگہ کی تلاش میں آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ کہ اچانک سردی کے مارے بے ہوش ہو کر شاہراہ پر گر پڑا تھا کراہ رہا تھا کہ شاید اس کی آواز اپاہجوں کے سال منانے والے کارکنوں کے کان میں پڑ جائے مگر یہ آواز تو اس قدر خفیف ہو چکی تھی کہ خود اپنے آپ میں کھوئی جا رہی تھی۔ انسان کہاں کوئی تھا جو اس کو دیکھتا۔

کچھ کتے بھونکے، اور رات اور بھی بھیانک ہوگئی۔ بوڑھے کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ اور وہ ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ سونے کی دائمی جگہ اسے مل چکی تھی۔ کتے اسے دیکھ کر بھونک رہے تھے۔ شاید اس کے سکون پا جانے پر رشک کر رہے تھے۔

تاریخ بدلتی جاتی ہے، جلسے ہوتے ہیں۔ انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ کسی کو ویرگتی پراپت کرنے کا تمغہ دیا جا رہا ہے اور کسی کی ہمت افزائی کے لئے صرف خالی خولی الفاظ ادا کئے جا رہے ہیں۔

اسٹرائیک ہو رہی ہے۔ نعرے لگ رہے ہیں۔ پھر کچھ روٹی کے ٹکڑے دے کر نعرہ لگانے والوں کو خاموش کر دیا جاتا ہے۔ جمہوریت کا فروغ اسی میں ہے۔ کہ شعبۂ حیات کے ہر ایک اعلیٰ و ادنیٰ کارکن کو کچھ دے کر مطمئن کر دیا جائے۔ انھیں سلا دیا جائے کہ وہ باغی نہ بن جائیں۔ اور حکومت کے عملے شب خون لگاتے رہیں۔ ٹیکس بڑھتی رہے۔ چیزوں کی قیمت دوگنی اور تین گونی ہوتی رہے۔ سیٹھ ساہوکار خوش ہوں۔ اور سماج کا ناسور پلتا رہے۔

تاریخ پھر بدل گئی ہے میرے بھائی! تاریخ بدلتی ہی رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کیا پھر اس تاریخ کا CIRCULAR MOTION ہمیں ماضی کی خوشحالیوں اطمینان اور سکون کی جانب لے جائیگا۔

وقت کس گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرتا ہے، اس کی رفتار کیسی ہے۔ کل صبح پھر سے کلنڈر آباد ہوں گے تاریخیں نیا جنم لیں گی۔

فن کار انہیں دیکھتا ہے۔ وقت کے دھارے کو گرفت میں لینے کے لئے اپنی انگلیاں خون دل میں ڈبو لیتا ہے۔ تاریخ بدل جاتی ہے۔ نیا سال شروع ہوتا ہے۔ مگر ایک ننگا سے

بقیہ صفحہ ۹ پر

صباح الدین ہاشمی

دیوار کی کہانی

"جانتے ہو ــــ؟ ان کی بستی بے چراغ ہوگئی ہے۔"

"وہ اپنی بستی سے ہجرت کر چکے ہیں۔"

"خدا کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا"

"دیر ہی سے سہی ــــ اس کا پھل ضرور ملتا ہے"

"ان کو بھی اپنی محنت کا پھل مل گیا ہے ــــ وہ دیوار ٹوٹ گئی ہے"

"بوڑھے نے بہت ہی گہرے لہجے میں کہا۔"

"کون سی دیوار ــــ؟ دوسرے کے لب ہلے۔"

"تم اس دیوار کے بارے میں نہیں جانتے ؟ کچھ بھی نہیں ــــ؟ کیا تم نے کسی کتاب میں اس کا قصہ نہیں پڑھا؟ اور اگر کتاب میں نہیں پڑھا تو بچپن کی کہانیاں یاد کرو ــــ ہو سکتا ہے دادی اماں نے سوتے وقت سنایا ہو۔"

نہیں میرے بھائی ــــ مجھے کچھ بھی دیوار کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ اس نے لاپرواہ لہجے میں جواب دیا۔

وہ تیسرے سے مخاطب ہوا ــــ تم جانتے ہو اس دیوار کے بارے میں ــــ؟ وہ ٹوٹ گئی ہے۔

کون سی دیوار ــــ؟ مجھے کسی دیوار کی خبر نہیں ہے نہ ٹوٹنے کی ــــ اور نہ بننے کی ــــ تیسرے نے بیڑی کا آخری کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

تو تم سب جاہل ہو ــــ بالکل جاہل ــــ یہ جاہلیت ہی تو ہے کہ اس دیوار کا تمہیں پتہ نہیں ہے، بوڑھے نے چہرے کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے خفگی سے کہا۔

اور اپنے ساتھیوں سے منہ پھیر کر آواز لگانے لگا۔

بھائیو، تم جانتے ہو ــــ؟

تم جانتے ہو بھائیو ــــ؟

بوڑھے کی آواز سنتے ہی کچھ پیروں میں بریک لگے، بوڑھے کا جائزہ لیا۔ گرد سے دبی ہوئی بوسیدہ قمیض، چہرے پر برسوں کی تھکن، غبار سے لپٹے ہوئے بے ترتیب بال،

ارے یہ کوئی لیڈر تو ہے نہیں ــــ کہ فرقہ وارانہ فسادات اور اقتصادی مسائل کا حل بتائے گا ــــ شاید یہی سوچ کر ان کے پیر پھر گردش کرنے لگے۔

اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس وقت نہ ہو۔ لیکن ایسا تھوڑی ہی ہے کہ سب وقت کے ہاتھ میں ہوں ــــ شاید ویسے ہی لوگ جن کے ہاتھ میں وقت تھا اس کے پاس دھیرے دھیرے جمع ہوگئے۔

تمہیں کس چیز کی تلاش ہے۔ بھیڑ سے ایک آواز ابھری،

مجھے کسی چیز کی تلاش نہیں ہے۔ ــــ میں اس دیوار کی کہانی جاننا چاہتا ہوں۔

کس دیوار کی کہانی ــــ دوسری آواز نے بوڑھے کا تعاقب کیا

اس دیوار کی کہانی جسے سکندر نے بنوایا تھا۔

یہ سکندر کس بلا کا نام ہے ــــ؟ قہقہے کے ساتھ تیسری آواز ابھری اور بوڑھے کو آپے سے باہر کر دیا۔

تم سب برباد ہو جاؤ گے ــــ جانتے ہو ــــ؟ وہ قوم جو اپنی تاریخ کو بھول جاتی ہے برباد ہو جاتی ہے اس کا وجود مٹ جاتا ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا

تم سب برباد ہوجاؤ گے ۔ بوڑھے کی گردش کرتی ہوئی لال آنکھیں اور گردش کرنے لگیں ۔

ارے یہ پاگل ہوگیا ہے ـــــ جیل کی دیوار ٹوٹ رہی ہے ۔ اس کو بڑا بنایا جا رہا ہے ۔ وہی دیوار اس کے ذہن میں آگئی ہوگی ۔ مجمع سے ایک سرگوشی ابھری ۔

جیل کی بات سن کر بڈھا کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا ۔

ہاں ! تمہاری پوری زندگی جیل بن گئی ہے ۔ تم جیل کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے ۔ جیل کا سایہ تمہاری زندگی پر ہی نہیں ـــ تمہارے ذہن ـــ تمہارے دل ـــ تمہاری فکر ـــ تمہارے قلم سب پر پڑ گیا ہے ـــ تم چاہتے ہوئے بھی اس قید سے آزاد نہیں ہو سکتے ـــ اور کہو چاہو گے بھی تو قیدی کی طرح ـــ آزادی تمہاری قسمت میں نہیں ہے ـــ اور اچھا ہے کہ تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہے ۔ لمبی تقریر کے بعد بوڑھے کے ہونٹ آرام کرنے لگے ۔

میں جانتا ہوں دیوار کی کہانی ـــ بوڑھے کے پاس ہی کھڑے ٹوپی والے نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

بوڑھے کے چہرے کا بوجھ کم ہوگیا ۔ اور بھچے ہوئے ہونٹ جنبش کرنے لگے ۔ تو بتاؤ ـــ ؟ بتاؤ میرے بھائی ـــ جانتا تو میں بھی ہوں ۔ مگر اس پر شبہ ہونے لگا ہے ۔ اسے اب مانتا نہیں ہوں ۔ مجھے وہ جھوٹی لگتی ہے ۔ شاید تمہیں صحیح معلوم ہو ۔

ٹوپی والے کی آواز بوڑھے کے ساتھ کھڑی ہوئی بھیڑ کو مخاطب کرنے لگی ۔ سکندر ذوالقرنین نے لوہے اور تانبے کی آمیزش سے ایک دیوار بنوائی تھی ۔ یہ دیوار تبت اور چین کے باشندوں کو یاجوج ماجوج کے خونخوار حملوں سے بچنے کے لئے بنائی گئی تھی ۔ یاجوج ماجوج ایک وحشی قوم کا نام ہے جو سکندر کو کوہ قاف کے پہاڑی سلسلوں کے درے میں ملی تھی ۔ یاجوج ماجوج بہت ہی خونخوار قوم ہے ۔ اسی لئے یہ اب بھی اس دیوار کو توڑنا چاہتے ہیں ۔ اسے توڑنے کے لئے یہ رات بھر دیوار کو چاٹتے رہتے ہیں ۔ اور جب کاغذ جیسی باریک بچ جاتی ہے انہیں نیند آنے لگتی ہے اور یہ تھک کر سو جاتے ہیں ۔ جب ان کی آنکھیں کھلتی ہیں تو اللہ پاک کی قدرت سے ویسی ہی دیوار ان کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے ۔ اور یہ پھر چاٹنا شروع کر دیتے ہیں ۔ یہ سلسلہ ہزاروں سال سے چلا آرہا ہے "

ٹوپی والا اپنی کہانی ختم کر کے رک گیا ۔

ہاں ! وہی دیوار ـــ اور کیا جانتے ہو اس دیوار کے بارے میں ـــ ؟ اور کیا جانتے ہو ـــ ؟ بوڑھے نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے کہا ۔

ٹوپی والے کی انگلیاں اس کے ماتھے پر گردش کرنے لگیں ۔ اور تھوڑی دیر کے بعد گویا ہوا ـــ ! ہاں ـــ ! اس دیوار کے بارے میں نہیں ـــ لیکن اس قوم کے بارے میں جانتا ہوں ۔

ہاں ! ـــ ہاں ـــ ! بتاؤ ـــ جو جانتے ہو بتاؤ ۔

بوڑھے کی آنکھیں ایک بار پھر گردش کر گئیں ۔

اس قوم کے بارے میں میں نے یہ پڑھا ہے کہ اس قوم کا وجود آدم کے صلب سے ہے ۔ لیکن حوا کے بطن سے نہیں ـــ شاید اسی وجہ سے ان کا قد ڈیڑھ بالشت کا ہوتا ہے ۔ اور ان کے کان ـــ ان کے کان تو اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ایک کو اوڑھتے ہیں اور دوسرا کو بچھاتے ہیں ـــ ہاں ! اس دیوار کے سلسلے میں ایک اور بات ہے کہ وہ دیوار قیامت کے دن ٹوٹ جائے گی اور وہ ساری دنیا پر حملہ کر دیں گے ـــ اور اپنی خونخوار زبان سے سب کو چاٹ جائیں گے ۔

اس کے سوا مجھے کچھ معلوم نہیں ہے ۔ ٹوپی والے نے بوڑھے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔

اور جو جانتے ہو وہ سب جھوٹ ہے ۔ بوڑھے نے خفگی سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا ۔ اور بوڑھے کی ایک ایک آواز ایک بار پھر مجمع کو مخاطب کرنے لگی ۔

بقیہ صفحہ ۲۷ پر

کلیم احمد (بنگلہ دیش)

موذی

دن ڈھل رہا تھا بوڑھا خاموش بیٹھا تھا۔ آج صدمے نے اسے مزید بوڑھا کر دیا تھا۔ غم و غصہ بوڑھے چہرے سے مترشح تھے گھر کے دروازے بند تھے۔ رہ رہ کر اندر کمرے سے اس کی بیٹی لوزان کے سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔ بوڑھا برآمدے کے کنارے بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ آج اس کا برسوں کا اعتماد ریت کے گھروندے کی مانند گر گیا تھا۔ اس نے کتنی مشقت سے بن ماں کی بچی کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ اس کو اپنی بیٹی پر کتنا ناز تھا۔ لیکن کیا وہ اب اٹھتی ہوئی انگلیوں کا متحمل ہو سکے گا؟ اس تصور کے ساتھ ہی اس کا بوڑھا جسم کانپ رہا تھا۔

دروازے کھڑکیاں بند رہیں گی۔

لیکن کب تک!

دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو۔ ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اور وہ کانپ کر رہ گیا۔

نہیں دروازہ نہیں کھلے گا۔

دروازہ کھولو.....

نہیں دروازہ نہیں کھلے گا..... کبھی نہیں۔

تو کیا اپنی لوزاں کو زمین کھود کر اپنے ہاتھوں زندہ دفن کر دوں۔ لیکن وہ زندہ کب ہے پھر اس کے سوا دوسری کوئی صورت بھی تو نہیں۔ اس نے پھاوڑا اٹھایا۔ اور آنگن کے بیچ آ کھڑا ہوا۔ اٹھے ہوئے ہاتھ رک گئے..... ابھی نہیں..... پھاوڑے کی بے ہنگم آواز دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر لے گی۔ اور پھر تم گرفتار کر لئے جاؤ گے..... بزدل

نہیں پھاوڑے کی آواز نہ صرف دوسروں کو متوجہ کرے گی بلکہ بہت کچھ کہہ دے گی۔

تو

پھندہ ایک آسان ترکیب۔

اس کے بعد

کئی دنوں تک جب دروازہ نہیں کھلے گا تو لوگ خود اس جانب متوجہ ہوں گے۔

اور پھر ایک ساتھ دو لاشیں برآمد ہوں گی۔ ایک بوڑھی اور ایک جوان لاش!

ہاں ٹھیک سمجھے۔

اور پھر یہ خبر اخبار والے لے اڑیں گے اور خوب سرخیاں جمائیں گے۔ بے غیرت بیٹی کے باغیرت باپ نے......

نہیں ایسا نہ کہو، لوزاں بہت معصوم ہے تم اس کی عمر نہیں دیکھتے کیا اس کا معصوم چہرہ اس کی بے گناہی کا ثبوت نہیں دیتی۔

پھر مجرم کے گرفتاری میں قانون کا ہاتھ بٹاؤ۔

اوہ..... تم چاہتے ہو کہ میں اپنے خاندان کی عزت کی دھجیاں خود اپنے ہاتھوں اڑا دوں۔

سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر مجرم نہ پکڑا گیا۔ تو درندگی ہر طرف پھیل جائے گی۔ اور تیری لوزاں جیسی نہ معلوم کتنی لوزاں اس درندگی کے بھینٹ چڑھ جائیں گی۔

لیکن اس سے فائدہ؟ کیا میری لوزاں بچ جائے گی،؟

کیا یہ سماج اپنے بندھے اصولوں کو توڑ کر اس معصوم کو معاف کر دیگا اور بڑھ کر تحفظ دیگا۔ نہیں کبھی نہیں۔

اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اور سانس خود بخود دھیمی لینے لگا۔

اچانک احساس ہوا کسی نے دروازہ ہولے سے کھولا ہے ۔
سفید کپڑوں پر لگے داغ دور سے نظر آجاتے ہیں ۔ وہ تیزی سے
آگے بڑھا ۔ دروازہ بند تھا ۔

دروازہ نہیں کھلے گا ۔

کب تک ۔

تم کون ہو ..... چاہتے کیا ہو ۔

دروازہ کھولو ۔

نہیں دروازہ نہیں کھلے گا ۔

بند دروازے محفوظ ہوتے ہیں ۔

ہاں ۔

تو سب اپنے دروازے بند کرلیں ۔

وہ کیوں ....

اگر مجرم پکڑا نہ گیا تو دروازے اسی طرح بند ہوتے جائیں گے ۔ اور معصوم بے گناہ بیٹیاں اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ قبر میں اتاری جائیں گی ۔ اور درندہ آزادی کے ساتھ دندناتا پھرے گا ۔

پھر .....

مجرم کو گرفتار ہونا چاہئے ۔

لیکن مجرم ؟

مجرم ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس انسانی جسم میں ایک شیطانی روح حلول کر گئی ہے ۔ اور وہ درندہ ہو گیا ہے ۔ ایک آدم خور درندہ ، اب کے بعد دیکھے حملہ کرے گا ۔ اس کے خونی پنجہ سے عفت ، سلطانہ ، رابعہ کوئی محفوظ نہیں رہ سکیں گی ۔

پھر .....

اسے گرفتار ہونا چاہئے ۔ گرفتاری کے بعد شارع عام پر کھڑا کرکے سنگسار کردینا چاہئے ۔ اور چاروں طرف سے پتھروں کی بارش اس وقت تک ہوتی رہنی چاہئے ۔ جب تک کہ اس کے جسم سے اس کا ایک ایک عضو الگ نہ ہو جائے ۔

لیکن وہ ہے کون ؟

ہمارے اور تمہارے جیسا انسان ۔

کیا کوئی انسان ایسے فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے ۔

ہاں ! اس وقت جب انسانیت پر شیطانیت طاری ہوتی ہے ۔ اور اچھے برے کی تمیز باقی نہیں رہتی ۔ اور وہ درندہ بن جاتا ہے ۔

لیکن وہ درندہ .....

کوئی بھی ہو سکتا ہے ۔ انور جیسا شریف اور نیک خصلت لڑکا بھی ۔

نہیں تم غلط کہتے ہو ۔ انور ایک شریف اور سلجھے ہوئے ذہن کا ایک اچھا لڑکا ہے ۔ اور پھر اس کی رگوں میں ایک شریف خون دوڑ رہا ہے ۔ اس فعل کا مرتکب وہ نہیں ہو سکتا ہے ۔ پھر وہ ..... وہ تو نوراں کا منگیتر بھی ہے ۔ اور چچا زاد بھائی بھی ۔

لیکن وہ ہے کہاں ۔؟ وہ تو تمہارے ساتھ ہی رہتا ہے

ہاں ..... لیکن ۔

لیکن کیا ۔ وہ نہیں ہے وہ فرار ہو گیا ہے ۔

ہو سکتا ہے کسی کام میں پھنس گیا ہو ۔ کوئی حادثہ پیش آگیا ہو ۔

مجرم کوئی عادی مجرم نہیں ۔ کسی وقتی جذبے پر شیطانیت غالب آگئی ۔ اور اب شرمندگی کی وجہ کر .....

تم کہنا کیا چاہتے ہو ؟

اتنے نا سمجھ بھی نہیں ہو ۔ تمہارا ذہن ٹھیک دوڑ رہا ہے جب تم آئے تو ہر چیز ٹھیک اپنی جگہ معمول کے مطابق درست تھی نوراں نے ہی کھٹکھٹانے پر چٹخنی گرائی تھی ۔ اور پھر پانی لا کر دیا تھا ۔ تم نے خاموشی کے ساتھ منہ ہاتھ دھونے کے بعد کھانا کھایا اور آرام کی غرض سے لیٹ گئے تھے ۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد نوراں سے پوچھا تھا ۔ اب تک انور نہیں آیا ۔

دیر سے آئیں گے۔

بٹیا ذرا تیل گرم کرنا۔ درد پھر بڑھ گیا ہے۔

روز ہی درد رہتا ہے اور روز ہی تیل گھستے ہو، فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ دو قدم پر ڈاکٹر صاحب ہیں۔ بڑھ کر دوا لے لو۔

نہیں بٹیا یوں ہی ٹھیک ہو جائے گا بس ذرا تیل گرم کر لے آ۔

بابا روز ہی درد رہتا ہے۔ دوا لے ہی لو۔

ہاں بٹیا ٹھیک کہتی ہو۔ دوا لے ہی لوں۔ کہیں درد زیادہ نہ بڑھ جائے۔ آج کچھ تکلیف زیادہ ہی۔

اور جب تم واپس آئے تو ہر چیز اپنی جگہ سے سرکی ہوئی تھی۔ لوزاں کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ تمہارے پانی کے دو بار چھینٹوں نے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ تمہیں دیکھتے ہی "بند ٹوٹ گیا بابا" اور ایک چیخ کے ساتھ گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ بے ہوشی سے پہلے اتنا ہوش تھا کہ اپنا چہرہ چھپا لے۔ تم نے چاہا کہ ہاتھ الگ کر دوں، مگر ہاتھ چہرے پر سختی سے جمے ہوئے تھے۔

لیکن انور

وہ موجود نہیں تھا۔ وہ تو فرار ہو گیا۔

لیکن۔

سنو گھٹن بہت ہے، دروازہ کھول دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اندر معصوم لوزاں کا دم گھٹ جائے۔

یہ تو اس کا مقدر بن چکا ہے۔

تم پاگل ہو گئے ہو۔

ہاں پاگل ہو گیا ہوں، دیکھو اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اور اب میں پھاوڑے کی مدد سے ایک قبر تیار کر دوں گا۔ اور پھر خاموشی سے بند کر دوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔

لیکن کل مشرق سے طلوع ہوتا سورج جب یہ پوچھے گا کہ یہ آنگن اتنا سونا سونا کیوں ہے؟ لوزاں کہاں ہے؟ تو کیا جواب دو گے۔ کیا یہ کہو گے کہ لوزاں کسی کے ساتھ فرار ہو گئی۔

نہیں۔

پھر کیا کہو گے؟

وہ اپنے ننہیال گئی ہے۔

تمہارا یہ جھوٹ کب تک قائم رہے گا؟

دو چار مرتبہ کے بعد پھر کچھ پوچھنا لوگ مناسب نہیں خیال کریں گے اور پھر سب لوزاں کو بھول جائیں گے۔

اور تم بھی۔

نہیں۔

پھر دیر نہ کرو وہ باہر آنا چاہتی ہے اسے اس کا حق نہ چھینو

لیکن۔

وقت نہ برباد کرو۔ کہیں بعد کو پچھتاوا بھی ہاتھ نہ آئے دروازہ کھول دو۔

نہیں میں لوگوں کی اٹھتی ہوئی انگلیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہ اس موذی کو بھی ختم کر دوں۔ نہ جانے میری طرح اور کتنے گھرانے کو یہ موذی ڈسے گا۔ اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چاہا کہ انور کے کمرے کو دھکا دے کر کھول دے۔ اور اس موذی کا خاتمہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کر دے۔

لیکن اچانک کمرے سے اٹھتی ہوئی سسکیوں کی آواز پر چونک پڑا۔ اور اس نے انور کے کمرے کے دروازے پر اپنے کان لگا دیئے۔ اندر کمرے سے انور کے سسکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

دوست میرا کوئی قصور نہیں۔

لیکن تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا دوست اس سے پوچھ رہا تھا جس پر اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا دوست میں وی، سی، آر پہ بلو پرنٹ دیکھ کر آیا تھا۔ اور پھر میں اپنے جذبات پر۔

بلو پرنٹ۔۔۔۔ بلو پرنٹ۔۔۔۔ اچانک اسکے کان بج اٹھے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ موذی انور نہیں ہے بلکہ [illegible]

انشائیہ

مشرور آروی

تہذیب

قدیم کی کتابیں ہوں یا مذاہب، مدارس ہوں، یا کھیل کے میدان، ادب کی محفل ہو یا پارلیامنٹ، دفاتر ہوں، یا ڈنر۔ پارٹی ہر جگہ۔ ہر مقام پر رقاصۂ تہذیب رقص کناں ہے۔ اور لوگ ہیں کہ اس کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ بچھے جاتے ہیں۔ مگر تہذیب کسی کو لفٹ نہیں دیتی ہے۔ مگر ہر کوئی اس سے اپنی گہری شناسائی کا دعویٰ کرتا نظر آتا ہے اور دوسروں کو اپنے سے کمتر تصور کرتا ہے۔

پیغمبران، مذہبی رہنماؤں، علمائے کرام اور سادھو سنتوں نے تہذیب کے دامن کو مضبوطی سے تھامنے کا درس دیا ہے۔ ان کا درس مقدس سر آنکھوں پر۔ لیکن کبھی کبھی ان کے درس کو طاق پر رکھنے اور دامن کو چھوڑنے میں سے اپنی خیریت نظر آتی ہے۔

اب آپ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ ڈنر پارٹی ہے۔ تمام بزرگوں کے ساتھ میرے جیسا دور روٹی میں سیر ہو جانے والا شخص بھی ہے ادھر میں ڈنر سے کر انتظار کے شدید کرب سے گزر رہا ہوں۔ کہ لوگ اب اٹھیں اور اب اٹھیں۔ مگر ادھر کچھ بزرگوں کی یہ حالت کہ پلیٹ مستقبل قریب میں خالی ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاتھ پلیٹ سے منہ تک کا فاصلہ تیزی سے طے کرتے ہوئے اور نگاہیں اردگرد رکھی مرغ و ماہی کے پیالوں کا تعاقب کرتی ہوئی۔ ایسی حالت میں اگر میں "بیک، ٹو، پویلین" ہونے کا خیال دل میں لاتا ہوں اور ساری تہذیب کو طاق پر رکھ دینے کا فیصلہ کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں۔

ہر مقام اور دنیا کے ہر خطہ پر تہذیب مختلف صورت میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور اس کی تعظیم نہ کرنے والوں کا انجام بھی مختلف ہوتا ہے۔ سیرۃ النبیؐ کے جلسہ میں اگر کوئی صاحب سگریٹ کے مرغولے اڑانا شروع کر دیں تو تہذیب کی ہتک عزتی کے الزام میں ان پر فتویٰ جہنم نازل ہو جاتا ہے۔ پارلیامنٹ تہذیب شکنی کا جواب مارشل کے ذریعہ ہاؤس بدر کر کے دیتی ہے۔ تو دفتر سسپنڈ یا ڈسچارج کا حکم نافذ کر کے اور تعلیمی ادارے رسٹی کیٹ کر کے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کا ہر فرد خود کو مہذب اور دوسرے کو بدتہذیب سمجھتا ہے۔ آقا نوکر کو اور نوکر آقا کو۔ اساتذہ طلبا کو اور طلبا اساتذہ کو، حکمران جماعت اپوزیشن کو اور اپوزیشن حکمراں طبقے کو، نیتا عوام کو اور عوام نیتا کو، اور سبھی کو اپنے تہذیب یافتہ ہونے کا کامل یقین ہے۔ اور یہی کامل یقین اب تک عالمی پیمانے پر دو عظیم جنگ کرا چکا ہے۔ اور تیسرے کی تیاری میں مصروف ہے تہذیب کی انتہا جنگ ہے اور جنگ کے بطن سے نومولود تہذیب کا جنم ہو جاتا ہے۔ پتھر کے زمانہ سے لیکر آج کے سائنسی دور تک نہ جانے کتنی تہذیبوں سے اہل دنیا کو سابقہ پڑا ہے۔ سکندر ساری دنیا کو تہذیب سکھانے کے ارادہ سے "تسخیر عالم" کے خیال سے نکلا تھا۔ مگر درمیان میں ہی ملک الموت نے اسے تہذیب سکھا دی، چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، مسولینی جتنے بھی تاناشاہ ہوئے سبھی دنیا کو تہذیب کا درس دینے کے لئے - IMDEREA MAS IL - کے راستہ پر گامزن ہوئے۔ اور ساری دنیا میں لاٹھی چارج کرا دیا۔

اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب بغیر لاٹھی کے سہارے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔ لاٹھی اور تہذیب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تہذیب لاٹھی

کا سہارا تلاش کرتی ہے۔ اور لاٹھی صرف تہذیب کی حمایت میں ہی اٹھتی ہے۔

تہذیب شوکیس میں رکھی اس موہنی مورت کی طرح ہے جسے جو بھی لباس پہنا دیجئے پہن لیتی ہے۔ وہ انکار نہیں کرتی ہے خوشی خوشی اپنے جسم کی زینت بنا لیتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس لباس میں حسن نظر آتا ہے۔ وہ محظوظ ہوتے ہیں۔ اور بعض منہ بنا لیتے ہیں

تہذیب کے دو زبردست رقیب ہیں۔ مذہب اور فیشن پرستی۔ دونوں تہذیب کو اپنا شکار بنانا چاہتے ہیں۔ دونوں اس پر اپنے اپنے دعوے کرتے نظر آتے ہیں۔ مذہب جب تہذیب سے متاثر ہوتا ہے۔ تو سرسید احمد خاں "تہذیب الاخلاق" کی ادارت شروع کر دیتے ہیں۔ اور فیشن پرستی کو تہذیب پر غالب ہوتے دیکھ کر علامہ اقبال با دل ناخواستہ یہ فتویٰ دینے لگتا ہے

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کی قدیم روایات اور گھسے پٹے اصولوں پر ہی اگر دنیا کی اکثریت قائم رہتی تو کبھی مشہور زمانہ صنعتی انقلاب وجود میں نہ آتا۔ انواع و اقسام کی مصنوعات اور ملبوسات وجود میں نہ آتے۔ خواتین گھر میں قید رہتیں۔ مگر خدا بھلا کرے نئی تہذیب کا اس نے دنیا کا نقشہ ہی چشم زدن میں بدل ڈالا۔ اور اسی نئی تہذیب کے باعث ہی آج دنیا اس قدر حسین و رنگین نظر آتی ہے

چنگیز، ہلاکو، ہٹلر اور مسولینی اگر تہذیب کے وہی پرانے عہد نامہ قدیم پر گامزن رہتے۔ تو کیا وہ کبھی اپنے اپنے ملک کے سیہ و سفید کے تنہا مالک ہوتے۔؟ بے چارہ ہٹلر میونخ (MUNICH) میں کسی دکان پر بیٹھا پالش ہی کرتا رہ جاتا۔ لیکن اس نے تہذیب کا دامن چھوڑا۔ لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کے انسانیت نواز اصولوں سے توبہ کی تو جرمنی کا حکمراں بن گیا۔

روسو موجودہ دور کا پہلا تہذیب شکن تھا۔ جس نے عوام کو تہذیب کے پرانے اصولوں اور شخصیت پرستی سے دستبردار ہونے پر آمادہ کیا۔ اور جب عوام نے تہذیب سے کنارہ کشی اختیار کی تو مشہور زمانہ فرانسیسی انقلاب رونما ہو گیا۔

دنیا میں مزدور تنگ دستی اور ظلم و ستم کے شکار تھے۔ مگر وہ اس قدر تہذیب یافتہ تھے کہ سرمایہ داروں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے بولنا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے۔ مگر تہذیب کے پرانے اصولوں کو گلے سے لگائے ہوئے تھے۔ ایسے دور میں مارکس کی تشریف آوری ہوئی، اور اس نے دنیا بھر کے مزدوروں کو روسو کے اصولوں پر چلتے ہوئے تہذیب شکنی کا نعرہ دیا۔ مزدوروں نے مارکس کی آواز پر لبیک کہا۔ تو ۱۹۱۷ء میں روس کا مشہور انقلاب ہو گیا۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ جو بے چارے تہذیب کا دامن سختی سے پکڑے رہتے ہیں۔ انہیں دنیا بھی نیک سمجھ کر مذاق اڑاتی ہے۔ اور وہ خود بھی تنگ دستی کا شکار رہتے ہیں۔ لیکن جس نے عقل سے کام لیا اور تہذیب سے منہ موڑا وہ فائدے میں رہا۔

"خواجہ اہل فراق" یعنی ابلیس لعین کو ہی لیجیے جب تک وہ تہذیب کا دامن تھامے رہا، ایک گمنام فرشتہ ہی بنا رہا۔ مگر جیوں ہی اس نے تہذیب کا پرانا لبادہ اتار پھینکا۔ چشم زدن میں فرشتہ سے شیطان ہو گیا۔ ایک گمنام فرشتے سے اچانک انٹرنیشنل فیم (INTER NATIONAL FAME) کی ہستی بن گیا۔ ازل تک اس کی یہ ہستی برقرار رہے گی۔ اور اس کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے پیغمبران اور اولیائے کرام سے لے کر ایک ادنیٰ آدمی تک اس سے پناہ مانگتا ہے اور خوف کھاتا ہے۔

مذہب تہذیب کا درس دیتا ہے۔ مگر عشق کے مذہب میں گناہ کبیرہ کا درجہ رکھتی ہے۔ شہنشاہ برطانیہ ایڈورڈ نے شرم و حیا کو چھوڑا اور شاہی تہذیب سے منہ موڑا تو عاشق صادق بن گیا۔ ورنہ اسی تہذیب کے چکر میں قیس آمری

بنگلہ: رفیق آزاد (بنگلہ دیش)
اردو: احمد سعدی (بنگلہ دیش)

میں ایک قبر کھود رہا ہوں

قبر نئی اک کھود رہا ہوں
کس کو اس میں دفن کروں گا — مجھکو اس کا علم نہیں ہے۔
میرے ابا، میری امی، دونوں ہی زندہ ہیں اب تک
دونوں ہی دس بیس برس تک اور بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔
مجھکو کامل اس کا یقیں ہے — ان کے لئے یہ قبر نہیں ہے
میرا ایک سگا بھائی ہے
اس کو اک معمولی سی بیماری بھی ہے
لیکن اس کو جگ جگ تک میں زندہ اور خوش
دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں — اس کے لئے یہ قبر نہیں ہے
میری ایک بہن بھی ہے
جو یکا تنہا اپنے گھر میں
شوہر کی بے وقت اچانک موت سے
افسردہ رہتی ہے — اس کے لئے یہ قبر نہیں ہے
میری نیک رحم دل بیوی
میری روح کو جو تسکین بہم پہونچا کر
میرا سہارا بن جاتی ہے — اس کے لئے یہ قبر نہیں ہے
میرے بچے
میری تمناؤں اور خوشیوں کا مرکز ہیں — ان کے لئے یہ قبر نہیں ہے
سورج مکھی کے پھول کی صورت
میری محبوبہ کا چہرہ — اس کے لئے یہ قبر نہیں ہے
اپنی ہلاکت اپنے ہاتھوں خود کرنے کا
میرا ارادہ بھی تو نہیں ہے
ظاہر ہے پھر — میرے لئے یہ قبر نہیں ہے
لیکن ایک حقیقت ہے یہ
قبر نئی اک کھود رہا ہوں
کس کو اس میں دفن کروں گا — مجھکو اس کا علم نہیں ہے (آمی اکٹی کوبر کھوڑچی)

نصر قریشی

نئے سال کی دعا

میرے مولا! دشتِ جاں کو موسمِ گل کی راحت دے
پیاسی دھرتی کے ہونٹوں کو قطرہ قطرہ لذت دے
لمحہ لمحہ عمرِ رواں کی مدت گھٹتی جاتی ہے
روز و شب کو صدیوں صدیوں روشن روشن مدت دے

روشنیوں کے شہر کو نگلے اندھیاروں کا اژدھا
ظلمت ظلمت سورج چمکے، شب کو نور کی خلعت دے
جینے والے جیتے جیتے تھک بیٹھے جینے کی سکت
وقت کا مقتل ہم کو پکارے، ٹکرانے کی ہمت دے

[illegible] راں کی حسرت میں مت جھڑ کے زخموں کو ہیں
[illegible] خوشبو جاگے، غنچہ و گل کو نکہت دے
سالِ گذشتہ جو بھی گذرا، وہ نہ گذرے اگلے برس
یا حوادث، قحط و بارش کی لعنت سے فرصت دے

جنگ کے شعلوں میں نغموں کی فصلیں جلنے لگتی ہیں
انسانوں میں انسانی رشتوں کی پاک محبت دے
ورق ورق پر لفظوں کی قندیل جلائیں اہلِ قلم!
کاغذ، قلم، سیاہی چمکے، تحریروں کو عظمت دے

وقت کے موڑ پہ بچھڑے ساتھی آن ملیں پھر اگلے برس
بزمِ یاراں، کوئے نگاراں میں وہ پیار کی شدت دے
نصرؔ وفا کی کھوج میں بھٹکے بستی بستی ڈگر ڈگر!
اس جوگی کو ٹھور ٹھکانہ دلداروں کی قربت دے

صفدر

گنگا بہتی ہے

روشن اور سفید ہمالہ کی اجلی برف پگھلتی ہے
گنگا بہتی ہے یگ یگ سے
گنگا شیریں اور مطہر پانی
ساگر کے منہ میں ڈال رہی ہے ساگر میں
اک گھونٹ نہیں انساں کے لئے
یگ یگ سے ساگر انسانوں کو پال رہی دھرتی کے چاروں اور
کھڑا ہے۔

ہر بوند میں اس کی زہر بھرا ہے
زہر کے قطروں سے جنے ساگر کے بیٹوں نے اب دھرتی کو گھیر
لیا ہے

وقت کھڑا ہے پھر بھی
روشن اور سفید ہمالہ کی اجلی برف پگھلتی ہے
گنگا بہتی ہے۔

شروَن کمار ورما

بغاوت

التجا کی رسم چھوڑ دو
ہاتھ پکڑ دو
اور لب اظہار کو آداب حسن و عشق کی
سب سرحدوں سے پار، اب اک جرأت بے باک دیدو
ساری دیواریں گرا دو
اک نئے روشن، دھڑکتے لمحہ خوش رنگ کی بنیاد رکھو
رونے والو!
زندگی کو وصل کا آہنگ بخشو

فیصلہ

اپنے گھر میں آج اچانک
لاش دیکھ کر
گھبرایا سا باہر نکلا
آبادی پر خوف کے گہرے کالے سائے چھائے ہوئے تھے
پھیلی تھی۔
ہر دروازے کی پیشانی پر اک تختی لٹک رہی تھی
" اندر لاش پڑی ہے بھائی "
' ایمان و اقدار کی میت '
' آؤ اس کو دفنا دیں، آرام سے سوئیں '

عادل ادیب

منظر پس منظر

شہر پر طاری ہے
ژولیدہ صداؤں کا ہراس
اور خزاں کے دائروں میں
ٹمٹماتے چراغ
بادلوں میں قبر کے
پگھلے وجود
سوچ کی پگڈنڈیوں پر
خوں چشیدہ آہٹیں
خوف سے کانپتے ہوئے
احساس کا بارِ گراں
کارواں در کارواں
پانیوں میں تیرتے
خواب و خیال
آگہی سے بھی پرے
فکر کے گہرے سمندر کا سکوت
شام کی بیچارگی میں
دھڑکنوں کا ارتعاش
جیسے امواجِ حوادث میں
سفینہ آس کا
روح میں سہمی سی لہریں
لاشعوری طور پر
منہدم
جذبوں کا پاکیزہ شعور
نور میں ظلمات کا
سیلِ رواں
وقت کے کشکول میں ہے
کرب کا ٹھنڈا لہو
لاشوں کے
انبار ہی انبار ہیں
اک تجسس آفریں
منظر ہے
تا حدِ نظر
جس کا پس منظر
بیاں کرنے سے
قاصر ہے زباں

———٠———

اسعد بدایونی

مشورہ

جن دنوں بادِ صرصر سے تتلی کے پر ٹوٹ جائیں۔
فقط اپنے بازو کی جانب نگاہیں رکھو
جن دنوں آسمانوں پہ سورج کا گولا غضب ناک ہو
صرف اپنے ہی سر کے سائے کی التجائیں کرو
جن دنوں راہیں سفاک ہوں
شام سے گھر پہنچنے کی جلدی کرو

اور جب
سارے موسم سبھی سلسلے
حسبِ معمول ہوں
سب جہانوں کے غم اپنے چہرے پہ لکھ کر
زمانے کا ماتم کرو

———٠———

عزیز قیسی

غزلیں

کب تک د[illegible] [illegible]ہا اب تو بجھا دے مجھکو
یوں نہ جل جل کے سلگنے کی سزا دے مجھکو

ورقِ گل کی ہوں تحریر فنا پڑھ لیجئے
اس سے پہلے کہ سحر آ کے مٹا دے مجھکو

بیچ منجدھار سے واپس نہیں آتا کوئی
پھر بھی اک بار کنارے سے صدا دے مجھکو

قتل کرنا ہے تو کر قتل سرِ منظرِ عام
بے گناہی کا ری کچھ تو صلہ دے مجھکو

مجھ سے تم ایسی بلندی تو نہ منسوب کرو
جو نہ خود اپنی ہی نظروں سے گرا دے مجھکو

میں نہ ہوں گا تو بھلانا ہے مجھے ناممکن!
ابھی زندہ ہوں کسی طرح بھلا دے مجھکو

ہے ندامت تو چھپا دل میں کسک کی مانند
قطرہ اشک کی صورت نہ گنوا دے مجھکو

زندگی میں تیرا احسان نہیں بھر لوں گا
کبھی تنہائی میں قیسی سے ملا دے مجھکو

بجائے دل کوئی انگارہ مسل گیا مجھکو
عطا کے نام پہ یہ کس نے دی سزا مجھکو

یہ گردبادِ فنا کب سے ہوں میں گردش میں
میں تھک گیا ہوں ٹھکانے لگا کے جا مجھکو

فسانہ ختم تھا وہ مل گئے تھے اس کے بعد
یہ خیر گذری کہ میں ڈھونڈتا رہا مجھکو

تعلقات کے اس بے کراں سمندر میں
میں ایک پل کا جزیرہ ہوں بھول جا مجھکو

عجب سزا تھی کہ قاتل رہا قصاص طلب
تمام عمر ملا مرا خوں بہا مجھکو

وہ مر چکا تھا مگر کل نشے کے عالم میں
عزیز قیسی اسی طرح پھر ملا مجھکو!

ڈاکٹر مظفر حنفی

غزلیں

نئے قافیوں کی زیارت ہوئی
اٹھو، قیمتی رات غارت ہوئی

ضرر کے لئے، رفعِ شر کے لئے
اسی آدمی کی صدارت ہوئی

لہو کا طلب گار تھا حرفِ حق
کسی کو نہ اتنی جسارت ہوئی

مگر سبز موسم نہیں آسکا
کئی بار ہم کو بشارت ہوئی

ضمانت نہیں ہے مرے ضبط کی
اگر پھر ادھر سے شرارت ہوئی

بغاوت کہا اے شہر آشوب میں
ہمیں سر پھروں سے عبارت ہوئی

ملا تھا نہ پتھر سے جس کا جواب
وہ اک اینٹ بڑھ کر عمارت ہوئی

مظفر غزل پیشِ تنقید ہے
اکارت گئی یا سوارت ہوئی؟

یہ چبائے ہوئے فقرے نہ سناؤ تم بھی
حال پر میرے ترس کھاتے ہو، جاؤ تم بھی

زرد موسم نے مرا خون پیا ہے دن رات
چاٹ سکتی ہو مجھے تیز ہواؤ، تم بھی

میرے الجھے ہوئے حالات نظر میں رکھنا
عین ممکن ہے مجھے یاد نہ آؤ، تم بھی

سروِ آزاد ہوں یارو، مرا سرمایہ کیا
کوئی پھولوں سے لدی شاخ ہلاؤ تم بھی

سر ہتھیلی پہ لئے اور نکل آئے لوگ!
پھر سے دو چلّے پہ نئے تیر چڑھاؤ تم بھی!

گھر سلگتے ہیں دھواں دھار ہے بستی ساری
کیا ضروری ہے میاں آگ لگاؤ تم بھی

سب رسالوں میں مظفر کی غزل چھپتی ہے
اس کے اشعار سے مضمون چراؤ تم بھی

ماجد الباقری (پاکستان)

غزلیں

شجر شمار کروں یا درخت بات کروں
یہ موسموں کا تقاضا ہے سخت بات کروں

سمندروں کی زباں سحاب بھی ہے حقیر بھی!
چٹان ڈوب نہ جائے کرخت بات کروں

وہ نیک خو ہے تو لازم نہیں تشکر سے ہی
نصیب اونگھ رہے ہوں تو بخت بات کروں

مرے قبیلے کی اپنی علامتیں ہیں یہاں
نہ سمجھے غیر کوئی بھی دو لخت بات کروں

ہر ایک لفظ سفر میں ہے بے لخت معنیٰ!
جہاں ٹھہرتا ہو مقصود رخت بات کروں

مفاہمت کا اشارہ نہیں ہے بے مفہوم!!
کوئی تو بات ہے ماجد دو لخت بات کروں

آگہی کے دائروں سے جب کوئی گذر گیا
جسم کا لباس بھی روح سے اتر گیا

"لا" کی سمت جب نہیں پرند کا سفر کدھر
شاخ سے جہاں اڑا راہ میں بکھر گیا

بے ثمر چنار کے سرخ بادباں ہیں
چار سو شفق شفق کوہ سے اتر گیا

ہر طرف سماج کے خاردار پیڑ ہیں
جو کبھی تیز اڑ گیا راستے میں مر گیا

وقت کے غلاف میں چھپ گئی ہیں ساعتیں
ایک صدی گذر گئی پل کوئی گذر گیا

جس طرف بھی رخ کیا آپ ہی فصیل تھا
زاویے غلط نہ تھے آئینوں سے ڈر گیا

آدمی کی شکل کا زندگی شکار تھا
بھر گیا نگاہ میں دار سے گذر گیا

غزلیں

محبوب شیدائی (ڈھاکہ)

سورج سے دور رات کی پہنائیوں میں ہے
وہ قافلہ جو نیند کی گہرائیوں میں ہے

جو شخص اپنی ذات کی پسپائیوں میں ہے
اچھائیوں میں ہے نہ وہ سچائیوں میں ہے

بے چہرگی ہے اس کی تہہ سنگ آفتاب
جس کا بدن چراغوں کی پرچھائیوں میں ہے

وہ انقلاب جس کا زمانہ ہے منتظر
رقاصۂ حیات کی انگڑائیوں میں ہے

شاید کہ محو خواب ہیں موسم نواز لوگ
کتنا سکون درد کی پروائیوں میں ہے

کس دل سے اپنے قتل کا الزام دوں اسے
جو میرا ہم نشیں ہی مرے بھائیوں میں ہے

بہتی ہوئی نگاہوں کی رفتار روک دو!
محبوب خیمہ زن مری تنہائیوں میں ہے

شمس تبریزی

سوچتا ہوں کہ کسی روز یہ کرنا ہوگا
آسمانوں کی بلندی سے اترنا ہوگا

تجھکو کھویا تو بہت ٹوٹ گیا تھا اس دم
تجھکو پانے کی تمنا میں بکھرنا ہوگا

امتحاں لیں گے مرا پھر سے یہ دنیا والے
تیری راہوں سے پھر اک بار گذرنا ہوگا

خواب سے زیست حقیقت میں بدل سکتی ہے
پر ترے جسم کے احساس کو مرنا ہوگا

کیمرہ میں ہیں یہ پیڑ، پتنگے، پودے
اپنے سائے سے ہمیں آپ ہی ڈرنا ہوگا!

راہ سے شمس گزرتے تھے تم اکثر اس کی
بات تھی خاص یہ اقرار تو کرنا ہوگا!

غزلیں

نشتر جعفری

صرف قصہ قیس کا وجہ فغاں کیسے بنے
ذکر لیلیٰ کا نہ ہو تو داستاں کیسے بنے

عزم خستہ ناؤ پر باد مخالف میں کٹی
وقت آخر فکر کیوں ہے بادباں کیسے بنے

راہ حق کی ہر ندا ہے اک صدائے بازگشت
راہبر تنہا کھڑا ہے کارواں کیسے بنے

ہے عبث یہ ذکر بجلی کب کہاں کیسے گری
فکر کر اس کی نیا اب آشیاں کیسے بنے

کیا محبت نے سکھائی ہے تکلم کی ادا؟
وہ جو چپ رہتے تھے ہر دم گلفشاں کیسے بنے

نالۂ نشتر کا آخر ہو چلا ان پر اثر!
ورنہ جو سنگ آشنا تھے مہرباں کیسے بنے

شاہد نعیم (جدہ)

جل مرنے سے کسی کو یہاں پر اماں نہیں
لیکن ابھی تو آگ کے شعلے جواں نہیں

سرگرمیوں میں کیسے ابھی روح پھونک دیں
ہمت تو ہے جوان مگر ہم جواں نہیں

رشتے تمام ٹوٹ گئے ہیں حصار کے
اٹھتی ہوئی صداؤں کی اپنی زباں نہیں

جو آدمی قریب تھے وہ دور ہو گئے
اپنی پناہ میں ابھی کوئی یہاں نہیں

ایسے میں زندگی کا تقاضا فضول ہے
اس شہر میں سفارش منصب کہاں نہیں

تبدیل کر رہے ہو تہ پا زمیں مگر!
کس سر زمیں پہ سایہ فگن آسماں نہیں

شاہد ابھی تو وقت گذاری کی فکر ہے
فی الحال میرے سامنے سود و زیاں نہیں

غزلیں

ڈاکٹر حسین احمد اعظم

تیرگی اپنے گھر میں رکھ دینا
اک دیا رہگذر میں رکھ دینا

شیشۂ جاں سلامتی کے لئے
پتھروں کے نگر میں رکھ دینا

خیریت ہے اسی میں رخت سفر
دامن راہبر میں رکھ دینا

دوستو زندگی کا سرخ لہو
حسن شام و سحر میں رکھ دینا

میری ماؤف سوزِ تمنا کو
ہوش کے بام و در میں رکھ دینا

دیکھ لیں لوگ اپنی پرچھائیں
آئینہ رہگذر میں رکھ دینا

بے یقینی کی اک صلیب بھی تم
مدعائے نظر میں رکھ دینا

اشک اسیاں کے یہ گہر پارے
تم دعائے سحر میں رکھ دینا

آرزو کا چراغ روشن کر
دل کو راہ سفر میں رکھ دینا

کام آئے گا زندگی میں کبھی
غم متاع ہنر میں رکھ دینا

جذبۂ شوق کی امانت کو
اضطراب نظر میں رکھ دینا

یاد ماضی کی ناگ پھینوں کو
موسم بے اثر میں رکھ دینا

دل سے اس دوست اور دشمن کو
عالم خیر و شر میں رکھ دینا

کانچ کا ایک ٹکڑا اے اعظم
دست آئینہ گر میں رکھ دینا

پروفیسر حسن احمد حسن

رات کاٹے بھی کٹتی نہیں ہے، دن گزارے گزرتا نہیں ہے
آیا ساون بھی لیکن ابھی تک وہ صنم ہائے آیا نہیں ہے
اک جھلک عاشقوں کو دکھانے بزم میں تم جو آتے نہیں ہو!
خون کرتے ہو لاکھوں دلوں کا، کام ہرگز یہ اچھا نہیں ہے!
خوف کھا آہ بیکس سے ناداں باز آجا ستانے سے اب تو
کون سا دل ہے ایسا یہاں جو تیری باتوں سے رویا نہیں ہے
تجھ میں سب خوبیاں ہیں جہاں کی عقل ہے ہوش ہے آگہی ہے
غم اگر ہے کوئی تو فقط یہ تجھ میں الفت کا جذبہ نہیں ہے
لاکھ باتیں بناؤ اے ہمدم لاکھ ناٹک محبت کے کھیلو
ذہن و دل سے ابھی تک تمہارے جذبۂ قتل نکلا نہیں ہے!
نذر کرتے رہیں گے دل و جاں تا کہ اک دن حقیقت کو پہنچو
ہم تو نفرت نہ تم سے کریں گے یہ سبق ہم نے سیکھا نہیں ہے!
چھین کے لیں تجھ سے بدلے ستم کے ایسی قوت بھی رکھتے ہیں ہم
یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک ہم نے اس طرح سوچا نہیں ہے
غم نہیں گر مرا آشیانہ شعلۂ برق نے پھونک ڈالا
کس زمانے میں ایسا ہوا ہے برق نے گھر جلایا نہیں ہے
اس ستم گر کی باتوں سے کیوں تو اس قدر غم میں ڈوبا ہوا ہے
سب ہی اچھے ہوں دنیا میں اے دل ایسا دنیا میں ہوتا نہیں ہے
آ ہی جاؤ گے رستے پہ اک دن آج جتنا بھی ہم کو ستا لو
پیار پر جا کے نفرت ہو بھاری ہم نے ایسا تو دیکھا نہیں ہے
اے حسن کان تیرے کسی نے جھوٹی باتوں سے ہی بھر دیئے ہیں
ہائے افسوس تو نے ابھی تک کیا حقیقت ہے جانا نہیں ہے


بیس نکات کا
پیغام یہ ہے
کہ ملک صحت مند
اور تعلیم یافتہ ہو۔

THE AAHANG URDU MONTHLY JUN.-84

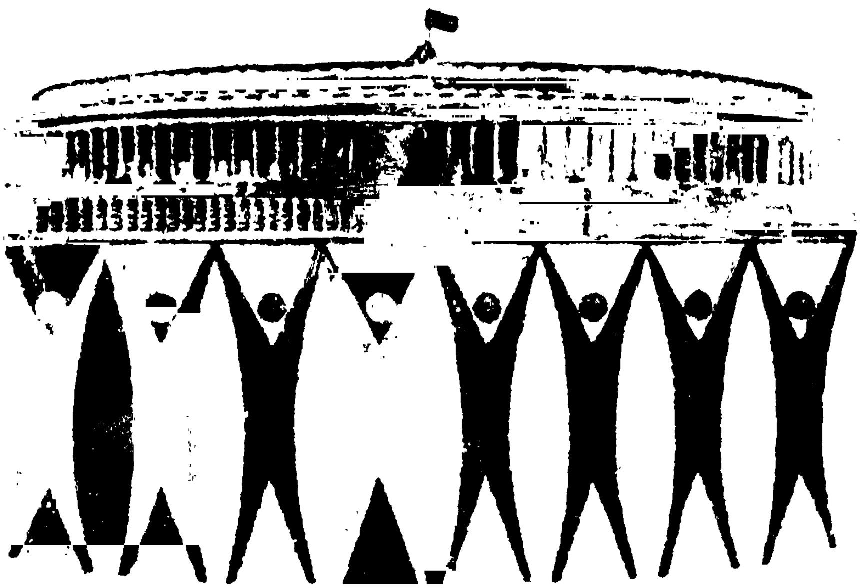
یوم جمہوریہ

کی اس 34 ویں سالگرہ پر

آیئے حلف اٹھائیں کہ ہم

- پالیسیوں کو مستحکم کریں گے۔
- خود کو ملک کی ترقی کے کاموں کے لیے وقف کریں گے۔
- غیر ضروری اخراجات سے احتراز کریں گے اور سادگی سے کام لیں گے۔
- تمام ملکی ذرائع کو بروئے کار لائیں گے۔

مستقبل کے لیے [illegible] کے تحفظ اور [illegible] کی حفاظت کرتے رہیں



ان تمام [illegible] ہوشیار رہیں گے
جو ہمیں [illegible] کرنا چاہتی ہیں

موجودہ اور آئندہ

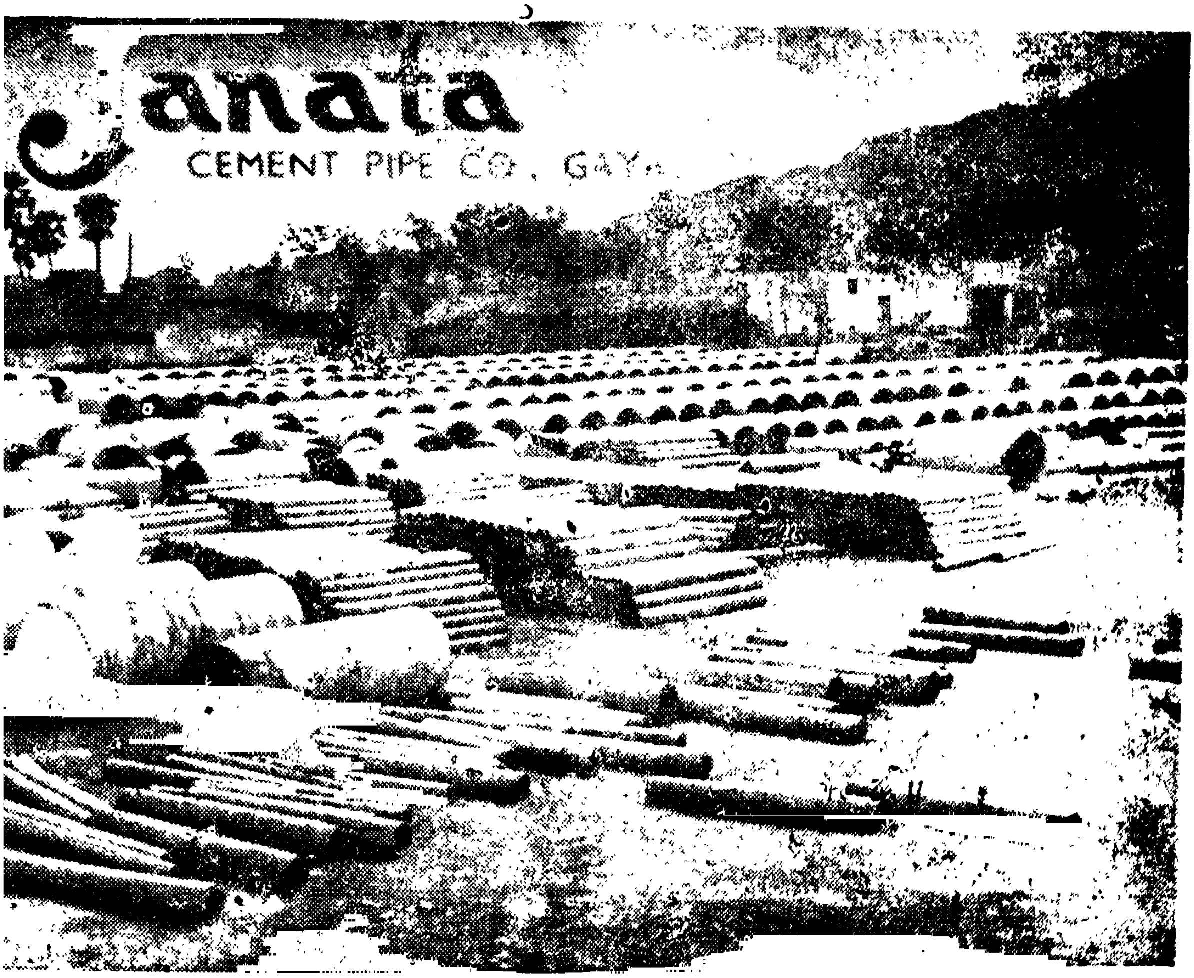
چنوتیوں

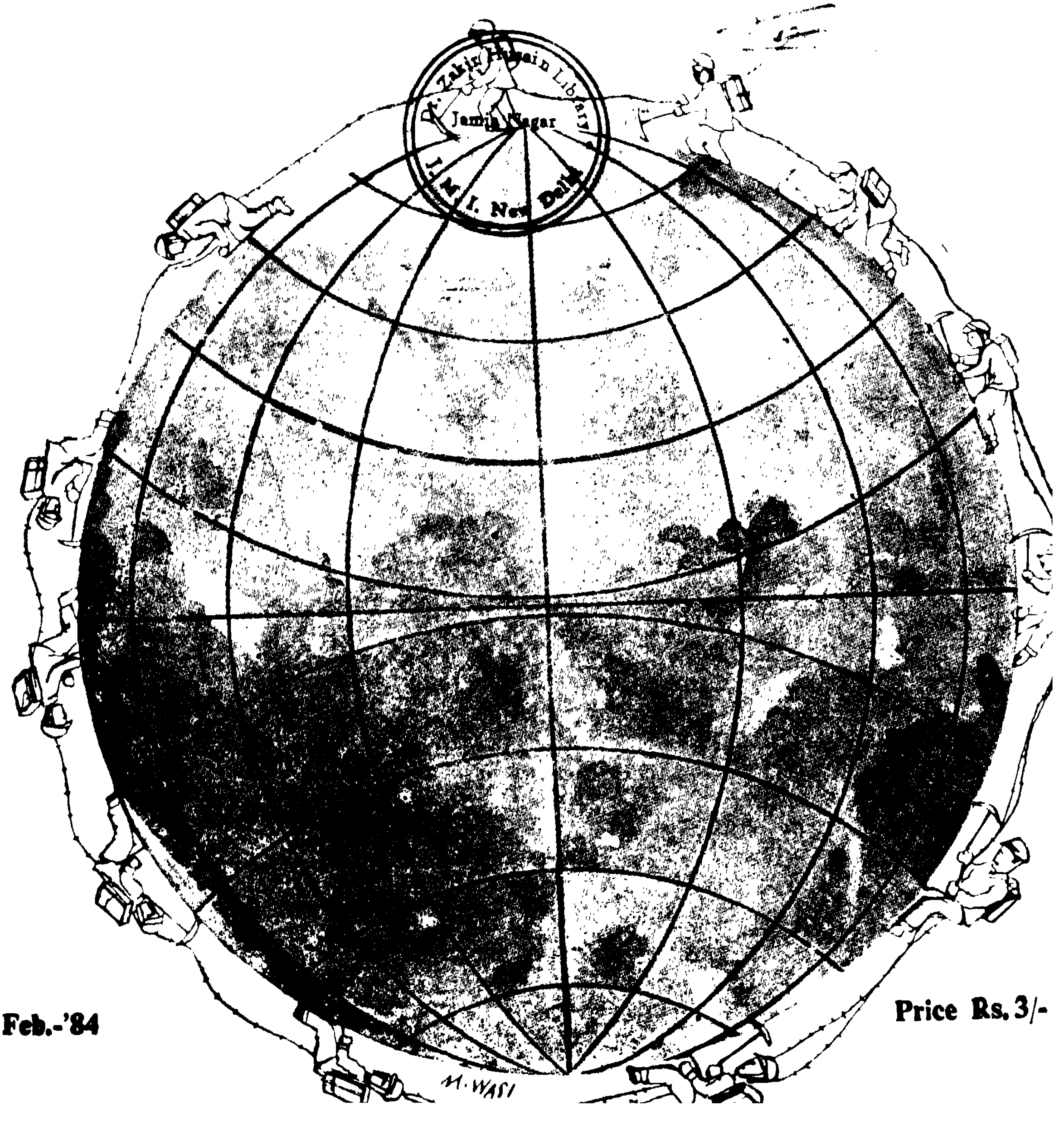
کا مقابلہ کرنے کو مستعد رہیں گے

. Regd 4253 64
. Regd. No. Gy.5 84
ne 432

The Aahang

Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA





Feb.-'84

Price Rs. 3/-

دی کلچرل اکیڈمی، ریتہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

آہنگ

گیا

شرح خریداری

ایک شمارہ ——— تین روپے

بارہ شمارے ——— چھتیس روپے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبدالصمد

محتویات

اداریہ

کشکول

اگر کوئی پڑھا لکھا ادیب اردو کے نقادوں کی سرسری طور پر ہی کوئی مختصر یعنی دس پندرہ پر مشتمل فہرست بنائے اور اس میں ڈاکٹر محمد حسن کا نام نہ ہو تو دنیا تو خیر جو کچھ فہرست بنانے والے کی ادبی عاقبت بھی خراب ہوگی۔

مگر خود محمد حسن (دیکھئے عصری ادب ۵۳-۵۴ صفحہ ۱۳۳) نے شاعروں شاعرے کے شاعروں، افسانہ نگاروں، مزاح نگاروں نقادوں اور محققین کی جو فہرست بنائی ہے وہ کچھ اس طرح کی فہرست ہے

افسانہ نگاروں میں کوئی عائشہ ہیں مگر عبدالصمد غائب یہاں تک کہ ننھ FAME والی واجدہ تبسم ہیں مگر علی امام غائب ہیں۔

نقادوں میں یا محققین کسی میں اختر اورینوی اور دروائی کا نام نہیں ہے حالانکہ اصغر علی انجینیر اور پیارے محمود ہاشمی کا نام ہے ——— اور محمود ہاشمی کے ہم نوالہ اور ہم خیال گوپی چند نارنگ کا نام نہیں۔

مزاح نگاروں میں بھارت چند کھنہ تک ہیں مگر رام لعل نابھوی نہیں ہیں

_____ اور جواز کے طور پر یہ جملہ ہے

"ظاہر ہے یہ فہرست مختصر ہے اور بہت
سے "اہم "نام چھوٹ گئے ہیں"

اس میں صرف اتنا جھوٹ ہے۔"چھوٹ گئے ہیں" اگر یہ لکھ
دیا گیا ہوتا کہ

"اور بہت سے اہم نام چھوڑ دیئے گئے ہیں"

تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ "چھوڑ" دینے کے
لئے بہت سی ذاتی وجوہات ہوسکتی تھیں۔

بہر حال
ڈاکٹر محمد حسن اردو تنقید کا اہم نام ہے یہ اگر کسی
سے چھوٹ جائے تو ہمیں بڑا ملال ہوگا۔
عصری ادب اردو کا اہم رسالہ ہے اگر رسائل
کے ذکر میں اس کا نام چھوٹ جائے تو ہمیں قلق ہوگا۔

۵

باخبر

آس پاس

دیر آید درست آید

خدا کا شکر ہے کہ پنجاب کے مسئلے پر اب سنجیدگی سے توجہ کی گئی ہے مرکزی حکومت نے اکالی دل کو سہ طرفہ بات چیت کے لئے دلی مدعو کیا۔ جسے تھوڑی رد و قدح کے بعد منظور کر لیا گیا۔ دوسری طرف حزب مخالف نے بھی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گویا یہ بات چیت حکومت، اکالی دل اور حزب مخالف کے درمیان ہوگی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس قسم کی کانفرنس پہلے بھی ہو چکی ہے اور کئی بار ہوئی ہے۔ لیکن نتیجہ ہمیشہ صفر نکلا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریقین کے سامنے وقار کی جابر دیوار آکھڑی ہوئی تھی۔ جسے وہ توڑ نہیں سکے۔ امید کرنی چاہئے کہ اس گفتگو میں وہ وقار کی اس دیوار کو برقرار نہیں رکھیں گے۔ اور ملکی مفاد میں قربانیوں کیلئے بھی تیار رہیں گے

اچھی توقعات

پچھلے دنوں روسی صدر مسٹر اندرپوف کا انتقال ہو گیا وہ وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری بھی تھے اور اس حیثیت سے وہ روس کی سب سے با اثر شخصیت تھے۔ وہ کوئی سوا سال قبل اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے تھے۔ لیکن وہ دنیا پر اپنی شخصیت کا کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔ جیسا کہ ان سے قبل کے روسی قائدین کا رہا ہے۔ ویسے بھی وہ زیادہ عرصہ بیمار ہی رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ روس کی ان غلطیوں کی کوئی اصلاح نہ کر سکے، جو عالمی سطح پر روس سے سرزد ہوئی تھیں۔ مسٹر چرننکو روس کے نئے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ توقع ہے کہ وہ روس کے عالمی لیڈرشپ کے منصب کو سمجھیں گے۔ اور امن قائم کرنے کی کوششوں میں خلوص کو راہ دیں گے

غلط حرکت

برمنگھم میں ہندوستانی ڈپلومیٹ مسٹر مہاترے کا جس بے رحمی سے قتل کیا گیا وہ ایک سخت قابل مذمت حرکت ہے جب ان کا اغوا ہوا تھا تو نام نہاد کشمیر لبریشن فرنٹ نے دعوا کیا تھا کہ یہ کام اس کا ہے لیکن مسٹر مہاترے کی لاش ملنے کے بعد وہ اس ذمہ داری سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی بات قابل اعتبار نہیں ہے۔ دوسری طرف ان کے لیڈر مقبول بٹ کو دلی میں پھانسی دیدی گئی۔ لیکن ان کی پھانسی سے لبریشن فرنٹ سے ان کی وابستگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ قتل کے مقدموں میں ماخوذ تھے۔ اور عدالت نے انکو سزا دی تھی۔ اس پس منظر میں حکومت ہند پر بدلے کی کارروائی کا الزام صحیح نہیں ہے۔ لوگ تو ان تمام معاملوں میں فاروق عبداللہ کو بھی بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور یہ سب کچھ سوچی سمجھی پالیسی ہے اس قسم کی حرکتوں کی سخت مذمت ہونی چاہئے

ڈاکٹر سید محمد عقیل

پروفیسر کلیم الدین احمد ـــــ ایک تاثر

پروفیسر کلیم الدین احمد کے ساتھ اردو تنقید کا ایک دور ختم ہوا انہوں نے خود ہی تنقید میں ایک نئے اسکول کا آغاز کیا اور شاید وہی اس کے خاتم بھی ہیں کہ ابھی تک ان کے نقش قدم پر چلنے والا اردو میں کوئی اہم نقاد پیدا نہیں ہوا۔ اردو تنقید، کلیم الدین احمد سے پہلے توصیف، اعتراضات، لفظی موشگافیاں، اور خالص رد مالوئی انداز میں اپنی باتیں پیش کرنے کا مزاج رکھتی تھی۔ کسی نے ایک قدم آگے بڑھایا تو کسی مغربی ناقد یا ادیب کا حوالہ دیا اور اسی کے اقوال کی روشنی میں مشرقی شعرا اور ادیبوں کو پرکھنے کی کوشش کر ڈالی۔ کلیم صاحب نے سب سے پہلے اردو تنقید کے بنے ہوئے مسلمات توڑنے کی کوشش کی۔ اور چند ایسے تیر الوان شعر وادب پر پھینکے کہ لوگ یکبارگی چونک پڑے۔ غزل جو اردو شاعری کی آبرو کہلاتی تھی اسے انہوں نے "نیم وحشی صنف سخن" کہہ کر ایسے ایسے تہمت اس صنف کی پراگندگی اور انتشار کے فراہم کئے کہ سب منہ دیکھتے رہ گئے۔ اردو تنقید پر ایک جملہ" اردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے یا آقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر" لکھکر اردو کے ناقدین کو قلم رکھ کر سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر وہ ابھی تک کیا کرتے رہے جس حالی کے "مقدمہ شعر وشاعری" اور جن کی تنقید پر کو اردو تنقید کی دنیا میں لوگ ایک نئی ہوا سمجھتے رہے ان کے متعلق کلیم صاحب نے یہ لکھا کہ :

> " خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم وادراک معمولی، غور وفکر ناکافی، تمیز ادنی دماغ وشخصیت اوسط، یہ تھی حالی کی کل کائنات"

جس اقبال اور جوش کی شاعری پر اردو دنیا جھوم رہی تھی ان کا (MYTH) متھ توڑنے کے لئے انھوں نے ان کی شاعری پر ایک سوالیہ نشان بنایا۔ یہ بھی سمجھایا کہ تنقید مشاعرہ نہیں ہے سمجھ بوجھ کر اشعار کی داد بھی دینی چاہئے اور توجیہہ بھی کرنی چاہیے جس زمانے میں اردو دنیا میں اقبال کا ڈنکا بج رہا تھا کلیم صاحب نے اپنی کتاب" اردو شاعری پر ایک نظر" میں لکھا کہ :

> " اقبال نظمیں لکھتے ہیں لیکن وہ پیغمبری کو شاعری سے زیادہ ضروری اور زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ انہیں کچھ کام کرنا ہے ضروری پیغام دینا ہے اس لئے وہ صرف پیغام پر دھیان دیتے ہیں۔ شاعرانہ محاسن اور ٹکنیک پر دھیان نہیں دیتے وہ پیغام میں ایسا محو ہو جاتے ہیں کہ اور کسی چیز کا لحاظ نہیں کرتے، وہ اس یورپ جیسے حکیموں کی دنیا میں تو سانس لیتے ہیں لیکن شاعری

کے نیل گوں اور بیکراں آسمان تک ان کی
رسائی نہیں"

پھر بھی نہیں اپنی آخری عمر میں" اقبال ـــ ایک مطالعہ" لکھکر مزید انکشافات کئے اور مزید سوالات اٹھائے۔ اقبال نے مغربی شعراء سے کتنا استفادہ کیا ہے ان کے خیالات بھی بہت کچھ ماخوذ ہیں۔ اور ان میں اوریجنیلیٹی بہت کم ہے جوش کے لئے لکھا کہ :

" جوش کے مانگے ہوئے افکار تخیلی تجربہ نہیں بنتے
افکار گویا ایک طرف رہتے ہیں اور الفاظ دوسری
طرف، جوش الفاظ کے جادوگر نہیں، بازیگر
ہیں۔ لفظی بلاغت گری اور شاعری میں زمین
و آسمان کا فرق ہے"

جب ترقی پسندی کا زور ہوا اور ہر طرف فضا میں اردو شعر و ادب صرف ترقی پسند پیمانوں سے ناپا جانے لگا اور ماورائے ترقی پسندی تمام شعری اور ادبی سرمایہ ہیچ ہونے لگا تو کلیم صاحب نے ترقی پسندوں اور ترقی پسند شعر و ادب پر دلچسپ اعتراضات کئے، مجاز کی شاعری کے اس وقت بڑے چرچے تھے، کوئی ادبی محفل مجاز کے افکار اور ان کی نظموں کے تذکروں سے خالی نہ ہوتی۔ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب اردو شاعری پر ایک نظر میں مجاز کی نظموں خصوصاً آوارہ' اندھیری رات کا مسافر اور سرمایہ داری وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا اور لکھا کہ :

" اس سرسری تنقید سے مجاز کی شاعری کا اندازہ
ممکن ہے ذہنیت ایک طالب علم کی سی،
جس نے ابھی بی اے نہیں کیا ہے، ادراک سطحی
اور معمولی ہے، جذبات کچھ اور رومانی قسم
کے"

اسی لپیٹ میں ترقی پسندوں کے متعلق لکھا کہ :

" ترقی پسند شعرا اپنی معصومیت میں سمجھتے
ہیں کہ آزادی، سرمایہ داری، مزدور کسان
اور امن جیسے موضوع پر نظمیں لکھنے سے ترقی
پسندی ہاتھ آجاتی ہے"

اس وقت کی نئی اردو تنقید میں دو مکتبۂ فکر کے الگ الگ دو ستون تھے ایک محمد حسن عسکری، اور دوسرے سید احتشام حسین، دونوں کی تنقیدوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے حسب ذیل نتائج نکالے، عسکری کے لئے لکھا کہ :

" عسکری صاحب کی حیثیت "دلال" کی ہے
وہ مغربی مال ہندوستان میں بیچنا
چاہتے ہیں وہ مغربی ادیبوں کا خلاصہ یا ترجمہ
پیش کرتے ہیں"

احتشام حسین کیلئے لکھا کہ :

" کاش احتشام صاحب ان لوگوں کے تنقیدی
خیالات اور ادبی تجربات سے فائدہ اٹھائیں
(ارسطو، سارتر، آرنلڈ، رچرڈ، ایلیٹ،
ہیگل، مارکس، پلینسکی وغیرہ) یہ مشکل اور
ذمہ دارانہ کام ہے اور احتشام صاحب
اس کے اہل نہیں، وہ مارکسیت کے تاریک
کمرے میں چکر کاٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی
ساری دنیا ہے"

اتنے بہت سے اقتباسات اور اردو کے شعرا اور ادیبوں کے متعلق رائیں، کلیم صاحب کی تنقیدی بصیرت اور تنقید سے ان کے تقاضوں کو اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں۔ جب یہ افکار انہوں نے اپنے رسالے "معاصر" میں شائع کئے تو ہر طرف ایک شور مچ گیا، ان کو بھی لوگوں نے مغرب زدہ سمجھا کچھ کا تاثر یہ بھی ہوا کہ کلیم الدین احمد احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ یہ سمجھے کہ اپنے کو نمایاں کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مسلمات ادب پر حملے کرو۔ اور کلیم الدین احمد بھی سب

کام کر رہے ہیں۔ مجاز نے کلیم صاحب کی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" کو اردو شاعری پر ایک ترچھی نظر کہہ کر محفلوں کے لئے ایک لطیفہ فراہم کیا۔ اور مدتوں اس پہلے دسے ہوتی رہی پھر کلیم صاحب کی کتاب داستان گوئی کے فن پر شائع ہوئی تو خیال ہوا کہ یہ شخص مشرقی ادب کی دلچسپیوں کو بھی سمجھتا ہے پھر کچھ دلوں بعد انہوں نے الف، آر، لیوس اور آئی، اے رچرڈس کے زیر اثر اردو میں بھی عملی تنقید کی بنیاد رکھی، ایک کتاب عملی تنقید کے نام سے لکھ ڈالی، جن میں شعر و ادب کا تجزیہ ان نقاط نظر کو دیکھ کر کیا جو لیوس اور رچرڈس کے نقاط نظر تھے۔ یہ طریق کار بھی اردو تنقید میں ایک دلچسپ اور نیا طریق کار تھا۔ اشعار اور افکار کو عملی تنقید کے ان نئے اصولوں سے جانچنا، پرکھنا جس میں فکر کے مختلف جہات، ذہن کی متعدد کیفیات اور حالات کے تحت تہذیبی [illegible] سے الفاظ یا افکار کا تجزیہ نا تنقید میں ایک نیا طریق کار تھا۔ اردو دنیا اس کے صرف ایک رخ سے واقف تھی۔ یعنی اشعار کے مطالب لکھنا، اور کہیں کہیں تشبیہات و استعارات کی وضاحتیں کرتے جانا، لیکن مختلف موڈ میں نفسیاتی کیفیات کے تحت کوئی جذبہ کس طرح شوق بے پایاں بن جاتا ہے۔ کب ماحول کی ناسازگاری، معاشی دباؤ اور فکری انتشار کو دستک دیتی ہے، کہ میں حافظ کیوں بیکار ہو جاتا ہے اور وہ کہہ میں انشد یاد آنے کی صورتیں کیونکر وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ ان تمام باتوں کی کھوج لگانا اردو والوں نے نہیں سیکھا تھا۔ لفظوں کے پیچھے جو تہذیبی اثرات، تن آسانیاں یا کرب و الم کی کارفرمائی ہوتی ہے اس کو سمجھے بغیر کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کو صحیح طور پر سمجھ لینا ممکن نہیں ہے۔ عملی تنقید نے اس تنقیدی رویے اور تجزیے کی طرف متوجہ کیا۔ انگریزی ادب میں تو اس فن پر بہت سی کتابیں آئی، اے رچرڈس اور EMPSON وغیرہ سے لے کر DYSON اور JOHN GINGER تک لکھی گئی ہیں۔ اور آج بھی لکھی جاتی ہیں۔ مگر اردو میں مولوی کلیم الدین احمد کے یہ کام کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا۔ راقم الحروف نے بھی اس طرز تنقید سے خاصا فائدہ اٹھایا ہے۔

کلیم صاحب اپنے طرز تنقید میں ہمیشہ بے لاگ رہے ہیں یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ اس رنگ کو نبھانے کے لئے انتہا پسندی کی سرحدوں میں بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اس کی تو بارہا بحث اٹھائی کہ بجنوری اور مجنوں اخر مغربی شعراء سے غالب اور اقبال کا مقابلہ کیوں کرتے ہیں کہ دونوں افکار میں روایات اور مختلف تہذیبوں کے اپنے رویوں اور اپنے اپنے طرز احساس و ادراک کا فرق ہے اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے کیوں کہ شاعر اور ادیب کی فکر پر نہ صرف تہذیب بلکہ اس کے مسلکی اساطیر کو بھی اس طرح دخل ہوتا ہے کہ کبھی کبھی شاعر خود اس سے واقف نہیں ہو پاتا۔ اور اس لئے کیا ضروری ہے کہ انیس اور شکسپیر کا مقابلہ کیا جائے۔ یا غالب سے گوئٹے کو ملانے کی فکر ہو (اور اکثر یہ کوشش اس مخصوص زبان و ادب سے ناواقف ہی کرتے ہیں) مگر خود کلیم الدین صاحب جب مشرقی ادب کو پرکھنے بیٹھے تو نہ صرف مغربی تنقید کے پیمانے استعمال کئے بلکہ مغربی شعراء اور انگریزی ادیبوں اور شاعروں کی فکری بلندی اور طرز گفتار یہاں تک کہ ان کی تشبیہات و استعارات سے اردو شعراء کے شعری رویوں کو ناپنے لگے۔ یہ باتیں ان کی دونوں کتابوں، "اردو شاعری پر ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک نظر" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جب مغربی فکر کو مشرقی فکر کے تناظر میں پرکھے یا اس کے خلاف کی کلیم صاحب دوسروں کو اجازت نہیں دیتے تو ایسا کیوں کرنے لگتے ہیں یہ بات عجیب ہو جاتی ہے اور یہیں سے اردو ناقدین کو اس شبہ کو توانائی ملتی ہے کہ کلیم صاحب ایک طرح کے ICONOCLAST یعنی بت شکن ہیں مغرب زدہ ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ انہیں اس کی فکر نہیں کہ ان کی بت شکنی سنگ گراں اور اپنی سبک دستی کی بات کا خیال

نہیں کرتی۔ تاہم کلیم صاحب کے ان رویوں سے چند باریک باتیں نکلی ہیں۔ اور وہ یہ کہ تنقید میں کسی نتیجے کو طے شدہ تسلیم کرکے نہیں چلنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ناقد کی اپنی تلاش اور اپنا مطالعہ بہت سے مسلمات کا بطلان کر دے۔ اور بہت سے نتیجے صحیح حالات کی تلاش کے بعد بالکل نئے ہوں۔ جیسا کہ آزاد کی آب حیات سے بحث کرتے ہوئے خود کلیم صاحب نے نکالے ہیں میر کے متعلق آزاد نے لکھ دیا کہ میر نے کہا تھا کہ "نکات الشعرا" میں ایک ہزار شعرا کا حال لکھونگا جبکہ میر نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ یا میر سوز کے متعلق میر کے خیالات وہ نہ تھے جو آزاد نے لکھے ہیں۔ یا اقبال کا سب کچھ اپنا ہے۔ ایسا نہیں۔ اس تلاش میں وہ یہاں تک چلے جاتے ہیں کہ اقبال کی مشہور نظمیں اور بہت سے فکری ابعاد بھی مغربی اور انگریزی شعرا سے اڑائے ہوئے ہیں۔ جس کی تفصیلی بحث ان کی کتاب "اقبال ــــ ایک مطالعہ" میں ملتی ہے یہاں ان کے اعادے کا موقع نہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ کلیم صاحب بھی اقبال اور شکسپیر کا مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔ مسجد قرطبہ کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت سے اشعار کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ :

"دیکھیے شکسپیر کس طرح سلسلۂ شب و روز
کے نقش گر حادثات ہونے کو بیان کرتا ہے"

پھر شکسپیر کے ایک سانیٹ سے بارہ سطریں پیش کرتے ہیں اور بعد کو یہ نتیجہ نکالتے ہیں :

"یہ شاعری ہے ہم لمحوں کو گذرتے ہوئے نہیں
دیکھتے لیکن موجوں کو ساحل کی طرف بڑھتے
ہوئے دیکھتے ہیں"

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

"SHELLEY شیلی نے بھی کار جہاں بے
ثبات" کہا ہے لیکن اس کے بیان میں ایک
حسن کاری ہے۔ جو اقبال کے شعر میں نہیں ہے"
(شیلی کے اشعار بہت پہلے لکھے گئے ہیں)

جب کلیم صاحب خود اقبال کو شیلی اور شکسپیر کے تصورات سے بہکے ہوئے کہتے ہیں تو خود کس طرح بہکتے ہیں کہ :

"غالب، شکسپیر اور گوئٹے کے ساتھ نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ شکسپیر میں کسی مخصوص فلسفۂ زندگی کی ترجمانی نہیں ملتی، لیکن اس بنا پر یہ کہنا کہ غالب شکسپیر کے ساتھ ہیں بجنوری مرحوم کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں، پھر یہ کہنا کہ وہ (غالب) جین آسٹن یا پروسٹ کی طرح ساری عمر مینا کاری کیا نہیں کرتے رہے بہت سے مغالطے کا سبب بن جاتا ہے ...... جین آسٹن اور پروسٹ کے مقصد اور ان کی تکنیک میں زمین و آسمان کا فرق ہے ...... جین آسٹن ناولسٹ تھی"

پھر ایک جگہ آل احمد سرور کے ایک انگریزی نقاد کولرج سے عبدالرحمٰن بجنوری کے مقابلے کو مضحک بتاتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ :

"بجنوری کا ذکر کولرج کے ساتھ کرنا کولرج کی ہتک ہے بجنوری کی غلط فہمی، کم فہمی، اور سر و پا باتوں کا کولرج کی تیز باریک، اور زندہ احساس سے مقابلہ کرنا تنقید پر دانستہ ظلم کرنا ہے، کولرج ایک بہت بڑا نقاد ہے اور بجنوری سرے سے نقاد کہے جانے کے مستحق نہیں ہیں"

یہ عجیب کیفیت ہے جو کلیم صاحب کے یہاں برابر دیکھی جا سکتی ہے کہ وہ خود ہی کہتے ہیں انگریزی یا مغربی ادب سے مشرقی ادب کا تقابل بے معنی ہے لیکن جب انہیں مشرق کے اچھے ادیب اور شاعر ملتے ہیں تو خود ہی مغرب اور خصوصاً انگریزی ادب کے مشاہیر سے کمتر ثابت کرکے اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے جو مثال پیش کرتے ہیں جنہیں مغربی نقاد استعمال کرکے مشرقی ادب

را کو مغربی ادیبوں اور شاعروں کے برابر لانے کی فکر کرتے ہیں
ان کے اس رویے پر جب کسی نے کچھ کہا تو انہوں نے یہی کہا
ید سائنس کی طرح ناگزیر ہے۔ ہمیشہ نئے راستے اور نئے دائرے تلاش
کرتے رہنا چاہئے۔ اور کسی نظریئے کو ہنری فورڈ کی پہلی بنائی
کار سمجھ کر استعمال کرنے سے کوئی تصور تنقید اسی کار کی طرح
ب گھر میں پہونچنے کے لائق ہو جاتا ہے۔ ایک زمانہ گذرنے کے ساتھ
کے تمام لوازم بدل جاتے ہیں۔ اسلئے کوئی تنقیدی پیمانہ
نہ کے لئے نہیں ہو سکتا۔ اس کی افادیت صرف اپنے دور تک
تی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ارسطو کی طرح نظریات ادب کی موٹی موٹی
بدلیں۔ مگر مختلف حالات میں فروعات میں واضح فرق آتا رہتا
ہے اور اس لئے ناقد صرف چند اصولوں کے ساتھ RIGID نہیں
سکتا۔ نئے مذاق اور آتی ہوئی زندگی کے نئے امکانات کیساتھ
تیر، غالب، انیس اور اقبال کو پھر سے تلاش کیا جاتا ہے۔
س طرح تنقید کے پرانے طریقے نئی صورتوں کے لئے ذہن کو تیار
و کر سکتے ہیں۔ مگر خود کسی کام کے نہیں رہ جاتے۔ کسی فن کار پر
رائے دینے اور اس کا محاسبہ کرنے کے فرق کو ہمیشہ سمجھتے رہنا چاہئے
رائے زنی تنقید نہیں ہو سکتی۔ اور تنقید جب رائے زنی کی سطح پر
اتر آتی ہے تو ادب کے کیف و کم کے اظہار کی اس سے امید نہیں
رکھنی چاہئے۔ وہ صرف توصیف، تعریف، یا پھر ایک رومانی
جذباتیت کا اظہار بن جاتی ہے۔ کلیم صاحب نے بار بار ایسی
رائے زنی اور جذباتی رومانی قیاس آرائی کی مخالفت کی ہے۔
جہاں نہ اصول نقاد بن سکتے ہیں اور نہ کسی تنقیدی اصول سازی
کی فضا بنتی ہے۔ اور نہ کوئی معیار تنقید بن سکتا ہے کہ آج
لوگ تنقید کے معنی اکثر نقص تلاش کرنا یا صرف خوبیاں گنوانا سمجھتے
ہیں۔ اور ایسے تمام فیصلوں کو صرف اپنے جذبات اور معمولی فہم
و ادراک میں اسیر کئے رہتے ہیں۔ کلیم صاحب نے پہلی مرتبہ اس
جذباتیت کی فضا کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ نقاد اس
سے بچ کر معتدل اسلوب، اور فن کی کسوٹی پر فن پارے اور فنکار
کو پرکھنے کی استطاعت اور سوجھ بوجھ حاصل کر سکیں۔ انہوں نے
صرف ایک نقطۂ نظر سے وابستہ ہو کر رہ جانے میں نقاد میں "زنجاپن"
پیدا ہو جانے کا خطرہ محسوس کیا۔ اور اس طرح اس کی آزادیٔ فکر
پر ایک خاص طرح کی قدغن لگ جاتی ہے۔ مگر مشکل یہی ہے کہ جب
نقاد نے اصول تنقید بنائے کسی نہ کسی مکتبۂ فکر سے اس کا وابستہ
ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ اسی کا اسیر بن جاتا ہے۔
تنقید ہر طرف سے آزاد ہونے کا نام نہیں۔ اس کے حدود کسی
نہ کسی ادبی نظریئے کے فریم ورک میں گھر کر نقاد کے طریق کار کو
پابند بنا ہی دیں گے۔ اور کلیم الدین احمد صاحب بھی اس سے بچ
نہیں سکے ہیں۔ کہ ان کی تنقید بھی تجزیہ، ساختیات اور مغربی ادبی
پیمانوں سے ہوتی ہوئی انہدامی تنقید (DECONSTRU-
CTIVE) کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے تاہم کلیم
صاحب کی تنقیدوں کی گونج اردو تنقید کی تاریخ میں شاید ہی
کبھی مدھم ہو سکے وہ اپنے طرز کے منفرد نقاد کی حیثیت سے
اردو میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ ●

میرزا ادیب (پاکستان)

پاکستان میں ریڈیو ڈرامہ

ریڈیو ڈراما ظاہر میں ایک صوتی کھیل ہوتا ہے یعنی ایک ایسا کھیل ہے جو دیکھا نہیں جاتا ہے صرف سنا جاتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ریڈیو ڈرامے نے پانچ چھے سال، کم نصف صدی کا سفر طے کرلیا ہے۔ پارسی تھیٹر کے زوال پذیر ہونے کے بعد ریڈیو ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس نے ڈرامے کو نئی زندگی دی۔ اور یوں جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے ایک بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ ہوئی کہ آغاز کار ہی میں ریڈیو کو ایسی شخصیتوں کا مخلصانہ تعاون حاصل ہو گیا جو ڈرامے کی فن کی نزاکتوں سے بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ سید امتیاز علی تاج، رفیع پیر زادہ، سید عابد علی عابد اعلیٰ پائے کے ڈراما نگار تھے۔ اگرچہ موخر الذکر نام کی شہرت بہ حیثیت ڈراما نگار نہیں بطور فیچر نگار کے قائم ہے، تاہم سید عابد علی عابد کے فیچروں میں ڈرامائی عناصر بھی موجود ہوتے تھے۔

ریڈیو نے اصلاً ایک تربیت گاہ کی شکل اختیار کرلی تھی جس سے تربیت پاکر لوگ فلم میں بھی گئے۔ اور جب ٹیلیویژن نمود پذیر ہوا تو اس سے بھی منسلک ہوئے۔ اور یہ ریڈیو کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

گذشتہ دس سال کی مدت میں ریڈیو ڈراما کن مراحل سے گذرا، اس پر کیا بیتی، اور اب کیا بیت رہی ہے۔ بات کو سمجھنے کے لئے ان حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے جو ریڈیو ڈرامے کو درپیش ہیں اور جو اس پر مستقل اثرانداز ہو رہے ہیں۔ مگر اس سے پیشتر ریڈیو ڈرامے اور ریڈیو ڈرامے کے سلسلے میں جو کچھ تجربے ہوئے ہیں، ان کا ذکر ہو جائے تو بہتر ہے۔

ریڈیو ڈراما آوازوں کی دنیا میں اپنا عمل جاری رکھتا ہے تجربات آوازوں ہی کے توسط سے ہو سکتے ہیں۔ انسانی جذبات کی کوئی بھی کیفیت ہو، جذباتی کشمکش کا کوئی بھی مقام ہو، ذہنی تصادم کی کوئی بھی صورت ہو ـــــ اس کا اظہار آواز ہی کے پیچ و خم، تب و تاب اور نشیب و فراز سے ہوتا ہے۔ آواز کس موقعے پر کیا صورت اختیار کرے کہ اس موقع کا ظاہر و باطن سامع کو اپنی تمام جزئیات کے ساتھ پہنچ جائے، یہ ہے ریڈیو ڈرامے کی غرض و غایت۔

عام ڈرامے کی طرح ریڈیو ڈرامے میں بھی ایک تجربہ کرداروں ہی کی کرداری خصوصیات سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کردار ہے جو اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے، اس کی صحیح اس کی نفسیاتی کیفیات مکالمے سے زیادہ آواز کے پیچیدہ عمل سے بروئے کار آسکتی ہیں۔ ریڈیو ڈرامے میں ایسے تجربے

ـئے ہیں۔ ایسے بھی تجربے بھی ہوئے ہیں جن میں صرف ایک صدا
رنے تن تنہا مختلف کرداروں کا رول اپنی آواز کی کیفیت
فریعے سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں زیڈ اے بخاری مرحوم اور
محمد حسین مرحوم کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ مگر اصل تجربہ یہ ہے کہ
ایک غیر مرئی شئے کو بطور ایک کردار کے پیش کیا جائے۔ اور یہ
تجربہ سلیم شاہد نے کیا تھا۔ اور بڑی کامیابی کے ساتھ کیا تھا
ڈراما ظہیر کاشمیری کا تھا۔ "اجالا" کے نام سے۔ اس کے کردار
ہیں ایک دیوار، ایک کتا، ایک پاگل، اور ایک ہذیانی۔ ڈرامے
کا عمل ہوتا ہے رات کے دو بجے، یہ پروڈیوسر سلیم شاہد کا کمال
فن یہ ہے کہ انہوں نے "صوتی زیر و بم" سے دیوار کو ایک با
قاعدہ کردار کے روپ میں پیش کر دیا تھا۔ گذشتہ دس برس
میں کوئی ایسا تجربہ تو نہیں ہوا لیکن اس سے الگ ایک تجربہ
ضرور ہوا ہے یہ ڈراما انتظار حسین کا "آخری آدمی" ہے، جسے
بشیر زیدی نے نہایت نہایت کامیابی کے ساتھ پروڈیوس
کیا تھا۔ کاش ایسے اور تجربے بھی کئے جاتے۔ ایک تجربہ عشرت
رحمانی نے بھی کیا تھا۔ "فن اور زندگی" میں انہوں نے ایک
فن کار کی زندگی — عالم طفولیت سے لے کر آخری سانس
تک بڑی خوش اسلوبی سے دکھائی تھی۔ جب تک ٹیلی ویژن
پاکستان کے بڑے شہروں میں نہیں آیا تھا۔ ریڈیو کی مسابقت
اگر کسی سے تھی تو وہ فلم تھی۔ مگر فلم نے ریڈیو ڈرامے پر کوئی خاص
اثر نہیں ڈالا تھا۔ البتہ ٹی وی نے اس کی مقبولیت کی راہ
میں ایک بہت بھاری پتھر کی حیثیت ضرور اختیار کر لی ہے
ریڈیو ڈرامہ صرف ایک حس کے توسط سے باقی حواس سے تعلق
استوار کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ٹی وی ڈراما بصری
ڈراما ہے۔ آنکھوں کے سامنے عمل پذیر ہوتا ہے اس کے
طریق عمل اور انداز کارکردگی سے حواس خمسہ بیک وقت متاثر
ہوتے ہیں۔ اس میں بہت کم تخیل آرائی کی ضرورت پڑتی ہے۔
ویسے بھی انسانی فطرت ناصبور واقع ہوئی ہے وہ سہل

پر کچھ اور کا تقاضا کرتی ہے۔ ٹی وی ڈراما نے ریڈیو سے ایک
معقول حد تک زیادہ ناظرین کو دیا ہے اس وجہ سے ریڈیو
ڈراما خاصا پیچھے رہ گیا ہے۔

گذشتہ دس سال کی مدت میں ریڈیو کے مختلف
اسٹیشنوں سے باقاعدگی کے ساتھ ڈرامے نشر ہوتے رہے ہیں
ان ڈراموں میں بہت کم نئے ڈرامے سننے گئے ہیں۔ وجہ ظاہر
ہے پرانے لکھنے والوں نے ٹی وی کے میڈیم کو ترجیح دی ہے۔
اس کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے ریڈیو نے زیادہ تر
پرانے ڈرامے ہی براڈ کاسٹ کئے ہیں۔ اور بعض بہت مقبول
ڈرامے تو کئی بار نشر ہو چکے ہیں۔ مثلاً سید امتیاز علی تاج کا "قرطبہ
کا قاضی" جسے ہر ریڈیو پروڈیوسر نے ایک بار تو لازماً نشر کیا ہے
دوسرے اسٹیشنوں سے نئے اور پرانے مصنفوں
کے سماجی موضوعات پر مبنی ڈرامے نشر ہوئے ہیں۔ اور ہوتے
رہتے ہیں۔ لاہور ریڈیو کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل
ہے کہ یہاں سے نئے تاریخی ڈرامے نشر ہوئے ہیں۔ اور ڈرامے
کو موجودہ پروڈیوسر سید جعفر رضا نے بطور خاص کچھ مصنفوں
سے تاریخی ڈرامے لکھوا کر نشر کئے ہیں۔

بہر حال ریڈیو ڈراما مدھم رفتار سے اپنے راستے پہ
چلا جا رہا ہے۔ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا۔ بہر حال
یہ بھی غنیمت ہے کہ ریڈیو ڈراما آج بھی زندہ ہے اور تیز
رفتاری سے نہ سہی، آہستہ خرامی سے ہی سہی۔ اپنی زندگی کا
ثبوت تو دیتا ہی رہتا ہے۔ ریڈیو کا ماضی لوٹ کر نہیں آسکتا
مگر یہ تو ہے کہ ریڈیو ڈراما اپنی شاندار روایت کو ایک
حد تک ضرور برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے
کے سامعین شہروں میں بہت کم سہی، مگر دیہی علاقوں میں
تو یقیناً موجود ہیں۔

یہ تو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جن لوگوں کو
ٹیلی ویژن کا چسکا لگ چکا ہے وہ ریڈیو کی طرف کیونکر توجہ دیں گے

لیکن نئی ذہانتوں کی دریافت تو بہرصورت ممکن ہے۔ انہیں تربیت دی جا سکتی ہے ان کی بہت ہمت افزائی ہونی چاہئے ریڈیو ڈرامے کے لیے ان ذہانتوں کی پہلے بھی ضرورت تھی اور آج تو ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی ہے۔ تاج عابد اور رفیع پیرزادہ کے دور میں ریڈیو ڈرامے کی پبلسٹی کئی دن تک ہوتی رہتی تھی اس سے سامعین کے جذبہ اشتیاق میں اضافہ ہوتا تھا۔ آج کل ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اگر آج آپ کسی سے سوال کریں "ڈراما کیا ہے" ممکن ہے آپ کا سوال ریڈیو ڈرامے سے متعلق ہے، لیکن آپ کا مخاطب ٹی وی کے ڈرامے کا ہی ذکر کرے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل ڈرامے سے مراد ٹی وی ڈرامے ہی ہوتا ہے یہ صورت اس امر کی شاہد ہے کہ ٹی وی ڈراما ہمارے ہاں بہت مقبول ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

ٹیلی وژن ڈرامے کی مقبولیت کی کچھ تو بنیادی وجوہ ہیں، مثلاً یہ ایک نیا ذریعہ اظہار ہے۔ یہ بصری ڈراما ہے ناظر سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے اسے کہیں آنے جانے کی ضرورت قطعاً نہیں ہوتی۔ ضرورت صرف ٹی وی سیٹ کی ہے، گھر بیٹھے ڈرامے سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ٹی وی ڈرامے کی پیش کش میں پروڈیوسر کو ہر سطح پر ہر قسم کی سہولت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سہولت کا ہی ایک حصہ ہے کہ جب رواں صدی کی ساتویں صدی میں ٹی وی کی نمود ہوئی تو ایسے لوگوں کی کمی کا ضرور احساس ہوا جو ٹی وی کے فنی لوازم کے ماہر یا واقف کار ہوں۔ مگر جہاں تک تربیت اداکاروں اور ڈراما پروڈیوسروں کا واسطہ ہے۔ ٹی وی کو کچھ زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان

حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ٹی وی ڈراما کی مقبولیت صرف ان ہی سہولتوں کی مرہون منت نہیں ٹی وی ڈراما مسلسل آگے بڑھتا رہا ہے۔ اور ٹی وی ڈراما پروڈیوسروں نے اس سلسلے میں واقعی بہت محنت

گزشتہ برس میں متعدد بہت اچھے ڈراما پروڈ منظر عام پر آئے۔ آغا ناصر، کنور آفتاب احمد، محسن علی، شا خان، یاور حیات، محمد نثار حسین، بختیار احمد، عارف رانا عشرت انصاری، سید قنبر علی شاہ، سلیم احمد، حسینہ معین، کاشمیری، نصرت جاوید، ثریا فاطمہ بجیا، امجد اسلام ا سلیم چشتی، منو بھائی، تاج حیدر، انصار عبدالعلی، جمیل یونس جاوید، شاہد کاظمی، یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ ا یہ مطلقاً دعویٰ نہیں کہ پروڈیوسروں اور ڈراما نگاروں فہرست میں سب نمایاں افراد شامل ہیں۔

پچھلے دس برس کی مدت میں ڈراموں کی کئی سی بہت کامیاب رہی ہیں۔ خدا کی بستی (شوکت صدیقی زوری (انکل عرفی) پرچھائیں (حسینہ معین) تعبیر (سا آگہی (ثریا فاطمہ بجیا) حیرت کدہ، ایک محبت سو افس (اشفاق احمد) کافی ہاؤس (حمید کاشمیری) میرا نام منگ (تصنیف جبار توقیر ڈرامائی تشکیل حمید کاشمیری) یہ قر یہ فاصلے، آخر شب (صفدر میر) کیسے کیسے لوگ (انصار پروفیسر چارہ گر (تاج حیدر) جگ بیتی (جمیل ملک) (نصرت جاوید) ضرب، جمع، تقسیم (بانو قدسیہ)

ڈرامے کو زندہ رکھنے اور اس کا معیار بلند کر۔ پاکستان کے دو بڑے شہروں کا بڑا حصہ ہے۔ ایک تو ہے، دوسرا لاہور، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں ٹیلی وژن نے جو رول ادا کیا ہے وہ بہت اہم اور نمایاں ہے۔ کراچی ٹیلی وژن نے بیشتر بڑے خوبصورت ڈرامے اور ڈراموں کی سیریز پیش کی ہیں۔ ان ڈراموں میں

تنوع بھی ہے اور ہدایت کارانہ پختگی بھی۔ کراچی کے مقابلے میں لاہور کے ڈراموں میں وہ توازن نہیں ہے جو اجتماعی طور پر فن پارے کے لئے ضروری ہے۔ لاہور کے بعض ڈرامے بہت ہی بلند اور بعض بہت ہی پست رہے ہیں۔ ان میں موضوعات کی رنگارنگی نہیں مجھے رہ رہ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاہور جو صدیوں سے جنوب مشرقی ایشیا میں ایک تہذیبی گہوارے کی لحاظ سے اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔ آج اس کا تخلیقی جوہر کہاں غائب ہو گیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کراچی نے اپنی کمزوری محسوس کر لی اور اسے دور کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا اور لاہور اس فخر کو ہی ایک متاع گراں بہا سمجھ کر سینے سے لگائے بیٹھے رہا کہ اس کی روایات بہت تابناک، بڑی عظیم ہیں۔

لاہور ہو یا کراچی یا پاکستان کا اور کوئی دور افتادہ حصہ اس کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے لیکن میں اپنی مسلسل مایوسی کو چھپا نہیں سکتا۔ جہاں تک علم و دانش کا تعلق ہے۔ لاہور اپنے بلند مقام سے گرتا چلا جا رہا ہے۔ اور مسلسل گرتا چلا جا رہا ہے۔ ڈر ہے کہ اگر قلم چل نکلا تو نہ جانے کتنی ناگفتنی باتیں اس کے ہونٹوں پر آ جائیں۔ اس لئے ڈرامے کی طرف توجہ کرتا ہوں

لاہور سے دو کامیاب اور مقبول سیریز حال ہی میں ختم ہوئیں پہلی ایک محبت ایک افسانہ" اور دوسری "وارث"۔ پہلی سیریز کے پیچھے ریاض بٹالوی کی تخلیقی صلاحیتیں کارفرما رہی ہیں۔ اور دوسری سیریز مکمل طور پر امجد اسلام امجد نے لکھی ہے ریاض بٹالوی بطور ایک افسانہ نگار کے دنیائے ادب میں آئے تھے۔ اور جلد ہی صحافت کی وادی میں اتر گئے لیکن یہاں بھی ان کی شگفتہ تحریر سلامت رہی۔ ان کی رپورٹ بذات خود ایک افسانہ ہوتی ہے۔ گہرا مشاہدہ، وافر معلومات، اور سماجی مسائل کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر یہ اجزا ان کی رپورٹ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ "ایک حقیقت ایک افسانہ" انہی کی رپورٹوں کی بنیادوں پر تعمیر کئے ہوئے ڈرامے [illegible]

نے بہت پسند کیا ہے۔ بیشتر ڈرامے امجد اسلام امجد اور جمیل ملک نے لکھے ہیں۔ محمد علی چراغ کی بھی اس باب میں کوششیں قابل قدر ہیں۔ اس سیریز کی مقبولیت کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ ناظرین نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی رواں دواں زندگی کے مختلف پہلو دیکھے ہیں۔

ریاض بٹالوی کی طرح حمید کاشمیری نے کچھ عرصہ پہلے اردو ادب کو بڑے خوب صورت اور فکر انگیز افسانے دیئے تھے آج وہ ٹی وی کے بڑے معروف ڈرامانگار ہیں۔ ان کے ڈراموں کے پیچھے بھی افسانہ نگار حمید کاشمیری کا توانا اور بیدار ذہن بر سر عمل ہوتا ہے۔

ریاض بٹالوی اور حمید کاشمیری کے ساتھ ایک اور نام بھی آنا چاہئے۔ امجد اسلام امجد۔ یوں یہ ایک تکون بن جاتی ہے۔ امجد بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ "ساتواں در" کے مصنف "عکس" کے مترجم، اس کے علاوہ ایک متوازن ذہن کے مالک تھا بھی لیکن ان کی شعری وراثت تو وقتی طور پر ان سے چھن گئے ہیں اور "وارث" کی مقبولیت کا ورثہ نیا بڑوں کے [illegible] سے ان کے حصہ میں آگیا ہے۔

ایک مرتبہ امجد اسلام امجد ایک تقریب میں مدعو تھے۔ کسی نے وارث کا ذکر چھیڑ دیا۔ اب کیا تھا ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کے بارے میں رائے کا اظہار کرنے لگا۔ کسی کو اس کی فلمی تکنیک کا اعتراض تھا۔ کسی کو طوالت پر، مگر ایک معاملہ میں سب متفق تھے۔ اور یہ معاملہ ہے وارث کے اختتامیے کا۔ ہر ایک اس بات پر معترض تھا کہ اس کا انجام ان نیچرل اور غیر مناسب تھا چودھری حشمت کو اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے کیفر کردار تک نہیں پہنچایا گیا اور یہ ڈرامے کا سب سے بڑا عیب رہا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ڈرامہ سیریز کو سب نے دیکھ [illegible] جو اس کے کسی نہ کسی پہلو، رخ یا جہت پر اعتراض کر

تھے ۔ وہ بھی اسے باقاعدہ دیکھتے رہے ۔ کیا یہ وارث کی ہمہ گیر مقبولیت پر شاہد نہیں ۔؟

میں نے اس تقریب کے لوگوں بہت سے بھی اور بعض ایسے افراد سے جو اچھی خاصی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں یہی اعتراض سنا ہے لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس سے زیادہ بہتر اور [illegible] اختتامیہ شاید ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔

کیا ہماری عام اور روزمرہ کی زندگی میں ظلم کرنے والے کو لازماً سزا مل جاتی ہے ؟ ہمارا مشاہدہ عام طور اس کی تائید نہیں کرتا ۔

ایک خالق کو سچائی کا خیال رکھنا چاہئے ۔ یہ سچائی ایک واقعہ بھی ہو سکتی ہے ۔ اور ایک کردار بھی ۔ ایک کردار کی سچائی یہ ہے کہ اس کی داخلی شخصیت کا ارتقا اس کے شخصی تقاضوں کے زیر اثر ہونا چاہئے ۔ آج ملٹن کا SATAN اور گوئٹے کا ڈاکٹر فاؤسٹ (مفیسٹوفلیس) کیوں زندہ ہیں ۔ ؟ صرف اس وجہ سے ان کے مصنفوں نے اپنے کرداروں کی سچائی کو مجروح ہونے نہیں دیا ۔

ایک بڑا کردار ۔ وہ عام اخلاقی مسلمات کو کتنا ہی پامال کیوں نہ کرے ۔ اس کی اپنی ایک کرداری عظمت ہوتی ہے چودھری حشمت بھی ، [illegible] ہے ، بہرحال ایک بڑا کردار ہے ۔ اور ایسا کردار جو ٹوٹ تو سکتا ہے ، جھک نہیں سکتا ۔ اس کے کردار کی عظمت اسی میں تھی کہ وہ موت کے لئے بھی کسی کا احسان نہ اٹھائے ۔ باقی رہ گیا یہ اعتراض کہ اس طرح اس نے لوگوں کی ہمدردی حاصل کر لی ہے حالانکہ وہ برا کردار ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک کردار کی حد کمال یہ ہے کہ وہ ایک ہیرو بن جائے ۔ اگر امجد اسلام امجد اس کے داخلی منطقی تقاضے سے صرف نظر کر کے عام نظریئے زیادہ صحیح یہ کہ فلمی نظریئے پر عمل کر کے لوگوں کے ہاتھوں اسے مروا ڈالتے تو یہ کردار واقعی مر جاتا ۔ اس ناظرین تو خوش ہو جاتے ، مگر چودھری حشمت علی جو آج ایک ہیرو بن گیا ہے ۔ اپنی بلندیوں سے گر کر گمنامی کی تاریکیوں میں اتر جاتا ۔ "وارث" کی انتہائی کامیابی

کے مستحق تنہا امجد نہیں ۔ اس کے پروڈیوسر غضنفر علی اور نصرت ٹھاکر کے علاوہ اداکار بھی ہیں ۔

اشفاق احمد ہمارے بڑے ڈرامہ نگار ہیں ۔ انہیں کہانی لکھنے کے فن میں بڑی دسترس حاصل ہے ۔ اب تک اپنے ڈراموں میں انہوں نے زندگی کے بعض بہت اہم اور بعض بڑے انوکھے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ مثلاً حیرت کدہ کے ڈرامے ان کا موجودہ سیریز (اور ڈرامے) کو پسند نہیں کیا جا رہا ہے ۔ اشفاق احمد جو اپنے ڈراموں میں بہت کچھ دے چکے ہیں اپنے ان ڈراموں میں بھی دے رہے ہیں ۔ مگر بہت کچھ کے مقابلے میں بہت کم ۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اشفاق اپنے کسی ڈرامے میں کچھ نہ دے لیکن قصہ یہ ہے کہ ان سے حسب معمول بہت کچھ کی توقع رکھتے ہیں جو پوری نہیں ہو رہی ۔

اشفاق کے یہاں واقعی رفتار سست رہتی ہے ۔ وہ اپنے مرکزی نقطۂ نظر کے ارد گرد آہستہ آہستہ واقعات پھیلاتے چلے جاتے ہیں ۔ اور ان واقعات سے روشنی کی لہریں اٹھ اٹھ کر مرکزی نکتے کو ایک ایسا نقطۂ منور بنا دیتی ہیں ۔ جو برابر پھیلتا رہتا ہے لیکن موجودہ سیریز میں صرف سست رو واقعات ہیں ۔ جو اپنی روشنی خود ہی سمیٹ کر ختم ہو جاتے ہیں ۔ مرکزی نکتہ ابھر نہیں سکتا ۔ ان میں بے کیف تفصیل نگاری بہت زیادہ ہے ۔ دوسری خامی یہ ہے کہ یہ تفصیل کسی نظریئے کی صداقت کے لئے ٹھوس بنیاد مہیا نہیں کرتی ، جیسا کہ "سردی اور سارد" کی بنیاد محض ایک جذباتی مفروضہ ہے ۔ تیسری خامی یہ ہے کہ ان میں عمل اور فعلیت کا بڑا فقدان ہے ۔ لمبی چوڑی بحثیں اپنی جگہ کتنی ہی دلچسپ اور پر لطف کیوں نہ ہوں ۔ ڈرامے کے اندرونی ارتقائی عمل سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں ۔ ڈرامے میں تقریباً ایک ایسا شہاب ثاقب ہے جو اپنے حقیقی وجود سے الگ ہو کر محض خلا میں معلق ہو کر رہ جاتا ہے ۔

میں نے جب سردی اور سارد دیکھا تھا تو میرا پہلا

اور آج بھی یہی ہے کہ اگر کسی مضبوط دیوار پر تعمیر کیے ہوئے ڈرامے
کو ہدایت کار کی ایسی ہنرمندی اور اداکاروں کا ایسا اداکارانہ کمال
حاصل ہو جاتا تو ٹی وی کے ڈراموں کی تاریخ میں ایک معجزہ بن جاتا
میں نے عرض کیا ہے کہ اشفاق اپنے ہر ڈرامے میں کچھ نہ کچھ
ضرور دے جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "گونگا اور کھیں بہادر" کے آخر
میں گونگے کا جنازہ اٹھنا بہت ضروری تھا۔ میرے بعض دوست کہتے
ہیں کہ اشفاق نے بیچارے کا جنازہ نکال کر ہی چھوڑا ہے۔" مگر یہ بھی
تو سوچیے کہ اگر یہ جنازہ نہ اٹھتا تو اس کے سائے میں ٹوپی میں علامتی
کردار کس طرح ابھر کر زندگی اور معاشرے کا تضاد واضح کر سکتا تھا؟
یہاں اشفاق کی ذہانت و آگہی داد طلب ہے۔ ایسی تابناک ذہانت
کی توقع اشفاق ہی سے کی جاتی ہے۔

اشفاق کے ہاں اور بہت حد تک بانو قدسیہ کے یہاں
بھی واقعات کی ترتیب میں بڑا حسن بڑی جامعیت ہوتی ہے۔
جذباتی تصادم ان کے ڈراموں میں زیریں سطح پر جاری رہتا ہے۔
دونوں علیحدہ ہنگ تصادم کے قائل نہیں۔ مگر اشفاق بانو سے
ایک خصوصیت میں الگ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خصوصیت ہے
ان کی علامت نگاری۔ ایک مثال تو اوپر دی جا چکی ہے۔ اور
دوسری ان کے ڈرامے "قرۃ العین" میں ہے۔ اشفاق کی علامت
صرف علامت نہیں رہتی۔ باقاعدہ ایک کردار بن جاتی ہے۔ اور
میں سمجھتا ہوں کہ اس خصوص میں اشفاق پاکستان کے واحد
ڈرامہ نگار ہیں۔

ٹی، وی نے کئی نئے نام دیے ہیں۔ ان میں نمایاں ترین
نام "تاج حیدر" ہے۔ تاج حیدر نے اپنے ڈراموں میں اچھی خاصی
فنکارانہ سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔ وہ ڈرامہ نگار ہونے کے
علاوہ جمیل ملک کی طرح ایک منجھے ہوئے اداکار بھی ہیں۔ جمیل
ملک ریڈیو سے سالہا سال وابستہ رہے ہیں۔ اور اب انہوں
نے ٹی وی کے ڈراموں میں بھی خاص نام پیدا کیا ہے۔

انصار عبدالعلی نے عام ڈگر سے ہٹ کر ڈراموں
کی ایک سیریز لکھی ہے۔ جو بہت کامیاب اور مقبول رہی ہے۔
"کیسے کیسے لوگ" اس سیریز میں انہوں نے مشاہیر کے کارناموں
اور ان کے حوادث حالات کے سلسلے میں اجمالی اشارات دے کر
ہر شخص کی پوری ذات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

حسینہ معین بھی ٹی وی کے ہی توسط سے منظر عام پر آئی
ہیں۔ یہ متوسط طبقے کے عام الجھنوں کی عکاسی ہیں۔ مکالمہ ڈرامیت
لکھتی ہیں۔ اپنے کرداروں کی نفسیاتی گہرائیوں میں نہیں جاتیں۔
ان کے ڈراموں میں کرداروں کی نقطۂ ایک ہی سطح ہوتی ہے۔ ثریا
فاطمہ بجیا کا رنگ ان سے مختلف ہے۔ ان کی تمثیلوں میں آگہی کی
ایک لہر شروع سے لے کر آخر تک متحرک رہتی ہے۔ بجیا کچھ کہنے کے
لیے لکھتی ہیں۔ ان کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ابھی ہر تحریر سے
محض تفریح ان کے پیش نظر کبھی نہیں رہی۔

منو بھائی کے یہاں فنی پختگی ملتی ہے۔ بکھرے ہوئے مواد کو
بڑے سلیقے سے، بڑی ہنرمندی سے ڈرامے کا روپ دیتے ہیں۔
سلیم چشتی کے ہاں بھی یہی خصوصیت ہے۔

سلیم احمد اپنی دوسری تحریروں کی طرح ڈراموں میں بھی ایک
مفکر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ موجودہ زندگی کے مسائل کے
ذریعہ وہ گہری سوچ سے کام لیتے ہیں۔ "تعبیر" میں انہوں نے تحریک
پاکستان کے پس منظر میں جا کر ماضی کے واقعات کا تجزیہ کیا ہے۔
اور ان محرکات کی نشان دہی کی ہے۔ جو تحریک پاکستان پر منتج ہے

آج کل اسٹیج پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسٹیج تھیٹر کے کچھ زیادہ
امید افزا نتائج کے امکانات نہیں ابھرتے۔ ریڈیو ڈرامے نے
بوجوہ خاص اپنی مقبولیت کھو دی ہے۔ اس وقت لے دے کے
ایک ٹی وی ڈراما ہے جس نے اپنی بڑی داخلی توانائیوں کا ثبوت
دیا ہے۔ ٹی وی ڈراما برابر آگے ہی قدم اٹھا رہا ہے۔ اس ڈرامے
نے اظہار و ترسیل کے لیے ایک نئے افق کو اس طرح چھو لیا ہے۔
کہ اس افق کے عقب میں کئی اور افق روشن ہو گئے ہیں۔

اب کچھ ضروری باتیں عرض کرتا ہوں:

(۱) ریڈیو ڈرامے کے باب میں یہ شکایت سنی جاتی رہی ہے کہ بعض حضرات اصل مصنفوں کا حوالہ دیئے بغیر ان کے افسانوں یا ڈراموں کو "اپنے رنگ" میں ڈھال لیا ہے۔ ٹی، وی، ڈراموں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاتی ہے۔ اور تو اور ہمارے ایک بڑے اور نامور ڈرامہ نگار نے اپنے بعض ڈراموں کے لئے "تذکرہ غوثیہ" سے مواد لیا۔ اور کوئی حوالہ نہیں دیا۔ بعض ڈراموں میں تو صرف ناموں کی تبدیلی ہی کو روا سمجھا گیا ہے انتظامیہ کو سختی کے ساتھ اس مذموم حرکت کو روکنا چاہیے۔

(۲) تجرباتی ڈرامے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ٹی وی نے ایک بڑا خوبصورت تجربہ کیا تھا جس میں سارا ڈرامہ صرف ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتا ہے۔ ٹی وی میں ایسے باصلاحیت پروڈیوسر اور اداکار موجود ہیں کہ نئے تجربوں کی ہر وقت گنجائش نکل سکتی ہے۔

(۳) ٹی وی پروڈیوسروں نے غیر ملکی ناولوں کی طرف بھرپور توجہ کی ہے: "وومن ان وہائٹ" (ولکی کولنز) "اے پورٹریٹ آف اے لیڈی" (ہنری جیمز) یہ قربتیں یہ فاصلے (فادر اینڈ سنز تورگنیف) اور بھی کئی ناول ہیں۔ یہ اچھی کوشش ہے مگر معلوم نہیں اردو کے کلاسیکی ادب کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے: فسانہ آزاد، توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، مولانا عبدالحلیم شرر اور مولوی سراج الدین کے ناول، موجودہ دور میں بھی متعدد ایسے ناول لکھے گئے ہیں۔ جو ٹی وی سیریز کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

چند برس پہلے کہانیوں کو ڈراموں کی صورت دی گئی تھی منٹو کی کئی کہانیاں کامیاب ڈراموں کی شکل میں دکھائی جا چکی ہیں۔ یہ سلسلہ پھر شروع کیا جا سکتا ہے۔ پارسی تھیٹر کے کچھ ڈراموں کو بھی اڈاپٹ کیا جا سکتا ہے۔ اردو کی بعض مثنویوں کی طرف بھی توجہ کی جا سکتی ہے۔ پارسی تھیٹر کے بعد اور ریڈیو ڈرامے کے درمیان کچھ ادبی قسم کے ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ مولانا شرر، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، حکیم احمد شجاع، فضل حق قریشی، مولانا ظفر علی خاں، (انہوں نے ایک ڈرامے کا ترجمہ کیا تھا تولہ بھر ریڈیم) اور دوسرے لوگوں نے جو ڈرامے لکھے تھے کے کچھ تعارفی بیان کے ساتھ دکھائے جا سکتے ہیں۔ ان سے ہمارے کلاسیکی ادب سے ایک حد تک واقفیت ہو سکتی ہے۔ ٹی، وی کا مقصد تفریحی ہی نہیں معلوماتی بھی ہونا چاہئے۔ اور اس طرح مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

(۴) آج کل ٹی، وی کے ڈراموں میں تفصیلی مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں۔ اتنی تفصیلات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف وہی تفصیلی مناظر ضروری ہوتے ہیں جنھیں الگ کر دینے پر ڈرامے کی معنویت متاثر ہو۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ایک ڈرامے کو جس کا تیس منٹ سے زیادہ نہیں۔ غیر ضروری تفصیلات سے گراں کرکے پون یا ایک گھنٹے تک پھیلا دیا جائے۔

(۵) ٹی، وی ڈراموں کی ایک معقول تعداد دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس ادارے نے زیادہ تر واقعاتی ڈرامے لکھے ہیں۔ اس کے توسط سے کرداری ڈرامے بہت کم دکھائے ہیں۔ واقعاتی ڈراموں سے میری مراد ایسے ڈرامے ہیں جن میں واقعاتی عنصر کو کردار یا کرداروں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی گئی ہو۔ واقعات کے بغیر کردار کیسے ابھر سکتا ہے یہ بالکل صحیح ہے مگر ساری توجہ واقعاتی ترتیب پر صرف کر دی جائے تو کردار اہمیت کے لحاظ سے ثانوی درجہ پر رہ جاتا ہے ایسا بھی ہو کہ ایک کردار کو ساتھ لے کر چلا جائے۔ اور زندگی کے خاص واقعات کے تناظر میں اس کے نفسیاتی ردعمل کو مرکز توجہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ کرداری ڈرامے مثلاً اشفاق احمد کا "بیٹی کا بوجھ" شاذ و نادر ہی پیش ہوتے ہیں۔

اس جائزے کی آخری شق ہے "ڈرامائی کتاب میں مطبوعہ ڈرامے جو گذشتہ دس برس میں ہمارے سامنے آئے۔ اس سے پیشتر کہ اس باب میں کچھ عرض کروں کچھ امور کی وضاحت

دیتا ہوں۔

(۱) یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود مطبوعہ کتابوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

(۲) اس فہرست میں تراجم کو شامل نہیں کیا گیا۔ صرف طبع زاد ڈراموں کے مجموعوں کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور ان میں سے صرف جدید ڈراموں کے، بچوں کے ڈرامے کو بھی شامل نہیں کیے گئے۔

(۳) ان ڈراموں کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا۔

اردو ادب میں سب سے کم چھپنے والی صنف ڈرامے کے سوا اور کوئی نہیں۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں تو یہ حال ہے کہ بعض اوقات ڈراما اسٹیج پر آنے سے پہلے ہی چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے رویے کی مطلق ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ ناشر حضرات کی ڈرامے کی اشاعت سے گریز کرنے کے معاملے میں دلیل یہ ہے کہ قارئین ڈراموں کو اسٹیج پر، ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر دیکھنا اور سننا زیادہ پسند کرتے ہیں، مگر پڑھنا پسند نہیں کرتے، اس لئے ڈرامے نہیں چھپتے۔ یہ دلیل مکمل طور پر تو نہیں جزواً ضرور صحیح ہے۔ مکمل طور پر اس وجہ سے نہیں کہ ڈرامے بعض شعری مجموعوں سے تو لازماً زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے یہاں ڈرامہ پڑھنے کا رجحان نسبتاً کم ہے۔ تاہم جو ڈرامے چھپے ہیں، بکے بھی ہیں۔ اس رجحان کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ اگر ڈرامے یا ڈراموں کے مجموعے کو اچھے انداز میں چھاپا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ادب کے قارئین اس کا مطالعہ نہ کریں۔ انصار عبدالعلی کے دو مجموعے "شہ رگ" اور "کیسے کیسے لوگ" بہت خوبصورت انداز میں چھاپے گئے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر مجموعے کا تو پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ اور ثانی الذکر مجموعہ بھی بڑی تیزی سے لوگوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

پچھلے دس برس میں یہ طبع زاد ڈرامے چھپے ہیں۔ چھپے ہی سے مراد کتابی صورت میں، رسائل کی اشاعت صورت میں نہیں۔

اجالے سے پہلے۔	ابراہیم جلیس۔
وہ لوگ	ہاجرہ مسرور
مزاج،	اجاگر وارثی،
لال قلعہ سے لالوکھیت،	خواجہ معین الدین
اُلجھن	مہر نگار مسرور
ڈرامے چند	عشرت رحمانی
لال قلعے کی شام	″ ″
شیخو، ماہ رخ	رضیہ بٹ
مثال کے طور پر	رضی ترمذی
سرخ بالوں والی لڑکی،	انور سجاد
اک ترے آنے سے پہلے	بانو قدسیہ
آغا ناصر کے سات ڈرامے	آغا ناصر
شہ رگ	انصار عبدالعلی
کیسے کیسے لوگ	″ ″
سوگوار	میرزا ریاض
کافی ہاؤس	حمید کاشمیری
شیشہ و سنگ۔	میرزا ادیب
ماموں جان اور ماموں جان	″ ″

-۲۰-

ممتاز احمد خاں (پاکستان)

آبلہ پا ـــ ایک جائزہ

گو کہ "آبلہ پا" کی اشاعت کو آج تقریباً اٹھارہ سال گزر چکے ہیں لیکن رضیہ فصیح احمد کا یہ ناول تیزی سے بدلتی قدروں کے موجودہ دور میں بھی اپنی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔

آبلہ پا۔ پاکستان کے ان گنے چنے ادبی ناولوں میں سے ایک ہے جن کی اپنی ایک جگہ ہے بلکہ اس ناول کو اگر قابلِ ذکر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کسی بھی ناول کی تازگی کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ جب ناول نگار عصری حقیقتوں کو ابدی بنا دے تو کہانی وقت کے ساتھ ساتھ چلتی ہی رہتی ہے۔ اور اس میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ ٹھہراؤ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہانی کا موضوع فرسودہ ہو گیا ہے اور اسے ماضی کے سرد خانے میں ڈال دیا جائے تو بہتر ہے۔ "آبلہ پا" کی تھیم کا تعلق زوال پذیر معاشرے سے ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں مادیت پرستی اور کھوکھلے اخلاقی رویوں نے انسان سے مسرتوں اور قلبی اطمینان اور ذہنی سکون کی دولت چھین لی ہے۔

پاکستان میں چھٹا عشرہ سماجی لحاظ سے ایک اہم موڑ ہے یوں تو اس ملک میں پرانی قدروں اور فرسودہ روایات کے خلاف جہاد نئے تعلیم یافتہ طبقے نے شروع ہی سے برپا کر رکھا تھا۔ لیکن اس عشرے کے دوران اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔ دولت کے حصول کی خواہش اور مغربی اندازِ فکر نے مشترکہ خاندانی نظام کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسد کا ہیرو ایک ویلن ہے وہ اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو ا کے بل بوتے پر معاشرتی لحاظ سے اونچا مقام حاصل کر لیتے مادیت پرستی اور مغرب کی ذہنی غلامی کی بنا پر اپنے خاند رشتوں سے بے نیاز ہو کر نئے مصنوعی اخلاقی رویوں کے اپنے ماضی سے پیوستہ رہ پاتے ہیں اور نہ نئی منزلوں لگا پاتے ہیں۔ اسد کا المیہ یہ ہے کہ اس نے غریب گھرانے میں پرانی روایات اور فرسودہ سوچ سے چپٹا ہوا ہے یہ اسے تعلیم ہے اور خود اقتصادی لحاظ سے تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب اسد کو اپنے گھرانے کے اس احسان کا بدلہ چکانا اس موقع پر اس کی سوچ منفی رخ اختیار کر لیتی ہے اس یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے گھرانے کے ماحول سے دل بردا ہے اسے ان لوگوں سے گھن آتی ہے جو اس کو کسی قابل کے لئے قربانی دے چکے ہیں۔ اب وہ اسی میں عافیت سم ہے کہ فراریت کی پالیسی اختیار کرے۔ وہ اپنے گھرانے ذہنی طور سے متذبذب اور مفاد پرست شخصیت کا رو لیتا ہے۔ وہ اپنے منفی آدرشوں سے ہم آہنگ ہونے کے اور منافقت کا سہارا لے کر صبا جیسی تعلیم یافتہ روش اعلیٰ آدرشوں کی حامل شخصیت کو اپنے جال میں پھانسو

صبا میں "پتی ورتا" کا جذبہ جبلی طور پر موجود ہے۔ بنیادی طور پر وہ سچ پرست ہے۔ پر وہ نہیں جانتی کہ اسد زندگی کی اعلیٰ قدروں کا دشمن ہے۔ ان دونوں کے درمیان بوبی ہے جس کا پلاٹ سے گہرا تعلق ہے۔ یہ بچہ جسے اسد اپنا خون سمجھتا ہے صبا اور اسد کی قربت کا ضامن بن جاتا ہے لیکن اسد صبا پر اعتماد نہیں کرتا۔ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اس کی منافقت اور کھوکھلا پن صبا پر آشکارا ہوتا جاتا ہے۔ اب اسد کا نیا روپ سامنے آتا ہے وہ سادیت پسند SADIST بن جاتا ہے۔ اور صبا کو ذہنی صدمات و اذیت پہونچانے لگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ انسان کے اعمال کے بطن میں ان کے ردِ عمل بھی چھپے ہوئے ہوتے ہیں، اسد کو بھی ایک شدید جھٹکا لگتا ہے جب کہ امریکہ سے اسے ایک پادری کا خط ملتا ہے جس میں وہ اسے مطلع کرتا ہے کہ کیتھرین نے مرتے ہوئے اس کے روبرو یہ اعتراف کیا تھا کہ بابی اس کی کوکھ میں اس سے ملاقات ہونے سے قبل ہی پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ معلوم ہو کر کہ بابی اس کا خون نہیں ہے اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ وہ شدید ہیجانی کیفیت کے دوران بابی کو قتل کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا ہے وہاں اس کا ضمیر جاگتا ہے اور وہ بھی کیتھرین کی طرح اپنے اعترافات تحریری شکل میں پیش کرتا ہے۔

ناول میں چمنستان ہوٹل پورے معاشرے کی علامت کے طور پر موجود ہے، یہاں ہر طبقے کے کردار موجود ہیں۔ کہ جن کی تمام نفسی کیفیات کو رضیہ فصیح احمد نے فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ان کرداروں میں کروڑپتی، لکھ پتی، نو دولتیے، متوسط اور غریب گھرانوں کے افراد اور بڑے طبقے کو خونخوار نظروں سے دیکھنے والی گندی روایات کی اسیر دھوبنیں، مہترانیاں، بیرے محنت کش لوگ اور دیگر افراد —— سب اپنے اپنے حال میں مست دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ ناول کے پلاٹ کے اہم دائرے کے اندر چھوٹے چھوٹے دائرے ہیں۔ یہ سب لوگ اپنی تمام تر شر پسندی، غلیظ خیالات، جنسی کجروی اور بوسیدہ رسم و رواج سے قطع نظر اپنی آنکھ کی شہتیر کی موجودگی سے بے پرواہ اپنے سے اونچے طبقے کے لوگوں کے تنکے کے برابر عیب پر گہری نظر رکھتے ہیں:

"اے ہے یہ بالشت بھر کیل ایسی ایڑیوں پہ
کیسے ٹھمک ٹھمک کر چلتے ہیں کہ انگ انگ ہلے
ہے میں تو سچ مچ آنکھیں نیچی کر لوں ہوں"

"اے ہے پہلے تو آگے سے یہاں یہاں تک
گلے کھلے رکھے تھیں۔ اور اب یہ نیا فیشن چلا
ہے اللہ مارا کہ ساری پیٹھ ننگی، اے لو آگایا
تو دکھا لیا نا دل بھر کر —— اب پچھایا دکھانے
کی باری ہے"

"اے ہے جو تم عراقی بیگم کے ملات کے کپڑے دیکھ
لو۔ یہ گلابی لیس، ادھر ادھر اٹکی ہوئی اور وہ
مہین ایسے کہ جسم تو کیا جسم کے اندر کی چیزیں بھی
دیکھ لو"

یہ وہ تبصرے ہیں جن میں چھوٹے طبقے کی ذہنیت کی رضیہ فصیح احمد نے بھرپور عکاسی کی ہے۔ یہاں انہوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جو اس طبقے کی اپنی زبان ہے ان الفاظ کے پس منظر میں ان لوگوں کی جھنجھلاہٹ، احساس محرومی اور حسد صاف طور پر نمایاں ہیں۔ اب جہاں تک اسد صبا اور دیگر کرداروں کا تعلق ہے ان کی منظرکشی بھی وسیع انداز سے کی گئی ہے۔ رضیہ فصیح احمد کی خوبی یہ ہے کہ وہ کردار کے ارتقا کو خوبصورتی سے ابھارتی ہیں۔ اور ان کے کردار پر یہ لیبل نہیں چسپاں کیا جا سکتا کہ وہ اوریجنل نہیں ہے۔

رضیہ فصیح احمد کے اس ناول کا تھیم اخلاقی، سماجی اور معاشی شکست و ریخت سے دوچار ایک ایسے کردار کا المیہ ہے جو مصنوعی اقدار اور مغربی رویوں کے زیر اثر ایسی راہ کا انتخاب کرتا ہے جو اسے ایسی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔ کہ جس میں سے اوپر آنے کے بجائے وہ نیچے ہی دھنستا چلا جاتا ہے رضیہ فصیح احمد یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ اس عہد کا فرد جب تک اپنے لئے دیانت داری حقیقت پسندی اور خلوص ومحبت پر مبنی اقدار کی تشکیل نہیں کریگا تب تک اسے مختلف المیوں سے دوچار ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔

رضیہ فصیح احمد نے ناول کو خطوں کے ذریعہ بیان کیا ہے یہ ایسی تکنیک ہے جسے اکثر و بیشتر برتا گیا ہے۔ ناول میں تین حصے ہیں ان میں کبھی کوئی کردار کہانی بیان کرتا ہے۔ اور کبھی رضیہ خود اس پروسیس PROCESS میں شریک ہو جاتی ہیں۔ جس سے قاری ذہنی جھٹکے بھی کھاتا ہے۔ اگر رضیہ فصیح احمد اس ناول میں کہانی بیان کرنے کے لئے اپنے افسانوں والی ہی تکنیک استعمال کرتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔ پھر یہ کہ اولین حصے میں جو کہ تقریباً ایک سو نوے صفحات پر مشتمل ہے کہانی انتہائی سست روی سے آگے بڑھتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو بقیہ دو حصوں میں کہانی کے ٹیمپو TEMPO کو ضرورت سے زیادہ تیز کرنا پڑا۔ تاہم ان تمام باتوں کے باوجود کہانی میں جھول نہیں پیدا ہوا۔ جو اس ناول کی کامیابی کی دلیل ہے۔

"آبلہ پا" نے پاکستانی ناولوں کے میدان میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ اور نہ کوئی نیا موڑ پیدا کیا۔ جو بحیثیت مجموعی ناول کی صنف کے ارتقا کا سبب بنتا۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ پاکستان میں ناول نگاری کا جو آہستہ رو سلسلہ چلا آ رہا ہے یہ ناول اس سلسلے کی اہم کڑی ضرور ثابت ہوا اس لئے کہ جہاں کم ناول لکھے جا رہے ہوں۔ وہاں پر لکھا جانے والا ناول ایک دوسرے ناول کو جنم دینے کا باعث ضرور بنتا ہے۔ لہٰذا "آبلہ پا" کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے فکشن میں قابل ذکر مقام رکھتا ہے۔ ●

بقیہ ایک کہانی جو مجھے خود پسند ہے

بہت بہت شکریہ مائی ڈارلنگ نیلو اور سنو،
میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے مجھ سے شادی کیوں کی۔؟ اگر اس لڑکی سے اتنی ہی محبت تھی تو زندگی بھر کنوارے رہتے۔ ایک گرجدار قہقہہ لگاتے ہوئے جملہ ادا کیا گیا۔

نیلو، انسانی جسم کی کچھ ضرورتیں بھی ہوتی ہیں۔ جنسی جذبات کی آگ بجھانے کے لئے ایک شریف آدمی چکلے اور کوٹھے پر جانے سے رہا۔ اور پھر اس ضرورت کے تحت آدمی بار بار چکلے کے چکر کیا لگائے میری پیاری گڑیا خدا نے آدمی کو پیٹ کی بھوک اور جسم کی بھوک دے کر خوب بے وقوف بنایا ہے۔ اسی لئے آدم کا ہر شخص ایک دوسرے کو بے وقوف بناتا ہے۔

— بس بس اب تم بھی بہکنے لگے۔ سوئچ آف کر دو اور آجاؤ

• کمرے میں مکمل اندھیرا چھا گیا لیکن مجھے نیلو کے شعلے کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹ صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ میں لحاف میں داخل ہو رہا ہوں، مکمل طور پر جانور بننے کے لئے ●

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

قاضی عبدالودود

(جن کا انتقال ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میں ہوا)

تحقیق کا دوسرا نام قاضی عبدالودود ہے۔ قاضی عبدالودود ان نامور ممتاز اور محققوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی تحقیقی کاموں کے لئے وقف کردی تھی۔ قاضی صاحب نے لندن سے بیرسٹری کے امتحانات پاس کئے۔ مگر خرابی صحت کی وجہ سے وہ پریکٹس جاری نہ رکھ سکے۔ تحقیق سے ایسا شغف پیدا ہوا کہ ساری زندگی تحقیق ہی میں گذار دی۔ شروع میں سیاست میں بھی حصہ لیا۔ مگر بعد میں کانگریس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ انہوں نے سیاسیات اور معاشیات کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ کمیونزم سے متعلق لیشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "لیشن کا قول ہے کہ معاہدے توڑے جانے ہی کے لئے ہوتے ہیں میں کبھی ایسی جماعت پر جس کا یہ عقیدہ ہو بھروسہ نہیں کرسکتا کمیونسٹوں نے ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو جو سزا دی ہے وہ میں بھول نہیں سکتا۔ ایک فرد جس طرح غلامی کی سطح پر پہونچا دیا جاتا ہے اسے میں نظر انداز نہیں کرسکتا"

یہ اچھا ہوا کہ حالات و واقعات کا مشاہدہ کرکے قاضی صاحب سیاست کے بھنور سے جلد نکل آئے۔ ورنہ اردو زبان ایک عظیم محقق سے محروم ہو جاتی۔ قاضی صاحب نے تحقیقی کام کا آغاز اس انداز سے کیا کہ اس میدان میں انہوں نے اپنی دھاک بٹھا دی۔ انہوں نے فارسی اور اردو ادب میں جو تحقیقی کام کئے اس سے تحقیق کا معیار صرف بلند ہی نہیں ہوا بلکہ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں:

> "قاضی صاحب نے اردو میں تحقیق کو ایک باضابطہ شعبہ بنا دیا اور اسے نہ صرف تنقید سے ممیز بلکہ ممتاز بھی کردیا ہے۔"

قاضی صاحب کا تحقیق کے سلسلے میں ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے بہت سے جعلی اشعار اور الحاقی اشعار کی چھان بین کی، اور ان کھوج لگا کر یہ بتایا کہ بعض اشعار ان شعرا کے نہیں ہیں جن سے انہیں منسوب کیا جاتا ہے اس طرح ایسے اشعار کی روشنی میں اگر اس شاعر کی شاعرانہ حیثیت کا جائزہ لیا جائے گا تو تنقید نگاری کا جو نتیجہ نکلے گا وہ صائب اور درست نہ ہوگا۔ اس طرح نقاد جوان شہ پاروں کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرے گا وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا۔ اور اس طرح وہ ایک ناقد کے فرائض منصبی ادا کرنے سے قاصر رہے گا اس طرح بقول یوسف حسین خاں۔ قاضی صاحب کا یہ کارنامہ

ہے کہ انہوں نے تحقیق اور تنقید کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا اس کی مثالیں دوسری زبانوں میں بھی کم ملیں گی۔

قاضی صاحب نے اردو میں تحقیق کا کام اس سائنٹفک اور جدید انداز سے کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے لئے جو اس میدان میں بعد کو آئے ان کے لئے ایسا نمونہ پیش کر دیا جن سے استفادہ کرنا ناگزیر ہو گیا۔ انہوں نے جو شمع تحقیق کی راہ میں روشن کیا وہ آج تک تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کر رہی ہے۔ ان کے تحقیقی کاموں اور ان کے بتلائے ہوئے رہنما اصولوں پر عمل کرتے آج بھی بہت سے محققین اس وادی پرخار سے کامیابی کے ساتھ گذر رہے ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر سید امتیاز علی عرشی کہتے ہیں کہ:

> "میں محب مکرم قاضی عبدالودود صاحب
> کو اردو زبان کے تمام تحقیقی کام کرنے والوں
> کا رہنما جانتا ہوں اور بیباک تنقید کرنے
> میں انہیں یکتا مانتا ہوں"

ان کے بارے میں میری یہ رائے برسوں پہلے کی ہے جس میں آج تک ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے۔

قاضی صاحب نے مشرقی اور مغربی علوم کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مشرقی زبانوں میں اردو، ہندی کے علاوہ فارسی اور عربی پر دسترس حاصل تھی۔ مغربی زبانوں میں انگریزی تو جانتے ہی تھے فرانس اور جرمنی میں قیام کے دوران فرانسیسی اور جرمنی زبانیں بھی سیکھیں۔ اور اس طرح براہ راست جرمن ادب اور فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا۔ حافظہ بھی زبردست پایا تھا۔ وسیع مطالعہ اور غیر معمولی حافظہ ایک محقق کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخ سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ قاضی صاحب نے اسلامی عہد کی تاریخ کا بالعموم اور مغلیہ خاندان کی تاریخ کا بطور خاص مطالعہ کیا تھا۔ اسی لئے وہ شعرا اور ادبا کے زمانہ ولادت کو وفات یا ایسے واقعات جن کا سنہ کتابوں میں درج یا متعین نہیں ہے۔ ان کا یقین تاریخ سے کیا جس کی بصیرت انہیں تاریخ کے مطالعے سے حاصل ہوئی۔

قاضی صاحب نے بے شمار تحقیقی مضامین اور مقالے لکھے۔ بہت سے مقالے مضامین شائع ہوئے۔ اور کچھ شائع نہیں بھی ہو سکے۔ قاضی صاحب نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ مگر بقول افسر صدیقی امروہوی:

> "معاصر" میں جس قدر تحقیقی ادبی مواد موصوف
> کی جانب سے دنیائے ادب میں پیش کیا
> گیا وہ ایسا سرمایہ ہے جس سے تحقیق کرنے
> والے حضرات مدتوں تک مستفید ہوتے رہیں گے"

پروفیسر کلیم الدین احمد نے ان کی زندگی میں ہی ایک بڑا کام یہ کیا کہ "مقالات قاضی عبدالودود" دو حصوں میں مرتب کر کے بہار اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام شائع کروا دیا۔ نیز انہوں نے معاصر کا قاضی عبدالودود نمبر بھی نکالا۔ جو قاضی صاحب کے فن اور ان کی شخصیت کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔

یوں تو تحقیق کا باضابطہ آغاز حافظ محمود خاں شیرانی سے ہوتا ہے مگر اس میدان میں قاضی صاحب نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اس بنا پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ "نقش ثانی می کشد نقاش بہ" رشید حسن خاں قاضی عبدالودود کو اردو میں تحقیق کا معلم ثانی کہتے ہیں۔ قاضی صاحب کی تحقیق سے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

> میرا خیال ہے کہ نئی نسل تحقیق کے آداب اور
> انداز سے قاضی صاحب کے توسط سے آشنا
> ہوئی ہے .... ان کی بے لچک
> شخصیت، ان کی بے جھجک انداز
> گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے
> اس زمانے میں تحقیق کے طالب علموں کی
> ذہنی تربیت کی ہے اور ان کی فکر میں

نے یہ بتایا ہے کہ تحقیق کی زبان اور
پیرایۂ اظہار میں انشا پردازی، مرصع کاری
اور الفاظ کے بے محابا استعمال کی مطلق
گنجائش نہیں"

پروفیسر کلیم الدین احمد کی طرح قاضی صاحب کا بھی اشہب قلم میدان تحقیق میں بے باکانہ دوڑتا ہے۔ وہ کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوتے، اور نہ ہی اس معاملے میں کسی عصبیت کا شکار ہوتے ہیں۔ صحیح اور کھری بات صاف صاف کہتے ہیں اس معاملے میں نہ تو کسی سے اس کی شخصی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ کسی کی شہرت سے مرعوب ہوتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی ہوں یا ڈاکٹر اختر اورینوی، بابائے اردو ہوں یا مسعود حسن رضوی، میر ہوں یا غالب، جہاں جس جگہ بھی جس کے یہاں کوئی غلطی یا نقص نظر آیا، اس کا اظہار نہایت جسارت کے ساتھ کر دیا اسی لئے گیان چند نے کہا ہے کہ:

"تنقید میں کلیم الدین احمد اور تحقیق میں قاضی
صاحب ایک دوسرے کے نظیر ہیں"

ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر ممتاز احمد سے قاضی صاحب کے تعلقات تھے۔ ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے مگر جب قاضی صاحب نے ان کتابوں کا تجزیہ کیا تو ذرا بھی مروت نہیں برتی۔ قاضی صاحب کی یہ ایک ایسی خوبی تھی جو بقول گیان چند: (جو

قاضی صاحب کو بت شکن محقق کے نام
سے یاد کرتے ہیں) تنہا قاضی صاحب کی
تنبیہ کی ہیبت نے محققین کو جس عزم و
احتیاط پر مجبور کیا اتنا دوسرے سب مل
کر بھی نہ کر سکے تحقیق کے فن اور روایت
کے لئے قاضی صاحب کی یہ بہت بڑی خدمت
ہے"

قاضی عبدالودود کی اسی حق گوئی اور بے باکی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر محمد حسن یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ

"قاضی عبدالودود ہمارے دور میں حق گوئی
اور بیباکی کا دوسرا نام ہے"

اور یہ حقیقت ہے کہ محقق کے اندر جب تک اظہار کی جرأت حق گوئی کی جسارت نہ ہو وہ ایک کامیاب اور اچھا محقق ہرگز نہیں بن سکتا۔ قاضی عبدالودود میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اسی لئے وہ تحقیق کی دنیا میں حق و صداقت کے علمبردار بنے اور اسی لئے اردو کے عظیم ترین محقق کہلائے۔ قاضی صاحب نے گرانقدر تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ ان سے تحقیق کی نئی راہیں کھلی ہیں۔ ان سے پہلے تحقیق کا انداز انشا پردازانہ تھا۔ تحقیق کرنے والوں کا رویہ بھی غیر محتاط تھا۔ مگر قاضی صاحب نے ان خرابیوں کو دور کیا۔ قاضی صاحب نے تحقیق کی زبان کے لئے سادگی اختیار کی۔ وہ سادگی اور منطقی ربط کے قائل ہیں۔ قاضی صاحب تحقیق کی راہ میں حق کی تلاش کو شرط اول قرار دیتے ہیں۔ اور مصلحت کو تحقیق کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

قاضی صاحب نے طبیعت موزوں پائی تھی۔ شعر بھی کسی زمانے میں یعنی یورپ جانے سے پہلے کہا کرتے تھے۔

سنے جو اسے، نیند اس کو نہ آئے،
مرا حال ہے، یہ کہانی نہیں ہے
میں روز و شب اگر نہ کراہوں تو کیا کروں
اک نو بہار ناز کو چاہوں تو کیا کروں
مجھے رونے سے منع کرتے ہیں :. یہ بھی اک امر اختیاری ہے
کیوں نہ خود کاتب تقدیر ہو خنداں مجھ پہ
شوق پرواز ہے لیکن پر پرواز نہیں

قاضی عبدالودود کا انتقال ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۸۸ سال تھی۔ ان کی سال پیدائش ۱۸۹۶ء ہے۔ ●

فہیم اعظمی (پاکستان)

بوند بھر روشنی

"اب اٹھئے بھی آٹھ بج چکے ہیں" بیوی نے اس کا شانہ ہلا کر صبح ہونے کی اطلاع دی۔

"اٹھتا ہوں" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ تم ناشتہ تو تیار کر لو۔ جمعہ کے دن بھی تو چین سے نہیں لیٹنے دیتیں۔

بیوی دبے پاؤں باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس نے کروٹ بدلی، دیکھا سورج کی شعاعیں دریچے کے شیشے سے چھن چھن کر کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اب اس روشنی میں انسان اٹھ کر رات گئے تک نہ جانے کتنے لبادوں میں اپنا آپ چھپا کر بہروپ دھارتا پھرے گا۔ لوٹ، کھسوٹ مکر و فریب۔ اور منافقت کا بازار گرم کرے گا۔ رات دیر تک انہیں سوچوں کا زہر بوند بوند اس کے پیمانۂ احساس میں گرتا رہا تھا۔

رات وہ خاصی دیر سے گھر لوٹا تھا۔ بچے سو چکے تھے۔ اور بیوی کی آنکھوں میں نیند کا خمار امنڈ رہا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو حسب معمول ایک تیز بو اس کے نتھنوں میں گھس گئی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ لباس تبدیل کیا، کھانا کھایا، بیوی سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ اور بتی بجھا کر سونے کے لئے لیٹ گیا لیکن نیند تو ایسی اڑی کہ آدھی رات تک نہ آئی۔

گذشتہ شام ایک پارٹی میں اس کے ایک دوست نے اسے لفٹ نہیں دی۔ لئے دیئے رہنے کے تیور ایسے تھے کہ جیسے کبھی مراسم ہی نہ رہے ہوں اس سے۔ نیا عہدہ، نئی کوٹھی، نئی کار، تینوں نشوں میں چور تھا وہ ——— کم ظرف، کمینے، میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔ پھر ایک ایک کر کے کتنے ہی مسخ شدہ چہرے اس کے روبرو آتے گئے محلے والوں کے چہرے جو طرح طرح سے اس کو ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتے تھے متعدد بار احتجاج کے باوجود گلی میں اس کے کمرے کے سامنے گھوڑا باندھا جاتا جس کی لید اور پیشاب کی بدبو سے بعض اوقات تو اسے متلی ہونے لگتی۔ چھت پر اور دروازے کے سامنے گلی میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا۔ چوسی ہوئی ہڈیاں پھلوں اور ترکاریوں کے چھلکے بکھیرے جاتے دوستوں کے چہرے بے وفائی اور منافقت کا رنگ لئے رنگے ہوئے۔ ان عزیزوں کے چہرے جو عزیز کم اور بیگانے زیادہ تھے۔ اور اس کی ذات کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

پھر اچانک اسے وہ ٹیکسی ڈرائیور یاد آگیا جس سے دو دن قبل اس کا واسطہ پڑا تھا۔ انارکلی سے واپسی پر بیوی بچوں سمیت وہ ٹیکسی میں بیٹھا تھا۔ گھر سے تھوڑی دور اتر کر جب اس نے میٹر دیکھا تو کھول کر رہ گیا۔ اصل کرائے سے ایک روپیہ اسی پیسے زیادہ بن گئے تھے۔ جب نوبت تلخ کلامی تک پہنچی تو ٹیکسی ڈرائیور ہاتھا پائی پر اتر آیا تھا۔ لوگ دور ہی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے حتی کہ اس نے دانت پیستے ہوئے مطلوبہ رقم ٹیکسی ڈرائیور کو ادا کر دی۔

رات گئے اس کی بیوی نے کروٹ بدلی ——— کبھی اپنے آس پاس پر بھی نظریں دوڑا لیا کیجئے۔ لوگ کما کما کر اپنے گھروں کو سجا رہے ہیں۔ اچھا پہن رہے ہیں اچھا کھا رہے ہیں۔ ہر طرح عیش کر رہے ہیں۔ اور ایک آپ ہیں لکیر کے فقیر، بس تنخواہ پر ہی قناعت کئے بیٹھے ہیں ——— تو تم جو میری شریک حیات ہو صرف اپنے مطلب سے غرض

رکھتی ہو۔ میری جائز کوششوں کی کوئی وقعت کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔ تمہارے خیال میں بے وفا، مطلبی، خودغرضی

آہستہ آہستہ تناؤ کا زور کم ہوتا چلا گیا۔ پھر اس کے ذہن کی وادی میں سناٹا چھا گیا۔ سناٹا اور اندھیرا۔

ناشتے کے بعد وہ دوبارہ اپنے بستر پر آن لیٹا، رات نیند پوری نہ ہونے کے باعث وہ کچھ سست سست سا ہو رہا تھا۔ اور اداس خالی خالی سا۔

آٹا ختم ہوگیا ہے۔ بیوی نے اس کی یکسوئی کی ساکن جھیل میں ایک پتھر پھینکا۔

جی، وہ چونکا،

میں نے کہا آٹا لے آئیے راشن کی دوکان سے، ختم ہوگیا ہے۔

یہ آٹا نہ جانے اتنی جلد کیوں ختم ہو جاتا ہے۔ برا سا منہ بنا کر وہ اٹھا۔ الماری میں سے راشن کارڈ نکالا اور صحن میں میں کھڑی سائیکل کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ کپڑا دیجئے دو کنستر میں لے آئیے باقی جو بچے وہ تھیلے میں بھر لیجئے نہیں۔ کپڑے میں آسانی رہے گی۔ کنستر گرنے کا خطرہ رہتا ہے اس دن بھی گرتے گرتے بچا تھا۔

بیوی نے میز پر بچھا ہوا رنگین میز پوش اٹھا کر آگے بڑھا دیا۔

ہفتہ بھر کا آٹا اس میں آجائے گا۔؟ کتنی بار کہا ہے کہ ایک بڑا سا تھیلا سی دو،

اس وقت تو جتنا اس میں آجائے لے آئیے، آئندہ انتظام کر دوں گی۔

اس نے میز پوش سائیکل کے کیرئر میں پھنسا دیا۔ اور سائیکل لے کر باہر چلا گیا۔

۴۱ راشن کی دوکان سے آٹا خریدنے کے بعد اس نے آٹے کی پوٹلی سائیکل کی کیرئر میں پھنسائی۔ اور سائیکل پر سوار ہوگیا۔ ایک کشادہ گلی میں سے جب اس کی سائیکل مین روڈ پر مڑی تو ایک بلند آواز کے تند جھونکے نے اس کے تخیل کے دریچے کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ بابو جی آٹا گر رہا ہے۔ اس نے دیکھا وہ ایک کالا بھجنگ نوجوان تھا جو موٹر رکشا ڈرائیو کرتے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے فوراً سائیکل میں بریک لگائی۔ پیچھے دیکھا تو پوٹلی کی گانٹھ ڈھیلی ہو جانے کی وجہ سے کچھ آٹا سڑک پر گر چکا تھا۔ وہ فوراً سائیکل سے اتر پڑا۔ اور اسٹینڈ پر سائیکل کھڑی کر کے اس توقع پر گرد و پیش پر نظریں دوڑانے لگا کہ کوئی اس کی مدد کرنے آئے گا۔ پوٹلی کیرئر کے سخت اسپرنگ میں پھنسی ہوئی تھی۔ اور اسپرنگ اوپر کئے بغیر پوٹلی میں دوبارہ گانٹھ نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی آکر اسپرنگ اوپر اٹھا دے تاکہ وہ پوٹلی کی ڈھیلی گرہ کو کس کر باندھ دے۔ لیکن لوگ اسے دیکھتے ہوئے گذرتے رہے وہ ابھی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ دفعتہً اس کے عقب سے ایک آواز ابھری۔ یہ آٹا ہے بیٹے، اس نے مڑ کر دیکھا یہ ایک بوڑھی دیہاتن تھی۔ صحت مند، جس کے چہرے پر بے انداز معصومیت تھی۔ اور جو اپنی چٹکی میں سڑک پر سے اٹھایا ہوا آٹا مسل کر دیکھ رہی تھی۔

پھر یہ بوڑھی عورت اس کے اور نزدیک آگئی بولی، لا بیٹے، میں باندھ دیتی ہوں پوٹلی، اس کے لہجے میں بلا کی مٹھاس تھی۔ اور اس کی شفاف آنکھوں میں ممتا کی ستارے جھلملا رہے تھے۔

اس بار بھی وہ کچھ نہ بول سکا۔ لیکن اس کے جذبات کا سارا سوج اس کی آنکھوں میں امنڈ آیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سائیکل کے کیرئر کا اسپرنگ اوپر اٹھا دیا۔ بوڑھی عورت نے آٹے کی پوٹلی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر احتیاط سے نیچے اتار دی۔ پھر نئی گرہ لگا کر پوٹلی کو کیرئر پر رکھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا، جیتے رہو بیٹا [illegible]۔ ● ختم

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

تیسرا دن

اپنی برتھ پر بیٹھا ہوا وہ بڑی دیر سے اونگھ رہا تھا لیکن اسٹیشن پر جب ایک جھٹکے سے ٹرین رکی، تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چونک کر باہر کی طرف دیکھا۔ اور پھر بڑی عجلت سے اپنی برتھ سے اٹھکر کھڑا ہو گیا۔ اور جست بھر کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔

ٹرین سے اترنے کے بعد وہ پلیٹ فارم پر مسافروں کی بھیڑ میں کھو گیا۔ پلیٹ فارم پر ٹرین سے اترنے اور ٹرین پر سوار ہونے والے مسافروں کی تعداد عام دنوں کی بہ نسبت زیادہ تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے پلیٹ فارم پر میلہ لگا ہوا ہو۔ اور ساری خلقت میلہ دیکھنے کے لئے امنڈ آئی ہو۔ ——— بچے، جوان، بوڑھے مرد اور عورتیں مختلف ملبوسات پہنے ہوئے بڑی عجلت میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سامان اٹھائے ہوئے قلیوں کی ایک کھیپ چل رہی تھی۔ وہ سب ٹرین میں مناسب جگہ تلاش کرتے ہوئے پورے پلیٹ فارم پر پھیلے ہوئے تھے۔ باقی لوگ ٹرین سے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکلنے کے لئے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ ان سبھوں کے درمیان جیسے گھر کر رہ گیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جب تک ٹرین اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ وہ مسافروں کی بھیڑ میں دھکے کھاتا ہوا بے مقصد میلہ میں کھو جانے والے کسی بچے کی طرح پلیٹ فارم پر بھاگتا دوڑتا رہا۔ پھر انجن نے سیٹی دی۔ اور ٹرین آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اور پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ کم ہوئی تو وہ گیٹ پر آ گیا۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر نے مسافروں سے ٹکٹ لیتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ٹکٹ پلیز!

ٹکٹ کلکٹر کی اس حرکت پر وہ سخت متعجب ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی یہ حرکت بالکل خلاف توقع تھی۔ اس نے گزشتہ کئی برسوں میں متعدد بار ٹرین سے سفر کیا تھا۔ لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس سے قبل اس نے کبھی اس سے ٹکٹ طلب نہیں کیا تھا ———

وہ اس کا دیرینہ دوست تھا۔ دونوں کی دوستی کی عمر بیس بائیس سال سے کم نہ تھی۔ اور دونوں کے تعلقات قابل رشک حد تک اچھے تھے۔ ان دونوں نے کتنی ہی شامیں ایک ساتھ گزاری تھیں کتنی ہی چاندنی راتوں میں پارک کے ویران گوشے میں بیٹھ کر رومانی کہانیاں سنی اور سنائی تھیں۔ اور کتنی ہی راتیں جاگ کر مختلف تقریبات میں شرکت کی تھی۔ مگر وہ تو جیسے اسے پہچان ہی نہ رہا تھا۔

اس نے حیرت سے ٹکٹ کلکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اجنبیوں کی طرح اسے گھور رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر یگانگت کی ہلکی سی چھاپ بھی تو نہ تھی۔

اس نے سوچا پتہ نہیں آج اسے کیا ہو گیا ہے جو مجھ سے بھی غیروں کا سا برتاؤ کر رہا ہے۔ ورنہ اس سے قبل تو وہ اسے دیکھ کر ہمیشہ مسکرا دیتا تھا۔ اور بہت ساری باتیں کرنے لگتا تھا۔

کہاں سے آ رہے ہو؟ کل شام میں دیر تک سوسائٹی میں تمہارا انتظار کرتا رہا اور جب تم نہیں آئے تو میں سمجھ گیا کہ تم شہر میں نہیں ہو۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم شہر میں موجود ہو اور سوسائٹی میں نہ آؤ۔

کہیں باہر جایا کرو تو کم از کم مجھے بتا تو دیا کرو۔ گذشتہ رات تارا قوال کی قوالی تھی۔ بہت خوب گاتا ہے۔ تم ہوتے تو سنتے،

بڑی پیاری آواز ہے اس کی، شام کو ضرور ملو۔ انتظار کروں گا۔
لیکن آج وہی شخص غیروں کی طرح اس سے ٹکٹ طلب کر رہا تھا ــــــ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے پیچھے کئی دوسرے مسافر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور وہ گیٹ کے درمیان راستہ روک کر کھڑا تھا۔ اس خیال سے وہ قدرے پریشان ہو گیا۔ اور گھبراہٹ میں اس نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔

اس نے ٹکٹ خریدا تھا یا نہیں، اسے کچھ بھی یاد نہ تھا وہ کہاں سے آ رہا تھا اسے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ اس نے اپنے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی، تو اس کا ذہن اور بھی الجھ گیا اور وہ جھنجھلا اٹھا۔

اس نے ہوائی شرٹ کی اوپر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ تلاش کیا پھر پتلون کی جیبوں میں تلاش کیا۔ لیکن ٹکٹ اسے نہیں ملا۔

پتہ نہیں، ٹکٹ کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔ میں نے ہوائی شرٹ کی اوپر والی جیب ہی میں رکھا تھا
ٹکٹ کلکٹر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید اسے اس کی باتوں پر یقین آ گیا۔ وہ اسے ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کر کے دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور وہ گیٹ کے باہر آ گیا۔

گیٹ کے باہر آنے کے بعد غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ ٹی اسٹال کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں کچھ لوگ کھڑے کھڑے کیک بسکٹ کھا رہے تھے۔ اور چائے پی رہے تھے اور ٹی اسٹال کا مالک ایک کونے میں کھڑا ہوا خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ـــ ٹی اسٹال کے مالک سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اکثر شام کو جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے کے لئے آتا تو ٹی اسٹال پر چائے ضرور پیتا۔ ٹی اسٹال کے مالک کو کرکٹ کے کھیل سے بڑی دلچسپی تھی۔ جب بھی کہیں کوئی مقابلہ ہو رہا ہوتا۔ تو وہ دیر تک اس سے اسکور اور کھیل پر تبصرہ کرتا رہتا۔ وہ جب بھی ٹی اسٹال پر جاتا ٹی اسٹال کا مالک بڑے تپاک سے اس کا استقبال کرتا ــــــ لیکن آج وہ بھی انجان بنا ہوا اسے اجنبی اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ٹی اسٹال پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹی اسٹال کے مالک نے پھر بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اسی طرح بے نیازی سے ایک کونے میں کھڑا رہا۔ اور ملازم ٹی اسٹال کے گرد کھڑے ہوئے لوگوں کی فرمائشیں پوری کرتا رہا۔

وہ چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے ان دونوں کو متوجہ کرتے ہوئے ملازم سے کہا۔ میاں مجھے بھی ایک کپ چائے پلانا، اور ہاں ایک پیس کیک بھی دے دو۔

اس کا خیال تھا کہ اس کی آواز سن کر مالک اور ملازم اسے ضرور پہچان جائیں گے۔ اور اپنی عدم توجہی کے لئے اس سے معذرت خواہ ہوں گے۔ ممکن ہے مالک اپنی عادت کے مطابق اس کے قریب آ جائے۔ اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ مگر اس کی توقع کے خلاف اس بار پھر ان دونوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ملازم نے کاؤنٹر پر سجائے ہوئے مرتبان سے ایک پیس کیک نکال کر طشتری میں رکھا۔ اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور ساتھ ہی ایک کپ چائے بھی دے دی۔ ان کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے وہ اسے پہچانتے ہی نہیں۔

اسے ان دونوں کے اس رویے کو دیکھ کر اپنی سبکی محسوس ہوئی۔ غصہ بھی آیا۔ لیکن اس نے ان کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر بھی وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ان کی بے اعتنائی ان کے لئے تکلیف دہ تھی۔

اس نے جلدی جلدی سے کیک کھایا، چائے پی، اور پیسے ادا کر کے کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔ پیسے ادا کرتے وقت جیب اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ٹی اسٹال کے مالک کی طرف بڑھایا تو اس کا ذہن پھر الجھ گیا۔ یہ دس روپے

یہ اکنّی کہاں سے آیا؟ اس نے سوچا اس کی جیب تو خالی تھی۔ دوران سفر اسے کئی بار سگریٹ پینے کی شدید خواہش ہوئی تھی۔ اور ڈبے میں ایک لڑکا خوانچہ میں سگریٹ سجائے ہوئے کئی اسٹیشنوں تک چکر لگاتا رہا تھا۔ لیکن پیسے نہ ہونے کے خیال سے وہ اپنی اس خواہش کو دبائے ہوئے سفر کرتا رہا تھا۔

وہ چند منٹ تک ذہن پر زور دے کر سوچتا رہا۔ پھر اسے یاد آ گیا دس روپے کا یہ نوٹ اسے پلیٹ فارم پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔ اس احساس سے اسے بڑی خوشی ہوئی کہ اب وہ سگریٹ بھی خرید سکتا تھا۔

ٹی اسٹال کے بازو ہی میں پان سگریٹ کی دو تین چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ وہ آخری دکان پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور دکاندار سے ایک گولڈ فلیک سگریٹ طلب کیا۔ دکاندار نے پیسے لے لئے۔ اور خاموشی سے سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا تو اسے بڑا عجیب سا لگا وہ دکاندار کو کم و بیش بیس پچیس سال سے جانتا تھا وہ اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ اور اس سے جب بھی ملاقات ہوتی۔ کوئی نہ کوئی موضوع چھیڑ کر دیر تک اس سے باتیں کرتا رہتا۔ ملکی سیاست سے متعلق سوالات کرتا۔ اشیاء کی گرانی کی شکایت کرتا اور رات کے وقت پلیٹ فارم پر ہونے والے نئے نئے واقعات سناتا۔ لیکن آج وہ بھی بدلا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر پان کے پتوں پر چونا اور کتھا مل کر پتیل کے ڈالے پہ سجانے میں مشغول ہو گیا۔

دکاندار کے اس رویہ سے معاً اسے خیال آیا۔ کہیں اس کی شکل تو تبدیل نہیں ہو گئی؟ اس خیال کے تحت اس نے دکان میں لگے ہوئے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا ـــــ لیکن نہیں اس کی شکل تو اب بھی ویسی ہی تھی۔ وہی ناک، وہی آنکھیں، وہی پیشانی، بائیں طرف پیشانی کے اوپر ایک چھوٹا سا زخم کا داغ ـــــ وہی چہرہ، وہی قد ـــــ پھر؟ پھر کیا بات ہے؟ تمام شناسا لوگ اسے اجنبی کیوں سمجھ رہے ہیں؟ یہ عجیب الجھن میں پڑ گیا ـــــ آخر یہ کیسے لوگ ہیں؟ یہ کون سا شہر ہے؟ وہ کہاں آ گیا ہے؟؟ وہ سوچتا گیا اور اس کا ذہن الجھتا گیا۔ الجھتا گیا۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

باہر آ کر وہ تھوڑی دیر تک خالی الذہن سا کھڑا رہا۔ پھر اس نے دوسرا سگریٹ سلگا کر دو تین لمبے لمبے کش لئے۔ اور رکشا اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔

رکشا اسٹینڈ پر اس کی نگاہ سب سے پہلے جس رکشہ والے پر پڑی، وہ بڑے میاں تھے۔ بڑے میاں بہت دنوں تک اس کے پڑوسی رہ چکے تھے۔ ان کی بیوی اکثر ان کے گھر کام کاج کر دیا کرتی تھی۔ اور اس کے بچوں سے بے حد پیار کرتی تھی۔ بڑے میاں بھی اس سے بے حد مانوس تھے۔ اور جب کبھی اسے صبح کو ٹرین یا کوچ سے سفر کرنا ہوتا تو صبح کو منہ اندھیرے جا کر اسٹیشن یا کوچ اسٹینڈ تک پہونچانے کی خدمات بڑے میاں ہی انجام دیتے۔ اگر کبھی اس کی ملاقات بازار میں بڑے میاں سے ہو جاتی وہ بھی ان کے رکشے پر بیٹھ جاتا۔ اور بڑے میاں ہمیشہ اس سے مقررہ کرایہ سے زیادہ ہی وصول کرتے۔

صاحب ایک روپیہ تو سبھی دیتے ہیں، وہ دھیمے لہجے احتجاج کرتے ـــــ آپ نے بھی ایک ہی روپیہ دیا؟

پھر بڑے میاں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دل برداشتہ ہو کر وہ محلہ چھوڑ دیا تھا۔

بڑے میاں کو دیکھ کر وہ سیدھا ان کے رکشے پر جا بیٹھ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ بڑے میاں اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کریں گے۔ اور پوچھیں گے ـــــ سو کیسے تو ہیں کہاں، آدھے ہیں صاحب! کہیں باہر گئے تھے کیا؟

لیکن بڑے میاں کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت دکھائی نہیں دی۔ انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا

لہجہ میں پوچھا۔ کہاں جانا ہے صاحب؟

پتہ نہیں بڑے میاں کے لہجے میں اتنی تلخی کہاں سے آگئی تھی۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس کے منہ کا مزہ تلخ ہوگیا اور اس کا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا ــــ اسے کہاں جانا ہے؟ کہاں جانا ہے اسے؟ جوں جوں وہ سوچتا گیا۔ اس کا ذہن الجھتا گیا۔ مگر اسے کچھ بھی یاد نہ آیا۔ اور وہ احمقوں کی طرح بڑے میاں کا چہرہ دیکھنے لگا۔

بڑے میاں نے پتہ نہیں کیا سوچا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر رکشا کا ہینڈل مضبوطی سے تھام کر سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اور رکشا کے تینوں پہیے گھومنے لگے۔

اس نے محسوس کیا جیسے رکشا کے پہیے کی طرح اس کا ذہن بھی گھوم رہا ہو۔ اور اس کے ذہن پر بار بار ایک ہی سوال گردش کر رہا ہو ــــ اسے کہاں جانا ہے؟ کہاں جانا ہے اسے؟ جیسے جیسے رکشا کی رفتار بڑھتی گئی اس کی سوچ کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔

سامنے ایک بڑا سا پارک تھا۔ پارک کے بعد ایک سڑک تھی۔ دوسری جانب ایک قطار میں بہت ساری دکانیں تھیں۔ اور [illegible] ان دکانوں کے بند دروازوں پر پڑی ہی تھیں۔ راستے پر اکا دکا مسافر چلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اور لگ رہا تھا کوئی رکشا تیزی سے گزر جاتا۔ اس نے محسوس کیا جیسے یہ سارا منظر اس کا جانا پہچانا ہو۔ جیسے وہ اس راستے سے پہلے بھی کتنی بار گزر چکا ہو۔ اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سامنے گرجا تھا جس کے اوپر ایک بڑا سا گھنٹہ جھول رہا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس کے آگے ایک ہسپتال ہے۔ اس کے آگے ہائی اسکول ہے اور اس کے آگے ایک بڑا میدان ہے۔ اور اس کے آگے؟ ــــ اس کے آگے؟ اس میدان سے آگے کیا ہے؟ لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ اور اس کے خیالات گڈمڈ ہوگئے۔

اس نے چونک کر دائیں اور بائیں طرف دیکھا۔ پھر اس نے سوچا یہ کون سی جگہ ہے؟ کون سا شہر ہے؟ ذہن پر زور دینے کے باوجود اسے کچھ بھی یاد نہ آیا۔ اور اس نے جھنجھلا کر سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا اپنی پوری قوت سے ہوا میں اچھال دیا ــــ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس کا وجود ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو اور وہ زمین و آسمان کے درمیان معلق جھول رہا ہو اور ہر شئے گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہو۔ اور اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری طاقت سلب ہوگئی ہو۔

اتنی دیر میں رکشا بازار کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

بڑے میاں نے رکشا کی رفتار کم کر دی۔ اور پیچھے مڑ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ــــ آپ نے بتایا نہیں، آپ کہاں جانا ہے صاحب؟

بڑے میاں کے اس سوال سے وہ پریشان ہوگیا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اسے خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، ویسے وہ کہیں جانا ضرور چاہتا تھا لیکن کہاں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس نے سوچا جب اسے یہی نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے تو پھر وہ یہاں کیسے آگیا!؟ کیسے آگیا؟ کیسے آگیا؟ اس کے ذہن پر دیر تک یہی سوال گردش کرتا رہا۔ مسلسل گونجتا رہا۔ اور اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔ پھر اسے بڑے میاں پر غصہ آگیا جو بالکل انجان بنا ہوا تھا۔

تم مجھے اسی جگہ اتار دو۔ اس نے خفگی آمیز لہجہ میں کہا

بڑے میاں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور رکشا روک کر سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا۔

رکشا سے اتر کر وہ دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اب وہ کدھر جائے، کیا کرے، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ویرانے میں کھڑا ہو۔ اور حد نظر تک ایک لق و دق میدان پھیلا ہوا ہو۔ اور ہر شئے پر دبیز خاموشی چھائی ہوئی ہو

اور وہ جیسے اس میدان کے آخری سرے تک پہونچا ہوا تھا ہو۔ مگر راستہ بھول گیا ہو۔

بازار کی بیشتر دکانیں کھل چکی تھیں۔ دوکاندار اپنی اپنی دکانوں کی جھاڑ پونچھ اور سامان کو سجا سجا کر رکھنے میں مصروف تھے۔ کہیں کہیں ایک دو خریدار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ باقی دکانیں اب تک بند تھیں۔

دکانداروں میں کتنے ہی دکاندار اس کے شناسا تھے پہلے وہ جب بھی ان دکانوں کے سامنے سے گذرتا، وہ سب اسے دیکھ کر بآواز بلند سلام کرتے، لیکن آج وہ سبھی اسے یوں گھور رہے تھے جیسے وہ اس شہر میں پہلی بار آیا ہو۔

اس نے چلتے چلتے سوچا، پتہ نہیں آج ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔؟ اسے سارے دکاندار بڑے عجیب لگ رہے تھے جیسے وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ جیسے وہ کسی دوسری دنیا کا مخلوق ہو۔ اور بھٹک کر ان لوگوں کے درمیان آگیا ہو

آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟ ایک دکاندار نے اس سے پوچھا۔ حالانکہ وہ گذشتہ پندرہ سال سے اکثر و بیشتر اس کی دوکان سے سامان خریدتا رہا تھا۔

تم نے یہ کیسے سمجھا۔ اس نے حیرت سے دوکاندار کی طرف دیکھا۔

آپ اپنے بشرے سے تو اس شہر کے باشندے دکھائی نہیں دیتے۔ دوکاندار نے جواب دیا۔

تم غلطی پر ہو، میں اسی شہر میں رہتا ہوں۔ اس نے تیقن بھرے لہجے میں کہا۔

اچھا! دکاندار نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کہاں رہتے ہیں آپ؟

دکاندار کے اس سوال پر وہ پھر الجھ گیا۔ اور جب اسے کوشش کے باوجود یہ یاد نہ آیا کہ وہ کہاں رہتا ہے تو وہ جھنجھلا اٹھا۔

میں کہاں رہتا ہوں۔ اس سے تمہیں کیا غرض ہے۔ اس نے خفگی سے جواب دیا۔ اور دکان سے باہر آگیا۔

پھر وہ بے مقصد بازار کا چکر لگاتا رہا۔ دکانوں میں داخل ہو کر چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ان کی قیمت دریافت کرتا رہا۔ اور اس طرح وہ پہلوان کی مٹھائی کی دکان تک آپہونچا۔

دکان کے مالک سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے اور اکثر وہ اس دکان پر چائے پینے آیا کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مالک دکان حسب معمول دکان پر بیٹھا ہوا خریداروں سے پیسے وصول کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ اور باہر رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔

دکان میں خریداروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اور مالک دکان خریداروں سے پیسے وصول کرتے ہوئے گاہے گاہے ایک نظر اس کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھر آئے تھے۔ اس احساس کے تحت اس نے چائے کا ایک آرڈر دیا۔ اور چائے پی کر جب اس نے پیسے ادا کئے تو دکاندار نے بڑی سرد مہری سے پیسے لے کر اس کی طرف یوں دیکھا کہ اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔

وہ بے حد اداس و مضمحل ہو گیا۔ اس نے سوچا کتنی عجیب ہے یہ دنیا، جہاں کے لوگ اتنی جلدی بدل جاتے ہیں اتنے بے مروت ہو جاتے ہیں کہ ماضی کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں یہ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ تمام لوگوں کو پہچان رہا تھا لیکن اتنے سارے لوگوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا کہ اسے ہاتھ تھام کر کہے میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ حالانکہ صرف چند ہی دنوں کی بات تھی کہ اس نے شہر چھوڑا تھا۔ اور چند ہی دنوں بعد ہی تو واپس آیا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کوئی بات

نہیں کوئی اسے پہچانے یا نہ پہچانے۔ وہ ان گذرگاہوں کی مدد سے اس جگہ پہنچ سکتا ہے جس جگہ کی اسے تلاش ہے۔ اسی خیال سے اس کی ڈھارس بندھی۔ اور اس کے دل پر چھایا ہوا غم کا بوجھ ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پیار بھری نگاہوں سے ان گذرگاہوں کی طرف دیکھا جن کے دونوں کنارے پر مکانوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا تمام گذرگاہیں اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی ہوں۔

تھوڑی دور تک وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا چلتا رہا لیکن اس کے بعد وہ پھر ان گذرگاہوں کے بیچ جیسے گم ہوگیا اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی طویل سرنگ میں داخل ہوگیا ہو۔ اور باہر نکلنے کا راستہ اسے معلوم نہ ہو۔

رات کے تقریباً دو بجے پولیس کے ایک گشتی دستے نے اسے مشتبہ حالت میں آوارہ گردی کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ پولیس کے استفسار کا بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

پولیس کے دریافت کرنے پر اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ اپنا نام تک بھول چکا ہے۔ وہ دیر تک اپنا نام یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کی یادداشت نے جواب دے دیا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ وہ کہاں سے آیا ہے۔ اس کا کیا نام ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ اسے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ البتہ اس کے تحت الشعور میں ان سارے سوالوں کے جواب روپوش تھا۔ لیکن وہ اپنے ذہن پر چھائے ہوئے ایک دبیز پردے کی تہہ ہٹا دینے سے قاصر تھا۔

وہ اپنی بے بسی پر تلملا اٹھا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ اور پولیس کی مسلسل سوالات کی بوچھار سے تنگ آکر وہ زور سے چیخ اٹھا ——— مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

رات پھر حوالات میں بند رہنے کے بعد دوسری صبح کو پولیس نے اسے مخبوط الحواس سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اور ایک بار پھر وہ راستے پر آکر کھڑا ہوگیا۔

اس وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ کبھی تو ساری بھولی بسری باتیں قطار باندھے ہوئے اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتیں۔ اور کبھی اس کا ذہن یوں الجھ جاتا کہ وہ سب کچھ بھول جاتا اور اس کا وجود خلا میں گم ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔

پھر وہ بھٹکتا ہوا اپنے مکان تک جا پہونچا۔

اپنے گھر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ یہی تو ہے وہ جگہ، جہاں وہ آنا چاہتا تھا۔ اس کا پیارا گھر۔ ہاں اسے اتنی دیر سے اپنے گھر کی ہی تو تلاش تھی اسے سب کچھ یاد آگیا۔

اس نے دیکھا، اس کے گھر میں کوئی تقریب تھی۔ جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ اور بہت سارے لوگ اب اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ کون سی تقریب تھی اس کے یہاں؟ اس نے لمحہ بھر کے لئے سوچا۔ اور جب اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ تو اس نے خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا۔ دروازے پر پہونچ کر اس نے آہستہ سے دستک دی۔

دروازہ کھلتے ہی اس کا چھوٹا لڑکا دروازے پر نمودار ہوا۔ اور کھڑکی سے اسے اپنی بیوی کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ پردہ سرکا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بیوی سے نگاہ ملتے ہی وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی کا چہرہ پردے کے پیچھے چھپ گیا۔

آپ نے دیر کردی، میلاد تو ختم ہو گئی۔ بیٹے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور اس کی طرف کاغذ کا ایک پڑا بڑھا دیا۔

نسیم سحر گجرات (پاکستان)

طول البلد

یوں تو اسے اس آبادی میں رہتے ہوئے ایک
عرصہ گذر چکا تھا لیکن ایک ایک دن بڑی دشواری سے کٹتا
تھا۔ جب بھی وہ دوسروں کے سامنے جاتا سب کے سب اسے
عجیب نظروں سے گھورنے۔ ان کی پیشانیوں پر شکنیں
ابھر آتیں۔ اور وہ منہ بنا کر آگے بڑھ جاتے۔ اس کے برعکس
وہ سب آپس میں جب بھی ایک دوسرے سے ملتے تو مسکراتے
[illegible]۔ نہ جانے وہ کس زندگی لیے جی رہا تھا۔ اسی دوران ایک
دن ایسا بھی آیا کہ کچھ لوگوں نے اسے سرِ راہ گھیر لیا۔ اور باری
باری سے سوال کرنے لگے۔

"کیا تم نے ہمارے طویل قدوں کو نہیں دیکھا"
ایک شخص نے پوچھا۔

"ہمارے قبرستان گئے ہو اور ہماری قبروں کو بھی
دیکھا ہے" دوسرے نے کہا۔

"تم نے ہماری پوشاک کا خیال نہیں رکھا" تیسرا بولا
اس نے سر جھکا کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا
——— "بھائیو، میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ میرا قد تمہارے
قدوں سے بہت چھوٹا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس بستی
میں جو بھی رہتا ہے وہ لمبے قد کا مالک ہے۔ یہاں کی ہر شخصیت
قد آور شخصیت ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ
تمہارے قبرستان کی قبریں بھی بڑی ہیں۔ ان میں کوئی
بھی قبر چھوٹی نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت بھی میں دیکھتا رہتا ہوں کہ
تمہارا لباس پورے جسم کو چھپائے رہتا ہے ان سب
باتوں کے باوجود میں تم سب سے ہاتھ جوڑ کر درخواست
کرتا ہوں کہ جیسا بھی ہوں، جو کچھ بھی ہوں مجھے یہاں رہنے
کی اجازت دو کیونکہ میں ایک عرصہ سے یہاں رہ رہا ہوں۔"
چھوٹے قد والے شخص کے اس بیان سے وہ قطعاً
مطمئن نہ ہوئے۔ جو افراد اس شخص کو گھیرے میں لئے ہوئے
تھے ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں، انہوں نے بھی پوچھ گچھ شروع
کی ———

"ایسا لگتا ہے کہ تم چوری چھپے یہاں رہ رہے تھے؟"
ایک عورت بولی۔

"ہم تمہیں رکھ کر کیا ہمیشہ کے لئے بدنامی مول لیں،
تمہارا چھوٹا قد ہماری قد آوری کی توہین ہے۔" دوسری نے کہا

"جہاں تم پہلے رہتے تھے، وہیں واپس چلے جاؤ"،
تیسری نے تجویز پیش کی۔

"اب وہاں جانا بڑی مشکل ہے کیونکہ وہ جگہ جہاں
میں رہتا تھا سب کچھ بھول گیا۔ پھر وہاں کے لوگ مجھے اجنبی
سمجھیں گے۔ ان کو پہچاننے میں دشواری ہوگی۔ کیونکہ میں
نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ یہاں گزارا ہے۔ میں
بہت کم عمری میں یہاں چلا آیا تھا۔ یہاں کی آب و ہوا میں
پلا، بڑھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ میرا قد نہیں بڑھ سکا۔
اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے میں گھر سے باہر ہی نہیں نکلتا۔"
انہوں نے اس شخص کی باتوں کو ان سنی ان سنی
کردی، اور سب کے سب ایک زبان ہو کر بولے،

"ہم سب بڑے ہیں۔ ہمارے قد بڑے ہیں، ہماری
تاریخ بڑی ہے، ہماری کتابیں بڑی ہیں۔ ہم کسی صورت
سے تم کو برداشت نہیں کر سکتے تمہیں ہر حالت میں یہاں

سے جانا ہوگا۔"

یہ حکم دے کر وہ سب اپنے اپنے گھروں کو چلدیئے لیکن ان میں سے ایک بوڑھا شخص جو کچھ دور تک تو ان کے ساتھ چلا، پھر پلٹ کر اسی جگہ پر آ گیا جہاں چھوٹے قدوالا شخص ایک کونے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو"

"بابا ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، اور کہاں جایا جائے۔" چھوٹے قدوالے شخص نے کہا۔

"بوڑھا یہ سن کر ہنسنے لگا اور کچھ دیر بعد بولا" ـــــ

"کچھ کہوں تو اس پر عمل کرو گے؟"

"ہاں۔ ضرور کروں گا"

"وعدہ کرو کہ جو کچھ بتاؤں گا اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے، ورنہ تیری مصیبت آجائے گی۔"

"یقین رکھو بابا ـــــ کسی سے کچھ نہیں کہوں گا"

اچھا ـــــ تو سنو ـــــ یہاں سے کچھ دور ایک بڑھئی رہتا ہے۔ اس کے گھر کسی اندھیری رات میں چلے جانا، اس کے گھر کے سامنے ایک کتا زنجیر سے بندھا ہوگا۔ وہ تمہیں دیکھ کر بھونکنے لگے گا۔ اس وقت تم ہنسنے لگنا۔ وہ چپ ہو جائے گا، آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینا، جب بڑھئی سامنے آئے تو اسے بھی دیکھ کر ہنسنا شروع کر دینا۔ وہ سب کچھ سمجھ جائے گا اور تمہارا کام کر دے گا۔ جب تمہارا کام ہو جائے تو تم بھی دوسروں کی طرح ہمیشہ ہنسنے کی کوشش کرنا۔

بابا ـــــ اس بلاوجہ اور مصنوعی ہنسی سے کیا فائدہ۔ پستہ قد انسان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

میں تمہیں ہر بات کی وجہ سے نہیں بتا سکتا۔ اگر آنسو بھی آئیں تو انہیں روک کر ہنسنے کی کوشش کرنا، یہ تمہارے لئے مفید ہوگا۔ اب تم جا سکتے ہو۔

دوسرے ہی دن رات کے آخری حصے میں وہ بو کی تمام باتوں پر عمل کرتے ہوئے بڑھئی کے گھر پہونچ گیا۔ اسے ایک اندھیری کوٹھری میں لے گیا۔ جہاں اس نے ا کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی، اور اپنا کام کرنے لگا۔ جب اپنا کام مکمل کر چکا تو اس نے آنکھوں پر سے پٹی کھول د اور کہا چلے جاؤ۔

اب صبح کے آثار نمودار ہو چکے تھے یہ شخص اپنے واپس لوٹ رہا تھا۔ اب اس کا قد اتنا ہی لمبا ہو گیا تھا کہ اس بستی کے دوسرے لوگوں کا تھا۔ راستہ میں جو شخص مسکرانے لگتا جس کے جواب میں اسے بھی مسکرانا پڑتا۔ شخص بڑی ہمدردی جتاتا بڑے خلوص سے باتیں کرتا۔ اچانک تبدیلی دیکھ کر اسے بڑی تشویش تھی کہ یہ سب ک کیسے ہو گیا۔ لیکن وہ اس تشویش سے کہیں زیادہ وہ اس بات پر خوش تھا، کہ میں بھی ان سب کا جیسا ہو گیا ہوں۔ مجھے یہاں رہنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ اب مجھے کوئی بھگا سکتا۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کو وہ دیکھتے ہی سوچنے لگا یہ بھی تو سب کا جیسا ہے پورا بدن چھپا ہو نہ پیر نظر آتے ہیں۔ اور نہ ہاتھ۔ ـــــ بڑا اچھا ہوا کہ سب جیسا جسم اور سب کا جیسا لباس ہو گیا۔ ورنہ مصیبت کہاں جاتا، کیا کرتا ـــــ اسی پس وپیش میں اس کا سف ہو گیا۔ اس کا گھر آ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آج اطمینان حاصل ہوا۔ اسے ایسا لگا، جیسا کہ یہ حقیقت اس کا اپنا گھر ہے۔ اب یہاں اطمینان سے رہ سکتا اس سے قبل گھر سے نکلتے وقت بڑا ڈر لگتا تھا۔ جب وا آتا تھا تو ایک خوف سا ہوتا تھا۔ شکر ہے کہ اب ان کا خاتمہ ہو گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسے اس با بڑی حیرت تھی کہ میرا قد لمبا ہو گیا۔ لیکن کتنا کس طرح ہ

خالد اکاسکر

ایک کہانی جو مجھے خود پسند نہیں

بابا کہانی سناؤ نا، میری پانچ سالہ بچی اپنی امّی کے گود میں
ہوئے بول پڑی۔

آؤ، میں نے کتاب میز پر رکھ دی، اور اپنی چیئر سے اٹھ کر
پر چلا آیا۔ ابھی رات کے نو بج رہے تھے۔ تہذیب روز مجھ سے کہانی
تی ہے وہی برسوں پرانی کہانی، راجکمار اور راجکماری کی کہانی،
یب کو یہ کہانی ازبر ہو گئی ہے۔ تہذیب کو یہ کہانی ازبر ہو گئی ہے
یا وہ مجھ سے یہی کہانی سنا کرتی ہے پچھلے ایک مہینے سے میں بلا
اسے یہی کہانی سنایا کرتا ہوں۔ تہذیب نینسی کے ، جی میں پڑھتی
ج اسے ایک مہینہ قبل اس کی ٹیچر نے اسے ایک کہانی سنائی
تب سے اسے کہانی سننے کا چسکا پڑ گیا ہے۔

بابا —— میری خاموشی پر تہذیب نے خفگی کا
ار کیا۔

نیلو، چائے بنا دو نا، میں نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے
ئے کہا۔

میں چائے بنا کے دیتی ہوں۔ لیکن آج تمہاری کہانی مجھے
سننی ہے، جاؤ تہذیب پاپا کے پاس جاؤ، میں ابھی آئی وہ اپنی
ساری سمیٹتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

ہاں! تو تہذیب بیٹیا، ایک تھا راجا......

نہیں پاپا، امی کو بھی آنے دو۔

تہذیب کو کہانی سنانے میں مزا آتا ہے۔ اس کہانی کو
سناتے ہوئے ذہن ماضی کو کریدنے لگتا ہے۔ بھولی، بسری صدائیں سنائی
دیتی ہیں۔ ذہن کے پردے پر سات آٹھ سال پرانے واقعات ابھر کر
ہونے لگتے ہیں۔ اپنی نوجوانی کے دن —— فلمی اداکاروں
میں پوشاکیں پہننا، فلمی اداکاروں کا اسٹائل اپنانا، خود کو منوانے
کے لئے الٹی، سیدھی حرکتیں کرنا۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے
نت نئے خول چڑھانا، اپنے خلوص کا اظہار کرنے کے لئے چکنی چپڑی
باتیں کرنا۔ اپنی کمزوریاں چھپانے کے لئے اخلاق کا سہارا لینا۔ ہر مسئلہ
پر جذباتی نقطۂ نگاہ سے سوچنا، ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھانا،
شہناز کے انتظار میں گھنٹوں بیٹھے رہنا، پھر تی ہوتی باتوں پر خوش
ہو لینا بے کاری کے اوقات گزارنے کے لئے فانی اور مجاز کے
اشعار پڑھنا، خودکشی کی دھمکیاں دینا، عشق ہی کی زندگی کی تکمیل
سمجھنا، —— نوجوانی بھی عجیب ہوتی ہے۔ بالکل
کسی وحشی اور بپھرے ہوئے جانور کی طرح، میں کچھ دیر ان کے کچے پکے
رنگوں میں بکھرا رہا۔

چلو پاپا، امی آگئیں۔

چائے کا کپ میرے ہاتھوں میں تھما کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

بستر پر آجاؤ نیلو، سہاگ رات کی نیلم قراب میرے
لئے صرف نیلو رہ گئی تھی۔ جو قربت نیلو میں ہے وہ نیلوفر میں کہاں۔
بعض اوقات الفاظ آدمی کو کس قدر دھوکا دیتے ہیں۔

تم تو بستر پر آنکھیں پسار سے لیٹے ہو۔ اور میں اٹھ کر بستر

پر بیٹھ گیا۔

چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے نیلو سے کہا کہ وہ میری پتلون کی جیب سے سگریٹ کی پیکٹ لیتی آئے۔ جب تک وہ سگریٹ کا پیکٹ لے آتی میں چائے ختم کر چکا تھا۔ نیلو بستر پر دو زانو بیٹھ گئی۔ اور تہذیب پھر اپنی امی کی گود میں پہونچ گئی۔

تہذیب اور نیلوفر میں صرف عمروں کا فرق ہے سوائے اس کے کہ تہذیب کے بال مختصر ہیں اور نیلو کی زلفیں کمر تک لہراتی ہیں۔ اگر تہذیب کے جسم میں میرا کوئی حصہ ہے تو صرف اتنا کہ اسکی آنکھیں میری طرح نیلی ہیں۔

بال کھول دو نیلو! اور اس نے بال کھول دیئے، بالوں کی ایک لٹ کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

کیا بات ہے، نیلو آج تم بھی کہانی سننے کے موڈ میں ہو،

پاپا کہانی

ہاں تہذیب ایک تھا راجکمار اور ایک تھی راجکماری،

نہیں پاپا، روز روز ایک ہی کہانی سناتے ہو تم، وہ تو مجھے معلوم ہے راجکمار کو راجکماری سے بہت پیار تھا، روز روز راجکمار راجکماری کے محل کا چکر لگاتا تھا۔ لیکن دونوں کی شادی نہیں ہو سکی۔ ہونہہ۔ یہ مت سناؤ، تہذیب نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ دوائی پیتے ہوئے بھی یہ بچی اسی انداز میں ہونٹ سکیڑتی ہے، کیا میری کہانی بھی تلخ ہے۔

دیکھو تہذیب، دوسری کہانی ہمیں نہیں آتی، اچھا تمہاری امی سنائیں گی تمہیں دوسری کہانی، یہ کہتے ہوئے میں شریر نگاہوں سے نیلو کا چہرہ تاکتا رہا۔

تہذیب، میں سناتی ہوں تمہیں ایک راجا کی کہانی۔ تم اپنے پاپا کی گود میں بیٹھو،

نہیں بیٹا، تم اپنی امی ہی کی گود میں رہنا۔ میں لیٹ جاتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے ٹانگیں پھیلا دیں۔ تہذیب بھی میرے پہلو میں آکر لیٹ گئی۔

ہاں نیلو! آج ہم تمہاری کہانی سنیں گے۔ میں نے اپنے طور پر معنی خیز جملہ کہا۔

میری کہانی نہیں۔ راجا کی، نیلو جملے کی تہہ تک پہونچ چکی تھی

امی سناؤ نا، تہذیب مچل گئی۔

ایک تھا راجا،

راجا کیسا ہوتا ہے امی،

تمہارے پاپا کی طرح، نیلو شاید مذاق پر اتر آئی تھی۔ نیلو کے چہرے کی مسکراہٹ فتح مندی کی نہیں بلکہ فخر کی آئینہ دار تھی۔

لیکن پاپا کا راجکمار کہاں ہے۔

تم ہو ہمارے راج کمار بیٹا، راج کمار کی کہانی سناتے ہوئے میں نے تہذیب سے کہا تھا کہ راجا کے بیٹے کو راج کمار کہتے ہیں۔

امی پلیز کہانی،

اس راجا کو ایک لڑکی سے بہت پیار تھا......

میں سمجھی، ننھی تہذیب نیلو کی بات کاٹتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دی،

کیا سمجھیں تم؟ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

راجا کی اس لڑکی سے شادی نہیں ہوئی۔ تہذیب تالیاں بجاتے ہوئے بولی میں فخر سے نیلو کا چہرہ تکنے لگا۔ نیلو بھی مسکرائے بغیر رہ نہ سکی۔ اور ہم تینوں کے بے ہنگم قہقہے کمرے میں گونجنے لگے

لیکن بیٹا، تمہیں کیسے معلوم ہوا۔

تہذیب اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہنے لگی تمہاری بھی کہانی میں پیار ہوا امی کی کہانی میں بھی پیار ہوا۔ تو پھر سمجھو، اپنی بات کا مفہوم واضح کرنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

لیکن تہذیب بیٹا، امی سے پوچھو، راجا اس لڑکی سے شادی کیوں نہ کر سکا۔

اس لئے کہ وہ لڑکی بے وفا تھی۔ نیلو تہذیب کے بالوں

میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

نہیں نیلو، تم زیادتی کر رہی ہو۔

پاپا ــ امی کو بولنے دو نا۔

لیکن تمہاری امی غلط بول رہی ہیں نیلو ــــ وہ لڑکی بے وفا نہیں تھی بلکہ واجانزیب تھا۔

عورت ہی دلدار نہیں ہوتی ــ خالدہ بھائی ڈیئر، یقیناً وہ لڑکی بے وفا تھی۔ نیلو براہ راست مجھ سے مخاطب ہو گئی۔

بے وفائی کسے کہتے ہیں جانتی ہو نیلو؟

تم کبھی کبھی بچوں سی باتیں کرتے ہو۔ یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے۔ حقیقت سے انحراف کب تک کرو گے۔ نیلو کا لہجہ جھلایا ہوا تھا۔ اب میں نیلو کو کیسے سمجھاؤں کہ حقیقت سے انحراف ہی زندگی ہے۔

پاپا، میں سو رہی ہوں۔ تہذیب نے میری جانب کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔ میں نے تہذیب کی پیٹھ پر تھپکیاں دینی شروع کیں۔ نیلو مسلسل میری جانب دیکھ رہی ہے چہرے پر ایک دبی دبی سی مسکراہٹ ہے۔ میں نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دی۔ اور ہولے سے نیلو کا رخسار سہلایا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ میں نے اپنا ہاتھ تہذیب کے سر پر رکھنا چاہا تو میری انگلیاں نیلو کے ہاتھ سے مس ہو گئیں۔ میں نے آہستہ سے نیلو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تہذیب سو چکی ہے۔ نیلو نے تہذیب کو ساتھ لگے بیڈ پر لٹا دیا۔ میں بستر کے ایک طرف ہو گیا۔ نیلو بغل میں آ کر لیٹ گئی۔ میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی زلفوں میں کنگھی کرنی شروع کر دی۔

کیا وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی؟

کیا دنیا کی ہر لڑکی خوب صورت ہوتی ہے؟

پھر تم اسے بھول کیوں نہیں پائے؟

تم نے کسی سے محبت کی ہے؟

کیوں! یہ میرے احمقانہ سوال کا بالکل منطقی جواب تھا۔ جھوٹی، میں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔

اوہ نو۔ کیا کر رہے ہو، چھوڑو نا۔ لگا درد سے کہتے ہوئے اس نے میری جانب کروٹ لی۔ اس کی آنکھوں میں سارے زمانے کا لطف اتر آیا۔ اوپر کے ہونٹوں کے دہانے پر پسینے کی ایک ہلکی سی بوند اتر آئی۔ اس بوند کو چکھنے کی خواہش میں میں نے اس کے نچلے ہونٹ کو انگلی اور انگوٹھے کے درمیان پکڑ کر دبا دیا اور چومنے ہی جا رہا تھا کہ نیلو بول اٹھی۔

نہیں، ابھی نہیں پہلے میرے سوال کا جواب دو۔

کون سا سوال، میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا

وہی، تم اسے بھول کیوں نہ پائے۔

دیکھو نیلو، آدمی جب کسی کو چاہتا ہے تو اسے بھول نہیں پاتا۔ حالانکہ مجھے یہ کہنا چاہئے تھا کہ آدمی اپنی شکست کو بھول نہیں سکتا۔ لیکن میں یہ بات نیلو سے کہہ نہ سکا۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نیلو سے آج بھی کتنا دور ہوں۔ نیلو آج بھی میرے لئے نیلوفر ہے۔ جھوٹے الفاظ کا سہارا لے کر میں نے نیلوفر کو نیلو بنا دیا۔ جتنا جھوٹا میں ہوں، اتنے جھوٹے الفاظ بھی ہیں۔ اس سے آگے میں سوچ نہ سکا تھا کہ نیلو مجھ سے مخاطب ہوئی

کیا سوچ رہے ہو؟

کچھ بھی نہیں...... کیا پوچھ رہی تھیں تم؟

یہی کہ ان پانچ برسوں میں نہ تم اس سے ملے ہو اور نہ ہی اس کی خبر رکھتے ہو اتنا عرصہ کافی ہوتا ہے کسی کو بھولنے کے لئے۔ نیلو کا یہ بیان اس کے معصوم ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

ہاں نیلو! اس میں کوئی شک نہیں کہ کافی عرصہ بیت گیا۔ اسے دیکھے ہوئے، لیکن پانچ برسوں کے قرب کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔

تمہارے کالج میں بہت ساری لڑکیاں پڑھتی ہوں گی کیا انہیں بھی یاد کرتی ہو؟

ہر لڑکی سے میرا کیا رشتہ، یہ مصروفیات اتنی مہلت

کہاں دیتی ہیں کہ میں اسے یاد کرسکوں۔ اور پھر کالج کے زمانے میں
ں لڑکی سے گہرے تعلقات رہے ہیں۔ دنیا بھر کی باتیں ہم دونوں
درمیان ہوا کرتی تھیں۔ اس کے گھریلو حالات سے میں واقف تھا
رے لاابالی پن سے وہ آگاہ تھی۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم دونوں ایک
دسرے کے مزاج سے بڑی حد تک مانوس تھے۔ تصنع اور بناوٹ
دائرے سے ہمیشہ باہر رہے ہم دونوں۔ اس آخری جملے میں جو
بت چھپا تھا اس سے میں بخوبی واقف تھا۔ اپنے احساس برتری
دتمندی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے نہ جانے میں نے کتنے جھوٹ
ہے ہوں گے۔

تم اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔

ہاں!

اور اس سے اظہار بھی کیا تھا۔

تم سے یہ تمام باتیں کہہ چکا ہوں

ہاں! اور یہ بھی کہہ چکے ہو کہ اس نے تم سے محض اس لئے
شادی نہیں کی کہ تم ایک غریب نوجوان تھے۔

اور آج بھی ہوں۔

تمہارے ہی کہنے کے مطابق اس نے ایک امیر شخص سے
شادی کرلی۔

ہوں۔

اس کے باوجود تم اسے بے وفا تسلیم نہیں کرتے؟

نیلو! عشق و محبت خالی پیٹ تو ہوتا نہیں۔ اب ظاہر
ہے اسے ایک اچھا سا رشتہ مل گیا۔ اس نے وہاں ہاں کردی۔
ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اس کا بیاہ کسی خوشحال گھرانے میں ہو۔ اگر میں
بھی اس کی جگہ ہوتا تو کسی دولت مند شخص ہی سے شادی کو
ترجیح دیتا۔ کافی دانشمندانہ فیصلہ تھا اس کا۔ ایک سمجھدار لڑکی
تھی وہ۔ کبھی زمانے میں ایسی ہی باتیں کرکے میں خود کو تسلی دیا کرتا
تھا۔ لیکن آج محض نیلوفر کو مرعوب کرنے کے لئے میں نے اخلاقی و
فلسفیانہ قسم کا رویہ اپنایا۔

اور میں بے وقوف ہوں جو تم سے شادی کر بیٹھی۔ نیلوفر
نے مسکرا کر شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔

حماقت تھی تمہاری۔ تمہارے والدین سے میری مالی حالت
پوشیدہ نہیں تھی۔

لیکن میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ تمہاری طرح چاہنے
والا شوہر ملا۔ اس سے بڑی دولت کیا ہوسکتی ہے لڑکی کے لئے۔

ہر مجبور آدمی جو صبر کرلیتا ہے ایسی ہی باتیں کرکے دل
کو تسلی دیا کرتا ہے۔ میں نے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ
نکالتے ہوئے کہا۔

نہیں، اب تم سگریٹ نہیں پیو گے۔ اور سونے سے قبل برش
بھی کرو گے۔

برش تو کروں گا ہی ....

سگریٹ رکھو اور برش کرلو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔

واش بیسن پر لگے آئینے میں دیکھتے ہوئے میں نے منہ سے
نکلتے ہوئے جھاگ کو اس طرح تھوک دیا۔ جیسے ماضی کو تھوک رہا
ہوں۔ لیکن تھوکتے ہی پیسٹ کا میٹھا ذائقہ اب بھی میرے منہ میں ہے
تولیے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے میں نے نیلو سے سوئچ آف کرنے کی
اجازت چاہی۔

ایک بات کہنی رہ گئی۔

کہو کہو،

میں خود کو تسلی نہیں دے رہی ہوں۔ میں .....

چھ، چھ، اب تک تم اسی میں الجھی ہو۔ میں نے تولیہ رکھتے
ہوئے کہا۔

میں اس لئے مطمئن اور خوش ہوں کہ تم نے مجھ سے اپنا
ماضی نہیں چھپایا۔ بلکہ ایک دوست .... اس سے آگے
کے الفاظ میرے کانوں تک نہیں پہونچ رہے تھے۔ میں نیلو کو کیونکر
سمجھاؤں کہ انسان خود ہی اپنے ماضی سے آنکھیں چراتا ہے۔ پھر یہ
کیسے ممکن ہے وہ اپنے ماضی میں دوسرے کو شامل کرے۔

انشائیہ

غلام جیلانی اصغر (پاکستان)

مکان بنانا

میرے دوست 'د' نے کہیں لکھا ہے، مکان مثل درخت کی جڑ کے ہے کہ جب انسان مکان بناتا ہے تو وہ دھرتی سے رشتۂ ازدواج قائم کرتا ہے جب میں نے یہ جملہ پہلی بار پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس جملہ میں بین السطور میرے رشتۂ ازدواج کا ذکر موجود ہے لیکن ایک عرصہ تک اس کا گہرا مفہوم میری نظروں سے پوشیدہ رہا پھر یوں ہوا ایک دن عالم اضطراب میں میں نے مکان کی نیو رکھدی۔ مزدور بنیاد کھودتا رہا۔ اور میں ان کے ساتھ ساتھ بنیاد کی گہرائی میں چلتا رہا، بنیاد جوں جوں گہری ہوتی گئی مجھے گہرائی کا عرفان ہوتا گیا۔ اس سے پہلے میں نے زمین کو کبھی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ میرا گہرائی کا تصور ایک غیر ارضی، مجرد خیال تھا جس کا ذائقہ میں نے اپنے رگ وپے میں محسوس نہیں کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ زمین کا سارا وجود اس کی خارجی سطح پر اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن زمین کے پیٹ میں اترنے سے مجھے ایسا لگا۔ جیسے زمین کے اندر ایک جہان نوآباد ہے۔ فضائے بسیط کی طرح اس کی بھی اپنی ایک فضا ہے جو تہہ در تہہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ بقول اقبال زمین اور بھی آسمان اور بھی ہیں۔ زمین کے اندر کا سلف، اس کے باہر کے سلف سے بالکل مختلف ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کا داخلی سلف خارجی سلف کی ضد ہے۔ شاید اسی وجہ سے طبقات الارض کے ماہرین جب زمین کی گہرائی سے باہر آتے ہیں تو وہ کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ جب وہ ایک ہی زمین کے دو متضاد رخ دیکھتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا ہے اس کا اندر تو اس سمندر کی طرح ہے جس کی تہہ ناپید ہے اس کا باہر اس ایمان دار آدمی کی طرح ہے جس کی ساری ایمان داری اس کے چہرے پر لکھی ہوئی ہوتی ہے جب آدمی زمین کے بطن میں اترتا ہے تو وہ اپنے اندر کی پر اسرار معنویت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ زمین کے باہر تو ایک ایسی ناہموار سی سطحیت ہے جس پر چلنے سے انسان اپنے اصلی وجود سے کٹ کر زمانی تناظر میں ایک ایسا حقیر تنکا بن جاتا ہے جو انبوہ کے سیلاب میں بے یار و مددگار بہتا چلا جا رہا ہو۔ زمین کی خارجی سطح پر وقت اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ یلغار کرتا ہوا گلا رہا ہے۔ وہ چہروں اور شناختوں کو تاراج کرتا جا رہا ہے لیکن زمین کے اندر تو محض SPACE ہے۔ جہاں وقت کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اصحاب کہف زمین کے پیٹ سے باہر آئے۔ تو انہوں نے محسوس کیا کہ کئی صدیاں بے چاپ گذر گئی ہیں۔ اور انہیں اس کا علم تک نہیں ہوا علم بھی کیسے ہوتا؟ یہ تمام بے نام صدیاں زمین کی خارجی سطح پر گذری تھیں۔ اندر تو وقت ایک نقطہ پرکار کا ٹکڑا تھا۔

زمین کے باہر صرف زمین ہی نہیں بلکہ انسانی تمدن کے سارے بدنما نقش بھی موجود ہیں۔ اونچے اونچے مکان

سکریپر زبھی، دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں، بدوضع سڑکیں،
جو غبریالوں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔ وہ ہر مسافر کو اپنے جال
میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ اور جب وہ اس زنداں سے باہر
آتا ہے وہ زرد نہیں ہوتا جو سفر کے آغاز میں تھا۔ سفر کے آغاز میں
وہ افلاطون کے سماوی اعیان کا ایک لطیف سا عکس تھا۔
جو خیر و برکت کی علامت بن کر عالم وجود میں آیا تھا۔ وہ حقیقت
نہیں تھا۔ بلکہ اس حقیقت عظمیٰ کی پرچھائیں جو مرکزی لائٹ
کی طرح اسی کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ لیکن جب وہ بنیاد کی گہرائی
سے نکل کر ٹھوس اور سپاٹ حقیقت کی گرد آلود سڑک پہ آیا
تو یہ پرچھائیں غائب ہو گئیں۔ اور اس کے ارد گرد غروب
آفتاب سے پہلے کا جھٹپٹا پھیل گیا۔ اس نیم تاریکی کے عالم میں
اس نے اپنے قرب و جوار میں اپنی طرح کے انسانوں کو کیڑوں
میں ملبلاتے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر کیڑا کسی غیر معلوم جبریت
کے تحت دوسرے کیڑے کی شہ رگ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس جبریت
میں استدلال کی کوئی منطقی معقولیت نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو
محض زندہ رہنے کی خواہش کا ایک اعلامیہ تھی۔ بالکل ایسا
ہی سفاک جذبہ جو ڈوبتے ہوئے جہاز کے آخری تختہ پر دو
ملاحوں کے درمیان زندگی اور موت کی پیکار میں ظاہر ہوتا ہے
میں جب بنیاد میں چل رہا تھا۔ تو مجھے یوں لگا جیسے
میں حیاتیاتی طور پر دو واضح اکائیوں میں بٹا ہوا ہوں۔ میرا
نچلا حصہ زمین کے ساتھ پیوستہ ہے۔ اس میں زمین کی ساری
آلائشوں کے ساتھ ارضیت کا جوہر بھی شامل ہے۔ یہی وہ
حصہ ہے جو مجھے نیچے کھینچتا ہے۔ تاکہ میری جڑیں زمین کے سینے
میں پیوستہ رہ کر اپنی زندگی حاصل کرتی رہیں۔ میرا اوپر والا
حصہ تو ایک موٹر ڈرائیور کی طرح سٹیرنگ ویل پر بیٹھا مجھے
ہدایات دیتا رہتا ہے۔ کبھی وہ مجھے دائیں مڑنے کا مشورہ دیتا
ہے۔ کیونکہ بقول اس کے یہ نیکی اور سلامتی کا راستہ ہے۔ کبھی
جب میرے اندر کی سلگتی ہوئی خواہشوں کا سرکش لاوہ بغاوت
پر آمادہ ہو جاتا ہے تو مجھے سمجھاتا ہے کہ بائیں جانب سے ہٹ کر
ہی چلنے میں سلامتی ہے۔ کیونکہ اس راستہ میں بابل اور نینوا کے
شہر آتے ہیں۔ جو اپنی سرکشی کی وجہ سے زیر زمین چلے گئے تھے۔
لیکن زیر زمین بھی تو ایک دنیا آباد ہے۔ جس میں سنگ یشب
اور مروارید کے مکان بنے ہوئے ہیں۔ ان میں ایسے بلوریں
اجسام محو خواب ہیں جو تاریکی میں لو دے رہے ہیں۔ موٹر
ڈرائیور میرے زیریں حصے کے اس استدلال کو سن کر کانوں
کو ہاتھ لگاتا ہے۔ اور سٹیرنگ ویل دائیں طرف موڑ دیتا ہے
اور میں پھر مزدوروں کے ساتھ بنیادوں میں ناک کی سیدھ
میں چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ کیونکہ وہ راہ راست کی طرح
سیدھی بنیاد بھی مکان کی بنیادی ضرورت ہے۔

پھر ایک دن جب میں اپنے مکان کی بنیاد کو دیکھنے آیا
تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ زمین کے سینوں سے اینٹوں کے
اہرام باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اور زمین کے سارے گھاؤ بھر گئے
ہیں۔ مجھے خوشی بھی ہوئی کہ زمین کو جو زخم لگے تھے وہ اب
مندمل ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی دیواروں
کو دیکھ کر اپنی "مکانیت" کا دکھ ہوا۔ اس سے پہلے میں ایک
ایسا آزاد پرندہ تھا۔ جو صرف شام کے وقت اپنے گھونسلے
کو لوٹتا تھا۔ یہ گھونسلہ محض ایک عارضی حصار عافیت تھا۔
اس سے میری وابستگی بس اتنی تھی کہ ہر پرندے کی اپنے
گھونسلے سے ہوتی ہے۔ لیکن اب میں ایک مرکز کے ساتھ ایک
غیر مرئی سی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ دیواروں کے
اٹھان سے پہلے میری خوشی کا محور وہ فضائے بیکراں تھی
جس کی کوئی حد نہیں۔ میں دن بھر ہوا کی دوش پر ناموجود کی
تلاش میں محو پرواز رہتا۔ جب 'د' کے پاس سے اٹھتا تو
'م' کے پاس جا بیٹھتا۔ جب وہاں سے اٹھتا تو کسی اور کے
پاس جا بیٹھتا۔ جب دوستوں کے قہقہے سے چائے اور سگریٹ
کی خوشبو معدوم ہو جاتی تو میں ایک نامعلوم منزل کی طرف

بلدانہ ہوجاتا۔ مجھے حاتم طائی کی طرح ہر روز ایک نیا سفر درپیش تھا۔ لیکن اب تو میں اپنی قید کے لئے ایک سنگین قلعہ تعمیر کر رہا تھا جس میں اندر جانے کے تو کئی راستے تھے۔ لیکن باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس پر میرا سدھایا واچ ڈاگ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

اب دیواریں مکمل ہو چکی تھیں۔ چھت کے لئے سریا باندھا جا رہا تھا۔ شٹرنگ کی صلیب کھڑی کر دی گئی تھی۔ مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے کچھ دیر کے بعد میری ٹانگیں اور بازو سریا کے جال میں باندھ دیئے جائیں گے۔ اور پھر میری بیوی خندۂ زیر لب سے میرا سواگت کرے گی اب بتاؤ تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ تم نے اپنا زنداں تعمیر کر لیا ہے۔ تم اس میں زندگی بھر قید رہو گے۔ اور ہم سب مل کر تمہاری نگرانی کریں گے۔ صبح شام تمہارے آگے تمہارا ہی کمایا ہوا راتب ڈال دیں گے۔ اس خیال سے مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں نے معماروں اور مزدوروں کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ لیکن ان کی آنکھوں میں رحم یا شرافت کا ہلکا سا رنگ بھی نہیں تھا۔ وہ میرے وجود کی تمام تر خواہشوں سے بے نیاز ہو کر میری جیب تلاش کر رہے تھے۔ جراب سکڑ کر میرے پیٹ سے لگ گئی تھی۔ دراصل ان کی ساری دلچسپی میری قید سے تھی نہ کہ میری رہائی سے۔ وہ آہستہ آہستہ میرے وجود کو گارے، سمنٹ، اور ریت میں چنتے جا رہے تھے۔ اور اس دن کے انتظار میں تھے جب میں اپنے ہی تعمیر کردہ مکان میں سر تا پا دب جاؤں گا۔ اور وہ اس پر میرا کتبہ ہذا من فضل ربی لکھ کر میرے گھر سے رخصت ہو جائیں گے۔

مکان بالکل زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ ابتدا میں کوئی مکان نہیں تھا۔ اس لئے زمان و مکان کا تصور بھی نہیں تھا بلکہ زمین اپنے کنوارپن کی سوندھی خوشبو میں سرمست گھوم رہی تھی۔ وہ اپنے مرکز سے کٹ چکی تھی۔ بالکل پنجابی فلم کی اس الہڑ مٹیار کی طرح جو ناچتے ناچتے گھر سے اتنا دور نکل گئی ہو۔ کہ اب واپس جانا اس کے بس کی بات نہ ہو۔ پھر یوں ہوا کہ اس مست خرامی کے کسی نایاب لمحہ میں زمین کی کوکھ زندگی سے بھر گئی۔ اور جب یہ زندگی ظاہر ہوئی تو اس میں زمان و مکان کا نادیدہ عنصر بھی شامل ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس عنصر میں خرابی کی صورت بھی مضمر تھی۔ جب تک مکان کا مرئی وجود نہیں تھا تو فساد کی کوئی معقول وجہ بھی موجود نہیں تھی۔ لیکن جوں ہی مکان کی تعمیر کا خواب عمل کی دنیا میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ہمسایوں سے نالی کے رُخ پر جھگڑا ہوا اس جھگڑے میں نالی کے ساتھ ہمسائیوں کی جوان بہو بیٹیوں کا پردہ بھی فریق ثانی کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ جب یہ جھگڑا ختم ہوا تو ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے اقساط کی بے قاعدگی ادائیگی پر مقدمہ بازی شروع ہو گئی اس جنگ میں وکلا، رفقا، عزیز و اقارب اور ان کے احباب شامل ہو گئے۔ مقدمہ ختم ہونے سے پہلے ہی باپ بیٹوں میں تقسیم اراضی، اور حق وراثت پر لے دے کا آغاز ہوا۔ چنانچہ وہی باپ جس نے اپنے وجود کی نفی کر کے مکان کی پیشانی پر "علم دین ولا" لکھا تھا۔ اب اپنے بیٹے علم دین کو نافرمانی اور ناشکرے کردار کی بنا پر تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد سے محروم کر رہا تھا۔ سجدہ نہ کرنے پر شیطان کا بھی تو موقف ہے کہ آدم زمین میں فساد برپا کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ باغ عدن سے نکلنے کے بعد آدم کو لامحالہ مکان کی ضرورت درپیش آئے گی۔ اور اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو چیزوں کو حاصل کرنے کی خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مجھے نادانستہ طور پر شیطان سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں کردار کی ہزار خرابیاں سہی لیکن اس کی سوجھ بوجھ اور دانائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے جب مستری سے شیطان کی ذہانت کا تذکرہ کیا تو پہلے تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا پھر دو تین اینٹیں توڑ کر نیچے پھینکیں۔ اور مزدور کو آواز دی کہ وہ تیار شدہ مسالہ میں ریت ملا دے

اب کام کل صبح ہی شروع ہو سکے گا۔ یہ سن کر مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔

مکان بنانا چنداں مشکل نہیں۔ یہ کام تو دنیا کے چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی کر سکتا ہے۔ بلکہ میری دانست میں چھوٹا آدمی بہتر کر سکتا ہے۔ اصل مسئلہ تو مناسب جگہ کا انتخاب ہے بعض لوگ جب کبھی مکان کی تعمیر کا منصوبہ بناتے ہیں۔ تو اس میں اولیت اینٹ، سمنٹ، گارے کو دیتے ہیں۔ اور جگہ کو دلال کی صواب دید پر چھوڑ دیتے ہیں۔ دلال عام طور پر ایسے خطۂ زمین کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو نشیبی علاقے میں واقعہ ہو تاکہ آپ کو پانی کی تکلیف نہ ہو۔ اور کیچڑ اور گندگی میں آپ خود کھیل ہو جائیں۔ اس کے برعکس فنکار اور شاعر مکان سے زیادہ مکان کے حدود اربعہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لئے میں نے اکثر شعرا کو حدود اربعہ سے آگے جاتے نہیں دیکھا۔ مثلاً غالب کو ہی لیجئے وہ عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہا۔ (اور مکان بھی ایسا جہاں کوئی معقول آدمی نہیں رہ سکتا تھا۔) وہ مغل زادہ تھا روزانہ بکرے کے کباب کھاتا اور بادام کا حریرہ پیتا، تھوڑی سی ولایتی شراب پینا بھی شعری ضرورت سمجھتا تھا۔ چنانچہ ان وسائل کا آدمی کسی وقت بھی تین بیڈ کا مکان بنوا سکتا تھا۔ لیکن غالب کی مشکل یہ تھی کہ مکان عرش سے پرے ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہاں سے مزید بلندی پر جا سکے۔ غالب کے زمانے میں عرش سے پرے جگہ کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن وہاں تک تعمیراتی سامان لے جانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ پھر غالب کا یہ بھی اصرار تھا کہ جگہ ایسی ہونی چاہیئے، جہاں کوئی ادیب یا غیر ادیب پڑوس میں نہ رہتا ہو بلکہ ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مکان کے لئے ایسی سائیٹ تو آئیڈل ہے۔ لیکن اس کی دقت وہی ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ لیعنی دھرتی سے رشتۂ ازدواج، اگر آدمی فضا میں مکان بنائے تو وہ زمان سے ناطہ کیسے قائم رکھ سکتا ہے۔ اور زمین پر بنائے تو اہل زمین کے شر سے کیسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔؟ بالخصوص مستری اور مزدور کی شر سے

اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب میرا مکان بالکل تیار ہو جائیگا تو اس کے سائے میں بیٹھ کر اپنے رشتۂ ازدواج پر غور کروں گا۔ اور سوچوں گا کہ کیا دھرتی لیعنی مکان سے وابستہ رہنا بہتر ہے۔ یا مکاں کی مرکانیت سے نکل کر غیر محدود فضا میں چہل قدمی کرنا۔ ●

بقیہ : طول البلد

ہمت کر کے وہ باہری دروازے تک گیا۔ دروازے کی کنڈی کو اندر سے بند کیا۔ رات ہو چکی تھی پورے گھر میں اندھیرا تھا۔ اپنے کمرے میں پہونچ کر چراغ روشن کیا چراغ کی روشنی اس کے پورے جسم پر پڑ رہی تھی۔ اس کے کرتے کے اگلے اور پچھلے دامن کمرے کے فرش کو چھو رہے تھے۔ اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے کرتے کے اگلے دامن کو اٹھایا۔ اب اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں ٹانگوں میں دو لکڑی کی لمبی بیساکھیاں بندھی ہوئی ہیں۔ جس سے اس کا قد تین گنا ہو گیا ہے یہ دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں سے دامن چھوٹ کر زمین پر آ گیا۔ اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ●

ساحل احمد

پانچ نظمیں

راست باز

سانپ کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے
کہ وہ راست باز ہے
اور ہمیشہ
پیٹ سے پیٹ ملا کر چلتا ہے
جبکہ
آدمی
پیٹ پہ پاؤں رکھ کر چلتا ہے

رات

رات دو بجے کے قریب
گھر کے پچھواڑے
(ایک تعمیر شدہ مکان میں
جو کہ ابھی ادھورا تھا)
دو چور ایک دوسرے کو شکست دینے پر
تلے ہوئے تھے
ہاتھا پائی کر رہے تھے
کمبختوں کو یہی جگہ ملی تھی

مہوا

جنگل کے اوبڑ کھابڑ راستے پر
پھپھوند لگا پتہ پڑا ہے
مہوے کا
کتے نے پیشاب کر دیا ہے

شعور

آدمی کا پیٹ جتنا بڑا ہوتا ہے
اتنا ہی چھوٹا اس کا دماغ ہوتا ہے
یوں کٹھل کے اندر ایک [illegible] ہوتا ہے
جس کے کھانے سے
بکری زیادہ دودھ دیتی ہے

آکسیجن

لال، پیلے اور کالے پیٹ میں
کاربن ڈائی آکسائیڈ بھر گئی ہے
آکسیجن
دور شت ہو گئی ہے

سوہن راہی (لندن)

میں مفلس ہوں

میں مفلس ہوں
بہت ہی مفلس
مجھے اپنی ذہنی، جسمانی اور شعوری لیاقتوں کا
اندازہ نہیں

میرا ناشتہ ان بندوق کی گولیوں میں ہے
جن سے موت اگتی ہے
میرا دوپہر کا کھانا ان ریڈار(۱) میں ہے
جو ملکوں کی سرحدوں پر نصب ہیں اور
جو خلا کی جھیل میں رقص کر رہے ہیں
میرا رات کا کھانا اس نرو گیس(۲) میں ہے
جو زندگی کے آئینے کو ڈس لیتی ہے
میری نیندیں ان کی مرہون منت ہیں
جو کریملن(۳)، وائٹ ہاوس(۴) اور وائٹ ہال(۵) میں
جاگ رہے ہیں
میرے خواب میرے نہیں
میرے خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں

میں مفلس ہوں
بہت ہی مفلس
میری بیماری کا علاج
ان تیز رفتار جہازوں کی پرواز میں ہے
جو امن کے نام پر
ترا غطوں کو تسخیر کریں گے
میرے جسم کا لباس
ان میزائیلوں کے پیٹ میں ہے
جو توازن کے نام پر
دھرتی کے سینے میں گاڑے جا رہے ہیں

میں مفلس ہوں
بہت ہی مفلس
زندگی کے معنی سے بے خبر
لیکن موت کے معنی سے باخبر

—— ٠ ——

(1) RADAR (2) NERVE GAS (3) KREMLIN (4) WHITE HOUSE نشان
(5) WHITE HALL

اسعد بدایونی

سجدۂ خاک کا موسم

شاخ کو چھوڑ چلا برگ خزاں آمادہ
جانے کس خاک کو جاتا ہے ہوا کے رتھ پر
سب کو مٹی کے بلاوے پہ چلے جانا ہے
جتنی مخلوق ہے اس عالم آب و گل میں
خاکدانوں کی ضیافت کے لئے زندہ ہے
کون سی روشنی تابندہ ہے
سب چراغوں کی نگاہیں ہیں، ہوا کے ہاتھوں
خاک ہی سب سے بڑا منبع ہے
خاک ہی خاک ہے ہر جسم کے شریانوں میں
خاک ہی ذہن میں ہے خاک ہی ہے کانوں میں
دل، زباں، آنکھ سبھی خاک کے ہیں

سجدۂ خاک کا موسم آیا
یعنی ادراک کا موسم آیا

خالد اگاسکر

سینڈل پوش خلا

میں
ایک راہرو
تھکا ماندہ
راستے سے بھٹکا ہوا
قدموں کے فاصلے گھٹانے کے لئے
تم تک پہنچا
تم

جو کافی اونچی تھیں
مجھ سے عظیم
اس عظمت پہ گمان خدا ہوا

اور
تم
اپنی اونچی ایڑی کے سینڈل اتار کر
اندھے کنوئیں میں کود پڑیں

صدیق مجیبی

غزل

عجیب دھند ہے آنکھوں کو سوجھتا بھی نہیں
ابھی تو دن کا ورق ٹھیک سے جلا بھی نہیں

یہ کس حصار میں سانسوں نے کس دیا ہے مجھے
یہ کیسا گھر ہے نکلنے کا راستا بھی نہیں

یہ کیسا غم ہے جو روتا ہے سسکیاں لے کر
کمند میں کون ہے روپوش بولتا بھی نہیں

مجھے بھی دیکھ، مرے حوصلے بھی دیکھ ذرا
مرا تو کوئی نہیں، تو نہیں، خدا بھی نہیں

عجیب درد کا رشتہ ہے، اک عذاب ہے یہ
بھلا دیا جسے ہم نے وہ بھولتا بھی نہیں

ہر ایک شب کوئی پلکوں کو آکے سیتا ہے
وہ میرا کون ہے، پوچھوں، تو بولتا بھی نہیں

—— ٭ ——

جتنی تری بساط ہے اتنا بنا مجھے
اے زندگی بنا تو، تماشا بنا مجھے

میں جا لوں ایک سانس میں اپنی تمام عمر
اک رات، ایسی رات کا لمحہ بنا مجھے

میں آنسوؤں میں گوندھ کے لایا ہوں جسم و جاں
تو جیسا چاہتا تھا، بنا، بنا مجھے

تو صاحبِ جمال و کرم، میں فقیرِ شہر
فیاضیاں دکھا، کبھی کاسا بنا مجھے

خوفِ گناہ ہے تو سلیقے سے بات ٹال
سانسوں میں گھول، ہونٹوں پہ نغمہ بنا مجھے

میں نقشِ ناتمام ہر اک عہد میں رہا
اے کلکِ فن شبیہِ تمنا بنا مجھے

—— ٭ ——

شاہد کلیم

جسم پر چڑیوں کے بال و پر نہیں
میری آنکھوں میں حسیں منظر نہیں

پھول پھل سے پیڑ ہیں آراستہ
میرے ہاتھوں میں کوئی پتھر نہیں

شہر اک سنسان جنگل ہو گیا
رات کیا، دن میں بھی شور و شر نہیں

اک دیا دہلیز پر جلتا رہے
لوگ سمجھیں گے کہ تو باہر نہیں

ڈھونڈتا ہوں آئینہ در آئینہ
میرے خط و خال بے پیکر نہیں

بے سر و ساماں ہوں لیکن اے کلیم
کوئی خطرہ اور کوئی ڈر نہیں

میں نکل بھاگوں کوئی جادہ نہیں
جسم کے زنداں میں دروازہ نہیں

کمرہ کمرہ خوشبوئیں لہرا گئیں
کہہ رہے تھے گل کوئی تازہ نہیں

رات کی مانند ہیں سپنے سبھی
کالے چہروں پر کوئی غازہ نہیں

تو سمندر ہے نہ دے کوئی مثال
دل کی گہرائی کا اندازہ نہیں

پھر خزاں نے نام اپنا لکھ دیا
کوئی پتا پیڑ کا سادہ نہیں

وہ مجھے کیا دے سکے گا اے کلیم
وہ تو عہد نو کا شہزادہ نہیں

وہاب دانش

زرد سی آنکھیں تھیں گم سم، بدگمانی تھی وہی
دوستوں کے پاس میری وہ کہانی تھی وہی

آستیں تھی سبز اس کی اور ہتھیلی تھی سفید
رنگ تھا ظاہر کہ مجھ پہ مہربانی تھی وہی

اک شکستہ آخری کچا سرا لمحوں کا تھا
رشتۂ جاں میں مگر، لوک روانی تھی وہی

زخم یوں تو بھر دیئے تھے نرم لمحوں نے مگر
پھول کی پتی کی جیسی اک نشانی تھی وہی

بس چکے تھے یوں تو سارے گھر نئی سرحد کے پاس
پھر بھی دانش بے یقینی، بے زمینی تھی وہی

نذیر فتح پوری

جو دل کی کیفیت ہے اسے آنکتے رہو
کاغذ کی ٹہنیوں پہ غزل ٹانکتے رہو

عریانیت چھپے نہ چھپے پھر بھی منچلو
لفظوں کے پیرہن سے بدن ڈھانکتے رہو

ہر آنکھ میں تلاش کرو حسنِ منظری
ہر دل میں چاہتوں کے افق جھانکتے رہو

یہ رخشِ عمر ہے اسے تھمنے نہ دو کبھی
کچھ تیز رو بھی ہو تو اسے ہانکتے رہو

کہتے ہیں جس کو کیف و کم زندگی نذیر
اک ایسا زہر ہے کہ جسے پھانکتے رہو

ایم۔ اے۔ ضیا

ہم مسافر ہیں کوئی ہم سے تقاضہ مت کرو
دل ہمارا ہے بڑا تم دل بھی چھوٹا مت کرو

روح کی گہرائیوں میں جو اتر جاتی ہے بات
وہ متاعِ زندگی ہے اس سے بھاگا مت کرو

کیا انا ہے کیا ہے سجدہ، کیا جنوں ہے کیا ہے عقل
سب فریبِ زندگی ہیں ان سے الجھا مت کرو

تاش کے پتوں کی طرح پیار تو بٹتا نہیں
اک جواری کی طرح یہ کھیل کھیلا مت کرو

پھر تمہاری بات کا رہ جائے شاید وزن بھی
دل کی باتیں کہہ کے اپنا بوجھ ہلکا مت کرو

ٹوٹتے شیشوں کی کھیتی میں گم رہتے ہو تم
کیا سمٹ پاؤ گے تم؟ ٹکڑوں میں بکھرا مت کرو

اے ضیا گوتم کی دھرتی سے چلے آئے یہاں
گیان کی نگری کو تم الجھن میں چھوڑا مت کرو

———— ٭ ————

خورشید سحر

یہ سوچتا ہوں تو کچھ کھلبلی سی ہوتی ہے
کہ میرے ہاتھ میں پتھر نہیں ہے موتی ہے

کسی کی چیخ ہو دستک ہو اس سے کیا مطلب
بہت سکون سے دنیا ابھی بھی سوتی ہے

ہر ایک شخص سے برہم ہے زندگی لیکن
نہ جانے کیا ہے کہ رشتوں کا بوجھ ڈھوتی ہے

کبھی جو برسی تو بس تتلیوں کا پر بھیگے
سلگتے شہر کو بارش کہاں بھگوتی ہے

طلوع ہوتے ہی جھکنے لگی غروب کی سمت
کہ یہ صدی بھی اب اپنا وقار کھوتی ہے

بہت ملول بہت ہی نڈھال ہے پھر بھی
یہ زندگی تری یادوں کا بوجھ ڈھوتی ہے

دل و دماغ پہ قابو تو پا لیا ہے سحر
مگر یہ آنکھ ہے ایسی کہ اب بھی روتی ہے

———— ٭ ————

شاہد لطیف (بمبئی)

سماعت شکن شور ہے گھر عجب ہے
یہاں پر صدائے مکرر عجب ہے

کہاں گم ہوا آسماں ؟ کون جانے
زمیں ہے اب اپنے سروں پر عجب ہے

یہ سایہ مرا تم سے بہتر یقیناً
جو چلتا ہے میرے برابر عجب ہے

مجھے خوف آتا ہے دیوار و در سے
بلاؤں سے عاری مرا گھر عجب ہے

بچھا ہوں میں دفتر سے اپنے مکاں تک
مری گردشوں کا یہ محور عجب ہے

شفق ہے، دھنک ہے کہ تاروں کا جھرمٹ
تصور کی دنیا کا منظر عجب ہے

ہر اک موج طوفان کا پیش خیمہ
سمندر ہے جسموں کے اندر عجب ہے

پروین کمار اشک

کھلونے دیکھتا ہے چیختا ہے
وہ بچپن ہی میں بوڑھا ہو گیا ہے

کبھی ہم جس کی چھت پر کھیلتے تھے
سنا ہے آج وہ گھر ڈھ گیا ہے

سکوتِ مرگ ہے جنگل میں لیکن
کہیں پر اک پرندہ بولتا ہے

میں کہنے کو تو اک صحرا ہوں لیکن
سمندر مجھ سے پانی مانگتا ہے

ہوا کا آدمی آیا کہ آیا !
فقیر شہر مجھ سے کہہ گیا ہے

وہ کیا جانے کہ بادل کیسے برسیں ؟
جو واٹر پروف چادر اوڑھتا ہے

مجھے بھوتوں کے کمرے میں بٹھا کر
مداری اشک جی خود چھپ گیا ہے

رئیس الدین رئیس

رنگ لے جائے گا رنگین تتلیاں لے جائے گا
پھر خزاں کا ہاتھ سب کی پتیاں لے جائے گا
جب مرے کمرے میں در آئے گا دست آفتاب
چھین کر مجھ سے مری تنہائیاں لے جائے گا
خامشیٔ آب دریا دیکھ کر خوش ہیں سبھی
جب بھنور آئے گا ساری کشتیاں لے جائے گا
دیوتا دن کی صعوبت اوڑھ کر سو جائیں گے
جب وہ گھر اپنے تھرکتی دیویاں لے جائے گا
سب اجالے بانٹ کر سورج لہو میں تر بتر
جب گھر اپنے جائے گا تاریکیاں لے جائے گا
پھر قدامت کو مٹا دے گا مشینوں کا یہ شور
گاؤں سے انساں کو کیا سب کھیتیاں لے جائیگا
واپسی پر دوست دیں گے تحفۂ جامہ دری
جسم پر اپنے سجا کر دھجیاں لے جائے گا

فریاد آذر

اس کی مخالفت کا تو میدان صاف تھا
لیکن خود اس سے اس کا بڑا اختلاف تھا
اندھا نہ تھا کوئی بھی مرے شہر میں مگر
ایک بے حسی کا سب کی نظر پر غلاف تھا
الزام کیا میں دیتا کسی شخص کی ذات کو
مجھ سے عجب لہو کا مرے انحراف تھا
ورنہ یہ سرد راتیں مجھے مار ڈالتیں
خوش فہمیوں کا مرے بدن پر لحاف تھا
جس کا کوئی وجود نہیں تھا جہان میں
اس کے ہی گرد سب کی نظر کا طواف تھا
یوں لمحہ لمحہ ختم ہوا جا رہا تھا وہ
جیسے کوئی وجود میں اس کے شگاف تھا
آذر کی بت تراشی سے واقف تھے سب مگر
آذر غزل تراش ہے یہ انکشاف تھا

تبصرہ

نام کتاب : وقت کا سورج (شعری مجموعہ)
مصنف : ساحر شیوی
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔
قیمت : پچیس ۲۵ روپے (مجلد)
مبصر : بدر اورنگ آبادی

"وقت کا سورج" حمد و نعت کے بعد، ۳۵ نظموں، غزلوں، چند رباعیات، قطعات اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ "حرفے چند" کے عنوان سے پریم گوپال متل نے پیش لفظ اور حرمت الاکرام نے تعارفی نوٹ لکھا ہے۔ لیکن دونوں ہی نے ساحر شیوی کی شاعری پر روشنی ڈالنے سے گریز کیا ہے بلکہ حرمت الاکرام نے تو ساحر کا نام "ہندستان کی اردو دنیا" میں بند کر دیا ہے وجہ اس کی شاید یہ ہو کہ ۱۲۰ صفحات کے اس مجموعے کا بیشتر حصہ بس "کلام موزوں" سے بھرا پڑا ہے۔ اور خود شاعر کو اس کا اعتراف ہے کہ ؎

ایک زمانہ ہوا شعر کہتے ہوئے
اب بھی ساحر ہوں میں مبتدی کی طرح

لیکن نیروبی (کینیا، مشرقی افریقہ) میں سکونت پذیر ساحر کی شاعری میں سماجی حالات کا عکس بھی ہے۔ اور انبساط مہیا کرنے کے سامان بھی، کئی استعارے ایسے بھی ملتے ہیں جو براہ راست وجدان پر اثر ڈالتے ہیں۔ اور اسی لئے لطف دے جاتے ہیں جیسے ؎

جو ہو سکے تو اندھیروں میں ڈوب کر دیکھو
شب سیہ میں سویرا دکھائی دیتا ہے

روکو نہ انہیں اور مچل جائیں گے
کر لیں نہ قیامت کہیں برپا آنسو

ساحر شیوی بنیادی طور پر نظم کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کی نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ساحر نے کائنات کی ہر چیز کو مدنظر رکھا ہے۔ انہوں نے جو خیالات پیش کئے ہیں ان میں خارجی حالات سے پیدا شدہ کیفیات کی بھرپور جھلک ہے۔ اور ان کی نظموں میں جذبات و احساسات کا اظہار خلوص، سچائی، اصلیت اور حقیقت کے ساتھ ہوا ہے جس کی مثال نظم "آدمی" ہے جس میں دور حاضر کے انسانوں کے گھناؤنے چہرے کو آئینہ دکھایا گیا ہے۔ ہاتھ جو ایٹم بم بناتے ہیں، پاؤں جو ٹھوکروں پہ جاتے ہیں، زبان جو کرسی کی خاطر، منصف بن کر جھوٹا فیصلہ سناتی ہے آنکھ، کان —— غرض کہ انسان کے بدن کا ہر عضو "نشتر" کے لئے آمادہ ہے اور بے قرار ہو کر شاعر پکار اٹھتے ہیں ؎

مجھے تم آدمی کا نام لے کر جب بلاتے ہو!
مجھے لگتا ہے جیسے مجھکو گالی دے رہے ہو تم

شاعر کا گلہ ہے کہ ؎

کہے گا کون سخن گو بھلا تمہیں ساحر!
جدید رنگ میں تم شاعری نہیں کرتے

لیکن چند اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں جدید شاعری کی زیریں لہروں کا نشان موجود ہے جیسے ؎

میں نے بلا دیا جو لہو کام آ گیا
پھولوں سے گلستان مرا معمور دیکھئے

بدل ہی جائے گا اک روز یہ نظام کہن
کبھی تو جائے گا یہ طوق و دار کا موسم

اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شاعر شعری معنوی اور صوری پہلو، تخیل، زبان، اسلوب، اور انداز بیان کی طرف مزید توجہ دیں۔

کتابت و طباعت بہت اچھی ہے اور کتابت کی غلطیاں نہیں ہیں۔ لیکن صفحہ ۷۸ پر لفظ "توتا" (طوطا) بری طرح کھٹکتا ہے۔ جلد اور دیدہ زیب پلاسٹک کور کے باوجود قیمت کچھ زیادہ ہے۔

نام کتاب : تجلیات قمر (شعری مجموعہ)
مصنف : قمر صدیقی مرحوم
ناشر : جمال احمد صدیقی۔
تقسیم کار : عثمانیہ بکڈپو، ۱۲۵ رابندر سرانی، کلکتہ ۷۳
قیمت : پندرہ روپے
مبصر : ڈاکٹر محمد مثنیٰ

"تجلیات قمر" قمر صدیقی مرحوم کی غزلوں، نظموں، قصائد، قطعات، اور نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ قمر صدیقی علامہ رضا علی وحشت کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ استاذ کا رنگ سخن ان کے کلام میں جا بجا جھلکتا ہے۔ ان کے کلام میں قدیم رنگ سخن کا نکھار ملتا ہے۔ قمر صدیقی مرحوم کا مزاج شعری غزل اور تغزل سے خاص مناسبت اور لگاؤ رکھتا ہے۔ لیکن استادانہ مہارت کے حامل ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہر صنف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس مجموعہ میں غزلوں کی تعداد دوسری اصناف کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

غزل کے مخصوص آداب کو انہوں نے جس عمدگی اور خوبی کے ساتھ اپنی غزلوں میں برتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے شعری مزاج کی تربیت میں ان کے استاذ علامہ رضا علی وحشت کی توجہ اور کاوش کو کس قدر دخل ہے، طرز اظہار کی بے ساختگی، محاورات کی برجستگی اور زبان و بیان کی صحت اور پختگی کے اعتبار سے ان کا کلام بجا طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کا مستحق ہے۔ ان کی غزلوں میں لطف بیان اور شیرینی کے ساتھ ساتھ خیال آفرینی بھی پائی جاتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لے کے انگڑائی کوئی اٹھا ہے خواب ناز سے
اور ہی عالم ہے اب تو فتنۂ بیدار کا

شکوہ جور و جفا اور وفا کا دعویٰ
تم کو اے اہل وفا پاس وفا کچھ بھی نہیں

مشہور ہو رہی ہے مری داستان عشق
یوں بھی تمہارے حسن کا قصہ بیاں ہوا

ان اشعار میں زبان و بیان کے حسن کے ساتھ تغزل کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے، جو غزل کی محض روایتی اور رسمی تہذیب کی یاد دلاتی ہے، جس میں نئی آہٹوں کا دور دور پتہ نہیں۔ غزلوں ہی کی طرح ان کی نظمیں، قصائد اور قطعات بھی بندھے ٹکے انداز کے ہیں۔ ان میں کوئی ایسی نئی کیفیت یا ندرت نہیں محسوس ہوتی جو انہیں اپنے دوسرے معاصرین سے الگ کر کے نمایاں کر سکے۔ جناب جمال احمد صدیقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے قمر صدیقی مرحوم کا کلام یکجا کر کے اس قدر اہتمام کے ساتھ شائع کیا کتابت اور طباعت کی خوبی نے اس مجموعہ کی دلکشی میں یقیناً اضافہ کر دیا ہے۔

نام کتاب : عکس تمنا (شعری مجموعہ)
مصنف : کمال جعفری
ملنے کا پتہ : ۴۹ آل انڈیا ریڈیو، ہوسٹل
کرزن روڈ، نئی دہلی۔
قیمت : پندرہ روپئے
مبصر : ڈاکٹر محمد مثنیٰ

"عکس تمنا" نوجوان شاعر کمال جعفری کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ میرے خیال میں ان کی غزلیں ان کی شاعرانہ شخصیت کا مقابلتاً زیادہ بھرپور اظہار ہیں۔ غالباً ان کو خود بھی اس حقیقت کا احساس ہے، یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ میں غزلوں کا حصہ نظموں پر شدت کے ساتھ حاوی اور غالب ہے۔ ان کی غزلیں قاری کو فوراً یہ احساس دلاتی ہیں کہ ان اشعار کا خالق اپنے عہد کا زندہ احساس رکھتا ہے۔ داخلی اور خارجی زندگی کے ہلکے سے ہلکے ارتعاشات بھی اس کے دل و دماغ کو چھوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے داخلی تقاضوں سے وجود میں آنے والے یہ اشعار لہجہ کے خلوص آواز کی انفرادیت، انداز کی سادگی، اور اظہار کی معصومیت سے بڑے موثر اور پرکشش بن گئے ہیں ؎

رستہ رستہ آنکھ بچھائے پھرتا ہوں میں شام و سحر
کوئی شناسا سا بھی آجائے دل کی دنیا تنگ نہیں

آج ہم آپ سلامت ہیں تو بس
کس کو معلوم کہ کل کیا ہوگا

کسے خبر کہ وہ رہتا ہے کس طرح گھر میں
جو دیکھنے میں تو گھر دکھائی دیتا ہے

کوئی صحرا نہ کوئی دریا ہے
زندگی درد کا جزیرا ہے

غزلوں کے ان اشعار میں جو پرخلوص لہجہ اور جو حساس آواز محسوس ہوتی ہے۔ اس میں ایک انوکھے پن کی کیفیت ہے۔ غزل کی دنیا میں کسی شاعر کے لئے اپنی آواز کو دوسری آوازوں سے الگ کرلینا آسان نہیں۔ کمال جعفری نے اپنی غزلوں میں نئے اور پرانے کا جو متوازن اور خوب صورت امتزاج پیش کیا ہے۔ اس سے ان کی انفرادیت نکھر کر سامنے آئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا شاعرانہ جوہر غزلوں میں زیادہ چمکا ہے لیکن ان کی نظمیں بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی معصوم خوشیوں سے لے کر انتہائی سنگین اور دل شکن حالات کے بخشے ہوئے رنج و الم تک ایک سلسلہ ہے جو ان کی نظموں سے جھانکتا نظر آتا ہے۔ ان میں تفکر اور گہرائی تو نہیں۔ لیکن خلوص کی نرمی اور سادگی نمایاں طور پر موجود ہے۔ "فردوس نظر" "فریب کار شہر" "ایک نظم" اور "کل اور آج" کامیاب نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت کے صحت مند عناصر کے احترام کے ساتھ ساتھ نئے تجربات کو اپنانے میں کسی طرح ہچکچاہٹ کا احساس نہیں پایا جاتا۔ ان کا یہ دعویٰ بڑی حد تک درست ہے کہ ان کی شاعری کا دامن، تصنع، لفظ بازی اور ازم کی خرابیوں سے محفوظ ہے۔

نام کتاب : ایلاف (شعری مجموعہ)
مصنف : رؤف خیر
ناشر : گل نو پبلیکیشنز، چھتہ بازار، حیدرآباد ۲
ملنے کا پتہ : رؤف خیر، ۱۲۷ / ۴ / ۳۰ / ۱
سبزی منڈی، حیدرآباد
قیمت : دس روپئے
مبصر : ڈاکٹر محمد مثنیٰ

ایلاف، رؤف خیر کا نیا شعری مجموعہ ہے۔ رؤف خیر کا نام جدید شعر و سخن کی دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے اس سے پہلے ان کا مجموعہ کلام "اقرا" نقادانِ فن سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس نئے مجموعہ میں ۵۸ ترائیلے اور چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اردو ادب میں ترائیلے کا نام آتے ہی روف خیر کے نام کا یاد آجانا بالکل فطری ہے کیونکہ فرانسیسی زبان کی یہ اہم اور مقبول صنف سخن ان کے یہاں ایک مستقل رجحان کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس کا مخصوص فارم ایک خاص کی طرح کی فنی مہارت اور چابکدستی کا مطالبہ کرتا ہے۔ آٹھ مصرعوں کی اس نظم میں دو مصرعوں کا اعادہ کرنے کے باوجود تاثیر کی شدت کو قائم رکھنا، اور بے کیفی اور بے رنگی سے دامنِ شعریت کو بچائے رکھنا معمولی بات نہیں۔ روف خیر اس کٹھن منزل سے جس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں اس کی داد نہ دینا ان کے ساتھ سخت بے انصافی ہوگی زندگی کی بنیادی مسائل سے لے کر انتہائی داخلی محسوسات اور سماجی تصورات تک ان کے ترائیلوں کا موضوع ہیں لیکن انہوں نے ان سارے موضوعات کو کچھ اس طرح اپنے فن میں برتا ہے کہ وہ شدت کے ساتھ محسوس کی ہوئی تصویریں بن کر ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں۔ ان کے ترائیلوں میں احساس کی رعنائی کے ساتھ فکر کی دبازت بھی نظر آتی ہے چند ترائیلے ملاحظہ ہوں۔

مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں!
مرے اندر سکون خواب جیسا!
ثمر آور وہ جو برگ آبیاں ہیں!
مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں!
مرے ... اب سے سیرابیاں ہیں
خرابہ بستی شاداب جیسا!
مرے باہر کی بلا آندھیاں ہیں

مرے اندر سکون خواب جیسا۔

ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے!
وہ ایک اسم کہ کھلتے ہیں جس سے دروازے
ملی جو چشم خوں ساز دم تو بھول گئے!
ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے!
سفالی جسم ملا، جام جم تو بھول گئے
غلط نہیں لگے کم سخن کے اندازے!
ترے وجود میں لوٹ آئے ہم تو بھول گئے
وہ ایک اسم کہ کھلتے ہیں جس سے دروازے

ان کے علاوہ "عرفان کے بعد"، "بن باس"، "کارِ جہاں دراز ہے"، "خاموش تماشائی"، اور "درد" ایسے ترائیلے ہیں جن میں عہدِ حاضر کی حسیت شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ایک ایسے نوجوان کی تخلیقات ہیں جس کا دل دھڑکتا ہے تو دماغ بھی سوچتا ہے۔ ترائیلے کے علاوہ اس مجموعہ میں جو نظمیں شامل ہیں ان میں بیشتر مختصر نظمیں ہیں۔ جو اپنے تاثر کی وحدت کے اعتبار سے ایک خاص انفرادیت کی حامل ہیں۔ زندگی کے معمولی دکھ سکھ سے لے کر اہم سماجی حقائق تک ان کی نظموں میں ایک محسوس شدہ خیال بن گئے ہیں۔ "تجربہ"، "خیال رزق"، "خود بینی"، "نظم" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو ایک باذوق اور باشعور قاری کو متوجہ کرنے کے سامان اپنے اندر رکھتی ہیں۔ رؤف خیر کی غزلیں بھی اپنے اندر ایک بانکپن اور طرفگی کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار ان کے جدید شعورِ حیات اور عصری حسیت کے آئینہ دار ہیں۔ چند شعر دیکھئے:-

جس روپ میں بھی چاہے تماشہ گر رہو
اتنا ہو اپنے ہونے کی پہچان تو رہو

زمیں سے ربط مگر ٹوٹ ہی نہیں پاتا
دراز اپنی اڑانوں کے سلسلے تو ہوئے

میدانِ جسم و جاں میں بڑے معرکے ہوئے
ہم سے کبھی وہ صلح کے قائل نہ تھے ہوئے

یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار ان کے لب و لہجہ کی انفرادیت اور آواز کے کس بل کے پتہ دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں باسی پن کا احساس نہیں ملتا، اور یہ بڑی بات ہے۔ صوری اعتبار سے بھی یہ مجموعہ اطمینان بخش ہے۔

نام کتاب : شعر شگفت (شعری مجموعہ)
فن کار : کرشن کمار طور
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی
مکتبہ قصر اردو بازار دہلی
قیمت : تیس روپے
مبصر : ڈاکٹر محمد مشتاق

• شعر شگفت • کرشن کمار طور کی غزلوں کا مجموعہ ہے غزلوں کا یہ مجموعہ اپنی ندرت فکر اور طرز بیان کے انوکھے پن کی بدولت ذہین اور سنجیدہ قاری کو اپنی طرف فوراً متوجہ کرلیتا ہے طور کی غزلوں کا مطالعہ ان کی بے پناہ صلاحیت کا شدت کے ساتھ احساس پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے غزل کے فنی آداب کو مکمل طور پر برتنے کے ساتھ ساتھ اس صنف سخن کے حدود میں بعض نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ جن سے ان کے تخلیقی جوہر اور غزل سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل ایک ایسی چیں بجبیں اور نازک مزاج صنف سخن ہے۔ جس میں روایتی سانچوں سے معمولی انحراف بھی آسان نہیں۔ اس میں تازگی اور طرفگی وہی فن کار پیدا کرسکتا ہے جسے اپنے عہد کے پیچیدہ [illegible] آگہی کے ساتھ ساتھ نئے رموز و علائم کو غزل کے فارم میں برتنے کا سلیقہ آتا ہو۔ کرشن کمار طور اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ غزلوں کے چند شعر دیکھئے۔

ایک ہی اور دیکھا اب دونوں میں اسیر
سایۂ قطرۂ شبنم ہے تو میں بھی

ترا شیدہ دونوں پر ایک سایہ
لب آویزاں کوئی نازک دعا سی
بدن صد سمت اظہار تعلق
اور آنکھیں اک مکمل گفتگو سی

نقش ہیں دشت بدن پر کن ہواؤں کے نشان
آب داری تہہ بہ تہہ گرد میں کچھ بھی نہیں

سمت نامہ ہے مرا اسم آواز
جز بس جہت سفر ہوں دیکھو مجھے

کرشن کمار عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے والے راہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات، اس کے حسن اور اس کی رنگا رنگی کے حوالے سے داخلی حقائق کو پرکھنے اور شاعرانہ پیکر میں ڈھالنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ان کی آواز اپنے ہم عصروں میں ایک الگ اور منفرد آواز ہے۔ جس پر کسی دوسری آواز کا دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ اور فن کی دنیا میں یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ان کی غزل میں جو گہری سنجیدگی اور اپنی راہ الگ بنانے کی جو خلش محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ "شعر شگفت" صوری و معنوی دونوں اعتبار سے عمدہ شعری مجموعہ کہا جا سکتا ہے •

[·]. Regd. 4253 64
T. Regd. No. Gy. 5 84
[·]one- 432

The Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

تفہیمات

— تنقیدی مضامین —

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-

The Cultural Academy, Gaya.

[·]over Printing :— Ambar Art Press, Gaya.



(Prof.) Dr. **HASAN AARZOO**
M. A. D. Litt.

(See in side his unique article on some Stories of Kalam Haidri)

MARCH 1984 **PRICE 3/-0**

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ - سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے	چھتیس روپے
ایک شمارہ	تین روپے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹرز
نوشابہ حقی، عبدالصمد

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا کی تمام مطبوعات (کتابیں، رسائل، پمفلٹ) میں شائع ہونے والی ادبی و نیم ادبی تخلیقات میں نام، مقام، واقعات، ادارے اور کردار [illegible] فرضی ہوتی ہیں۔ حقیقی افراد، مقام، واقعات، ادارے اور کردار سے اس کی مماثلت یا مطابقت محض اتفاق ہے جس کے لیے کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا کے کسی فرد، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، ارکین، معاونین، کارکنان [illegible] پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ادارہ

محتویات

اداریہ

کشکول

ادب کا استحصال کرنے کی کوششوں کی بڑی لمبی تاریخ ہے ایسا لگتا ہے انسانی ذہن کو بدلنے کے لئے ادب سے زیادہ معصوم حربہ کوئی نہیں ہے۔

مگر تاریخ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ادب ہر طرح کی آزمائشوں سے پاک و صاف نکل آتا ہے۔

اسے مذہب اپنے لئے استعمال کرتا ہے۔

سیاست اسے استعمال کرتی ہے۔

اس کے ذریعہ انسان کی عملی قوتوں کو مفلوج کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

اس کے ذریعے ایک تہذیب دوسری تہذیب کی بیخ کنی کرتی ہے۔

لیکن ادب عالیہ کا مرتبہ وہی ادب حاصل کرتا ہے جو ذریعہ اور نتیجہ دونوں ہوتا ہے۔

ادب کے لئے اول و آخر ادب ہی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ جو بھی ADJECTIVE استعمال کیا جاتا ہے اسے ایک حد کے اندر رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ ادب کا بہرحال استحصال کرنے کی کوشش ہے

اسلامی ادب کسی جماعت کی وقتی ضرورت ہو سکتی ہے مگر ادب کا رتبہ اسے نہ مل سکا ہے نہ مل سکے گا۔ کیونکہ جماعت تو جغرافیائی اور سیاسی مصلحتوں کی تابع ہوتی ہے۔ اور ہوتی رہتی ہے۔ مگر ادب ان مصلحتوں میں قید ہونے سے انکار کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

———— ٥ ————

مطبوعات دی کلچرل اکیڈمی، (رجسٹرڈ) گیا

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
	تنقید و تبصرہ		
۱	زاویۂ نگاہ	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۰/-
۲	انتخاب کلام جمیل	" محمد مثنیٰ	۷/-
۳	معیار و مسائل	" شاہ شکیل احمد	۵/-
۴	استفسار یمن نمبر	مرتبہ کلام حیدری	۲۵/-
۵	شاد کی نثر نگاری	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۴۰/-
۶	مزامیر	کلام حیدری	۱۰/-
۷	برملا	کلام حیدری	۱۵/-
۸	عکس	نثار احمد صدیقی	۱۰/-
۹	نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	مہدی جعفر	۳۰/-
۱۰	کلیات وجد	ایم ایم مصطفےٰ	۱۵/-
۱۱	تفہیمات	کلام حیدری	۳۰/-
۱۲	تذکرہ شعرائے گجرات	کلام حیدری	۱۵/-
	افسانے		
۱۳	بے نام گلیاں	کلام حیدری	۱۰/-
۱۴	بابا لوگ	غیاث احمد گدی	۸/-
۱۵	سفر	کلام حیدری	۱۰/-
۱۶	[illegible] تنہائی کی کشتیاں	احمد یوسف	۱۵/-
[illegible]	[illegible] نام [illegible]	کلام حیدری	۱۵/-
[illegible]	[illegible]	ترجمہ شاہد احمد دہلوی	۱۰/-
۱۹	سائنس کی [illegible]	ترجمہ شیخ [illegible] الدین	۱۰/-

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۰	فکشن نمبر	مرتبہ کلام حیدری	۳۵/-
۲۱	شاہی کنیز	رحمٰن حمیدی	۱۰/-
۲۲	ارتقا سیریز ۵	مرتبہ کلام حیدری	۱۵/-
۲۳	گولڈن جبلی	کلام حیدری	۲۰/-
۲۴	پس دیوار	عبدالصمد	۳۰/-
۲۵	یہ لوگ (خاکے)	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	۱۸/-
۲۶	شعلے سے بھڑک اٹھے (ڈراما)	نثار احمد صدیقی	۸/-
	آگ سنگ	بدر اورنگ آبادی	۱۵/-
	شاعری		
۲۷	درخشاں	حفیظ بنارسی	۵/-
۲۸	نوائے راز	معبود شمسی	۵/-
۲۹	لہو کا سفر	ڈاکٹر بزم لیشور پرساد	۱۰/-
۳۰	والٹ ہیٹ مین	ڈاکٹر عبدالروف	۵/-
۳۱	[illegible] نا معتبر	قسیم الحق گیاوی	۱۲/-
۳۲			
	متفرقات		
۳۳	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	۳۰/-
۳۴	فراز دار	کلام حیدری	۳۰/-

باخبر

دس پاس

[اس عنوان کے تحت پیش کئے گئے افسانہ "باخبر" کی آزادانہ تحریر کا نمونہ ہے جو ہم مہیا کرتے ہیں۔ تاہم پوری ذمہ داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ادبی رسالے میں ایسے سیاسی اور نیم سیاسی مطالعوں کا پیش کرنا کارآمد ہے ——— کلام حیدری]

سڑک جام

ادھر شہروں میں ایک لعنت بہت تیزی کے ساتھ آئی ہے۔ جہاں جائیے ٹریفک جام، جدھر دیکھئے سڑک بند۔ دس منٹ کے واسطے کام کے لئے نکلئے اور گھنٹوں لٹوا کر چلے آئیے۔ وقت اور کام تو برباد ہوتا ہی ہے، ذہنی کوفت الگ ہاتھ آتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حکام جن کے ہاتھوں میں نظم و نسق رہتا ہے وہ کہاں سوئے رہتے ہیں ٹریفک کا الگ محکمہ موجود ہے لیکن اول تو ٹریفک کے سپاہی ہر جگہ دکھائی نہیں پڑتے۔ اور اگر خلاف توقع کہیں دکھائی بھی دے جاتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس سڑک یا لین سے گورنر، منسٹر یا کسی اہم شخصیت کی سواری گزرنے والی ہے۔

پٹنہ جو ایک شہر تھا۔ بڑے اور چھوٹے دونوں شہروں کی خصوصیت اس ایک شہر میں سمٹی ہوئی تھی۔ گنگا پر جب ایک پل بننے لگا تو شہر کے لوگ بڑے خوش دکھائی دینے لگے۔ لیکن جب پل کھل گیا تب ان شہریوں کے سر پر اچانک اتنی بلائیں نازل ہو گئیں کہ وہ بوکھلا کر رہ گئے۔ نارتھ بہار کے درجنوں شہر کے دروازے کھل گئے وہاں سے افراد اور سواریاں اتنی تعداد میں آنے لگے کہ ان کے چلنے کی بھی جگہ نہیں رہی۔ مکان اول تو یوں بھی پٹنہ میں ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ پھر ان کے کرائے دوگنے اور تگنے ہو گئے۔ پٹنہ کو بڑا شہر بنانے کی کوشش برابر جاری رہی۔ لیکن بڑے شہروں کی سہولیات سے اس کو محروم رکھا گیا۔

سواری کی سہولت بالکل دستیاب نہیں۔ راجیہ ٹرانسپورٹ کی دو چار بسیں چلتی ہیں۔ لیکن وہ بالکل ناکافی ہیں۔ درجنوں اسکوٹر چلتی ہیں۔ لیکن وہ بھی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ رکشہ والوں کا حال یہ ہے کہ

وہ من مانا کرایہ بتاتے ہیں۔ اور مجبور انسانوں کو ان کی بات ماننی پڑتی ہے ضرورت اس بات کی ہے پٹنہ شہر کے لئے ایک عظیم منصوبہ تیار کیا جائے۔ اور اس پر سختی سے عمل بھی کیا جائے۔ ورنہ شہریوں کی زندگی جہنم بن کر رہ جائے گی۔

کیا ہوگا انجام

بہار میں تعلیمی نظام میں روز بروز گراوٹ آتی جا رہی ہے۔ یہ ایک ایک عبرت ناک داستان ہے سرکاریں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ اور ہر سرکار اس بات کا دعوہ کرتی ہے کہ وہ تعلیم کے میدان سے بدعنوانی کو دور کر دے گی لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ سرکار خود ہی اس بدعنوانی میں مبتلا ہو جاتی ہے کیونکہ اسے اپنی بقا اسی میں نظر آتی ہے۔ اسکول سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر کھولے جاتے ہیں۔ کالج پیسے کمانے کے لئے اور یونیورسٹی ذات پات کی سیاست کو فروغ دینے کے لئے۔ کسی بھی نئے کالج میں جب نوکریوں کے لئے درخواستیں مانگی جاتی ہیں تو امیدواروں کا ایک کیو سا لگ جاتا ہے۔ ان میں جو امیدوار کالج کے ارباب اختیار کی جیبیں زیادہ بھاری کرتا ہے وہ رکھ لیا جاتا ہے۔ رقم کی کوئی تعیین نہیں۔ دس ہزار، پندرہ ہزار، بیس ہزار، پچیس ہزار۔ جیسا بھگوان، ویسے پجاری، ان روپیوں کی کوئی رسید نہیں دی جاتی۔

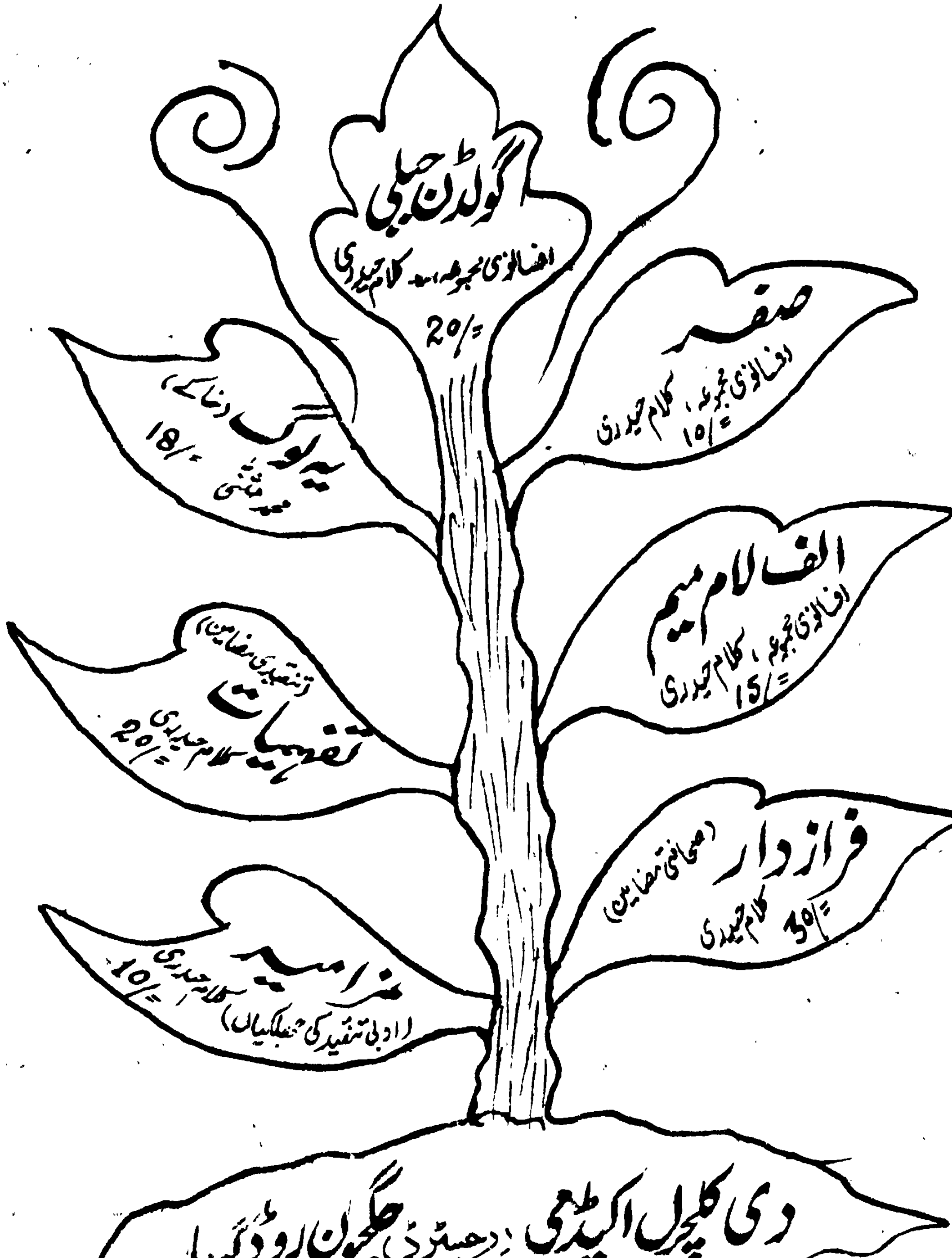
اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ آپ نے کھیت بیچ کر، مکان فروخت کرکے، یا بیوی کے زیورات بیچ کر روپے دیئے ہیں۔ اب آپ کالج میں کام کیجئے لیکن پیسوں کا (مشاہرہ کا) کبھی مطالبہ مت کیجئے، ہاں آپ نے جو روپے دیئے ہیں۔ ان کے سود کی ایک چوتھائی اور وہ بھی کبھی کبھار آپ کو مل جائے گی۔ تاکہ امید کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹے جس جگہ پر آپ کام کر رہے ہیں، اس کی منظوری سرکار دیتی ہے اور آپ جانئے کہ سرکاری منظوری حاصل کرنے کے لئے نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کا کتنی بار چکر لگانا پڑتا ہے۔ ہر فائل کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے ہر چپراسی، بابو، بڑا بابو وغیرہ وغیرہ کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے گویا منظوری دلانے کا جان جوکھم بھی آپ ہی کو کرنا ہے۔ پھر جب سرکار سے روپیہ آنے لگا تو آپ کے منہ میں پانی نہیں آنا چاہئے۔ کیونکہ وہ روپیہ کالج کے ارباب اختیار کے ہاتھوں میں پہونچ کر آپ کے پاس آئے گا۔ اور نہیں بھی آئے گا تب آپ کیا بگاڑ لیں گے؟

تب آپ یہ کہیں گے کہ پیٹ کے دوزخ کو کسی طرح بھرنا ہی ہے سو آپ جائز و ناجائز کے فرق کو بھول جائیں گے اور ——

لیکن اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟ جب ماحول ہی ایسا تیار کیا گیا ہے تو پھر آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

کیسا کنٹرول

ابھی جو نیا مرکزی بجٹ آیا ہے اس میں بہت سی باتیں خوش کرنے والی بھی ہیں۔ مثلاً بہت سی چیزوں پر ٹیکس میں کمی کر دی گئی ہے۔ اور اخبار پڑھنے والی، ریڈیو سننے والی عوام یہ سوچ کر بہت خوش ہے کہ وہ بھی ان "عیاشیوں" میں پڑ سکتا ہے۔ وزیر خزانہ نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ قیمتوں کو روکنے میں کامیاب رہے ہیں۔ لیکن بازار میں روٹی دال کی قیمت میں کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی ان کی قیمت روز بروز چڑھتی جا رہی ہے تعجب ہے کہ ہمارے ارباب اختیار کو یہ پتہ نہیں کہ عوام، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اور فرج نہیں چاہئے۔ روٹی چاہتے ہیں جس کے ساتھ دال ہو۔ اور یہ چیزیں بازار میں سستی نہیں ملتیں۔ تو پھر ہم اس بات پر کیسے یقین کر لیں کہ بازار کی


گولڈن جبلی
افسانوی مجموعہ ۔ کلام حیدری
20/=
صفر
(افسانوی مجموعہ، کلام حیدری
15/=
محمد مثنی
18/=
الف لام میم
(افسانوی مجموعہ، کلام حیدری
15/=
(تنقیدی مضامین)
تفہیمات
کلام حیدری
20/=
فراز دار
(صحافتی مضامین)
کلام حیدری
30/=
کلام حیدری
10/=
(ادبی تنقید کی جھلکیاں)
دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگجیون روڈ گیا

ڈاکٹر حسن آرزو

مخفی افسانوں کا خالق

اردو مختصر افسانوں میں جس نے سب سے پہلی بار بہت باقاعدہ اور باضابطہ طور پر مخفی افسانے لکھنے کی فنی اور شعوری کوشش کی وہ ہیں ــــــــ کلام حیدری
مخفی افسانوں سے میری مراد دہشت پسند، ہیبت ناک، شدید رومانی یا آسیبی اور طلسماتی افسانے نہیں بلکہ نفسیات اور سماجیات کی طرح مخفیات OCCULT سے وابستہ افسانے مقصود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس جہت سے حیدری کے فکر و فن کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ یوں تو انہوں نے نفسیاتی افسانے بھی لکھے ہیں، سماجی بھی، استعاراتی بھی، تجریدی بھی اور ان کے علاوہ بھی ــــــــ لیکن مجھے یہاں خصوصیت سے ان کے جدید مخفی افسانوں کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ کلام حیدری نے نہ صرف کامیاب مخفی افسانے لکھے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے فن میں مخفیات OCCULT جنس اور جبر کا ایک مثلث بنا دیا ہے ــــــــ ان کا افسانہ "قاتل" جسے اکثر مبصروں نے بغیر کچھ بتائے اور تجزیہ کئے ایک کامیاب افسانہ کہا ہے ــــــــ سچ مچ ایک کامیاب جدید مخفی افسانہ ہے۔ اور سو فی صدی مخفی افسانہ ہے۔ اسے اردو ادب کے مخفی افسانوں کی فہرست میں صف اول میں جگہ پانے کا شرف حاصل ہے۔ ٹھیک جس طرح پاکستان میں زاہدہ حنا کا افسانہ "جل ہے سارا جال" کے متعلق میں یہی بات دہرا سکتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ پہلا افسانہ مخفی علوم کی ایک شاخ علم الاعداد سے متعلق ہے اور دوسرا علم النجوم سے وابستہ ــــــــ ایک کا خالق حیدری ہے، دوسرے کی حنا ــــــــ اور خالق جب تخلیق کرتا ہے تو دراصل اپنے وجود کی تقسیم کرتا ہے ہر تخلیق اس کے وجود کی تفریق ہوتی ہے۔ یہ تخلیق و تفریق اسے اعداد ہی کے واسطوں سے سمیٹ سمیٹ کر بالآخر "صفر" کی گود میں پہونچا دیتی ہے ــــــــ ہوش مند دانا اور بینا اجنتا کے غاروں کے مصوروں نے اور ایلورا کے سنگ تراشوں نے اس راز کو پالیا تھا۔ اس سرّ تک پہونچ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے عمل کے نیچے اوپر یا کسی گوشہ میں اپنا نام ٹانکنے کی حماقت نہیں کی ــــــــ جب "صفر" سے مفر ممکن نہیں تو آخری منزل یہ ہے کہ نام کچھ بھی ہو سکتا ہے عزیز و، حیدری بھی، حنا بھی، حسن بھی، SERIAL TIME کی گود میں تسلسل زماں کی آغوش میں صرف تخلیق رہ جاتی ہے اس روئے زمین پر تخلیق رہ جائے گی، موضوع رہ جائے گا کہ کائنات کے تمام موضوعات ایک سے نو تک کے اعداد کی مخفی سمٹی ہوئی اشکال ہیں۔ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ، مِنْ کُلِّ سترہ اعداد کو

پڑھنا ساری کائنات کو پڑھنا ہے۔ کُل بھید کو پڑھنا ہے۔
تو میں عرض کر رہا تھا کہ ایک کا افسانہ علم الاعداد سے اور دوسری
کا علم النجوم سے وابستہ ہے ——— اور بہرحال
ان دونوں افسانوں نے اپنے اپنے حلقوں میں ایک تاریخ
بنائی ہے۔

افسانہ "قاتل" کی اہمیت یوں بھی ہے کہ یہاں فنکار
جنسیات، اقتصادیات، مذہبیت اور جدید صنعتی نظام
کی دانشوری کے جنگلوں میں گھر کر بھی باطنی اسرار کی تلاش و
تجسس میں گم کردہ راہ نہیں ہوتا، بلکہ اردو افسانوں کو ایک
کامیاب اور قیمتی تجربہ عطا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
——— اس کی واپسی قابل رشک ہوتی ہے۔

مخفیات کی دنیا میں دوسرے موضوعات کے علاوہ
علم الاعداد کا موضوع بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ "قاتل" میں
علم الاعداد کو پہلی بار سنجیدہ طور پر موضوع فن بنا کر منظر عام
پر پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ ایسی جرأت اور اس کا کامل
مظاہرہ وہی کر سکتا ہے جسے مخفیات کا کچھ مطالعہ ہو عالم ہوتا
کوئی شرط نہیں، بلکہ شرط یہ ہے کہ اس کا حواس اور وجدان
اس دنیا سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو ———
غلام حیدری اپنے قلمی نام کے اعتبار سے ستارہ زحل کی نمائندگی
کرتے ہیں۔ لیکن اپنی تشبیہ اور دیگر واقعات کے لحاظ سے دو قمر
سے منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ پیدائش کا صحیح علم
نہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ زحل اور عطارد کے زائیدہ حضرات
مخفیات سے خاصی رغبت رکھتے ہیں۔ اس طرف ان کی
لپک وجدانی ہوتی ہے ——— چنانچہ ہم دیکھتے
ہیں کہ حیدری کے دوسرے افسانوں میں مخفیات کی جلوہ
باریوں کی نشو و آرائیاں موجود ملتی ہیں۔ ان کا افسانہ "اپنی
اپنی آواز میں" جو ان کے مجموعہ صفر میں شریک ہے۔ اپنے اندر
مخفی افسانہ ہونے کی صلاحیتیں رکھتا ہے ———

شاہراہ نمبر ۱۳ جس کا عدد صفر ہوتا ہے ایک
نئی اٹ زناٹا بھرتی جا رہی ہے اس میں چار آدمی ہیں، رات کا
وقت ہے، ۹ بجے ہیں کہ دفعتاً یہ کار حادثہ کی شکار ہو جاتی ہے
لیکن کوئی مرتا نہیں ——— اگر کار کا نمبر کوئی بھی ایسا ہوتا جس
کا عدد صفر "۸" ہو جاتا تو پھر علم الاعداد کے پیش نظر اس
حادثہ کے تمام امکانات موجود ہوتے کیونکہ ۴ عدد
کے لئے ۸ کا عدد اکثر حادثہ کا پیش خیمہ بنتا ہے ———
——— "۹" کی ساعت افسانہ میں موجود ہے یہ ساعت اگر ہم آہنگ
نہیں تو پھر ہم کے اعداد والوں کے لئے اتنی ضرر رساں بھی نہیں ہو
سکتی۔ کار بچ سکتی تھی، انجن فیل ہو سکتا تھا تیل ختم ہو جا سکتا
تھا لیکن ACCIDENT ہونے کا گمان نہیں کیا جا سکتا
تھا۔ بہرحال یہ ایک کامیاب افسانہ ہے ———
حادثہ کے بعد چاروں آدمی ایک دوسرے سے الگ لیکن ایک
دوسرے کے بارے میں یکساں طور پر سوچتے ہیں۔ اعداد کی خود
غرضی (جو جدید سرمایہ دارانہ نظام اور مخلوط معاشی نظام
MIXED ECONOMY کی دین ہے) ترسیمی ہم آہنگی
بھی خوب ہے اور یہی مقام فنی اعتبار سے افسانہ کی بلند ترین
چوٹی ہے۔

افسانہ "صفر" اپنی موضوعی تقسیم کے لحاظ سے ایک
خوبصورت تجریدی مخفی افسانہ ہے۔ بظاہر یہ بحر صفر سے اگا
شروع ہوتا ہے۔ اور صفر کی بے کراں پہنائیوں میں ڈوبتا نظر
آتا ہے ——— مگر اس ابھرنے اور ڈوبنے کے
علاوہ جن ماورائی کیفیتوں کا اظہار ہوتا ہے دراصل وہی اہم
ہیں۔ کچھ لوگ علم الاعداد میں صفر کی وابستگی ستارۂ زحل
سے جوڑتے ہیں اور بگڑ گوش کے دیئے ہوئے صفر کے نظریات
اور اس کی تفسیر و تعبیر سے گذرتے ہوئے بے کراں NIHI-
LISM کی طرف جا پہنچتے ہیں ———
یا پھر صفر میں ڈوب کر تناہی سے لاتناہی کا رشتہ تلاش

عقائد کی پیدائش کا ایشیا ہی گہوارہ رہا ہے۔ چنانچہ یہاں کی سرمایہ دارانہ اور صنعتی نظام سے پیدا ہونے والی جدید سماجیات کے بطن میں بھی دور دور تک MYTH اور اساطیر اور مخفیات کی جڑیں پھیلی ہوئی موجود ملتی ہیں۔ یہ بات افسانہ کی سطح کو اوپر اٹھانے کا سبب بھی بنتی ہے۔ بہرحال! اس جدید صنعتی نظام میں جس میں بنک کی سہولت کاریاں بھی موجود ہیں سے تعلق رکھنے والا یہ بے نام کردار نہایت کاہل اور جاہل ہونے کے علاوہ لڑکیوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے پاس باپ کی چھوڑی ہوئی بڑی جاداد اور بنک میں ۴ لاکھ روپے کی فکسڈ ڈپوزٹ موجود رہتی ہے ——— لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ کسی بھی وسیلے سے اسے علم الاعداد کی مخفی قوتوں سے واقفیت ہے۔ اور کم از کم اسے معلوم ہے کہ اس کا سعد و نحس نمبر کون کون ہے ——— ؟ چنانچہ جب اسے ایک ادبی میگزین نکالنے کی سوجھتی ہے تو خسارہ میں چلنے والا یہ کام بھی منافع بخش طور پر چل پڑتا ہے ——— ہرچند اسے اس کام کی آمدنی سے چنداں مطلب نہ تھا ایک دن اسے یہ سوجھی کہ وہ چھ لڑکیوں کو ایک ہی جغرافیائی خطے سے چھ دنوں تک لگاتار بلائے اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ اس نے یہی کیا۔ لیکن علم الاعداد کا مسئلہ یہاں بھی آکھڑا ہوتا ہے ———

اور آخرکار اس بے نام آدمی کے ساتھ وہی حادثہ رونما ہوتا ہے جس سے وہ اچھی طرح باخبر تھا ——— یعنی جب صبح میں میگزین کا ایڈیٹر دفتر جانے کے لئے تیار ہوا تو اس بے نام آدمی کے ملازم نے یہ فون کیا کہ وہ اپنے بستر پر مردہ پڑا ہوا ہے ———

اس مرکزی کردار کے سلسلے میں حیدری نے کھلے طور پر یہ نہیں بتائے کہ علم الاعداد کی رو سے اس کا اپنا نمائندہ عدد کون سا ہے ——— ؟ یہ تیرہ بھی ہو سکتا ہے چھ بھی اور نو بھی فن کار نے یہاں ابہام سے کام لیا ہے۔ لیکن ابہام کے باوجود غور کرنے پر ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بہرحال وہ نمبر ۳ کا آدمی ہے۔ اور قاری کے لئے بس اتنا جاننا کافی ہوتا ہے ——— ——— لیکن بین السطور سے بھی کچھ مفہوم جھلکتے ہیں۔

یہ ایسا نمبر تین ہے جس کا دوسرا رخ فعال نہیں بلکہ مجہول ہے۔ دوسرے لفظوں میں ستارہ مشتری کے مجہول اور منفی اثرات کا حامل ہے ——— از روئے علم النجوم یہ ستارہ بروج قوس اور حوت سے متعلق ہے وہ سعدین ہے، سعد اکبر ہے، برج قوس مذکر ہے، ماہیت آتشی، خاصیت میں گرم۔ چنانچہ تیر، چڑھی ہوئی کمان، اس کی علامت ہے برج حوت اس کے برعکس مونث ہے ماہیت آبی ہے۔ خاصیت میں ٹھنڈا ہے، ذات کا برہمن، علامت اس کی دو مخالف سمت میں تیرتی ہوئی مچھلیاں ہیں۔ ستارہ مشتری کا تعلق، عالم، فاضل، مصنف کتاب، جوہری، سرمایہ دار، وزیر، قاضی اور بادشاہوں سے ہے ——— لیکن ستارہ مشتری کے منفی اثرات کا حامل یا بگڑا ہوا GUPETERIAN عام طور پر عیش پسند، اخلاقیات سے بے نیاز، روپے اور آمدنی کی طرف سے بے پرواہ اور مطمئن، اخراجات بے جا میں مبتلا، شراب اور عورت کا رسیا، صنف کو امیر کا دسترخوان سمجھ کر ہر طبقہ اور ہر درجہ کی عورتوں سے لذت وصل کا تجربہ حاصل کرنے کا خواہش مند، فنون لطیفہ میں عریانیت اور فحاشی کا طالب ہوا کرتا ہے جس طرح بگڑا ہوا زہرادی (VENUSHAM) اکثر HOMO - SEXUAL ہو جاتا ہے یا اسٹیج پر عریاں رقص کرنے والیوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے ———

بہرحال! حیدری نے اپنے اس مرکزی کردار کو انہی جبتوں سے گڑھا ہے کہ نمبر ۳ (اور اس کے مجہول رخ) کے علاوہ جو کچھ ہو اس کو اس چہرہ سے الگ کر دیا جائے۔ اور پھر اس کا کوئی نام نہ دیا جائے گمان یہ ہے کہ فنکار حیدری کو اس گرفت کا بات شعور ان کے دوسرے کامیاب تجریدی مخفی افسانہ "صفر" سے حاصل

ہوا ہوگا:

"...... اس میں وہ سب نکال دینا پڑتا
ہے جو صورت نہیں ہے چہرہ بنانے میں
چہرہ بنانا کام نہیں ہے غیر چہرہ جو کچھ ہے
اسے الگ کرنا اصل کام ہے" (صفر)

——— غرض ان کا یہ بے نام کردار اس جہت سے ایک علامتی کردار بن جاتا ہے کہ اس کا کوئی نام نہیں ہے وہ اپنے اوصاف سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

نمبر ۳ کے اوصاف رکھنے والے اس مرکزی کردار کی مطابقت، اس کے جمالیاتی شعور اور جنسی جذبہ کی آسودگی نمبر ۳ تین کی لڑکی ہی سے بہتر طور پر ہو سکتی تھی۔ اس کے عیوب میں بھی اسے لپسی ہوئی بجلیاں اور جنسی بلاوا اور کشش کے لپکتے ہوئے کوندتے نظر آ سکتے تھے اور یہی ہوتا ہے:

"یہ جو نمبر تین ۳ ہے یہ بڑی عجیب اور غضب
کی عورت ہے اس کے کان کی لوؤں سے
پنڈلی کے تناؤ تک جو بلاوا ہے اسے کوئی
فنکار ہی محسوس کر سکتا ہے ———
یہ کمبخت ڈائری لکھتی ہے اور بتا سکتی ہے
کہ اگر آج میرے ساتھ سوئے گی تو میرا کتنا
نمبر ہوگا ——— کہتی ہے انبک
۶۰ انمبر اپنی ڈائری میں نوٹ کر چکی ہے۔
اگر میرا نمبر بڑا تو میں ایک سو ساٹھواں ہونگا
یہ نمبر علم الاعداد کی رو سے مجھے راس نہیں
آتا، ہر چند میں آج کی رات اسی کے ساتھ
بسر کرنا چاہتا ہوں ....
...... میرا مسئلہ یہ نمبر ۱ نہیں جس کی
چھاتیاں تم بھی محسوس کر چکے ہو۔ یہ نمبر ۲ جو
چھوٹی ہے یہ بھی میرا مسئلہ نہیں......"

باقی ۱، ۵ اور ۶ ہیں وہ اس کردار کے جنسی جذبے کو (باوجود لڑکیاں ہوتے ہوئے) کامل آسودگی نہیں بخش سکتی ہیں۔ اصل یہ کہ نمبر ۳ کے علاوہ باقی نمبر ۱، ۲، ۴، ۵ وغیرہ جیسے اس کے لئے غیر چہرے تھے، جس کا اظہار وہ کسی اخلاقی ضابطہ کا چہرہ لگائے بغیر کر دیتا ہے ———

اسلوب کے لحاظ سے قاتل ایک بیانیہ افسانہ ہے۔ ——— کہنا پڑتا ہے کہ مخفیات کی دنیا کی سریت، اس کی باطنی پراسراریت اس کا ہلکا ہلکا دھندلکا، اس کا الگجا پن، اس کے علائم، اس کی پیکریت، اس کی تلمیحات، اس کی زبان اور اس کی ترسیلات سے ہمارے ادب میں خاطر خواہ کام نہیں لایا گیا ہے جب کہ ——— مخفیات کی زبان کی SECRECY اور MYTH اور اساطیر سے اس کا رشتہ اسالیب اور معنویات کے لحاظ سے ادب کے لئے ایک قیمتی خزانہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ہاں! یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعری یا افسانے صرف علائم، تلمیحات ابہام اور تمثیلات کی وجہ سے اہم نہیں ہو سکتے۔ اصل یہ کہ معنی کو روشن اور تاباں کرنے کے کس قدر امکانات انہوں نے اپنے پہلو میں سمیٹے ہیں۔؟ انھوں نے مفہوم کو کس قدر وسعت اور پھیلاؤ عطا کیا ہے اور ابہام سے کس قدر تہہ داری اور توانائی حاصل کی ہے ——— ؟

یہ چیزیں اہم ہوتی ہیں ——— اردو کے کچھ افسانہ نگاروں اور شاعروں کا المیہ یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف اوسط درجہ اور تیسرے درجہ کے ذہن و فکر کے لوگ ہوتے ہیں۔ بلکہ یہاں نجوم کی زبان میں بگڑے ہوئے تمر اور عطارد والے منفعلین اور بر خود غلط اذہان کو بھی آسانی سے پناہ گاہیں مل جاتی ہیں۔

چنانچہ جو توانائیاں ہم نے دوسرے فنون لطیفہ اور خصوصیت سے مصوری کی دنیا سے حاصل کی تھیں وہ حاصل

فن کاروں کے ہاتھ میں پڑ کر بے دیدہ و بے نور ہو جاتی ہیں۔ اچھے شمس والے یا زہرا دی (VENUSCANADY) با کمال مصور ہوتے ہیں۔ لیکن بگڑے ہوئے شمس والے کمرشیل آرٹسٹ یا بلو پرنٹ کے خالق اور کبھی کارٹونسٹ بن کر رہ جاتے ہیں کچھ فن کاروں کو یہ سطح بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس سے نیچے گرتے ہیں ان میں کارٹونسٹ کی صلاحیتیں بھی نہیں ہوتی ہیں۔ اس وقت وہ ابہام کو اپنی سپر بناتے ہیں۔ اور جب تجرید اور اسطور اور علامت اور استعارات ذاتی اور الم علم کی توانا اصطلاحیں بھی ان سے اپنا دامن جھٹک لیتی ہیں تو وہ ابسیرڈ۔ فنکار کہے جانے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ فنکار کہلانا چاہتے ہیں ——

جدیدیت اونچے درجہ کی فنکاری ہے اونچے فنکار اپنے اندرونی دباؤ کے تقاضوں پر اپنے علائم، تمثیلات، اور استعارے پیش کرتے ہیں۔ ابہام سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ جدید اردو ادب بھی ان سے تکلیف دہ حد تک آغوش نہیں ہے۔ لیکن ایسے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی تعداد بہت کم ہے یہی وہ فن کار ہیں جو اپنے فن کی وجہ سے زندہ رہتے ہیں۔ اور زندہ رہیں گے —— خواہ وہ جدید ہوں یا قدیم!

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حیدری کا یہ افسانہ بیانیہ ہے نہ صرف بیانیہ بلکہ منولوگ بھی۔

لیکن یاد رکھئے اس کی خود کلامی کسی بھی اسٹیج کی مجبوری نہیں۔ خود کلامی میں ایسی روشن اور واضح محاکات پیدا کر دینا کہ اسٹیج کی جلیت بھرت، اس کی حرکی اور معنوی وسعت سمٹ کر قوس وقزح بکھیر دے کوئی رسمی بات نہیں۔ یہ خوبی اس افسانہ کو منصب ہے یہاں محض ایک مثال پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں:

"—— ہرگز مت سمجھو کہ زیادہ پی گیا ہوں ....

...... بولو میری مدد کرو گے نا ——
سالا یہ گلاس بھی ختم ہو گیا —— ذرا
ٹھہرو میں بوتل ہی یہاں لے آتا ہوں ——
—— ہاں —— ان چھ لڑکیوں میں
یہ جو نزدیک ہے، کہتی ہے اس کی عمر بیس
سال ہے —— جھوٹ کہتی ہے یا سچ
—— مگر مجھے تو اس سے بھی کم عمر لگتی
ہے، غور سے دیکھو، یہ جو اس کی چھاتیاں
ہیں، کس قدر موزوں سائز ہے۔ اور چھوؤ گے
تو —— دیکھو —— دیکھو ——
میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے اٹھایا اور میرا ہاتھ
اس کی چھاتیوں پر پھیرنے لگا، مجھے لگا میں
........" (قاتل)

یہاں مروجہ اخلاق اور آدرش کی قبا کو محض غلیظ اور نعالی کے طور پر تار تار نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس سے لذت حاصل کرنا مقصود ہے۔ بلکہ فن کار کو داخلی اسرار، اور خارجی عوامل کے دباؤ ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ انسان نے اپنے اوپر کتنی نقابیں ڈال رکھی ہیں۔ نفسیات کے بعد اس کا اندازہ مخفیات کی دنیا ہی میں ہوتا ہے۔

غرض افسانہ "اپنی اپنی آواز میں" اور صفر کے بعد قاتل" مخفی افسانوں میں ایک ایسا ناقابل فراموش اور قیمتی اضافہ ہے جو اردو ادب میں یاد رکھا جائے گا —— کلام حیدری نے اس افسانہ میں مخفیات کے پھیلے ہوئے جنس اور جبر کے رشتوں کو بھی انتہا کی نزاکت سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے ——

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے۔ —— وہی اس کام کو کامیابی سے انجام تک پہونچا سکتے تھے وہی اس کے اہل ہیں کاش ان کا وہ "حاشیائی آدمی" اگر آج موجود ہوتا تو کچھ اور بھی اضافہ ہو سکتا تھا —— لیکن ہم میں سے اگر

ناولٹ

رحمٰن حمیدی

باب اوّل

ڈوبتے انسان کا چہرہ

وہ کئی ہفتوں سے اداس اداس اور بجھا بجھا سا تھا۔ اضمحلال کی کیفیت اس کے دل و دماغ پر طاری تھی اداسی اور مایوسی اس کی تقدیر تھی۔ اس کی کیفیت گلشن ناآفریدہ کے مانند تھی۔ اس کے دل و دماغ میں اضطرابی لہریں یوں بیدار ہوتیں جیسے سمندر کی خوابیدہ لہریں بادوباراں کے طوفان کی زد میں تڑپ اٹھتی ہیں۔ وہ اپنے وجود کی بے ثباتی پر تلملا اٹھتا ہے خود اپنی ذات پر جبیں بہ جبیں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کریدنے لگتا ہے۔ اپنے زخموں پر خود ہی نمک چھڑکنے لگتا ہے۔ کرب آلود احساسات سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ کان کی لویں انگارے کی طرح دہکنے لگتی ہیں۔ دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ دل و دماغ میں زبردست بے چینی پھیل جاتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اس کی روح لہولہان ہو جاتی ہے وہ خون سے لت پت ہو جاتا ہے۔ اپنے وجود کو اس حال میں رکھ کر یک گونہ اسے سکون و مسرت حاصل ہوتی ہے۔

وہ اس نوعیت کی کیفیت کا عادی ہو چکا تھا۔ ریزہ ریزہ شہید اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنا سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کون سا پیشہ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کیا کھاتا ہے؟ کس طرح شب و روز کے مرحلے طے کرتا ہے؟ وہ سبھی کچھ ذہن سے کھرچ کھرچ کر نکال دینا چاہتا تھا۔ بیتے لمحات کی اسیری سے اسے زبردست نفرت تھی۔ وہ ماضی کے کربناک لمحات سے فرار ہو کر کائنات کی وسعتوں میں ڈوب جانا چاہتا تھا کہ حیات بحر بیکراں ہے۔ اسیری گناہ ہے، حیوانات، نباتات اور جمادات ارض و سماں کی گود میں آزادی سے سانس لیتے ہیں۔ غنچے باد صبا کے جھونکوں سے اٹھکیلیاں کرتے ہیں، خوشبو بکھر کے فضا کو معطر کر دیتی ہے۔ دھرتی آرائش جمال میں ڈوب جاتی ہے گوشہ گوشہ لہلہا اٹھتا ہے۔ ہونٹوں پہ تازگی اور توانائی آ جاتی ہے لیکن اس کی حالت بار برداری کے جانور کے مانند تھی۔ ناتواں جسم پر ناقابل برداشت بوجھ ——

اس کا وجود ریزہ ریزہ بکھر جاتا ہے۔ کرب آلود کیفیت چھا جاتی ہے۔ بے بسی مغلوب کر لیتی ہے۔ ایسی حالت میں اداسی اور مایوسی اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ وہ گرد و پیش کی ہر شے سے بے نیاز ہو کر اپنے خول میں سرایت کر جاتا ہے۔ اگرچہ اشنا کی کبھی کبھی سی کیفیت اور بے زبان پتھر کے مانند گمبھیری

خاموشی پر حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ تو وہ اس طرح دیکھتا ہے جیسے اس کا جسم صدیوں سے پیاسا ہے ندی برسوں پہلے خشک ہو چکی ہوتی ہے۔ ندی کا صرف ارضی زاویہ رہ گیا ہے ندی کی روح سلب ہو چکی ہے۔ اس کی ہر شئے ملیامیٹ و نابود ہو چکی ہے۔ وہ معنویت سے محروم ہے۔ اب اس ندی کے پانی سے کوئی پودا سیراب نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی بیج کو زرخیزی نہیں مل سکتی۔ اسی لئے وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچن میں چلی جاتی ہے۔ خادمہ پر اپنی تلخی کا اظہار کرتی ہے۔ اور کوئی نکڑی برتن اس کے ہاتھ سے گر کر چور ہو جاتا ہے۔ کرچیاں فرش پر بکھر جاتی ہیں۔ ایک وجود تلخی کا شکار ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ اس کے نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ بے نام و نشان ہو کر ملبے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ فنا کی کھیتی میں ... د کے کام آتا ہے۔ اسی ... وہ اپنے وجود کو ٹوٹتا رہتا ہے ریزہ ریزہ کرچیوں ... کو ... بیان کرتا رہتا ہے۔ اس عمل سے اسے بے پناہ طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ حد نگاہ تک خون ہی خون پھیل جاتا ہے۔ در و دیوار سرخ ہو جاتے ہیں۔ جلتی ہوئی مشعلیں اور تیز ہو جاتی ہیں۔ دھواں اجنبی راہوں کی سمت تحلیل ہو جاتا ہے۔ دھوئیں کے مرغولے میں وہ دیر تک الجھا رہ جاتا ہے ——— !

لیکن اس وقت اس کی اداسی بے سبب نہ تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے خون آلود منظر دیکھا تھا۔ وہ حادثے کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ اس انجن کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی رفتار سو میل سے زائد تھی۔ بہت دور نقطے کی طرح ایک بچہ اچھل رہا تھا۔ ریل کی آہنی لکیروں پر چھ برس کا بچہ اچھلتا کودتا چلتا جا رہا تھا۔ شاید وہ قریب کے گاؤں کے دہقانی کا چشم و چراغ تھا۔ وہ ہر چوبی شہتیر پر بڑی تیزی سے اچھل رہا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح گاؤں میں اپنے دو منزلہ عمارت کے زینے پر اچھلا کرتا تھا۔ چند لمحے میں وہ نقطہ میں وہ بچہ کے ہیولیٰ میں تبدیل ہو گیا ——— اور ——— پھر الیکٹرک انجن سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ وہ برق رفتاری کی زد میں آ چکا تھا۔ پھٹے ہوئے غبارے کی طرح اس کی بوٹیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سرخ سرخ خون چند ہی لمحے میں سیاہ پڑ گیا۔ جنگلی کتے، گیدڑ، لومڑی اور گوشت خور جانور اس کی بوٹیوں کے گرد منڈلانے لگے۔ رفتار کی زد میں ہر شئے میں فنا ہو جاتی ہے۔ اسے یہ عرفان حاصل ہو چکا تھا۔ اس نے رفتار کی آڑ میں چھپے کرشمہ دکھانے والے کو پہچان لیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے وجود کی کربناک بڑھتی جا رہی تھی۔ تخیلات کا سمندر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ علم و آگہی کے دائرے میں وسعت آ گئی تھی۔ وہ گہرائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ کہ اچانک کال بوائے نے اسے پکارا۔

آپ کا کال بک ہے ———

کال مین کے ہاتھ سے اس نے کتاب لے لی۔ اس نے دستخط کر کے کتاب واپس کر دیا۔ اس نے ذہن نشین کر لیا کہ کس وقت کی ٹرین لے کر جانا ہے ابھی اس کی روانگی میں دو گھنٹے کا مزید وقت تھا۔ اس کی بیوی نے دریچے سے کال مین کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے اس نے اسٹو پر چائے کا پانی رکھ دیا۔ چائے پتی گرم گرم پانی میں کھولی تو پانی کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ پیالی کی آواز پر اسے اطمینان ہو گیا کہ چائے جلد ہی ملنے والی ہے۔ امید ہی اس کی حیات کا محور ہے۔ اس کی مرکز پر اس کا وجود بارش کا آخری بوند کی مانند لٹکا ہوا ہے۔ بوند کا آخری قطرہ برگ بے ثمر پر فضا میں معلق ہے۔ وہ اپنے وجود کے محیط بے کراں میں ڈوبا ہوا ہے سورج مغرب کی وسعتوں میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی کرنیں خون آلود ہو چکی تھیں۔ لوہے کی

سمت سے سرمئی چادر پھیل رہی ہے۔ کائنات کا رنگ تاریکی کی آمد کا غمازی کر رہا تھا۔ درختوں نے گیس کے اخراج میں تیزی پیدا کر دی تھی۔ ہر شے تبدیلی پر مائل تھی۔ کائنات میں فضائے بسیط کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔ روشنی جا چکی تھی۔ پرانی بازار سے شاہراہ تک جانے والی شاہراہ پر راہ گیروں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ سدنند جھاریلیہ سے مارکیٹ کے چوراہے پر چہل پہل تھی۔ مزدور اپنے اپنے طبقات میں مزدوری کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ ٹی اسٹال پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے بدلتے رنگ کو دیکھ رہا تھا۔ ہولے ہولے بدلتے رُخ کی شناخت کی ادھیڑبن میں لگا ہوا تھا۔ کہ اس کی بیوی نے کہا۔

چائے

اس نے چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کے دائرے میں بیوی کا چہرہ دیکھا اور دھیمے سے پوچھا۔

ڈیوٹی کا سارا سامان تیار ہے۔

بس ابھی تیار کر دیتی ہوں

وہ غمگین ہو گیا۔ چائے کے سِپ لینے لگا۔ وہ دریچے سے متضاد سمت جانے والے راہ گیروں کو دیکھنے لگا۔ حرکت میں برکت اور زندگی ہے۔ رفتار زندہ حیات کی پہچان ہے۔ یہ بھاگ دوڑ اور یہ تگ و دو کس لئے ہے ؟ کرہ ارض کیوں گردش کرتا ہے۔؟ موسم کیوں آتا ہے؟ ہوائیں کیوں دوڑتی ہیں۔؟ سمندر کی موجوں میں اضطراب کیوں ہے ؟ پودا بیج سے نکل کر کیوں جھانکتا ہے؟ درخت کے ہیولیٰ میں کیسی یافت ہے۔ اس کی ذات کے لئے کیا ہے؟ پھل کی بوجھ سے اس کی ناتواں شاخیں کانپتی ہیں لرزتی ہیں۔ اس کی رگ حیات کیوں تڑپتی ہیں۔ اسے کیا حاصل ہے؟ تیز آندھی کی زد میں وہ اکھڑ جاتا ہے جڑیں بھی دھرتی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ وہ دھرتی پر بے گور و کفن پڑا رہتا ہے۔ اس کا وجود ساکت و جامد ہے ——

اس نے چائے کی پیالی خالی کر دی وہ کھڑا ہو گیا ——

سوچ و فکر میں یہ کیسی آگ دہک اٹھی ہے ——؟

اس نے سوچا۔

چند برس پہلے کی بات ہے وہ اسٹیم انجن کا ڈرائیور تھا۔ بوائیلر کا منہ کھلا ہوا تھا۔ فائرمین کوئلہ جھونک رہا تھا دہکتے شعلے کا ایک جوالہ تیزی سے اٹھتا اور کوئلہ جل کر راکھ ہو جاتا۔ وہ انجن کے اسٹیم کے کھاد میں کام آتا ہے۔ زندگی کی سلگتی بھٹی میں وہ جل رہا تھا۔ وہ بھی قطرہ بہ قطرہ خاک آلود ہو رہا تھا۔ دھرتی کی گود میں وہ بھی گھستا جا رہا تھا۔ اس کا بھی وجود آہستہ آہستہ مٹ رہا تھا۔

وہ باتھ روم کے اندر گیا۔ اس نے غلاظت خارج کی۔ پائپ کے پانی سے غسل کیا۔ صابن کے جھاگ سے اس نے جسم کی خارجی صفائی کی۔ تولیہ لپیٹ کر باہر آ گیا۔ اس نے کپڑے پہن کر بال درست کئے، دروازے پر کھڑا ہوا تو بیوی نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ ڈیوٹی کا سارا سامان تھیلے میں رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی دونوں لڑکیاں ٹیوشن پڑھنے گئی تھیں۔ گھر میں تنہا بیوی تھی۔ اس نے تھیلا ہاتھ میں لے لیا۔ آہستہ سے بیوی کے گالوں کا بوسہ لے لیا۔ لیکن اس کے منہ کا مزا اور خراب ہو گیا۔ بیوی کے پھیکے اور خشک گال پر ہونٹ رکھ کر اس نے غلطی کی تھی۔ بلکہ دھوکا ہوا تھا۔ مصنوعی پیار کے اظہار میں یہ عمل سرزد ہوا تھا۔ اسی لئے اسے تلخی کا احساس ہوا۔ بیوی کے چہرے کی جاذبیت ختم ہو چکی تھی۔ پچکے ہوئے گال، پژمردہ جسم ابھری ہوئی ہڈیوں میں صرف جان باقی ہے عورت کا ہیولیٰ ہے۔ اصل عورت دم توڑ چکی ہے۔ صرف اس کا ڈھانچہ ہے۔ اس ڈھانچے کو دیکھ کر اسے بھی کوفت ہوتی ہے۔

خزاں آلود موسم کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے لڑکیاں موسم بہار کی طرح جھوم رہی ہیں۔ انہیں جیون ساتھی کی ضرورت ہے ایسا جیون ساتھی جو مالی کی طرح ان کی آبیاری کرے۔ اور ان کی حفاظت کرے۔ اچھے تعلیم یافتہ مالی کا چارج بہت زیادہ تھا۔ وہ اسی تگ و دو میں تھا کہ بونس اور تنخواہ کی رقم سے کچھ پس انداز ہو تو وہ مالی کی تلاش میں نکلے۔ ابھی تک قسمت نے یاوری نہیں کی تھی۔ سڑک پر گرے پتھر کے مانند ٹھوکریں کھا رہا تھا تلخی اس کی روح میں پیوست ہو چکی تھی۔ اب وہ صرف کھوکھلے رشتے اور مصنوعی تعلقات کی بنا پر جی رہا تھا اس نے تلخی مائل کیفیات کو چھپا لیا۔ مصنوعی چہرے کا سہارا لیا۔ بیوی کے روبرو وہ اس طرح مسکرایا جیسے زندگی کا صحیح لطف آ گیا۔ بیوی ہی اس کے لئے سب کچھ ہے بیوی خوش فہمیوں میں مبتلا ہو گئی۔ وہ سامان لے کر ریلوے کوارٹر سے نکلا، ——— نہایا دھویا ہوا ——— صاف ستھرے لباس میں ملبوس، بیوی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں وعدے کئے ——— وہ اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا ——— ڈرائیورز رننگ روم کی جانب ——— لیکن کس انجن کے ڈرائیور کے لئے ——— ؟ گاڑی کہاں لے جانا ہے ——— ؟ ———

وہ ریلوے برج کے زینے طے کر چکا تھا۔ وہ زینے کی ناہموار سطح پر کھڑا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا ریلوے کالونی کی مبلہ آبادی سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ جہاں وہ ایستادہ تھا۔ وہاں سے سبھی کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آر پی الیف آفس، صاحب کالونی، اینگلو انڈین کالونی، پوسٹ آفس، ریلوے یارڈ، لوکو شیڈ، ریلوے گراؤنڈ، دو منزلہ فلیٹ ——— اور ——— اور پھر وہ فلیٹ جو اس کا مسکن تھا۔ اس کا بیرونی حصہ مدھم روشنی میں اچھا لگ رہا تھا۔ کوڑے کرکٹ پر اگی ہوئی ہریالی دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے بلندی سے گندے پانی کی روانی دیکھی۔ جو شیڈ اور یارڈ کی جانب سے آ رہا تھا۔ آب رواں ٹوٹے پائپ سے زمین پر زمین پر گر رہا تھا اور دائرہ بنا چکا تھا۔ لگاتار انتہائی منزل کی سمت رواں دواں تھا۔ گرنے والی مٹی کی بے سہارگی قابل دید تھی۔ پانی میں گرتے ہی وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ اس کا علم نہیں ہوتا ہے روشنی چاروں طرف تاریکی سے جہاد کر رہی تھی۔ وہ بلب کی روشنی میں ایستادہ تھا۔ معاً لائٹ فیل ہوئی۔ اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا۔ حد نگاہ تک تاریکی پھیل چکی تھی۔ وہ چونکا، اس کے ساتھ سامان تھا۔ آج تو اسے بالکل خالی ہاتھ جانا تھا۔ کیونکہ اسے نئے انجن کی ڈرائیوری کرنی تھی۔ اس انجن میں خودکار آلات کام کریں گے۔ سگنل اور کاشن سبھی کچھ آلات کے ذریعہ ہوگا۔ اسے تو صرف نگرانی کرنی ہے اس انجن کے ڈرائیور کے لئے کوئی بھی ڈرائیور نہیں ہو رہا تھا وہ صرف اپنی لڑکیوں کا منہ دیکھ کر راضی ہو گیا تھا۔ تاکہ جہیز اور تلک کی رقم نکل آئے۔ اس ڈرائیور پر دس ہزار کا خصوصی انعام تھا۔ پرموشن کا بھی چانس تھا۔ جب کوئی بھی ڈرائیور تیار نہیں ہوا تو سروس ریکارڈ کی بنیاد پر ڈرائیور کا انتخاب عمل میں آیا۔ اسے آفس کی جانب سے آرڈر ملا۔ اس کی اٹھارہ سال کی سروس میں ایک بھی ایکسیڈنٹ اور ورک فیل کا کیس نہیں ہوا تھا۔ اسی بنیاد پر اسے اسپیشل آرڈر ملا تھا۔ لیکن وہ اس طرح کی ساری باتوں سے بے نیاز تھا اس کی نگاہ صرف دونوں لڑکیوں پر تھی۔ اس کے نیچے سے مال گاڑی اس طرح گذری جیسے کوئی رینگتا ہوا سانپ نکل گیا۔ مال گاڑی گذری تو اس کے خیالات کا تانا بانا منتشر ہو گیا۔ وہ اپنے سامان کے بارے میں سوچنے لگا

——— یہ ساری چیزیں بیکار ہیں۔ اسے ساتھ لے جانے سے کیا حاصل ——— ؟

وہ اپنا سامان دیکھ کر تاسف وندامت سے شرمسار ہو گیا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ کھو چکا ہے وہ نیچے ... یا۔ اور اس شاہراہ پر چلنے لگا جو اس کے کوارٹر کی ... جاتی تھی۔ چند منٹ میں وہ اپنے فلیٹ کے دروازے پر ... تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اس نے کھٹکھٹایا۔ بیوی نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ غیر متوقع آمد پر اس کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ وہ بیوی کا چہرہ پڑھنے لگا۔ جو شاید منہ دھو کر پاؤڈر کا استعمال کر چکی تھی۔ اس نے دروازے سے ہی تھیلہ بڑھا دیا۔ بیوی نے سوالیہ نگاہ اس پر ڈالی تو اس نے کہا۔

آج ریلوے کے نئے انجن کی ڈرائیوری پر جا رہا ہوں۔

ان سامانوں کی مطلق ضرورت نہیں ؟

وہ واپس مڑ گیا اور شاہراہ پر چلنے لگا۔ اسے بڑی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے ؟ وہ لپکتا ہوا ڈرائیور زریم کے قریب آیا۔ اس کا استقبال فورمین نے کیا۔ اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

یہ انجن ٹرائل کے طور پر چلایا جا رہا ہے۔ تم ہوڑہ تک جاؤ گے وہاں پلیٹ فارم پر جی ایم تمہیں خوش آمدید کہے گا۔ تمہارے اعزاز میں وہاں پروگرام بھی ہے۔ اس انجن کے سارے آلات خودکار ہیں۔ تمہیں صرف اس انجن کے اندر جلنے اور بجھنے والے بلبوں کی علامت کو ذہن نشین کرنا ہے۔ تاکہ تم پر روشنی کی معنویت واضح ہو جائے۔ اس اشارے کی زبان تم دوسرے ڈرائیوروں کو سمجھا سکو

اتنا کہہ کر فورمین نے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ ہیڈ ٹی۔ ایکس۔ آر نے بھی اسے ہار پہنایا۔

سبھی موجود آفسران نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے قریب ہی انجن دلہن کی طرح ایستادہ تھا۔ وہ جوں ہی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ مختلف آلات میں حرکت شروع ہو گئی۔ چند ثانئے کے بعد تین سبز بلب بیک وقت روشن ہوئے۔ انجن سے سیٹی کی آواز نکلی اور انجن رینگنے لگا۔ چند منٹ کے اندر انجن دو سو میل کی رفتار سے دوڑنے لگا۔ وہ گدے دار کرسی پر بیٹھ گیا۔ بھاگتے ہوئے مناظر لمحہ بھر کے لئے گرفت میں آتے اور معدوم ہو جاتے۔ تیز رفتاری کے باعث اسے ہر شئے دھندلی نظر آنے لگی۔ اس کے انجن کی رفتار اور تیز ہو رہی جا رہی تھی۔ انجن کے اندر رونما ہونے والے محرکات کو وہ انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیورز کیبن کا شیشہ چاروں طرف سے بند تھا۔ ہوا صرف سامنے کی دو سوراخوں سے آ رہی تھی۔ اس کے سامنے ڈبے میں ڈرائی فروٹ کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک پیکٹ کھول کر کھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کی غور و خوض کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ اس انجن میں بیکار محض ہے۔ اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی ڈرائیور کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سارا کام مشینی آلات کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔ خودکار آلات کی زد میں سبز سرخ بلب روشن ہو رہے تھے۔ بلب کے جلنے اور بجھنے کے عمل سے عجیب و غریب سماں پیدا ہو رہا تھا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سرخ و سبز روشنی کا چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن وہ اس شہر میں قیدی کی طرح زندگی گذار رہا ہے اسے اپنی بے بسی اور مجبوری کا احساس ہو رہا تھا اس سے پہلے وہ اپنی مرضی سے انجن کی رفتار تیز اور دھیمی کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی پریشان حال مسافروں کو بٹھا لیتا۔ اور انہیں منزل پہ اتار کر اسے بے حد مسرت ہوتی۔ سبھی آلات اس کی زد اور دائرہ اختیار میں ہوا کرتے تھے لیکن آج وہ

آلات کے دائرے میں محبوس تھا۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ
بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مشین کے رحم وکرم پر جی رہا تھا۔
وہ گاڑی کی رفتار دیکھتا اور تلملا کر رہ جاتا۔ الیکٹرک
پول سے اسے منزل کی دوری کا پتہ لگایا۔ ہوڑہ پہونچنے کے
لئے چار گھنٹے اور چاہیئے۔ یعنی وہ علی الصباح قریباً چار بجے
ہوڑہ پہونچے گا۔ اگر رفتار اور تیز ہوگی تو پہنچنے کا اور وقت
کم ہوگا۔ اس کے پاس کوئی کام نہیں ہے سگنل کا نظام بھی
آٹومیٹک ہے۔ اس کے پاس کافی پینے اور پھل کھانے کے
علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ اسے ہلکی ہلکی غنودگی محسوس
ہونے لگی۔ اس نے دونوں پیروں کو اٹھا کر چیر پر رکھ لیا
اور دونوں ہاتھوں سے دائرہ بنایا۔ باہوں کے مربع نما
دائرہ میں دونوں گھٹنوں کو لے لیا۔ اور اس طرح سونے لگا
جیسے پرندہ اپنے پیروں میں منہ چھپا کر سوتا ہے خود کو سمیٹ
کر اسے آرام محسوس ہوا۔ چند منٹ میں اسے گہری نیند آگئی
اس کے دونوں گھٹنے پیٹ سے لگے تھے
وہ اپنی باہوں سے اسے رسی کی طرح باندھے ہوئے تھا نیند
کا غلبہ اس پر طاری تھا۔ سمندر شور و ہنگامے سے دور قدرت
کی گود میں محو خواب تھا۔ کوئی سیارہ ٹوٹ کر فضا میں
اور سمندر میں گر پڑا۔ چاروں طرف طوفان آلود منظر پھیل
گیا۔ سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہنگامہ اور شور و غل
حد نگاہ تک پھیل گیا۔

شب کے تین بجے وہ چونک کر بیدار ہوا تو اس کے
جسم میں رعشہ طاری تھا۔ وہ اپنی نشست سے گر کر ابر کے
فرش پر آگیا۔ اس کے دونوں گھٹنے شکم میں پیوست ہو
چکے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں گرہ پڑ چکی تھی۔
اس کے دونوں ہاتھ خون پینے والے جانور کے پنجے کی طرح
ہو چکا ہے۔ اس کے جسم پر لمبے لمبے بال نکل آئے ہیں۔
صرف آنکھ، ناک اور منہ کا حصہ بالوں سے خالی ہے

اس نے سر گھما کر اپنے اعضا کا جائزہ لیا۔ تو اسے یقین ہے
کہ وہ جنگلی درندے کی ہئیت میں تبدیل ہو چکا ہے صرف
اس کا دماغ اصلی حالت میں ہے۔ اس نے اپنا لباس دانت
اور پنجے کے تیز ناخن سے پھاڑ دیئے۔ لباس میں اسے قیدی
کی صعوبت محسوس ہو رہی تھی۔ لباس سے آزاد ہوا تو اسے
قدرے راحت ملی۔ اس نے برق رفتار انجن کی زد میں متحرک
آلات کو گہری نگاہ سے دیکھا۔ سرخ بلب کی روشنی میں وہ
سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نمبر اور حروف آسانی سے پڑھ رہا تھا
مشینوں کی گنگناہٹ کی آواز پردہ سماعت سے ٹکرا رہی تھی
اس کی نگاہوں کے سامنے لباس کے ٹکڑے تھے۔ جسے اس
نے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں خود کو دیکھنے
لگا۔ اس کے تنفس کی رفتار سے سینے کے بال یوں جنبش کر
رہے تھے۔ جیسے درخت کے شاخوں کی پتیاں ہوا کے دوش
پر جھولتی ہیں۔ اسے ذہن میں زبردست تلخی کا احساس ہوا
اس نے انتہائی کربناکی سے سوچا۔
اس انجن میں مجھے کیا ہو گیا
کیا اسی سفاکی کے خوف سے کوئی ڈرائیور تیار نہیں ہوا تھا
میں ان آلات کی زد میں انسان سے حیوان بن گیا۔
اف، یہ سب کچھ کیسے عمل پذیر ہوا
پانچ فٹ چوڑی اور دس فٹ لمبی فرش پر وہ
بے بسی سے پڑا ہوا تھا۔ فرش کی قاشی اور چاروں سمت
خودکار آلات پر مشتمل انجن سے وہ قطعی ناواقف تھا
جلتے بجھتے بلب کی علامت اور آلات کی مکروہ آواز
کی فہم سے وہ قاصر تھا۔ غیر مانوس فرش پر وہ کربناکی
کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ کرب و اضطراب کے عالم میں اس
نے لباس کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا۔ اس کی جیب میں ایک
چھوٹی سی ڈائری تھی۔ جس میں اس کی ڈیوٹی کا حساب تھا
اس نے بڑے بابو کی بے ایمانی کی خوف سے اپنا مائیلیج خود

ہی لوٹ گیا تھا۔ اس کا اوور ٹائم، نائٹ الاؤنس اور بل الاؤنس سارا حساب اس کی ڈائری میں درج ہے اس کی جیب کی قلم دو ہاتھ کی دوری پر پڑا ہوا تھا۔ وہ قلم اٹھانے کے لئے جوں ہی اٹھا اس کا توازن ڈگمگا گیا۔ اور وہ لڑھک کر فرش کی دوسری سمت چلا گیا۔ اس کے کولہے اور جسم کے پچھلے حصے کی طرف چوٹ آئی تھی۔ وہ چوٹ کی شدت سے جوں کا توں رہ گیا۔ وہ غیر متوازن انداز سے اٹھا تھا اسی لئے گر پڑا تھا تھوڑی دیر بعد درد میں افاقہ ہوا۔ تو وہ چوپایہ جانور کی طرح آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر کی ریاضت کے بعد وہ جانوروں کی طرح کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ چند قدم چلنے میں بھی اسے کامیابی ہوئی۔ چند قدم کی مسافت طے کرنے کے بعد اس کے جی میں آیا کہ وہ چیخ چیخ کر چلائے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس نے چلانے کی کوشش کی تو اسے علم ہوا کہ وہ نطق زبان سے بھی محروم ہو چکا ہے۔ وہ گونگا بھی ہو چکا ہے۔ صرف کان آنکھ اور ذہن علیٰ حالہ ہیں۔ جسم کے دیگر صرف سبھی اعضار سے وہ محروم ہو چکا ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔ وہ فرش پر سینے کے بل بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے کی جانب بڑھایا۔ اور اس پر سر رکھ کر رونے لگا۔ آنسوؤں کی روانی سے کئی ننھے دائرے فرش پر نمودار ہو گئے ——— ——— دائرہ نما داغ ——— تلخی اور اداسی کا منبع ——— اس کی کرب ناکی کی کیفیت اور بڑھتی جا رہی تھی۔ اشک آلود کیفیت کے عالم میں ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے نہایت بھیانک خواب دیکھا ——— گھنا جنگل ہے خار دار جھاڑیاں پگڈنڈی پر پھیل گئی ہیں۔ اونچے اونچے درختوں کی شاخوں پر سانپ لہرا رہے ہیں۔ سورج کی روشنی میں سانپ کی دودھاری زبان لپلپا رہی ہے۔ سانپ کے دماغ کی تھیلی سے زہریلی گیس خارج ہو رہی ہے زہر ہر شے میں سرایت کر چکی ہے آب و ہوا زہر آلود ہو چکی ہے۔ خوفناک درندے چنگھاڑ رہے ہیں۔ منہ پھاڑے درندے اس کی سمت آ رہے ہیں۔ وہ خوف و دہشت سے کانٹوں میں بھاگ رہا ہے۔ اس کے پاؤں لہولہان ہیں۔ کئی بار وہ جھاڑی پر بھی گرا۔ اس کے ہاتھ اور جسم سے خون رس رہا ہے۔ وہ لہولہان ہے۔ اس کے خون سے کانٹوں کا سرا لہولہان ہے۔ اس کا خون جھاڑیوں کی جڑوں میں پہنچ رہا ہے۔ موٹے موٹے درختوں کی آبیاری ہو رہی ہے۔ خوفناک درندے اس پر حملہ آور ہیں۔ اضطراب و پریشانی میں اس کا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ چکے ہیں۔ اس کی گردن کٹ چکی ہے اب وہ صرف چند لمحات کا مہمان ہے۔ خوفناک درندہ اسے لقمۂ تر کی طرح نگلنے والا ہے ——— معاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ پریشانی کی خواب اس کے ذہن میں پردۂ سیمیں کی طرح پھیلنے لگا۔ اس کی نگاہیں آکسیجن بکس پر پڑیں۔ جو انجن کی رفتار کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ موٹے موٹے تار جن پر دبیز دبیز اور پلاسٹک لپٹا ہوا تھا۔ وہ بلب کی روشنی میں سیماب کی طرح چمک رہا تھا۔ انجن کے جھٹکوں سے پھلوں کا پیکٹ فرش پر گرا۔ سیب ادھر ادھر بکھر گیا انگور کا گچھا جوں کا توں فرش پڑا ہوا تھا۔ انگور کی خوشبو اس کے نتھنوں میں آئی۔ ایک سیب جھٹکے سے لڑھکتا ہوا کرکٹ کے بال کی طرح اس کی گود میں آیا۔ اس نے سیب اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی۔ تو بے پناہ درد سے بلبلا اٹھا۔ دردناک ٹیس اس کے پورے وجود میں پھیل گئی۔ اس نے سیب اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا درد کی شدت سے وہ لیٹ گیا اور کراہنے لگا۔ آہنی پٹری پر انجن کے دوڑنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ نامانوس دائرے میں محبوس تھا۔ وہ بہت دیر تک

اسی حالت میں پڑا رہا۔ جب اسے سکون محسوس ہوا تو وہ چند ٹانگوں کے لئے چوپایہ کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ اس حالت میں اس کا حرکت قلب بہت تیز ہوگیا۔ اس کے اعصاب میں تیزابی لہریں اٹھنے لگیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے رگوں میں گرم گرم سیال دوڑ رہا ہے۔ بے اختیار اس کے ذہن میں آیا۔

——— ہے سکوان ——— مجھے کیسی

سروس ملی ہے ——— مشہ ترین اکر چلنا بلوار

کی تیز دھار پر چلنا پڑتا ہے ——— خطرات ہی خطرات

رننگ روم میں آرام ——— شب و روز سفر

ہی سفر ——— ہوڑہ سے گوموہ ———

گوموہ سے گیا ——— شب کے وقت اُلّو کی طرح

سگنل پر نگاہیں جمائے رکھنا ——— دن کے وقت

خون آلود مند [illegible] اندر ہی اندر کھولتے رہنا۔

اس کا خیال تھا۔

خود کار آلات پر مشتمل انجن کے ڈرائیو میں ساری ذمہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ انجن کے اندر آزادی کی فضا محسوس ہوگی۔ انسان ذمہ داریوں کے بوجھ تلے جانور ہو جاتا ہے۔ انسان اپنا ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ لیکن میرے ہوش و حواس جوں کے توں ہیں۔ اور میرا ظاہر حیوانی شکل و ہیئت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ کیا ہوگیا۔؟

اس نے شکم کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ لوٹ کر کروٹ بدلا۔ اس عمل سے اسے قدرے سکون محسوس ہوا۔ اس نے سر اٹھا اٹھا کر اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ اس کے پشت کے آخری حصے میں دم نکل آئی تھی۔ دم پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ دم کی لمبائی تقریباً ایک بالشت تھی۔ دم جھاڑ کر کھڑا ہوا تو اسے [illegible] کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے جانوروں کی طرح دائرہ نما ایک چکر لگایا۔ جس جانب میدان تھا۔ اس کے قریب گیا کیونکہ اسے [illegible] ہو رہا تھا

اس نے سوچا ——— گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے اس نے یہ ملازمت اختیار کی تھی۔ اس ملازمت نے ذہن میں آتشیں سیال بھر دیا۔ ریلوے کے افسران اور فورمین کو ڈرائیوروں کی مجبوریوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ تو ایر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھتے ہیں۔ سیلون میں سفر کرتے ہیں۔ آرام دہ فلیٹ میں رہتے ہیں۔ ان کی زندگی حرم سرا کے نوابوں کی مانند ہے۔ انہیں ورکرز کے دکھ سکھ کا کوئی خیال نہیں۔ حالانکہ ہر ورکر کو مناسب راحت اور مناسب اجرت ملنی چاہئے۔ یہاں تو آدمی ڈیوٹی سے آف ہو کر آتا ہے ٹھیک سے آرام بھی نہیں کر پاتا کہ کتاب آجاتی ہے بادل ناخواستہ ڈیوٹی پر جانا پڑتا ہے۔ ہم جس وقت لائین پر ہوتے ہیں۔ وہ بستر پر آرام و راحت سے محو خواب ہوتے ہیں اگر کتاب پر دستخط سے انکار کیا جاتا ہے تو بک آف ہونا پڑتا ہے۔ باز پرس ہونے لگتی ہے۔ طرح طرح کی الجھنوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ روٹی کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ نئی نئی دشواریاں اور مشکلات سامنے آجاتی ہیں۔ اگر میں شادی شدہ نہ ہوتا، بیوی، بچے نہ ہوتے، لڑکیوں اور قرض کا بوجھ نہ ہوتا۔ تو میں اختیاری ریٹائرمنٹ لے لیتا۔ اور اسے وہ کھری کھری سناتا۔ کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجاتا افسر شاہی مجھے بالکل پسند نہیں۔ خصوصیت سے اس وقت جب کسی بات پر اختلاف رائے کیا جائے تو وہ ایسی نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے میں سرکار کا ملازم نہیں ہوں۔ اس کا ملازم خاص ہوں۔ اور اسی کا دیا کھاتا ہوں۔ میری محنت و مشقت کی کوئی قیمت نہیں۔ میری مزدوری کی کوئی وقعت نہیں۔ اگر اس ڈرائیوری سے مجھے دس ہزار مل جاتا۔ پی۔ ایف کی جمع شدہ رقم ختم ہو چکی ہے۔ چند برسوں میں بچے اور بس انا نہ ہو جاتا۔ تو میں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتا۔ لڑکیوں

کی شادی ہوجاتی تو میرے گذارے کے لئے پنشن کی رقم کافی ہے۔ میں اپنے منصوبے میں کامیاب ہوجاتا تو پرندے کی طرح آزاد ہوجاتا ——— لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا ٹرین پہونچنے پر کیا ہوتا ہے۔؟ یہ ٹرائل سروس ہے، میرا کیا حشر ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب کیا کروں گا اور مجھ سے کیا ہوسکتا ہے ——— ؟

یہ گاڑی چھ بجے صبح ہوڑہ پہونچنے والی ہے انجن کے اندر کے کلاک کی سوئی ساڑھے پانچ بجا رہی تھی۔ ٹک ٹک کی آواز انجن کے شور میں مدغم ہوچکی تھی۔ رفتار بتانے والی سوئی دو سو میل کی رفتار بتا رہی تھی۔ گھڑی کے اندر کا بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی تیز تھی۔ اس روشنی میں سفید و سرخ سوئیاں حرکت آلود تھیں۔ گاڑی کو منزل تک پہونچنے میں صرف نصف گھنٹہ تھا۔ گاڑی بالکل عین وقت پر چل رہی تھی کیونکہ یہ ٹرائل سروس تھی۔ صرف ایک تجربہ تھا۔ تجربے کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ریلوے کے افسران پر تھا۔ اس ٹرین کے استقبال کے لئے ریلوے کے سبھی افسران ہوڑہ پلیٹ فارم پر موجود ہوں گے۔ یوں تو ریل کا تجربہ کاغذ کے اعتبار سے سو فیصد کامیاب ہوتا ہے۔ حادثات یا ناکامیاں تو اسٹاف کی غلطی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ کاغذات کی رو سے محکمہ ریل کبھی بھی قصوروار نہیں ہوتا۔ ریل تو ریل ہے۔ حکومت کے تجربے سو فیصد کامیاب ہوتے ہیں۔ اس نے ریلوے کے سبھی محکمے کو نہایت قریب سے دیکھا ہے۔

اس کے ذہن میں خیالات ابھرتے ڈوبتے حباب کی طرح نمودار ہو رہے تھے۔ اس کی کیفیت عجیب و غریب تھی۔ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ رہ رہ کر اسے خیال آتا کہ انجن کے رکنے پر اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ وہ کس طرح انجن سے باہر آئے گا۔ اگر باہر نہیں گیا تو کب تک اس انجن کے اندر محبوس رہے گا۔ آخر کار اسے باہر جانا ہی ہوگا اب صرف دس منٹ منزل مقصود پر پہونچنے کے لئے رہ گیا ہے گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشن سے نکل رہی ہے۔ مسافت کے اختتام میں صرف چند منٹ رہ گیا ہے۔ چند ساعت بعد گاڑی پلیٹ فارم پر آجائے گی۔ گاڑی ریلوے کراسنگ سے گذر چکی ہے۔ حادثات کا خوف ختم ہوچکا ہے۔ اس گاڑی کی آمد کی اطلاع سبھی کو مل چکی ہے۔ اس کے لئے سبھی سگنل سبز ہوں گے۔ حادثات کے ہوشیاری کا سگنل نہیں آن ہوگا۔ ریلوے نے اس ٹرین کے لئے خصوصی انتظام کئے ہیں۔ لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری شکل و ہیئت دیکھ کر کارکنان پر کیا ردعمل ہوگا۔ افسران کیا فیصلہ کریں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نوعیت کے انجن میں تو وہ رہ سکتا ہے آخر کام ہی کیا ہے۔ صرف جلتے بجھتے بلبوں کو دیکھنا ہے۔ کافی پینا ہے اور چپ رہنا ہے اس طرح کا کام تو کوئی بھی کرسکتا ہے۔ اس میں کوئی خاص تربیت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس انجن میں تو سارا کام خود بخود ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں آدمی کی حیثیت بیکار محض کی ہے۔

وہ خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا۔ کہ انجن ایک جھٹکے سے رکا۔ سارے مشین یک لخت بند ہوگئے۔ چھوٹے چھوٹے سارے بلب بجھ گئے۔ سو والٹ کا صرف ایک بلب روشن تھا۔ تیز روشنی سے اس کی آنکھوں کو تکلیف ہو رہی تھی۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ انجینیر اور ریلوے کے افسران انجن کے قریب آئے۔ شاید سبھی اس کے باہر آنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا تو انجینیر ڈی، پی او نے اسے پکارا۔

اشوک ——— !

جب کوئی آواز نہیں ملی تو اس نے دو تین بار

پکارا۔ اور دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ اشوک اس درمیان خود کو سنبھال چکا تھا۔ آہستہ آہستہ چوپایہ کی طرح چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ اس کا چہرہ اور جسم دیکھ کر سبھی کو حیرت ہوئی۔ خوف و دہشت سے سبھی نے اسے اندر کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میڈیکل کے سبھی اسٹاف کو طلب کیا گیا۔ دریں اثنا انجن ڈبے سے الگ کر کے مال گاڑی کے ڈیلیوری یارڈ کے اندر لایا گیا۔ میڈیکل اسٹاف نے اس کا طبی معائنہ کیا۔ اس کے کیس کا بریف نوٹ تیار کیا گیا۔ اس کے قلب ماہیت کے جملہ اسباب پر ماہرین کی آرا طلب گیئں۔ طبی معائنہ کے بعد اسے ایمبولینس سے واپس گوموہ بھیجا گیا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر کا ایک دستہ بھی چلا۔ جو جگہ جگہ اس کے تغیر پذیر اثرات کو نوٹ کرنے والا تھا۔ اس کی روانگی سے قبل ہی اس کے بیوی بچوں کو حادثے کی اطلاع ریلوے ٹیلی گراف سے دی جا چکی تھی۔

وہ ایمبولینس میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی میڈیکل اسٹاف بیٹھا ہوا تھا۔ ایمبولینس تیز رفتاری سے مسافت طے کر رہی تھی۔ ڈرائیور کے قریب ریلوے کا سکوریٹی آفیسر تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ بردوان اور آسنسول کے درمیان جی ٹی روڈ کے کنارے ایک کینٹین میں سبھی نے چائے پی۔ اس کے سامنے بھی ڈبل روٹی اور بسکٹ رکھا گیا۔ لیکن اس نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ وہ علی حالہ لیٹ گیا۔ ایمبولینس کے جھٹکے پر اسے بے اطمینانی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بے چارگی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ اپنے اعضا کو ہلتے دیکھ کر اسے کوفت ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن ایمبولینس کے جھٹکے پر گر جاتا ہے۔ وہ از سر نو انسانی شکل و ماہیت کے [illegible] سوچتا رہتا گہری سوچ و فکر کے [illegible] ہوتی [illegible] حالتیں نہ

بھی اپنی گفتگو میں مایوسی کا اظہار کیا تھا جسے اس نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ اس گفتگو سے اسے جو تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس کے لئے ناقابل بیان تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا تھا۔ ایک ہی حالت میں پڑے رہنے کی وجہ سے اسے حد سے زیادہ گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کروٹ بدلنے سے بھی احتراز کر رہا تھا۔ کیونکہ کروٹ بدلنے کی وجہ سے وہ نیچے بھی گر سکتا تھا۔ گرنے کے خوف سے وہ سہما ہوا تھا۔ گرنے سے جو ضرب آئے وہ اور ناقابل برداشت ہو گی۔ اس لئے عقل کا تقاضا یہی تھا کہ موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کی جائے۔ اور حوصلہ پست نہیں کیا جائے۔ سائنس کے دور میں ساری چیزیں امکانی ہیں۔ ایمبولینس کی رفتار سے اسے جھٹکا لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک ہلکی ہلکی سانسیں لیتا رہا۔ اسے امید تھی کہ چند ماہ کے مکمل آرام اور مکمل علاج کے بعد حالات سدھر جائیں گے سبھی کچھ معمولات پر آ جائیں گے۔

وہ اپنے آپ سے خود ہی کہنے لگا ـــــــ

فلیٹ پہونچنے پر ایمبولینس سے باہر آنا ہی ہوگا۔ مجھے اس روپ میں دیکھ کر بیوی بچوں پر کیا ردعمل ہوگا۔ ان کے اعصاب پر کیا گذرے گی۔ دوست، احباب کس نگاہ سے دیکھیں گے؟ بیوی اپنے دل میں کیا سوچے گی۔ لڑکیاں دوسروں سے کیا کہیں گی۔ لوگوں کی زبان پر میرے لئے کون سے الفاظ ہوں گے۔ میں بھی قدرت کا عجیب و غریب مخلوق ہو گیا ہوں۔ پورا جسم حیوان کا ہے لیکن دماغ انسان کا ہے حیوان کے جسم میں انسانی دماغ ـــــــ

سوچ و فکر میں انسانی لہریں ہیں۔ اور جسم پر انسانی اثرات ہیں۔ انسان اور حیوان کا اختلاط یا انسان کے جسم پر حیوانات کا اختیار ـــــــ عجیب و غریب مخلوق ـــــــ!

سہ پہر کے وقت ایمبولینس فلیٹ کے قریب پہنچی دیکھتے دیکھتے کالونی کے مرد و عورت کا اژدہام لگ گیا۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں کی رونے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ سبھی اس کی میت گاڑی دیکھنے کے لئے مضطرب تھے۔ اس کی آمد پر گریہ وزاری کی آواز اور تیز ہو گئی۔ ریلوے ملازمین کے درمیان یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیکھنے والوں کا ہجوم سیلاب کے پانی کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔ ایمبولینس کے رکتے ہی سیکورٹی آفیسر باہر آیا اس کی موجودگی میں میڈیکل اسٹاف نے اسے احتیاط سے اتارا۔ ہجوم کے اصرار پر اسے کچھ دیر کے لئے باہر رکھ دیا گیا۔

وہ جانور کی طرح خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سبھی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر چہرے کو پہچان رہا تھا۔ دیکھنے والی نگاہوں اور چہروں کو اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ ان کے چہروں کی کیفیت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس شکل و ہیئت میں اصلی اشوک کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کا وجود ایک تماشہ ہو گیا ہے سبھی تماشبین کی طرح اسے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے متضاد تاثرات کو وہ انہماک سے سن رہا تھا۔ اور پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ قریبا ایک گھنٹے تک اسے باہر لان میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اسے اسٹریچر سے اس کے کمرے میں پہونچا دیا گیا۔ کمرے میں پہونچ کر اسے عافیت محسوس ہوئی۔ ایک گونہ سکون قلب حاصل ہوا۔ اس کی بیوی نے گریہ و زاری بند کر کے سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ لڑکیاں ابھی تک سسک رہی تھیں۔ سیکورٹی آفیسر بیٹھنے والے کمرے میں آ کر بیٹھا۔ اس نے اشوک کی فیملی کو تسلی دی اور نہایت ہمدردی سے کہا۔

اب آشوک کمار چترجی سروس کے لائق نہیں ہیں۔ تاہم اس کی پوری تنخواہ آپ لوگوں کو برابر ملتی رہے گی۔ یہ فلیٹ بھی آپ کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ اور اس خصوصی دوائیو کے دس ہزار کا چیک بھی آپ کے نام لے آیا ہوں۔ اسے لے لیجئے۔

اس نے اشوک کی بیوی سے چند کاغذات پر دستخط کرائے۔ اور چیک اس کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد سیکورٹی آفیسر واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی کے بعد کئی لوگ اشوک کو دیکھنے کے لئے آئے۔ کئی افراد نے اس کی صورت حال پر چہ می گوئیاں کیں۔ اخبارات کے نمائندے نے کئی زاویئے سے اس کی تصاویر کھینچی۔ اور تفصیلات نوٹ کی۔

اشوک کی بڑی لڑکی سنگیتا نے خود کو سنبھالا اور نیم گرم دودھ پیالے میں انڈیل کر لے آئی۔ اس کے سامنے رکھا۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کر دودھ پی لیا۔ اس کی بیوی اور چھوٹی لڑکی نے مل کر کمرے کا سارا فرنیچر باہر نکالا۔ اس کے لیٹنے کے لئے ایک بوریا بچھا دیا۔ بوریے پر وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ایمبولنس میں وہ کافی تھک چکا تھا۔ غنودگی کے عالم میں وہ فرش پر لیٹ گیا۔ آہستہ آہستہ نیند اس پر غالب آ گئی۔ وہ بظاہر خراٹے لینے لگا نیند کی آغوش میں اس نے خواب دیکھا

ایک آدمی شہر کے شاہراہ پر آہستہ آہستہ چل رہا ہے اس کے سر پر کئی سینگ جانور جیسے ہوئے ہیں لوگ اس کے خوف سے بے تحاشہ بھاگ رہے ہیں جس کو جہاں سینگ سما رہا ہے گھس رہا ہے افراتفری کا عالم ہے۔ ہر فرد بدحواس ہے۔ خوف و دہشت کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ زندگی دم توڑ رہی ہے زندگی کے بدن میں خوفناک عفریت نے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ شہر میں ویرانی بڑھتی جا رہی ہے۔ خوفناک عفریت جگہ جگہ ایستادہ ہیں۔ جانور والے آدمی کے اشارے پر وہ

لوگوں کے اژدہام کو سمیٹر کے ریوڑ کی طرح ہانک رہے ہیں
انسان کا خون ندی نالے میں پانی کی طرح بہہ رہا ہے دھرتی
اپنے محور پر تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ دھرتی کا سینہ
جگہ جگہ سے شق ہو گیا ہے۔ مدفون اشیا باہر آ رہی ہیں۔
لوگ حیران و ششدر ہیں۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہر طرح کی
خبریں پھیل رہی ہیں۔ دھرتی سے انسانی صدائیں
بلند ہو رہی ہیں۔ احکامات صادر ہو رہے ہیں۔ اور دھرتی
پر عمل جاری ہے۔ لوگ اپنی اپنی جماعت میں اکٹھا ہو رہے
ہیں۔ روز مرہ کے حساب و کتاب کو جلدی جلدی نمٹانے کی بات
کر رہے ہیں۔ اعتماد و یقین کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں۔
اپنے اپنے پس انداز رقم کی فکر میں ہر فرد دوڑ رہا ہے۔
جن افراد کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تہی دست ہے
ہر فرد سے فریاد کر رہا ہے لیکن کوئی کسی کا مددگار و غمخوار
نہیں ہے۔ اس شہر میں عجیب و غریب گھوڑے دوڑ
رہے ہیں۔ ان کی ٹاپ سے آگ کی چنگاری پھوٹتی ہے۔ اور
مکانات جل کر خاکستر ہو رہے ہیں۔ مال و دولت کی محبت
میں ڈوبے افراد کی لاشوں کا انبار لگ رہا ہے جانوروں
نے ایک کتاب کھولی ہے۔ وہ شہر کے قلب میں ایستادہ
ہے اس کی آواز پورے شہر میں گونج رہی ہے۔ وہ صاف
صاف لفظوں میں کہہ رہا ہے دولت کے نشے نے تمہیں
حیوان بنا دیا ہے اسی لئے گھوڑے کی ٹاپوں کی چنگاریوں
نے تمہیں ہلاک کر دیا ہے۔ تم سرد آگ ہی میں جلتے رہو گے
جنہیں تم نے لوٹا ہے اب وہ آرام و عافیت سے رہیں گے
اسی دھرتی پر ان کے لئے پھلدار درختوں کے باغات نمودار
ہوں گے۔ ان کے لئے ٹھنڈے نہر کا پانی جاری ہو گا۔ وہ
سیراب ہوں گے۔ خوشحال ہوں گے۔ زندگی ان کی بہار
بداماں ہو گی۔ ——— اور ——— اور تمہاری
حیات کا عذاب شروع ہو چکا ہے۔ تم پر جابر حکمراں مسلط
کر دیئے گئے ہیں۔ تم بُری طرح پھنس چکے ہو۔ اب تم اس
عذاب سے نہیں نکل سکتے۔ تمہارے چہرے مسخ کر دیئے
جائیں گے۔ تاکہ تمہارا کرب روز بروز تیز ہو جائے تمہاری
اذیت میں روز افزوں اضافہ ہو ——— اور ———
تم کرب کے کراں میں ڈوب جاؤ ——— اتنا کہہ کر
جانوروالے آدمی نے جست لگائی۔ اور عین اس کے سینے
پر گرا۔ وہ چونک کر بیدار ہوا۔
وہ اپنے کمرے کے در و دیوار کو دیکھنے لگا

باب دوئم

شب کے آٹھ بجے تک اس پر خواب آلود کیفیت
طاری رہی۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب دروازہ
کھلنے کی آواز فضا میں ابھری۔ اس کی بڑی لڑکی شوبھا
اس کے لئے شب کا کھانا لے کر اندر داخل ہوئی تھی۔
شوبھا نے اخبار پھیلا کر اس کے لئے کھانا چن دیا۔ اس
نے شوبھا کی آمد و رفت سے اندازہ لگایا کہ اس کے
ہیئت کذائی سے شوبھا کو وحشت نہیں ہوتی۔ اس
کے اندر نفرت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ وہ ابھی بھی اسے
اپنے باپ کے روپ میں تسلیم کرتی ہے۔ پیار و محبت
اور احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ چلی گئی تو وہ اپنی
جگہ سے اٹھا ہر چیز کو اس نے باری باری سے سونگھا
اس نے ڈبل روٹی کا دو ٹکڑا کھایا۔ پانی پی کر کمرے میں
آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ دونوں کمرے کے الحاقی
دروازے پر وہ رک گیا دروازہ دوسری جانب سے
بند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آج اس کی ذات ہی گفتگو
کا موضوع ہے۔ وہ دروازے کے قریب سے سننے لگا۔
اس کا قیاس بالکل صحیح نکلا۔ دونوں لڑکیوں کے پاس

حادثے کا اثر سب سے زیادہ تھا اس کی بیوی اس بارہ پر مطمئن تھی کہ تنخواہ حسب معمول ملتی رہے گی۔ گھریلو اخراجات پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ اقتصادی اعتبار سے اس حادثے کی زد میں کنبہ نہیں آیا ورنہ کتنے برے دن آجاتے۔ وہ لڑکیوں کو لے کر کس کے پاس جاتی۔ سارے رشتے ناطے تو اچھے دن کے ہوتے ہیں۔ برے دنوں میں اپنا خون بھی سفید ہو جاتا ہے بہر حال۔ اب ہر ماہ اسے سات تاریخ کو ریلوے آفس جانا ہوگا۔ اور دستخط کر کے رقم لے لینی ہے۔ شوبھا کالج میں بی اے کی طالبہ ہے۔ چھوٹی لڑکی انجنا دسویں کلاس کی طالبہ ہے بڑی لڑکی کو گریجویشن کے بعد آسانی سے ڈی، آر، ایم آفس میں ملازمت مل جائے گی۔ اس کے باپ کا حادثہ نوکری کے حصول میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ فی الحال تعلیمی اخراجات جوں کے توں رہیں گے۔ لڑکیوں کے ذہن میں اقتصادیات کی بجائے باپ کی ہستی تھی۔ ان کے ذہن میں تھا پتا جی نے شادی کے لئے جس لڑکے کو منتخب کیا ہے اور جو تلک کی تیاری کر رہے تھے اس کا انجام کیا ہوگا؟ اب وہاں رشتے کی بات ٹوٹ جائے گی۔ یہ کنبہ اقتصادی اعتبار سے اثر انداز نہ ہو لیکن سماجی اور اخلاقی اعتبار سے ضرور اثر انداز ہوگا۔ یہ حادثہ خاندان کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ لڑکیوں کا چہرہ حد سے زیادہ سوگوار تھا۔ حسب معمول اس وقت شوبھا کالج ٹاسک میں مصروف رہتی۔ انجنا کوئی لیسن رٹتی رہتی۔ اور بیوی کچن میں خادمہ پر اپنا غصہ اتارتی رہتی۔ لیکن اس وقت سبھی ایک کمرے میں ہیں۔ اور اس کی شکل و ہیئت ہی موضوع سخن ہے۔ اس کی ذات پہ اظہار رائے ہو رہا ہے۔

اشوک دروازے سے ہٹ کر دوبارہ اسی جگہ پر آیا جہاں کھانا پڑا ہوا تھا۔ اس نے سبھی اشیا کو پھر سے سونگھا۔ اسے کھانے کے اندر کسی طرح کا ذائقہ نہیں محسوس ہوا۔ کمرے میں تیز روشنی کا بلب روشن تھا۔ بلب کی روشنی اس کی آنکھوں پر براہ راست پڑ رہی تھی وہ انتہائی کراہیت کے عالم میں کھانے کے پاس سے مڑا اور بارہ فٹ چوڑے اور چودہ فٹ لمبے کمرے میں دھیرے دھیرے ٹہلنے لگا۔

کئی راتیں اس نے اسی طرح گذاریں۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برآمدے میں اس کی ساری چیزیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اخبارات کا پلندہ تھا۔ فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے تھے خالی ڈبیاں تھیں۔ اخبارات کا پلندہ تھا۔ کتابوں کے ریک سے کئی کتابیں فرش پر گری تھیں۔ جرائد کے فائل گڈ مڈ تھے۔ اس کے بستر کی حالت اور بھی بدتر تھی۔ اس کی بیوی کتابیں اور اخبارات کاغذ خریدنے والے کے ہاتھ فروخت کرنے کی منصوبہ بنا رہی تھی۔ اس کی بیوی کی نگاہ میں ساری چیزیں بیکار تھیں۔ جبکہ اشوک کی نگاہ میں ہر شئے کارآمد تھی۔ کئی کتابیں بے حد قیمتی تھیں۔ اس کی لڑکیاں چند کتابیں رکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن اس کی بیوی کتابوں کو چھونے سے منع کر رہی تھی۔ وہ لڑکیوں کو بتا رہی تھی کہ ان کتابوں کے مطالعہ سے ہی اس کے باپ کی یہ حالت ہوئی ہے ان کتابوں کے مطالعہ سے انہیں بھی یہ مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں کا حسین و جمیل چہرہ اور گداز جسم بھی حیوانات میں تبدیل ہو جائے گا اسی لئے یہ ساری چیزیں انہیں زہریلی ناگ کی طرح لگ رہی تھیں۔ ان کتابوں کی ساری معنویت ختم ہو چکی ہے۔ اب ان کتابوں کا گھر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس بستر کی چادر اور اس کے کپڑے ایک کونے میں پڑے ہوئے تھے۔ جو شاید دھوبی کو دینے کے لئے رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے شیونگ کا سارا سامان بیکار اشیا کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ باورچی خانے کا نل کھلا ہوا تھا

جس سے پانی گر رہا تھا۔ خادمہ کے برتن دھونے کی آواز صاف آرہی تھی۔ وہ برآمدے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جبکہ دوسرے کمرے کا ملحق دروازہ تھوڑا سا کھلا لیکن پھر فوراً ہی بند ہوگیا۔ اندر سے برآمدے کا بھی دروازہ بند ہوگیا۔ ایسا لگا کہ کوئی کمرے میں جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنا ارادہ بدل دیتا ہے۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کونے میں آگیا تاکہ دیکھنے والے کو کسی طرح کی ہچکچاہٹ نہ ہو۔ اور وہ بھی نو وارد کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ دروازہ دوسری بار تھوڑا سا کھلا۔ تو اس نے پہچان لیا۔ یہ اس کی فیملی کا سنگیت ٹیچر مسٹر سنہا تھا۔ اس کی پشت پر اس کی بیوی کا چہرہ بھی نظر آیا۔ بیوی کے چہرے پر اب کسی طرح کا اضمحلال نہیں تھا۔ وہ خوش و خرم اور توانا اور تندرست نظر آرہی تھی۔ مسٹر سنہا اسے دیکھ کر واپس چلے گئے شاید وہ اس وقت صرف عبادت کے لئے آئے تھے۔ بیوی کے اصرار پر انہوں نے چائے کی پیالی لے لی۔ وہ برآمدے کی میز پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ چائے کا اشوک بھی عادی تھا۔ چائے کی اشتہا بھی اس کے اندر انگڑائی لینے لگی۔ لیکن اس کی جانب کسی نے توجہ نہیں کی۔ مسٹر سنہا نے اظہار ہمدردی کی۔ ان کے ایک آدھ جملے ان کی سماعت میں بھی آئے۔ اشوک مسٹر سنہا کی ذہانت کا مطلق قائل نہیں تھا۔ اس نے ہر گفتگو میں اندازہ کیا کہ وہ اوسط درجے کی ذہنیت کا مالک ہے اسے سنگیت کا شوق ہے۔ روپئے کمانے سے مطلب ہے صفحۂ ہستی پر کیا ہو رہا ہے۔ کائنات کس سمت کی جانب جا رہی ہے۔ ایجادات و اختراع کی کیا نوعیت ہے؟ چاند کی دھرتی کا کیسا رنگ ہے؟ قطب مشتری کی تصاویر کیا بتا رہی ہیں اسے ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہے اسے صرف روٹی اور سنگیت سے مطلب ہے۔ وہ شمالی بہار کا باشندہ ہے۔ وہ ہر ماہ روپئے اکٹھا کر کے گھر بھیج دیتا ہے۔ تھوڑی سی رقم اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ اپنی آمدنی کا چالیس فیصد شراب پر خرچ کرتا ہے اشوک نے اسے کئی بار سمجھایا تھا لیکن اس کی ہر بات بے سود ثابت ہوئی۔ شراب اس کے خمیر میں پیوست ہو چکی تھی۔ یہ لت اسے بہت پہلے ہی لگ چکی تھی۔ اب اسے ترک کرنا اس کے لئے محال تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ شراب ہی زندگی ہے۔ یا زندگی کا دوسرا نام شراب ہے۔ اس کا صحیح لطف کھانے کے ساتھ آتا ہے دنیا کے بیشتر افراد شراب کا سہارا لیتے ہیں۔ احمق اور جاہل افراد اس سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ شراب کے موضوع پر وہ ہمیشہ رطب اللسان رہتا۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھا۔ اس کی بیوی سے باتیں کی۔ اور الوداعی سلام کر کے چلا گیا۔ اس کے باہر جانے اور دروازہ اندر سے بند کرنے کی آواز صاف آئی۔ خادمہ برتن صاف کر چکی تھی۔ وہ اب جانا چاہتی تھی خادمہ نے اس کی بیوی سے اجازت لی۔ اور صبح کے وقت آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اس کی بیوی نے دوبارہ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اشوک اپنے کمرے میں گم صم بیٹھا ہوا تھا اس کے ذہن میں تشویش آلود تصورات چبھ رہے تھے۔ رہ رہ کر ایک ہی سوالیہ نشان اس کے ذہن میں انگڑائی لے رہا تھا ——— کیا میری خاموش، بے زبان، اور بے نام و نشان حیات بھی دہشت کا شکار ہو جائے گی

اب اس کے [illegible] خاموشی گہری ہو رہی تھی فلیٹ کے سبھی دروازے اندر سے مقفل ہو چکے تھے لابی والے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ اس کی بیوی اور لڑکیاں اپنے اپنے بستر پر جا چکی تھیں۔ راہداری کا بلب روشن تھا۔ اس کے کمرے کا بھی بلب جل رہا تھا۔ اس بلب کو کسی نے بجھانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ حالانکہ اس بلب کی روشنی سے اسے تکلیف محسوس ہو رہی تھی

بے زبانی کے باعث وہ اس تکلیف کو بھی برداشت کر رہا تھا
اب اس کمرے میں کسی کے آنے کی امید نہیں تھی ۔

رات کافی گذر چکی تھی ۔ چاروں طرف گہری خاموشی
تھی ۔ زندگی ساکت تھی یا محوِ خواب تھی ۔ وہ نہایت اطمینان
سے اپنی ذات پر غور و خوض کر رہا تھا ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ
ان حالات میں زندگی کس طرح گذاری جائے ۔ یا اس شکل
و ہیئت میں زندگی کس طرح بسر کی جائے ۔ اب کیا کیا جائے
دونوں پاؤں جالگھ میں پیوست ہیں ۔ دونوں ہاتھ سمٹ
کر چھوٹے ہوگئے ہیں ۔ انگشت میں جمود ہے ۔ جسم کا ڈھانچہ
عجیب شکل میں تبدیل ہوچکا ہے ۔ پورے جسم پر لمبے لمبے
سیاہ بال اگ آئے ہیں ۔ کان کی بناوٹ پہلی جیسی نہیں
ہے ۔ اس اونچی اونچی دیواروں کے کمرے میں اسے وحشت
ہو رہی تھی ۔ حالانکہ یہی کمرہ ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے
کئی سال گذارے تھے ۔ اس نے آئن اسٹائن کی تھیوری
کا مطالعہ یہیں کیا تھا ۔ چاند اور دیگر سیاروں پر کتابیں
یہیں پڑھی تھیں ۔ اس کمرے سے اسے گہری مانوسیت تھی
لیکن اب اسے دہشت ہو رہی تھی ۔ دیوار پر ایک کیلنڈر رہ
گیا تھا جس میں ہوڑہ برج کا منظر مقید تھا ۔ آتی جاتی سواریاں
اور جاتے مناظر کی ساکت کیفیت قابل دید تھی ۔ اس منظر
کو دیکھ کر اسے قدرے راحت محسوس ہوئی ۔

وہ اب جسمانی طور پر توانائی محسوس کر رہا تھا ۔
اس کی کھال موٹی ہوتی جارہی تھی ۔ اس کے پنجے بڑے اور
آہنی ہو رہے تھے ۔ اس کی دو ٹانگیں جیسے وہ جالگھ سے
منسلک سمجھ رہا تھا ۔ وہ صرف اس کا ذہنی تصور تھا ۔
حقیقت حال کچھ اور تھی ۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں
تھے اس کے بازوؤں کی مچھلی اس طرح ابھری ہوئی تھی ۔
دقت اسے صرف یہ تھی کہ وہ ایک حال میں زیادہ دیر تک
رہ نہیں پاتا ۔ ایک حال میں اسے کچھ دیر راحت ملتی اور پھر
وہ اضطراب و کرب کا شکار ہو جاتا ۔

وہ تمام رات کمرے میں گھومتا رہا ۔ گھڑی دو گھڑی
کیلئے اس پر غنودگی طاری ہو جاتی ۔ اور پھر وہ کولھو کے بیل
کے مانند چکر لگاتا رہتا ۔ اس گھر میں اب اس کی معنویت
ختم ہو چکی تھی ۔ اس کا وجہ جواز ختم ہو چکا تھا ۔ اس کی غیر
موجودگی میں بھی وہی رتھ چلے گی ۔ وہ عضو معطل کے مانند
ہے ۔ اس کے اس حادثے کا اثر کسی پر نہیں تھا ۔ سبھی اپنی
اپنی ذات میں مگن تھے تمام رات سبھی اپنی گہری نیند میں
ہوتے ۔ اور وہ بے چینی سے چکر لگاتا رہتا ۔ مضطرب
و پریشان ۔

علی الصباح خادمہ کی دستک اس کا کنبہ بیدار
ہوا ۔ اس کی بیوی نے اٹھ کر دروازہ کھولا ۔ خادمہ نے
اسٹو پہ چائے بنا کر تینوں کو پیش کر دیا ۔ اور پھر کوئلہ کا
چولہا جلانے لگی ۔ اس کی چھوٹی لڑکی نے آہستہ سے دروازہ
کھولا ۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرا گئیں ۔ اس کے ہاتھ میں چائے
کی پیالی تھی ۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے پھر دروازہ بند
کر دیا ۔ وہ چائے کی سپ لینے لگی ۔ اشوک کی قوت اشتہا
چائے کی پیالی دیکھ کر تیز ہوگئی

اگر اسے بھی چائے کی پیالی مل جاتی تو صبح سویرے کی
بیداری کا لطف آجاتا ۔ اسے چائے نہ دینے کا یہ مطلب
ہوا کہ اب وہ اس گھر کا لازمی جز نہیں رہا ۔ اس کی حیثیت
گھریلو جانور کی ہوگئی ہے ۔ اس کے خون نے ہی اس سے منہ
موڑ لیا ہے اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا وہ اپنے وجود
کی معنویت سے محروم ہو چکا ہے معانی سے محروم الفاظ
کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ۔ صفحۂ قرطاس سے حاشیہ پہ
جاتا ہے ۔ بے وقعتی کی زندگی اسے فنا کر دیتی ہے وہ ہر
جانب سے گر چکا ہے ۔ گرتے پتھر اور گرتے انسان کو
کوئی روک نہیں سکتا ۔ یہ مقدر کا کھیل ہے ۔ سفاک

بربریت کے واقع پیچ نرالے ہوتے ہیں۔

وہ خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اس کی بڑی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس کے ساتھ مہترانی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک گوشے میں آگیا۔ لڑکی کے اشارے پر مہترانی نے کمرے کے فرش کی صفائی کی۔ غلاظت اور پس خوردہ خوراک کو اٹھا کر بالٹی میں رکھ لیا۔ مہترانی باہر نکل گئی۔ بڑی لڑکی نے پھر اخبار پھیلا کر روٹی اور ترکاری رکھ دیا۔ اور کمرہ بند کر دیا۔ لڑکیاں غسل کرنے چلی گئیں۔ نہا دھو کر انہوں نے لباس زیب تن کیا۔ بڑی لڑکی کالج چلی گئی۔ چھوٹی لڑکی اسکول روانہ ہوگئی۔ اس کی بیوی نے لڑکیوں کو رخصت کر کے غسل کیا۔ اور اطمینان سے میز کے قریب بیٹھ کر کھانے لگی۔ خادمہ اتارے ہوئے کپڑوں کو دھونے لگی

ساڑھے دس بجے قریب سنگیت کا ٹیچر آیا۔

اس کی بیوی کو سنگیت کا بے حد شوق تھا۔ وہ سنگیت ٹیچر کو دیکھ کر مسکرا اٹھی۔ اس نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اسے اصرار کر کے چائے کے میز پر بٹھا لیا۔ اس کی بیوی نے اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی۔ اسے چائے بسکٹ دے کر اپنے کمرے میں آئی۔ ہارمونیم کو ٹھیک سے رکھ کر بھجن کو ٹھیک سے مشق کرنے لگی۔ اشوک کو اپنی بیوی کی آواز میں زبردست کشش محسوس ہوئی۔ وہ ملحق دروازے کے قریب آگیا تاکہ آواز اور صاف آئے۔ وہ شگاف سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی نے آدھے گھنٹے تک ریاض کیا۔ سنگیت ٹیچر طبلے پر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ ہارمونیم الماری میں رکھ کر آئی، تو سنگیت ٹیچر کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔ سنگیت ٹیچر مسٹر سنہا لے [illegible] بوس وکنار میں معروف ہوگیا۔ ———

پھر اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس ے [illegible] دیر کی وہ تاب نہ لاسکا۔ اس نے اچھل کر پیچھے سے زبردست دھکا مارا۔

دروازے کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ اس کی بیوی مادرزاد برہنہ تھی۔ مسٹر سنہا کے جسم پر صرف فلائنگ شرٹ تھا۔ وہ آدم خور شیر کی مانند اچھل کر مسٹر سنہا پر حملہ آور ہوا۔ مزاحمت کے دوران اس کی بیوی نے کونے میں پڑے ہوئے ڈنڈے سے اس کے سر پر پوری قوت سے مارا۔ اشوک کا سر چکرا گیا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کی ساری چیزیں درہم برہم ہو چکی تھیں۔ چینی کے کئی پلیٹ اور ڈنر کے کئی سیٹ چور ہو گئے۔ مسٹر سنہا کو سر اور بازو پر چوٹ آئی تھی۔ اشوک بھی زخمی ہوا تھا۔ اس کے پنجے میں شیشے کا ٹکڑا چبھ گیا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد خون خود بخود بند ہو گیا۔ کمرے میں خون کے کئی دھبے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر چکا تھا۔ اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ وہ عورت جسے وہ ستی ساوتری سمجھ رہا تھا۔ اس کا دوسرا روپ دیکھ کر وہ جھنجھنا اٹھا اس کے چہرے کا ہیولیٰ اور بھیانک ہو گیا۔ وہ سیال آفریں تصورات میں ڈوب گیا۔

سہ پہر تک وہ بے سدھ پڑا رہا۔ اس کی لال لال لہو جیسی آنکھوں میں شعلے دہک رہے تھے۔ وہ بہت دیر تک آتشیں لہروں پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی بیوی نے دونوں دروازوں کو مقفل کیا۔ اس بار اس نے کنڈی میں باہر سے تالا بھی بند کیا۔ وہ شکست خوردہ جانور کی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات انگڑائی لے رہے تھے۔ وہ رہ رہ کر اپنی حرماں نصیبی پر بے چین ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ وہ پنجے پر سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔ آنسوؤں کی روانی سے فرش پر نمی آگئی تھی۔ اسے ایک ہی خیال کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا ——— میں نے جس عورت کے لئے اپنا گاؤں چھوڑا، ماں، باپ، بھائی، بہن سے دور ہوا۔ تلوار کی تیز

دھار پر چلنے والی گاڑی کی نوکری حاصل کی۔ میں سو فیصد اسی عورت کا رہا۔ میرے خواب و خیال اور دل و دماغ میں کوئی عورت نہیں آئی۔ حالانکہ میرے کئی دوست ڈرائیور تھے۔ جو اپنی تنخواہ کا ستر فیصد آمدنی شراب اور عورت پر صرف کرتے تھے۔ کئی ڈرائیور کی مستقل کال گرل ہوڑہ اور گیا میں ہے۔ ان عورتوں کے یہاں ڈرائیورز جس انداز سے رنگ رلیاں مناتے اسے دیکھ کر نوابوں کی عیاشی اور راجاؤں کی رنگ محل کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں لیکن ــــ لیکن میں کبھی بھی لہو لعب کی طرف مائل نہیں ہوا۔

اس کا معمول تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا پچاس فیصد بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ ۲۵ فیصد ڈیپازٹ میں ڈال دیتا۔ دس فیصد اخبارات و رسائل پر خرچ کرتا۔ اسے جیمز جوائس یاد آیا ــــــ جو برسہا برس تک کیلی فورنیا کے راہبوں اور سادہ لوح انسانوں کو دھوکا دیتا رہا۔ اس نے لاکھ پتی انسان کو بھی بھیک مانگنے کے لئے بڑے بڑے شہروں میں بھیج دیا۔ اس نے لاکھ پتی بیوہ سے شادی کی۔ اس کی دولت پر عیش کیا۔ دراصل وہ بندر نچانے والا مداری تھا۔ اس نے پاکٹ ماری بھی کی تھی۔ اس دھوکے اور فریب سے سونا چاندی جمع کیا اور ــــــ اور پھر ایک شہر کی بنیاد پڑ گئی۔ اس نے ہمیشہ دوسروں کو دھوکا دیا۔ زندگی بھر وہ دوسروں کو فریب دیتا رہا اور اپنے لئے سونا چاندی اور زیور اور جواہرات جمع کرتا رہا۔ اس نے عملی طور پر ثابت کیا کہ چھل اور فریب دنیا کا دوسرا نام ہے رشتے ناطے جھوٹے ہیں۔ مواقع اور حالات ہی سب کچھ ہیں۔ سبھی رشتے مٹ جاتے ہیں۔ رشتوں کی بنیاد پر سانس لینے والے افراد پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ کے سارے چٹان بکھر جاتے ہیں سمندر کی گہرائی کا علم ہو سکتا ہے۔ پہاڑ کی بلندی کی پیمائش ہو سکتی ہے۔ لیکن عورت کا صحیح علم کسی کو نہیں ہو سکتا عورت ایک سربستہ راز ہے اس کی سرشت کا مطالعہ امر محال ہے۔ جس عورت پر اس نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ وہ بھی اس کی نہیں۔ اس کائنات میں کچھ بھی اپنا نہیں۔ صرف فریب ہی فریب ہے ــــــ

دن کے حادثہ سے وہ دل برداشتہ تھا شدت جذبات سے اس نے جست لگالی تھی۔ اس جست میں اسے بھی چوٹ آئی تھی۔ اس ضرب کا اب اسے احساس ہو رہا تھا۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔

سہ پہر کے وقت لڑکیاں واپس آئیں تو اس کی بیوی کی گرم گرم آواز فلیٹ میں گونجنے لگی۔ وہ دن کے واقعہ کو مبالغہ سے بیان کر رہی تھی۔ آخر میں اس نے اشوک کی موجودگی سبھی کے لئے مہلک ثابت کی۔ دن کے واقعہ کی تفصیل سے لڑکیوں کے ذہن میں دہشت سرایت کر گئی تینوں سر جوڑ کر غور و فکر کرنے لگے۔ کہ کس طرح اس مصیبت سے نجات پائی جائے۔ شوبھا کا خیال تھا کہ اسے جانوروں کے تحقیقاتی ادارے میں بھیج دیا جائے۔ کیونکہ یہ اپنی نوعیت کا واحد جانور ہے۔ اس کی فروخت سے خاصی رقم بھی مل سکتی ہے۔ لیکن اس کی بیوی کا اصرار تھا کہ یہ سب کچھ کرنا بیکار ہے۔ اسے خاموشی سے زہر دیدینا ہی بھلائی ہے۔ یہ آفت اپنے آپ ٹل جائے گی۔ اور سبھی لوگ ہمیشہ کے لئے اس مصیبت سے نجات پا جائیں گے۔ لڑکیوں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ چھوٹی لڑکی انجنا رونے لگی۔ اس نے دروازہ کھول کر اشوک کو دیکھا۔ تو اس کا دل جذبۂ رحم سے بھر آیا۔ کیونکہ اشوک کی ظاہری حالت قابل رحم تھی۔ وہ درد و کرب کے عالم میں آہستہ آہستہ سسک رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کی

منہ کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں ۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب چلی گئی ۔ اس نے اشوک کے جسم پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کا لمس پاکر اس نے آہستہ سے آنکھ کھولا۔ اس نے ایک بار گہری نگاہ سے انجنا کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنی لڑکی کے قدموں پر سر رکھ کر لوٹنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شدید بے چینی کے عالم میں ہے۔ دریں اثنا انجنا کا اندرونی خوف زائل ہوچکا تھا۔ اس کی ماں نے اسے زور سے ڈانٹا۔ لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئی وہ اشوک کے قریب بیٹھی ہی رہی۔ اس عمل سے اسے اشوک سے ہلکی سی مانوسیت ہوگئی۔ اس نے شب کے وقت اپنا بستر اسی کے کمرے میں لگایا۔ حالانکہ اس کی ماں اس کو سخت و سست کہتی رہی۔ اور بُری طرح پھٹکارتی رہی۔ وہ [illegible] رہی تھی کہ اس کمرے میں سونا اس کے لئے [illegible] ہے۔ کوئی بھی ناخوشگوار حادثہ ہو سکتا ہے۔ انجنا [illegible] توڑ کر اشوک کو کھلایا۔ اسے بڑے المونیم کے [illegible] سے پانی پلایا۔ اس کے آرام کے لئے موٹا [illegible] نے اشوک کا سارا کام اسی کمرے میں رہ کر کیا۔ نصف شب کے قریب وہ لیٹ گئی اسے بہت جلد گہری نیند آگئی۔ علی الصباح اس کی آنکھ کھلی۔ تو اس نے اٹھ کر دیکھا اس کی پشت پر ضرب کی لمبی نشان تھی۔ وہ ڈنڈوں کی شیشی لے آئی۔ اور روئی سے آہستہ آہستہ اس کی پشت پر لگا دیا اشوک کی آنکھ کھل چکی تھی۔ اس نے انجنا کو غور سے دیکھا۔ اس کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ وہ یہ کہ بڑی لڑکی مسٹر سنہا کی اولاد ہے اور چھوٹی لڑکی میری اولاد ہے کیونکہ خون خون کی طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ ساری باتیں سن چکا تھا۔ اس سے اسے ناقابل برداشت صدمہ ہوا تھا۔ اس نے پیار بھری نگاہوں سے انجنا کی جانب کی جانب دیکھا۔ جو پھر اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ اسی لئے وہ مطمئن تھی۔ اشوک کے دل و دماغ میں شفقت و محبت کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے بستر کے قریب پالتو کتے کی طرح لیٹ گیا۔

دوسرے کمرے میں اس کی بیوی ایندھن کی طرح کھولتی رہی۔ بہت رات تک اس کے بڑبڑانے کی آوازیں آتی رہیں۔ ان آوازوں کی اصلی وجہ صرف اشوک کو معلوم تھا۔ یا پھر اس کی بیوی اور مسٹر سنہا کو معلوم تھا۔ اس حادثے سے وہ بہت زیادہ نڈھال اور مضمحل تھا ڈھول لگ جانے سے اسے قدرے راحت محسوس ہوئی تھی۔ وہ پھر سو گیا۔ اس نتھنے سے گھرگھراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ کمرے کی فضا میں اس کی خرخراہٹ کی آواز پھیل رہی تھی۔ وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔ اس نے نہایت بھیانک اور ڈراؤنا خواب دیکھا ــــــــ

پہاڑ کی بلندی پر مکروہ چہرے کا انسان بیٹھا ہے اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ ان شعلوں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا ہے۔ بیشتر چٹانوں کا چہرہ خون آلود ہے۔ پہاڑ کی بلندی سے خون کی ندی جاری ہوگئی تھی۔ خون تیزی سے بہتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے خون کی تیز دھارا اسے بھی بہالے لئے جارہی ہے۔ ــــــ اور ــــــ پھر وہ ایک چٹان کے قریب رکا ہے۔ اس کی بیوی اور سنگیت ماسٹر مسٹر سنہا نمودار ہوتے ہیں۔ دونوں نے مل کر اس کی گردن میں رسی باندھی ہے۔ گردن کی رسی لمحہ بہ لمحہ تنگ ہوتی جارہی ہے۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ بے بسی سے وہ ماہی بے آب کی طرح چھٹپٹا رہا ہے دونوں اس کے سامنے خوشی سے قہقہہ لگا رہے ہیں اس کا نیم مردہ جسم آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو رہا ہے

ایک گدھ اس کے شانے پر آکر بیٹھا ہے ـــــــ
وہ چونک کر بیدار ہوتا ہے۔ کمرے کا بلب روشن ہے
رات گذر چکی ہے۔ چاروں طرف گہری خاموشی ہے
اس نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ اس کی لڑکی محو خواب ہے
اس کے ننھے ننھے آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں وہ
گہری نیند میں تھی۔ اور پھر اس کی نگاہ اپنے جسم پر
پڑی۔ اس کے ذہن میں آیا ـــــــ اب میں
کسی لائق نہیں رہا۔ اب میں اپنی بچی کو بھی خطرے سے نہیں
بچا سکتا۔ بیوی نے مجھے کتنا زبردست دھوکا دیا ہے
یہ عورت، عورت نہیں ہے۔ ناگن ہے۔ اسی کے زہر سے
سب کچھ ہوا ہے۔ ممکن ہے مسٹر سنہا سے مل کر اس
نے مجھے کچھ کھلا دیا ہے۔ جس کی بنیاد پر میں اپنی شکل و
ہیئت سے محروم ہو گیا ہوں۔ یہ کسی دیو کی کرامات
ہے ـــــــ لیکن ـــــــ لیکن میں اب انتقام
لوں گا۔ میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی
آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔ یہ منظر میرے جسم وجاں
میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ میں آگ کے شعلوں پر تڑپ
رہا ہوں۔ اس قدر شدید کرب کا احساس کبھی نہیں ہوا۔
کیا کروں میرے سوچ و فکر پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی
جسم کی ساری علامات ختم ہو چکی ہے۔ کاش جسم کے ساتھ
دماغ بھی سلب ہو جاتا۔ سوچ و فکر اور شعور سے بھی
محروم ہو جاتا۔ ہر قید سے آزاد ہو جاتا۔ اور پھر یہ کیفیت
نہ ہوتی۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جو عقل و خرد
اور دانش و فکر کے دولت سے محروم ہے۔ سوچ و فکر
کا کرب کتنا دردناک عذاب ہے۔

وہ دیر تک تصورات میں غوطہ زن رہا۔ صبح
ہوئی تو انجنا نے اسے بند روٹی کھلایا۔ وہ جانوروں
کی طرح کھاتا رہا۔ انجنا اسے خاموشی سے دیکھتی رہی
اس نے بند روٹی کھالیا تو وہ کمرے سے باہر آگئی۔ اور
دروازہ بند کر دیا۔ اشوک کی ہیئت کذائی کو دو ماہ
سے زیادہ ہو گیا تھا۔ کالونی کے مکین بھی اس کی صورت
سے مانوس ہو چکے تھے۔ کسی کو اس کے وجود سے وحشت
نہیں ہوتی تھی۔ وہ قریب قریب سبھی کی نگاہوں میں
پیوست ہو چکا تھا۔ سبھی کے ذہن میں اس کے لئے جگہ
بن چکی تھی۔ لیکن اس کی بیوی ہمیشہ بڑبڑاتی رہتی تھی
وہ نفرت آگیں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سلگتی
ہوئی آنکھوں کو وہ بھانپ لیتا۔ وہ اندر ہی اندر کھول
رہی تھی۔ مسٹر سنہا کے مشورے پر اس نے کئی
منصوبے بنائے جس کی بنیاد پر وہ ہمیشہ کے لئے ہٹ
جاتا۔ لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی وجہ مانع ہو گئی۔ اب اس
نے نہایت رازداری سے اس کے کھانے میں زہر ملا دیا
لڑکیاں اپنے اپنے ادارے میں تھیں۔ اس نے کھانا خادمہ
کے ہاتھ سے اس کے سامنے بھجوا دیا۔ خادمہ کمرے سے
باہر آئی۔ تو وہ اٹھ کر کھانے کے قریب گیا۔ اسے بھوک
بھی بہت زیادہ تھی۔ جوں ہی وہ کھانے پر جھکا۔ اسے
بہت تیز بو محسوس ہوئی۔ اس کی چھٹی حس بیدار
تھی۔ اسے فوراً زہر کی ملاوٹ کا اندازہ ہو گیا۔ اس
لئے وہ کھانے کو سونگھ کر اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ فرش
پر کھانا جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ گھر کی پالتو بلی میاؤں
میاؤں کرتی ہوئی آئی۔ وہ کھانے پر جھک گئی اس نے
روٹی کھینچ لی۔ اس نے عجلت میں روٹی کا چند ٹکڑا
کھایا۔ اور پھر وہ وہیں فرش پر گر پڑی۔ ذبح کئے
ہوئے بکرے کی مانند چھٹپٹانے لگی۔ چند ثانئے کے
بعد وہ ساکت و جامد ہو گئی۔ اس کی روح قفس عنصری
سے پرواز کر چکی تھی۔ اشوک موت و زیست کا کھیل
پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ قوت گویائی سے

محرومی کے باعث بے زبانی کا شکار تھا۔ بلی کی موت اس کی نگاہوں میں رقص کر رہی تھی۔ چھٹپٹانے کے باعث جو نشانات فرش پر ابھرے تھے۔ ان نشانات کو وہ گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اس کی موت اسی طرح ہوگی وہ بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کر دار فانی سے کوچ کر جاتا۔ بے ثباتی عالم کی زد میں وہ بھی آجاتا۔ ابھی چند منٹ قبل حیات کا رشتہ ٹوٹ جاتا لیکن اس کی قوت شامہ نے اسے بچالیا عین اسی وقت کال بیل کی آواز فلیٹ میں گونجی۔ وہ سمجھ گیا کہ مسٹر سنہا کی آمد کی گھنٹی ہے۔ عام طور پر وہ اسی وقت آتا ہے۔ دروازہ کھلا۔ مسٹر سنہا کی آواز سے وہ اور بھی پہچان گیا۔ اسے قدموں کی آہٹ اپنے کمرے کی طرف محسوس ہوئی۔ وہ کھانے کے قریب منہ رکھ کر اس طرح لیٹ گیا جیسے وہ روٹی کھاتے ہی جاں بحق ہوگیا ہے۔ اس نے اپنی سانس بھی دھیمی کرلی۔ تنفس کی رفتار بہت ہی دھیمی ہوگئی۔ آنکھیں بند کرلی۔ بے سدھ وہ یوں پڑا ہوا تھا۔ جیسے کوئی مردہ ہو۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ مسٹر سنہا اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ دونوں کے قہقہے کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ اس کی بیوی فرط مسرت سے مسٹر سنہا سے لپٹ پڑی۔ اور بے اختیار اس کے چہرے کو چومنے لگی۔ چند منٹ تک یہ عمل جاری رہا۔ سنہا کی بانہوں میں جھولتے ہوئے اس نے کہا۔

ڈارلنگ! تم نے بہت اچھا کیا۔ یہ زہر اچھے قسم کا تھا۔ اب اس کا کام تمام ہوچکا ہے۔ لیکن مجھے اپنی بلی کی موت کا دکھ ہے۔ اس کمینے نے جاتے جاتے میری بلی کو لے ہی لیا۔ وہ اس کی بانہوں سے نکل کر بلی کے قریب آئی اسے اٹھا کر پیار کیا۔ اسے کئی بار چوما اور پھر اسے صاف جگہ پر لٹا دیا۔ بلی کی زبان باہر آچکی تھی۔ اس کے چاروں پاؤں لکڑی کے مانند سخت ہوچکے تھے۔ اس کا دہانہ کھلا ہوا تھا۔ دانت نکوسے بھیڑیئے کی مانند اس کا چہرہ لگ رہا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی شکل و ہیئت ظاہر کررہی تھی کہ روح بڑی مشکل سے پرواز ہوئی ہے۔ تیز آندھی بے رحمی سے درخت کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکتا ہے ایک ایک ہی کراہ کراہ کر دم توڑ رہی ہے درخت کا جسم تپ دق کے مریض کی طرح زرد ہو کر خشک ہوچکا ہے۔ بلی کی موت اس کی بیوی کے لئے المناک سانحہ تھا۔ لیکن اشوک کی موت کی خوشی کے باعث یہ تاسف زائل ہورہا تھا۔ وہ بلی کو فرش پر لٹا کر مسٹر سنہا کے قریب آئی۔ جو اشوک کے قریب ایستادہ نہایت انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی نے پیروں سے زور سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

ڈارلنگ! اس موذی سے نجات ملی۔ لڑکیاں آجائیں تو مہتر کو بلاؤں گی۔ اور اسے کوڑے کرکٹ پر پھینکوا دوں گی۔ اور اب ہمارے اور تمہارے درمیان کی بیچ کی دیوار گر چکی ہے۔ اب ہم لوگ اس گھر میں آزادی کی فضا محسوس کریں گے۔ ہمیں یہ بہت پہلے ہی کردیتے۔ لیکن لڑکیوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ لڑکیوں کو سمجھانا دشوار ترین مرحلہ ہے۔ بڑی لڑکی میرے مشورے پر عمل کرتی ہے لیکن چھوٹی لڑکی مجھ سے ہمیشہ تکرار کرتی ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر زہر دینے کے لئے راضی ہی نہیں ہوتی تھی اگر اس راز کا علم لڑکیوں کو ہوا تو معاملہ پولس تک پہونچ جائے گا۔ بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ راز ہمیشہ کے لئے راز ہی رہنا چاہئے۔

مسٹر سنہا نے سمجھایا۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کی ہیئت کذائی ہی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس ہیئت میں تم لوگوں نے اسے اتنے دنوں تک برداشت کرلیا۔ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔ جانوروں کے

ساتھ نباہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ تم لوگوں کی عالی ظرفی تھی جس نے اس مردود کو گھر میں جگہ دی۔ یہ تو برص کے مریض سے بھی زیادہ مہلک اور موذی ہے۔ لڑکیوں کی جانب سے اطمینان رکھو۔ چند روز ملول اور افسردہ رہیں گی۔ اور پھر معمول پر آجائیں گی۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے منسلک دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیونکہ ان کے خیال میں اشوک کی حیثیت لاش کی سی تھی۔ مسٹر سنہا نے طبلہ لے لیا اور اس کی بیوی نے ہارمونیم پر خوشی کے گیت گانے لگی۔ دونوں کا موڈ بہت ہی خوشگوار تھا۔ چند گانے کے بعد مسٹر سنہا نے اپنی جیب سے شیمپین کی بوتل نکالی جام و سبو کا دور چلنے لگا۔ شراب کی مہک پورے کمرے میں پھیل گئی۔ اس بو کو اشوک نے بھی محسوس کیا۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھ کھولی۔ پورا کمرہ اس کی نگاہ کی زد میں تھا وہ جملہ حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی مسٹر سنہا کو پلا رہی تھی۔ اور خود بھی پی رہی تھی۔ دونوں نشے میں دھت ہو کر بستر پر آگئے۔ دونوں کا جسم لباس کی قید سے آزاد ہو گیا۔ بہیمیت کا کھیل شروع ہوا۔ اور پھر ــــــ نشہ اترا تو سورج ڈھل چکا تھا لڑکیوں کی آمد کا وقت ہو رہا تھا۔ مسٹر سنہا نے غسل کیا لباس پہنا، بالوں کو درست کیا۔ اور پھر دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کی بیوی جانے کے لئے اصرار کرتی رہی لیکن وہ نہیں رکا۔ اس کی بیوی نے اپنے کپڑوں کو زیب تن کیا۔ بستر کی شکن آلود چادر کو درست کیا۔ شراب کی بوتل کھڑکی سے ہاتھ نکال کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اور وہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی اس نے اشوک کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ دونوں دروازے بند ہو چکے تھے۔ اشوک نے آنکھیں کھول دیں معمول کے مطابق وہ جنبش کرنے لگا۔ اور اطمینان سے سانسیں لینے لگا۔ رشتے کی سفاکی اور عورت کی بدلتی ہوئی ہیئت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ عورت کی گراوٹ اور بے مایہ پن کا وہ چشم دید گواہ تھا۔ اپنی بیوی کا دوسرا روپ دیکھ کر اسے ہر شئے سے نفرت ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور خون پی کر رہ گیا۔ صرف اس لئے کہ گذشتہ حادثے میں وہ بھی زخمی ہوا تھا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ مسٹر سنہا کے تعلقات کا اسے علم نہیں تھا۔ قلب ماہیت کے بعد اسے علم ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت تیزابی لہریں اٹھتی رہتی۔ وہ ہر وقت زہریلے خیالات میں الجھا رہتا۔ اس کی بیوی کے الفاظ شیشے کی طرح اس کے خون میں چبھ رہے تھے۔ بیوی نے جس طرح اسے ٹھوکر لگائی تھی۔ وہ انتہائی تکلیف دہ انداز تھا۔ حالات اس کے برعکس تھے۔ اسی طرح وہ تلخ گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کے جی میں آیا تھا کہ اچھل کر دونوں کو دبوچ لے۔ دونوں کی گردن مروڑ دے۔ دونوں کا چہرہ لہولہان کر دے دونوں کے جسم کا ایک ایک عضو مفلوج کر دے۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اندر ہی اندر کسمسا کر رہ گیا۔ نادانی کو وہ دیکھ رہا تھا۔ اس بات سے اسے اطمینان ہوا کہ مردے کا رول اس نے کامیابی سے ادا کیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔ کمرے کے اندر دائرہ نما انداز سے چکر لگانے لگا اس نے مردہ بلی کو کئی بار دیکھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا چہرہ خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ اسے بھی مردار کے چہرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ موت کا چہرہ کتنا بھیانک ہے زندگی کے رخصت ہوتے ہی جسم کتنی تیزی سے رنگ

بدلتا گھٹتا ہے۔ کائنات میں کوئی چیز بھی اپنی نہیں ہے۔
یہ جسم بھی اپنا نہیں ہے اس پر بھی اختیار نہیں ہے۔
رفتار کی زد میں یہ بھی گھستا رہتا ہے۔ اس کی تغیراتی
کیفیت ایک نہیں رہ سکتی۔ زندگی کا اصلی چہرہ کتنا
بھیانک ہے۔ اس کی اصلی ہیئت انتہائی ڈراؤنی ہے
انسان حیوان بن کر سب کچھ کھو دیتا ہے۔ مٹا ہوا چہرہ
تغیر پذیر ہیئت، منحنی جسمانی اعضا، زنگ آلود ذہن،
ناپائیدار رشتے، فرضی کہانیاں، فرضی انسان یہ سب
استقامت سے محروم ہے۔ دھرتی آکاش کو چومے، یہ
صرف نظر کا دھوکا ہے۔ ہر طرف خود فریبی کے جذبات ہیں
کوئی انسان کسی کا نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی احتیاجات
اور مقاصد کے زد میں ایک دوسرے کے قریب آتا ہے
تصنع اور بناوٹ کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔ ہر موجود
کا مخصوص دائرہ ہے یہی دائرہ اسے اپنی گرفت میں لیتا
ہے۔ اس کی تعمیل و تشکیل کے لئے وہ مختلف ناٹک رچاتا
ہے۔ اپنائیت کا سوانگ رچاتا ہے۔ ہر موجود رشتے کی
آڑ میں ایک دوسرے کو فریب دے رہا ہے۔ اپنائیت
صرف وہم ہے۔ حقیقت کا عرفان بہت مشکل ہے۔ پتھر کے
ٹکرانے سے چنگاری پھوٹتی ہے۔ پتھر کے سینے میں کیا ہے
اس کا علم کسی کو نہیں۔ انسان مٹی کے ڈھیر پر ایستادہ
ہے لیکن وہ اسے چٹان سے بھی زیادہ مضبوط گمان کر
رہا ہے۔ یہ کیسی خود فریبی ہے۔ عورت کا وجود تو سراسر
فریب پر واقع ہے۔ اس کی بنیاد پر جو بھی رشتے استوار
ہوتے ہیں۔ اس کا کھوکھلا پن بہت کم لوگوں کو محسوس ہوتا
ہے۔ جو بھی اس کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ یہ اسی کے
ہونے کا دعوی کرتی ہے۔ نسوانیت کی بنیاد پر قائم ہونے
والے رشتے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ عورت
پر اعتماد و بھروسہ کرنا سب سے بڑی حماقت ہے۔

عورت کی ہی وجہ سے وہ اس ہیئت کا شکار ہوا ہے۔
وہ اپنے وجود کی معنویت سے محروم ہو چکا ہے۔ اگر یہ
عورت اس کی زندگی میں داخل نہ ہوتی تو شاید اس کا
یہ حشر نہ ہوتا۔ اس میں مسٹر سنہا اور اس کی بیوی ہی کا
ہاتھ ہے۔ کس طرح کے کیمیاوی اجزا کھلائے گئے، میں جس
کے باعث وہ انسان سے حیوان کے ہیولی میں تبدیل ہو گیا
ہے۔ ان لوگوں کو شاید یہ گمان ہے کہ یہ ہوش و حواس سے
بھی عاری ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، فہم
و ادراک جوں کا توں ہے۔ حیوان کے خول میں انسان کا دماغ
سانسیں لے رہا ہے۔ انسان پر حیوانیت غالب ہے۔
———— لیکن ———— لیکن اس
وقت اس کی بیوی بے حد شاداں و فرحاں ہے۔ خوشی
میں وہ گنگنا رہی ہے۔ وہ لڑکیوں کو اس کی موت
موت کی خبر سنائے گی۔ اور اسے مردہ سمجھ کر دکھانے
کے لئے لائے گی۔ اس کی موت خوشی کا پیش خیمہ ہے۔
یہی مزاج لڑکیوں پر غالب آگیا تو ان کی بھی زندگی تباہ
و برباد ہو جائے گی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی
نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے اس عورت کی دوہری شخصیت
کا علم ہوتا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔ اب اس کی نسل پر
ایک نئی روایت قائم ہوگی۔ جو ستی ساوتری کی مخالف
سمت کی جانب جائے گی۔ زندگی کی بے ثباتی اور بے
اطمینانی کے اور بھی اسباب رونما ہوں گے۔ انسانی
سماج میں جبلت اور فطرت کے نئے پہلو سامنے آئیں گے
ماہرین نفسیات کے لئے نئے مسائل ہیں۔ درخت کے شاخ
ننگی ہو گئی ہے۔ پتیاں بے آبرو ہو چکی ہیں۔ ہوا کے
رخ پر انہیں جنبش کرنی ہے۔ ان کی حیات کی باگ ڈور
کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔
چند چکر لگانے کے بعد وہ مردہ بلی کے قریب

آکر بیٹھ گیا۔ مردہ جانور اور زہر آلود کھانے کو دیکھ کر عجیب و غریب کیفیت اس پر طاری ہو جاتی۔ وہ مضطرب اور پریشان ہو جاتا۔ روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ قدرت نے اسے بچا لیا۔ وہ بال بال بچ گیا۔ موت و حیات کے درمیان کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ ابھی ابھی وہ موت کی گود میں ہوتا۔ زہر کی زد میں آکر وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ______

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ روشنی اندھیرے کے سمت مائل تھی۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلے کی جانب مائل تھے۔ دن ڈیوٹی آف کرنے والے مزدور چوراہے پر جمع تھے۔ چائے کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں پر محو گفتگو تھے۔ ورک شاپ کی مشین بند تھی۔ شیڈ سے دھوئیں کے مرغولے باہر آ رہے تھے۔ بلندی پر ایک جٹ پرواز کر رہا تھا۔ نیلگوں آسمان پہ ڈوبتے سورج کی کرنیں کانپ رہی تھیں۔ کچھ مزدور دو غول در غول ایستادہ تھے۔ اور آنے جانے والی گاڑیوں پر رائے زنی کر رہے تھے۔ لوہے کے اوزاروں پر چلنے والی گاڑی ان کی شب و روز کی مالک تھی۔ سبھی ذہنی طور پر آہنی آلات کے اسیر تھے۔ حیات ایک نقطے پر مسعود ہو چکی تھی۔ دور جنگل کی روشنی کبھی نہیں دیکھی۔ کسی نے ریل کی بات کی اور سب اس راہ پر چل پڑے۔ ایک مرکز، مختلف قطار ! ______

معاً ورک شاپ سے سائرن کی آواز بلند ہوئی۔ سائرن کی آواز سات بار بلند ہوئی۔ اس علامت کی تفہیم سے وہ واقف تھا۔ حادثے کی نوعیت اس کے ذہن میں آگئی۔ کوئی پسنجر ٹرین حادثے کی لپیٹ میں آگئی ہے۔ اس نوعیت کے حادثے میں لوگوں کی موت واقع ہوتی ہے۔ بہت سے مسافر زخمی ہوتے ہیں۔ حکام جو امدادی کام کا سامان لے کر پہونچتے ہیں۔ ان کی سفاکیاں قابل دید ہوتی ہیں۔ جائے وقوع پر مال لوٹنے والوں کا اژدہام ہوتا ہے زخمیوں کی چیخ پکار بلند ہوتی ہے۔ الگ الگ آوازیں آپس میں تحلیل ہو کر شور بن جاتی ہے۔ ایک انتشار پھیل جاتا ہے فضا مکدر ہو جاتی ہے ساکت و جامد اشیا انسان کے اندھے اور سفاک کھیل کا تماشہ دیکھتی ہے۔ ہر سمت حادثے کا اثر پھیل جاتا ہے۔ خون کا رنگ رفتہ رفتہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ حادثے کی جگہ رنگ و روپ بدلنے لگتی ہے۔ گاڑی جوں کہ توں دوڑنے لگتی ہے۔ حادثے کا ہر نشان مٹ جاتا ہے۔ دھرتی اپنے محور پر گھومنے لگتی ہے حادثے کا ہر نشان مٹ جاتا ہے ٹوٹنے والے درختوں کی پتیاں گرتی رہتی ہیں۔ نئی پتیاں جنم لیتی ہیں۔ درخت دھرتی پر لہراتا ہے۔ دھرتی کا سینہ آباد رہتا ہے۔ فنا ہونے والوں کے نشانات معدوم ہو جاتے ہیں نئے پودے جنم لیتے ہیں۔ دھرتی کا گود ہرا بھرا رہتا ہے۔ ہری بھری دھرتی اور آباد کاری ______

باب سوئم

اشوک کی زندگی کا یہ دور انتہائی زہر آلود تھا حیات کی مغلوجیت سے اس کے ذہنی اعصاب اس قدر معتوب نہیں ہوئے تھے۔ جس قدر بیوی کے سفاکانہ رویے سے ہو رہی تھی۔ اس کی حیات کا ایک ایک لمحہ زہر آلود تھا۔ کھانے میں زہر کی آمیزش سے وہ انتہائی مضطرب و پریشان تھا۔ مختلف نوعیت کے شکوک و شبہات اس کے ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔ ایسی حرکت کی اسے قطعی امید نہیں تھی۔ اب وہ اس گھر کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ جبھی اس کے کھانے میں زہر کی آمیزش کی گئی تھی۔ سنگیتا کے ٹیچر کے تعلقات پر وہ اندھوں کی طرح کھول ہی رہا تھا کہ اس کے اعصاب پر ایک اور حادثے

کا اثر مرتسم ہوا۔ اسے بیوی کے اس حد تک گراوٹ کے قطعی امید نہیں تھی۔ وہ گھر کے بدلے ہوئے حالات میں اپنی حیثیت کو ٹٹول رہا تھا۔ اور اپنی ذات کی بے بناہی کی تصورات میں گم صم تھا۔ اس کا ذہن مختلف زاویے سے سوچ و فکر کی جانب مائل تھا۔ اس کے وجود اور ٹھوکر زدہ پتھر کے وجود میں مطلق امتیاز نہ تھا۔ حیاتی اعتبار سے اشوک ہر روز ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ یہ ٹھوکریں اس کے دماغ میں کاری ضرب لگا رہی تھیں۔ کرب آلود تلخی کا احساس شدید سے شدید تر ہو رہا تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے وجود پر تلملا رہا تھا۔ وہ اپنے وجود کی معنویت سے محروم ہو چکا تھا اس کا وجود کھوٹے سکے کے مانند ہو چکا تھا۔

باورچی خانے کے چولہے سے کچے کوئلے کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ کوئلے کے جلنے کی بو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ کوئلے کے چٹخنے کی آواز فضا میں ابھرتی اور ڈوب جاتی۔ نل پر کوئی برتن صاف کر رہا تھا۔ برتن کی کھنکناہٹ کی آواز کمرے میں آ رہی تھی۔ دھواں باورچی خانے کی چمنی سے نکل رہا تھا کوئلے کی بو فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اس بو کو اشوک شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اندرون کمرہ وہ حسب معمول بیٹھا ہوا تھا۔ مردہ بلی کو دیکھ اسے الرجی ہو رہی تھی۔ عجیب و غریب دہشت ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر سے ایک ہی منظر دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ اسی طرح تھا، کمرہ جوں کا توں تھا۔ در و دیوار اسی طرح ایستادہ تھے۔ بلی کی زبان اسی طرح باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ اس مکروہ نظارے سے اوب چکا تھا وہ خاموشی سے اٹھا اور دریچے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا سامنے جھاما رکیٹ کا چوراہا صاف دکھائی دے رہا تھا چوراہے سے ریلوے ملازمین کی جملہ آبادی چار حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ شمال کی جانب ریلوے برج اور اسٹیشن تھا۔ جہاں آنے جانے والوں مسافروں کی بھیڑ رہا کرتی ہے

ڈکٹ چلانے والے غول در غول بیٹھے جوا کھیلتے رہتے ہیں۔ چائے اور پان کی دو کانیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ جیب کترے اور چور اچکے ان دوکانوں پر جمے رہتے ہیں۔ یہاں کے ماحول میں ہر وقت ٹنشن برقرار رہتا ہے۔

جنوب کی شاہراہ پرانی بازار کی جانب جاتی ہے جہاں سیٹھ، ساہوکار آباد ہیں۔ وہ ریلوے ملازمین کی بدولت لاکھوں کماتے ہیں۔ انہیں کو آنکھیں دکھاتے ہیں اور احسان جتاتے ہیں۔ رقم کی ادائیگی میں ذرا سی تاخیر ہو جائے تو بڑی سفاکی سے پیش آتے ہیں۔ دروازوں پر بے تحاشہ گالیاں دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں روپیہ ہی سب کچھ ہے۔ ان کا مطمح نظر صرف حصول زر ہے انسان اور انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس محلے کے انسان کی جبلت بالکل جداگانہ ہے۔

مشرق کی جانب جانے والی شاہراہ لوکو بازار، نیو بازار، بی، این، آر چاتک سے ہوتی ہوئی جی ٹی روڈ میں مل جاتی ہے۔ بشیر شاہ کی روح آج بھی اس شاہراہ پر نظر آتی ہے۔ اس علاقے کی مسلم آبادی کا درمیانی تصادم قابل دید ہوتا ہے۔ مسجد اور بیرون مسجد، وہابی اور سنی کے مسائل پر ہمیشہ دست گریباں رہتے ہیں۔ مولوی کی تقریر کی مختلف تاویلیں بیان کی جاتی ہیں۔ چائے خانوں میں رائے زنی ہو رہتی ہے۔ مذہب کی صحیح روح اس آبادی سے رخصت ہو چکی ہے۔ اور اب اس کی بے بنیاد باتوں پر جنگ و جدال ہوتا رہتا ہے۔

مغرب کی جانب سکیٹ لائن کی آبادی ہے۔ اشوک گہری نگاہ سے چوراہے کی جانب دیکھ رہا تھا اس کا ذہن مختلف خیالات کی جانب دوڑ رہا تھا۔ آخر کار اس کی نگاہیں کھڑکی سے چند فرلانگ کی دوری پر تعمیر شدہ رننگ روم کے درختوں پر مرکوز ہو گئیں۔ درخت کی شاخوں پر آفتاب

کی علامتی کرنیں لرز رہی تھیں۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ اشوک
کو بھوک شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ صبح سے اس نے
کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ دماغ کے ساتھ ساتھ پیٹ میں بھی آگ
لگی ہوئی تھی۔ اس کے قلب و جاں میں زبردست بے چینی پھیل
رہی تھی۔ دفعتاً بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھ گیا
لڑکیوں کی آمد کا وقت ہو چکا ہے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر فرش
پر بیٹھ گیا۔ اس کا قیاس صحیح تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ
لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ اس کی بیوی موت کی خبر سنا رہی
تھی۔ یہ خبر سنتے ہی لڑکیاں چونک پڑیں۔ وہ تیزی سے اشوک
کے کمرے میں آئیں۔ انہیں کے ہمراہ اشوک کی بیوی بھی آئی۔
کمرے کا منظر جوں کا توں تھا۔ بلی کی لاش ساکت و جامد ہو
چکی تھی۔ زہر آلود کھانا اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ فرق تھا تو صرف
اتنا کہ اشوک زندہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر آرام کر رہا تھا
اس کی بیوی اپنے شوہر کو زندہ دیکھ کر انگشت بدنداں تھی
اس کے ذہنی اعصاب پر بجلی گر پڑی۔ ہیبت زدہ اور
حیران زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اشوک کی
خوفناک آنکھیں اس کے سراپا پر مرکوز تھیں۔ اس کی آرائش
و زیبائش کو وہ گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر
پاؤڈر کی تہہ، آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لپ اسٹک،
ماتھے پر بندیا، زلفوں کی آرائش، ہاتھوں میں مہندی،
جسم میں امریکن جارجٹ کی ساڑی اور بلاؤز، پاؤں میں
گہرے سرخ رنگ کی لکیر ———— لڑکیاں
اسکول و کالج سے فوراً ہی لوٹی تھیں۔ اس لئے ان کے چہرے
پر اضمحلال تھا۔ تھکاوٹ کے آثار تھے۔ لیکن اشوک کو زندہ
دیکھ کر ان کی آنکھوں میں مسرت و شادمانی کی غیر معمولی چمک
آگئی۔ دونوں لڑکیوں نے ماں کو پرمعنی نگاہوں سے دیکھا
ماں کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے ذہن میں زبردست
اضطراب تھا۔ لیکن وہ اپنے چہرے سے عیاں نہیں ہونے
دینا چاہتی تھی۔ پیشانی کی سلوٹوں سے ہلکی ہلکی سی نشان
دہی ہوتی تھی۔ اس نے فوراً گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ لڑکیوں
کو سمجھایا کہ اشوک اس طرح سویا ہوا تھا کہ اسے موت کا گمان
ہوا تھا۔ اور پھر یہ بھی دیکھنا تھا کہ تم دونوں کو اپنے باپ
سے کتنی محبت ہے۔ انجنا اس کے چہرے کو دیکھ کر تاڑ گئی۔
اس کی چھٹی حس نے ساری بات معلوم کر لی تھی۔ اس کی آنکھیں
آبدیدہ ہو گئیں۔ وہ اشوک کے قریب گئی۔ اس کے سر پر ہاتھ
رکھا۔ اور پھر زور زور سے سسکنے لگی۔ شوبھا باہر چلی گئی
اس نے خادمہ کے معرفت مہترانی کو بلوایا۔ مہترانی نے کمرہ کو
صاف کیا اور مردہ بلی کو اٹھا کر لے گئی۔ گھر کے ماحول پر ایک
گہری خاموشی پھیل گئی۔ سبھی کی نگاہوں میں ایک تجسس
پنہاں تھا۔ اس سے ایک نئی معنویت ٹپک رہی تھی۔ لڑکیوں
کی نگاہوں سے بچ کر اس کے ذہن میں ایک ہی سوال ناگن کی
طرح سر ابھار رہا تھا ———— یہ سوال اس کے رگ
احساس میں تیزی سے چبھ رہا تھا۔ اشوک اتنی تیز زہر کی
زد میں آکر کیسے بچ گیا۔؟ کیا زہر میں ملاوٹ تھی؟ اتنی جلدی
زہر کا اثر کیسے زائل ہو گیا۔؟ اس نے مردہ حالت میں خود ہی
دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں ——
———— وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی ——
———— یہ کمینہ نہ مرتا ہے اور نہ ہم سب کو چین
سے زندہ رہنے دیتا ہے اس نے سبھی کا آرام و سکون
زہر آلود کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم سب کا سکون سدا
کے لئے سلب ہو چکا ہے ———— لیکن ————
اب کیا ہو سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

شام کا سرمئی آنچل پھیل چکا تھا۔ اس لئے سبھی
کمرے میں تیز روشنی کا بلب آن تھا۔ سارے دروازے
کھلے ہوئے تھے۔ اشوک نے تیز روشنی میں ملحق کمرے کی
جانب دیکھا۔ ہر شئے بالکل صاف نظر آ رہی تھی کمرے

کی سفید دیوار پر کلنڈر آویزاں تھا۔ کلنڈر کی شبیہ میں شیر ندی کے کنارے پانی میں منہ ڈالے ہرن پر حملہ آور ہے ایسا لگ رہا تھا کہ ہرن کی چیخ کلنڈر سے باہر آ رہی ہے ہرن کا خون، پانی اور خشکی پہ گرا ہے۔ ندی کے پار ڈوبنے والا سورج لہولہان ہے۔ وہ خون آلود مناظر کی تاب نہ لاسکا اور اس کا چوتھائی حصہ منہ چھپا سکا ہے۔ سبزہ زار لرز اٹھا ہے جنگلی درختوں اور پودوں کا وجود کانپ اٹھا ہے ندی کا پانی سرخ ہو چکا ہے۔ مناظر میں خون ہی خون ہے ———

کلنڈر کے نیچے ٹیبل ہے۔ اس ٹیبل پر ریڈیو کم ٹیپ کا سیٹ ہے۔ سیٹ آن ہے۔ بنگالی فلم کی میوزک بج رہی ہے آواز دھیمی ہے۔ نغمہ و سرور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ میز کے قریب کرسی پر اس کی بیوی بیٹھی ہے۔ میز پہ رکھے ہوئے فریم کو دیکھ رہی ہے جس میں تصویر ہے۔ یہاں پر اس کی شادی کی تقریب کی تصویر تھی۔ اس تصویر میں اس کی بیوی شرمسار ایستادہ تھی۔ اس نے تصویر کی جانب گہری نگاہ سے دیکھا۔ تو چونک پڑا۔ فریم وہی تھا لیکن تصویر دوسری تھی۔ اب وہ اس کی بجائے مسٹر سنہا کی بانہوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ اور دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ تصویر سے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے دونوں جیون ساتھی ہیں۔ اور جنم جنم کے پیاسے ہیں۔ اس تصویر پر اس کی نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دونوں اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کی مفلوجیت پر طنز کر رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ پر جھنجھلا گیا۔ اس کے اعصاب پر زبردست تناؤ پیدا ہوا۔ اس کے ہوش و حواس پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہوئی۔ اس کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔ وہ اپنے آپ پر تلملا اٹھا۔ چند گھنٹے قبل وہ مسٹر سنہا کو اس کے ساتھ ٹہلتے کرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ اس کے بڑبڑاتے ہوئے الفاظ بھی سن چکا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں زہرآلود تلخی پھیل گئی۔ اس کے جسم و جاں میں اضطرابی لہریں دوڑنے لگیں۔ زندگی میں وہ پہلی اور آخری بار شکست خوردگی کے احساس سے دوچار ہوا۔ زندگی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا۔ جو ابھی تک اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ وہ ابھی تک مایوسی اور ناکامی کے احساس سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ ہر حال میں وہ زندگی سے نبرد آزما تھا لیکن اس وقت وہ مایوسی کا شکار ہو رہا تھا۔ زندگی کا وہ حوصلہ جو قلب ماہیت کے عالم میں اس کے اندر تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ سرد ہو رہا تھا۔ حیات کی بے ثباتی اس کے سامنے آ رہی تھی۔ وقت اور رشتے کس قدر سفاک ہیں۔ عورت کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھ کے دیدے میں ہر جھلملانے والا چہرہ اسے اپنا سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو فریب دیتا ہے۔ خود فریبی مرد کی قسمت ہے۔ اور خود نمائی عورت کی فطرت ہے۔ وہ کسی کی نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنے وجود کی ہوتی ہے۔ اپنی ذات سے ہٹ کر اس کے پاس کچھ بھی نہیں ———

وہ مختلف زاویئے سے سوچتا رہا۔ اور زندگی کا بھیانک روپ اس کے سامنے بحر بیکراں کی طرح پھیلتا گیا اس کی آنکھوں سے لہو ٹپکتا رہا۔ رات کا کھانا اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔ کھانے کو اس نے سونگھا تک نہیں کھانا اس کے سامنے بتوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ وہ بظاہر چپ چاپ پڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کا ذہن شدید بے چینی کا شکار تھا۔ اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے پورے جسم میں سوئی چبھ رہی ہو۔ شدید کرب سے وہ مضطرب تھا۔ اس اضطراب و کرب میں نصف شب گذر گئی۔ بیوی اور لڑکیاں اپنے اپنے بستر پر محو خواب تھیں۔

فلیٹ پہ مکمل سکوت طاری تھا۔ کالونی کے آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آتی تو پرسکون فضا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ وہ فرطِ اضطراب سے اٹھا اور دریچے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ سارے مناظر ساکت تھے۔ ان مناظر کو وہ برسوں سے دیکھ رہا تھا۔ ساری عمارتیں جانی پہچانی تھیں۔ ریت سڑک۔ پل۔ اور مرکری ٹیوب سے اس کی آنکھیں مانوس تھیں۔ سڑک بیوہ کی مانگ کی طرح سنسان و ویران تھی۔ ہاں ایک عورت سنسان سڑک پر نظر آئی۔ وہ سفید ساڑی سفید بلاؤز، اور پرس لٹکائے جا رہی تھی۔ مرکری کی تیز روشنی میں وہ بڑی حسین لگ رہی تھی اشوک اسے دیکھ کر گم گشتہ یادوں میں کھو گیا۔ اسے کالج فرینڈ ارمیلا کی یاد آگئی۔ اس عورت کی شبیہ اس سے بہت ملتی جلتی تھی۔ وہی چال، وہی دراز گیسو وہی جسم اور وہی انداز رفتار ________ اس کی شبیہہ دل و دماغ میں دوڑ گئی۔ رومانی عہد و پیمان ذہن میں عود کر آئے۔ اس کی جدائی کی کسک کی لذت سے بھی دوچار ہوا۔ اس کے کرب آلود کیفیت میں مزید لرزا کی سرایت کر گئی۔ وہ دریچے سے ہٹ گیا۔ اس تلخ لذت میں اسے کیف و سرور بھی حاصل ہوا۔ گم گشتہ یادوں کے تاثر سے اسے قدرے سکون حاصل ہوا لیکن اس کی جدائی کا سماں آنکھوں میں آ گیا ________ اشک آلود پلکیں۔ کجھا کجھا سا چہرہ، کھوئی کھوئی سی باتیں۔ غم و یاس میں ڈوبی ہوئی لڑکی ________ وہ تھکا ماندہ سا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اسی فرش پر لیٹ گیا۔

دو بجے شب میں کال بیل کی آواز آئی۔ وہ گراؤنڈ فلور کے بیل ڈرائیور کو آواز دے رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دروازے کی کنڈی بھی بجا رہا تھا۔ شاید ڈیوٹی کے لئے اس کی کال تھی۔ اس لئے کال بوائے کو زور آواز دیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ کال بک پر دستخط کیا کال مین چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اور ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ رات کے سناٹے میں اس نے ہر آواز سنی۔ ریلوے کی ملازمت میں انسان مشین ہو جاتا ہے۔ آرام و راحت کے لئے ترس جاتا ہے۔ آرام و سکون کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔ کس وقت کال مین آجائے کوئی ٹھیک نہیں۔ اشوک کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس کے دماغ کے ساتھ ساتھ پیٹ بھی جل رہا تھا۔ اور اندرونی کرب سے بے تاب تھا وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ چوپائے کی طرح چلتا ہوا کھڑکی پر آیا۔ اس نے سوچا شاید باہر کی مناظر کی دیدار سے کچھ سکون حاصل ہو جائے۔ اسی مقصد کے لئے وہ بیرونی مناظر کی طرف دیکھنے لگا۔ منظر جوں کا توں تھا۔ اس مناظر میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ بے کیفی اس کے ذہن میں بس گئی۔ مگر رکشے کی چند سواریاں سے گذریں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ پہلے رکشے پر پان دوکان والا اپنی کی ٹوکریاں لئے جا رہا تھا۔ دوسرے رکشے پر انی بازار کا سیٹھ تھا جس کی راشن کی دوکان تھی۔ اکثر ریلوے ملازمین اسی دوکان سے راشن خریدتے ہیں۔ اور ماہانہ حساب کرتے ہیں۔ آخری رکشے پر کوئی فیملی تھی جس کی وہ شناخت نہیں کرسکا۔ دونوں جسمانی لمس میں محو تھے عورت کسی بات پر بار بار ہنس رہی تھی۔ سواریاں گذر گئیں تو علی حالہ سڑک ویران ہو گئی۔ دو ایک آوارہ کتے بھونکتے ہوئے ایک جانب سے دوسری جانب دوڑتے اور آپس میں ایک دوسرے پر غراتے۔ کبھی ایک دوسرے کو کاٹنے کے لئے جھپٹ جاتے۔ فریقین میں سے کسی ایک کی شکست ہو جاتی۔ اور وہ کائیں کائیں کرتا ہوا [illegible]

جاتا۔ فاتح کا دم جھاڑتا ہوا سڑک پر گھومنے لگتا۔
اس گستاخی سے چند لمحے کے لئے سکوت درہم برہم ہو جاتا
اور پھر گہری خاموشی چاروں طرف پھیل جاتی۔ اور
سبھی آوازیں اسی طرح ڈوب جاتیں۔ جس طرح حلق
میں کمزور و ناتواں طبقے کی آواز ڈوب جاتی ہے۔

اس کے ذہن میں زبردست آتشیں لہریں اٹھ
رہی تھیں۔ اس کے پورے جسم میں زبردست رعشہ
طاری تھا۔ اس کا سارا جسم عرق آلود ہو گیا۔ وہ فرش
پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ نصف گھنٹے تک اس
پر یہی کیفیت طاری رہی۔ شدید اضطراب و کرب
کے عالم میں زبردست چیخ اس کے گلے سے نکلی۔ مفلوجیت
کے بعد یہ اس کی پہلی آواز تھی۔ جو اس کے حلق سے باہر
آئی تھی۔ اس کی فلک شگاف چیخ سے فلیٹ گونج اٹھا
اشوک کو دراصل ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ گویا کوئی اس
کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس کے چیخنے کی آواز بہت دور تک
گئی۔ فلیٹ کے آس پاس کے رہنے والے دوڑ پڑے
دستک دینے والوں کی آوازیں آنے لگیں۔ انجانے
دروازہ کھولا۔ شب کے آخری حصے میں فلیٹ آس پاس
کے لوگوں سے بھر گیا۔ سبھی اشوک کو دیکھنے کے لئے بے
تاب تھے۔ اشوک کا پورا وجود زلزلہ آلود دھرتی کی طرح
کانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ گہرا سرخ تھا۔ اس کی آنکھیں
ابل پڑی تھیں۔ اس کے متحرک ہونٹوں سے آہستہ آہستہ
آواز آ رہی تھی۔ ——— میں ——— میں
فرار ہونا چاہتا ہوں ——— سکون چاہتا ہوں
——— زہر آلود سماج کے رشتے ناپاک ہیں
——— یہ کائنات بے معنی ہے ———
ہر طرف دھوکا ہے ——— ہر چہرہ نقلی ہے
——— ہر آواز جھوٹی ہے ——— ———

ہر خون پانی ہے ——— اب اس دھرتی پر کچھ
بھی اپنا نہیں ——— زہر ہی زہر ہے ———
عالم مشین نے سب کچھ زہر آلود کر دیا ہے ———
اور ——— میری بیوی زہر ہے ———
سماج کی زہریلی ناگن ہے ——— تاریک راہوں
کے مسافر آنکھیں کھولو ——— دریچے اور
دروازے پر مکروہ چہرہ آویزاں ہے ———
تاریکی میں نقیب کی آواز گونج رہی ہے ———
انسان کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں ———
سارے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ ایک ایک اعضا تلم ہو چکے
ہیں ——— وقت بڑا سفاک ہے۔ تیرا ہاتھ ہی
مجھے بچا سکتا ہے ——— اور ——— اور

———

اس کی آواز حلق کی گود میں سو گئی۔ اس کے
متحرک ہونٹ آہستہ آہستہ ساکت ہو گئے۔ اس
کا سر فرش پر لڑھک گیا۔ اس کی روح قفس عنصری
سے پرواز کر گئی۔ وہ مکمل انسان کی طرح ساکت و
جامد فرش پر پڑا ہوا تھا۔ حاضرین حیرت زدہ تھے
آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر فرد یہی غور کرنے
لگا کہ وہ دوبارہ کب انسانی روپ میں آیا۔؟ اور یہ بات
کیوں صیغۂ راز میں رکھا گیا۔؟ ایسا کیوں ہوا؟ سوالیہ
علامت ہر چہرے پر پھیلنے لگی۔ ہر طرف رائے زنی ہونے
لگی۔ کیا اشوک کی زندگی کی تباہی میں کسی تیسرے کا ہاتھ
ہے۔ ———

لڑکیاں اور اس کی بیوی بالکل خاموش تھیں
ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا
تھا وہ غم کے اس منزل پر ہیں۔ جہاں آنسو خشک ہو
جاتے ہیں۔ یا پھر اشوک یہ موت ان کی زندگی میں

ی وقعت نہیں رکھتی۔ ان کی نگاہ میں اشوک اسی
وقت مرچکا تھا جب اس پہ قلب ماہیت کا دورہ
ا تھا۔

علی الصباح ریلوے سے لکڑی کی سپلائی آئی۔
ت کے ٹرکمنے لکڑیوں کو جمنا ندی کے کنارے
پہنچا دیا۔ اشوک کی موت کی خبر چاروں طرف پھیل
تھی۔ ریلوے ملازمین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ صبح
یرے اس کا جنازہ نکلا۔ جنازہ آگے آگے تھا۔
لواروں کا جلوس پشت پر تھا۔ لاش ندی کے
رے پشت پر رکھی گئی۔ تیل اور جوٹ ریلوے نے
ہلالی کیا تھا۔ اشوک کی اولاد میں صرف بیٹی تھی
سے ریلوے کے سیکوریٹی آفیسر کے نمائندے نے
کو آگ لگائی۔ دھرتی کی آگ بلند ہوئی تو سورج
رہ سرخ ہوگیا۔ ارض و سماں کے درمیان سوگواری
گئی۔ آسمان پر خون کے دھبے پھیل گئے۔ بادلوں
رہ لہولہان ہوگیا●

بقیہ . آس پاس

اری کنٹرول ہے، کنٹرول تو روٹی پر ہونا چاہیے
پر ہونا چاہیے، ہم تو وزیر خزانہ کی بات اسی
یقین کریں گے۔ جب وہ عوام الناس کو روٹی اور
اس قیمت پر فراہم کرادیں گے جو قیمت ۱۹۶۰ کی
نس میں موجود ہے۔ ●

—— ● ——

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

(رول نمبر ۸ دیکھیں)

مقام اشاعت	:	پرانی گیا، بہار
میعاد اشاعت	:	ماہنامہ
پرنٹر و پبلشر و مالک	:	کلام حیدری
قومیت	:	ہندوستانی
ایڈیٹر	:	کلام حیدری
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	پرانی گیا (بہار)

میں کلام حیدری مالک ماہنامہ آہنگ گیا اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاعات کے مطابق درست و صحیح ہیں۔ دستخط کلام حیدری

نسترن جہاں (امریکہ)

پیچھے مڑ کے دیکھا تو پتھر کے ہو جاؤ گے

ہم اپنی مصروف زندگی میں
وہ چند لمحے کہاں سے لائیں
وہ چند لمحے کہ جن میں اپنے
اداس دل کی دھڑکتی راہوں کو
چند مانوس آہٹیں دیں
وہ چند لمحے کہاں سے لائیں
کہ پھر محبت کی نرم چھاؤں میں بیٹھ جائیں
اور اپنے آنسو ٹپک ٹپک کر
تڑپ تڑپ کر
حساب دیں ان اذیتوں کا
کہ جن کی شدت سے لمحہ لمحہ لہو لہان تھا
کہ جن کو عزم اور حوصلے سے
نہایت خوش سلیقگی سے
نگاہ و قلب و جگر میں محفوظ ہم نے رکھا
حساب دیں ان ریاضتوں کا

جو ایک ان جیسے ساعتوں میں
عذاب کی سی رفاقتوں کا
جو ہم نے مانگیں نہ ہم نے چاہیں
مگر ہمارا نصیب ٹھہریں جو

تمہاری راہوں سے آج میرا گزر نہیں ہے
مگر یہ کیا ہے
تمہارے احساس کی فضائیں
مری محبت کی سبز و شاداب خوشبوئیں ہیں
مرے زمان و مکاں سے تم کو نہیں ہے نسبت
مگر یہ کیا ہے
مرے زمان و مکاں میں ہر سو
تمہاری چاہت کی روح پرور صدائیں ہیں
مگر میری جان

تمہاری مصروف زندگی میں
ہماری مصروف زندگی میں
نہ کوئی لمحہ ہے اب تمہارا
نہ کوئی ساعت ہے اب ہماری
کہ اپنا حق زندگی پہ ہم کو
نہیں رہا ہے
نہیں رہا ہے

حمید الماس

آغازِ زوال

ہوا یوں ہے
زوالِ عمر کے گھٹتے ہوئے لمحوں میں
تجدیدِ محبت کا سخن چھیڑتے ہی
میں نے یہ کہا اس سے
بتاؤ! کس قدر تم سے محبت ہے
کہ جیسے جوش کہتے ہیں
کہ جیسے
....
یاد ہی آتا نہیں وہ شعر
لعنت ہو
زوالِ عمر کے ذہنِ معطل پر

نیا تصور

تین بچوں کو وہ جنم دے کر وہ خوش تھی
ان دنوں
اس کے قلبِ ناتواں میں
تھا یہ اندیشہ کہیں
راحتِ تولید نو سے ہو نہ جائے بے کنار
اب کہ
ذہنوں میں وہ پہلا سا تصور
نسل کے حفظ و بقا کا ہی نہیں
سوچنا پڑتا ہے
مرجائیں تو کیا
اپنے بچوں کے توسط سے
امر ہو جائیں گے

سوہن راہی (لندن)

جلی ہوئی تیلیاں

زندگی ہے
یا جلی ہوئی تیلیاں
اپنے ہی خون سے پیاس بجھاتی ہوئی تیلیاں
سوکھی بے حس تیلیاں
ایک دو حصوں کو چھوڑ کر دنیا کے تمام حصوں میں
اب صرف یہ تیلیاں ہیں
ان تیلیوں کا مقدر

جدھر جدھر سب جلا ہوا چہرہ
بے شعلہ چہرہ
بے آب اور بے نور چہرہ
یہ تیلیاں اب ایک ایک کر کے
کسی اور کے ہاتھ سے جلائی جاتی ہیں
کسی اور روشنی کے نشے سے جلائی جاتی ہیں

ان سے ان کا اپنا پن چھن گیا ہے
کاش! کوئی ان سب کو اکٹھا کر کے
ایک الاؤ کا اہتمام کر دے
کہیں کچھ تو روشنی ہو
حالات میں کچھ تو گرمی پیدا ہو
ان سوکھی تیلیوں سے
ان چیختی تبدیلیوں سے

خالد اگاسکر

چور دروازہ

وہ
میری زندگی میں
چور دروازے سے داخل ہوئی

ہم دونوں
آموں کے باغوں میں جھومتے رہے
ندی کے بہاؤ کے ساتھ
چلتے رہے

جب
باغ میں خزاں داخل ہوئی

اور
ندی کا پانی خشک ہونے لگا

تو

وہ
سامنے کے دروازے سے نکل گئی

بلندی

تم
دوسری منزل پہ کھڑی ہو کر
آسمان میں کیا تلاش کر رہی ہو
تمہارا کیا کھو گیا ہے
نیچے آ جاؤ
دیکھو
میری گردن دکھ رہی ہے
کہیں ایسا نہ ہو
میں ٹوٹ جاؤں

حسن نعیم

نقوشِ پا جو سنوارے گا ایک نظر دیگا
مگر جو راہ نکالے گا۔ رہ گذر دے گا

اسی اصول پہ قائم ہوں میں بھی، دنیا بھی
جو راہِ خلق میں اٹھے گا، اپنا سر دے گا

میں اس کے جسم کی خوبی سے گرچہ واقف ہوں
مجھے تھی فکر وہ کب دل میں اپنے گھر دیگا

اسی گمان میں آنکھیں لگی نہیں برسوں
کوئی ستارہ مجھے تحفۂ سحر دے گا

وہ شاہ نقد کبھی دیکھے گا اوجِ فن میرا
یہ انتظام کبھی کوئی حریف کر دے گا

یہ جامِ حرف جسے اپنا خون دینا تھا
اسی امید میں خالی رہا۔ وہ بھر دے گا

خبر نہ تھی کہ اس درجہ مہرباں ہے نعیم
کسی کو آگے مرے عیب کی خبر دے گا۔

شہاب دانش

پردے کے روبرو پس پردہ بھی دیکھنا
چھپ جائے گا ہواؤں میں پرندہ بھی دیکھنا

برجستہ ہو رہا ہے کھلے سر پہ کچھ نزول
سالم ہوں وہ گھڑی تو شکستہ بھی دیکھنا

[illegible] سلے سے ہے درست، ہر اک داغ التفات
[illegible] کے پیچ و خم میں شگفتہ بھی دیکھنا

ہے بام و در پہ شام ابابیل نوحہ گر
وہ بے چراغ گھر کا دریچہ بھی دیکھنا

بارش سے برگ و بر کی عجب گرد وا گردی
کیا شاخ سے گرا ہے شگوفہ بھی دیکھنا

پھر آخری سرا ہے یہ دانش غریب شہر
آگے ہے وہ نہنگ [illegible] بھی دیکھنا

زیب غوری

سفید سرد راکھ چاندنی کی بام و در پہ ہے
تھمی ہوئی نگاہ دل کے ڈوبتے شرر پہ ہے

بھٹک رہا ہوں دشت شب کے بندخار زار میں
گھنی گھنی سیاہ سبز چھاؤں میرے سر پہ ہے

تراش کر پہاڑ میں نے رکھ دیئے تو کیا ہوا
خبر نہ تھی تری نظر کا قرض بھی ہنر پہ ہے

حساب میری نارسائیوں کا پھر نہ مانگنا
ابھی کہیں کہیں چمک سی خاک رہگذر پہ ہے

چلے چلو ابھی سفر تمام کب ہوا ہے زیب
[illegible] بوجھ ایک اور دشت کا بھی میرے سر پہ ہے

شہباز نقوی (پاکستان)

اس کے ہاتھوں پہ محبت کی دعا لکھونگا میں
اس کے لب پر اک دن حرف وفا لکھونگا میں

زرد پتوں پہ بناؤں گا نمو کے زاویے
خشک پیڑوں پہ بہاروں کا کہا لکھونگا میں

مردہ سطحوں پہ بنا کر ندیوں کے خال و خد
پتھروں پر پانیوں کا ذائقہ لکھوں گا میں

اپنے ٹوٹے پر ڈبو کر اپنے تازہ خون میں
اڑتی کونجوں سے سفر کا رابطہ لکھوں گا میں

اندھے لمحوں کو دکھائے جو یقیں کا راستہ
اس دیئے کو روشنی کا قافلہ لکھوں گا میں

منزلیں موجود ہیں لیکن گریزاں ہیں قدم
اپنی تاریخ سفر کا سانحہ لکھوں گا میں

گھر کی دیواروں سے مٹ جائیگا تنہائی کا دکھ
آہٹوں کا ایک زندہ فیصلہ لکھوں گا میں

جان کاشمیری

ربط دل سے کج ادائی میں بھی ہونا چاہیئے
پاس یک جائی جدائی میں بھی ہونا چاہیئے

اپنے ماتھے پر سجا کر آ سلاخوں کے نشاں
قید کا شہرہ رہائی میں بھی ہونا چاہیئے

جا کے واپس آنا چاہو تو خوشی سے آ سکو
اعتدال اتنا لڑائی میں بھی ہونا چاہیئے

اس کے دم سے ہے محبت کا توازن برقرار
ذکر غم، نغمہ سرائی میں بھی ہونا چاہیئے

اس کی ہستی کو مٹا سکتا نہیں کوئی پہاڑ
حوصلہ جینے کا رائی میں بھی ہونا چاہیئے!

جان تجھکو کیسے ملے گا قبر خوشبو کھود کر
راز کچھ گل تک رسائی میں بھی ہونا چاہیئے

سیدہ شان معراج

ہمیں تو اپنی ہی آب و ہوا نہ راس آئی
وفا پسند تھی لیکن وفا نہ راس آئی

ہم اپنی ذات کے زنداں میں سانس لینے لگے
جب اس کے قرب کی بادِ صبا نہ راس آئی

دعا کے لفظ و معانی میں فرق تھا شاید
بہت عجیب تھی اس کی دعا نہ راس آئی

گذر گئی جو مرے سر سے بے نیازانہ
رفاقتوں کی وہ کالی گھٹا نہ راس آئی

نہ التفات کا موسم نہ بے رخی کی فضا
ہمیں تو وقت کی کوئی ادا نہ راس آئی

سید رونق رضا

ابر تھا پر آنسوؤں کی چمک کھو گئی قافلہ بادبانوں کے چلتے رہے
ساحلوں کی دعائیں سروں پر لئے بادبان آسمانوں کے چلتے رہے

ریگ ساحل پہ دو ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ملے رت جگا ہو گیا
کبھی نیند کی گود میں سو گئی، ذکر کچے مکانوں کے چلتے رہے

اتنی بھرپور تھیں اپنی مجبوریاں زندگی بھر لبوں سے نہ کچھ کہہ سکے
ہاں مگر عمر بھر صرف امید پر سلسلے کچھ گمانوں کے چلتے رہے

سب نے دیکھا کہ ہم حال کی قید میں جاں گرفتہ بھی تھے پا بہ زنجیر بھی
کس کو معلوم اپنے خیالوں میں ہم ساتھ گذرے زمانوں کے چلتے رہے

خوشبوؤں سے بسی شام خلوت میں بھی ہم کو بوئے غنیم آ رہی تھی مگر
تھی فراغت کی شب آخری دوستو مشغلے داستانوں کے چلتے رہے

معراج العارفی قادری

میری حیات کے سنگین مسئلے ہیں بہت
سلطا ایک میری جاں پہ واہمے ہیں بہت

محققوں نے یہ تحقیق کر کے لکھا ہے
کہ زیست ایک سہی، اسکے فلسفے ہیں بہت

کسی بھی ایک روش کو نہ زندگی کہیئے!
یہ زہر ایسا ہے جس کا کہ سلسلے ہیں بہت

سراب دھوکا ہے اے دوستو سمندر کا
دبے ہوئے اسی صحرا میں قافلے ہیں بہت

دل و نظر کے تصور کے خوابوں کے ذریعے
تمہارے شہر میں آنے کے راستے ہیں بہت

قدم جما کے اگر چل سکو تو ساتھ چلو!
حرم کی راہ میں اے دوست میکدے ہیں بہت

ابھی سے حضرت معراج تھک کے بیٹھ گئے
ابھی تو کرنے کو باقی مقابلے ہیں بہت

احتشام اختر

شوخ گفتار ہوئی چلبلے مکتوب ہوئے
بے تکلف ہوئے وہ ہم سے تو پھر خوب ہوئے

دام سے جن کے نکلنا مرا مشکل تھا بہت
آج وہ پہلی ہی یلغار میں مغلوب ہوئے

رہے شوکیس میں جب تک تو نہ پوچھا ہم کو
اور جب بک گئے ہم تو انہیں مطلوب ہوئے

نقش امید کے وہ رنگ جو ہلکے تھے بہت
دل ناعاقبت اندیش کو مرغوب ہوئے

ساز و آہنگ کے قیدی وہ مہذب شہری
وحشی نغمات کو سن کر بڑے محجوب ہوئے

جن کے سائے سے بھی میں دور رہا تھا اختر
ان کے سب جرم مرے نام سے منسوب ہوئے

شبیر رسول

لفظِ ماضی میں اداؤں کی طرح کھو جائیں
گھپ اندھیرے میں بلاؤں کی طرح کھو جائیں

کیا عجب ہے کہ کسی گاؤں کے میلے میں کبھی
ہم پراچین کتھاؤں کی طرح کھو جائیں

اس سے ٹکرا کے پلٹنے سے تو بہتر ہے یہی
دل کے گنبد میں صداؤں کی طرح کھو جائیں

دور سرحد سے نگاہوں کی پکارو تو سہی
ہم سے پاگل تو دِشاؤں کی طرح کھو جائیں

آؤ کہ ہمارے تمدن میں کہیں ایسا نہ ہو
گاؤں تاریک گپھاؤں کی طرح کھو جائیں

جھوٹی شہرت کے ہر اک داؤ پہ بکنے والے
گندے جسموں سے قباؤں کی طرح کھو جائیں

پھر کسی یاد کے چھتنار گھنے جنگل میں
آؤ! بے سمت ہواؤں کی طرح کھو جائیں

شہپرِ زر پہ فلک وسعتوں میں اڑنے والے
کل نہ دنیا کے خداؤں کی طرح کھو جائیں

قاضی انصار

یوں مجھ سے بدگمان ہے میرا خدا ہنوز
جیسے کوئی گناہ نہ مجھ سے ہوا ہنوز

ان راستوں سے قافلے کتنے گزر گئے
ابھرا نہ راستے میں کوئی نقشِ پا ہنوز

میں ہوں زمین اور نہ تو آسمان ہے
پھر اپنے درمیان ہے کیوں کر خلا ہنوز

سچ بولنے کا ہم سے ہوا تھا کبھی قصور
اس جرم ہی کی کاٹ رہے ہیں سزا ہنوز

اس بات کی خوشی ہے مجھے میرے دوستو!
میں اپنی ہی حدود کے اندر رہا ہنوز

جنت میں کی تھی حضرت آدم نے اک خطا
انصار اس لیے تو ہے پاس خطا ہنوز

رئیس الدین رئیس

کبھی لہجہ بدل لینا کبھی تیور بدل لینا
انہیں آتا ہے اک پل میں کئی منظر بدل لینا

بدل لینا زباں اور لفظ کے پیکر بدل لینا
یہاں پسپائیاں دیکھو وہیں لشکر بدل لینا

زمانہ آشنا ہو تم تمہیں کو زیب دیتا ہے
کبھی مرکز سے ہٹ جانا کبھی محور بدل لینا

یہی اچھا ہے جہاں جاؤ تم ان عام لوگوں میں
تکبر کی جو دستار ہے سر پر بدل لینا

وہ جب بھی قتل کرتا ہے خلوص دل سے کرتا ہے
کہ اس قاتل کو آتا ہی نہیں خنجر بدل لینا

یہ شہرت کی سنہری دھوپ تو جینے نہیں دیگی
رئیس اس زرد و زرخیزی سے تم بنجر بدل لینا

خورشید سحر

تمام عمر کا سرمایہ مجھکو کھونا تھا
یہ حادثہ بھی مرے ساتھ ایک ہونا تھا

طلسم خواب ہوا غرق بہتے پانی میں
اندھیرے گھر کا یہی آخری کھلونا تھا

میں اپنے آپ کو کھونے پہ کس لئے روتا
مجھے تو اس کی جدائی پہ رونا دھونا تھا

مجھے پسند تھا خوش رنگ پانیوں کا سماں
کہ خود ہی اپنا سفینہ مجھے ڈبونا تھا

مری نظر کی کڑی دھوپ مل گئی ہوگی
وگرنہ شہر کا منظر تو کچھ سلونا تھا

قارئین

سواد و صوت

محترم ! تسلیم

کراچی میں آہنگ بس یہ ہے کہ پڑھنے کو مل جاتا ہے اور پڑھ کر لگتا ہے اردو کے ایک دبستان کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر حسن آرزو نے زاہدہ حنا کے افسانوں پر جس زاویئے سے روشنی ڈالی ہے وہ ان کا اپنا ہے اب اس زاویئے سے وہی تو مطالعہ پیش کر سکتا ہے جس نے ادب کے علاوہ دیگر علوم فلکیات، نجوم وغیرہ پر بھی دسترس حاصل کر لی ہو۔

آہنگ زندہ ادب پیش کرتا ہے آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آپ کا

خاور رشید،

نظام آباد کراچی،

مکرمی ! تسلیم

آہنگ کے پرچے ملتے رہتے ہیں۔ اس عنایت کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں، دسمبر کے پرچے میں ڈاکٹر احسن آرزو کا مضمون سخن ہائے ناگفتنی بہت دلچسپ اور معلومات افروز تھا۔ معلوم نہیں اس کا عنوان ناگفتنی کیوں رکھا۔ شاید کلیم الدین احمد کے سخن ہائے گفتنی کا جواب تھا علم الاعداد سے تحقیق میں فائدہ اٹھانا ایک نئی بات ہے

بہر حال انہوں نے رنگین کا سنہ ولادت بالکل صحت کے ساتھ معلوم کر لیا ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے

گیان چند

مکرمی ! تسلیم

آہنگ کا تازہ شمارہ دیکھا۔ بہت خوب ہے مضامین کافی معلوماتی ہیں۔ اس کے قبل والے شمارے میں ڈاکٹر حسن آرزو کا مضمون کافی پسند آیا۔ جو ایک اچھی محنت کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل کا مضمون اس شمارے کا جان ہے۔ افسانوں میں قیوم راہی، احمد سعدی کے افسانے اچھے ہیں۔ انشائیہ "مکان بنانا" بڑے دلچسپ طریقے تحریر کیا گیا ہے۔ پاکستان میں صنف انشائیہ پر مضامین اور انشائیے کافی لکھے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں اس پر بہت کم دھیان دیا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں۔؟

غزلیں و نظمیں تقریباً سبھی اچھے اور معیاری ہیں ڈاکٹر محمد مثنیٰ تبصرہ اچھا کر رہے ہیں۔ ان سے تبصرہ برابر کرائیے۔

آپ کا

تسلیم انجم (رانچی)


بیس نکات کی
یہ کہانی
گاؤں گاؤں
میں بجلی پانی


کھیتی کو زمین
رہنے کو مکان
بیس نکات کی
یہ ہے شان

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. No. Gy 5/84
Phone—432

THE Aahang Urdu Mont
BAIRAGI, GAYA

ـ تنقیدی مضامین ـ

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-

The Cultural Academy, (Regd.) Gaya

1984

PRICE 3/00

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے	چھتیس روپے
ایک شمارہ	تین روپے

فون نمبر 432

محتویات

کشکول

بہار اُردو اکیڈمی یا پٹنہ اُردو اکیڈمی؟

بہار اُردو اکیڈمی جس ادارے کا نام ہے اُسے "پبلک اِکس چیکر" سے بارہ لاکھ سے زیادہ کی رقم ہر سال دی جاتی ہے، کیوں کہ ریاستی حکومت چاہتی ہے کہ یہ اکیڈمی اُردو کی ترویج و اشاعت کے مقابلے میں دوسرے پرائیویٹ اداروں اور انجمنوں سے زیادہ اور بہتر کام کر سکے۔ ریاستی سرکار کی یہ گراں قدر رقم کس کس طرح "استعمال" ہوتی ہے، ہو رہی ہے یہ جاننے کا حق اُردو عوام کے علاوہ پوری ریاست کے عوام کو بھی ہے۔

اکیڈمی کی ابتدا میں ہی ابتری کے آثار تھے مگر جناب جگن ناتھ کوشل، گورنر بہار (جو اکیڈمی کے صدر بھی تھے) کی دانش وری اور اُن کی قیادت نے اسے بہت سی آفتوں سے بچائے رکھا۔ اُس وقت اکیڈمی کو اتنی بڑی رقم بھی نہیں ملتی تھی مگر سہیل عظیم آبادی جیسی بڑی ادبی شخصیت کو سکریٹری بنا کر اس اکیڈمی کو جو وقار بخشا گیا وہ شاہ مشتاق صاحب تک تو خیر کسی طرح خیریت کے ساتھ رہا مگر اُس کے بعد ______

اُس کے بعد اکیڈمی کے افسروں اور آفس پر اکیڈمی کے گرانٹ کی بیالیس فی صد رقم خرچ ہونے لگی۔ کسی WELFARE ادارے کی کل سالانہ پونجی کا بیالیس فی صد سکریٹری، دو دو وائس چیرمین، ایک ڈائرکٹر اور از قبیل مدوں پر خرچ ہو جائے تو کوئی بھی انتظامیہ کی ابجد سے واقف شخص ہمیں یہ بتا دے کہ ایک WELFARE ادارے کے لئے اس سے زیادہ بدانتظامی کیا ہو سکتی ہے؟

اکیڈمی کی ایک جنرل کانسل ہے ____ ایک مجلسِ عاملہ ہے ____ مگر مجلسِ عاملہ ہی کا

عمل دخل ہے جنرل کانسل میں مجلس عاملہ کے کُل ممبروں کے علاوہ محض تین ایسے ممبر ہوتے ہیں جو جنرل کانسل کے
ممبر ہوتے ہیں مگر مجلسِ عاملہ کے نہیں یعنی "جنرل کانسل" کی بجائے "مجلسِ عاملہ" ہی سب کچھ ہے۔ یہ ویسا ہی ہوا کہ
جیسے کابینہ کے وزراء کے علاوہ دو چار اور افراد کو لے کر گویا اسمبلی بنا لی جائے۔ اکثریت مجلسِ عاملہ کے ممبروں کی ہے
اس جنرل کانسل کے یہ تین ممبر محض منہ تاکتے رہ جاتے ہیں اور سے پاؤں تک یہی "آپسی لین دین" کا کاروبار چلتا رہتا ہے،
پوری اکیڈمی پر نظر ڈالیے، سوائے یونی ورسیٹیوں کے ہیڈ کے زیادہ تر پٹنہ ہی کے لوگ مجلس عاملہ
کے ممبر ہیں۔ جیسے یہ اکیڈمی پورے بہار کے لئے نہیں ہے بلکہ پٹنہ اُردو اکیڈمی ہے۔

موجودہ I.A.S. سکریٹری کا TERM ایک دو ماہ کے بعد ختم ہو رہا ہے، خبر گرم ہے کہ کئی پنشن یافتہ
I.A.S. اُمیدوار بنے بیٹھے ہیں۔ بہار اُردو اکیڈمی کے سکریٹری یا نائب صدر ہونے کے لئے پڑھا لکھا آدمی
ہونا ضروری نہیں ہے۔ اُسے I.A.S. ہونا چاہئے کیونکہ I.A.S. سے زیادہ عقلمند کوئی ہو سکتا ہے یہ تصور کرنا
بھی محال ہے ——— بہار اُردو اکیڈمی میں "اکس آفیشیو" ممبروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ
عام آدمی جو "آفیشیو" ہو ہی نہیں سکتا۔ مجلس عاملہ میں چلا جائے گا تو بارہ لاکھ کا بیالیس فی صد
"انتظامیہ" پر خرچ ہونا مشکل ہو جائے گا اس لئے شاید ضروری ہے کہ ہمیشہ اس خرچ میں اضافہ ہوتا رہے۔
اور اس کے لئے ضروری ہے کہ صرف پٹنہ شہر کے لوگ ہی مجلس عاملہ کے ممبر بنائے جائیں۔
نہیں معلوم ہمارے چیف منسٹر صاحب اور جناب گورنر صاحب اُردو اکیڈمی کے
"بوڑھوں کی آرام گاہ" بن جانے پر کیا سوچتے ہیں؟

باخبر

آس پاس

[اس عنوان کے تحت پیش کیے گئے افکار "باخبر" کے آزادیٔ تحریر کا ثبوت ہے جو ہم مہیا کرتے ہیں۔ تاہم پوری ذمہ داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ادبی رسالے میں ایسے سیاسی اور نیم سیاسی مطالعوں کا پیش کرنا کارآمد ہے۔

کلام حیدری]

کہاں جائیں

گرمی کے موسم کی آمد آمد ہوتی ہے تو بہار کے عوام کانپنے لگتے ہیں کہ خدا جانے اب کی بار گرمی کیسے کٹے گی۔۔

۔۔۔ بجلی کے بارے میں سرکار ہر سال یہ دعویٰ کرتی ہے کہ آئندہ سال اس کا انتظام بہتر ہو جائے گا اور ہمارے عوام اس "بہتر" کے انتظار میں کسی نہ کسی طرح اپنی تکلیفوں کو کاٹ لیتے ہیں لیکن جب آئندہ سال آتا ہے تو یہ انتظام بجائے بہتر ہونے کے اور "بدتر" ہو جاتا ہے۔ آپ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیے تو نہ صرف بجلی بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی جو رفتار آپ دیکھیں گے، پانچ دس سال کے بعد اس میں نمایاں ترقی کے اثرات صاف نمایاں ہوں گے۔ ہمارے ملک کی خصوصیت یہ ہے کہ ہم بجائے ترقی کے تنزلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آپ آج جو چیز دیکھیں گے، کچھ عرصہ کے بعد اسے بدتر ہی حالت میں دیکھنے کی توقع رکھئے۔ سوائے پٹنہ کے، کہ جو بہار کی راجدھانی ہے، وزراء اور امراء رہتے ہیں اور ایک بے حد چلانے والی قوم بھی رہتی ہے جو اخبار نویس کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس لئے یہاں جان جوکھم میں ڈال کر کسی نہ کسی طرح انتظام بہتر رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اب آپ دوسرے شہروں کی خبر لیجئے۔ دربھنگہ میں لگاتار پانچ روز تک بجلی غائب، گیا میں چوبیس گھنٹوں میں سولہ، اٹھارہ گھنٹے بجلی غائب، بہار شریف میں بیس گھنٹے بجلی ندارد........ آپ شہروں کو گنتے رہئے۔ پورے صوبے کی گنتی کر لیجئے، کہیں سے کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

غیر منصوبہ بند طریقے سے ٹیوب ویل کے جابر نے زمین کی نچلی سطح کے نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ فروری آتے آتے ستر فی صد کوہی سوکھ جاتے ہیں۔ مئی جون میں یہ تعداد نوے فی صد ہو جاتی ہے۔ پی ایچ ڈی کے چاپاکل جہاں تہاں لگے ہوئے ہیں، وہ آدھے سے زیادہ ناکار

ہو چکے ہیں لے دے کے بجلی کی امید باقی رہتی ہے سو اس کا حال آپ کو معلوم ہے۔ جب تک بجلی رہتی ہے، تب تک تو بھی بہ کسی طرح پانی مل جاتا ہے، ادھر بجلی غائب ادھر پانی بند۔ ایک اور واقعہ دیکھئے۔ پانی کی سپلائی کا جو نظام آج سے تیس سال قبل شہروں میں نافذ کیا گیا تھا، وہی نظام آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہے۔ جب کہ شہروں کی آبادی دُگنی اور تگنی ہو چکی ہے۔ ایسی مایوس کن صورت حال میں بہار کے عوام کیا کریں، کہاں جائیں۔

فرق

حال ہی میں بہار میں راجیہ سبھا اور ریاستی کانسل کے انتخابات ہوئے جس کے اور نتائج تو توقع کے مطابق برآمد ہوئے۔ ان اداروں کے انتخابات کے نتائج میں کوئی غیر معمولی بات ہوتی بھی نہیں ہے۔ لیکن جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری سید شہاب الدین کی راجیہ سبھا سیٹ کے لئے شکست فاش، نے بہتوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ جنتا پارٹی کے تین مسلمان ممبران ایوان قانون ساز نے ایک بیان میں بہت ہی حقیقت پسندانہ بات کہی ہے کہ مسلمانوں کو جنتا پارٹی کے تئیں اپنے رویئے کے بارے میں پھر سے غور کرنا ہوگا۔ ان کی شکست میں دراصل کس کا ہاتھ ہے اور کون سی وجوہات در پردہ کام کر رہی تھیں؛ ہم اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ بہار ریاستی جنتا پارٹی کے صدر شری ستندر نرائن سنگھ اور ایوان قانون ساز کے لیڈر شری کرپوری ٹھاکر کے درمیان اس مسئلے کو لے کر خوب لے دے ہو رہی ہے۔ دونوں ہی صاحبان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پارٹی کے صدر چندر شیکھر کو اپنے اپنے کردار کے بارے میں مطمئن کر دیا ہے۔ ادھر چندر شیکھر بالکل خاموش ہیں وجہ ——— وہ نہ ستندر بابو کو ہاتھ سے ضائع کرنا چاہتے ہیں اور نہ کرپوری جی کو ہی چھوڑنا چاہتے ہیں۔ الیکشن۔ رہ گیا ہے۔ ایک شہاب الدین کے ہار جانے سے کیا بگڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف کانگریس نے کانسلر کے لئے ایک ایسے امیدوار کو ٹکٹ دیا جس کو پارٹی کا ایک بڑا طبقہ مخالفت کر رہا تھا اور وہ شخص خود بھی خراب دنوں میں پارٹی کو دھوکہ دے چکا تھا، لیکن پارٹی ٹکٹ دے چکی تھی، اس لئے ووٹ اسی کو پڑنے تھے، سو پڑے۔ ان نتائج سے بہار کے مسلمان ووٹروں کی نگاہوں کے سامنے سے پردہ اُٹھ جائے گا اور وہ صحیح غلط کے فرق کو سمجھ سکیں گے۔

بے منزل

جب چندر شیکھر کی سرکردگی میں پانچ پارٹیوں کا متحدہ محاذ بنا تو ان سب کالموں میں اس کا استقبال کیا گیا تھا کیونکہ اس وقت ملک میں ایک صحت مند حزب مخالف کی موجودگی، ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن چند ہی مہینوں میں جب اس کا شیرازہ بکھرنے لگا تو فطری طور پر ان امیدوں کو دھکا لگا۔ راجیہ سبھا کے انتخابات میں جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری سید شہاب الدین کو جس طرح چت کیا گیا وہ پارٹی کے اندر فرقہ پرستی اور ذات پرستی کو بڑھاوا دینے والی طاقتوں کی کھلی فتح ہے۔ ہیم وتی نندن بہوگنا نے بجا طور پر یہ بات کہی ہے کہ اس متحدہ محاذ سے امیدیں رکھنا فضول ہے۔ وہ ایک نئی پارٹی بنانے کے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں۔ ادھر فاروق محمد عبداللہ نے اپنے نکتہ نظر میں خاصی لچک لائی ہے اور وہ اندرا گاندھی کو اب اپنی بڑی بہن بس کہنے ہی والے ہیں۔ کشمیر کے گورنر کے طور پر انہوں نے جس طرح جگموہن جیسے مشہور زمانہ فرد کا استقبال کیا ہے اس سے ان کے اندر واضح تبدیلی کا اشارہ ملتا ہے۔ دوسری طرف اپریل میں ہی مدراس میں، جو اپوزیشن کا اجتماع ہونے والا

تھا، وہ غیر معین مدت کے لئے ملتوی ہو گیا ہے۔ اور یہ سب اس وقت ہو رہا ہے، جب کہ لوک سبھا کے انتخابات کو صرف چند مہینے رہ گئے ہیں اور اب ان پارٹیوں کو ایجنڈا اور چناؤ کے بارے میں سوچ بچار کرنا چاہیئے تھا بات یہ ہے کہ کسی واضح مقصد کی عدم موجودگی میں کسی سیاسی تحریک یا سیاسی جماعت کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ وہ کس مقصد کو لے کر چل رہی ہیں۔ اب وہ وقت پھر آنے ہی والا ہے کہ وہ اپنے ایک ساتھ نہیں مل بیٹھنے کی وجہ اندرا گاندھی کو بتانے والی ہیں، اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں اندرا گاندھی ایک کامیاب سیاستدان ہیں اور ایک کامیاب سیاستدان کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ وقت سے فائدہ اٹھائے۔ بھلا ایسی حالت میں اندرا گاندھی کو کامیاب ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

کیا ہو رہا ہے

پنجاب میں جو لوگ تشدد کی کارروائیوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ انہوں نے کیا سوچ رکھا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا یہ بات طے ہے کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا نتیجہ ہرگز اچھا نہیں نکلے گا۔ لیکن یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے اور جب ہم آپ اتنی سی بات سمجھ سکتے ہیں تو وہ لوگ، جو اتنی زبردست تحریک کے قائد ہیں کیا نہیں سمجھ سکتے۔ بات یہ ہے کہ وہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہو رہا ہے اور اس کے دوررس نتائج سے بھی لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ صاف دیکھنے میں یوں آتا ہے کہ جب بھی الجھے ہوئے مسئلوں کو حل کرنے کی سنجیدگی سے کوشش کی جاتی ہے اور کوئی مثبت نتیجہ سامنے آتا ہے تو کسی نہ کسی حرکت سے صورت حال کو اس حد تک بگاڑ دیا جاتا ہے کہ معاملہ یا تو بالکل ہی بگڑ جائے یا کم از کم جوں کا توں رہے ایسا لگتا ہے کہ کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جو صورت حال کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے اور وہ اپنی انگلیوں پر سب کو نچا رہی ہے۔ ہمیں جنگ آزادی کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جو تاریخ کی زبانی ہم تک پہنچا ہے کہ جب ساری قوم کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا تو کوئی ان دیکھی طاقت تھی جو یہ سب پسند نہیں کر رہی تھی، چنانچہ بعد میں جا کر اس عظیم مقصد کے کاز کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا کہ برصغیر کے عوام آج تک اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔

پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے لئے پورے طور پر سرکار کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ آخر سرکار کر بھی کیا سکتی ہے۔ اسے بہرحال جمہوری بندشوں میں رہ کر ہی کام کرنا ہے۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور جب عوام کا یہ رخ ہے تو پھر ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

● ●

بقیہ "لائٹ ہاؤس"

اور وہ اس سے اپنے لائٹ ہاؤس ٹاور کے فانوس میں سلگتی ہوئی بستی کو دیکھا۔ جس کی روشنی ماند پڑ گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ پلیٹ فارم پر بیٹھا اپنے گھٹنوں میں سر دیئے زار و قطار رونے لگا!!!

THE AAHANG URDU-MONTHLY, APRIL 1984

ترقی اُردو بیورو کی تازہ ترین مطبوعات

۱۔ کلیات میر	مرتب ظل عباس عباسی	Rs. 52-00
۲۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کی اساس	اے۔ بی۔ ایم حبیب اللہ/مترجم مسعود الحق	Rs. 25-00
۳۔ تاریخ قدیم ہندی فلسفہ	شیو نرائن ماتھر	Rs. 30-00
۴۔ بین الاقوامی معاشیات	ڈاکٹر لیاقت علی خاں	Rs. 35-00
۵۔ نسل اور نسلی امتیاز	محمد عبدالقادر عمادی	Rs: 08-50
۶۔ سرطان کیا ہے؟	محمد برہان حسین	Rs. 07-00
۷۔ اوڈیسی	اطہر پرویز	Rs. 07-00
۸۔ بابر نامہ	محمد قاسم صدیقی	Rs. 04-50
۹۔ حالی	مرتبہ صالحہ عابد حسین	Rs. 4-50
۱۰۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا حیات اور کارنامے		Rs. 12-00
۱۱۔ خواجہ میر درد	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	Rs. 04-50
۱۲۔ اکبر الہ آبادی	صغرا مہدی	Rs. 04-50
۱۳۔ بچوں کے حالی	صالحہ عابد حسین	Rs. 03-75
۱۴۔ فضائی اور خلائی اُڑان	شاداں پرویز	Rs. 03.25
۱۵۔ انوکھی کہانیاں	محمد قاسم صدیقی	Rs. 02-25
۱۶۔ کٹھ پتلی ایک تماشہ	سطوت رسول	Rs. 07-00
۱۷۔ ہمالیہ کے بنجارے	مترجم کمال احمد صدیقی	Rs. 06-50
۱۸۔ پریم چند کی کہانیاں	مرتب جوگندر پال	R-10-00
۱۹۔ یونانی ادویہ مفردہ (تیسرا ایڈیشن)	حکیم سید صفی الدین علی	Rs. 07-50
۲۰۔ تشریح الاحشا (حصہ دوم)	ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی	Rs. 19.50

کتب اور دیگر معلومات کے لئے لکھیں

شعبۂ فروخت و نمائش ترقی اُردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر۔ کے۔ پورم۔ نئی دہلی

۱۱۰۰۶۶

DAVP-511(115)/83

پروفیسر منی ور آروی

رشید احمد صدیقی کا

"ارہر کا کھیت" — ایک تجزیہ

رشید احمد صدیقی مملکت انشائیہ کے تاجدار تھے۔ طفلانہ خیالات، بھونڈی مزاح نگاری، اور سستی و بازاری تشبیہوں کو شکست فاش دے کر، اس مملکت پر آپ نے مرتے دم تک شان و بان کے ساتھ حکومت کی۔ آپ کا قلم ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ وہی وجہ تھی کہ خانقاہ انشائیہ" میں ذرا سی بے ادبی سے بھی آپ چراغ پا ہو جاتے تھے۔ اور آپ کا باوضو قلم "فتوۂ کفر" دینے سے باز نہیں آتے تھے۔

کلیم الدین احمد فرماتے ہیں:

"رشید احمد صدیقی کی یہ ایک ممتاز خصوصیت
ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک ادبی شان
ہوتی ہے جو شوکت تھانوی، عظیم بیگ
چغتائی اور پطرس کی تحریروں میں نظر نہیں
آتی"

کلیم صاحب نے بجا فرمایا ہے۔ چغتائی اور شوکت کی تحریریں تو نیم پختہ ذہن کی معلوم ہوتی ہیں۔ پطرس کے مضامین بھی مجھے متاثر نہ کر پائے۔ ان کا سب سے اچھا انشائیہ "کتے" ہے۔ مگر اس کا پہلا حصہ جس میں پطرس نے کتے کے ذریعہ شاعر اور مشاعرہ پر طنز کیا ہے۔ بالکل پھیکا ہے۔ حالانکہ سستے قسم کے مزاح اور طنز پر جان دینے والے ہمارے تنقید نگار اس پیراگراف پر جان دیتے ہیں۔ خیر یہ اپنے اپنے ذہن کی بات ہے۔ پطرس کے "کتے" کا آخری جملہ پورے مضمون کی جان اور تحریر پطرس کی شان ہے۔

"انگریزی میں ایک مثل ہے، بھونکتے ہوئے
کتے کاٹا نہیں کرتے۔ یہ بجا ہی۔ لیکن کون
جانتا ہے کہ بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند
کر دے اور کاٹنا شروع کر دے"

پطرس کا پہلا پیراگراف سر سے پیر تک شعوری طور سے شامل ہو کر لکھا ہوا صاف معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہاں بحث رشید صاحب سے اور ان کے کھیت سے ہے جس کا تجزیہ ہمیں کرنا ہے۔ "ارہر کا کھیت" رشید صاحب کا سلیقہ، احسان، رشید صاحب کی مرکزۃ الآرا تحریر ہے۔

مثل کر میں ارہر کے کھیت پر اپنے قلم کو جنبش دینے سے پہلے آپ کے سامنے مصنف انشائیہ کا ایک مختصر تعارف کرا دوں۔

سمجھتا ہوں جب تک آپ کے پاس علوم و فنون کا گنجہائے گراں مایہ نہ ہو "صنف انشائیہ" کی خانقاہ مقدس میں سجدے سے بھی قدم رکھنا بے ادبی ہوگی۔ انشائیہ نگار کوئی صاحب کرامت بزرگ نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ قلم ہاتھ میں سنبھال لیتا ہے تو ید بیضا، دم عیسیٰ، لحن داؤدی کے معجزے بھی دکھانے لگتا ہے۔ اور اس کا قلم عصائے موسوی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انشائیہ نگار نہ مورخ ہوتا ہے اور نہ ہی فلسفی، نہ وہ ڈرامہ نگار ہوتا ہے اور نہ سائنس ٹیسٹ، نہ وہ شاعر ہوتا ہے اور نہ ہی ماہر نفسیات و معاشیات۔ نہ وہ واعظ ہوتا ہے اور نہ ہی مصور، مگر جب وہ خانقاہ انشائیہ" میں جیوں ہی قدم رکھتا ہے تو چشم زدن میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔ انشائیہ نگار روسو کی طرح SOCIAL CONTRACT نہیں لکھتا۔ بلکہ ڈنڈ رو کی طرح ENCYCHOPEDB BRITANICA تصنیف کرتا ہے۔ کوزے میں سمندر اور مونالزا کے لب شیریں پر لیونارڈو ونچی کے ذریعہ ایک حسین دھیمی مسکراہٹ عطا کرنے کے آرٹ کا نام انشائیہ ہے۔

اب آئیے "ارہر کے کھیت" کی طرف، مگر ذرا ٹھہریئے رشید صاحب کے یہ دو ریمارکس جو انہوں نے عظیم بیگ چغتائی، اور ملا رموزی کے سلسلے میں پاس کئے تھے۔ گوش ذہن نشین کر لیا جائے۔

"مرزا صاحب (عظیم بیگ چغتائی) کی مروت ان کو لسیار نویسی پر مجبور کرتی ہے۔ اور لسیار نویسی کا دوسرا نام کم سے کم صحیفۂ ظرافت میں لغو بھی ہے۔"

(رشید احمد صدیقی)

وہ (ملا رموزی) اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سب باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں۔ یا ان الفاظ اور لہجہ میں نہیں لکھنا چاہئے۔ جن میں ملا صاحب لکھنے کے عادی ہیں"

آئیے، رشید صاحب کے یہ دونوں ریمارکس کی مشعل لے کر ان کے "ارہر کے کھیت" کی طرف رخ کریں۔ بلا شبہ صنف انشائیہ کے لئے رشید صاحب کے یہ دونوں "خیالات" فرمان موسوی" کا درجہ رکھتے ہیں۔

"ارہر کے کھیت" کی ابتدا بہت شاندار ہے لکھتے ہیں!

"——— دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائیڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض۔ فطری حوائج، اور دوسری حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائیڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل، ہندوستان کے ارہر کے کھیت میں ہی پڑی تھی"

کس قدر شاندار انداز ہے کتنی نادر تشبیہ ہے۔ کتنا لطیف طنز ہے، تشبیہات کس شان بے نیازی سے ان کے بارہ نو قلم سے موضوع کو زریں بنا رہے ہیں ———

"پارلیامنٹ اور کونسلوں کی تقریر، تیرا جیرز جواب" رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمئی محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں۔ وہ صدا ہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آلہ کبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھی۔ ہائیڈ پارک کی خورشش نعدیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریانیو پہ ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واٹرلو پر تمام ہوتی ہیں"

طنز اس کو کہتے ہیں۔ واٹرلو اور نپولین کی یاد تازہ کرکے

رشید صاحب نے نہ صرف اس فاتح فرانس کی یاد تازہ کر دی
بلکہ موضوع کو ایک شان کے ساتھ فتح بھی کر لیا ہے۔

مغربی معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے زخم پر کس شان اور با ادب ہو کر نشتر چلایا ہے ہم اس کی تشریح یوں بھی کر سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی انتہاء عریانیت ہے۔ جو اہل مغرب کے باعث فخر و انبساط ہے۔ مگر ہماری مشرقی تہذیب اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ اور اگر کوئی اہل فرنگ کسی ارہر کے کھیت میں عریانیت کا پرچم بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسی ارہر کے کھیت میں سینکڑوں ویلنگٹن اور بلوچر (BLUCHER) اس خود ساختہ مشرقی نپولین سے سخت ٹکر لیتے ہوئے ارہر کے کھیت کو واٹر لو بنا دیتے ہیں

ارہر کے کھیت کا موازنہ پارلیامنٹ سے نہایت ہی خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں
اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت
میں اتنا ہی دخل ہے جتنا ہندوستانی
پارلیامنٹ میں اراکین پارلیامنٹ کو"

مگر بے مثال طنز یہاں دیکھئے،

"دونوں (یعنی پارلیامنٹ اور خواتین دیہے)
بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، روتے ہیں اور
اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں، دیہاتی
عورتیں اور بچے اور کچھ اور مفید کام کرتے
ہیں جس سے ان کو کھیت دونوں کو فائدہ
پہونچتا ہے اور ہندوستانی اراکین
پارلیامنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان
کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان
پہونچتا ہے۔ ایک تقاضائے حاجت کرنا
ہے دوسرا نان کو آپریشن"

ارباب سیاست پر اس سے حسین طنز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رشید صاحب کا یہ جملہ آج بھی پارلیامنٹ کے کسی گوشہ سے پارلیامنٹ کی کارروائی کے دوران قہقہہ لگاتا ہوا نظر آتا ہے کل کیا، آج بھی ہمارے ممبران خواتین اور بچے کی نوٹو اسٹیٹ کاپی بنے پارلیامنٹ میں جھکتے، ضد کرتے، جھگڑتے، روتے نظر آتے ہیں۔ اس پیراگراف میں رشید صاحب نے "کچھ اور مفید کام" لکھ کر شاندار طنز کیا ہے۔ "یہ کچھ اور مفید" اس پیراگراف کی جان ہے۔ جس کا تعلق پیراگراف کی ابتدا اور آخری جملے سے ہے۔ یہ اس پیراگراف کا "ٹیپ کا بند" کے مثل ہے۔

اب رشید صاحب کا یہ پیراگراف پڑھئے ـــ

"شام کا دھندلکا، اور گاؤں کا دھواں،
گہرا آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے.........
کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے
پر اعتماد کرتے ہیں، اس لئے زندگی کے
نشیب و فراز سے بے ضمیر یا مستغنی ہوتے
ہیں۔ غرض کسان.........خوش
نہیں تو مسرور سہی۔"

یہ لمبا چوڑا پیراگراف ارہر کے کھیت کا کانٹا ہے۔ اگر رشید صاحب اسے نہ لکھتے تو بہتر تھا۔ اس پیراگراف کی قطعی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ ہی موضوع سے ہی اس کا کوئی تعلق ہے یہ ایک مہمل پیراگراف ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے کہ ایک انشائیہ نگار کو فنون لطیفہ اور سبھی علوم و فنون سے باخبر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے رشید صاحب میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے اس پیراگراف میں تاریخ کا کس قدر اچھا مصرف لیا ہے، دیکھئے۔

"لیکن وہ دیکھئے گا، گاؤں کے قریب والے
کنوئیں کے سامنے ایک راستہ کھیت کے
سمت گیا ہے۔ ایک طرف گڑھا سا ہے

جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے ۔ دوسری طرف
ببول کا ایک بڑا ناکھو کھلا درخت ہے جیسے
کوئی کہن سال و کشور یہ کراس تمغہ یافتہ
جس پر ایک آدھ شب زندہ دار بزرگ
اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ
لے رہے ہیں ۔ جیسے جنگ عظیم کے اختتام پر
یورپ کے بعض فرزندگان قسمت شاخ
زریں پر بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ
لے رہے تھے "

ویسے اس پیراگراف کو بھی خواہ مخواہ طول دیا گیا ہے اور جہاں تک میں نے اسے لکھا ہے ابھی اس کے آگے بھی کافی ہے مگر رشید صاحب نے شب زندہ دار بزرگ کا موازنہ لیگ آف نیشنز (LEEGUE OF NATIONS) کے اراکین سے بڑے ہی لطف انداز میں اور بر وقت کیا ہے ۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد اس وقت کے صدر امریکہ ولسن کی دعوت پر ورسائی میں ایک امن کانفرنس ہوئی تھی ۔ جس میں برطانیہ کے لائیڈ جارج ، فرانس کے مدیر خارجہ کلیمانشو کے علاوہ یورپ کے ممالک کے سبھی چھوٹے بڑے حکمراں موجود تھے اور وہ اسباب جنگ کا وہاں جائزہ لے رہے تھے ۔ رشید صاحب نے شب زندہ دار بزرگوں کا ان اراکین کانفرنس سے موازنہ کرنا ان کی تاریخ پر عمیق نظر کا ایک ثبوت ہے ۔

اس کے بعد مضمون خواہ مخواہ "گرینڈ ٹرنک روڈ" کی صورت اختیار کر گیا ہے ۔ اور ہمارا مندرجہ ذیل مہمل اور بیکار کے پیراگراف سے واسطہ پڑتا ہے ۔

(۱) "ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ لشکر کس ہم
پر روانہ ہوا تھا .... سائنس کی سفارش
اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے"

(۲) جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت
میں .... جیل خانہ سے موت گھبراتی
ہے"

(۳) شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے
کیف ہے ، جتنا بے مرچوں کا سالن ، بے
تمباکو کا پان .... ہے دوسرا ..
.... ؟"

(۴) لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے
مطالبۂ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے ۔
ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر
ضد کرتا ہے ، اور دوسری طرف سب کا انتظام
بھی پورا کر لیتا ہے"

(۵) ارہر کے کھیت میں عقل کی شرمساری
کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے لسبولہ سے
کام لیتے ہیں ۔ اور عدالت رنڈے سے خبر
لیتی ہے ۔ کسی نچلے شہری کا ارہر کا کھیت میں
دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی
دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے ۔
جتنا کسی پبلک مشاعروں میں بھلے مانس
شاعر کا اپنا کلام سنانا ۔

(۶) دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمین دار
اور پٹواری موجود ہیں ۔ اس کی ساری
ملکیت منقولہ ہے ۔ الّا عورت ، شہری
اس کا قائل ہے کہ جب یورپ اور دولت
قائم نہیں اس وقت تک سب کچھ
غیر منقولہ ہے الّا عورت ، دیہاتی عورت
کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح ،
دیہاتی کے نزدیک ....
.... لندن کے فنا ہو جانے

یہ بعد میں قائم رہتا ہے"

میں نے مندرجہ بالا جس پیراگراف کا ابھی ذکر کیا ہے جس میں پیراگراف ۱، ۲، ۴، ۶ کافی طویل اور مہمل ہیں۔ موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ کہیں شباب اور مفلسی پر خیال آرائی ہے۔ تو کہیں (پیراگراف ۶) شہری اور دیہاتی کا موازنہ، اور وہ بھی طوالت کے ساتھ جو ذہن کو گراں گذرتا ہے۔ اور ہم جو ابھی تک "ارہر کے کھیت" اور رشید صاحب کی حسین تحریر میں کھوئے ہوئے تھے اچانک چونک پڑتے ہیں کہ یہ کیا ہوا۔

رشید صاحب بھی عظیم بیگ چغتائی کی طرح بسیار نویسی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور ارہر کھیت کو دیہات کی اسمبلی سے مثال دیتے دیتے اس قدر چھ سات پیراگراف خواہ مخواہ کا لکھ گئے جس کا موضوع سے کوئی سروکار نہ تھا موضوع سے تعلق رکھنے والا پیراگراف تو اب آتا ہے جو واقعی جاندار ہے۔ لیکن اسے غلط جگہ پر تحریر کیا گیا۔ اس کا مقام وہاں پر تھا جہاں آپ فرماتے ہیں:

• یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں
اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت
میں اتنا ہی دخل ہے جتنا ہندوستان
پارلیامنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو....
نان کو آپریشن"

"ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ
ہے کونسل اور اسمبلی کا نور یہیں سے پھوٹا
گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں
معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی
کب اور کہاں ہو رہی ہے۔ داروغہ جی کیوں
آئے اور کیا کر گئے۔ پٹواری کی بیوی
نے اس سال کون کون سے نئے زیور
بنوائے۔ رکمنیا کو بچہ کیوں پیدا نہ ہوتا۔
اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھہرا........
اندھیرے میں گالی گلوچ موثر نہیں ہوتی۔
دونوں آگے بڑھیں۔ ایک کا پاؤں اور
دوسری کا ہاتھ لعوق حفظان صحت پر
پڑا۔ اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب...
.... ایک غوغا بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ
گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے لوگ
نکلنے لگے۔ مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے
بلی، لومڑی، نیولا بن بلاؤ.......
گویا اسمبلی میں بم گرا"

اسمبلی اور پارلیامنٹ سے ارہر کے کھیت کا موازنہ کرتے ہوئے رشید صاحب نے یہاں قلم کا نہیں بلکہ کیمرے کا استعمال کیا ہے۔ یہاں ان کا قلم لیونارڈو ونچی کا برش اور نظیر اکبر آبادی کا قلم بن گیا ہے۔ خاص کر آخری جملہ جبکہ بھگدڑ مچ گئی ہے۔ اور سب بھاگ رہے ہیں۔ مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، بلی، لومڑی، نیولا۔ اور آخر میں بن بلاؤ کا نام دے کر آپ نے شگفتگی کے ساتھ ایک حسن پیدا کر دیا ہے اب آخر میں عوج بن عنق مارکہ وہ بیکار، مہمل اور بے مطلب کا پیراگراف شروع ہوتا ہے جس پر عقل حیران ہے۔ کہ رشید صاحب بے چارے ارہر کے کھیت سے اچانک کہاں پہونچ گئے تھے۔ پورا پیراگراف لکھنا تو ممکن نہیں کیونکہ یہ ایک طویل پیراگراف ہے۔ اور میرا یہ مضمون کسی رسالہ کے لئے لکھا جا رہا ہے۔ خواہ مخواہ پورا پیراگراف مجھے اور رسالہ دونوں کو پریشان کر دے گا۔ وہ پیراگراف یہ ہے

"ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم
کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے
کلاس پہونچ گئے۔ بحیثیت کلاس تھا

تنہا پایا جاتا۔ پانے والوں کے لیے اتنا ہی
بصیرت افروز اور دلچسپ ہے جتنا کسی
آثارِ قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ
برس قدیم آبنا ذ گینڈے کا ڈھانچہ ملنا

....

....

اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسٹی نے
معلمین کے لئے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن
پہننا لازمی کر دیا ہے ....

....

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس
شر کا معاوضہ؟ ....
ذرا استعمال کیجئے ... گا۔ میں نے کہا
اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا
فرمایا۔ السلام علیکم"

مندرجہ بالا اس پورے پیراگراف کی ترطی کوئی
ضرورت نہ تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ "ادہر کا کھیت" جہاں چند
پیراگراف یعنی رشید صاحب کے ذریں خیالات جہاں کافی
... ہیں۔ وہاں یہ خواہ مخواہ کے بھرتی کے جملوں اور بے
... پیراگراف سے مضمون کو کافی دھکا پہونچا ہے
... بسیار نویسی کے جہاں عظیم بیگ، انجم مانپوری، اور
... وغیرہ شکار ہوئے وہاں رشید صاحب بھی
... سے خود کو بچا نہ پائے۔ بلکہ یوں کہیے کہ "ادہر
... وہ جان بوجھ کر بھٹک گئے ہیں۔ اب رشید
صاحب کے وہ دونوں ریمارکس جو عظیم بیگ چغتائی اور
... نے پاس کئے تھے پھر ذہن نشین کر لیجائے

(۱) مرزا صاحب کی مروت
ان کو بسیار نویسی پہ مجبور کرتی ہے۔ اور
بسیار نویسی کا دوسرا نام کم سے کم صحیفۂ
ظرافت میں لغویت بھی ہے"
" (۲) وہ (ملا رموزی) اس حقیقت کو
فراموش کر جاتے ہیں کہ سب باتیں لکھنے کی
نہیں ہوتیں یا ان الفاظ اور لہجہ میں نہیں
لکھنا چاہیے جن میں ملا صاحب لکھنے کے
عادی ہیں"

اور یہ دونوں ریمارکس خود رشید صاحب کے لئے بھی وہی
مقام رکھتا ہے جو عظیم بیگ اور ملا رموزی پہ خود انہوں نے
پاس کئے تھے۔ ان سب نقائص کے باوجود بھی رشید احمد
صدیقی "شاہراہ انشائیہ" کے راہ رو ہیں۔ مملکت انشائیہ کا
یہ بسمارک ابھی تک اپنا ثانی پیدا نہ کر سکا۔ سستے خیالات
بھونڈے مزاح، گھسے پٹے موضوعات، عجیب دغریب
تشبیہات، واہیات طنز اور علم سے بے نیاز مجموعہ کہالات
کو لوگ آج انشائیہ سمجھ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ اور
حیرت تو یہ کہ ان کی تحریریں شائع بھی ہو جا رہی ہیں۔ رشید
صاحب شاہراہ انشائیہ کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے
ہیں۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس صنف میں نئے
نئے تجربے کر کے اسے بلندی کے اس ایورسٹ پہ پہونچانے
کی کوشش کرنی چاہیئے، جہاں اس وقت ناول، ڈرامہ
قصیدہ اور غزل ہے۔ ●

پروفیسر محمد بدرالدین

لسانیات اور دیگر علوم کے باہمی رشتے

یہ حقیقت ہر ذی ہوش پر عیاں ہے کہ علم (Learning or Knowledge) بذاتِ خود بحرِ بے کنار کی مثل ہے جس کی گہرائی اور اصل تک رسائی حاصل کرنا دشواری ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتِ انسانی فطرت کے گوناگوں مظاہر کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کے لئے موجودات کے فطری خصائص کے پیشِ نظر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی چلی آرہی ہے اور اپنی سہولت کی خاطر اس نے پھر علوم کو مختلف خانوں اور شعبوں میں تقسیم کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے تاکہ کائنات کے مختلف النوع موجودات کے خدوخال واضح طور پر منظرِ عام پر آسکیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کوئی علم گردشِ ایام کے دوش بدوش تدریجی ارتقاء کے منازل کو طے کرتا ہوا عروج کی بالائی سطح پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا رشتہ ہم عصر زمانہ کے مروجہ علوم کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ بعینہ اس حقیقت کا اطلاق لسانیات جیسے ترقی یافتہ علم پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس علم کی روز افزوں ترقی کے پیشِ نظر مختلف ماہرین لسانیات نے بعض دیگر علوم کے ساتھ اس کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ علوم مندرجہ ذیل ہیں ـــ

۱۔ قواعد (Grammar)
۲۔ ادب (Literature)
۳۔ علم نفسیات (Psychology)
۴۔ علم حیوانیات (Physiology)
۵۔ علم جغرافیہ (Geography)
۶۔ تواریخ (History)
۷۔ علم طبیعات (Physics)
۸۔ منطق (Logic)
۹۔ علم بشریات (Anthropology)
۱۰۔ فلسفہ (Philosphy)

اب ذرا غور کیا جائے کہ لسانیات سے متعلق علوم کے تعلقات کی نوعتیں کیا کیا ہیں۔

قواعد اور لسانیات دونوں اس طرح زبانوں کے مطالعہ سے متعلق ہیں کہ کبھی کبھی ان میں امتیاز [illegible] پیدا کرنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ چونکہ دونوں علم اپنے اپنے اعمال و مقاصد کے اعتبار سے تقریباً ایک ہی نوع کے امور انجام دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے باہمی فرق [illegible] کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے [illegible] کے باعث [illegible] لوگ بعض دفعہ لسانیات کو [illegible] اور قواعد کو لسانیات [illegible]

قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے درمیان امتیاز ہے اور وہ یہ کہ قواعد کسی زبان میں الفاظ کے صحیح استعمال کے اصول بتاتی ہے کہ آیا فلاں لفظ اس طرح فلاں مقام پر استعمال میں لایا جائے یا نہیں و یا پھر فلاں لفظ کو فلاں جگہ میں استعمال کیا جانا چاہیئے۔ لیکن لسانیات اس چہ گوئی میں حصہ نہیں لیتی۔ اس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ کسی زبان میں فلاں فلاں الفاظ یوں استعمال ہوتے تھے یا ہوتے ہیں یا کسی زبان کے صوتی ماحول اس نوع کا تھا یا اس نوع کا ہے اور اس طرح کی متعدد باتیں لسانیات کا موضوع بحث بن جاتی ہیں۔ جہاں تک دونوں کے باہمی اشتراک کا سوال ہے تو اس ضمن میں عرض کیا جا سکتا ہے کہ دونو ایک دوسرے کا نکامذ ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بھی ہیں۔ مثلاً قواعد کے ماتحت آنے والی تراکیب الفاظ لسانیات پر ہی منحصر ہیں۔ دوسری جانب لسانیات کی دو اہم شاخیں تشکیلیات اور نحو کے تمام تر بنیادی لوازمات قواعد ہی سے اخذ کئے جاتے ہیں۔

ادب اور لسانیات بھی ایک دوسرے سے متعلق و مشترک ہیں اس لئے کہ اگر ادب کی تخلیق نہ ہوئی ہوتی تو آج ہم لسانیات کے لئے خاطر خواہ مواد جمع بھی نہیں کر پاتے۔ آج بھی ہم پرانی زبانوں کی اصلیت و حقیقت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی راہ میں قدیم زبانوں مثلاً اوستا، قدیم فارسی، یونانی، سنسکرت، عبرانی اور قدیم عربی وغیرہ کے ادبوں کا سہارا لیتے ہیں۔ آج اگر ہمارے پاس اردو کا قدیم ادب نہیں ہوتا تو ہم امیر خسرو، قلی قطب شاہ، وجہی، فائز دہلوی اور ولی دکنی جیسے عظیم شعراء و ادبا کے کلام کی زبان کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ معلوم ہوا کہ ادب اور لسانیات ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں یعنی (قطعاً) دونوں ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔

لسانیات اور علم نفسیات کے درمیان بھی گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ زبان خیالات و جذبات کی ترسیل و ابلاغ کی ذریعہ ہے اور خیالات و جذبات کا تعلق ہمارے ذہن و دل سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ لسانیات کو زبان کے بعض مسائل کی تفہیم میں علم نفسیات کی مدد قبول کرنا ہوتی ہے اس ضمن میں بالخصوص معنیات (Semantics) کو اس علم پر انحصار کرنا ہی ہوتا ہے اسی طرح نحو (Syntax) کو بھی علم نفسیات سے چند مواد قرض کے طور پر لینے ہوتے ہیں صوتی تغیرات (Phonetic changes) کے پس پشت ایک مسلسل نفسیاتی عمل کارفرما ہوتا ہے جس کے زیر اثر زبانوں کے صوتی نظام میں نمایاں تبدیلی سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی عمل اور رد عمل کی گتھیوں کو سمجھنے میں ہمیں علم نفسیات سے مدد لینی ہوتی ہے اور اس طرح دونوں کا آپسی رشتہ واضح ہو جاتا ہے۔

زبان انسانی دہن (منہ) سے نکلی ہوئی آواز کا نام ہے۔ پھیپھڑے (Lungs) سے خارج شدہ ہوا کس طرح منہ کے خلا (Mouth cavity) سے گذر کر باہر نکلتی ہے حنجرہ (Larynx)، صوت تانت (Vocal cords)، ناک کا خلا (Nasal cavity)، کوا یا لہات (Uvula)، تالو (Pa-late)، دانت (Teeth)، ہونٹ (Lips)، کنٹھ (Gutter)، زبان (Tongue)، زبان کا اگلا حصہ (Front of the tongue)، زبان کا پچھلا (Back of the tongue)، زبان کی نوک (Apex of the tongue)

دانت بیٹھک (Teeth ridges) اور دانت بیٹھکی (Alveolar) وغیرہ کی وجہ سے نکلنے والی کلامی اصوات میں تبدیلیاں کس طرح واقع ہوتی ہیں اور پھر ہم کس طرح انہیں گوش گذار کرتے ہیں، ان تمام مسائل کا حل علم حیوانات (Physiology) بہم پہونچاتا ہے۔

لسانیات اور جغرافیہ کے گہرے تعلق سے بھی انکار ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جب ہم دنیا کی زبانوں کے خطوں اور علاقوں کی نشاندہی کے درپے ہوتے ہیں تو ہمیں علم جغرافیہ کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کی زبانوں کے جغرافیائی حدود کیا ہیں؟ قرب و جوار کے جغرافیائی ماحول کا اثر زبانوں کے لفظی ذخیرے پر کس طرح مرتب ہوتا ہے یا پھر اسی جغرافیائی ماحول کے تبدیلی کے سبب الفاظ کے معانی میں کس طرح تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں، ان تمام سوالوں کے جواب میں لسانیات کو جغرافیہ کی دست پروری کرنا ہوتی ہے۔ چنانچہ ان حقائق کی روشنی میں یہ خیال ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ لسانیات جغرافیہ کا دستگیر ہے اور اس طرح دونوں کے باہمی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔

لسانیات اور تواریخ (History) کے باہمی اشتراک کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ قدیم ترین زبانوں کے خدوخال کو جاننے کے لئے ان کے متعلقہ ممالک کے معاشی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور مذہبی ماحول کی قدیم تاریخ کی خواہش کرنی ہوتی ہے اور اسی صورت میں قدیم زبانوں کی نحوی، صوتی، تشکیلی اور معنوی کیفیتوں کی نشاندہی ممکن ہو پاتی ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ ہر لفظ کی اپنی جداگانہ تاریخ ہوتی ہے اور اس طویل تاریخ کی تفصیل کے حصول کے لئے لسانیات کو تاریخ کا منہ تاکنا ہی ہوتا ہے۔ اور اس طرح اس نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے گہرے طور پر متحرک و مختلط ہیں۔

لسانیات اور علم طبیعات کے تعلق کو بھی فروگذاشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ انسان جب اپنے جذبات و احساسات کی ترسیل و ابلاغ کرتا ہے تو اس کے منہ سے کلامی اصوات (sound speeches) کے خارج ہونے کے بعد اور کسی کے کان کے پردے تک پہنچنے کے قبل یہ کلامی اصوات خلاء میں لہروں کی شکل میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ انہیں لہروں کے مطالعہ میں علم طبیعات معاون ثابت ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علم لہروں کی نوعیتوں اور دیگر آوازوں اور کلامی اصوات کے باہمی امتیازات سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ دورحاضر میں ماہرین عملی صوتیات (Experts of practical phonetics) علم طبیعات کے مطالعہ میں اپنے انہماک و مصروفیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس کے زیر اثر جدید ترین سائنسی آلات بھی ایجاد کئے گئے ہیں اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ اس کے علاوہ مصوتوں (Consonants) اور مصمتوں (Vowels) کی وضاحت کے لئے علم طبیعات کا تعاون حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔

لسانیات اور منطق بالواسطہ طور پر ایک دوسرے سے متعلق نہیں ہیں لیکن چونکہ لسانیات کی تحقیقوں کی وضاحت کے لئے منطقی انداز تحریر اختیار کرنا ہوتا ہے اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کو منطق کا مقروض ہونا ہی پڑتا ہے۔ دوسری جانب منطق بھی لسانیات کا مطیع و احسان بردار ہے۔ اس لئے کہ وہ بغیر زبان کی مدد حاصل کئے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ اس لئے بھی دونوں ایک دوسرے

رشیماں سہیل

علامہ اقبال کی شاعری میں مردِ مومن کا تصور

کوئی بھی نظامِ فکر اور فلسفۂ حیات اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان باہمی رشتوں پر نظر نہ رکھی جائے جو خالقِ کائنات، کائنات اور انسان کے درمیان قائم ہے۔ گویا مفکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقبال کی ہی اصطلاح میں خود بیں بھی ہوں، خدا بیں بھی ہو اور جہاں بیں بھی۔ کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے یہ جانے بغیر انسان کو نہ کوئی راہ نجات دکھائی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی راہ عمل تجویز کی جا سکتی ہے۔ مختلف ادیان اور مختلف مفکرین نے انسان کا مختلف تصور پیش کیا ہے۔ اِن مثالی انسانوں میں چند یہ ہیں۔ ہومر کا "مردِ آزاد"۔ سقراط کا "حکیم خود آگاہ"۔ افلاطون کا "حکیم حکمراں" عبدالکریم جیلی کا "انسانِ کامل"۔ نیطشے کا "فوق البشر"۔ گیٹے کا "فاوسٹ" قرآن کا "مردِ مومن" کارلائل کا "ہیرو" دستووسکی کا "خدا نما انسان"۔ میکیاولی کا "ممتازِ مقنّن" وغیرہ بقول اقبال یہ عظیم المرتبت انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ان تمام حکیموں، فلسفیوں اور معلموں کی طرح اقبال نے بھی اپنی تعلیمات کو ایک پیکر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ پیکر ہی "مردِ مومن" ہے۔ اقبال کا مردِ مومن ایک گوشت پوست کا انسان ہے۔ وہ اپنے اندر وہ تمام خصائل رکھتا ہے۔ جن سے اقبال اپنے وطن کے نوجوانوں کو آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مردِ مومن اپنی قوم کے ساتھ رہ کر نہ صرف خود بلندی حاصل کرتا ہے بلکہ اپنے گرد و پیش کے افراد کو بھی پستی و جہالت سے نجات دلاتا ہے۔ جس طرح قرآن کریم ایک قوم کے لئے ہی نہیں بلکہ کل نوعِ انسانی کے لئے نجات و برأت کے نکات لے کر آیا تھا۔ اسی طرح مومن بھی انسانیت کا نجات دہندہ ہے وہ سازِ فطرت کا نغمہ اور خدا کا حرفِ آخر ہے۔ اُس کا ارادہ خدا کا ارادہ، اُس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور اُس کا کلام خدا کا کلام ہے ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال نے اپنے اس نصب العینی انسان "مردِ مومن" کے لئے کئی اصطلاحیں استعمال کی ہیں جیسے "مردِ حر"، "مردِ قلندر" "مردِ بزرگ"۔ "خلیفۃ اللہ فی الارض" "درویش"۔ "فقیر" اور "مردِ تمام" وغیرہ۔

اقبال کے تصور کا انسان پاک دل، پاکباز، بلند نظر، عالی ہمت، راست گو، صاف باطن، منصف مزاج، حق پسند، انسان دوست، مساوات پسند، باحمیت، غیور و جسور، جواد، صابر، مستقل مزاج، دور اندیش، سخی و متقی، خوش گفتار و بلند کردار ہے۔ غرض وہ جلال و جمال کا ایک شاہکار ہے۔ مسجد قرطبہ کے جلال و جمال کو دیکھ کر اقبال کو وہ مرد مومن یاد آجاتا ہے جس کا تعارف انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
اُس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اُس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

انھوں نے کوئی خیالی پیکر پیش نہیں کیا ہے بلکہ ایک ایسے انسان کا تصور پیش کیا ہے جس پر بہت سے انسان پورے اتر سکتے ہیں۔ اقبال کا مرد مومن ان سبھی اوصاف و اعمال سے مزین ہے جو اسلام ایک انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کا قدم اخلاقی و روحانی ترقی میں کسی منزل پر نہیں رکتا یہاں تک کہ وہ فرشتوں پر بھی سبقت حاصل کرسکتا ہے ؎

بچے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

اقبال کا خیال ہے کہ انسان اپنے عمل و کردار کی بدولت نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔ وہ تقدیر کے بجائے تدبیر کا قائل ہے وہ اپنے لئے نیا جہاں اور نئی تقدیر بھی پیدا کرسکتا ہے۔ اس کے تبدیل ہونے پر کائنات کا نظام بھی بدل سکتا ہے ؎

بہ پائے خود مزن زنجیر تقدیر
تہ ایں گنبد گرداں رہے ہست
اگر باور نہ داری، خیز و دریاب
کہ چوں پا وا کنی جولانگے ہست

مردِ مومن کا ظہور یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے خمیر سے ہوا ہے۔ اس کے اندر ایک مقصد حیات ہوتا ہے جس کو مکمل کرنے کے لئے اس کے اندر جوش، ولولہ اور شدید اولوالعزمی پائی جاتی ہے۔ وہ یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی شمشیر سے باطل کو کاٹتے ہوئے اپنی خودی کو مکمل کرکے جہادِ زندگی کے لئے آمادہ کرتا ہے اور منزل مقصود پر پہنچ کر اپنی تقدیر کی تعمیر کرتا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کا مرد مومن اپنی ذہنی نشو و نما کے ہر مرحلے میں حیات و کائنات کا دامن تھام کر آگے بڑھتا ہے۔ اس کا مقصد حیات محض شکم پروری نہیں بلکہ تکمیل ذات کے بعد نوع انسان کی رہبری ہے۔ وہ انسانی معاشرے کو تمام انسانوں کے لئے خوشگوار بنانا چاہتا ہے۔ وہ بزمِ حق و باطل میں فولاد کی طرح انتہائی سخت ہو جاتا ہے اور حلقۂ یاراں میں ریشم کی طرح نرم ہے۔ اپنی پاکیزگی طبع کی بدولت وہ برائی کو نیکی میں تبدیل کرسکتا ہے۔ اپنی جدوجہد کی بدولت خار کو گل میں اور شب کی تاریکی کو سحر کے نور میں بدل سکتا ہے۔ اس کی شخصیت ایک پُرنور ستارے کی طرح ہے جو سارے عالم کو منور کرسکتی ہے۔ وہ ایک وقت میں ایسی شبنم کی مانند بن جاتا ہے جس سے دلوں میں ٹھنڈک پہنچے اور دوسرے وقت میں ایک ایسا طوفان بھی بن جاتا ہے جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں۔ اس طرح مرد مومن

وجبروت اور شفقت وکرم کا امتزاج ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مرد مومن جد وجہد زندگی میں گردش افلاک سے نبرد آزمائی کرتا ہے اور ایک حریف کے مانند ہمیشہ دست وگریباں رہتا ہے۔ بظاہر یہ خاکی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ خاک سے آزاد ہے۔ یہاں تک کہ زمین کی تنگی بھی اسے اپنے اندر مقید کرنے میں ناکام ہے ؎

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

قرآن کریم میں خدا فرماتا ہے کہ میں نے انسان کو محنت و مشقت اور جد و جہد کے لئے ہی پیدا کیا ہے اقبال اسی آیت سے متاثر نظر آتے ہیں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ۵

(بے شک ہم نے انسان کو اسی حالت میں پیدا کیا ہے کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کرے)

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
پہاڑ ان کی ہیبت سے ہوتے ہیں رائی

اس کی سرشت میں حریت اور بیباکی کا جذبہ اتنا شدید ہے کہ راہ میں حائل بڑی سے بڑی چٹانوں کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔ وہ قوت کا پیکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ انسان وہی حاصل کرے گا جس کے لئے وہ سعی اور کوشش کرے گا لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۵ مرد مومن اسی حکم قرآنی کی تعمیل کرتا ہے۔ اسی لئے اس کے قوت بازو کا اندازہ کرنا انتہائی مشکل ہے ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے مرد مومن کی شخصیت کا احاطہ خاص طور سے ان کے تین مابعد الطبیعاتی تصورات کے ذریعے ممکن ہے۔ جن میں سے ایک ان کا تصور خودی ہے دوسرا تصور عشق اور تیسرا فقر۔ اقبال کے نزدیک خودی کا مطلب غرور نہیں ہے بلکہ "معرفت نفس" یا "شعور ذات" ہے۔ اچھے جذبات کو کسوٹی پر کسنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے "خودی"۔ اس لئے مرد مومن بھی صاحب خودی ہے جو اس دنیائے رنگ و بو میں اپنی خودی کو مستحکم کرنے کے بعد یہ بانگ دہل یہ اعلان کر دیتا ہے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

قرآن حکیم کی بھی یہی ہدایت ہے کہ جو شخص اپنی خودی کو مستحکم کرے گا وہ فلاح کا درجہ حاصل کر لے گا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۵

(پس خدا نے برائی اور بھلائی کے راستے نفس انسانی کو بتا دیئے۔ جس شخص نے اپنے نفس کو برائی سے پاک کر لیا وہ فلاح پا گیا اور جس نے اسے برائیوں کی گندگی میں پوشیدہ کر دیا وہ ناکام ہوگا)

مرد مومن کو جب اپنی خودی کا سراغ مل جاتا ہے تب وہ خدا سے بھی قریب ہو جاتا ہے کیونکہ

یعنی جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا اپنے رب کو۔ خدا تک پہنچنے کے لئے اسے خودی کے علاوہ عشق کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ خودی عشق کے بغیر نامکمل رہ جاتی ہے اقبال نے عشق کو "بلند جذبات" کے معنی

میں استعمال کیا ہے۔ اُن کا عشق اچھے اور تخلیقی جذبات کا مفہوم ادا کرتا ہے جس میں حرکت و توانائی ہے۔ یہ فنا کا نہیں بلکہ بقا کا ضامن ہے۔ مردِ مومن کا ہر کام کیونکہ عشق کا رہینِ منت ہے اس لئے زندہ اور تابندہ ہو جاتا

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مردِ مومن عقل اور عشق دونوں میں ہی کامل ہے

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

فقر کو اقبال نے بے زری کے بجائے "استغنا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ جب خودی میں جذبۂ والہانہ یا عشق پیدا ہو جاتا ہے تو انسان فقر کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔ یہ مکمل انسان ہی "مومن" کہلانے لگتا ہے۔ بلند عزائم، ایمان اور یقین سے وہ اپنے اندر ایک نئی توانائی حاصل کر لیتا ہے اور اپنی کارکشائی، کارسازی اور مشکل کشائی میں اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے اس کا فقر ہمیشہ طوفانی ہوتا ہے یہ راہبِ خانقاہ کا پُرسکون فقر نہیں ہے ؎

سکوں پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

لیکن مردِ مومن کی فقیرانہ شان میں بھی شاہی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ کسبِ حلال کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی کھلاتا ہے وہ عالمگیریت کو اپنا اصول بنا لیتا ہے۔ اس کی زندگی کا مطمحِ نظر المقصد تمام انسانوں کو ایک رشتے میں منسلک کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ایک عالم کا شہری ہوتا ہے ؎

میں عجمی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

اُس کی سلطنت کی وسعت بے کراں ہوتی ہے وہ مکان و زمان کی حدود سے متجاوز ہے ؎

اُس کی زمیں بے حدود اُس کا افق بے ثغور
اُس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل

مردِ مومن کسی خاص رنگ، نسل، وطن، قوم یا قبیلے سے تعلق نہیں رکھتا۔ اُس کی حیثیت ایک عالمی حقیقت کی ہے۔ جس کی آفاقیت اور انسانیت رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو ختم کر دیتی ہے۔ زندگی کی فاسد قدروں سے جہاد کرنے کے لئے اگر اسے تخریب سے کام لینا پڑتا ہے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا اور اس زمین و آسمانِ مستعار کو پھونک کر اسی کے خاکستر سے اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے ؎

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

مومن اللہ کا اس زمین پر نائب اور خلیفہ ہے اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے۔ یہ چاند، سورج اور ستارے اس کی حکومت میں ہیں۔ وہ زمان و مکاں کا حاکم ہے اُس کا تابع نہیں ؎

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

معراجِ مصطفیٰ سے ان کو یہ سبق ملا ہے کہ انسان کائنات کی ہر چیز پر قابض ہے نہ صرف زمین بلکہ اس کی رسائی ماہ و انجم تک ممکن ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہیں گردوں

اگر جذبۂ عشق بیدار رہے تو یقیناً انسان ان منزلوں تک پہنچ سکتا ہے جو ابھی دھند میں لپٹی ہوئی ہیں کیوں کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

چنانچہ جب امریکی انسان بر دار خلائی جہاز (لیونار ماڈیول جس کا نام ایگل تھا) چاند کی جانب سرگرم سفر تھا تو گویا اقبال کا ایک خواب پورا ہو رہا تھا۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اس مردِ خود آگاہ کا محبت و اخوت سے غلام باشندوں کے اندر انقلاب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے انھیں غلامی سے نفرت ہو تی ہے حتیٰ کہ آزادی ان کا مقدر بن جاتی ہے ؎

اس مردِ خود آگاہ و فراست کی محبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

مومن موت سے کبھی بھی خوفزدہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت بھی مردِ مومن کی زندگی کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر سکتی بلکہ نئی اور اعلیٰ زندگی کے حصول میں معاون ثابت ہوتی ہے ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اقبال کا مردِ مومن معاشرے میں عورتوں کو اُن کے پورے حقوق دینے میں ذرا بھی گریز نہیں کرتا۔ وہ عورت کو تخلیقی صلاحیت کا حامل سمجھتا ہے وہ زن شناس ہے اور اس کی عزت و ناموس کا محافظ ہے۔ عورت کے جوہر کی نمود مردِ مومن کے ہاتھ میں ہے وہی اس کی تعلیم، ترقی اور آزادی کا ضامن ہے ؎

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

اقبال کا مردِ مومن نہ تو مکمل طور پر نیطشے کا "فوق البشر" ہے اور نہ ہی عبدالکریم جیلی کا خالص "صوفی۔" انھوں نے ان دونوں کے بیچ ایک نئی راہ ہموار کی ہے۔ مردِ مومن کا تصور ان کا ذاتی تصور ہے۔ اقبال نے مردِ مومن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت قرآن کے مردِ مومن، عبدالکریم جیلی کے انسانِ کامل کے ساتھ ساتھ مارکسزم کے اصولوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے جو واضح ہے۔ اُس وقت تک انھوں نے نیطشے کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس سے متعلق ڈاکٹر نکلسن کو انھوں نے ایک خط میں تحریر بھی کیا ہے۔

اس طرح اقبال کا مردِ مومن وہ مثالی انسان ہے جو دنیا میں سب سے بلند مرتبہ ہے اور یہ بلند مقام خدائی عطیہ نہیں بلکہ اس کی اپنی جدوجہد اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے اصولوں کا تتبع کرکے ہر انسان معاشرے میں یہ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ مردِ مومن کی مثال آسمان سے گرنے والی اس بجلی سے دی جا سکتی ہے جس کے تمام انسان منتظر رہتے ہیں اور ایک دن اس کی زد میں آکر خود بھی روشن و پر نور ہو جاتے ہیں اور دنیا کو بھی منور کر دیتے ہیں ؎

مردِ حق از آسماں افتد چو برق
ہیزمِ او شہر و دشت غرب و شرق

فکر تونسوی

مَیں

خُدا ہے ہر آدمی

آج میں اُس "میں" کا ذکر کروں گا۔ جو ہر ذی رُوح میں موجود ہے" تاکم بدہن، اگر خدا بُرا نہ مانے تو یہ "میں" خدا کے اپنے اندر موجود ہے، مخلوق بناتے وقت اُس نے اپنی بچی ہوئی "میں" میں سے تھوڑی بہت "میں" ہر انسان کے اندر ڈال دی۔

یہی وجہ ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو تھوڑا بہت خُدا ضرور مانتا ہے۔

جو آدمی اپنا نام خدا بخش یا اللہ داد رکھ لیتے ہیں۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ ان میں صرف بخش ہی بخش رہ جاتا ہے۔ خدا اُن میں اوّل تو ہوتا نہیں اور اگر ہوتا ہے تو اتنا کم جتنا وہ دودھ، جس میں پانی ملا ہوا ہو۔ اور ایسے ہی دُودھ کی بنا پر وہ اپنے آپ کو خُدا کہتے ہیں۔

اگرچہ کبھی خدا کے نام پر پانی کی سبیلیں لگا لیتے ہیں۔ [illegible] خدا ان سے متاثر ہوتا۔ کیونکہ سبیل لگانے والے کی نیت، مشکوک ہوتی ہے۔ خدا ہی شک و شبہ کا خالق ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں نے کس کی نیت میں کتنا خلل رکھا ہے۔ نیت کا خلل ہی دراصل ایک طرح کی "میں" ہوتا ہے۔ جو پانی کی سبیل کی ہیئت اختیار کر جاتا ہے اور پانی کو متعفن کر دیتا ہے۔

مگر خلل پانی میں نہیں ہوتا۔ اُسے دودھ میں ڈال دو، اُس میں زہر ملا کر دشمن کو پلا دو، اسے سیلاب بنا کر مفلس کے مکان کی طرف موڑ دو، اسے اُبال کر کسی ننگے بدن پر انڈیل دو اور اسے چاہے سبیل میں ڈال کر ثواب دارین حاصل کرنے کا منصوبہ بنا لو ——— پانی کو کسی بات پر اعتراض نہیں ہوتا ——— پانی کو احتجاج کرتے کبھی نے دیکھا نہ تھا۔

کیا آپ نے کبھی دیکھا؟ کہ کنوئیں کے پانی نے فی سبیل اللہ کوئی سبیل لگائی ہو؟ کیوں؟ کیونکہ پانی کی کوئی نیت نہیں ہوتی۔ پانی سے زیادہ بے نیاز دُنیا میں اور کوئی چیز نہیں۔

اگرچہ پانی کی بھی اپنی ایک "میں" ہوتی ہے۔۔ ۔۔۔ مگر وہ اپنی "میں" کے اندر جھانک نہیں سکتا اپنے اندر نہیں، جہاں "میں" چھپی ہوتی ہے۔ موجود ہوتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔

شاہ و گدا

ایک گدا شہر کے مشہور مالدار میرن شاہ کے در پر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔ گیٹ کے دونوں طرف [illegible]

پتھریلے شیر نصب کئے ہوئے تھے۔ مگر گداگر تھا شیروں سے بھی خوف نہیں کھاتا تھا۔ بھیک مانگنے میں کیا ڈر؟ چنانچہ وہ بغیر ڈرے بہ سلسلۂ بھیک کہہ رہا تھا:۔

" شاہ جی! خدا آپ کی بر سر شتی میں اضافہ برکت دے

" اللہ کے نام پر میری جھولی میں کچھ سیم و زر ڈال دے۔ جو آپ نے اپنی قیمتی مصلحتوں سے کمایا ہے۔"

" میری دعا ہے کہ بربادیاں آپ کا تعاقب شروع کر دیں۔ جو نجانے اب تک کیوں خاموش کھڑی ہیں۔"

" اے شہر کے ذلیل کتے! خداوند کریم جو میری ہر دعا قبول کرتا ہے آپ کے خونخوار دانتوں کو اور تیکھا کر دے۔ تاکہ چیرنے پھاڑنے میں اور آسانی میسر آ جائے۔"

" اے نوکیلے خارزاروں کے جھنڈ! آپ پر پھر بھی گلابوں کی بارشیں ہوں۔"

" کائنات کے سچے خدا! آپ ایسی مفسد، شرارتی حرامی اور ریاکار شخصیت کو وہ ہر نعمت عطا کر دیں جن کے لئے ان کی مخلوق ترستی ہے۔"

" لہذا اپنے خوشحال مستقبل کے صدقے! مجھے روٹی کا ایک لقمہ ہی عنایت کر دے۔"

ایک راہ گیر گداگر کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ گدا سے کہنے لگا۔" ارے تم سے نالائق ہو جس سے بھیک مانگ رہے ہو اسے گھناؤنی گالیاں دے رہے ہو؟"

گدا نے کہا۔" میری مرضی! بیک تمہا نگ رہے ہو یا میں؟"

اتنے میں اچانک میرن شاہ، ڈرائی فروٹ کی بھرپور رسیلی تھالی لئے باہر نکلا اور گداگر کی جھولی میں عرض کر دی۔ اُس راہ گیر نے پوچھا" آپ نے اسے ڈرائی فروٹ کی تھالی کیوں نذر کی؟"

وہ بولا" کیونکہ ہمارے گھر سے کوئی خیرات خواہ خالی ہاتھ نہیں جا سکتا۔"

" مگر وہ آپ کو فحش گالیاں دے رہا تھا۔"

" گالیاں اس کی" میں " تھیں۔ فروٹ کی تھالی میری" میں" تھی

اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنے خونخوار کتے کو حکم دیا کہ بھونک بھونک کر گداگر کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔

میرن شاہ کی" میں" کے دو روپ تھے۔ رسیلی تھالی اور خونخوار کتا۔

نئے حاکم نے کہا

ایک ریاست کا حاکم اعلیٰ انتقال کر گیا۔ انتقال نہ کرنا اس کی" میں" کے بس کا روگ نہیں تھا اور انتقال کرنا بھی اس کی استطاعت سے باہر تھا۔ لہذا ملک کے ہر شہری نے اعتراف کیا کہ حاکم اعلیٰ اگر اپنے خوف سے ہمیں مسلسل دبا سکتا تھا تو ہم سب جو ابھی جی رہے ہیں بے خوف دنیا نیا حاکم چن سکتے ہیں۔

چنانچہ حاکم اعلیٰ کی وفات کے بعد ایک اور آدمی کو حاکم اعلیٰ متعین کیا گیا۔ ہر قوم اپنا کوئی نہ کوئی حاکم اعلیٰ ضرور تعینات کرتی ہے۔ تاکہ ڈرے یا مرے اسی کے سائے میں ڈرے مرے۔

نئے حاکم اعلیٰ نے اپنا طمطراق جمانا چاہا۔ رعایا کے نمائندہ افراد کا ایک اجتماع کیا اور اُن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہنے لگا۔

" معزز بھائیو! آپ اور میں بھی جانتے ہیں کہ مرحوم حاکم نیک نفس نہیں تھا۔ ظلم و تشدد کے خنجر اس کے پاس تھے، جن سے وہ ہماری ہر آرزو کو تہہ تیغ کر دیتا تھا۔ اُس کی چنگیزی آنکھوں سے شعلے پھوٹتے تھے جن سے ہماری بھی مسرتیں جل جاتی تھیں۔ ہم سب غم ناک تابوتوں کے اندر گونگے قیدی تھے۔ احتجاج کی کوئی آواز سنائی

نہیں دیتی تھی۔ لیکن آج جبکہ ڈر دفن ہو چکا ہے، میں
بغیر جھجک کے کہتا ہوں کہ اگر تم میں جرأت ہوتی تو برسوں
پہلے اس کا قلعہ فتح کر سکتے تھے۔"

حاضرین کے پچھلے حلقے سے ایک آواز ابھری۔
"مگر جناب! کیا آپ میں بھی اس وقت غیرت نہیں تھی؟"
نئے حاکم نے غیض و غضب سے کہا۔ "کون ہے
یہ؟ کس کی آواز ہے؟ جس کی بھی ہے، کھڑا ہو جائے۔"
ایک بھی آدمی کھڑا نہیں ہوا۔
نئے حاکم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں! میں
بھی اس کے عہد میں صرف آواز دیتا تھا، کھڑا نہیں
ہوتا تھا۔"

میں کی خودکشی

میں نے پوچھا۔ "آپ کا اسم شریف؟ چلئے شریف
کو بھی چھوڑیئے، اسم ہی سہی۔"
وہ بولا۔ "میرا نام کے، بی، کے، پی ہے"
یوں لگا، یہ نام نہیں ہے، ایلوپیتھی کی کوئی
دوا ہے۔"
"آپ نے شریف کو چھوڑا نہیں بلکہ دو تین شریف
اور بڑھا دیئے، لگتا ہے، کسی عظیم خاندان کے فرد ہیں؟"
"لگتا ہے، آپ مجھے میرے خاندان کی بدولت
پہچاننا چاہتے ہیں، میری وجہ سے نہیں۔"
میں ایک دم خاموش ہو گیا۔ خاموشی میں یہ
صلاحیت ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی اپنی عظمت کو کوئی
آپ پر انڈیلنے سے رک جاتا ہے۔
مگر وہ رکا نہیں، خود بخود، جیسے کسی کو مخاطب
نہ ہو، مگر لگے کہ سارے گرد و پیش سے مخاطب ہے۔
بول اٹھا، "میں نے صرف بی۔ اے کی ہے مگر عظمت یہ
کہ ایم۔ اے کلاسز کو پڑھاتا ہوں، ایک پبلک کالج میں۔"

اچانک بس اسٹاپ پر زناٹے سے ایک بس آ
رکی۔ میں بس کی طرف جھپٹا۔ کے۔ بی نے میرا کندھا پکڑ
لیا۔ "چھوڑیئے اس بس کو۔ دوسری بس پر چلے چلیں گے"
"اور اگر دوسری بس پر بھی آپ نے مجھے سوار
نہ ہونے دیا؟"
"تو کیا حرج ہے تیسری بس آئے گی پھر چوتھی
پانچویں۔ بسیں تو آتی رہتی ہیں۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے
کہ بسیں آئیں تو ہم اُن پر چڑھ بھی جائیں؟ ان بسوں کے
متعلق یاد رکھیں کہ یہ آپ کی انفرادیت کو کچل دیتی ہے، بسوں
کو ہمارا محتاج ہونا چاہیئے، ہمیں نہیں۔"
بی۔ کے (تیسری مرتبہ) مجھے پُرکشش لگا۔ ترپی، جسم
توانا، چہرے پر شوخ ذہانت، آنکھوں میں البیلا پن۔
یہ شخص تو اپنی ساحرانہ گفتگو سے کسی بھی شخص کو دو منٹ
میں زیرِ نگیں کر سکتا ہے۔ میں نے صرف اپنے لالچی چسکے کے
لئے، اپنی انفرادیت کا تیر اس کے سامنے ختم کر دیا۔ مگر میرے
ختم ہونے کو وہ خاطر میں نہ لایا۔ جیسے کسی کو شکست
دینا معمولی سانحہ ہو۔ ایسے، جیسے کسی کے پاؤں میں ہلکا
سا کانٹا چبھ جائے۔
ہم دو چار منٹ تک کھڑے بے معنی گفتگو کرتے
رہے۔ مگر کچھ یوں بے معنی کہ اگر سیاست پر بات شروع
کرتا تو وہ ریاضی کی پیچیدگی پر بات کرنے لگتا۔ سوشل سائنس
کی گفتگو جنسیات کا رخ موڑ لیتی اور افلاس عالم کا تذکرہ
دیوارِ چین سے جا ٹکراتا ۔۔۔ بے حیرت ہوئی کہ وہ عالم
فاضل تو اس قسم کا ہے، جیسے کوئی بس کنڈکٹر شیکسپیئر
کے ڈراموں پر بحث شروع کر دے۔ وہ کبھی ایک موضوع پر
پندرہ منٹ سے زیادہ ٹکتا ہی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا ہر
پندرہ سکنڈ کے بعد اس کے اندر عذاب کی ایک نئی لہر
اٹھاتی اور وہ اپنے موضوع کو پتنگ کا ماڈر سے وہیں چھا کر

دیتا۔

عجیب بے چین آتما ہے، میں سوچتے سوچتے
اُس کی آنکھوں میں ڈوبنے لگا۔

مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اپنے موضوع کو تود نہ مار
دے تو اُسے خدشہ ہوگا کہ کہیں وہ خود نہ مر جائے۔
پھلجھڑی سی ایک لڑکی ہمارے سامنے سے
گذری، میں نے صرف موضوع بدلنے کی خاطر اس سے کہا
"کے۔ بی! یہ لڑکی جو گذر گئی آپ کی طرف اس للچائی نظر
سے دیکھ رہی تھی جیسے آپ اُس کی پیاس کا ایک کنواں
ہوں۔ آؤ، اس کا تعاقب کریں۔"

وہ بولا۔ "جانے دو، پیاسا ہی جانے دو۔"

"مگر یہ لڑکی ......؟"

"ابھی اور بہت سی پیاسی لڑکیاں آئیں گی۔"

"ہونہہ! جیسے یہ لڑکیاں نہ ہوں، بسیں ہوں
اور بھی بسیں آئیں گی۔ آپ کی انفرادیت یہیں رُکی کھڑی
رہے گی۔ مگر قبلہ! بسیں رکتی نہیں۔"

میرے کندھے پر پٹھانی تھپکی ڈال کر بولا۔ "اوفکر
صاحب! یو آر گریٹ!"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "اور آپ بھی ایضاً، ایضاً
ایضاً۔"

اور اُس کے بعد جیسا کہ رواج ہے میں اور کے۔
بی (تین مرتبہ) ایک دوسرے کے دوست بنتے رہے۔
دوست بننا کچھ مشکل نہیں، تھوڑا سا پاگل پن چاہیئے جو
میرے پاس بہ فضلِ خدا موجود تھا اور کے۔ بی میں تو
پاگل پن کا پورا خدا موجود تھا۔

شروع شروع میں وہ پاگلانہ حد تک کمیونسٹ
تھا۔ پھر اس کے اندر کمیونزم پندرہ پندرہ سکنڈ کے وقفہ سے
تھوڑا تھوڑا مرتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھ سے ملا
تو کمیونزم کے کمیونزم سے بھی زیادہ عاقلانہ گفتگو کرنے
لگا۔ میں نے پوچھا۔ "کے۔ بی! کمیونزم میں تمہیں کون سی
خامی نظر آئی؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

"تو پھر اس کے خلاف کیوں بول رہے ہو۔"

"بس، میرا جی چاہتا ہے، ہر اس چیز کے خلاف
بولوں، جس کی حمایت کرتا ہوں۔ ہر اس کلے کو چیر دوں جو
میں نے خود تخلیق کیا تھا۔ کیونکہ مجھے صرف اُسی سے طمانیت
ملتی ہے۔"

"بڑی منفی طمانیت ہے۔"

"ہر طمانیت، منفی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔"

نہ جانے یہ اس کی صرف فقرے بازی کی نمائشی کوشش
تھی یا وہ واقعی کسی طمانیت اور تسکین کا پیاسا تھا۔ اُس کی
پیاس کہیں بجھتی ہی نہیں تھی۔ جس پبلک کالج میں پڑھاتا تھا
وہاں کچھ زیادہ مقبول ہو گیا (طلباء میں زیادہ، طالبات میں
اس سے زیادہ) لیکن اچانک بغیر وجہ کے کالج کی ملازمت
ترک کر دی اور ایک کولڈ ڈرنک کمپنی میں منیجر بن گیا۔ ایک
مرتبہ کمپنی نے اس کی تنخواہ میں دس فیصدی اضافہ کر دیا
تو کمپنی سے استعفیٰ دے دیا۔ "میں نے پوچھا۔" کے۔ بی! کولڈ
ڈرنک کے بعد کون سا شغل اختیار کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "ایک زراعتی فارم کی پلاننگ کر لی ہے۔"

"فارم میں کیا اگاؤ گے؟"

"آم اگاؤں گا۔ جس سے پورے خلیجی ممالک میں
ہندوستان کی دھوم مچ جائے گی۔"

اور مجھے کچھ دن کے بعد ایک دوست نے بتایا
کہ آم کے پودے لگانے کے تیسرے دن ہی بعد کے۔ بی کہیں
غائب ہو گیا۔ اچانک ایک مہینے بعد ایک خوش رنگ فیشن
میگزین دکھائی دیا۔ جس پر لکھا تھا "ایڈیٹر، کے۔ بی"

کے۔بی، کے۔بی۔"

میں حیران کہ وہ جو بھی ٹھکانا بناتا ہے اُسے ہی تتر بتر کر دیتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنا دشمن خود ہو۔ جب سے پیدا ہوا، اپنا دشمن خود ہی بنا رہا، اور خود کو تتر بتر کر کے اپنے آپ کو تسکین پہنچاتا رہا۔ اس نے بہت پیسے کمائے۔ مگر سبھی یوں ہی لٹا دیئے، جیسے کوئی شرابی ایک ایک روپے کے نوٹ نکال کر ہوا میں اُڑا رہا ہو اور ہر اُڑان پر قہقہے لگا رہا ہو۔

کچھ عرصے بعد کافی ہاؤس میں جانے کا اتفاق ہوا تو ایک دوست کے۔بی کا ذکر کر رہا تھا۔

"یہ کے۔بی نام کے حضرت کا آج کل کیا شغل ہے۔"

وہ بولا۔ "سارے شغل ختم ہو گئے۔"

"مطلب"

"اس نے پرسوں شادی کر لی اور آج اس نے ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔"

چہ چہ چہ "کتنا برا ہوا۔"

میں نے کہا نہیں اچھا ہوا۔"

"اچھا؟"

"ہاں اس بے چین روح کو تسکین کی تلاش تھی، خودکشی نے اسے امر شانتی ہدایت کر دی۔" ——

اور یار د! میرے لئے ایک کافی تو منگاؤ۔"

"کیا کے۔بی کے ذہن ہو گئے؟"

[illegible] اس سوال کا جواب دے سکے۔ کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ جو دے سکتا تھا، وہ تو تسکین پانے کے لئے کہیں دور نکل گیا تھا۔

بقیہ: لسانیات اور دیگر...

پر منحصر ہیں۔ اور یہی آپسی انحصار اس بات کی دلالت پیش کرتا ہے کہ دونوں میں گہرا رشتہ ہے۔

علم بشریات (Anthropology)

لسانیات بھی ایک دوسرے سے گہرے طور پر متعلق ہیں کہ علم بشریات کے ماتحت ہی ہم اس حقیقت سے روشناس ہوتے ہیں کہ زبان انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی و فروغ کی غماز ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے آغاز و ارتقا کی داستان علم بشریات کا موضوع بحث جاتی ہے۔ چنانچہ اس نہج سے غور کئے جانے پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علم بشریات اور لسانیات دونوں ایک دوسرے کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ آج بھی ہندوستان کی طرح دیگر ممالک ایسے ہیں جہاں کے لوگ اندھے یقین اور بے جا اعتقادات کے شکار ہیں اور ان کو ان بے یقینیوں اور اعتقادوں کو عقل و منطق قبول نہیں کرتے۔ مثلاً ہندوستان میں جب کسی شخص کے دو چار بچے دارالفانی کو لبیک کہہ دیتے ہیں تو باقی ماندہ بچوں کو فضول اور بے معنی ناموں سے پکارا جانے لگتا ہے۔ جیسے کسی بچے کی ناک میں سوراخ کر کے "چھیدی" یا اس کو ترازو سے وزن کر کے "جوکھو" وغیرہ نام رکھ دیئے جاتے ہیں جو نفسیاتی ردعمل کے زیر اثر رکھ جاتے ہیں۔

بہر صورت اس طرح کی متعدد سماجی نفسیات کے زیر اثر پیدا شدہ [illegible] یقین کی وجوہ کو جاننے کے لئے ہم علم بشریات کا مطالعہ کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

لسانیات اور فلسفہ میں بھی گہرا تعلق ہے ہندوستان جیسے دیگر قدیم ممالک کے دانشوروں اور مفکروں نے زبان سے متعلق بے شمار مسائل پر غور و خوض کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ خیال ظاہر کیا جاتا

ایوب جوہر (بنگلہ دیش)

بازیافت

میں کون ہوں؟

یہ سوال بارہا میرے گرد چکرایا ہے اور آج بھی میرے چاروں اور پوچھتا ہوا پھر رہا ہے۔

میں کون ہوں؟

میں نے بارہا اپنے آپ سے پوچھا ہے اور آج بھی پوچھ رہا ہوں۔

لیکن بارہا میرے اندر کے آدمی نے اس سلسلے میں اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا ثبوت دیا ہے اور آج بھی جب کہ میں اس سے رو رو کر گڑ گڑا گڑگڑا کر پوچھ رہا ہوں کہ للہ میری شناخت بتاؤ مجھے اپنی پہچان دو کہ میں کون ہوں وہ آج بھی اسی طرح ٹکر ٹکر میری جانب دیکھ رہا ہے جیسے اُسے میرے ہونے یا نہ ہونے پر شک ہو۔ جیسے میں ہو کر بھی نہیں رہا ہوں لیکن میں ——— میں جو فکر ہوں، احساس ہوں اور ایک مکمل وجود ہوں کیسے اپنے آپ کو یقین دلاؤں کہ میرا وجود ایسا ہی ہے جیسے سورج کی تمتمانی ہوئی دہکتی کرنیں۔

کچھ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں جنھیں پیدا ہونے سے قبل ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ کون ہیں اور وہ لوگ بھی بڑے بھاگوان ہوتے ہیں جنھیں پیدا ہونے سے قبل کیا مرنے کے بعد بھی یہ جاننے کی کبھی خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کون ہیں۔ لیکن میں ایک ایسے بدبخت اور قابل رحم طبقے سے تعلق رکھتا ہوں جو پیدا ہونے سے قبل بھی سوچتا رہتا ہے اور مرنے کے بعد بھی کہ وہ کون ہے۔ ماں باپ نے میری پیدائش کے بعد ایک نام دیا تھا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ احساس بھی دیا تھا کہ شاید میں وہی ہوں جو میرے ماں باپ مجھے کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں، لیکن حیات کی آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے جب کئی بار پھسلا اور پھسل پھسل کر لہولہان ہوا تو یہ احساس بھی جاتا رہا کہ میں وہ نہیں ہوں جو میرے ماں باپ سمجھتے یا کہتے ہیں یا خود میں جو کچھ سمجھنے پر قانع ہو گیا تھا۔

لیکن، پھر میں کون ہوں؟ ——— اور میرے اندر یہ کیسی خواہش کی آگ دہک رہی ہے، جس کی ہر لپک میرے ذہن کے کھنڈر میں پہنچ کر ایک گونج پیدا کر رہی ہے۔ میں کون ہوں؟ - میں کون ہوں؟؟ ———

یہ شدت! یہ اضطراب!! یہ بے چینی!!! —

آخر.... آخر.... آخر.... میں اپنے آپ کو کہاں

ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ کیا واقعی میں نے اپنے آپ کو کھو دیا ہے؟

لیکن کیوں؟

گوتم، ارسطو اور سقراط کے پاس ایک جواز تھا خود کو کھونے کا خود کو گم کرنے کا ـــــ مگر میرے پاس کیا جواز ہے، کہ میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر خود کو کھو دیا ہے؟ شاید میں بالکل بچہ ہوں، ایک ننھا بالک۔ جو اپنی جانب کسی بھی بڑھتی ہوئی انگلی کو پکڑنے کی خاطر خود کو کھو دیتا ہے، ہاں، شاید یہی جواز ہے۔

وہ شاید کوئی میلہ تھا یا بڑا جلوس، کہ میں نے بہت لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں میں نے اپنے ماں باپ کو کھو دیا تھا اور بلک بلک کر رونے لگا تھا کہ ایک دبلے پتلے لیکن لمبے آدمی نے میری جانب اپنی انگلی بڑھائی تھی اور میں نے اس کی انگلی پکڑ کر سب کچھ کھو دیا تھا لیکن سب کچھ کھونے کا احساس جلد ہی ختم ہو گیا کہ وہ لمبا شخص مجھے ایک ایسی دنیا میں لے آیا تھا جہاں گنبد ہی گنبد تھے، مینار ہی مینار اور اللہ اکبر کی رُوح پرور آوازیں ـــــ

"مسجد" ـــــ ہاں، مجھے اس لمبے شخص نے اس دنیا کا نام مسجد ہی بتایا تھا، مسجد، میری ابتدا اور انتہا ـــــ اور پھر میں اپنی کل کائنات پاکر اپنے سارے دکھ بھول گیا، میں یہ بھول گیا کہ میں ہمیشہ کے لئے اپنی ماں سے بچھڑ چکا ہوں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میرا کوئی باپ بھی تھا جو میری ایک ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا۔ میں سب کچھ بھول گیا، اس لئے کہ اپنی پہچان اور شناخت سے بڑھ کر کوئی چیز کہاں ہوتی ہے۔

ہابیل نے اپنی شناخت کی خاطر ہی قابیل کے خون کا [illegible]

اپنا خون چاٹ رہا تھا تو کوئی عجیب بات تو نہ تھی۔

لیکن عجیب بات ہونے میں شاید دیر بھی نہیں لگی۔ وہ تمام خوش فہمیاں جنھیں پاکر میں نے اپنے آپ کو پایا تھا، پل بھر میں کسی اڑتی ہوئی خوشبو کی طرح سرسراتی ہوئی ذہن سے نکل گئیں۔ میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ میرے اصل نام کی بجائے کسی اور نام سے مجھے پکارا جائے گا اور وہ بھی مسجد میں، جہاں میں نے کل کائنات کی حصولی کے تصور سے اپنے ذہن کے شبستاں سجا رکھے تھے۔ لیکن جب مجھے "باہری" کہہ کر پکارا گیا تو میں کسی منہدم عمارت کی طرح ہی دھڑام سے زمین بوس ہو گیا اور اپنی شناخت کا غم کسی بپھرے ہوئے سمندر کی طرح مچل اٹھا۔

باہری؟ لوگ مجھے باہری کہتے ہیں، تو کیا میں وہ نہیں ہوں جو اپنے آپ کو سمجھ رہا تھا، لیکن کیوں؟ اس لمبے شخص نے تو مجھ سے یہ نہیں کہا تھا تم "باہری" ہو۔ اس نے تو کہا تھا کہ تم گھر میں ہو، تو کیا اس نے جھوٹ کہا تھا؟ پھر جھوٹ اور سچ کی شناخت کون کرے گا؟ لوگ کہتے ہیں کہ کائنات میں کوئی ایسی شئے موجود نہیں جس کی کوئی پہچان نہ ہو جب کہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ خود میں اپنی پہچان کے لئے سرگرداں ہوں، گلی گلی کوچے کوچے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اور ایک ایک شخص سے گڑگڑا کر پوچھ رہا ہوں للہ میری شناخت بتاؤ۔ مگر کوئی میری پہچان نہیں دے رہا ہے۔ کوئی مجھے کوئی نام بھی نہیں دے رہا ہے کہ میں بہل جاؤں اور ایک بار پھر دھوکہ کھا جاؤں کہ شاید میں وہی ہوں جو لوگ مجھے کہہ رہے ہیں۔ سچ اور جھوٹ کی گتھیاں کون سلجھائے گا۔ کسے پڑی ہے کہ کسی کے پھٹے میں ٹانگ دے۔ اور بالفرض کسی [illegible]

انگلی مجھے اپنے گھر نہیں لے جائے گی البتہ قتل گاہ ضرور پہنچا دے گی۔

قتل ـــــ شاعر کے نزدیک کتنا پیارا لفظ ہے، جو اپنے خیالی محبوب کے سامنے لاکھوں بار قتل ہوتا رہتا ہے اور مسکراتا رہتا ہے، لیکن میں ـــــ میں کہ شاعر نہیں ہوں، یہی پیارا لفظ مجھے کتنا بزدل بنائے ہوئے ہے۔ خوف سے جسم تھر تھر کانپ رہا ہوں۔ اور لگتا ہے قتل ہونے سے پہلے ہی قتل ہو گیا ہوں۔

ہاں مجھے یاد آرہا ہے۔ قتل ہونے سے پہلے میں بارہا قتل ہوتا رہا ہوں۔ جلیانوالہ باغ میں، روڈیشیا میں، فلسطین میں، افغانستان و ایران میں، ویٹ نام اور بنگلہ دیش میں ـــــ اور یہ قتل معمولی قتل نہیں ہے، اتنا سستا ہرگز نہیں کہ کسی سفیر کے گمشدہ بلی کے بچے کا اشتہار بن جائے۔

مجھے اس روز واقعی ہنسی آئی تھی جب میں نے مقامی اخبار میں یہ اشتہار دیکھا کہ کسی سفیر کی قابل احترام بلی کا بچہ گم ہو گیا ہے جس کی بازیافت پر ایک ہزار ٹکا کا انعام رکھا گیا ہے۔ اس اشتہار کی سرخی پر میں بڑی دیر تک ہنستا رہا تھا، اور یہ سوچا تھا کہ لوگ کتنے احمق ہیں [illegible] کہ ایک بلی کے بچے کی گمشدگی پر اس طرح دیوانے ہو رہے ہیں [illegible] قدم قدم پر گم ہوتا رہا ہوں پل پل قتل ہوتا رہا ہوں اور کسی کو کانوں کان خبر ہونے نہیں دی [illegible] میں گم ہو گیا ہوں، میں قتل کیا جا چکا ہوں [illegible] ـــــ

[illegible] لیکن میں یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہوں، میری آواز کون سن رہا ہے، جب کہ میری آواز "میاؤں میاؤں" نہیں ہے، ایک عجیب سی آواز ہے، ایک بے نام چہرہ اور ایک [illegible] خیر ضروری ہو جو مجھے کسی کے دل میں کیا [illegible]

پیدا ہوسکتی ہے؟ لیکن میں شاید غلط کہہ رہا ہوں اس لئے بھی کہ اگر ہمدردی سے دنیا خالی ہو گئی ہے تو یہ جل کر بھسم کیوں نہیں ہو جاتی، زمین تانبے کی اور پہاڑ روئی کے گالوں میں کیوں نہیں تبدیل ہو جاتے اور یہ سب جھوٹ ہے، میری وہ ہنسی بھی جھوٹ ہے جو میں اپنے آپ پر ہنستا رہا ہوں، پر اپنے آپ پر ہنسنا تو میری فطرت بن چکی ہے۔ ابھی کل کی ہی بات ہے، میرے ایک دوست نے کہا تھا، انتہائی سنجیدہ لہجے میں "یار ہر شام نت نئی کاریں کھڑی کیوں دکھائی دیتی ہیں۔" تو میں نے تجسس سے پوچھا تھا کیوں؟ اس پر میرے دوست نے کہا تھا ہماری بہنوں کی تفریح کے لئے۔ اور یہ سنتے ہی میں بے تحاشہ ہنسنے لگا تھا، اور قہقہوں کا یہ سیلاب جب تھما تب مجھے احساس ہوا کہ یہ قہقہے تو میں اپنے آپ پر لگا رہا تھا ـــــ بے نام اور بے مقصد ـــــ

زندگی جب قہقہہ ہو جاتی ہے تو پھر سب کچھ ہونے کے امکان خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، بہنوں کی تفریح کے لئے کاریں بھی کھڑی نظر آتی ہیں اور بھائیوں کے قہقہے بھی گونجتے ہیں، بے نام اور بے مقصد قہقہے، وہ قہقہے جن کی کوئی پہچان نہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح میری کوئی پہچان نہیں رہی۔ اور جس پہچان کے لئے میں در در ٹھوکریں کھا رہا ہوں کہ شاید کسی دروازے پر میرے نام کی تختی لٹکی نظر آئے۔ اور میں اپنا سینہ پھلا کر کہہ سکوں، دیکھو میں نے اپنے آپ کو ڈھونڈ لیا ہے اب میں بے نام نہیں ہوں، بلکہ اب میرا نام بھی ہے اور وہ گھر بھی ہے جس گھر میں بہنیں تفریح کے لئے گھر کے باہر نت نئی کھڑی کاروں کی جانب نہیں لپکتی ہیں۔ بلکہ اپنے بھائیوں کے قدموں کی آہٹ کی منتظر رہتی ہیں کہ ان کا بھائی آئے گا اور ان کے کانوں میں پیار بھرا رس ٹپکائے گا "بہنو" دیکھو تو میں تمہارے لئے کیسی پیاری پیاری چوڑیاں لایا ہوں۔

لیکن وہ دن کب آئے گا؟ کب میں اپنے آپ کو
ڈھونڈ نکالوں گا اور کب میری پہچان ہوگی کہ میں یہ
نہیں ہوں میں وہ ہوں، وہ جو خود اپنی حفاظت نہیں
کرتا بلکہ بہنوں کی ناموس کا بھی رکھوالا ہوتا ہے۔ میں
دوڑ رہا ہوں۔ اپنی تلاش میں در در مارا مارا پھر رہا ہوں،
منزل اب بھی نظروں سے اوجھل ہے، پاؤں لہولہان
ہو چکے ہیں اور شدت درد سے کراہ رہا ہوں۔ اور
...... اور ......

لیکن نہیں، کہیں میں دھوکا تو نہیں کھا رہا ہوں؟ کہیں یہ
مسلسل خود فریبی ہی تو نہیں ہے؟ آخر اس کی کیا ضمانت ہے کہ میں نے واقعی
اپنے آپ کو کھو دیا ہے! یا پھر میں وہ نہیں رہا جو کبھی تھا مگر یہ لوگ
مجھے وہ کیوں نہیں کہہ رہے ہیں آخر یہ لوگ مجھے کسی اور نام سے کیوں
بلا رہے ہیں جب کہ میں وہ نہیں ہوں جو یہ لوگ مجھے سمجھ رہے ہیں
تو میں پھر کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟؟ - اُف میرا دماغ پھٹ کیوں
نہیں جاتا۔ آخر میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں؟ اور یہ سب سوچ کر
حاصل کیا ہے؟؟ مگر ——

میں تھک کر بیٹھ گیا ہوں، مجھ سے اور چلا نہیں جا رہا
ہے۔ میرے پاؤں لہولہان ہو چکے ہیں۔ میرا ذہن ماؤف
ہو چکا ہے —————— مگر ——

میری نظریں...... یہ نظریں کیوں بھاگ رہی ہیں
اور اسی بچے کو گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہیں، جو زمین
پر جھکا کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہے، شاید —— ہاں،
شاید وہ بھی میری طرح اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہے،
میرا ہم جنس، میرا ہم سفر —— اور پھر اچانک میرے
پاؤں اس کی جانب بڑھ گئے ہیں ——

"بیٹے کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

اُس نے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے
پھر انتہائی لاپرواہی سے جواب دیا ہے

"ایک چونی گر گئی ہے وہی ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"کہاں گری ہے؟"

"یہیں گری ہے۔"

"تو تم صرف یہیں پر کیوں ڈھونڈ رہے ہو، ا
اُدھر دیکھو ممکن ہے کہیں دُور جا پڑی ہو۔"

میرے اس مشورے پر اس بچے نے پھر مجھے گھو
کر دیکھا ہے اور نہایت سنجیدگی سے جواب دیا ہے۔

"میرے ابو کہتے ہیں جو چیز جہاں گرتی ہے وہ وہیں
پر ملتی ہے کسی دوسری جگہ نہیں۔"

بچے کے جواب پر میں یکلخت سناٹے میں آگیا ہو
—— مجھے محسوس ہوا ہے جیسے بچے نے مجھے جواب نہیں
دیا ہے بلکہ ایک بھرپور طمانچہ میرے گالوں پر جڑ دیا ہے
جو چیز جہاں گرتی ہے وہ وہیں ملتی ہے جو چیز جہاں
گرتی ہے ......

میں اس بچے سے بے نیاز ہو چکا ہوں، میرے
لہولہان پاؤں اپنا سارا درد و کرب بھول چکے ہیں، ا
میرے ذہن کے دریچے پر نئی روشنی ابھر رہی ہے — منز
— منزل ——

میں صبح کی تیز اور میٹھی روشنی میں دیکھ رہا ہوا
منزل تو میری وہیں ہے جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا
اور یہ احساس ہوتے ہی خوشی سے میرے پاؤں کھول
اور جب میں نڈھال ہو کر جسم زمین پر چاروں شانے
چت گرا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کھردر
زمین پر نہیں گرا بلکہ اپنی ماں کی گود میں گر رہا ہوں
گود جو برسوں سے میرے جلنے والے [illegible]
[illegible]

——————

[illegible]

شام بارک پوری
(بنگلا دیش)

مٹھی میں جگنو

افق مغرب پر شفق کی سُرخی ایسی بکھری ہوئی تھی جیسے کسی دوشیزہ نے اپنے چہرے پر غازہ مل رکھا ہو کلکتہ کی چہل پہل زندگی، بڑی بڑی عمارتیں، کاروں کا قافلہ رواں دواں ـــــ ہر طرف لوگوں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شاداب کی ٹیکسی جب پارک اسٹریٹ میں داخل ہوئی تو وہاں کی رونق شباب پر تھی۔ ٹیکسی پارک ہوٹل کی شاندار عمارت کے پورٹیکو میں جاکر ٹھہر گئی۔ اس نے کرایہ چکایا اور لاؤنج میں داخل ہوا کاؤنٹر پر گلابی ساڑی میں ملبوس وہی خاتون ملکوتی تبسم کے ساتھ موجود تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی مستی تھی جیسے چھلکتے ہوئے پیمانے، زلفیں جیسی کالی گھٹائیں۔ اور چہرے پر ایسا نور برس رہا تھا جیسے چادر ستاروں سے پھوٹتی کرنیں ..... سر قدم ایک فتنہ اور ہر ادا ایک قیامت۔ اس نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ اس نے اپنے کمرے کی چابی طلب کی اور کہا۔ "میں کل سویرے ہوٹل چھوڑ دوں گا۔ اس لئے بل رات کو میرے کمرے میں بھجوا دیں" "بہت بہتر سر۔" اس کے لبوں پر ہنوز تبسم کی کلیاں رقصاں تھیں۔

وہ لفٹ پر سوار ہو کر اوپر اپنے کمرے میں پہونچا۔ وہ دہلی سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں کلکتہ آیا ہوا تھا۔ اس کے برانچ منیجر نے غبن کر کے لاکھوں کا گھپلا کر دیا تھا۔ دن بھر حساب کتاب کی جانچ کرتے کرتے اس کا بدن چور چور ہو رہا تھا۔ تکان سے بُرا حال تھا۔ ائر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچ کر سکون سا محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر آرام کیا پھر غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ کلکتہ میں یہ اس کی آخری رات تھی۔ جلدی جلدی نیچے اترا۔ چابی کاؤنٹر پر پھینکی اور ہوٹل سے باہر نکل آیا

ہوا عطر بیز تھی۔ ذرہ ذرہ مسکرا رہا تھا۔ چاروں طرف نور ہی نور بکھرا ہوا تھا۔ تا حد نظر حسن ہی حسن نظر آ رہا تھا۔ جیسے راہ گذر کہکشاں بن گئی ہو۔ حسینوں کا جھرمٹ، سرسراتے آنچل، نقرئی قہقہوں کا آبشار، پارک اسٹریٹ کے فٹ پاتھوں پر جنت کا گماں ہوتا تھا۔ اس نے پارک اسٹریٹ کا ایک لمبا چکر لگایا جو کلکتہ کا دل ہے۔ یہاں دن محو خواب ہوتا ہے اور رات حسن کی بانہوں میں جھولتی ہے۔ وہ "مولن روز" ریستوراں میں جب داخل ہوا تو چاروں طرف موسیقی بکھری ہوئی تھی۔ فلور کی دوسری جانب ایک حسن بنگالہ ـــ آرکسٹرا کے درمیان اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ میزوں کے گرد شراب سے تھکے

ہوئے چہرے اُدھار سے سلگی ہوئی آنکھیں مغنیہ پرسوز
تھیں۔ تھرتھراتی لڑکی کے آبنوسی جسم پر تانبے کا رنگ نمایاں
تھا۔ پرسوز آواز میں جوانی تڑپ رہی تھی اور شباب
سلگ رہا تھا۔ ریستوراں میں نور و موسیقی کی بارش
سی ہو رہی تھی۔ میزوں کے گرد سرگوشیوں میں باتیں
کرتی ہوئی حسینوں کے عارض و رخسار سے شعاعیں
پھوٹ رہی تھیں۔ جام و سبو کی کھنک اور قلقل مینا
کی آواز کے ساتھ ماہ پاروں کے نقرئی قہقہوں سے
شاداب کو کسی جھکے ہوئے گلزار کا خواب یاد آیا۔

اس کے سامنے بھی اسکاچ کا پیگ رکھ دیا
گیا۔ وہ پیگ پر پیگ چڑھانے لگا۔ سارا ماحول نشے میں
ڈوبا ہوا تھا۔ اس سانولی حسینہ کی مد بھری آنکھیں ساون
کی مچلتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح اس کی زلفیں تھیں۔ خمار
کے عالم میں وہ خواب بن کر اس کے ذہن میں لہرا اٹھی۔
اس کی آنکھوں میں آتشیں شرارے دوڑ رہے تھے جام
و مینا اور مغنیہ کی سحر آگیں آواز نے اس کے جذبات میں
ہلچل مچا دی۔ اس نے ویٹر سے بل منگوایا پھر بیٹھے سے
چور ہو کر اٹھا۔

وہ نشے میں جھومتا ہوا ہوٹل واپس آیا۔ گلابی
ساڑی والی حسینہ اب تک کاؤنٹر پر موجود تھی لبوں
پر وہی دلفریب تبسم اور آنکھوں میں جلتی ہوئی قندیلیں۔
اس نے کمرے کی چابی لی۔ ان کے درمیان ہلکا سا پردہ
حائل تھا۔ اس کا دل مچلا کہ کاش میرا نصیب جاگتا، اور
اس کا گداز جسم اپنے بازوؤں میں بھینچ لیتا، مگر لب پر
پابندی تھی۔ اور خواہش پر پہرہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا
زینہ کی طرف کمرے میں بڑھا، داخل ہوا تو اس کی
کی روح مغموم ہو گئی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ بیرا
بل لے کر حاضر ہوا تھا۔ اس نے بل چکایا اور بیرے کو پچاس
روپے دئیے۔ بیرا اپنی انگلی سے سر کھجا رہا تھا اور کچھ کہنے
کے لئے ہچکچا بھی رہا تھا۔ شاداب نے سوالیہ نگاہوں سے اس
کی طرف دیکھا۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"سر۔ اگر آپ خفا نہ ہوں تو ایک بات کہوں۔"
اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"بالکل بے فکر ہو کر کہو۔"

"سر ایک بہت ہی زبردست مال ہے۔ ہزاروں
میں ایک۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی خدمت میں
حاضر کروں۔" گھبراہٹ کے مارے اس کی پیشانی پر پسینے
کے قطرے نمودار ہو گئے۔

"ضرور۔ ضرور کل صبح میں جا رہا ہوں۔ یہاں کی
حسین رات سے بھی اپنا دل بہلا لوں۔" اس نے پرس سے
نوٹ نکال کر اسے دیئے۔

"صاحب۔ صرف دو سو! وہ تین سو سے کم
نہیں لیتی۔ مال دیکھ لیجئے پھر دام دیجئے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ لو۔" اس نے ایک
سو اور دیا۔

بیرا خوش خوش لوٹا۔ شاداب کو چونکہ صبح
سویرے ٹرین سے جانا تھا۔ اس لئے اپنے سوٹ کیس میں
کپڑے سجانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازے پر
دستک ہوئی۔

"کم ان" وہ سوٹ کیس میں کپڑا سجاتے سجاتے
رک گیا۔

اندر داخل ہونے والی شعلہ جوالا اور اس کی
نگاہوں کے تصادم سے ایسا محسوس ہوا جیسے آئینہ
سے آئینہ ٹکرا گیا ہو۔ اس نے زبان کھولی [illegible]

اس کی آنکھیں جھپکیں اور شرما گئیں۔ دونوں کے ہونٹ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ جیسے زبانیں گنگ ہو گئی ہوں۔ بیرا دروازہ باہر سے بند کر کے جا چکا تھا۔

"حنا" تم اس رُوپ میں ملو گی۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔" جیسے اُسے کسی نے آسمان سے زمین پر پھینک دیا ہو۔

"شاداب تم میرے چاک گریباں کو نہ دیکھو آج تمہارے پہلو میں آئی ہوں۔ شاید وقت کا تقاضہ یہی ہے۔ میں ایک لپکتا ہوا شعلہ ہی نہیں، سربازار رُسوا بھی ہوں۔"

پہلے پہل تو جوانی کا خواب نظر آتی تھیں، اَب بے حجابی کا کفن لئے آئی ہو۔" شاداب کی رگ رگ میں لہو موجیں مار رہا تھا۔

اب تمہیں مجھ سے ملنے میں حجاب آتا ہے؟ زندگی کی جن راہوں سے ہو کر تم تک پہنچی ہوں۔ الفت نہ سہی بیوپار سہی۔"

"محبت کچھ اس طرح بے آبرو ہو گی۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کبھی تمہارے ہاتھ میں سرسبز حیا دیکھی تھی۔"

"محبت کے جواب میں کچھ اور نہ پوچھو۔ عورت وہ جنس ہے جس کے عنوان بدلتے رہتے ہیں۔"

"میں ساری زندگی جس کی یاد میں تڑپتا رہا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس طرح میری خواب گاہ میں آئے گی اور میرے احساس کو جھنجھوڑے گی۔"

"مجھے اس مقام پر دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی کہ زندگی کے ریلے نے مجھے تمہاری طرف دھکیل دیا ہے۔"

"تمہیں اپنا نہیں سکا مگر کچھ عرصہ تمہاری خوابوں میں جیتا رہا۔ گرچہ تم پیکر رعنائی ہو مگر اب میرے پاس کیا لینے آئی ہو۔"

"میں نے خود اپنے کئے کی سزا پائی ہے۔ میں نے کتنی خواب گاہوں کو سجایا ہے۔ اس لئے میں تمہاری نظروں سے گر چکی ہوں۔ تم اگر اپنے آپ کو محبت کے پاسبانوں میں شمار کرتے ہو تو مجھے اور ڈوبنے سے بچا لو۔"

"جب تم طوفانوں میں گھر چکی ہو تو ساحل کا خیال آیا۔"

"میں چاندنی راتوں کی ویرانی ہوں تمہیں میری باتوں سے حیرت اس لئے ہو رہی ہے کہ آج کی رات تم نے میرا جسم خرید لیا۔ اس لئے مجھ سے اجتناب کر رہے ہو۔" اس کے سینے کا زخم مہک اُٹھا تھا۔

تم نے سنہرے سکوں کی چھاؤں میں جینے کے لئے اپنا دل اور اپنا پیار بیچا تھا۔ دوسرے کا گھر آباد کر کے میرا آشیاں جلا دیا تھا۔ اب اپنے سینے سے لگانے کی امید کیوں رکھتے ہو۔" اس کی آواز سے درد ٹپکنے لگا تھا۔

"تم نے میرے جسم کی قیمت ادا کی ہے۔ آج کی رات جاوداں کر لو۔ اس لئے کہ کل صبح مجھے تمہاری خلوت گاہ سے چلے جانا ہے۔"

شاداب کا نشہ ٹوٹ چکا تھا۔ زندگی کی یہ حقیقت شراب کی کڑواہٹ سے بھی کہیں زیادہ سخت تھی۔ اُسے شراب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی مدہوشی ہی میں ہوش و حواس قائم رہتے ہیں۔ اس نے فون کر کے بلیک اینڈ وائٹ کی بوتل طلب کی اور ساتھ ہی پل بھی۔

حنا کی مہتابی جبیں پر شباب کی جھلکیاں اور جوان سینے کی مخروطی اٹھان ذوقِ نظر کے لئے قیامت تھیں۔ مست آنکھوں اور ماڈرن اسٹائل سے کٹی ہوئی کاکلوں نے زندہ چہرے کو اس طرح اپنے جلو میں لے لیا تھا جیسے چاند کے

اوپر ابر کا ٹکڑا۔ سبک اور سڈول جسم کی لچک میں شباب
خمر کی انگڑائیاں بھری ہوئی تھیں۔ لباس سے ایسی خوشبو
آرہی تھی جس سے سارا کمرہ معطر ہوگیا تھا۔ وہ سرخ
مئے کی ایسی بوتل تھی جسے پینے کے لئے کسی جام اور پیمانے
کی ضرورت نہ تھی۔ اسے اگر کوئی مصور دیکھ لیتا تو اپنے
خوابوں میں سمالیتا۔

تھوڑی دیر میں وہی بیرا ایک ٹرے میں بلیک
اینڈ وائٹ کی بوتل، گلاس اور ایک طشتری میں برف
کے ٹکڑے لئے کمرے میں داخل ہوا۔ تمام چیزیں قرینے
سے میز پر لگانے کے بعد ایک اچٹتی ہوئی سی نظر حنا
پر ڈالی جو صوفے پر شاداب کے پہلو بہ پہلو سوگوار
بیٹھی تھی۔

"صاحب۔ کچھ کھانے کے لئے بھی لاؤں؟"

"نہیں" پھر اس نے حنا سے پوچھا "تمہارے
لئے کچھ منگواؤں؟"

"میں جس چیز کی بھوکی ہوں، اس کی بھوک غذا سے
نہیں مٹے گی۔" حنا نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

شاداب نے پھر پرس ٹٹولا اور ادائیگی کے بعد بیرا
کو دروازہ بند کرنے کے لئے کہا۔ بیرا نہایت مؤدب
انداز میں کمرے کا دروازہ بند کرکے چلا گیا۔ وہ نظر سے
قریب مگر دل سے دور شاداب کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔
اس نے بڑے اطمینان سے شراب کی بوتل کھولی اور دو
گلاسوں میں پیگ بنانے لگی۔

"تم نے یہ کب سے شروع کردیا؟"

"جب ہر شخص میرا جام شراب پیتا ہے تو پھر میں
اس ارغوانی شربت سے محروم کیوں رہوں؟"

"اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تمہاری جوانی
ظلمتوں کے جس دلدل میں پھنسی ہوئی ہے، اس سے
شراروں کے پھول کھلنے کی امید نہیں۔" شاداب نے پیگ اٹھا
کر ایک ہی سانس میں ختم کردیا۔ حنا اس کے لئے دوسرا
پیگ بنانے لگی۔ وہ بھی وسکی کی ہلکی ہلکی چسکی لے رہی تھی۔ اس
کے حلق سے کڑوے گھونٹ اس طرح اتر رہے تھے جیسے
شبنم نے آفتاب کا سینہ جلا دیا ہو۔

"پڑھنے والوں کا قحط ہے، ورنہ میری زندگی
ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔" حنا کی آنکھوں میں سرخ ڈورے
دوڑنے لگے تھے۔ "میرے خیال پر ہنسنے کی بجائے، مجھے
اپنے گلے سے لگالو۔"

"تم نے اپنی پرنور جوانی سے کتنی خواب گاہوں کو
جگمگایا ہوگا، مگر میری راتوں نے اندھیرے ہی اندھیرے
دیکھے ہیں۔"

ماحول میں نور کی صہبا چھلکی ہوئی تھی۔ منظر جھوم
رہا تھا اور بام و در کو وجد آرہا تھا۔ حنا نے اٹھ کر دروازہ
کی چٹخنی لگادی۔ اب وہ اپنی ساری اتار رہی تھی۔ شاداب
اس کے اس انداز پر چونک پڑا۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔"

"آج اپنے جسم کو سرسبز لے آئی ہوں۔ جسے کبھی
تمہارے پیار کی خاطر چھپا رکھا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے
اپنا بلاؤز بھی اتار دیا۔ بریسیئر میں اس کے سینے کی گولائیاں
کسی کار کی ہیڈ لائٹ کی طرح چمک رہی تھیں۔

"میری نظروں میں تمہارے جسم کی کوئی قیمت نہیں،
مجھے تمہاری روح سے پیار ہے۔" شاداب نے گلاس
میں پوری شراب بھرلی۔

"من کی دیوی کو دکھانے کے لئے تن کا لباس
اتار رہی ہوں۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "پیار کے لئے نہ
سہی اپنی قیمت کے لئے ....."

"میں نے سمجھا تھا کہ مہ جبینوں کا دستور رہی

ہی تغافل ہے ۔ اس لئے اپنے ارمانوں کو سینے میں تھپک تھپک کر سلا دیا تھا مگر تمہیں کال گرل کی صورت میں دیکھ کر میرے ذہن میں چنگاریاں سلگنے لگی ہیں ۔"

"میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوں ۔ میں جس گلشن کا پھول بن گئی تھی، وہاں میرے دل میں ایک کانٹا چبھ گیا ۔" وہ اس کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ گئی ۔

شاداب جام پر جام چڑھائے چلا جا رہا تھا ۔

" بس کرو شاداب ۔ اس دلکش سماں کو شراب کے دور میں برباد نہ کرو ۔" اس نے اس کے ہاتھ سے گلاس چھین لیا ۔

" ایک وقت تھا کہ بے پئے مدہوشی تھی ۔ اب تو جام پر جام پینے کے بعد بھی مخمور نہیں ہوں ۔" وہ نشے میں بہکنے لگا تھا ۔ " میں تمہاری داستان ضرور سنوں گا کہ اس مرحلے تک کیسے پہونچی ؟ "

میری داستان سراپا غم کے سوا کچھ بھی نہیں میرے سوتیلے باپ نے دولت کی سنہری چمک دیکھ کر جس شخص سے میری شادی کرا دی وہ دھوکے باز نکلا ۔ پرمٹ اور لائسنس حاصل کرنے کے لئے اس نے مجھے دوسروں کی بانہوں میں پھینک دیا ۔ پھر ایسی آندھی اٹھی کہ ڈالی کا پھول ٹوٹ کر پاؤں تلے مسل دیا گیا ۔ میں سب کی بانہوں میں رات کی دلہن ہوں ۔ ٹوٹی ہوئی کشتی کو ہوا کا رخ بہائے لئے جا رہا ہے ۔ تم ایسے وقت میں ملے جب میں سب کچھ لٹا چکی ہوں ۔" اس کی یہ داستان ایک مستقل زندگی بن چکی تھی ۔

شاداب کے سینے میں چتائیں سی جل رہی تھیں ۔ اس پر مدہوشی طاری تھی ۔ اسے ہر طرف دھندلی چھائی نظر آ رہی تھی ۔ اس کی نظروں سے ہر چیز اوجھل ہوتی جا رہی تھی ۔ غنودگی میں اس نے اپنا سر صوفے پر ڈال دیا تھا ۔

گیا

حنا نے اسے بازوؤں سے سہارا دے کر اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا ۔ وہ بے سدھ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر خوابوں کی وادیوں میں پہنچ چکا تھا ۔ حنا کے سینے میں جذبات کا دم گھٹ رہا تھا ۔ طلوع سحر کے بعد خود سپردگی کی مدت ختم ہونے والی تھی ۔ اسے اس کی بزم سے نکل کر پھر سر بازار آنا تھا ۔

ابھی صبح ہونے میں کچھ رات باقی تھی ۔ پہلو میں چارہ ساز تھا مگر دل میں درد کا طوفان اٹھا ہوا تھا ۔ اس نے کتنی سیجوں کو سجایا تھا مگر آج ان سلوٹوں میں کتنے ارمان کھلے تھے ؟ اپنی اس بے بسی پر اس کی جوانی بھڑک اٹھی تھی ۔ دوسرے بستر پر کروٹیں بدلتے اس نے رات گذار دی ۔

صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ شاداب کی آنکھ کھل گئی ۔ اچانک اس کی نظر گھڑی پر گئی تو پانچ بج رہے تھے ۔ درد سے سر پھٹا جا رہا تھا ۔ آنکھوں میں اب تک خمار باقی تھا ۔ اس نے دوسرے بستر پر نظر ڈالی، تو حنا کی بجائے سلوٹیں نظر آئیں ۔ شاید وہ جا چکی تھی ۔ رات کی پریاں تاریکی میں آتی ہیں اور پو پھٹنے سے پہلے اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہیں ۔ اس نے فون کر کے پورٹر کو بلوایا اور جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے سوٹ کیس بند کیا، جوتا پہنا اور بریف کیس ہاتھ میں لے لیا ۔ اس وقت تک پورٹر کمرے میں داخل ہو چکا تھا ۔ شاید دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا ۔ اسے منہ ہاتھ دھونے کا بھی وقت نہیں ملا ۔ جلدی جلدی نیچے اترا ۔ پورٹر نے سامان ٹیکسی میں رکھ دیا ۔ اس نے اسے ٹپ کر دیا ۔

ٹیکسی ہوڑہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئی ۔ صبح سویرے سڑکیں بالکل سنسان تھیں ۔ نسیم صبح سے اسے اپنا ذہن کچھ ہلکا ہوتا محسوس ہوا ۔ جب اسٹیشن پہنچا تو ٹرین

لیٹ گئی۔ سیٹ اس نے پہلے ہی سے بک کروالی تھی۔
سامان بک اسٹال کے پاس رکھ کر چند میگزین خریدے
پھر ٹی اسٹال سے چائے پی۔ عین اسی وقت ایک انسپکٹر
چند سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔

" آپ ہی کا نام شاداب ہے" اُس نے پوچھا۔

" جی ہاں۔"

" آج کی رات آپ نے پارک ہوٹل میں قیام کیا
تھا۔ اُس نے دوبارہ دریافت کیا۔

" مگر یہ سب باتیں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"
اس نے حیرانی سے پوچھا۔

" جس کمرے میں آپ ٹھہرے ہوئے تھے اس میں
ایک قتل ہوگیا ہے۔ اس لئے آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔"

" مگر انسپکٹر صاحب۔ میں کمرہ بالکل خالی چھوڑ
آیا تھا۔

" کمرے میں نہیں بلکہ باتھ روم میں حنا نامی ایک
لڑکی کو قتل کیا گیا ہے۔ ابھی ابھی لاش برآمد ہوئی ہے۔"

" میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ جو جان سے زیادہ
عزیز ہو، اس کی جان کون لے سکتا ہے؟"

یہ سب آپ عدالت میں بتایئے گا۔" انسپکٹر
نے سختی سے کہا۔ " ان کے سامان کی تلاشی لو۔"

سپاہیوں نے اُس کا بریف کیس اور سوٹ کیس
کھولا تو سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے خون آلود چھرا
موجود تھا۔ شاداب حیرت کا بت بنا کبھی انسپکٹر کو
دیکھتا کبھی خون آلود چھرے کو۔ اس کا دماغ ماؤف ہوا
جا رہا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو
گئے تھے۔ افسوس! بے بسی اور بے چارگی میں شاداب
کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے انسپکٹر کو لاکھ سمجھا
بجھانے کی کوشش کی مگر اُس نے اس کی ایک نہ سنی۔
اور اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی گئی۔ پھر اسے سپاہیو
ں کے ساتھ وین کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ انسپکٹر اگلی
سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وین دھواں چھوڑتی
ہوئی لال بازار تھانے کی طرف چل پڑی۔

عدالتی کارروائی شروع ہوئی تو تمام واقعات
شہادتیں، شاداب کے خلاف تھیں۔ وہ موقع واردات پر
حنا کے ساتھ دادِ عیش دیتا رہا۔ اور پھر اپنی ناکام محبت کا
انتقام لینے کے لئے مقتولہ کی جان لے لی۔ خون آلود چھرے
نے بھی اس کے جرم کو ثابت کرنے کے لئے نمایاں کا
کام کیا۔ اُسے عمر قید کی سزا ہوگئی۔ اس نے اپیل دائر
کر دی۔ دہلی سے اس کی بیوی اور بچے اس سے ملنے آگئے۔

" آپ نے یہ کیا کیا سرتاج؟" اُس کی بیوی اُسے
دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بچے چھوٹے تھے
اس لئے وہ صحیح بات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔

" بیگم کیا تم بھی مجھے مجرم سمجھتی ہو؟" وہ کراہ
کر بولا۔ " یہ قتل میں نے نہیں کیا اور یہ ناکردہ گناہ کی
سزا کا میں مستحق نہیں۔"

" اب کیا ہوگا" وہ گڑگڑائی۔

" اللہ سے امید رکھو۔ اپیل کے لئے میں نے
شہر کے سب سے بڑے بیرسٹر کا انتخاب کیا ہے۔ ایک نہ
ایک دن حق کی فتح ہوگی۔"

تھوڑی دیر تک دونوں میں گھریلو باتیں ہوتی رہیں
بچوں کے مستقبل کی باتیں بہت سی کاروباری لین دین
کی باتیں اسے سمجھائیں۔ ایک سپاہی نے آکر بتایا کہ ملاقات
کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ وہ اپنے شوہر سے جدا ہوتے وقت بار
مڑ مڑ کر دیکھتی اور آنسو بہاتی جا رہی تھی۔

ہائی کورٹ میں اس کے مقدمے کی پیروی بیرسٹر نے کی۔ وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی میں زوردار بحث ہوئی۔ عدالت کا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آخر میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جج نے اس کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس کی عمر قید کی سزا بحال رہی۔ سپریم کورٹ میں بھی اپیل مسترد ہو گئی۔

وہ جیل میں عام قیدیوں کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ دوسرے قیدیوں کی بہ نسبت بہت ہی کم گو، شریف اور فرمانبردار تھا۔ وقت کا پرندہ پرواز کرتا رہا اور زندگی کی گھڑی اپنی رفتار سے چلتی رہی۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی بھی اچھی خاصی لانبی ہو گئی تھی۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ شاداب کے چہرے کی شادابی ماند پڑ چکی تھی۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ زندگی کے بارہ سال زندان میں گزار چکا تھا۔ زندان کی تاریکیوں میں وہ ایک جگنو تھا جس کی تمام قیدی عزت کرتے تھے۔ اور اس کی شرافت کے سب ہی قائل تھے۔ جب قیدیوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا تو وہی ان کی صلح کرواتا۔

کافی عرصہ سے شاداب کو اپنے بال بچوں اور بیوی کی خیریت کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ وہ ان کی طرف سے متفکر تھا۔ ... خط و کتابت بھی بند تھی۔ اس قید و بند کی زندگی سے اس کی روح مجروح ہو چکی تھی۔ جب وہ آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا تو سوچتا کہ ان کی زندگی کتنی آسان ہے۔ انسان سے بہتر، جو نیلگوں فلک پر آزادی سے مائل بہ پرواز ہیں اور ناکردہ گناہ کی سزا کے وجہ سے اسے اپنا وجود ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے جگنو کو اپنی مٹھی میں بند کر رکھا ہو۔

ایک بار جیل میں چند قیدی لائے گئے، جو پہلی نظر میں چھٹے ہوئے بدمعاش اور غنڈے لگتے تھے جس کی عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ مگر جسمانی طور پر اب بھی بہت طاقتور دکھائی دیتا تھا۔ پرانے قیدیوں کے ساتھ بیٹھ گیا سب ہی خوش گپیوں میں مشغول تھے۔

"ارے بھائی تم کس جرم کی پاداش میں قید کئے گئے ہو؟" ایک قیدی نے اس سے پوچھا۔

اس نے زوردار قہقہہ لگایا پھر اپنی کہانی سنائی۔

"دوستو! میں ایک فراڈ ہوں۔ اس بار جعلسازی کے جرم میں مجھے سزا ہو گئی۔ اس کے قبل میں نے بے شمار جرم کئے تھے مگر صاف بچ نکلا۔ اس جیل کی چہار دیواری میں رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں زیادہ دنوں تک مقید نہیں رہ سکتا۔"

شاداب کو اس کا چہرہ شناسا نظر آیا۔ وہ اس کے روبرو کھڑا ہو گیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"تمہارا نام کیا ہے اور تم کس جرم کے مرتکب ہوئے ہو؟"

"میرا نام سردار امجد ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"آپ کا پرانا نمک خوار۔ کلکتہ برانچ کا منیجر۔"

"اچھا یہ تم ہو جسے غبن کے الزام میں میں نے برطرف کر دیا تھا"

"جی حضور۔ لاکھوں روپے کے خرد برد کا مقدمہ بھی دائر کرنے والے تھے۔" وہ کھسیا کر ہنسا۔ "مگر آپ کس جرم کی سزا بھگت رہے ہیں۔"

"جرم اور سزا۔ یہ تو ہمارے قانون کے بنائے ہوئے ضابطے ہیں۔ اس سے مفر نہیں۔" شاداب اسے گھور کر رہ گیا۔ اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ تب اس کے قیدی ساتھیوں نے بتایا۔"

"کسی نامعلوم شخص نے پارک ہوٹل میں ایک لڑکی کو قتل کر کے خون آلود چھرا اس کے سوٹ کیس میں چھپا

دیا تھا۔ اس ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔

"اس دنیا میں کون قصوروار ہے اور کون نہیں یہ کہنا مشکل ہے۔ جس لڑکی کا قتل ہوا تھا ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ پرانے تعلقات ہوں۔" اس نے جذبات سے بے قابو ہو کر اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ "جب کبھی محبت نفرت میں بدل جاتی ہے تو آدمی غیر ارادی طور پر قتل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے تمام واقعات سے باخبر ہو۔" دوسرے قیدیوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

شاداب کی تیز نظریں اس کے سینے میں چھپے ہوئے حقیقت کو جاننے کے لئے اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"ایک ایسے مقام پر مالک اور ملازم کی ملاقات ہوتی ہے جہاں سبھی مجرم برابر ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہو۔ چاہے کسی جرم کا مرتکب ہو۔"

اس کی باتوں سے شاداب کو شک ہوا کہ منیجر جانتا ہے جس نے حنا کو قتل کیا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں میرے قاتل ہونے کی خبر سب سے پہلے کب اور کہاں ملی؟"

"دنیا قتل، چوری، ڈاکے اور جرم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کب اور کہاں سنا تھا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"تمہارے جیسے فراڈ اور دوسرے ملزموں میں رابطہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے رازداں بھی ہوتے ہیں شاید تم نے سنا ہو کہ حنا کا قتل کس نے کیا تھا؟" شاداب نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"قاتل وہی ہوتا ہے جس کے پاس سے خون آلود چھرا برآمد ہوتا ہے اور پھر قتل بھی تو آپ کے کمرے میں ہوا تھا۔ اس لئے دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے سے کیا فائدہ؟ کمرے میں آپ کی موجودگی اور پھر کسی دوسرے شخص کو آپ کے سوٹ کیس میں چھرا چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ چھرا لے کر بھی فرار ہو سکتا تھا۔"

شاداب کا شک یقین میں تبدیل ہو چکا تھا یہی وہ قاتل ہے جس نے حنا کا خون کیا تھا۔ اس خیال سے وہ بے چین ہو گیا۔ وہ تمام رات کروٹیں بدلتا رہا اور اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کرتا رہا۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ہجوم چکر لگا رہا تھا۔ اس ناکردہ گناہ کی وجہ سے اس کا خاندان تباہ ہو گیا تھا۔ بیوی بچے کی جدائی اس کے دل میں کچوکے لگانے لگی۔ اب تو اس کے بچے بھی جوان ہو گئے ہوں گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے اور کہاں کا قانون — جس ناکردہ جرم کے تحت اسے عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ وہ جوانی سے بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ اسے اپنی زندگی ایک بوجھ محسوس ہونے لگی تھی۔

کئی روز تک وہ اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ کرب کی آگ اسے اندر ہی اندر جلا رہی تھی۔ اس کے اندیشے کی آنچ بھڑک اٹھی تھی۔ "یقیناً اسی کمینے سردار امجد کی حرکت ہے جس نے مجھے اس جرم میں ملوث کر دیا تھا، اگر موقع ملا تو میں اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دوں گا۔"

کئی ہفتے گزر گئے۔ شاداب اور امجد کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کئی راتوں سے اس کی آنکھوں کی نیند اڑ چکی تھی۔

رات تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ جیل کی چہار دیواری میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ عام قیدیوں سے مستثنیٰ تھا۔ اس کے اخلاق و عادات اور شرافت کو دیکھ

یلر نے اسے آزادی دے رکھی تھی کہ جیل خانے کے کسی بھی
شے میں بلا روک ٹوک آجا سکتا تھا۔

اچانک اس کے کانوں میں کسی چیز کے کاٹنے کی
از آئی۔ وہ ٹھٹکتے ٹھٹکتے رک گیا اور دھیان سے آواز
نے کی کوشش کی۔ پھر وہ آواز کی طرف بڑھا۔ اس نے
ل کے بڑے گیٹ کا سلاخ کٹتے دیکھا۔ چند سلاخیں
ٹنے کے بعد اندر سے کوئی شخص فرار ہونے کے لئے نکلنا
اہتا تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اس قیدی کو دیکھ
ہا تھا جو سلاخوں کے درمیان نکل کر باہر آیا تھا۔
رار ہونے والا امجد تھا۔ اس نے بھی شاداب کو دیکھ
لیا تھا۔ باہر نکلتے ہی وہ شاداب کو دیوار کے قریب لے
یا اور سرگوشیوں میں کہا۔ "میں کئی روز سے یہاں سے
رار ہونے کی کوشش میں تھا۔ سلاخیں کاٹنے کا اوزار
ہت ہی مشکل سے دستیاب ہوا ہے۔ ہمارے ساتھ چند
ور قیدی فرار ہوں گے۔ آپ صرف اپنی زبان بند رکھیں
۔ ورنہ اسی اوزار سے آپ کا خاتمہ کر دوں گا۔ آپ بھی
ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

"شاداب غصے سے کھول رہا تھا۔ اس نے امجد
ا ہاتھ زور سے جھٹک دیا اور کہا "میں فرار ہونا نہیں
چاہتا۔ تم مجھے قتل کرنا کیوں چاہتے ہو؟ تم تو آج
سے بارہ سال قبل ہی مجھے قتل کر چکے ہو۔"

ان کی تیز گفتگو سے سپاہیوں نے آوازیں دینی
شروع کیں۔ پھر سیٹی بجنے لگی۔ چاروں طرف روشنی
پھیل گئی۔ امجد کو اپنے بچاؤ کی ایک ہی صورت نظر
آئی کہ دوبارہ کوٹھری میں واپس چلا جائے۔ شاداب
بھی واپس اپنی کوٹھری میں جا کر خیالات کا جال بننے لگا۔

صبح کو سپاہیوں نے دیکھا کہ چہار دیواری کی سلاخیں
کٹی ہوئی ہیں۔ جیلر نے آکر تفتیش شروع کی۔ تمام قیدیوں
نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جو قیدی اس واقعے سے واقف
تھے، انہوں نے خاموش رہنے ہی میں مصلحت سمجھی کیونکہ
امجد خونخوار اور ظالم تھا۔

"جیلر جانتا تھا کہ شاداب تمام قیدیوں میں سب
سے نیک اور صاف گو ہے اس لئے اس سے دریافت
کیا۔ "تم سچے اور صاف گو شخص ہو۔ لہٰذا سچ سچ بتاؤ
کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟"

بظاہر امجد بے تعلق سا ایک طرف کھڑا ——
صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں
تیز تھیں اور خوف سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔

"راز ظاہر کر دوں۔ کیونکہ اس شخص کی وجہ سے
میری زندگی جہنم کا نمونہ بن چکی ہے۔ میرے ہونٹوں کی
مسکراہٹ چرالی ہے۔ اس سے انتقام لینے کا اس سے
اچھا موقع اور کبھی نہیں ملے گا۔ اس طرح اس کی
قید و بند کی مدتوں میں اضافہ ہو جائے گا۔" شاداب
نے سوچا۔ "اگر میرا شک غلط نکلا تو میں اپنے ضمیر کی بوجھ
سے زندہ درگور ہو جاؤں گا۔"

" مجھے سچ سچ بتاؤ کہ سلاخیں کس نے کاٹی ہیں۔"
جیلر نے دوبارہ نرمی سے پوچھا۔

شاداب نے ایک نظر امجد پر ڈالی جو سوکھے پتے
کی طرح کانپ رہا تھا — پھر کہا۔ " مجھے اس کا علم نہیں
خدا ہی بہتر جانتا ہے یہ کس کی حرکت ہے۔"

جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اسے اپنے آفس میں طلب
کیا۔ لیکن اس نے زبان نہیں کھولی۔ اور اس طرح
اتنے بڑے واقعہ پر پردہ پڑ گیا۔

اسی رات جب کہ شاداب اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا
کے جھروکے میں جھانک رہا تھا امجد آہستہ آہستہ چلتا
ہوا، اس کے پاس پہونچا اور اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" شاداب نے کہا۔ "اب میرے پاس کیا رکھا ہے، سوائے ماضی کے سنہرے خواب کے ..."

امجد بُت کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔ "مجھے معاف کر دیجئے۔"

"کیوں؟" شاداب نے کہا۔ "تم نے میرا کیا بگاڑا ہے؟"

"میں نے ہی حنا کا خون کیا تھا۔ دراصل غبن کے جرم میں پھنستا دیکھ کر میں نے یہ پلان بنایا تھا۔ حنا کو رقم دے کر ہوٹل کے کمرے میں بھجوایا تھا تاکہ وہ شراب میں زہر ملا کر آپ کو پلا دے۔ نہ معلوم اس نے میرے پروگرام پر عمل کیوں نہیں کیا؟ جب رات کے آخری پہر میں کمرے میں داخل ہوا اور حنا کو باتھ روم میں لے جا کر باز پرس کی تو اس نے مجھے دھمکی دی کہ مجبوراً مجھے اسے چھرے سے ہلاک کرنا پڑا۔ وہ بے جان ہو کر باتھ روم کے فرش پر گر پڑی۔ خون آلود چھرا لے کر اگر میں باہر نکلتا تو کسی نہ کسی کی نظر پڑ سکتی تھی۔ اس لئے آپ کے سوٹ کیس میں چھپا دیا۔ کیونکہ شراب پی کر آپ بے خبر سوئے ہوئے تھے۔"

شاداب خاموشی سے اسے ٹک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ حنا نے اسے زہر کیوں نہیں دیا۔

"میرے مالک — خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنے جرم کا اقبال کرتا ہوں۔ اب آپ رہا ہو کر بآسانی اپنے گھر جا سکیں گے۔"

"گھر کیسا گھر! اب تو میرا خاندان برباد ہو چکا ہے۔ پتہ نہیں میری بیوی اور بچے کہاں ہیں؟ میں نے زندگی کے جو بارہ سال ناکردہ گناہ کی پاداش میں گزارے ہیں اسے واپس کر سکتے ہو؟ کیا تم قانون کے وہ ضابطے بدلوا سکتے ہو جس کی بنا پر بے گناہ لوگوں کو سزا ملتی ہے اور ایک انسان کی زندگی سے وابستہ بہت ساری زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں؟" بارہ سال کی قید نے اسے آزاد دنیا کی نعمتوں سے محروم کر دیا تھا۔

امجد نے پاگلوں کی طرح اپنا سر اس کے سر پر مارتے ہوئے کہا۔ "میں ہر سزا سہنے کو تیار ہوں۔ چاہے قانون مجھے کوڑے سے مارے یا پھانسی دے دے۔ مگر آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کے دل میں ایسا نور ہے جو کسی فرشتہ میں ہوتا ہے۔ آپ نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے ہی آپ کی زندگی میں اندھیرے بکھیرے ہیں پھر بھی جیلر کے سامنے مجھے مجرم ثابت کرنے سے اجتناب کیا۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"خدا تم پر ابرِ کرم کی بارش کرے۔" اُسے روتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی تارے جھلملانے لگے۔

صبح امجد نے حکام کے سامنے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔

جیلر جب شاداب کی رہائی کا پروانہ لئے جیل کے اندر داخل ہوا تو اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی ... حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

رضا روحی

لائٹ ہاؤز

لائٹ ہاؤز ٹاور کی بتی ٹمٹماکر خاموش ہوگئی اور ہر چیز سیاہی میں ڈوب گئی۔ پھر کنکریٹ سے بنا ہوا کہن سال لائٹ ہاؤز بظاہر بڑی تمکنت سے وسیع وعریض سمندر کے مشرقی ساحل پر کھڑا تھا ...... ساحل سے چند میل کے فاصلے پر بسے شہر والے اس بات سے واقف تھے کہ لائٹ ہاؤز ٹاور کی بتی بجھ چکی ہے ...... جدت پسند شہر والوں کو یوں بھی قدیم لائٹ ہاؤز ٹاور کے وجود سے کوئی دلچسپی نہ تھی ...... مگر سمندر کے سینے پر تیرنے والے جہازوں کو روشنی کی ضرورت تھی اور قدیم لائٹ ہاؤز ٹاور کی بھی کہ اس کے بغیر وہ اپنی راہ اور سمت کا تعین نہیں کر سکتے تھے۔

روشنی کی عدم موجودگی میں جب رات کی تاریکی اپنے شباب پر ہوتی تو اس وقت سمندر پر تیرتے ہوئے جہاز اپنا راستہ بھول کر رات بھر بھٹکا کرتے اور جب صبح کاذب کا ہلکا اجالا تاریکی کی چادر چیر کر نمودار ہوتا تو جہاز اپنے راستے کا تعین کر کے آگے بڑھ جاتے۔ شہر کی انتظامیہ سے لائٹ ہاؤز ٹاور کی اہمیت چھپی ہوئی نہ تھی مگر انتظامیہ نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی کہ لائٹ ہاؤز ٹاور جو کئی صدیوں سے ساحل کو رات بھر منور کئے رکھتا تھا تو اچانک اس کے ناکارہ ہونے کی کیا وجہ ہے۔

صدیوں پرانے لائٹ ہاؤز کا اگر قریب سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ٹاور کس قدر شکستہ حالت میں ہے۔ ٹاور کی دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے ادھڑ چکا ہے۔ کئی فٹ موٹی دیواروں کے جوڑ کھل چکے ہیں اور دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی ہیں ...... دراڑوں اور روزنوں سے حشرات الارض اور چمگادڑیں داخل ہو کر لائٹ ہاؤز کو اپنا مکین بنا چکی ہیں۔ ٹاور کے اندر کی فضا میں انتہائی نمی ہے ...... ہر سو اد ھر پلاسٹر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں۔ جب طاقتور موجوں کے تھپیڑے ٹاور کی دیواروں سے ٹکراتے ہیں تو ٹاور کی بہن سالہ روح لرز اٹھتی ہے ...... اور کئی فٹ ریت کے اندر دھنسے ہوئے اس کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں ...... ایسے میں سرکش موجوں کا پانی دراڑوں اور روزنوں سے ٹاور کے اندر داخل ہو کر اس کی بنیادوں کو متاثر کرنے لگتا ہے تو لائٹ ہاؤز ٹاور کے اسٹور روم میں پڑا ہڈیوں کا ڈھانچہ درد و کرب سے چیخنے چلانے لگتا ہے۔ چیخوں کی آوازیں سن کر ابابیلیں اور چمگادڑیں اپنے پر بڑے خوفناک انداز میں پھڑپھڑانے لگتی ہیں اور

لائٹ ہاؤز ٹاور کا سارا ماحول دہشت ناک ہوجاتا ہے۔

ایسے میں ٹاور کے اندر اپنے سفر کا آغاز اس نے شوروم سے کیا — جہاں اس کا بوڑھا باپ، لائٹ ہاؤز ٹاور کا محافظ اپنی فالج زدہ ناکارہ ٹانگ کا ماتم کرتا ہوا صدیوں پرانی روایتوں کی پاسداری کا درس دیتا ہوا ختم ہوگیا تھا۔ کچھ دن اس نے اپنے بوڑھے باپ کی موت کا ماتم کیا۔ یاس و حسرت کی تصویر بنا باپ کی لاش کے پاس بیٹھا اسے تکتا رہا۔ جب لاش سڑنے لگی اور اُس سے تعفن اٹھنے لگا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی کمسنی کے باوجود اُسے لائٹ ہاؤز ٹاور کی روشنی کی اہمیت کا اندازہ ہوچکا تھا۔

شوروم سے نکل کر اس نے نچلے حصے میں بنے ہوئے واٹر ٹینک کا جائزہ لیا اور مطمئن ہوگیا کہ ٹینک پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر واپس شوروم میں داخل ہوگیا۔ لائٹ ہاؤز کے بوڑھے محافظ کی لاش کی جگہ آہستہ آہستہ ایک ڈھانچہ لے رہا تھا۔ وہ خوف سے کانپ اٹھا اور لاش پر ایک آخری نظر ڈال کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسٹور روم کے اوپر آئل روم بنی ہوئی تھی۔ اس نے تیل کے ذخیرے کا جائزہ لیا۔ تیل کا بہت بڑا ذخیرہ اب بھی موجود تھا جسے دیکھ کر اس نے مطمئن انداز میں اپنا سر ہلایا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا لونگ روم[1] میں داخل ہوا۔ لونگ روم میں جگہ جگہ ادھڑے پلاسٹر کا ملبہ پڑا ہوا تھا۔ کمرے کے فرش پر حشرات العارض رینگ رہے تھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا وہ سیڑھی کے پاس پہنچ گیا اور اپنے جسم پر رینگتے ہوئے حشرات العارض سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کرنے لگا اور جب اس جدوجہد میں کامیاب ہو کر اس نے سیڑھی پر قدم رکھا تو اس نے محسوس کیا کہ کئی صدیاں اس پر اپنا سایہ ڈال کر گزر چکی ہیں۔ جیسے ہی اس نے حشرات العارض سے چھٹکارا پا کر سیڑھی پر قدم رکھا تو وہ چونک پڑا کیونکہ نامعلوم ہاتھوں کی یورش سے نیچے دھکیلنے پر آمادہ تھی —— وہ نامعلوم ہاتھوں سے برسرِ پیکار ہوگیا اور بعد مشکل دس سیڑھیاں اس نے جب طے کیں تو اس کا سانس پھول رہا تھا ....

.... سیڑھیوں کے اختتام پر بیڈ روم تھا جس میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ حشرات العارض اور نامعلوم ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کرتے کرتے وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ بیڈ روم کا ماحول بڑا ہی فرحت بخش تھا۔ یہاں حشرات العارض کا وجود تھا اور نہ ہی نامعلوم ہاتھوں کی یلغار —— وہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ کئی بار فرش پر بکھری ہوئی چیزوں سے الجھ الجھ کر گر پڑا۔ بستر کے قریب پہنچ کر اس نے ٹٹول کر دیکھا۔ بستر صاف مگر یخ بستہ تھا۔ وہ بستر پر دراز ہوگیا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ کئی لمحے اس نے یہ غور کیا کہ ٹاور کے اندر نامعلوم ہاتھ کیسے در آئے جب کہ ٹاور کا اکلوتا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ جب اس کا ذہن اس کی سوچوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو غنودگی اس پر چھانے لگی۔ اچانک اس کے باپ کے کہے ہوئے آخری الفاظ اس کے ڈوبتے ذہن میں گونج اُٹھے —

"تم پر کتنے ہی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے .... تم اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو گے ..... لائٹ ہاؤز ٹاور کی بتی کبھی بجھنے نہ پائے ...... صدیوں سے ہمارے آباؤ اجداد لائٹ ہاؤز ٹاور کی روشنی کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔ ایسی تمہاری اپنی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ یہ لو یہ ماچس کی ڈبیہ ہے۔ اس میں صرف تین تیلیاں ہیں۔ ....

---

1. Living room

انہیں بڑی احتیاط اور کفایت شعاری سے استعمال کرو
...... یہ تمہیں لیمپ روم تک پہنچنے میں مدد دیں گی
...... لائٹ ہاؤز ٹاور کی روشنی جلانے کے لئے بھی
تمہیں یہ تیلیاں درکار ہیں۔ اُن کی حفاظت کرو..."

اُس کا ذہن جاگ اٹھا۔ اور وہ کروٹ بدل کر اندھیرے میں تکنے لگا۔ اچانک ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آواز سارے ٹاور میں گونج اُٹھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا...... ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آواز ایک بار پھر ٹاور میں گونجی تو اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"افسوس کہ لائٹ ہاؤز ٹاور کی روشنی میرے ساتھ ہی ختم ہو گئی ـــــ کاش تمہیں اُس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا..... تو یوں تم آرام سے سو نہ جاتے.."

آواز میں انتہائی درد پوشیدہ تھا۔ احساسِ تغافل اور ندامت نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ نقاہت اور تھکن کے باعث اس کے جسم کے سارے اعضا لرزہ براندام تھے...... ایک قدم آگے بڑھانا جیسے ناممکن لگ رہا تھا۔ بستر کا جیسے سہارا لینا اب ممکن نہ تھا۔ وہ سیڑھی پر بیٹھ گیا اور سستانے لگا۔ اوپر لیمپ روم تک پہنچنے کے لئے مزید ایک عرصہ درکار تھا۔ اس کی آنکھوں میں گرم آنسو تیر رہے تھے۔

"رونا مردوں کی شان کے خلاف ہے" اس کے باپ نے سالوں قبل اُسے روتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔ اپنے بکھرے ہوئے وجود اور منتشر حواس کو مجتمع کر کے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک سیڑھی وہ آسانی سے چڑھ گیا۔ دوسری سیڑھی چڑھتے ہوئے بھی اُسے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اب یہاں سے سیڑھیوں کا رُخ بدل کر ایک راہداری میں مڑ گیا تھا۔ یہاں سے اُسے پتلی سی راہداری میں موجود سیڑھیوں کو چڑھ کر بالائی اسٹور روم پھر سرچ روم یا لیمپ روم پہنچنا تھا۔

وہ راہداری میں داخل ہوا۔ تنگ و تاریک راہداری کا بے انتہا نم تھی۔ جیسے ہی اس نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھا اس کا پیر پھسل گیا۔ بروقت وہ اپنا توازن قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکا مگر سنبھلتے ہوئے اس کے لبوں سے جو چیخ آزاد ہوئی تو دوسرے ہی پل سینکڑوں چمگادڑیں اور ابابیلیں اپنے خوفناک پر پھڑپھڑاتے ہوئے اُس پر ٹوٹ پڑے۔

کاش میں اپنے باپ کی وصیت سے نافرمانی کر سکتا اس نے دکھ سے سوچا۔ اب واپس لوٹنا ناممکن تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا اور آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

راہداری کا اختتام ایک پلیٹ فارم پر ہوتا تھا۔ جہاں کی دیواروں میں دو آہنی دروازے نصب تھے۔ ... ایک دروازہ سرچ روم میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ ٹاور کی باہری درز میں نصب تھا۔ اس دروازے کے باہر ایک چھوٹا سا لوہے کا پلیٹ فارم تھا اور باہری دیوار سے لگی لوہے کی سیڑھی اوپر لیمپ تک پہنچا سکتی تھی۔ جہاں اس کے سفر کی انتہا تھی۔

اس نے اپنے ذہن میں راستے کا نقشہ مرتب کیا اور اپنے آپ کو دلاسہ دیتا ہوا چمگادڑوں اور ابابیلوں سے برسرِ پیکار ہو گیا۔

اپنے جسم کے مختلف حصوں سے چپکی ہوئی چمگادڑوں کو نوچ نوچ کر پھینکتا ہوا وہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اچانک رک کر وہ راہداری کا جائزہ لینے لگا کہ جانے کہاں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا داخل ہو کر اس کے وجود سے مس ہوا تھا۔ جس سیڑھی پر وہ کھڑا تھا اُس سے تین سیڑھیاں اوپر چوکور پتھر جانے کب طوفانی لہروں کا شکار ہو کر دیوار

سے اکھڑ چکا تھا۔ دیوار کے روزن سے ہلکی ہلکی روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ یخ بستہ ہوا کے جھونکے اُسی روزن سے داخل ہو کر اس کے تھکے ہوئے اعضا کو سکون سے ہمکنار کر رہے تھے توانائی اور تازگی اس کے رگ رگ میں سرایت کر گئی اور وہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھا۔ ابابیلیں اب بھی اس کے جسم سے ٹکرا رہی تھیں۔ مگر وہ اُن کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر وہ اپنے پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔

دور بہت دور نیچے اسٹور روم میں پڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے کے جبڑے کھلے اور سارے ٹاور میں اس کی آواز گونج اُٹھی۔

"آفرین ہے تم پر بیٹے۔ اب تھوڑی سی تکلیف اور برداشت کر لو۔ صدیوں سے جلتی ہوئی ٹاور کی بتی میری موت کے ساتھ ہی بجھ چکی ہے۔ سمندر طوفان کی زد میں آچکا ہے۔ جہاز اپنا راستہ بھٹک چکے ہیں۔ انہیں روشنی کی ضرورت ہے۔ اُٹھو ایک آخری مرحلہ رہ گیا ہے اُسے بھی سَر کر لو۔"

چمگادڑوں اور ابابیلوں سے جھڑپ کے دوران اس کا سارا جسم لہو لہان ہو چکا تھا...... وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر سستانا چاہتا تھا...... مگر مجبوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے ماچس ٹٹول کر دیکھا اس میں صرف تین تیلیاں موجود تھیں۔ اس نے سوچا کہ لائٹ ہاؤز ٹاور کی بستی کو ایک بار روشن کرنے کے بعد وہ شہر جا کر مزید ماچس کی ڈبیاں خرید لائے گا۔ اور ٹاور کی بتی کو ہمیشہ جلائے رکھے گا کہ اب تک جو نقصان بتی کے بجھ جانے سے ہوا ہے اس کا کچھ نہ کچھ ازالہ کر سکے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے ماچس کی ڈبیہ سے ایک تیلی نکال کر جلائی اور پلیٹ فارم پر بنی آہنی دروازوں کا جائزہ لیا۔ دروازہ میں زنگ آلود قفل لگے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ تیلی دم توڑ دیتی۔ اس نے لپک کر دیوار میں بنے طاق سے چابیوں کا گچھا اٹھا لیا۔ تیلی بجھ گئی اور ہر سو اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا وہ سروس روم کے دروازے پر پہنچا اور چابی کی مدد سے زنگ آلود قفل کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی لمحوں کی کوشش کے بعد قفل کھل گیا۔ آہنی پٹ کھول کر وہ سروس روم میں داخل ہوا۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ سروس روم کے چھوٹے سے اسٹول پر ایک لالٹین رہا کرتا تھا۔ اس نے دوسری تیلی جلائی اور اسٹول پر رکھے ہوئے لالٹین کو روشن کیا پھر اس نے سروس روم کا جائزہ لیا بستی کو رات بھر جلائے رکھنے کا میکینزم زنگ آلود ہو چکا تھا۔ اُس نے میکنزم کو گھس کر صاف کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اسے اپنی تمام تر طاقت کا استعمال کرکے وزنی کلوک کے ہینڈل کو گھما کر کلوک کے تاروں کا وزن ٹھیک کرنا تھا میکنزم صاف کرنے کے بعد وہ اس مشکل کام میں جٹ گیا۔ جب وہ اس مشکل کام سے فارغ ہوا تو نقاہت سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اُس کا سارا جسم پسینہ میں بھیگ چکا تھا اس نے اٹھنا چاہا تو محسوس ہوا کہ کسی غیر مرئی طاقت نے اس کے دونوں پیروں کی ساری توانائی کھینچ لی ہے۔ کئی گھنٹے سستا لینے کے بعد وہ اٹھا اور رُک رُک کر اپنی سانسیں لیتا ہوا درست کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ماچس کی دو تیلیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اب آخری تیلی رہ گئی تھی۔ جس کے ذریعہ اسے لائٹ ہاؤز ٹاور کی انتہائی بلندیوں پر بنے پلیٹ فارم پر ایستادہ دیو پیکر فانوس کو روشن کرنا تھا۔ سروس روم کا آہنی دروازہ بند کرکے اس نے قفل لگایا اور دوسرا دروازہ کھولنے لگا جس کا قفل بھی زنگ آلود ہو چکا تھا۔

زنگ آلود دروازے کا زنگ آلود قفل کسی بھی

پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا ... اسے اپنی کھی طاقت قفل کھولنے کے عمل پر صرف کرنی پڑی۔ جب قفل کھل گیا تو اطمینان کی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی ... بے انتہا مسرت کا احساس لئے اس نے دروازے کا پٹ کھولا تو ٹاور کے اندر طوفانی ہوائیں داخل ہوئیں۔ اس نے دیکھا کہ سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے۔ دیو ہیکل لہریں ٹاور کی دیواروں سے اپنا سر پھوڑ رہی تھیں۔ صدیوں پرانا لائٹ ہاؤس اپنے تمام حصوں سے لرز اٹھا۔ شام کا دھندلکا ہر سو پھیلنے لگا۔ اس کی نظریں طوفانی لہروں پر مرکوز تھیں۔ مگر اس کا رواں رواں محسوس کر رہا تھا کہ لائٹ ہاؤس ٹاور ایک کشتی کی مانند ڈول رہا تھا۔ آہنی دروازے کے پٹ کے باہر بنے لوہے کے چھوٹے سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اس نے آہنی سیڑھی کا جائزہ لیا۔ آہنی سیڑھی میں زنگ لگ چکا تھا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں سیڑھی پر رکھا تو لگا کہ سیڑھی اس کا بوجھ نہ سنبھال سکے گی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ صدیوں کی محنت ایک پل کی کمزوری کی حاوی ہو جائے یہ اسے منظور نہ تھا۔ یہاں سے واپس لوٹنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی پیاسا ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے سمندر کے ساحل تک پہنچے اور بنا اپنی پیاس بجھائے واپس لوٹ جائے۔

یوں بھی وہ اپنی تمام زندگی لائٹ ہاؤس ٹاور کے اپنے باپ دادا سے لو جلائے رکھنے کے مشن کی نذر کر چکا تھا۔ اب آخری مرحلے میں زنگ آلود سیڑھی سے ڈر کر لوٹنا بڑی مضحکہ خیز بات تھی۔

ایک ہاتھ سے ریلنگ اور دوسرے ہاتھ سے اوپر کا پائیدان تھامے اس نے ہمت کر کے اپنا دوسرا پاؤں اگلے پائیدان پر جمایا۔ راڈ چر چرا کر اس کے بوجھ تلے دم توڑنے لگا۔ بصد مشکل اس نے آٹھ سیڑھیاں طے کیں۔ اب صرف دو سیڑھیاں رہ گئی تھیں۔ نویں سیڑھی پر قدم جمانے سے پہلے اس نے پلیٹ فارم کا چھجا ایک ہاتھ سے تھام لیا۔ جیسے ہی اس نے نویں سیڑھی پر قدم رکھا زنگ آلود سیڑھی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ سیڑھی ایک زوردار آواز کے ساتھ دیوار کے پتھروں سمیت اکھڑ کر طوفانی لہروں کا لقمہ بن گئی۔ اگر پلیٹ فارم کا چھجا اس نے تھام نہ لیا ہوتا تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ خود بھی بے چین لہروں کا لقمہ بن گیا ہوتا۔ اپنے معلق جسم کا بوجھ اٹھائے وہ بعد مشکل پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔

ابھی اندھیرا پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔ پلیٹ فارم کے بیچ ایستادہ فانوس سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس نے فانوس کو رگڑ رگڑ کر چمکایا۔ جب فانوس اچھی طرح صاف ہو گیا تو اس نے ماچس میں پڑی آخری تیلی نکالی اور بعد احتیاط بتی جلائی۔ بتی بھڑک اٹھی تو اس کا سانس جیسے سینے میں رک گیا۔ اسے لگا کہ بتی بھڑک کر بجھ جائے گی۔ چند ساعتوں بعد بتی اعتدال اور اعتماد کے ساتھ جلنے لگی۔

اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر مسرت رقصاں تھی۔ لائٹ ہاؤس ٹاور اپنی روشنی ہر سو بکھیرنے لگا۔ اپنے مشن کی کامیابی کی خوشی میں وہ بھول گیا کہ اب وہ نیچے نہیں جا سکے گا کہ آہنی سیڑھی اکھڑ چکی ہے۔

اس نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ طوفانی لہریں اب مزید اونچی ہو گئیں تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ لائٹ ہاؤس ٹاور خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا ہے۔

اچانک سارا سمندر تیز روشنی سے جگمگانے لگا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب اس کی آنکھیں تیز روشنی سے مانوس ہو گئیں تو اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے آہنی مینار پر دیو ہیکل بلب لگا ہوا ہے۔ جو برقی قوت سے جگمگا کر سارے سمندر کو تسخیر کر چکا ہے۔ اس نے حیرت

یوسف ناظم

شاعرِ درپردہ

کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اگر وہ کسی وقت دو چار منٹ کے لئے چُپ رہ گئے تو دنیا کے سارے کاروبار رک جائیں گے۔ یہ لوگ کافی مبارک ہیں کیونکہ اس وقت دنیا میں جتنا بھی شور ہو رہا ہے ان میں ان زبانی مصروف لوگوں کا کافی حصہ ہے۔ واکی ٹاکی قسم کے جتنے بھی اوزار اور مشینیں وجود میں آئی ہیں ان ہی کا ثمرہ ہیں۔ ان کے برخلاف کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں مستقل طور پر خاموش رہنا کوئی پاکیزہ عمل ہے اور یہ کہ اگر اس محنت کا اجر یہاں نہیں ملا تو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا۔ یہ لوگ بھی مبارک ہیں اور اگر خاموشی کا یہ عمل ثواب دارین لوٹنے کا ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے تو ہمارا یہ بے زبان شاعر مسمی حمید الماس ساکن بنگلور کافی ثواب لوٹ چکا ہے۔ (حالانکہ شاعروں کا کام مشاعرے لوٹنا ہوتا ہے، لیکن یہ مشاعرہ کیا، مشاعرے کے پیچھے بھی شاید ہی جاتا رہا ہو) اس شاعر کی شعر گوئی اور خود خموشی کی عمر ۳۲ سال ہو چکی ہے حمید الماس ۱۹۵۱ء سے شاعری کر رہے ہیں انھیں اس طرح بے دردی کے ساتھ چپ ہونے کی عادت کیوں پڑی، اس کی وجہ معلوم کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ سوال اگر ان سے کیا بھی گیا تو جواب میں خاموشی کے چند لمحوں کے علاوہ اور کچھ وصول نہ ہوگا۔ حمید الماس اپنے اعضائے جسمانی میں سب سے کم تکلیف اگر کسی عضو کو دیتے ہیں تو وہ ان کی زبان ہے۔

حمید الماس اردو شاعری میں بڑا پُرانا اور جانا پہچانا نام ہے۔ کیا تعجب بھاری بھر کم بھی ہو لیکن ہوا یہ کہ شاعر خود لوگوں سے اتنا کھنچا کھنچا، ڈرا ڈرا اور بچا بچا رہا کہ لوگ کبھی بھی اس کی طرف سے خوش ظن نہ ہو سکے۔ کسی کو کیا تکلیف تھی کہ وہ شاعر کی طرف بڑھ کر ہونہہ، ہاں اور جی سُننے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا۔ صرف ہونہہ اور فقط ہاں سُننے کے لئے لوگوں کے پاس بیکار وقت نہیں ہے۔

حمید الماس جب ساڑھے چودہ سال کے ہوئے تو ملازم ہو گئے اور وہ بھی سرکاری ملازم۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمت کے لئے بلوغ کی شرط نہیں تھی۔ (شعور کی شاید ہو) دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ سنہ ۱۹۴۹ء میں جب یہ محکمۂ لیبر میں ملازم ہوئے تو ان کی صرف مسیں ہی نہیں کوئی چیز بھی نہیں بھیگی تھی۔ لیکن یہ خود بھیگی بلی بنے رہے اور رفتہ رفتہ کوشش کر کے اسی محکمہ میں بالغ ہوئے ملازم ہوئے انھیں بہ مشکل دو سال ہوئے ہوں گے کہ انھوں نے شاعری

شروع کر دی اور شاعری جیسا کہ آپ کو معلوم ہے صرف شروع ہو سکتی ہے ختم نہیں ہو سکتی، آج یہ عالم ہے کہ حمید الماس کوئی ۵۰۰ سے زیادہ نظمیں اور غزلیں کہہ چکے ہیں۔ (ان کے اس اسکور میں دوسروں کی کہی ہوئی نظمیں بھی شامل ہیں ۔ مطلب یہ کہ وہ نظمیں جن کا ترجمہ شاعر نے کیا ہے) حمید الماس اپنے ذاتی شعر کہتے ہیں، دوسروں کی کہی ہوئی نظموں کا منظوم ترجمہ کرتے ہیں نثر لکھتے ہیں اور جب اتنا سب کچھ کرنے پر بھی ان کا جی نہیں بھرتا ہے تو ریڈیائی ڈرامے اور فیچر قلمبند کرتے ہیں ۔ بعض حضرات ریڈیائی فیچر کو اوپیرا کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اوپیرا پیدا کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے ۔ بہت خوشی کی بات ہے ورنہ ان کے اس ثانی کے بھی اوپیرا سہنے پڑتے۔

حمید الماس اُردو تو خیر جانتے ہی ہیں لیکن کنڑا زبان میں بھی ان کا عمل دخل ہے۔ اُردو ان کی مادری زبان ہے اور کنڑا پر ان کا نادری قبضہ ہے ۔ کنڑا زبان کی نظموں کی ایک کتاب کے مصنف ہیں ۔ میں انھیں اس کتاب کا مصنف اس لئے مانتا ہوں کہ پتہ نہیں کنڑا میں یہ نظمیں ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو کیا اتنی ہی اچھی ہیں ۔ ایک نظم تو مجھے اردو ہی لگی (لگی کے معنی معلوم کرنے کے ہیں۔ آج کل یہی لفظ زیادہ مستعمل ہے ۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی) ۔ چند مصرعے دیکھئے ۔

ہزار روپ دئیے ہیں خدا نے انساں کو
تمہاری صورتِ زیبا نہ جانے کیسی ہے
تمہاری دید تمہارے وصال سے پہلے
تصورات میں بنتے ہیں نت نئے خاکے
فلک پہ جیسے دھنک کی جمال آرائی
تمہاری چشم کہ کیری کی پھانک ہو جیسے
سفید دانت کہ ہوں جیسے انار کے دانے
وہ لب کہ جیسے شگفتہ گلاب کی پتّی
تمہاری زلف پہ کوئل کے رنگ کا دھوکہ
وغیرہ وغیرہ

اب ان مصرعوں میں وہ دغدغۂ حشر کہاں ہے جو کنڑا زبان کا خاصہ ہے ۔ اس لئے حمید الماس کو مترجم کی بجائے اگر میں مصنف کہوں تو اس میں غیر منصفی کیا ہے۔

حمید الماس ضلع گلبرگہ کے ایک موضع سگر شریف میں نمودار ہوئے ۔ سگر شریف کے صحیح محل وقوع کا مجھے علم نہیں ہے لیکن مقام ہے بہت مشہور ۔ اتنا مشہور کہ اسے کربلائے ثانی کہا جاتا ہے ۔

یقیناً شہر خموشاں ہوگا اور اس کے جائز متوطن ہونے کا حق صرف حمید الماس کو پہنچتا ہے ۔ حمید الماس، سگر شریف میں سنیچر کے دن پیدا ہوئے اور ان کے سنیچر کے دن پیدا ہونے کی اہمیت نہ ہوتی اگر انھیں سنیچر کے دن کی پیدا شدہ رفیقہ حیات نہ ملتیں اور یہ بھی کوئی قابل ذکر بات نہ ہوتی اگر ان کے بچے بھی سنیچر کے دن پیدا نہ ہوئے ہوتے ۔ اپنے والدین کے نقش قدم پر چلنے کی اس سے بہتر مثال گلبرگہ میں ہی نہیں پوری ریاست کرناٹک میں کہیں نہیں ملتی ۔ بچوں کی یہ سعادت مندی بھی والد کی خاموشی کی طرح کسی نہ کسی اجر کی سزاوار ہے ۔ حمید الماس نے اپنی رسم مناکحت چونکہ سن بلوغ کو پہنچتے ہی منعقد کر لی تھی اس لئے کمسنی میں ہی ان کے بچے ان کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگے ۔ ان کے چپ ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے ۔

محکمۂ لیبر میں ان کی شاعری کی اطلاع دیر سے پہنچی لیکن یہ اپنی اوائل شاعری ہی میں زیور طباعت سے آراستہ ہو گئے تھے ۔ سلیمان ادیب نے انھیں اپنے "صبا" میں (جب بھی وہ چھپتا تھا) بالالتزام چھاپا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخدوم محی الدین کی آنکھیں ان کے کلام سے

آشنا ہوگئیں۔ مخدوم محی الدین مزدور رہنما ہونے کی
وجہ سے لیبر آفس کے مستقل اور تاحیات "LIFE
PATRONS" سرپرستوں میں سے تھا۔ آفس میں
ان کا آنا جانا معمولات میں سے تھا۔ حمید الماس سے جب
وہ ملے تو مخدوم جیسے لسان شخص اور سحرالبیان مقرر
کو اس بے زبان شاعر نے صرف اپنی نظروں سے مخاطب
کیا ہوگا۔ زبان کے ہلنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے
مخدوم محی الدین نے از راہ مردم شناسی انھیں گونگے
پہلوان کے خطاب سے نوازا۔ اور اس خطاب کو بھی حمید
الماس نے خاموشی سے قبول کرلیا ــــ شکریہ تک ادا
نہیں کیا۔

حمید الماس محکمۂ لیبر میں کامل ۳۴ سال سے کام
کررہے ہیں اور ان سوا تین دہوں میں انھیں کم سے کم
تین سال چھٹی پر رہنا چاہیے تھا لیکن انھوں نے
اپنی ساری چھٹی سرکار کی ریلیف فنڈ میں بطور تحفہ جمع
کروادی۔ کسی اور کا معاملہ ہوتا تو اس شبہ کی گنجائش
تھی کہ اس شخص کو گھر کے مقابلے دفتر میں زیادہ آرام
ملتا ہوگا لیکن حمید الماس نے یہ قبول عام دفتری ذہنیت
اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حد تو یہ ہے کہ حمید الماس
نے جتنی بھی شاعری کی، جتنے بھی ترجمے کئے اور جتنے بھی
قصے لکھے گھر بیٹھ کر لکھے۔ آفس میں شعر کہنا تو کجا وہ شعر کی
بات تک نہیں کرتے حالانکہ اب سرکاری دفتر میں سب
کچھ ہوتا ہے۔ نہیں ہوتا ہے تو دفتری کام نہیں ہوتا۔ اتنے
طویل عرصے میں انہوں نے بمشکل ایک مرتبہ شادی کی
اور اتفاقاً ایک مرتبہ بیمار ہوئے۔ ان دونوں معاملات
میں انہوں نے اپنا دل استعمال کیا۔

علاوہ اس کے حمید الماس نے اپنے دوستوں
کی تعداد کو ہمیشہ انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۳۰۲ کی حدود
میں رکھا ہے۔ اس پورے برصغیر میں ان سے ہم کلام ہونے
والوں کی تعداد کبھی پانچ سے آگے نہیں بڑھی۔ ممکن ہے انہوں
نے کسی سے سن لیا یا کسی کتاب میں پڑھ لیا ہو کہ دشمن دوستوں
ہی میں سے پیدا ہوتے ہیں، معلوم نہیں کس شاعر نے
کہا ہے لیکن اچھا ہی کہا ہے ؎

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

اس لئے وہ بانسری سے بچنے کے لئے بانس ہی سے
دور دور رہے۔ یوں بھی اتنے کم گو، کم آمیز اور تقریباً محفل
بیزار شخص سے دوستی کرکے کسے اپنی عافیت خراب کرنی
تھی۔ شاعر خود کہتا ہے ؎

میں اپنے خول سے باہر نکل کے کیا کرتا
کہ مصلحت کا گراں سنگ میری راہ میں تھا

اگر اردو کے سارے شاعر اسی قسم کی مصلحت
اندیشی اختیار کرلیں تو ہندوستان میں کہیں مشاعرہ نہ
ہو اور نہ کوئی شاعر دوسرے شاعر سے نبرد آزما ہو۔
یہ بھی ایک طرح کی اردو دشمنی ہوگی ــــ بہرحال یہ کیا کم
ہے کہ اس بے زبان شاعر نے اب تک ایسی پانچ کتابیں
پہچان کا درد، فرمودات، شب گرد، جوئے ہنر اور
نقش خرابی نہایت ہی خاموشی اور شرافت کے ساتھ
پیش کردی ہیں اور میں سمجھتا ہوں ابھی کافی غیر مطبوعہ
کلام در پردہ موجود ہے۔ میرے حساب سے دو شعری
مجموعوں کا تو مال ہوگا ہی ــــ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ
فراق گورکھپوری نے اس شاعر کو تحریری خوش آمدید
کہا تھا۔ شاید ۱۹۷۵ء میں۔ لیکن یہ شاعر اتنے دبے
پاؤں چلتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی چوری چوری چلے
آرہا ہے۔

خول میں بند رہنا بھی ایک لحاظ سے اچھی عادت

ہے اور اس کے بھی کچھ نہ کچھ فوائد ہوتے ہی ہوں گے۔
لیکن یہ کھلی دنیا کی بات ہی اور ہے۔ آکسیجن زیادہ ملتی ہے۔

بقیہ: علامہ اقبال کی شاعری...

اگر انسان اقبال کے مثالی مردِ مومن کا تتبع اختیار کرے تو کچھ عجب نہیں کہ ارتقا کی اس منزل پہ پہنچ جائے جس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال نے کہا تھا ۔۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

بقیہ: لسانیات اور دیگر...

زبان میں جملوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور کچھ اور الفاظ ان جملوں کے شکستہ اجزا ہیں۔ لسانیات کی اہم ترین شاخ معنیات (Semantics) کو تو ایک مدت تک فلسفہ کی شاخ ہی قرار دیا جاتا رہا۔ زبان، علم زبان اور قواعد کا بھی اپنا منفرد فلسفہ ہے۔

بہرکیف، عمومی طور پر ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ لسانیات اپنی وسعت و مقبولیت کی وجہ سے مذکورہ علوم سے گہرے طور پر مشترک ہے۔

نیّر جہاں (امریکہ)

ہمزاد

میں تنہائی میں اکثر رات کو اک چیخ سنتی ہوں
بڑے ہی کرب میں اک دکھ بھری آواز کہتی ہے
"خدارا کھینچ لو تختہ مرے پاؤں کے نیچے سے
گلے میں ہے مرے پھندا
خدارا کھینچ لو تختہ
میں ڈر کے ۔ سہم کے ۔ گھبرا کے ۔ اکثر سوچتی ہوں پھر
یہ آخر چیخ کس کی تھی ؟
گلا کیوں میرا سوکھا ہے ؟

ساتواں آسماں

ضیاء الانجم

سان پر رکھی ہوئی ہے زندگی
رفتہ رفتہ کورا بن جائے گا
کون پہچانے گا اپنے آپ کو
چہرہ چہرہ آئینہ ہو جائے گا

ایک ہی محور پہ رقصاں رات دن
چاند سورج اور زمین و آسماں
میں کہاں کس موڑ پر ہوں کیا خبر
آسماں سمجھوں میں خود کو ساتواں

شور و غوغہ کرب نادیدہ تپش
آبلہ پائی شکستہ راستے
دور سناٹے میں روتی روشنی
در بریدہ آرزو کے مقبرے

روشنی کو بھی جماہی آرہی ہے
تھک تھکا کر سو نہ جائے دیکھنا
جستجو کی تیز لو کچھ اور تیز
سورج اندھا ہو نہ جائے دیکھنا

کوئی ٹکڑا روشنی کا اس طرف بھی
جس طرف ویرانیوں کا راج ہے
ذہن نابینا کی آنکھیں کھول دو
خوف و وحشت کا سروں پر تاج ہے

شام کی آنکھوں نے برسائے لہو
صبح کے چہروں کا جو غازہ ہوا
آج پائی ہے ضیاؔ نے روشنی
آج اپنے غم کا اندازہ ہوا

شاہد میر

احساسِ سرد و شاں نہ زمانے کے پیار نے
مجھ کو جکڑ رکھا ہے خود اپنے حصار نے

اب اُس پہ چل رہی ہیں مری تشنہ کامیاں
جو راستہ بنایا تھا پانی کی دھار نے

دیکھے جو ہر قدم پہ شکاری کھڑے ہوئے
تنگ آکے جال اوڑھ لیا ہے شکار نے

اے میرے رہگذار ذرا اور صبر کر
نرغے میں لے رکھا ہے مجھے شاخسار نے

انجام کار خود بھی تہہ سنگ آگیا
جو ہاتھ سر سے بوجھ چلا تھا اتارنے

شاہد فصیل شہر ہوں جب بھی لب کشا
منہ اس کا بند کر دیا اک اشتہار نے

فریاد آزر

گرمی پرواز سے جلتا ہوا پر دیکھتا
گر فرشتہ رفعتِ انساں تک اُڑ کر دیکھتا

سب کی آنکھیں رہن رکھی تھیں مرے دشمن کے پاس
کون میرے گھر کی بربادی کا منظر دیکھتا

زہر کا رنگ اس کے بھی ہو جاتا حیرت سے سفید
جب مرا نیلا بدن پاس آکے شنکر دیکھتا

لے ہی آئی کھینچ کر آدم کو شہروں کی کشش
آخرش کب تک کوئی صحرا سمندر دیکھتا

قدر خودداری کی کرتا تھا بڑا معصوم تھا
ورنہ وہ اب تک مرا جھکتا ہوا سر دیکھتا

دیکھتا بھی کون مڑ کر اپنے ماضی کی طرف
کس کی خواہش تھی کہ اپنا جسم پتھر دیکھتا

پرکاش تیواری

غموں کے اندھیروں میں غرقاب ہوں میں
اماوس کا بکھرا ہوا خواب ہوں میں
مرے نام سے ہے زمانے کو نفرت
کہ پیالے میں ہستی کے زہراب ہوں میں
جمی ہے امیدوں پہ حرماں کی کائی
کہ صحرا کا اک خشک تالاب ہوں میں
قلم بند ہیں جس میں رُوحوں کے قصّے
کتابِ زمانہ کا وہ باب ہوں میں
پڑا ہے جو کھائی میں تاریکیوں کی
مرادوں کا وہ نخل شاداب ہوں میں
مری زندگی بن گئی ہے بھبھولا
نہ چھیڑو مجھے تم کہ پُر آب ہوں میں
کہیں ابر برسے تو مجھ سے غرض کیا
سمجھ لو کہ بس دیگ بے آب ہوں میں
تجھے زیست کی ہر خوشی ہو میسّر
مرا غم نہ کر شاد و شاداب ہوں میں
تعارف مرا کیا ہے یہ پوچھو نہ پرکاش
وفا نام ہے اور نایاب ہوں میں

سیّد شمیم گوہر

پُرانی جنگ کا اب سارا بار اترے گا
ذرا سی دیر میں سب کا خمار اترے گا
لگا ہیں اُٹھی ہیں اک شہرِ بے حصار کی سمت
جہاں یہ ٹھہرے وہیں شہسوار اترے گا
پھر اس کے بعد تو مجھ سے کوئی خطا نہ ہوئی
عذاب مجھ پہ خدا کتنی بار اترے گا
کبھی تو اشکِ ندامت سے آنکھ تر ہوگی
کبھی تو سر سے گناہوں کا بار اُترے گا
وفا کسی سے کبھی کی نہ کج کلاہی نے
اسی زمین پہ تیرا خمار اترے گا
انا فقیر کو یہ شہر چھوڑنے تو دو
عذاب دیکھنا کس کس پہ بار اترے گا
نہ جانے خوف سا رہتا ہے کیوں مجھے گوہر
کہ آج تیر کوئی دل کے پار اترے گا

معراج العارفی قادریہ

اُس نے دیکھا بھی نہیں، میں نے بتایا بھی نہیں
قصۂ دردوالم ہائے سُنایا بھی نہیں

آئینۂ دل کو بنایا تھا مگر کیسا کہئیے
اُس نے دیکھا بھی نہیں، میں نے دکھایا بھی نہیں

اُس کی تصویر سے اکثر یہ کہا کرتا ہوں
تجھکو پایا بھی نہیں، اور گنوایا بھی نہیں

موت تو دُور رہے یہ زیست میں احساس ہوا
کوئی اپنا بھی نہیں، کوئی پرایا بھی نہیں

درد کی دھوپ میں صحرائے الم کا یہ سفر
اُس پہ جلنے کی نہیں، موت کا سایا بھی نہیں

دل کو جو بھا گیا اُس کو تو سجایا سر پر
جو نگاہوں سے گرا، اُس کو اُٹھایا بھی نہیں

کیسے معراج وہ دے گا مجھے کرسی کا خطاب
سر جھکایا جو نہیں، تو اُٹھایا بھی نہیں

نیاز اعظمی

تمام شہر کو جو راستہ بتاتا ہے
وہ اپنے آپ سے کیسا فریب کھاتا ہے

گذر نہ جائے کہیں انتظار کی حد سے
رہ خیال میں بھی آہٹیں سجاتا ہے

میں روز درد کی شاخیں پسار جاتا ہوں
مرا ہی سایہ مجھے روز کاٹ جاتا ہے

تمام جسم کو نیلاہٹوں سے بھر دے گا
وہ ایک سانپ لہو میں جو سرسراتا ہے

نجوم و ماہ تو دریا میں ڈوبتے ہیں مگر
تمہاری آنکھوں میں دریا بھی ڈوب جاتا ہے

نیاز ان کا تکلف بھی کیا تکلف ہے
کبھی تو رونا سا، رونا کبھی ہنساتا ہے

امیر حیدر ملک ادبی ایوارڈ

۱۹۸۲ء

دی کلچرل اکیڈمی گیا (رجسٹرڈ) انعامی بورڈ نے امیر حیدر ملک ادبی ایوارڈ ۱۹۸۲ء کے لئے اپنی سفارشات چیرمین اکیڈمی کے یہاں داخل کر دی ہیں۔ چیرمین نے بورڈ کے فیصلے کو حتمی طور پر قبول کرتے ہوئے حسب ذیل کتابوں پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات کا اعلان کیا ہے۔

نام کتاب	مصنف	رقم انعام
شیر شاہ سوری	ڈاکٹر حسن آرزو	پانچ سو روپے
نشانِ منزل	جگن ناتھ آزاد	پانچ سو روپے
شاعری اور شیوہ پیغمبری	صفدر	پانچ سو روپے

چیرمین

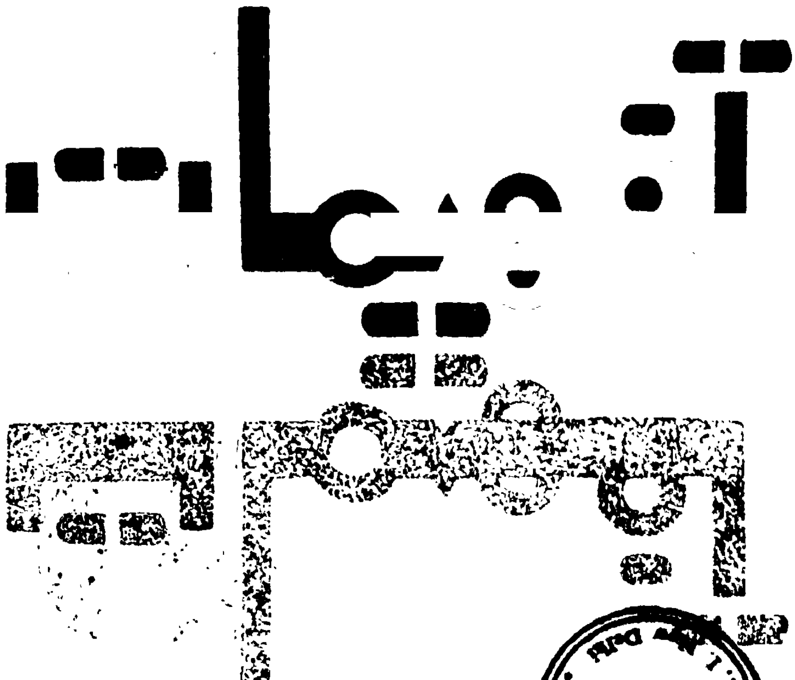
کلام حیدری

(کلام حیدری)


کھیتی کو زمین
رہنے کو مکان
بیس نکات کی
یہ ہے شان
davp 83/496

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. No. Gy 5/84
Phone—432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA



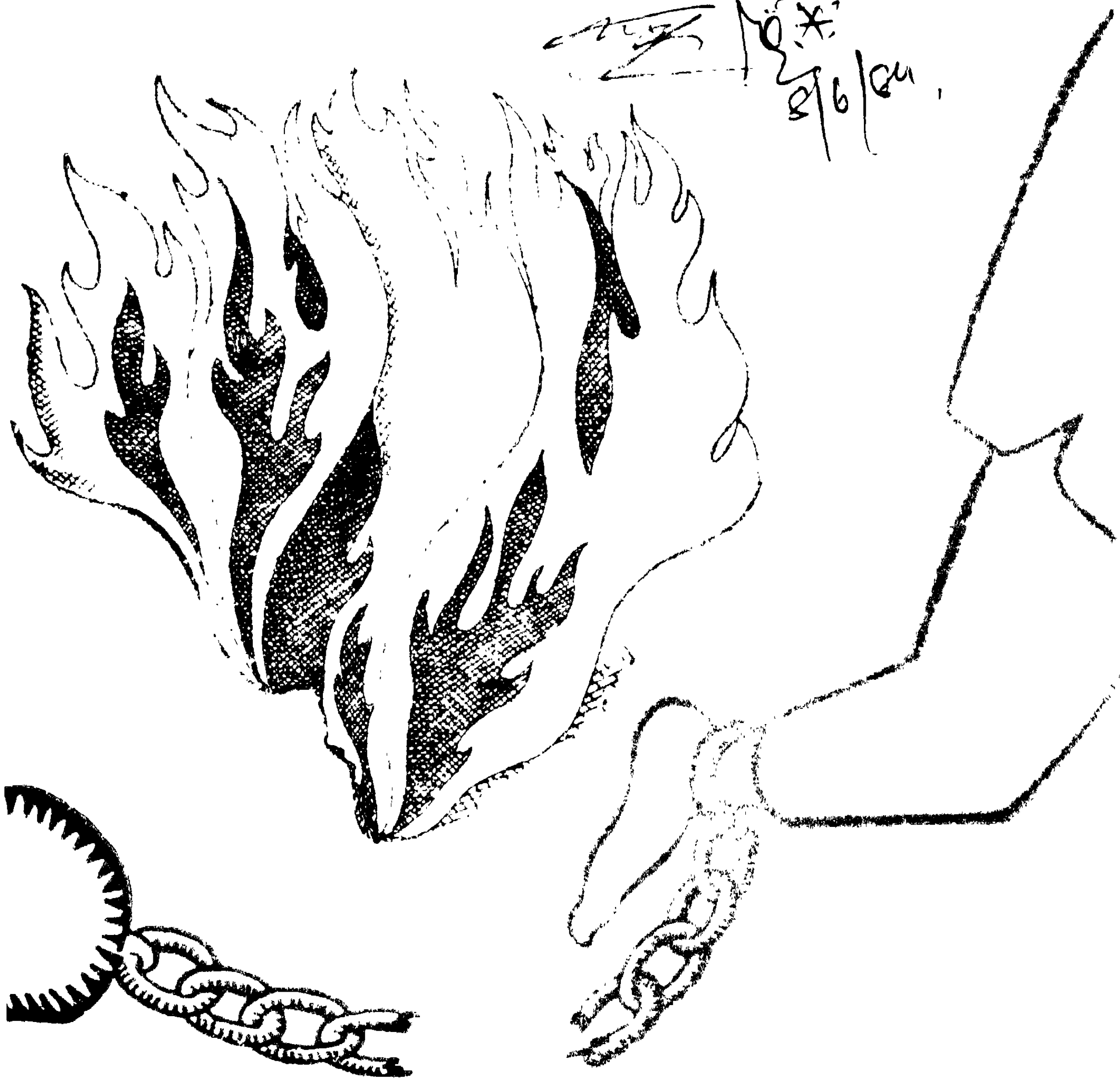
— تنقیدی مضامین —

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-

The Cultural Academy, (Regd.) Gaya

8/6/84



MAY 1984

PRICE 3.00

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے چھتیس روپئے

ایک شمارہ تین روپئے

فون ۲۳۲

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبدالصمد

محتویات

اداریہ

ادب فیشن نہیں ہے مگر فیشن میں کوشش زیادہ ہوتی ہے اور فیشن بنیادی مقصد سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صرف فیشن رہ جاتا ہے اور مقصد، بنیادی مقصد غائب ہو جاتا ہے۔ فیشن لباس سے جسم کو بے نیاز کر دیتا ہے اور لباس کے بنیادی مقصد کو ختم کر کے "کیبرے" اور ——— محض تھرکتا جسم اور حریص نگاہیں رہ جاتی ہیں اور دولت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتی ہے اور تب دولت ہی تمام اقدار پر حاوی ہو جاتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو ہر خوبصورت شئے پیسوں میں تولی جاتی ہے۔

ادب فیشن نہیں ہے

تو پھر ادب کیا ہے؟

ادب اشرف المخلوقات کی اشرف ترین ذہن ہے۔ اگر جدیدیت فیشن ہے تو جسم کو ننگا اور ذہن کو پراگندہ کرے ہی گی اور کیا ہی ہے

"نیا افسانہ سیاسی مقصدیت اور نظریاتی وابستگی کی نفی پہ اصرار کرتا ہے —"

بقول فتح محمد ملک نئے افسانے کی تعریف کرنے والے اس بات پر متفق ہیں۔

مگر احمد داؤد کا افسانہ، نئے افسانے کے اس فارمولے سے انحراف کا افسانہ ہے "فتح محمد ملک یعنی ایک فارمولے سے نجات حاصل کرنے کے لئے انتہا پسندی اختیار کرنے والے آخر اس کی نفی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

'مقصدیت' کوئی چڑنے کی چیز یا اچھوت نہیں ہے اسے فن کی تہوں اور جمال میں صحت مند خون کی طرح دوڑنا ہے ورنہ پھر ادب کا حسن اضمحلال سے دوچار ہو جاتا ہے۔

فیشن کے طور پر ذکر شن چندر نہ جاسکتا، بیدی اور نہ قرۃ العین حیدر ——— اپنی صلاحیتوں کو صیقل کرنا پڑتا ہے

نقل نقل ہی ہے جتنی بھی عقل اختیار کی جائے وہ اپنے کھولتے تخلیقی چشمے کا بدل نہیں ہو سکتی۔

پتا پن، انفرادیت اور اپنی شناخت!

یہ تخلیقی کام کرنے والوں کے لئے MUST ہے!

کلام حیدری

کلام حیدری

شمس الرحمن فاروقی اور شرح میر

جواز شمارہ ۳۰

کچھ نہ دیکھا پھر بجز ایک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

اس کی شرح کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے یہ خاص باتیں لکھی ہیں

۱۔ شعلے کا پُر پیچ و تاب ہونا آگ کی تیزی کو ظاہر کرتا ہے

۲۔ اور اس بات کو بھی کہ پروانے کے دل میں اس قدر گرمی تھی کہ اس کے جل اٹھنے پر جو شعلہ اٹھا وہ بھی بے چین اور بے قرار تھا۔

۳۔ پیچ و تاب کا لفظ پروانے کے دل میں جذبات کے تلاطم کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

۴۔ بیان کے اختصار نے شدت پیدا کر دی۔

۵۔ بیان کا ڈرامائی انداز بھی بہت خوب ہے۔

۶۔ یہاں تک کہ یہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ پروانہ شمع کی طرف کیوں گیا تھا

۷۔ جبکہ غالب نے بات واضح کر دی ہے:

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ!
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

بات میں بات پیدا کرنا شارح کا کام نہیں ہے یہ میری ناچیز رائے میں مستحسن نہیں ہے۔ "شعلہ" کو پُر پیچ و تاب کہنے کی ضرورت اس لئے نہیں پڑی کہ وہ آگ کی تیزی کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ شعلہ بہرحال پُر پیچ و تاب ہوتا ہے کہا جائے یا نہ کہا جائے۔ اس لئے میر جیسا بڑا شاعر غیر ضروری بات کیوں کہے گا؟ شعلہ پُر پیچ و بے قرار تھا یہی بات میر کے لئے کافی ہے۔ الفتِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود کا سبب صد شاعرانہ اظہار ہے۔ مزید یہ کہ معشوق کو عاشق کی ایسی جانبازی کا تجربہ نہیں تھا اس لئے وہ پیچ و تاب کھا گیا ——— خود میر نے بجز شمع تک جانے اور ایک شعلۂ پُر پیچ و تاب کچھ نہ دیکھا کیونکہ اس کے بعد یکھنے کو رہ کیا گیا تھا۔ سوائے اذیت ناک یا قابلِ اعلا بات کے: "پروانے کے دل میں اس قدر گرمی تھی"۔ گرمی نے صرف اتنا کام کیا کہ وہ شمع تک والہانہ طور پر چلا گیا نہ کہ اس کے جل اٹھنے جانے سے جو شعلہ اٹھا وہ بھی بے چین تھا۔ "جذبات کا تلاطم" اور شعلے کی تیزی اور لپک میں مجھے کوئی منطقی یا شاعرانہ مماثلت نہیں لگتی۔ بیان کا اختصار واقعی قابلِ داد ہے۔ مگر غالب کے جس شعر پر میر کے شعر کو فضیلت دینے کی سعی کی گئی ہے وہ بیکار سی ورزش ہے۔ یا میر کے شعر کو اور روشنی میں لانے کے لئے غالب کے شعر کو قطعی اندھیرا بنا دیا گیا ہے۔ غالب کے شعر کا رویہ اور اس کی نہج میر کے شعر سے بہت الگ ہے اور بالکل منفرد ہے۔

۱۔ غالب معشوق سے تغافل کا گلا کرنے گئے تھے۔ جبکہ میر کا پروانہ فدا ہونے گیا تھا۔

۲۔ غالب نے معشوق کے لئے استعارہ استعمال نہیں کیا ہے وہ حسن کی تجسیم کرتا ہے

۳۔ پھر غالب اس کی "ایک ہی نگاہ" کی خاکستر کرنے کی سفاکی اور تندی کا اظہار کرتا ہے۔

۴۔ "بس خاک ہو گئے" میں یہ بات چھپی ہے کہ "جل جل کر خاک ہو گیا" کیونکہ عاشق تو محض تغافل کے گلے کے لئے گیا تھا کوئی گلے پڑنے نہیں گیا تھا۔

چنانچہ میر کے شعر بالکل ہی مختلف غالب کے شعر کا موازنہ یہاں پر غالب سے بے انصافی اور میر کی جانبداری بن جاتی ہے۔

شارح کا موازنہ سے پرہیز کرنا شاید بہتر ہے۔ (باقی آئندہ)

باخبر

آس پاس

اس عنوان کے تحت پیش کئے گئے افکار "باخبر" کی آزادی تحریر کا ثبوت ہیں جو ہم مہیا کرتے ہیں۔ اتنا ہم پوری ذمہ داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ادبی رسالے میں ایسے سیاسی اور نیم سیاسی مطالعوں کا پیش کرنا کارآمد ہے ——

کلاہ حیدری ——

بروقت کارروائی

مہاراشٹر کے نائب وزیر اعلیٰ شری راماراؤ آدیک کو آخر اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر "اتنی بڑی ہمت" نہیں کی ہے۔ کانگریس اعلیٰ کمان نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اعلیٰ کمان کا یہ فیصلہ بہت بروقت اور مناسب ہے۔ شری آدیک بمبئی ایر پورٹ پر شراب کے نشے میں نازیبا حرکات کے مرتکب ہوئے تھے اور اس کی گونج نہ صرف ہندوستان، بلکہ بیرون ملک بھی سنی گئی تھی۔ اگرچہ شری آدیک اور ان کے لوگوں نے اپنے دفاع کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن ملک کے وقار کے لئے یہ بہت ضروری تھا کہ وہ حکومت سے باہر نکالے جائیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک آدیک پکڑے گئے اور انہیں ان کے کئے کی سزا بھی مل گئی۔ لیکن ملک اور پارٹی میں ابھی جانے کتنے راماراؤ آدیک موجود ہیں چونکہ وہ پکڑ میں نہیں آتے اس لئے انہیں کوئی سزا بھی نہیں دیتا۔ ہر راماراؤ آدیک کو جو ایر پورٹ پر نازیبا حرکتیں کرنے کا موقع بھی تو نہیں ملتا آگے آگے دیکھئے ......

دلی کے لفٹننٹ گورنر شری جگ موہن کو جہاں کا

کا گورنر مقرر کیا گیا ہے۔ وہاں کے موجودہ گورنر شری بی کے نہرو کو دوسری ریاست میں بھیج دیا گیا ہے۔ شری جگ موہن کی انتظامی صلاحیتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ایمرجنسی میں انہوں نے دلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے وائس چیرمین کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں، اگرچہ ان کے مقدر میں بدنامیاں لکھی تھیں اور مقدر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ اندرا گاندھی کے دوبارہ برسر اقتدار آنے پر دہلی کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہوئے۔ پھر اسی حیثیت سے گوا گئے۔ پھر دلی لوٹ کر آئے اور اب کشمیر میں خدمات انجام دینے جا رہے ہیں۔ اندرا گاندھی کے خاندان سے ان کی وفاداری مسلم ہے اور صرف اسی حیثیت سے ان کا کشمیر جانا سیاسی اور صحافتی حلقوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اگرچہ جموں کشمیر کے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ نے ان کی تقرری کا خیر مقدم کیا ہے۔ لیکن شری جگ موہن وہاں جا کر اپنے لئے کون سا کردار چنتے ہیں۔ یہ دیکھنا ہوگا۔ مرکزی کانگریسی حکومت نے فاروق عبداللہ اور ان کی پارٹی کے خلاف جو منظم سیاسی لائحہ عمل تیار کیا ہے۔ اس کے پیش نظر شری جگ موہن جیسے وفادار شخص کی، گورنر کے عہدے پر تقرری خاص دلچسپ اور فکر انگیز ہو سکتا ہے۔

تماشہ

یو پی اسمبلی میں پچھلے دنوں ایک عجیب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ منسٹر تعلیم و تعلقات عامہ شری عمار رضوی نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا بل پیش کیا، انہیں کے ساتھی شری واسدیو سنگھ نے اس کے خلاف زبردست تقریر کی اور کانگریسی ممبران نے تالیوں کی گونج سے ان کا استقبال کیا۔ کانگریس اعلیٰ کمان نے ہندرا ایرپورٹ پر نازیبا حرکت کے مرتکب ہونے پر ماما راؤ آدیک کے خلاف فوری کارروائی کی اور اسی پارٹی کے ایک ذمہ دار وزیر نے اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں، اسمبلی کے اندر اپنی پارٹی کے مینی فیسٹو کا اس بری طرح مذاق اڑایا۔ کئی ہفتے گزر گئے لیکن اعلیٰ کمان خاموش ہے۔ واسدیو سنگھ اینٹھ رہے ہیں۔ شری پت مشرا مسکرا رہے ہیں اور عمار رضوی اپنا منہ چھپائے پھر رہے ہیں ذہنوں میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دراصل اس پورے ڈرامے کا اصل ہیرو کون ہے ——؟ واسدیو سنگھ بیچارے کی اتنی سکت کہاں کہ وہ اتنا بڑا منصب سنبھال سکیں ••

بقیہ افسانہ / اندر کا اندھیرا

اپنے چہرے نکالتے لگتے۔

اسی طرح سے نشیمن میں ایک روز وہ کسی خوب صورت نہیں کر پائیں گے چارہ تھی اور میں اس لئے بے نام خواہش لئے ہیجیلے لبوں پر ابھرتی صداؤں کے بے جان لبوں میں اثر تلاش کرنے لگا۔ پھر یہ دیکھ کر میں ایک دم پھوٹ پڑا اور سب کے سامنے اسے جانے کیا کیا کہہ ڈالا وہ وہاں سے خاموشی سے تنہا ہی چلی گئی۔ اس وقت میں اپنے آپ کو کسی ڈھلان کی پھسلن پر محسوس کر رہا تھا۔ اور غصے کے مارے بے قابو ہو رہا تھا جس کی بنا پر گھر جاتے ہی میں نے اسے پکڑ لیا اور نجانے کس جذبے کے تحت لاشعوری طور سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبانے لگا۔ یکایک میری نظر سامنے والے اس آئینے پر پڑی۔ بالکل وہی منظر تھا اس وقت زمین پر آسمان کے سائے گہرے ہونے لگے۔ جن سے گھبرا کر بے شمار روحیں فضا میں سسکیاں بھرتی ہوئی سنائی دینے لگیں اور میں وقت کی سیڑھیوں سے اپنے وجود کی گہرائی میں گرنے لگا ——!!!

حسین الحق

اُردو اِملا کی اِصلاح

ایک مطالعہ

گذشتہ دنوں ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی کتاب " اردو املا اور اس کی اصلاح " کے مطالعہ کا موقع ملا۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی کتاب سے پہلے رشید حسن خاں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، گوپی چند نارنگ اور حفیظ الرحمان واصف وغیرہ کے علاوہ بھی کچھ حضرات کی کتابیں اور مضامین منظر عام پر آچکے ہیں۔ میں ایسی میدان کا آدمی نہیں اس لئے "ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" کے مصداق اس موضوع پر اگر کوئی کتاب مل جاتی ہے یا کوئی مضمون نظر آجاتا ہے تو یقیناً پڑھ لیتا ہوں مگر اب سے پہلے یہ موضوع کبھی مجھے کچھ لکھنے کے لئے انگیخت نہ کرسکا بلکہ سچ پوچھئے تو املا کے موضوع پر ایسی مصنوعی اور آدھی ادھوری باتیں سننے کو ملتی رہی ہیں اور ایسے تحکمانہ اور امرانہ انداز میں کتابیں اور مضامین لکھے جاتے رہے ہیں کہ یہ سب مل جل کر ہمیشہ میری اکتاہٹ ہی کا سبب بنتے رہے۔

اور اسی لئے جب میرے بزرگ کرم فرما جناب ڈاکٹر محمد مثنیٰ صاحب نے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی کتاب پڑھنے کا مشورہ دیا تو حسب سابق میرا رویہ متعصبانہ ہوگیا مگر چوں کہ میں ڈاکٹر صاحب کی دانش پر یقین کرتا ہوں اس لئے کتاب پڑھنے کا وعدہ کرلیا مگر پھر بھی یہ یقین تھا کہ یہ کتاب بھی دوسری کتابوں کی طرح بورنگ اور سیاسی ہی ہوگی لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔

تو جیسا کہ میں عرض کرچکا۔ املا پر گفتگو اب تک میری اکتاہٹ کا سبب بنتی رہی ہے۔

اور اس کی ایک وجہ تو سطور بالا میں بیان کی جاچکی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ سارا مسئلہ مجھے بہت ہی غیر فطری دکھائی دیتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کچھ ایسی تبدیلیاں لانی چاہتے ہیں جو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں کسی حد تک معاون ہوں گی اور کسی حد تک مضرت رساں اس کا فیصلہ ذرا مشکل ہے۔ خود ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب نے بھی اپنی کتاب میں اس طرف اشارے کئے ہیں

(۱) "ان اصلاحات میں مولانا احسن مارہروی کی تجاویز پر مبنی اصلاحات کے ساتھ کئی ایسی اصلاحات تھیں جن کو دیکھ کر آج تعجب ہوتا ہے لیکن ان کی تہہ میں اس زمانے کے خیالات کے مطابق "ٹائپ کے لئے آسانیاں فراہم کرنے

کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مثلاً اس قسم کے اصطلاحات کہ کھنا کو کھنا، طائر کو طاعر وغیرہ ....“ (صفحہ ۱)

(۲) ”[illegible] کے آس پاس غلام رسول نے جانے اعراب ...... اختراع و دریافت کئے اردو کی ابتدائی
درسی تعلیم میں اب بالعموم ایسے ہی قاعدے داخل ہوئے، بالفاظ دیگر ہندی کی ماتراؤں کے طرز پر اعرابی
علامات کے ساتھ اب اردو بالکل ہندی کی طرح پڑھائی جانے لگی، ابتدائی سطح پر اردو کی دشواریوں
کا حل گویا یہ نکالا گیا کہ اردو کو ہندی بنا دیا جائے، کسی نے یہ نہ سوچا کہ اگر ابتدائی سطح پر اردو ہندی کی
طرح پڑھائی جائے گی تو ثانوی سطح پر بھی وہ اس سے نہیں بچ سکتی۔“ (صفحہ ۱۶، ۱۷)

(۳) ”اردو کے مخالفوں کی طرف سے اردو رسم خط اور زبان کے بارے میں دفعتاً فوقتاً جو اعتراضات ہوتے
رہتے ہیں ان سے بہت سے اردو داں اس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اگر اردو رسم خط اور زبان کی
اصلاح سے اعتراضات کے پہلو دور ہو جائیں تو اردو کو ہمارے ملک میں جائز مقام مل جائے گا ..... اس
کی وجہ سے اردو دنیا ..... کے بعض اہل علم اپنی زبان میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جو خامیاں نکالتے ہیں ان کی
خبر شاید اردو کے مخالفوں کو بھی نہیں ہے۔“ (صفحہ ۱۹)

(۴) ”رشید حسن خاں نے اردو املا کے بارے میں لکھا ہے کہ ”املا کے موضوع پر یہ اردو میں پہلی مفصل کتاب ہے“
حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اصلاح املا کے موضوع پر ہے اور اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ کسی کو دم مارنے
کا موقع نہ ملے۔ ”اردو کیسے لکھیں“ میں سرورق ہی پر کتاب کے نام کے نیچے قوسین میں ”صحیح املا“ لکھا ہوا
ہے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیح املا یہی ہے اور اس میں رد و قبول سے کام لینے کا کوئی پہلو نہیں
نکلتا۔“ (صفحہ ۲۵)

(۵) ”ترقی اردو بورڈ تو اپنی تمام مطبوعات میں ان سفارشات پر عمل کرے گا ہی، اردو کے دوسرے اداروں،
انجمنوں، ادیبوں، شاعروں، اخباروں کے ایڈیٹروں اور پبلشروں سے بھی یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ان
سفارشات کو اپنائیں گے“ (اردو املا، [illegible]، صفحہ ۶)

”اس سے ظاہر ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اردو کے دوسرے اداروں
انجمنوں، عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اسے الٹی یہ
امید ہے کہ تمام لوگ ان سفارشات کو قبول کر لیں گے“ (صفحہ ۲۵)

مندرجہ بالا اقتباسات کے حوالے سے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب نے جن مضمرات کی طرف اشارہ کیا ہے اور
ماہرین زبان کے جس اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے وہ مدتوں سے مجھے بھی پریشان کرتا رہا ہے۔ افسوس
کی بات ہے کہ ماہرین زبان نے املا کے سلسلے میں کہیں آمرانہ، کہیں معصومانہ، کہیں منافقانہ اور کہیں سیاسی رویہ
اختیار کیا مگر ارتقائے زبان کے فطری اصولوں کی طرف توجہ فرمانے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی ورنہ یہ
بات تو ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ زبان کی فطری تشکیل کا مرحلہ ارادی تشکیل کی بہ نسبت زیادہ پائیدار اور صحیح
ہوتا ہے۔ اور اس کی بڑی نمایاں مثال ہمیں غرض کہ، حالانکہ، بلکہ، چنانچہ، دست یاب اور خوب صورت وغیرہ جیسے

الفاظ میں ملتی ہے کہ ماہرین زبان نے تو آمرانہ طور پر مندرجہ بالا تمام الفاظ کو الگ الگ لکھنے کا نادری حکم صادر کر دیا مگر عوام نے "غرض کہ، ہم عصر، دست یاب اور خوب صورت وغیرہ کے سلسلے میں ماہرین زبان کا مشورہ مان لیا اور بلکہ، حالانکہ اور چنانچہ وغیرہ کے سلسلے میں ماہرین کے فیصلے کو رد کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

جواب یہ ہے کہ اصلاح املا کا تجربہ بھی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب عام زبان کی تجربہ گاہ میں وہ کامیاب ہو جائے۔ (ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں میں نے "عام زبان" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "عوامی زبان" کا نہیں اور "غلط العام" کے فصیح اور "غلط العوام" کے غلط ہونے کی بات بہت پرانی ہے اور میرے نزدیک مستند بھی)

زبان خلا میں پیدا نہیں ہوتی اور زبان کے ارتقا اور صحت کا انحصار بھی تحقیق و تنقید پر نہیں تخلیق ہی پر ہے جس طرح کسی عہد کی معاشرت، تہذیب، ذہنی مادی اور روحانی کشمکشوں کا سچا عکس اس عہد کے تخلیقی ادب ہی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح زبان کے ارتقائی مراحل کے صحیح عرفان کے لئے تخلیقی نمونوں ہی پر انحصار کرنا پڑتا ہے، برسبیل تذکرہ میں ہماری محاورات کی اس لغت کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو خدا بخش خاں لائبریری (پٹنہ) کے زیر اہتمام اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب احمد یوسف صاحب تیار کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں احمد یوسف صاحب نے سب سے پہلے تخلیقی نمونوں سے تلاش کا کام شروع کیا ہے، اور یہی انہیں کرنا بھی تھا۔ کیونکہ محاورے جس عوامی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں وہ تخلیقی نمونوں کے علاوہ اور کہیں اپنے صحیح رنگ اور آہنگ میں دست یاب نہیں ہو سکتے۔

لہٰذا املا کے سلسلے میں اگر کچھ حضرات اپنے طور پر کوئی فیصلہ سنا دیتے ہیں اور کوئی قاعدہ کلیہ بنا دیتے ہیں تو اس کی حیثیت اس وقت تک جب تک کہ یہ قاعدہ کلیہ تخلیقی فنکار کی روح تک پہنچ کر اس فنکار یا ویسے فنکاروں کے تخلیقی اظہار کے ذریعہ عوامی زندگی میں رچ بس نہ جائے اس کی حیثیت ایک دن کی بادشاہت میں رائج کئے جانے والے چمڑے کے سکے سے زیادہ قرار نہیں دی جا سکتی۔

پھر یہ بھی کہ صحتِ املا کی یہ سفارشات اور کوششیں صرف اس لئے کی گئی ہیں کہ (بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب) "ٹائپ کو مقبول بنایا جائے اور ہندی کی ماتراؤں کے طرز پر اعراب و علامات کے ساتھ اب اردو بھی بالکل ہندی کی طرح پڑھائی جائے اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد لسانی سے زیادہ سیاسی ہیں۔

میں نے [illegible] دیکھا کہ جو حضرات جدید املا کے وظیفے کا ورد کرتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر حضرات (بہ استثنائے چند) کوئی [illegible] کتاب ہاتھ میں لیتے ہی کتاب کے مواد اور اس کی ظاہری خوب صورتی کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے املا کی طرف بالکل اسی طرح متوجہ ہوتے ہیں جیسے "عروضیا" شعر سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے سے پہلے فعلن فعلن پڑھتا ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں جدید املا کو کتاب سے لطف اندوز ہونے کے سلسلے میں رکاوٹ ہی سمجھنا ہوگا۔ جدید املا کے علمبرداروں کا میں نے یہ بھی حال دیکھا وہ ایسا کاتب تلاش کرتے پھرتے ہیں جو ان کے [illegible] مسودہ کو جدید املا میں کتابت کر دے جو خود ان کی تحریر میں رشید حسن خاں کے ذہنی تضادات کی طرح قدیم و جدید املا کا ملغوبہ

معلوم ہوا کہ جو حضرات جدید املا کا "ہوا" کھڑا کرتے ہیں خود ان کی تحریری اور تخلیقی داخل میں جدید املا ابھی تک اپنی جگہ نہیں بنا سکا اور یہ سب کچھ صرف اپنے کو نمایاں کرنے کی ایک شعوری اور سوچی سمجھی کوشش ہے ورنہ قربانی کی "بیگم" اگر اردو میں "بیگم" بن سکتی ہے تو پھر ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی رائے سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے) "ذات کے بارے میں اپنے مخصوص تحقیقی شعور سے یہ بات نکالی اور اس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے کہ ذات بمعنی نفس یا شخص عربی لفظ ہے، سنسکرت لفظ جات یعنی نژاد یا قوم کے معنی میں ذات لکھنا درست نہیں اس معنی میں "زات" لکھنا چاہیئے۔ اسی طرح انہوں نے "ذرا" (بمعنی تھوڑا) کو غلط اور "زرا" کو صحیح قرار دیا ہے۔ لفظ کی تحقیق کی حد تک یہ بات بڑے معرکے کی ہے لیکن ایسی تحقیق سے الفاظ کے مسلمہ املا میں ترمیم لازمی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو اس طرح ہم کہاں کہاں مسلمہ املا کو بدلتے رہیں گے اور سوچتے رہیں گے کہ کہاں "ذال" سے لکھیں اور کہاں "زے" سے جبکہ اصلاح کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ ایسی دشواریاں کم ہوں، دوسرے "زے" سے لکھنے کی منطق بھی زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکتی کیونکہ زے بھی بہرحال عربی حرف ہے۔ اگر اصل کا لحاظ رکھنا ہو تو پھر "جات" اور "جرا" لکھنا چاہیئے۔ (ص ۲۶)

اور ایمانداری کی بات بھی یہی ہے کہ مسلمہ املا کو صرف اس لئے بدلنے کی کوشش کہ لفظ معنی کے لحاظ سے اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے، کوئی صائب بات نہیں ہے اور نہ ہی اردو کے مخصوص تہذیبی اور لسانی پس منظر میں اسے قابل قبول سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اردو تو ابتدا ہی سے اقوام اور زبانوں کے "اختلاط باہم" سے اکتساب فیض کرتی رہی ہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کی بھی مصنوعی، فرضی اور خارجی "خالصیت" (Purity) نہ تو پائیدار ہو سکتی ہے اور نہ ہی مذاق سلیم اسے تسلیم کر سکتا ہے۔ سچی بات وہی ہے جو ڈاکٹر محمد ابو سحر نے لکھی ہے کہ

"انیسویں صدی کے وسط اور آخر یا بیسویں صدی کے ابتدا کی مطبوعات دیکھئے تو املا میں کافی فرق نظر آئے گا۔ مگر یہ فرق ایک خاموش تغیر کا نتیجہ ہے۔" (صفحہ ۲۷)

ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بڑی جرأت کے ساتھ رشید حسن خاں اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ جیسے مستند زبان دانوں کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے (اور ان غلطیوں کے پیش نظر ان ماہرین کا استناد بھی اب متنازعہ فیہ بن چکا ہے) مثلاً رشید حسن خاں نے "اردو املا" (ص ۲۹۴، ۹۵) میں "پرواہ" کی "ہ" اڑا دینے کا فیصلہ صادر کیا ہے اور رشید حسن خاں اور آثر لکھنوی دونوں نے بوالہوس، بوالعجب اور بوالفضول وغیرہ کو بل ہوس، بل عجب اور بل فضول لکھنے کا مشورہ دیا لیکن سحر صاحب واضح طور پر ان مشوروں کی خامیاں نمایاں کرتے ہیں اور اعلانیہ یہ کہتے ہیں کہ

(۱) "جہاں پرواہ آئے گا وہاں پرواہ ہی لکھا جائے گا نہ کہ "پروا"" (صفحہ ۳۴)

(۲) "عام طور پر بوالہوس ہی لکھا جاتا ہے اور اس کے لکھنے میں کوئی خاص دشواری بھی نہیں، بوالعجب اور بوالفضول کے املا میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اردو میں ان تمام الفاظ کا مروج املا ہی صحیح ہے بالفرض یہ ترکیبیں تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اتریں تو نہ اتریں، اردو میں اسی طرح لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی ہیں" (صفحہ ۴۲)

اسی طرح الف اور ہائے مختفی اور ہائے متصل کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر صاحب رشید حسن خاں صاحب کی سفارشات تفصیلی بحث کر کے انہیں غلط ثابت کر دیتے ہیں، خصوصاً تولہ ماشہ اور دانہ پانی والی بحث بہت دلچسپ ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی کتاب پر "صحیح املا" کا سائن بورڈ لگانے والے رشید حسن خاں صاحب خود کتنے ذہنی تضادات کا شکار ہیں۔ خاں صاحب کے ایسے ہی ذہنی تضاد کا ایک اور نمونہ "امالہ" کی بحث میں سامنے آتا ہے۔ جہاں وہ ہائے مختفی (کعبہ) کو یائے مجہول (کعبے) سے بدلنے کا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں اور ڈاکٹر ابو محمد سحر "قبلہ" کو "قبلے" سے بدلنے کی مثال پیش کر کے رشید حسن خاں کے قاعدہ کلیہ کو چٹکیوں سے اڑا دیتے ہیں اور شاید یہاں بھی ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب ہی کا خیال صحیح ہے کہ

"بعض الفاظ ایسی شکلوں میں بھی امالہ قبول کرتے ہیں جن کا شاید کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے، اس لئے صحیح اور غلط کا دو ٹوک فیصلہ بڑا ہی گمراہ کن ہو سکتا ہے۔" (صفحہ ۶۷)

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں بلا خوف و خطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب اردو کے تہذیبی اور لسانی ورثے سے واقف ہیں۔ مذاقِ سلیم کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ زبانِ عام کے تجربہ گاہ کے قائل ہیں۔ اور املا یا زبان کی اصلاح کے سلسلے میں نہ تو کسی سیاست یا حکومت کے رویے سے مرعوب ہوتے ہیں۔ نہ ہی نئے پن کے شوق میں نادر الوجود بیانات دیتے ہیں اور نہ ہی بلا وجہ اور بلا سبب کسی تبدیلی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اجمالاً ان کی ذاتی رائے یہ ہے کہ

(۱) "عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور ان کے املا کو اب عربی و فارسی کی قدیم فرہنگوں یا جدید تحقیقات لغت کی روشنی میں نہیں دیکھا جائے گا بلکہ یہ پہلو پیش نظر رکھا جائے گا کہ اردو میں وہ الفاظ و تراکیب کس صورت میں آئے اور انہوں نے اپنی کیا صورت برقرار رکھی، فارسی کے جو الفاظ معرب ہو کر یا عربی کے جو الفاظ مفرس ہو کر اردو میں داخل ہوئے ان کی املا میں اگر اصل کے مطابق بعد میں ترمیم نہیں ہوئی تو ان کی معرب یا مفرس صورتیں ہی قابل قبول ہوں گی، فارسی یا عربی کی جدید تحقیقاتِ لغت اور ترمیماتِ املا سے اردو املا کی حد تک ہمیں کوئی غرض نہ ہوگی۔" (صفحہ ۳۴)

(۲) "ہندی الفاظ کو ان کی قیاسی اصل کی بنا پر اردو میں لکھنے کا اصول بڑی سختی سے بنایا جاتا ہے لیکن جب عربی الفاظ کا معاملہ آتا ہے تو اصل سے قطع نظر کر کے ہمزہ اور ی کو اردو املا کو اردو سے خارج کرنے کا قاعدہ بنایا جاتا ہے .... یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہے کہ کہیں تو اصل کا [illegible] کہ کسی [illegible] یا اس کے املا کو معتوب قرار دیا جائے اور کہیں اردو کے نام پر اصل کی [illegible] اور نقصان دونوں صورتوں میں اردو کا ہو، دیکھنا یہ چاہئے کہ زبان کا ڈھانچہ اس وقت کیا ہے اور اس کی انفرادیت، مزاج اور چلن کو مدنظر رکھ کر کسی حد تک ترمیم و تنسیخ قابل قبول ہو سکتی ہے۔ (ص [illegible]

(۳) "حرفوں کو الگ الگ لکھنا بھی وبالِ جان نہ بننا چاہئے۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے انگریزی اور ہندی میں کوئی لفظ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو الگ الگ ٹکڑوں میں نہیں لکھا جاتا، اردو میں رسم خط کے بعض پہلوؤں کے پیش نظر ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن جس طرح تمام الفاظ کو ملا کر لکھنا ٹھیک نہیں اسی طرح تمام الفاظ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا بھی مناسب نہیں، دونوں طریقو[illegible]

ضروری ہے۔" (صفحہ ۸۱)

(۴) • "یہ طریقہ مناسب نہیں کہ کوئی ایک صاحب یا چند اصحاب املا کا ایک دستور بنا دیں اور یہ فرض کر لیا جائے کہ دوسرے لوگ چار و ناچار اس کو قبول کر لیں گے۔ املا کی اصول سازی اور معیار بندی کا سب سے زیادہ تعلق موجودہ رواج اور آئندہ قبولِ عام سے ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر لوگوں سے صلاح و مشورہ کیا جائے اور اصلاح کے عملی نمونوں کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے" (ص ۹۲)

(۵) • املائی اصلاح میں تحقیقِ لغت، قواعد، لسانیات اور صوتیات سے حسبِ موقع مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن چلن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (ص ۹۳)

مندرجہ بالا آرا سے اختلاف کن بنیادوں پر ممکن ہے۔ مجھے علم نہیں۔ لیکن یہ احساس ضرور ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی ساری دلیلیں اس سرکاری اردو کے چلن کو کمزور اور غیر مقبول بنانے کا سبب بن سکتی ہیں جس کا مقصد وحید اردو کو ہندی کے جیسا بنا دینا ہے۔ اس قسم کی کوششوں کی سب سے عریاں شکل تو رسم خط کی تبدیلی کا مشورہ ہے اور اس سے ذرا ہلکی لیکن اثرات میں اس سے زیادہ دور رس کمار پاشی، کنور سین اور ایسے کچھ اور ادیبوں کی وہ تحریریں ہیں جس میں رسم خط فارسی رہتا ہے مگر زبان سنسکرت آمیز ہندی ہوتی ہے اور سب سے زیادہ صبر آزما اور سب سے زیادہ پائدار، املا اور لغت وغیرہ کے سہارے اردو کے مخصوص ہند ایرانی ڈھانچے کو اکھاڑ پھینکنے کی وہ کوشش ہے جو رشید حسن خاں اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کر رہے ہیں۔

میں کوئی زبان کا ماہر تو ہوں نہیں کہ کوئی سفارش کروں اور اسے انجمن ترقی اردو (ہند) اور ترقی اردو بورڈ جیسے ادارے قبول کر لیں اس لئے بھی ان سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے کچھ کہنے کا قائل نہیں البتہ میں ان لوگوں اور ان اداروں سے جو ان سرکاری اور نیم سرکاری سفارشات اور تضادات کے مضمرات سے واقف ہیں اور ان کا رد چاہتے ہیں ایک ہی سفارش کرنا چاہوں گا کہ جہاں جہاں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، رشید حسن خاں اور گوپی چند نارنگ صاحبان کی کتابیں اور سفارشات پہنچنے کا امکان ہے وہاں وہاں ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی کتاب "اردو املا اور اس کی اصلاح" اپنی جیب خاص سے خرید کر بھیج دی جائے۔ .... انشاء اللہ تریاق کا کام کرے گی !!

★

بقیہ تبصرے

تصویر کا محض ایک رخ ہے۔ تصویر کے دوسرے رُخ کو (جسے اصل رخ کہنا چاہئے) دیکھنے کے لئے انہیں اس موڑ پر ٹھہر جانے کے بجائے آگے بڑھنا ہوگا تب انہیں انسان کی وہ تصویر نظر آئے گی جو جدو جہد، حوصلہ اور کامرانی سے عبارت ہے۔ اس نظم کے علاوہ "الہام" اور "تلاشِ خضر" فنی اعتبار سے قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ دلآویز ہے۔

★

ڈاکٹر یوسف حسن

بنگال میں اردو کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر

ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی نے ۱۲۰۱ء میں ندیا (مغربی بنگال) جب اچانک حملہ کیا تو اس وقت ں کا حکمراں راجہ لکشمن سین تھا. راجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی اور وہ چور دروازہ سے نکل کر کشتی سے بکرم پور (ڈھاکا) طرف بھاگ گیا. بختیار خلجی گوڑ یا لکھناوتی کے علاوہ شمالی اور مغربی بنگال کے کئی مقامات پر قابض ہو گیا. ۱۲۰۶ء میں اس قتل کے بعد علی مردان خلجی حکمراں بنا اور اپنا نام سلطان علاء الدین رکھ کر خود مختاری کا اعلان کیا. اس کی موت کے بعد لطان غیاث الدین نے گوڑ یا لکھناوتی کو پائے تخت بنا کر ۱۲۱۳ء سے ۱۲۲۷ء تک حکومت کی. سلطان ناصر الدین رد اسے دہلی کا اقتدار اعلیٰ قبول نہ کرنے پر حملہ آور ہوا. غیاث الدین کو شکست ہوئی اور قتل ہوا. اس کے بعد بنگال میں وں تک بدامنی اور انتشار کا عالم رہا. حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں. طغرل نے ۱۲۶۸ء میں خود مختاری کا اعلان کر کے ۱۲۸۲ء حکومت کی. سلطان غیاث الدین بلبن نے ۱۲۸۲ء میں بنگال پر حملہ کیا اور طغرل کو شکست دے کر اپنے بیٹے بغرا خاں ھناوتی کا حکمراں مقرر کیا. بغرا خاں (سلطان نصیر الدین) نے تقریباً ۶ سال تک حکومت کی. اس کے بعد اس کا بیٹا طان رکن الدین کیکاؤس ۱۲۹۱ء سے ۱۳۰۱ء تک بنگال کا حکمراں رہا. سلطان شمس الدین فیروز شاہ نے ۱۳۰۱ء سے ۳۲۲ء تک حکومت کی. اس کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی. اس کا ایک بیٹا ناصر الدین ابراہیم نے ناوتی کو پائے تخت بنا کر شمالی بنگال پر قبضہ کیا. دوسرا بیٹا غیاث الدین بہادر شاہ سونار گاؤں پر قبضہ کر کے مشرقی ال کا حکمراں بن بیٹھا. اس زمانے میں دہلی کے سلطان غیاث الدین تغلق نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بنگال پر حملہ کیا اور ۱۳۲۸ء اسے دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا. اس نے انتظامی سہولت کے لئے بنگال کو تین حصوں میں تقسیم کیا. شمالی بنگال کا دارالحکومت ناوتی قرار پایا. اور غضر خاں کو اس کا گورنر مقرر کیا گیا. مغربی بنگال کا دارالحکومت ستگرام قرار پایا. اور عزیز الدین یحییٰ کے گورنر ہوئے. سونار گاؤں مشرقی بنگال کا دارالحکومت بنا اور اس کے گورنر بہرام خاں ہوئے. بہرام خاں کی وفات پر الدین مبارک شاہ (۱۳۳۸ء تا ۱۳۴۹ء) مشرقی بنگال کا حکمراں بن بیٹھا. جعفر خاں فخر الدین شاہ کے ساتھ جنگ مارا گیا. علاء الدین علی شاہ شمالی بنگال کے اور شمس الدین الیاس مغربی بنگال کے خود مختار حکمراں بن گئے. شمس الدین

الیاس شاہ نے شمالی بنگال پر حملہ کرکے اور علاء الدین علی شاہ کو شکست دیکر گوڑ یا لکھناوتی پر قبضہ کر لیا۔ اس نے مشرقی اور جنوبی بنگال کے علاوہ اڑیسہ، ترہٹ (بہار) اور کامروپ کے علاقے بھی فتح کئے اور بنگال میں ایک خود مختار الیاس شاہی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔

بنگال کے خود مختار پٹھان سلاطین

الیاس شاہ کی وفات پر اس کا بیٹا سکندر شاہ ۱۳۵۷ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے ۱۳۸۹ء تک حکومت کرنے کے بعد اس کا بیٹا سلطان غیاث الدین اعظم شاہ حکمراں ہوا۔ ۱۴۱۰ء میں اس کے قتل کے بعد بنگال میں بد امنی اور خلفشار کا دور دورہ رہا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاکر راجہ گنیش نے ۱۴۱۴ء میں گوڑ کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ایک سمجھوتے کے تحت راجہ گنیش کے بیٹے راجہ جادو (جت مل) نے اسلام قبول کرکے سلطان جلال الدین محمد شاہ کے نام سے ۱۴۱۸ء سے ۱۴۳۱ء تک حکومت کی۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا احمد شاہ حکمراں ہوا جس نے ۱۴۳۱ء سے ۱۴۴۲ء تک حکومت کی۔ اس کے قتل کے بعد حکومت پھر شمس الدین الیاس شاہ کے خاندان میں چلی گئی۔ اس خاندان کے چار بادشاہوں نے ۴۵ برس حکومت کی۔ اس خاندان کا آخری حکمراں ۱۴۸۷ء میں ایک زرخرید حبشی غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور مظفر شاہ جو حبشی خاندان کا ایک فرد تھا حکومت پر قابض ہو گیا۔ اس کے قتل کے بعد حکومت علاء الدین حسین شاہ کے قبضے میں چلی گئی۔ اس نے بنگال کی خود مختار سلطنت کی حدود کو بہار، اڑیسہ، کوچ بہار، چٹ گاؤں، تپرہ اور آسام کے کچھ علاقے شامل کرکے بہت وسیع کر دیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا نصرت شاہ حکمراں ہوا اور اس نے ۱۵۱۹ء سے ۱۵۳۲ء تک حکومت کی۔ نصرت شاہ کے بعد غیاث الدین محمود بنگال کا حکمراں ہوا جسے شیر شاہ نے مار بھگایا۔ ۱۵۳۸ء میں بنگال کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بابر نے مغل سلطنت کی بنیاد رکھ کر ۱۵۳۰ء میں انتقال کیا۔ ہمایوں حکومت کی باگ ڈور کو پوری طرح اپنی گرفت میں لانے بھی نہ پایا تھا کہ شیر شاہ سے اس کی جھڑپ شروع ہو گئی۔ شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر دلی کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے عہد میں بنگال اپنی خود مختاری کی حیثیت کھو کر دلی کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد اس کے خاندان والے دلی کی سلطنت کو زیادہ دنوں تک برقرار نہ رکھ سکے۔ ہمایوں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پھر واپس لے لی۔ شیر شاہ کے خاندان نے ۱۵۶۴ء تک بنگال پر حکومت کی۔ اس کے بعد جنوبی بہار کا حاکم سلیمان کرانی بنگال پر قابض ہو گیا۔ ۱۵۷۲ء تک کی وفات پر اس کے بیٹے بایزید نے اس کی جگہ لی۔ پھر اس کے چھوٹے بھائی داؤد خاں کرانی نے گدی سنبھالی۔ مغلوں (اکبر اور جہانگیر) کو بنگال کے پٹھانوں کو زیر کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا حال تفصیل سے مغلوں کے باب میں آئے گا۔

ترکوں کے ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت (۱۲۰۱ء تا ۱۳۵۰ء) میں بنگال میں بڑی زبردست سیاسی، مذہبی اور تہذیبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یوں تو مسلمانوں کی فتح بنگالہ سے قبل مسلمان سوداگر اور بزرگان دین اسلام کو اس سرزمین سے روشناس کرا چکے تھے۔ مگر اسلام کی ترقی کی رفتار بڑی سست تھی۔ مسلمانوں نے جب بنگال کو فتح کیا اور ان کے قدم یہاں مضبوطی سے جم گئے تو خود بخود اس کے پھلنے پھولنے کی راہیں صاف ہو گئیں۔ مسلمان اپنے ساتھ ایک ترقی پسند مذہب اور ترقی یافتہ تہذیب لائے تھے۔ صدیوں سے برہمنوں کے ستائے ہوئے غیر مسلم جن میں

بیشتر بدھسٹ تھے اسلام کے جمہوری اصولوں اور انسان دوستی کے فلسفے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے مسلمان صرف ملک ہی نہیں فتح کرتے تھے بلکہ اپنی انسانیت نوازی کے سلوک سے عوام کے دلوں پر بھی فتح پا لیتے تھے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق[1] "اسلامی کلچر سے بنگال میں علمی احیا کی بنیاد پڑی اور اب بنگال ایک نفسیاتی انقلاب سے دوچار ہونے لگا۔ بنگال کی دنیا دو حصوں میں منقسم تھی، ایک نئی تنومند اسلامی دنیا تھی اور دوسری قدیم خستہ حال شکستہ اور رسوم زدہ ہندو دنیا۔"

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد مشرق وسطی کے ملکوں اور شمالی اور مغربی ہند سے مسلمانوں اور ان کے ساتھ صوفیوں اور درویشوں کی کثیر تعداد میں بنگال آنے کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ یہ لوگ بنگال میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو کر اور مقامی آبادی میں گھل مل کر اور شادی بیاہ کا سلسلہ قائم کر کے آبادی کا ایک حصہ بنتے گئے۔ ڈاکٹر انعام الحق اپنی کتاب "مسلم بنگلہ ساہتیہ" میں لکھتے ہیں "بختیار اور اس کے جنرلوں کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی یا تو غیر شادی شدہ تھے یا بیویاں ساتھ نہ لائے تھے۔ انہوں نے نیز بہت سے دوسرے مسلمانوں نے بنگال میں شادیاں کر لیں اور یہیں کے ہو رہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد مسلمان بنگال میں ایک تہذیبی قوت بن گئے۔"

باہر سے آنے والے بزرگان دین میں حضرت مخدوم جلال الدین تبریزی اور حضرت شاہ جلال مجرد یمنی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ حضرت مخدوم جلال تبریزی ۱۲۲۵ء کے لگ بھگ بنگال تشریف لائے اور پنڈوا میں سکونت اختیار کر کے تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ حضرت شیخ جلال الدین مجرد یمنی نے ۱۳۰۳ء میں مع اپنے ۳۱۳ مجاہدین کے سکندر غازی کی فوج کے ساتھ راجہ گور گوبند کی سرکوبی کے لئے سلہٹ پر حملہ کیا تھا۔ (عہد علاء الدین خلجی اور بنگال کا حکمران شمس الدین فیروز شاہ) سلہٹ کی فتح کے بعد حضرت جلال نے مجاہدین میں تمام مفتوحات تقسیم کر دیں اور ہر ایک کو شادی بیاہ کی اجازت دیدی۔ آپ سلہٹ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے اور تبلیغ و اشاعت میں ساری زندگی گزار دی۔

شاہ جلال تبریزی اور شاہ جلال مجرد یمنی نے بقول ڈاکٹر انعام الحق[1] جس کام کو شروع کیا تھا بعد کے صوفیوں اور درویشوں نے اس کو آگے بڑھایا۔ ان میں سب سے مشہور یہ تھے۔ غازی ملک اکبر خاں جو ۱۲۱۴ء میں بنگال آئے اور پاریل میں دفن ہوئے۔ انہوں نے ساری عمر ڈھاکہ کے مانک گنج کے علاقے میں گذار دی۔ خواجہ معین الدین چشتی کے مرید عبداللہ کرمانی بیر بھوم کے علاقے کھستگری کے رہنے والے (۱۱۴۴ — ۱۲۳۶ء) مخدوم شاہ محمد غزنوی عرف راہی پیر جو ۱۲۰۲ء میں بردوان کے علاقہ منگل کوٹ میں آئے۔ شاہ صفی الدین شہید جو تیرہویں صدی کے آخری زمانے میں فوت ہوئے اور سیتگرام کے علاقہ تربینی میں عمر گذار کے چھوٹا پنڈوا میں دفن ہوئے۔ بدر الدین مبارک علامہ عرف بدر شاہ جو سلطان فخر الدین مبارک شاہ (۱۳۳۸ - ۱۳۴۹ء) کے زمانے میں ضلع چاٹگام میں رہتے تھے۔ مخدوم شاہ دولہ جو ۱۲۵۰ء میں بقید حیات تھے اور بوگرہ اور پبنا کے رہنے والے تھے جو بعین پرگنہ

۱۔ مسلم بنگلہ ساہتیہ (مسلم بنگالی ادب) صفحہ ۳۵

یہ علاقے بلندہ کے سید عباس علی مکی عرف پیر گورا چاند جو ١٣٢٢ء میں زندہ تھے اور ان سب سے مشہور اور بے مثال شیخ اور مذہبی عالم تھا ١١٣٠ء اور ١٣٥٠ء کے درمیان دیناج پور میں تبلیغ اسلام کرتے تھے۔"

ان بزرگان دین نے بنگال کے مختلف علاقوں میں پھیل کر اپنی سرگرمیوں سے بنگال کے مذہبی اور تہذیبی ڈھانچے میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا۔ سلطانوں اور امیروں کی بنائی ہوئی مسجدیں اور مدرسے اور صوفیوں اور درویشوں کی قائم کی ہوئی خانقاہیں اور آستانے مذہبی اور تہذیبی ادارے بنے۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی۔ ترک اپنے ساتھ ترکی زبان لائے تھے۔ ریاستی زبان فارسی تھی۔ سنسکرت سب سے زیادہ مانوس زبان تھی جو ہندوؤں کی مذہبی زبان بھی تھی۔ ان کے علاوہ چند دیسی اور مقامی بولیاں تھیں۔ چنانچہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے بے شمار الفاظ ان بولیوں میں رائج ہوئے۔

مختصر یہ کہ ترکوں کے ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت میں شورشوں، بغاوتوں، اور خانہ جنگیوں کے باوجود اسلام کی جڑیں مضبوطی سے اس سرزمین میں پیوست ہوئیں۔ بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے آنے اور رہنے بسنے کا سلسلہ قائم ہوا۔ مسلمانوں کے تسلط کے ساتھ برہمنوں کا زور ٹوٹا۔ غیر مسلم کثرت سے مسلمان ہوئے اور مسلمانوں کی تہذیب تمدن اور ان کی زبانوں سے متاثر ہوئے۔ اس طرح ایک مخلوط بولی اور مخلوط تہذیب کی تشکیل ہوئی۔

ترکوں کے دور کے بعد خود مختار پٹھانوں کا دور (١٣٥٠ء سے ١٥٧٥ء تک) شروع ہوتا ہے۔ بنگال میں بنگلہ زبان، مخلوط بولی (دوبھاشی) اور اردو زبان کی تاریخ اور ارتقا کو سمجھنے کے لئے اس دور کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔

بنگال کا علاقہ وسطی ہندوستان سے کافی فاصلہ پر تھا۔ پھر گھنے جنگلوں، پہاڑیوں کے سلسلوں اور بڑے بڑے دریاؤں نے بنگال کو اور بھی علحدہ کر دیا تھا۔ بقول ڈاکٹر شہید اللہ[۱] "چونکہ بنگال دہلی سے خاصے فاصلہ پر واقع تھا۔ اس لئے اکثر سلاطین دہلی بنگال میں اپنا اقتدار باقی رکھنے میں قاصر رہے اور یہی سبب تھا کہ بنگال کے حکمران ایک ذرا موقع ملتے ہی اپنی آزادی اور خود مختاری کا علم بلند کر دیا کرتے تھے۔ اس بار بار کی بغاوت کا ثمرہ تھا کہ بدنام ہو کر گوڑ، 'بلگل پور' یعنی 'باغی پور' کے نام سے مشہور تھا ـــــ اعلان آزادی کے ساتھ ہی ساتھ الیاس شاہی حکمرانوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ بوقت ضرورت سلطنت دہلی سے جنگ اور اپنی مدافعت نیز نظام سلطنت کی بہبودی اور استواری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ لازمی اور لابدی ہے کہ اس ملک کی لاتعداد ہندو رعایا سے واقفیت پیدا کی جائے اور ساتھ ہی ان کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ یہی سبب تھا کہ وہ ملکی ادب کی حوصلہ افزائی کے لئے آگے بڑھے ...."

سلطان الیاس شاہ کے بعد سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کا نام بنگلہ زبان کی سرپرستی کے لئے آتا ہے۔ اس کے زمانے میں بنگلہ زبان اور ماتھیلی زبان کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس نے اپنے دربار میں ایک حافظ شیرازی کو دعوت دی تو ماتھیلی زبان کے شاعر ودیاپتی کو بھی مدعو کر کے بڑی عزت بخشی۔ فارسی

۱۔ بنگلہ ادب کی تاریخ - ڈاکٹر محمد شہید اللہ - صفحہ ٦٦ اور صفحہ ١٠١

سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رہی۔ اس طرح بنگال میں عربی، فارسی، ترکی، مائیتھلی، برج اور بنگلہ کے ساتھ مت منفرد طور پر ایک مخلوط زبان کا پیکر تیار ہو رہا تھا کہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر ایک ہندو خاندان (راجہ گنیش) کے قبضے میں چلی گئی۔ راجہ گنیش کے خاندان نے تقریباً ۲۸ برس بنگال پر حکومت کی۔ اس خاندان کے حکمرانوں کے دور میں بنگلہ زبان و ادب پر ہندو مذہب کے اثرات بری طرح چھا گئے۔ بنگالی رامائن کا مصنف کرتی واس پہلا بنگالی ادیب تھا جس نے سلطان جلال الدین (راجہ گنیش کا بیٹا راجہ جادو) کے دربار میں اپنے اشعار پڑھے اور جسے سلطان نے پھولوں کی مالا پہنائی۔ اس خاندان کا تیسرا اور آخری بادشاہ شمس الدین محمد شاہ تھا جس کے عہد میں چنڈی داس نمودار ہوا اور گوڑ کے دربار میں اپنا کلام سنایا۔ ۱۴۴۲ء میں الیاس شاہ کے خاندان نے گوڑ پر قابض ہو کر ۴۵ برس حکومت کی۔ اس زمانے میں "مالادھر باسو" نے "سری کرشن وجے" لکھ کر گن راج خاں کا خطاب حاصل کیا۔ دھروانند مسرا نے ایک سماجی تاریخ "مہاونشاولی" لکھی۔ سلطان شمس الدین یوسف شاہ کی فرمائش پر زین الدین نے ایک فارسی مثنوی کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے اس کا نام "رسول وجے" رکھا۔ غرض بنگلہ زبان نے ۱۴۸۷ء تک دربار میں رسائی کر لی تھی۔ ۱۴۹۳ء میں حسین شاہ گوڑ کے تخت کا مالک بنا تو بنگلہ زبان کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں۔ حسین شاہ اور اس کے خاندان کے حکمرانوں نے بنگلہ زبان کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ بنگالی مہابھارت اور دیومالا کی مشہور کہانی "ودیا سندر" یہ سب حسین شاہی ادب کی یادگار ہیں۔ وشنومت کا پرچار بھی اسی زمانے میں ہوا۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق[1] "وشنومت تصوف کے اصول "ذکر" کی بنگالی شکل ہے جو یاد الٰہی اور خدمت خلق کی بنیادوں پر قائم ہے۔ وشنومت میں اسلام کی مساوات اور اخوت کے اصول نمایاں ہیں۔ صوفیوں کے سماع اور وشنو کی کیرتن میں کوئی بھی فرق نہیں۔ سماع اور کیرتن کے بعد وشنوؤں کی جسمانی اور قلبی کشش بھی آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ بلکہ بنگالی اور فارسی کے تلمیحات بھی ایک سی ہیں "وشنومت" کا "پریم" فارسی کا "عشق" ہے۔ رادھا کرشن کے مقابلے میں "ساقی" اور "مے" یا "شمع" "پروانہ" ہے۔" اشرف صوفیوں کی کرامت کو سمجھئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی وشنو طرز میں اپنا کلام لکھا۔ اس زمانے میں مسلمان ہندوانہ موضوعات پر لکھنے کو غیر اسلامی تصور نہیں کرتے تھے۔

حسین شاہ کے بیٹے نصیر الدین شاہ (۱۵۱۹ء - ۱۵۳۰ء) نے بھی مہابھارت کا بنگلہ ترجمہ کرایا — غیاث الدین محمود کے عہد میں برنداون داس کی "چیتنا بھگوت" اور لوچن داس کی "چیتنا منگل" لکھی گئیں۔ غرض بنگلہ زبان ایک مضبوط زبان بن چکی تھی۔

اس دور میں باہر سے فقیروں اور درویشوں کے آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ان بزرگوں کا تعلق مختلف خانوادوں سے تھا۔ مثلاً سہروردیہ، قادریہ، چشتیہ، زاہدیہ، جلیلیہ وغیرہ۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی لکھتے ہیں[2] "اشرف جہانگیر سمنانی کے ایک خط مرقومہ ۱۴۱۵ء سے ہمیں ان بزرگان دین کے مختلف سلسلوں کی جھلک ملتی ہے — انہوں نے لکھا ہے کہ سرزمین بنگال بھی کتنی عمدہ سرزمین ہے جہاں مختلف مقامات سے بے شمار مشائخ اور

[1] مسلم بنگلہ ساہتیہ (مسلم بنگالی ادب) صفحہ ۶۴
[2] ثقافت۔ مشرقی پاکستان نمبر

فقراء آئے جنہوں نے اسے اپنا وطن بنالیا۔ مثال کے طور پر دیوگاؤں کو لیجئے جہاں شیخ المشائخ شہاب الدین سہروردی کے ستر ممتاز مرید ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہی حال دیوتلہ میں سلسلہ جلیلیہ کے بزرگوں کا ہے۔ حضرت شیخ شرف الدین طوامہ کا مزار سنار گاؤں میں ہے۔ حضرت شیخ شرف الدین منیری آپ کے خاص مریدین میں سے تھے۔ ان کے بعد حضرت بندہ عالم ماہی گدرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگال کے شہروں کا تو کیا ذکر کوئی قصبہ اور کوئی قریہ ایسا نہ تھا جہاں بزرگان دین نہ پہنچے ہوں اور آباد نہ ہوئے ہوں۔"

ڈاکٹر انعام الحق نے بھی اپنی کتاب "مسلم بنگلہ ساہتیہ" میں اس دور کے مشہور بزرگوں کے نام دیئے ہیں:

اخی سراج الدین، گوڑ (وفات ۱۳۵۷ء) شیخ علاء الحق پنڈوا (وفات ۱۳۹۸ء) نور قطب عالم (وفات ۱۴۱۶ء) شاہ انور قلی حلوائی، فرفرہ، ہگلی (وفات ۱۳۷۵ء) شاہ اسماعیل غازی رنگپور (۱۴۷۴ء میں قتل کئے گئے) خان جہان، کھلنا (وفات ۱۴۵۸ء) حاجی بابا صالح، سنار گاؤں (وفات ۱۵۰۶ء) شاہ جلال سلہٹ (وفات ۱۳۴۶ء) شاہ محسن اولیا، چاٹگام (وفات ۱۳۹۷ء) پیر بدر (زمانہ فخر الدین، مبارک شاہ) راستی شاہ تپرہ (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ء) مولانا برخوردار، گوڑ (۱۴۸۶ء سے پہلے) مولانا عطا، دیوکوٹ (۱۳۵۵ء) مولانا شاہ دولہ، راج شاہی (۱۵۱۹ء میں زندہ تھے) شاہ چاند عرف دادا پیر، مرشد آباد (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء) سید جلال الدین عالمی، ستگرام (وفات ۱۵۳۱ء) سید شاہ علی بغدادی، میرپور، ڈھاکہ (۱۵۲۰ء میں زندہ تھے)

ان صوفیوں اور درویشوں کی سرگرمیوں نے بنگال کی مذہبی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ یہ بنگال کے گاؤں گاؤں میں پھیل کر اسلام کا پیغام پہنچانے میں مصروف تھے۔ ان کے مدرسوں اور خانقاہوں میں تعلیم و تلقین اور واعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری اور سماع کی مجلسوں کے ذریعہ پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باہر سے آئے ہوئے مسلمان خاص طور پر بزرگان دین مقامی لوگوں کے ساتھ کون سی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ کوئی نہ کوئی تو ایسی بولی خواہ وہ انتہائی غیر ترقی یافتہ حالت میں ہی کیوں نہ ہو، ضرور ہوگی جسے مقامی اور غیر مقامی سمجھتے اور بولتے ہوں گے۔ ہمیں اس طرح کی بولی کے نشانات حضرت شرف الدین احمد منیری کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ حضرت شرف الدین احمد منیری اس دور کے بزرگوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے ایک عرصے تک بنگال میں قیام فرمایا تھا۔ اور تعلیم و تربیت بھی سنار گاؤں (بنگال) ہی میں پائی تھی۔ محمود شیرانی لکھتے ہیں: "تصنیفات کے سلسلے میں آپ کے ملفوظات و مکتوب موسوم بہ معدن المعانی کتاب ارشاد السالکین اور شرح اداب المریدین مشہور ہیں۔ شرف نامہ احمد منیری ابراہیم بن قوام فاروقی نے آپ ہی کے نام پر سلطان باربک شاہ ۸۶۲ھ و ۸۷۹ھ والی بنگالہ کے عہد میں لکھا ہے۔ شیخ شرف الدین مجالسہ میں شاعری کرتے تھے اور شرف آپ کا تخلص تھا۔ ذیل میں آپ کا ایک کج مندرہ جو انواع امراض کے لئے مفید بتایا جاتا ہے نقل کرتا ہوں۔ ان کے دوسرے اس کج مندرہ میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں کج مندرہ اس عہد کی اردو کا بھی ایک اچھا خاصہ نمونہ ہے۔"[1]

[1] پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی صفحہ ۱۴

اس کج مندرہ کے اہم ٹکڑے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللھم صل علیٰ محمدؐ و آل محمد .... کرتا بیدن ہرتا دہی ایک سرجن ہار دو جگ تین تلوک چار بید پانچ ہند وچھ مارک سات سمندر آٹھ بس نو گرہ دس راون .... رات دن بھر کہری ڈنڈی ڈنڈ پلا پیلا جوک مہورت میں تہیں ساکھی دھرت ہوں جو کچھ فلانے کے پنڈ پران میں ہوئی راہ کا بات کا کونے کا پوکہر کا اندیساری کا اجیالی کا چوٹ کا پھیٹ کا کٹے کا کرائے کا پہچانے، لانگھے کا الکھن کا دلیو دالو بھوت پیت راکس بھوکس ڈائن ڈکن سکھن لچھن چوڑیل میل ملان جان بھوان .... کشت الوں ہا ہو بلغم پی جوش مرکی کہی کہا گلٹی پھرکی باؤ کولا۔ سرخ باد سبز باد سیاہ باد زرد باد و ہفتاد دو باد ہر بادے کہ باشد در وجود فلاں جن آبکار دہیں سہے۔ دو ہائی سلیمان بن داؤد پیغمبر کی جل بھسمنت ہو بیک بلا جائے بیک بلا جائے ..

....

سراپ جی جی کرنت تی تی مرنت دہائی شاہ شرف الدین احمد منیری کی ....

کالا ہنسا نرملا سے سمندر تیر
پنکہ پسارے بکہ ہرے نرمل کرے سریر
بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
درد رہے نہ پیر
دوہرہ راسہ بار بخواند
شرف صرف مائل کہیں درد کچھو نہ بسائے
گر دچھویں بار کی سو درد دور ہو جائے "

حضرت شرف الدین احمد منیری نے اس کج مندرہ میں جو زبان استعمال کی ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان کی وہ مخلوط بولی جو شمالی اور مغربی ہندوستان میں زبان دہلوی، زبان ریختہ، دکنی، ہندی اور بعد میں ہندوستانی اور اردو کے ناموں سے مشہور ہوئی چودھویں صدی عیسوی میں بنگال اور بہار میں بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ حضرت شرف الدین منیری کی تحریروں کے اور بھی نمونے بہار میں ملے ہیں۔

مولانا ابراہیم قوام فاروقی بنگال کے رہنے والے تھے۔ آپ نے سلطان باربکشاہ (۸۶۲ھ و ۸۷۹ھ) والی بنگالہ کے عہد میں ایک لغت شرف نامہ احمد منیری لکھا تھا۔ اس لغت سے چند ہندی الفاظ کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں[1]۔

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اکار (باغبان)	کویری	پچہ (لبلاب و عشقہ)	اکاس بیل
ہندشیشا	گالہ	جامہ خوک	سوالہ
بھرک	گرہ (گرہ)	چوبہ	بیلن

[1] پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی صفحہ ۲۱۶

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
بجران	کھرچنی (کھرچنی)	خردل	رائی
پنج پایک	کیکڑہ	آہن جفت	بھالہ
ترترک	ممولا	آروغ	متا
انگروانگورہ	ہینگ	بناغ	گلری
آہک	چونہ	بان	سہجنہ
بساک	سہرہ (سہرا)	تیک	گھن
باخہ	کچھوا (کچھوا)	پائلہ	کراہی
پنگان	تھال	تختہ بند	پٹی
تسمہ	پاتی	چرپہ	بلامی
خاکستر	راکھ	خفتگان	آنکھ (انگا)
دغدغہ	کدکدی (گدگدی)	شیردان	کھیری
شنبلیت	میتھی	کشک انجیر	گولہ
خرفہ	لونک	دلوچہ	جوک
راسو	نیول	زرت	جوار
زاک	پھٹکری (پھٹکری)	سلیک	گھٹن
مقلی	کراہی	شمنہ	بلائی
زغنک	ہچکی	سرند	سوال
سنبل	جھر	شب تاب	جکی
کت	کھت (کھاٹ)	کان	کھان
کلوندہ	گلری	کوفتہ	پلہری
گدر	گاجر	مقناطیس	جومک
ماہچہ	سولی	کمان گرہ	غلول (غلیل)
کانسی	کسنی	مشکیں وفادار (پھول)	جولی (جوئی)
موز	کیلہ	یاقوت سرخ	پدم
کنار	بیر	قزاستر (قلاوز)	چوکی

بنگال میں نویں صدی ہجری میں ایک بنگالی فرہنگ نگار نے اپنی فرہنگ میں فارسی الفاظ کی شرح کے ساتھ ان کے ہندی مرادفات بھی دیئے ہیں۔ انکی کثرت سے ہندی الفاظ اور ہندی میں مختلف اشیا کے ناموں کی ابھرتی

سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں ہندی جو بعد میں اردو کہلائی بنگال میں سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ محمود شیرانی نے اس کی وضاحت یوں کی ہے [1]

" یہ امر یاد رہے کہ یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برجی ہے نہ پنجابی۔ نہ راجستھانی اور نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اردو ہے جو اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔ اس لئے ان بعید زمانوں میں بھی اس قدر ترقی اور وسعت اختیار کرلی تھی کہ پنجاب، بنگالہ، گجرات اور ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ مذکورہ بالا فرہنگ نویس باوجودیکہ مختلف مقامات ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی مالوہ کا ہے، کوئی بنگالہ کا، اور کوئی پنجاب کا جہاں مختلف زبانیں بولی جارہی ہیں اور ان لوگوں کا اپنے اپنے وطن کی زبانوں سے واقف ہونا بھی لازمی ہے۔ لیکن اپنے لغات میں وہ وطنی زبانوں کے الفاظ نہیں دیتے بلکہ اسی عام زبانوں کے جو تمام ملک کے مسلمانوں کی مشترک ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ الفاظ ان تمام لغات میں عام ہیں ....."

خود مختار پٹھان سلاطین کے دور سے سوریوں کے دور تک بنگال اور بہار میں مقامی بولیوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ فارسی سرکاری زبان ہونے کے باوجود کمزور اور نڈھال رہی۔ شیر شاہ اور اس کے خاندان کے افراد نے ۱۵۷۶ء تک بنگال پر حکومت کی۔ اس زمانے میں بنگال اور بہار میں ماگدھی سے نکلی ہوئی چار اہم بولیاں تھیں۔ شمالی بہار کی میتھلی، جنوبی بہار کی مگہی اور مغربی بہار کی بھوجپوری اور بنگال میں بنگلہ۔ شیر شاہ خود بہار کے علاقہ سہسرام کا رہنے والا تھا۔ سوریوں کو بقول محمود شیرانی [2] " فارسی سے سخت دشمنی تھی "۔ سوریوں نے بھی بنگال کے خود مختار پٹھان سلطانوں کی طرح مقامی بولیوں کو فروغ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ یہ بولیاں فطری طور پر ایک دوسرے سے ملتی جلتی اور متاثر تھیں۔ بنگلہ زبان نے سوریوں کے دور کے ختم ہونے تک برہمنوں کے زیر اثر سنسکرت کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ اس کا اندازہ ان بولیوں کے نمائندہ شاعروں کے ان اشعار سے لگا سکتے ہیں۔ میتھلی کا شاعر ودیاپتی کہتا ہے [3]

کھن اک من سنو بھکن	ترجمہ	(ذرا جی لگا کے ایک اچھا بیان سنو)
کچھو بولوں ترکانوں لکھن	"	(کچھ ترکوں کے لچھن میں بتاتا ہوں)
تتو بے کہار و پیٹھے بجاری	"	(وہاں دو کہار بازار میں داخل ہوئے)
جہن لکھ گھورا مونگا ہجاری	"	(جہاں لاکھوں گھوڑے اور ہزاروں ہاتھی تھے)
کھریدے کھریدے بھوتا گلامو	"	(بہت سے غلام خریدے گئے)
ترکین ترکین انیکو سلامو	"	(ترک ترک کو سلام کرتے ہیں)

کبیر داس بنارس کا باشندہ تھا۔ اس کا بھوجپوری میں نمونہ کلام [4]

کنوا پھڑواکے جوگی جٹوا بڑھولے	(کان پھڑوا کے جوگی نے جٹا بڑھایا ہے)
داڑھی بڑھائے جوگی ہوگیلے بکرا	(داڑھی بڑھا کے جوگی بکرا ہوگیا)

[1] پنجاب میں اردو۔ صفحہ ۲۰۷

[2-3] کیرتی لتا۔ ودیاپتی۔ بحوالہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی [4] زبان مشرقی بنگال و امکان، ظہیر الدین احمد صفحہ

کہہ ٹی کبیرا سنو بھائی سادھو (کہتا ہے کبیر سنو بھائی سادھو)
جم درجوا باندھل جیسے پکڑا (جم کے دروازے پر تم پکڑ باندھ کرلے جائے جاؤگے)

بہرام خاں چاٹگام کا باشندہ تھا۔ اس نے ۱۵۴۵ء سے ۱۵۵۷ء تک بنگلہ زبان میں شاعری کی تھی۔ اس کے علمی شغف کی قدر کرتے ہوئے سور خاندان کے خود مختار بادشاہ نظام شاہ سور نے اسے وزیر دولت کا خطاب دیا تھا۔ "لیلیٰ مجنوں" اس کی بڑی طویل اور مشہور نظم ہے۔ یہ دراصل جامی کی "لیلیٰ مجنوں" کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں ایک جگہ کہتا ہے:

بیرہی چیندرا ندا (بیوہ کی چاند سے نفرت)

بیرہی جنیر پرکھی ششتی دیا ہیں — اے یا پے ماشیہ تورا ایک پلکے کھیں
(بیوہ کے لئے چاند بھی بے رحم ہے — (اس گناہ کی پاداش میں چاند گھلتا جاتا ہے)
دکھیتو جنیر کرییا ناہی تمہار — تے کارنے پرتی ماشے مریتو ایکبار
(دکھیوں کے لئے رحم نہیں ہے ترے پاس — اس لئے ہر مہینہ موت واقع ہوتی ہے ایکبار)
بیرہی جنیر من ایدی ششنیک — تے کارنے رہیلک اندور کلنک
(بیوہ کا دل ہر وقت خوفزدہ رہتا ہے — اس لئے اس کے (چاند کے) چہرے میں داغ ہے)
بالک شمی شرب لوکے بیدیتو — بی شیش انک بکرو چیندرے چیر ہتو
(بچپن کا وقت ہر کسی کو یاد رہتا ہے — یہی وجہ ہے کہ چاند کی شکل میں ٹیڑھاپن ہے)

بنگال میں ترکوں کے دور سے سوریوں کے دور تک مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی اور سرکاری زبان فارسی۔ اس کے باوجود اگر بہرام خاں کے کلام میں عربی اور فارسی الفاظ نہیں ملتے ہیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہی چاٹگام ہے جہاں مسلمانوں کی فتح بنگالہ سے قبل عربی ایک عام فہم زبان تھی۔ بنگال میں مغل سلطنت کے قیام سے قبل مقامی بولیوں کی یہی حالت اور کیفیت تھی۔

(۱) بنگالی زبان کا تاریخی ارتقا ... بحوالہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ...

پروفیسر جاوید حیات

یہ لوگ ـــــ ایک مطالعہ

صنم پرستی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ چنانچہ فنون لطیفہ میں تشبیہیں اتارنا یا پیکر تراشنے کا کام کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ مصور کنویس پر برش اور رنگوں کے امتزاج سے پیکر تراشتا ہے۔ بت تراش سنگ و تیشہ کی مدد لیتا ہے اور تجسیم کا کام کرتا ہے۔ پیکر تراشی ادب میں بھی ہوتی ہے اور ادیب الفاظ کی مدد سے تشبیہیں اتارتا ہے جسے اصطلاح میں خاکہ کہتے ہیں۔ یہ مضمون کی مخصوص نوعیت ہے جس میں کسی شخصیت کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کی جاتی ہے۔ اس میں کسی خاص فرد سے متعلق مصنف کے ذاتی تاثرات کچھ اس طرح پیش کئے جاتے ہیں کہ اس کے چہرے کے نقوش اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارگر عوامل سبھی کچھ احاطہ تحریر میں آجاتے ہیں۔

ہمارے ادب میں شخصیت کا احساس بیسویں صدی کے اوائل سے ہی ملنے لگتا ہے۔ تذکروں کی صورت میں جہاں ہمیں اردو ادب کی تاریخ و تنقید کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ وہیں ادبی شخصیتوں کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ محمد حسین آزاد کی تصنیف "آب حیات" میں تو قلمی تصویر کشی یا مرقعہ نگاری کے نمونے بھرے پڑے ہیں۔ جس میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح فرحت اللہ بیگ کی تصنیف "نذیر احمد کی کہانی میری زبانی" عبدالحق کی "چند ہم عصر" چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ" رشید احمد صدیقی کی "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہم نفساں رفتہ" ڈاکٹر محمد حسین کی "بہار کے نو چراغ" اور "نمود ہستی" وغیرہ اردو میں خاکہ نگاری کے اہم نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو میں خاکہ نگاری کے مختلف نمونے سامنے آتے رہے ہیں۔ جن میں سے حالیہ نمونہ ڈاکٹر محمد مثنیٰ کی تصنیف "یہ لوگ" بھی ہے۔ جسے انڈین لینگویجز پبلی کیشنز گیا نے فروری ۱۹۸۲ء میں شائع کیا ہے۔

"یہ لوگ" ڈاکٹر محمد مثنیٰ کے ادبی خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں بقول مصنف "یادوں کی خلش ہائے پنہاں کے طفیل تاثرات اور واقعیات کے بیان سے میں نے بعض شخصیتوں کی تصویر کشی کی ہے۔" یہ تمام شخصیتیں ہماری جانی پہچانی ہیں اور اپنی شخصیت و سیرت کے لحاظ سے بلند مقام پر فائز ہیں۔ خواجہ غلام السیدین

علامہ جمیل مظہری، احتشام حسین، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، کلام حیدری، راہی معصوم رضا، آر۔ کے گرگ، اقبال مجید، اور مظہر امام، یہ تمام شخصیتیں اپنے اپنے حلقے میں آفتاب و مہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشتیؔ صاحب نے انہیں قریب سے دیکھا ہے اور ان کی زندگی کے بعض معمولی اور غیر معمولی پہلوؤں سے وہ [illegible] ہوئے ہیں۔ جنہیں انہوں نے نہایت ہی حسن و خوبی کے ساتھ کاغذ کے صفحات پر بکھیر دیا ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت و [illegible] ان کی علمیت و بصیرت اور ان کی مختلف داخلی و خارجی خصوصیات ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

پہلا خاکہ ہندوستان کی قومی اور سماجی زندگی کے ایک اہم معمار خواجہ غلام السیدین کا ہے جو خواجہ الطاف ح[illegible] کے نواسے اور خواجہ غلام الثقلین کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے لیڈس (Leeds) میں اپنی طالب علمی کے دور میں سب سے [illegible] نمبر حاصل کر کے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اور نہایت ہی کم عمری میں یونیورسٹی پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ایک معلم کے علاوہ وہ ایک اچھے ادیب اور اصول پسند سیاست داں بھی تھے۔ ان سب سے بڑھ کر ان کے اند[illegible] اچھے انسان کی تمام تر خوبیاں موجود تھیں۔ اخلاق مندی، شگفتہ مزاجی، شائستگی، خوش گفتاری، روشن خ[illegible] امن پسندی وغیرہ جیسی خوبیاں ان کی شخصیت کے جوہر تھے۔ جنہوں نے مشتیؔ صاحب کو پہلی ہی ملاقات میں ان کا گ[illegible] بنالیا جو پہلی بھی تھی اور آخری بھی لیکن ان کی شخصیت کا جو گہرا نقش ان کے ذہن پر قائم ہوا تھا اس نے انہیں ا[illegible] کے اظہار پر مجبور کر دیا۔

دوسرا خاکہ شاعر بہار علامہ جمیل مظہری کی زندگی کے چند نقوش پر مشتمل ہے۔ جس کے ذریعہ ان کی فراخ[illegible] ان کی طرز گفتگو، ان کی عالمانہ و مفکرانہ حیثیت، ان کے افکار و خیالات اور ان کی بصیرت و بصارت کے کئی گوشے [illegible] نقاب ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ اسے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمیل مظہری سے ہماری پرانی آشنائی ہو۔ وہ [illegible] شاعروں کی حوصلہ افزائی کس طرح کرتے تھے۔ زندگی کے بنیادی اور گہرے مسائل و حقائق کے بارے میں ان کے تصو[illegible] اور خیالات کیا تھے۔ فلسفہ و تاریخ اور مذہب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی، ان کی تخلیق و تشکیک، ان کی فکر و [illegible] غرض کہ زندگی کی مختلف جہتیں ہم پر روشن ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد احتشام حسین کی شخصیت کے کچھ نقوش پیش کیے گئے ہیں جن سے مصنف کی پہلی ملاقات زمانہ طالب[illegible] میں ہوئی تھی۔ اور اسی پہلی ملاقات میں ان کے علم و فضل اور سادگی و انکساری کا سکہ ان کے دل و دماغ پر بیٹھ گیا تھا [illegible] میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی زندگی کے کئی گوشے ان پر واضح ہوتے چلے گئے۔ جنہیں مشتیؔ صاحب نے نہایت ہی حسن و خ[illegible] کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ان تاثراتی بیان کے پس منظر میں ترقی پسند تحریک سے متعلق کئی امور بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

احتشام حسین کے بعد سہیل عظیم آبادی سے متعلق کچھ یادیں کچھ باتیں پیش کی گئی ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد قا[illegible] کے سامنے سہیل صاحب کی شخصیت و سیرت کا ایک جیتا جاگتا مرقع آجاتا ہے۔ ہم یہ جان لیتے ہیں کہ ان کی ذات میں [illegible] جدید کا ایک خوبصورت امتزاج تھا۔ بزرگوں کا احترام، ہم عصروں سے محبت اور نوجوانوں کی حوصلہ اف[illegible] کرنا سہیل صاحب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ ملک کے قابل ذکر ادبا و شعراء میں بیشتر ان کے قریبی ا[illegible]

مخلصانہ مراسم تھے۔ اور ہندی ادیبوں کے درمیان بھی ان کی مقبولیت اسی طرح تھی جس طرح اردو ادیبوں کے درمیان۔ ان کے گرد نوجوان ادیبوں اور فنکاروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ غرض کہ ان کی ادبی شخصیت سے الگ ہٹ کر ان کی ذات کے بہت سارے گوشے ہم پر واضح ہو جاتے ہیں۔ ان کے لب ولہجے کی اپنائیت، انداز گفتگو کا غیر رسمی پن اور اعتبار قائم کر دینے والا اخلاص۔ یہ سب کچھ ہم پر اس طرح واضح ہو جاتا ہے جیسے کہ ان سے ہماری ذاتی ملاقات ہو۔

پانچواں خاکہ اختر انصاری کا ہے۔ جن کی تحریروں نے شروع سے ہی مشفق صاحب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور جب وہ علی گڑھ پہنچے اور ان سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے تو ان کا تاثر اور گہرا ہو گیا۔ یہ تمام تاثرات ان کے خاکے سے پوری طرح نمایاں ہے۔

چھٹا خاکہ خلیل الرحمن اعظمی کا ہے جو اس مجموعے میں شامل خاکوں کے درمیان سب سے منفرد اور بھرپور ہے۔ یہ خاکہ شروع تو ہوتا ہے بظاہر ایک غیر متعلق واقعہ کے بیان سے جس میں قاضی عبدالستار کی سرد مہری اور بے اعتنائی کا دل شکن بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بیان دراصل خلیل الرحمن اعظمی کے اخلاق اور انسان دوستی کے احساس کو واضح کرتا ہے اور اس احساس کے پس منظر میں ان کا ایک شخصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جس میں ان کی علمیت ان کی تنقیدی بصیرت ان کے نظریات، ان کے مختلف مضامین سے متعلق مباحث وغیرہ سبھی اس طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ خلیل صاحب کا ظاہر و باطن قاری پر عیاں ہو جاتا ہے

خلیل الرحمن اعظمی کے اس خاکے کی طرح اگلا خاکہ باقر مہدی کی شخصیت کا ایک بھرپور مطالعہ پیش کرتا ہے جس کے پس منظر میں ترقی پسند تحریک اور ان سے وابستہ کئی دیگر افراد کے مرقعے بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ویسے اس خاکے میں جا بجا خلیل الرحمن اعظمی کی شخصیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ جسے اس خاکے کی کمزوری قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر ہے۔ ویسے مجموعی اعتبار سے یہ خاکہ نہایت ہی بھرپور اور مکمل ہے۔

اسی طرح کلام حیدری کا خاکہ بھی فنی اعتبار سے ایک بھرپور خاکہ ہے جس کی روشنی میں کلام حیدری کی مختلف الجہت شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے چلی آتی ہے۔ کلام حیدری جو بیک وقت ایک صحافی، ادیب، صنعت کار اور سیاسی وسماجی کارکن ہیں۔ زندگی کی ان مختلف النوع جہتوں کے درمیان ان کی انسانیت، ان کا اخلاق، ان کا نظم وضبط، ان کی اردو نوازی اور ادب دوستی ممتاز ہے اور یہ ساری باتیں اس خاکے میں پوری طرح ابھرتی ہیں۔

راہی معصوم رضا کا خاکہ بھی ان کی شخصیت کو سمجھنے میں پوری معاونت کرتا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات ان کے پڑھنے کا انداز، ان کا دلکش ترنم اور ان کی پرکشش شخصیت سب کچھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح وہ نظریاتی اختلاف کے باعث ایک بار کسی اہم الیکشن میں اپنے والد کا ساتھ نہ دیکر مخالف امیدوار کی حمایت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی معصوم ہیں جو اردو زبان کے وجود سے انکار کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے اس موقف سے اختلاف رکھنے کے باوجود مشفق صاحب نے نہایت ہی غیر جانبداری کے ساتھ ان کی شخصیت کی عکاسی کی ہے۔

اس طرح سے آر کے گرگ، اقبال مجید اور مظہر امام کی شخصیت کے جو مرقعے پیش کئے گئے ہیں وہ اپنے آپ میں جامع اور بھرپور ہیں اور ان سے ان لوگوں کی زندگی کے مختلف گوشے عیاں ہو کر قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔

ایک خاص بات جو ان تمام خاکوں کو پڑھنے کے بعد سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان کے بین السطور میں مصنف کا بھی ایک مکمل اور بھرپور عکس ابھرتا ہے اور ان کی شخصیت و زندگی کے مختلف گوشوں سے قاری کو واقفیت ہوتی چلی جاتی ہے۔ اعظم گڈھ، الہ آباد اور علی گڈھ میں اقلیمی سفر جاری رکھتے ہوئے ۱۹۶۵ء میں وہ کس طرح مگدھ یونیورسٹی میں فیلوشپ اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہیں کے کالج میں لکچرر رہنے کے بعد کس طرح آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور وہاں سے پھر واپس اسی کالج میں آتے ہیں جہاں پہلے تھے۔ یہ ساری باتیں ہمیں ان مختلف خاکوں کو پڑھنے کے دوران معلوم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس دوران زندگی کے مختلف موڑ پر انہیں جن مراحل سے گذرنا پڑا، جو دوست واحباب ملے، جو مشغولیات رہیں سب کچھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح پوری کتاب پر مصنف کی شخصیت چھائی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ان خاکوں کا انداز بیان بھی مختلف ہے جس میں تاثراتی اسلوب کے بجائے بیانیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ فنی نقطہ نظر سے ناقدان فن کی نگاہ میں یہ باتیں عیب گنی جائیں اور اصطلاحی نقطہ نظر سے ان میں سے بعض خاکے فنی تعریف کی کسوٹی پر پورے نہ اتریں لیکن اس سلسلے میں مصنف کا درج ذیل بیان کافی ہے۔

> "میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یادوں کی خلش ہائے پنہاں کے طفیل تاثرات اور واقعات کے بیان سے میں نے بعض شخصیتوں کی تصویر کشی کی ہے۔ آپ اسے کوئی نام بھی دے دیجئے۔"

بہر حال، قمر نظامی کی کتابت اور ہند لیتھو پریس کی طباعت نے اسے دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت اٹھارہ روپے ہے جو آج کل کی مناسبت سے کچھ زیادہ نہیں، جہاں ۱۰۰ صفحے کی کتاب ۲۵، ۳۰ روپے میں آتی ہے۔

★

عبدالقیوم ابدالی

شاعر کا نثری نظم اور آزاد غزل نمبر
ایک جائزہ

شاعر کی اپنی ایک روایت رہی ہے۔ اعجاز صاحب کی موت کے بعد بھی اس روایت کو زندہ رکھنے کی جو
کوشش ان کے بیٹوں نے کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ پھر بھی اس بات کا احساس تو ہوتا ہی ہے کہ وہ معیار و وقار جو
اعجاز صاحب نے بخشا تھا وہ قائم نہیں رہ سکا۔ موجودہ شمارے میں شامل ناموں کی طویل فہرست جہاں ان کے وسیع حلقہ کی
یاد دلاتی ہے۔ وہیں پگھلا نیلم (سجاد ظہیر) کے دیباچے نثری نظموں پر خلیل الرحمٰن اعظمی سے گفتگو (مطبوعہ شب خون)
سجاد ظہیر، خورشید الاسلام کی نظموں کی عدم شمولیت ان کی دقت نظری اور انتھک جانفشانی کی یاد دلاتی ہے۔
اداریہ میں نثری نظموں اور آزاد غزلوں کو متنازعہ ہیئتی تجربے کہا گیا ہے۔ میرے خیال میں نثری نظمیں اور آزاد غزلیں
ایک ہی لاٹھی سے ہانکا نہیں جا سکتا اور جہاں تک نثری نظموں کا تعلق [illegible] ہے صرف ایک ہیئتی تجربہ کہہ کر ٹالا جا
سکتا نہیں۔ سجاد ظہیر نے جنہوں نے پہلی بار اپنے مجموعہ "پگھلا نیلم" میں نثری نظموں کو یہ کہہ کر شائع کروایا کہ یہ شاعری ہے
اپنے دیباچے میں اس بات پر اعتراض کیا تھا کہ ان کے چند دوست ان کی ان تخلیقات کو ہیئتی تجربہ کہتے ہیں
جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کوئی فن کار محض تجربے کے لئے یا اپنی بوالعجبی کو ثابت کرنے کے لئے کسی ادبی صنف کو ترک
نہیں کرتا یا ہیئتوں کی تبدیلی کا جوکھم نہیں مول لیتا۔ بلکہ اس کا تخلیقی اظہار جب بار بار اس کا دامن پکڑنے لگتا ہے
وہ مجبوراً نئے اصناف یا نئی ہیئتوں میں اپنی بات کہتا ہے۔ اسے نہ تو یہ سوچنے کی فرصت ہوتی ہے کہ اس صنف یا
ہیئت کا مستقبل کیا ہوگا اور نہ ہی وہ کسی ناقد کا انتظار کر پاتا ہے کہ وہ اس صنف کے لئے کچھ آداب مقرر کرے یا
اس کی تربیت یا تیاری کرائے۔
دوسری بات یہ کہ کسی صنف یا ہیئت کا چلن عام ہونا یا ترک کیا جانا کوئی حادثاتی واقعہ نہیں ہوتا بلکہ جب
حالات بدلتے ہیں، نئے مسائل، نئے نظریات و خیالات شاعر کو کچھ نیا کہنے پر مجبور کرتے ہیں تو صرف موضوع و مواد یا
طرز بیان میں ہی تبدیلی نہیں آتی بلکہ ہیئتوں اور اصناف میں بھی تبدیلیاں راہ پانے لگتی ہیں۔ کسی نئی صنف یا ہیئت کے
استعمال میں آنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے کی تمام ہیئتیں یا اصناف [illegible] مردہ قرار دی گئیں [illegible]

فنکار پرانی ہیئتوں یا اصناف میں ہی تخلیق کرتے رہتے ہیں اور اس نئی صنف یا ہیئت کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ کچھ لوگ ان کا خیر مقدم تو کرتے ہیں لیکن انہیں اظہار خیال کا وسیلہ نہیں بناتے اور کچھ لوگ مکمل طور پر اسی صنف یا ہیئت کو استعمال کرنے لگتے ہیں۔ رد و قبول کے اسی دائرے میں گردش کرتے کرتے بہت سی ہیئتوں یا اصناف کا چلن خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں جب ہم 'نثری نظموں' اور 'آزاد غزلوں' کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ 'نثری نظم' نظم کی ایک آزاد ہیئت ہے اور دوسری اصناف شاعری کی طرح موجودہ زمانہ کی شعری تقاضوں سے قریب تر ہے جبکہ 'آزاد غزل' نظم کی ایک صنف یا ہیئت 'غزل' میں تبدیلی کی کوشش ہے اور پابندیوں سے انحراف کے دعویٰ کے باوجود پابند ہے اور اسی طرح دور حاضر کے شعری تقاضوں کی تکمیل کا ضامن نہیں بلکہ چند لوگوں کی خواہشِ شہرت کا متقاضی ہے۔

دوسری بات یہ کہ نثری نظموں نے جہاں فن کار اور اس کے قاری کے رشتہ کو مضبوط کیا ہے اور ان کے درمیان سے تکلفات کے پردے ہٹا دیئے ہیں وہیں آزاد غزلوں نے اپنے پڑھنے والوں کو مشکوک کیا ہے کہ آزاد غزلوں کا شاعر غزلوں کی تمام تر پابندیوں کو برتتے ہوئے صرف مصرعوں کو چھوٹا بڑا کیوں کر رہا ہے؟

نثری نظموں کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ڈھانچہ زمانہ حال کی اردو شاعری کے ہیئتی تقاضوں سے بہت قریب ہے اس لئے ہمارے بہت سارے شاعروں نے اسے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور اس میں اچھی شاعری بھی کر رہے ہیں۔ سجاد ظہیر سے شہریار تک نثری نظموں کے تمام شاعروں نے اس بات کا ذکر بار بار کیا ہے کہ انہوں نے مجبوراً اوزان و ارکان کے مروجہ طریقوں کو ارادتاً ترک نہیں کیا بلکہ اپنے شعری مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہیں ایک نئے آہنگ اور ہر نئے ترنم کی ضرورت تھی جو نثری نظموں کی ہیئت میں میسر آسکی ہے۔ یا پھر اپنے تجربوں کو الفاظ کے پیکر میں منتقل کرنے کی صورت میں کچھ زیادہ یا کچھ کم کہنے کی مجبوری انہیں جس کرب یا اذیت ناک صورت حال میں مبتلا کرتی رہی تھی نثری نظموں میں انہیں اس سے نجات مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب آزاد غزلوں کے شاعروں سے اس کا جواز آپ دریافت کرتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ "جو جواز" آزاد نظموں کا ہے (یہ جواب مظہر امام صاحب نے مجھے بھی دیا تھا) آزاد غزلوں کے ایک اور شاعر پرویز رحمانی سے جب میں نے یہ دریافت کیا کہ کیا وہ 'آزاد غزل' کی اصطلاح سے مطمئن ہیں تو انھوں نے جواب دیا جی نہیں میں اپنی اس نوع کی تخلیقات کو 'گیتل' کہتا ہوں۔ مطلب تھا گیتوں اور غزلوں کے امتزاج سے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ ہر گائی جانے والی چیز "گیت" نہیں ہوتی اور غزلوں کے طور کے ارکان میں کمی بیشی کر کے گیت کی تخلیق نہیں کی جا سکتی میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غزلوں کی ہیئت میں اس نوع کی تبدیلیاں فن کار کی مجبوری نہیں بلکہ شعوری کوشش ہے جو ادب کے لئے مضر ہوتی ہے۔

چار سو صفحات کے اس ضخیم نمبر میں نثری نظموں اور آزاد غزلوں کی حمایت اور مخالفت میں درجنوں مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین شامل ہیں۔ ان تمام مضامین کا تفصیلی جائزہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی سود مند۔ نثری نظموں پر تین مضامین کا ذکر میں خصوصیت سے کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر محمد حسن کا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تسلیم شدہ ترقی پسند ہیں اور نثری شاعری بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ "جو منطقی ربط اور فکر و استدلال کے بجائے حسیات، تخیئل اور جذبے سے مخاطب ہو اور ان صلاحیتوں کو بیدار کر کے پڑھنے والوں کو نیاپن دیدے وہی شاعری ہے۔ (۲) شاعر سخت خطرے مول لے کر پرانی بیسا کھیوں سے اپنے کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ اس کا دعویٰ صرف اتنا ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لئے جو کچھ ہے اس میں خود اپنی توانائی کشش اور کیفیت ہے کہ وہ دوسرے سہاروں کے بغیر بھی شاعری کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اس نے پہلے قافیئے کے سہارے سے خود کو آزاد کیا کچھ غزل کی محدود علامتوں کی قید سے باہر قدم نکالا پھر بحر کے متعینہ ارکان کی تقسیم و ترتیب میں پھیر بدل کیا۔ یعنی آزاد نظم کو اپنایا اور اب ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتا ہے اور خود کو نثر کی نحوی ترتیب سے قریب تر کر کے شاعری کے لازمی خلل DISTORTION کو ختم کرنا چاہتا ہے (۳) نثری شاعری صرف بحروں کو رد کرنے کا نام نہیں ہے نہ وہ محض نثری ترتیب کی بازیافت کا نام ہے۔ اس کی کامیابی ان دونوں شرائط کو پورا کرنے کے بعد اپنی شعری و جمالیاتی استناد کو ثابت کرنے میں مضمر ہے۔

ان اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک نثری نظموں کے لئے بس تین شرطیں ہیں۔ اول وہ بنیادی طور پر شاعری ہو یعنی وہ فکر و استدلال کے بجائے حسیات، تخیئل اور جذبے سے مخاطب ہو اور ان صلاحیتوں کو بیدار کر کے پڑھنے والوں کو نیاپن دیدے دوم اس میں بحروں کو رد کر دیا گیا ہو۔ اور نثر کی نحوی ترتیب کی بازیافت ہوئی ہو۔ سوم وہ اپنی شعری اور جمالیاتی استناد کو ثابت کرے۔

ڈاکٹر محمد حسن کے برعکس وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ تاحال اردو میں نثری نظم کے نام پر لکھی گئی تحریروں میں گہرائی اور وسعت اور زبان کو تخلیقی انداز میں برتنے کا وہ انداز نظر نہیں آیا جو مثلاً نطشے، خلیل جبران اور ہرمن ہیسں کی تحریروں میں عام طور سے نظر آتا ہے۔ اس لئے نثری نظم ہمارے ادب میں ایک صنف کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکی ہے.... اور ان کے آئندہ قیام کے امکانات بظاہر روشن نہیں ہیں۔ اس کے باوجود یہ دونوں حضرات نثری نظموں کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ اس کا خیر مقدم کرنا اور اس تجربے میں مصروف لوگوں کو تعمیری مشورے دینا ان کی تربیت اور تیاری کرانا اپنا فرض اور داخلی ضرورت سمجھتے ہیں۔ جہاں تک آغا صاحب کا معاملہ ہے مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے کن شاعروں کو پڑھا ہے جن کے یہاں ان کو گہرائی، وسعت اور زبان کو تخلیقی انداز میں برتنے کا انداز نظر نہیں آیا۔ دوسری بات یہ کہ میں نے جیسا کہ اوپر عرض کیا ہمارے یہاں یا دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی صنف یا ہیئت کا استعمال کیا جانا یا ترک کیا جانا محض تجربہ کی بات نہیں ہوتی اور نہ ہی محض دوسروں کی پیروی۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے مختلف زبانوں میں بھی آزاد معریٰ اور نثری شاعری کے نمونے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ خود ہمارے یہاں جو آزاد نظمیں لکھی گئی ہیں انہیں آپ سیدھے سیدھے کسی مغربی زبان کی شاعری کا چربہ نہیں کہہ سکتے۔ ہم نے پابند نظموں میں صرف اتنی ہی تبدیلیاں کی جتنی ہمیں ضرورت تھی اور اس کے لئے نہ تو ہمیں کسی تعمیری مشورے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی طرح کی تربیت یا تیاری کی۔ ان دونوں حضرات کو یہ بھی شکایت ہے کہ نثر کی اس نئی جہت کو شاعری کے تابع کر کے اس کی انفرادیت اور امیج کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرا کہنا صرف یہ ہے کہ فی زمانہ نثر اور نظم کی حدیں جا ہے ایک دوسرے میں مدغم ہی کیوں نہ ہو جائیں ان کی شناخت انھیں بنیادوں پر ممکن ہے جہاں یہ ایک دوسرے

ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے سچ ہی لکھا ہے۔ "شاعری اور نثر میں الفاظ کے استعمال کے جداگانہ طریقے مشرقی اور مغربی ادب میں [illegible] ہیں۔ تخیلاتی اور جذباتی نثر اور شاعری میں لفظ احساس و تخیل کی گرفت میں ہوتا ہے جبکہ منطقی اور افادی نثر میں وہ منطق اور افادیت کے زیر اثر ہوتا ہے۔ نثری نظم میں لفظ کا استعمال نہ تو ساختہ جذباتیت کا متحمل ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے جذباتیت کی قلعی کھل جاتی ہے اور نہ ہی یہ منطقی اور افادی نثر کی منطقیت کو قبولتی ہے کہ اس سے اس کے جواب مضمون ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور ہمارے یہاں جو نثری نظمیں لکھی جا رہی ہیں ان میں نظموں کی تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ اسلئے انہیں نظمیں ہی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر عنوان چشتی، ابن فرید، ابوالفیض سحر، شمیم۔ کاف نظام، نجمہ شہریار، احمد کمال پروازی، طارق زیدی کے مضامین بھی شامل ہیں۔ نجمہ شہریار کے مضمون سے شدید اپنے پن کا احساس کہیں جاگزیں ہوا جاتا ہے۔ باقر مہدی، شاہد شیدائی، ساجدہ زیدی، اور ابوالفیض سحر سے نثار احمد صدیقی کے ذریعہ کیا ہوا ایک انٹرویو بھی اس میں شامل ہے جو انٹرویو سے زیادہ تحریری جواب لگتا ہے۔ ان میں باقر مہدی نے بڑے ہی پر اثر انداز میں نثری نظموں کی حمایت کی ہے۔

فاضل مدیران نے نثری نظموں کا جو انتخاب شامل کیا ہے وہ شاید فاروقی صاحب کو قائل کرنے کی نیت سے کیا گیا ہے کہ بہ قول فاروقی صاحب "جب کسی صنف یا ہیئت کو خراب یا کم زور یا نو آمدہ فن کار بھی اختیار کر لیں اور کئی نسلوں تک ایسا ہی ہوتا رہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب یہ صنف یا ہیئت قائم ہو گئی" بہر حال زبیر رضوی کی نظمیں رگوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ فصیح اکمل، بلراج کومل، ڈاکٹر محمد حسن، شہریار، صادق، نجمہ شہریار، فیاض رفعت وغیرہ کی نظمیں بھی اچھی ہیں۔ مجھے اس موقع پر جمیل مظہری کی ایک نظم کی یاد آ رہی ہے جس کا عنوان بھی شاید نثری نظم تھا اور وہ شب خون میں شائع ہوئی تھی۔ اسے بھی شامل کرنا تھا۔

آزاد غزلوں۔ پر مظہر امام صاحب کے مضمون کا ذکر سب سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ مظہر امام ہی آزاد غزلوں کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی پہلی آزاد غزل کے متعلق فرماتے ہیں۔" دو تین سال تک مجھ پر ایسی کیفیت طاری رہی کہ غزلیہ شاعری سے بھی بدمزگی پیدا ہونے لگی۔ میں خود شعر کہنے لگا تھا اور اگرچہ ابتدا غزل گوئی سے کی تھی لیکن رجحان نظم نگاری کی طرف تھا۔ شروع میں باقاعدہ پابند نظمیں لکھیں اور فن عروض سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کے رسائل میں راشد، میراجی، حسیب الرحمٰن، مختار صدیقی وغیرہ کی آزاد نظمیں پڑھنے کے بعد مجھے پابند شاعری کے بالمقابل آزاد شاعری میں زیادہ تازگی اور کشش محسوس ہوئی۔ ۱۹۴۴ء کے اواخر میں خود میں نے پہلی دفعہ آزاد نظم لکھنے کی کوشش کی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اس وقت تک مخدوم محی الدین کے علاوہ کسی ترقی پسند نظم نگار نے آزاد شاعری شروع نہیں کی تھی۔ میں نے آزاد شاعری کا فنی اور عروضی نقطہ نظر سے بھی مطالعہ کیا۔ اس وقت تک آزاد نظموں میں عموماً ارکان کی کمی بیشی ہی روا رکھی جاتی تھی۔ ارکان کو توڑنے کا سلسلہ کچھ عرصہ بعد شروع ہوا۔ کہیں کہیں قافیوں کا آجانا عیب نہیں بلکہ حسن سمجھا جاتا تھا۔ 'ماورا' کی بہت سی آزاد نظموں میں ہم قافیہ لائنیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ انھیں ہم قافیہ مصرعوں" کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ اس طرح تو آزاد غزل بھی لکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا میں نے ۱۹۴۵ء کے اوائل میں آزاد غزل کا تجربہ کیا۔

مذکورہ اقتباس سے میری اس بات کو مزید تقویت ملتی ہے کہ 'آزاد غزل' فن کار کی مجبوری یا ضرورت نہیں بلکہ شعوری کوشش ہے۔ اب تک آزاد نظم یا نثری نظم کے کسی شاعر نے یہ دلیل نہیں پیش کی کہ فلاں صنف کو دیکھ کر اس کے دل میں یہ

خیال آیا کہ آزاد نظم یا نثری نظم بھی لکھی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ہئیتیں جو خالصتاً مغربی ادب کے اثرات سے ہمارے یہاں مستعمل ہوئیں۔ ان کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اس نوع کی مغربی نظموں کو دیکھ کر ان کو خیال آیا کہ اردو میں بھی ایسی نظمیں لکھی جا سکتی ہیں۔ چہ جائے کہ کسی شاعر سے یہ کہا جائے کہ آپ فلاں ہئیت میں شاعری کیجئے اور پھر وہ شاعر آپ کی تحریک پر آزاد غزل لکھے بھائی جان! تحریکیں ذہن بنا سکتی ہیں تخلیق نہیں کروا سکتیں۔ چاہے وہ کرامت علی کی کرامت ہوں یا مظہر امام۔ مظہر امام صاحب نے آزاد غزلوں کے معترضین کو خوب خوب گھرکیاں دی ہیں۔ آنکھیں دکھائی ہیں کہ آخر وہ اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟ کرامت علی کرامت، سید مبارک حسین، سید حامد حسین نے آزاد غزلوں کی حمایت میں تماشے کئے ہیں لیکن اپنی تمام تر کرتب بازیوں کے باوجود اپنے ہی اعتراضات کا جواب دینے سے قاصر رہے ہیں۔ عزیز اندوری اور ذکار الدین شایاں کے مضامین بھی اس نمبر میں شامل ہیں جو پڑھے جا سکتے ہیں۔ مضامین تو اور بہت سے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نوع کی شاعری آپ کرنے پر بضد ہیں تو کیجئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی آپ کا کیا بگاڑے گا۔ لیکن ہم اسے آزاد غزل کم از کم نہیں مانیں گے۔ زیادہ سے زیادہ شاعری یا نظم کی ایک اور صنف یا ہئیت کہہ کر قبول کر سکتے ہیں۔ آزاد غزلوں میں فیض کا ایک فلمی گیت بھی شامل ہے۔ جسے آزاد غزل کے ہم نوا آزاد غزل کہنے پر مصر ہیں اور خود فیض جسے نظم کہتے ہیں۔

بہرحال اس نمبر کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی ہر ممکن کوشش مدیران نے کی ہے۔ طباعت و کتابت کاغذ بدرجہ بہتر ہیں۔ قیمت مناسب ہے۔ ادب کے طالب علموں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری اور کارآمد ثابت ہوگا۔

★

انسان اور زمین

" وہ کیا ہے؟"

" انسان کا زمین کے ساتھ ازلی رشتہ ہے۔ عہد سے ہر ایک انسان زمین کے رشتے سے منسلک ہے۔ انسان کا جسم اسی مٹی میں مل جاتا ہے جس کی خمیر سے وہ وجود میں آتا ہے۔" ساجد نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے باوجود انسان مال و دولت، حرص و ہوس، قتل و غارت گری سے باز نہیں آتا حالانکہ اس دنیا میں انسان کو دو گز کفن اور چھ فیٹ زمین ملتی ہے اور یہی زمین اس کی آخری آرام گاہ ہے۔"

دوران گفتگو بچے کے منہ سے نپل نکل گیا اور وہ رونے لگا۔ ساجد بچے کو ہاتھوں اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اس میں اسے اپنے بھائی کی شباہت نظر آئی۔ وہ بچے کو اپنے گلے سے لگا کر زار و قطار رونے لگا۔

★

طاہر نقوی (پاکستان)

اندر کا اندھیرا

میں ادراک کی سرحدوں سے لڑھکتا ہوا زمین پر گرنے کے بعد ایسا خواب دیکھنے لگا ہوں جو تھکے ہوئے مسافر کو اس وقت نظر آتا ہے جب وہ کسی درخت کے سائے میں سستانے لیٹ جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا باہر جانے سے پہلے میں آئینے کے سامنے کھڑا تھا کہ اچانک میرا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا، آئینے میں ایک خوفناک منظر میرے سامنے تھا ـــــ ایک آدمی ایک نوجوان لڑکی کا گلا اپنے دونوں ہاتھوں سے گھونٹ رہا تھا۔ اُس آدمی کی پشت آئینے کی جانب تھی، اس لئے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ منظر ایسا صاف تھا کہ میں اسے اپنا واہمہ قرار نہیں دے سکا۔ میں نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا۔ مگر وہاں دیوار کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا دوبارہ آئینے کی طرف مڑا اور میری حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا کیونکہ اب آئینے میں محض اس دیوار کا عکس نظر آرہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں، میں قطعی طور پر ہوش و حواس میں تھا۔ کبھی کوئی لمحہ زیست بن جاتا ہے اور کبھی پوری زیست لمحے میں گم ہوجاتی ہے۔

گھر سے نکلتے وقت اپنی آنکھوں میں لرزتے منظر کی دھول جھونک کر میں اپنے طور سے پوری طرح مطمئن ہوگیا۔ میں جب وہاں پہنچا جہاں خوشبوئیں بال کھولے بے چین بے چین گھوم رہی تھیں۔ اور اجنبی ساعتیں لذتِ آشنائی سے بھیگی ہوئی راحتوں سے آپس میں گلے مل رہی تھیں تو ایسے میں گزرے ہوئے لمحے میری یادداشت کے پس پشت چلے گئے اور میرے ذہن کا سارا بھاری پن جاتا رہا۔ وہاں مجھے وہ نظر آئی جسے دیکھ کر مجھے اچانک وہی منظر یاد آگیا اور میں حیرتوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ واقعی آئینے میں اُس وقت وہی تھی۔ میرے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں چھانے لگیں، اس کے ساتھ ہی اُس کے منگیتر کو دیکھ کر آئینے کے منظر والے شخص کا خیال آگیا اور میں اپنی سوچ کی لہروں سے ابھرتے ہوئے اعتماد کے ساتھ ساتھ بہہ نکلا۔ میں نے شاید مستقبل کے کسی منظر کی چاپ سن لی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اسے سارے معاملے سے آگاہ کردوں تو کہیں اسے یہ گمان نہ ہو جائے کہ میں اس کے منگیتر کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ وہ میرے دل کی جھیل میں چاند بن کر بہت پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی اسی لمحے میں خوابوں کے روزن سے اپنا گم گشتہ گھر ڈھونڈنے لگا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور اس کے در

کی خاموشیوں کو میں نے دستک نذر کی تو وہ زوردار قہقہے لگانے لگی اور مجھے وہمی قرار دینے لگی۔ البتہ میرے یقین دلانے اور میری گہری سنجیدگی کی وجہ سے چُپ ہو گئی اور پھر اس نے بظاہر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا شاید وہ اپنے ذہن کے سمندر میں غوطے کھانے لگی تھی اپنی خوش اندیشیوں کے ہجوم میں اس کی اس حالت کو بھانپتے ہوئے میں نے اُسے مشورہ دیا کہ آنے والے وقت میں میرے اس مشاہدے کا خاص خیال رکھے۔

چند روز بعد میں نے سُنا کہ اس نے وہاں شادی سے انکار کر دیا، یہ سن کر مجھے عجیب سی تسلی ہوئی اور پھر یہ سُن کر کہ اس کا منگیتر ملک سے باہر چلا گیا ہے تو میرے اندر اس پھانس کی چبھن اب نہ رہی جو اس سے قبل ہر لمحے میرے دل میں رہتی تھی۔ مجھے اُس شخص پر رحم بھی آیا۔ لرزتا ہوا زمین کے بھنور میں اتر کر کہیں کھو گیا۔ میں اپنے آپ کو اب مجرم سمجھنے لگا مگر ساتھ ہی مطمئن بھی تھا کہ آنے والے حادثے سے بچنے کے لئے یہی ہونا چاہیئے تھا۔ اب میں اس کا سامنا کرنے سے شعوری ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگا۔ مجھے یہی اندیشہ تھا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں نے دھوکا دے کر اپنا راستہ صاف کیا ہے لیکن میں ایسے میں اسے تنہا چھوڑنے کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک روز اپنی تنہائی میں اُس سے کچھ کہنا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔ میں نے تنکا بن کر اسے سہارا دیا تو اس نے اُسے قبول کر لیا۔ اس وقت میں نے سرد موسم میں ٹھٹھرتے ہوئے راحت محسوس کی اور خود کو اپنے سائے کی دلپذیر لذت آشنائی میں کھویا ہوا اجنبی پایا اور اس کے ساتھ ان گنت پلوں کے سسکتے ہوئے سانس میرے اپنے وجود کو دکھانے لگے۔

جب میں اپنے محفوظ بستر پر ہوتا تو حامل دیواریں خوف کے بیج چنتیں اور مجھے اپنا گھر مکڑی کے جالے پر اوندھا لٹکا ہوا لگتا۔ انسان کے ذہن سے خیالوں کا بھوت اترتا ہے تو ماحول کو ناسازگار پا کر وہ زندگی سے فرار چاہتا ہے۔ میں فطری طور پر ہمیشہ سے شکّی اور حاسد ہوں، اس کا سبب شاید یہ ہو کہ ہر انسان مجبوری کی زنجیروں میں جکڑا ہے۔ وہ کسی سے ہنستی بولتی تو میرا خون گرم ہونے لگتا اور میرے چہرے سے بھی ایسے ہی تاثرات عیاں ہونے لگتے۔ ایسی بات وہ ہمیشہ ہنسی میں اُڑا دیتی اور اسے اندازہ ہو جاتا کہ ایسے موقعے پر میں اس کے بارے میں کیا کیا سوچنے لگتا ہوں۔ مجھے یہ بھی برابر احساس ہوتا اُس کا یہ خفیف خدشے میری زندگی تلخ بنا دیں گے۔ میرے اندر تپتا صحرا نمودار ہونے لگا جس کا ریت میری رگوں میں بکھر کر رہ گیا۔ میری آنکھیں بے در گھروں سے نکلنے کی خواہش میں نیم جان ہو جاتیں اور آنسو بہنے سے پہلے ہی آنکھوں سے بدگمان ہونے لگتے۔ اس ردعمل کے طور پر میں چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگتا، بدمزاجی کرتا اسے طعنے دیتا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں سوچ کا غم دیکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں صدیوں کے اندھیرے تیرتے رہتے۔ اس کے بعد مجھے لوگوں سے مِل کر دکھ ملنے لگا۔ اور ہمارے درمیان فاصلہ سمٹنے کی بجائے بڑھتا ہی رہا۔ چنانچہ میں لاشعوری طور پر غمگین اور اداس رہنے لگا اور ایک سرد لہر ہر لمحے میرے وجود میں نیچے سے اوپر لہراتی ہوئی اپنے ساتھ غبار کو لیے اٹھتی جیسے میرے اندر کے اعضا اس کے ساتھ حلق کے راستے باہر نکل آئیں گے سراب انا میں بھٹکتے مسافر کی طویل تنہائیاں میرے اداس دل کی اُجاڑ پنہائیوں سے

شعیب شمس

نیا اشوک

گلیوں میں کتے بھونک رہے ہیں — عجیب ڈراؤنی سی آوازیں — چتکبرے، کالے، بھورے کتے مسلسل بھونکے جارہے ہیں۔ شاید سارے شہر میں چور گھس آئے ہیں — کتوں کی چیخیں نحوست کی علامت ہیں۔ یقیناً کوئی طوفان آنے والا ہے — بھیانک طوفان — ممکن ہے اس طوفان کی زد میں سارا قومی اثاثہ ہی آجائے۔ پچھلے سمندری طوفان نے تو کچھ دنوں بعد سنبھلنے کا موقعہ دیدیا تھا — لیکن یہ کیسا طوفان آخر آنے والا ہے جو رات کی چیخیں رفتہ رفتہ بھیانک ہوتی جا رہی ہیں۔ لمحے جیسے جیسے سرکتے جارہے ہیں اسی تیزی سے کتوں کا بھونکنا بھی بڑھتا جارہا ہے۔

ایسی ہی بھیانک رات آج سے صدیوں قبل بھی آئی تھی جب پاٹلی پتر کی پوتر دھرتی پر اشوک نے راج سنگھاسن سنبھالا تھا۔ تخت شاہی کچھ اس زور سے ڈول گیا تھا کہ دھرتی کی آوازیں بھی دب سی گئی تھیں۔ چرچراہٹ کی ایک ہلکی سی آواز ابھری تھی جیسے دھرتی کی چھاتی کسی نے زوروں سے دبا دی ہو — اور ننانوے بھائیوں کے قتل کے بعد اشوک سمراٹ اشوک بن گیا تھا — اگم کنواں کا پاک اور پوتر پانی سرخ ہوکر چوٹ کھائے ہوئے شیر کی طرح چنگھاڑنے لگا تھا —

راج تلک کی چمک بڑھ گئی تھی۔

"تم کون ہو؟ — سورج ڈوبتے ہی اس کنویں پر آکر بیٹھنے سے تمہیں کون سی خوشی ملتی ہے؟"

"میں سمراٹ اشوک کا بھائی ہوں۔ گئی رات تک اس انتظار میں رہتا ہوں کہ میرے بھائیوں کا لہو مجھے اپنی داستان سنائے گا — لیکن ...؟ بھائیوں کا خون شاید سفید ہو چکا ہے۔ جب ہی تو میرے دیس کی سیتائیں اس کنواں کی پوجا کرتی ہیں، پھول چڑھاتی ہیں، آرتی اتارتی ہیں — آج تک میں یہ نہ سمجھ پایا کہ یہ سیتائیں اپنے بھائیوں کا سوگ مناتی ہیں یا سمراٹ اشوک کی وجئے کی آرتی اتارتی ہیں۔ تمہیں کچھ واقفیت ہو تو بتاؤ۔"

رات کا سناٹا خاموش ہی رہتا ہے۔ رات کی زبان کھل جائے تو تہذیب کا جنازہ نکلنے میں وقت ہی کیا لگے گا۔

میں وہی احمد حسین ہوں جسے رات کی بھیانک

چیخوں نے مختلف شہروں میں اپنا رخ بنایا تھا۔ ایسی ہی چیختی اور چنگھاڑتی ہوئی رات کو جب چتکبرے، سیاہ اور بھورے رنگ کے کتے گلیوں، کوچوں اور شاہراہوں پر بھونک رہے تھے اور اپنے نوکیلے دانتوں سے ساری تہذیب کو نوچتے پھر رہے تھے ۔۔ کتوں کی یہ چیخیں نحوست کی علامت ہیں ۔۔

"یا اللہ رحم ۔۔" میری بوڑھی ماں کی بوڑھی اور کپکپاتی ہوئی آواز سناٹوں کو چیر گئی تھی ۔۔ ایسی ہی ایک رات کو جب کتے بھونک رہے تھے، سمندری طوفان آیا تھا ۔۔ ہم بے گھر ہو گئے تھے اور میری ماں بیوہ ۔۔ اس کی مانگ کا سیندور وقت کے نیلے سمندر میں جذب ہو چکا تھا۔

میں بھی ڈرا ڈرا اور سہما سہما سا رات کی چیخیں سن رہا تھا ۔۔ چتکبرے، کالے اور بھورے کتوں نے یکایک اپنا رنگ تبدیل کر لیا تھا ۔۔ کبھی سبز ۔۔ کبھی سرخ ۔۔ اور کبھی گیروا رنگ ۔۔ کتوں کی زبانیں حلق سے باہر آ گئی تھیں۔ زبانوں کے آخری سرے سے انسانی خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

لکڑی کے کمزور دروازوں پر کتوں کے پنجے کھڑ کھڑا رہے ہیں ۔۔ کیا دروازہ ٹوٹ جائے گا؟ ۔۔ اور کمزور سا دروازہ معمولی سی کوششوں سے ٹوٹ کر گر پڑا ۔

گہرے سبز رنگ کے کتوں نے حملہ کر دیا تھا ۔ گلیوں، کوچوں، شاہراہوں اور مکانوں سے سمراٹ اشوک کے بھائیوں کی دردناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں ۔۔۔ سیکڑوں سال بعد تاریخ پھر دہرائی جا رہی تھی ۔۔ پاٹلی پتر کی دھرتی کی چیخیں ہر شہر میں پہنچ چکی تھی ۔

اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اگم کنواں پر پیاسا پڑا تھا ۔۔ کسی نے میرے حلق میں میرے ہی بھائیوں کا خون ٹپکا دیا ۔۔ یقیناً انسانی خون بہت ہی لذیذ ہوتا ہے ۔ جب ہی تو ہر اشوک سمراٹ بننا چاہتا ہے ۔

" لیکن میں اس بات کو نہیں مان سکتا کہ ایک بھائی اپنے بھائی کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا ۔ اپنی ماں کی کوکھ سونی کرے گا ۔ تاریخ کے اوراق جھوٹے ہیں ۔۔ من گھڑت ہیں ۔۔ انہیں جلا دو ۔۔ اسی کنویں میں دفن کر دو جس کنویں میں ننانوے بھائیوں کی لاشیں دفن ہیں ۔۔ ننانوے ہی نہیں ۔۔ ننانوے ہزار ۔۔ لاکھ ۔۔ ۔۔ کروڑ ۔۔"

رات کی خاموشی نے جب میرے بیان پر بے یقینی کا حملہ کیا تو ایک زہرخند مسکراہٹ میرے زخمی ہونٹوں پر پھیل گئی ۔ ہونٹوں کے زخموں پر کھرنڈ سی جم گئی تھی ۔ چٹر چٹر کر زخم کے سارے بند کھل گئے اور خون کے قطرے ہونٹ سے رسنے لگے ۔

" پانی "

میرے ہی بھائیوں کا لہو ایک مرتبہ پھر میرے حلق میں ٹپکا دیا گیا ۔

میں احمد حسین ہوں" ۔۔ بہار میں، علی گڑھ میں، مراد آباد میں ۔۔ میرٹھ میں ۔ فہرست بہت طویل ہے ۔

" میں دولت سنگھ ہوں" ۔۔ پنجاب میں

" میں رنجن بھٹاچاریہ ہوں" ۔۔ بنگال میں

" میں کریم ہوں ۔۔ بنگلہ دیش میں ۔۔" اور رحیم میرا قاتل ہے ۔

تمہیں اس کی خبر ہے کہ سمراٹ اشوک کے بھائیوں کا کیا نام تھا؟ ممکن ہے رام ہو، لچھمن ہو، کرشن ہو، شمبھو ہو ۔ میں احمد حسین دولت سنگھ، رنجن بھٹاچاریہ ہوں تو کیا ہوا ۔۔ میں ہوں تو اشوک کا بھائی ہی ۔ بھائیوں کا لہو بہا کر راج سنگھاسن سنبھالنا تو اسی دیس کی ریت چلی آ رہی ہے ۔ صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے اب بھی ہو رہا ہے ۔ اب تو یہ ایک تہوار کی صورت منایا جانے لگا ہے ۔۔ منایا جاتا رہے گا ۔۔

احمد رشید

"شراب"

"جانے سے پہلے تم وعدہ کرو کہ ہمارا کہا مانوگے، اسی میں تمہاری عافیت ہے" شکتی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"جی ..... ہاں" میں نے کہا

"اگر تم نے اپنی زبان کا پاس کیا تو تمہاری تخلیق، جو پاداش ہے اس بزرگ کے جرم کی، جس کی صلیب تمہارے کاندھے پر لٹکا دی گئی ہے".... شکتی نے گفتگو کا سلسلہ جاری کیا۔

"جی۔ جی اچھا" میں نے قطع کلامی کی۔

"یہ صلیب موم کی طرح سیّال تب ہی ہوگی جب تم ہمارے حکم کی شدت میں مبتلا ہو جاؤگے" شکتی نے کہا

"جی......"

"اب جاؤ تم" شکتی نے قطع کلامی کی

تب میں نے سنا، اپنے رونے کی..... اور سنانے والے خوش ہو رہے تھے..... سب سے پہلے میرے کان میں نطق نے ایک شدید "شکتی" لکھا...... یہ میری کمزوری کا سب سے پہلا اعلان تھا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا سوائے ہاتھ پاؤں پھینکنے کے، میری مجبوری میری بے زبانی تھی — اور کمتری وہ ایک غلیظ بوند، جو سرخ ہو کر میری رگوں میں سرایت کر گئی۔ مگر میں قید ہوں ایک خوبصورت قید خانہ میں" "حکم یہ کہ خوبصورتی کی کالونج سے بچو یوں کہ تمہیں سفید کرتا پہنایا گیا ہے"..... اور قید خانہ کو صرف قید خانہ خیال کرو" اور میں زندہ ہوں اس میں لیکن میں آزاد کب تھا!!؟ اس وقت!؟ جبکہ میں اندر سے "میں" نہیں تھا...... اور جب میرے بزرگ نے "میں" کو تلاش کر لیا۔ اور تم نے منع کرنے کے باوجود اس کو تلاش کر لیا جو تمہارے اور میرے درمیان فرق ہے۔"

"جی میں پشیمان ہوں"

"مجھے خدشہ ہے، کہیں تم اپنی اوقات نہ پہچان لو۔ ....ا...و....ر اگر پہچان ہی گئے ہو تو یاد رکھو تمہاری اوقات خاک"

"ہے جی"

اور پھر تم خود سوچو، تم جو میرے علاوہ سب سے افضل ہو (یہ کہنے کا مجھے ہی حق ہے)..... اور اگر تم نے اسی پر زور سے دھنک کے ساتھ قدم رکھا جس کی کہ تم اکائی ہو، تو بس سمجھ لو، تم اسفل ہو"

"جی ہاں.... میں..."

"اقبالِ جرم یقیناً تمہارے معصوم ہونے کی معلوم ہے
......جاؤ.....!"

"جی شکریہ"

جاؤ.... کہ پاداش کا صراطِ مستقیم ڈھونڈو۔"

اس طرح میرے بزرگ کو پاداش کے لئے صراطِ مستقیم پر چلنا پڑا.... وہ چلے..... اور لوٹ چلے، یہ چلنا میرے سر ڈال کر کہ میں سیدھا سیدھا بل کی طرف سانپ کی طرح لوٹوں، اس گرمی کی شدت سے بچے رہیوں کا جبکہ "آگ کا گولا سوا نیزے پر اتر آئے گا۔" اور جب میں نے دیکھا تو اس کا فاصلہ شیشے سے میری آنکھ تک دوربین کے برابر تھا۔
میں پسینہ میں شرابور تھا۔ "چہرہ" سایہ کی طرح جھلس گیا تھا میں اپنے سانسوں کی ڈور اپنے کاندھے پر بوجھ کی طرح خود لئے بھاگ رہا تھا۔ بالکل بے مقصد سا..... بے مقصد اس لئے کہ ڈور ٹوٹنے کا خوف سر پر سوار تھا۔ چونکہ الفاظ کے معنی خیز ترتیب سے میں نے یہ سُن لیا تھا کہ کشش کا عمل ڈھیلا ہونے کے سبب کبھی کبھی کوئی تارہ ٹوٹ جاتا ہے... کہیں پورا ڈھیلا ہونے کے بعد جال سر پر نہ آن پڑے!؟"

گو کہ میرے اور بزرگ کے افضل ہونے کا سلسلہ اسفل سے شروع ہوتا ہے۔ مگر اس کو قید کرنے سے پہلے قید خانہ تیار کیا گیا۔ خاکی فرش کو روکنے کے لئے میخیں لگائی گئیں اور نیلے شامیانہ کو بغیر لاگ کے ٹانگ دیا گیا....

"اور اگر تم نے میری رسی کو مضبوطی سے نہ پکڑے رکھا.... تو یہ میخیں اکھڑ جائیں گی"، کشتی نے تنبیہ کی

میرے بزرگ توانا تھے...... لیکن مجھے اپنی کمزوری پر یقین سا ہو گیا ہے...... چونکہ الفاظ بول رہے ہیں کہ میخیں ہر لمحہ کمزور ہو رہی ہیں"..... اور کہیں یہ اکھڑ گئیں!؟ ..... تو بس مائیں پیٹ پکڑے بھی بچانے نہیں دوڑیں گی بلکہ اپنا سر پکڑے بھاگیں گی.... اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں بالکل تنہا ہوں اپنے پیٹ کو لئے.... سب ہی دوڑ رہے ہیں تانبے کی سڑک پر، سورج سر پر آگیا ہے مجھے پتلی پتلی ٹانگوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ جب سے خاک، تانبہ میں تبدیل ہوئی ہے، موسموں نے نظام بدل لیا ہے۔ جاڑوں میں سخت گرمی، گرمیوں میں سخت جاڑہ اور برسات ہر موسم میں ہوتی ہے۔ اناج کی ہیئت پتھروں میں بدل گئی ہے۔ ماؤں کے پستانوں میں دودھ سوکھ گئے ہیں اور بچوں کی جگہ، سانپ ان سے چمٹ گئے ہیں۔ یوں بچوں کی پہچان باپ کے بجائے ماں بن گئی.......... اور جبکہ ہم لوٹیں گے تو "بہ غفیر میں" نہیں " پسر ابن مادر فلاں " سے پکارا جائے گا۔" لیکن وہ تخلیق جو آنکھ کھلنے پر آسمان باپ اور زمین ماں کو دیکھتی ہے..... پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی پہچان کی جستجو میں بھاگتا ہے..... بھاگ تو میں بھی رہا ہوں .... سب بھاگ رہے ہیں.... پہچان تو سبھی کی کھو گئی ہے۔ بھیڑ میں علاوہ ٹانگوں کے ــ میں اکیلا رہ گیا ہوں ــ اکیلے پن کا خوف نہ جاگنے دیتا ہے چونکہ جاگتے ہی دوڑنا پڑتا ہے اس دھواں آلود فضا میں، جس میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی سوائے...... ٹیں ٹیں..... پوں پوں...... بچو بچو...... بھاگو.... گھڑ گھڑ.... ڑ ڑ .... نہ ہی سونے دیتا ہے.... کیونکہ سنا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔!؟

" بابا..... پھل لانا..... کل میری بچی نے کہا
میں یہ کیسے کہوں۔ درخت خشک ہو گئے ــ
اور اب زمین پانی کی جگہ پٹرول اگلتی ہے.... جو پیاس بجھانے کا سبب کم.... پیاس کا سبب زیادہ بنتا ہے۔"

اور آج بچی نے کچھ بھی نہیں کہا..... شاید وہ جان گئی ہے کہ بابا الفاظ کی ترتیب کے معنی سمجھ گئے ہیں کہ ایک تیسرا نہایت خوفناک ہاتھ جلد ہی پوری دنیا کو

اپنی مٹھی میں لے کر کچلنے والا ہے۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ
پرندے اپنی چہچہاہٹ بھول گئے اور بابا معصوم مسکراہٹیں
بھول گئے اور ممی سے بغیر بات کئے سونے میں جاگنے لگے
ہیں ۔۔۔ میں سوچنے لگا جب سے میں نے "میں" کو جان
لیا ہے تو یہ "میں" اب آسیب بن کر ڈرانے لگتا ہے۔
مگر کیوں ؟ اس لئے کہ شاید کچھ ہونے والا ہے ! ؟ میں
بھاگنے لگا۔ پسینے میں شرابور۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا
ایک بھیڑ ہے اسی انتظار میں کہ کچھ ہونے والا ہے ! ؟
بھاگتے بھاگتے ایک بزرگ سے ٹکرا گیا۔

" بیٹے دیکھ کر چلو " اس بزرگ نے کہا

" اے بزرگ ..... اگر تم بھی دیکھ کر چلتے تو ..... تو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔" بیٹے دیکھ کر چلو؛

" بات سچ ہے ...... میں دیکھ رہا ہوں یہ جم غفیر وہیں لوٹ رہا ہے ۔ جہاں سے چلا ہے "

" کہاں سے چلا ہے ؟" میں نے کہا

" جہاں سے اس کی چار ٹانگوں کا سفر شروع ہوا تھا۔"

" لیکن مجھے تو دو ٹانگیں نظر آتی ہیں "

" ہاں ..... ہاں .... اس نے اپنے سر کی ٹوپی میرے سر پر رکھ دی ۔

" میں چونک گیا ...... وہ لوگ جو دو ٹانگوں پر بھاگتے نظر آرہے تھے ..... اب ان کے چہرے صاف دکھائی دے رہے ہیں ...... کہ کسی کی ٹانگوں پر کتے کا سر رکھا تھا ..... کسی بلی کا ..... کسی شیر کا ...... کسی لومڑی کا ..... کسی گیدڑ کا ..... کسی کی مگرمچھ کا .. .. اور کسی کا خنزیر کا ..... اور جب کہ میں نے اپنے سر کو دیکھا ..... تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا ... میں ڈر گیا ..... خوف سے چیخنے لگا ۔ مجھے بچاؤ کہ میں ...... میں بھی نہیں رہا ..... میری پہچان کیا ہوئی ! ؟

بزرگ انسان نے پھر اپنی ٹوپی میرے سر سے اتار دی ۔

میں نے چاروں طرف نظر گھمائی ..... وہی بھاگتی ہوئی ٹانگیں نظر آئیں ... میں نے سانس لیا اور کچھ سکون سا ہوا ۔

بزرگ نے کہا " اور پھر ایک دن یوں ہوگا کہ شیر خوار اپنے ماؤں کے سوکھے ہوئے پستان چھوڑ رہے ہوں گے " بچے کھیلوں کی ملک میں سونے سے جاگ رہے ہوں گے ۔ مرد خون اور پسینہ کھلانے کے لئے طلوع آفتاب کے انتظار میں آنکھیں بند کئے جاگ رہے ہوں گے ۔ عورتیں اپنے حمل سے فارغ ہونے کے انتظار میں کھلی آنکھوں کے ساتھ جاگ رہی ہوں گی ..... کسان کاندھے پر ہل رکھے ۔ بند آنکھیں کئے کھیتوں کو جا رہے ہوں گے ..... کہ اچانک میخیں اکھڑ جائیں گی ..... ایک ہولناک آواز سے زمین سے پانی ابلنے لگے گا ......

بس ... بس کرو ... اے بزرگ انسان ... مجھے ڈر لگتا ہے ... کہ کچھ ہونے والا ہے ! ؟

" آج کا یہ منظر بھی کم ہولناک نہیں ... اے بزرگ انسان "

اور میں خوف زدہ ہو کر پھر اسی جم غفیر میں شامل ہو گیا جس میں میرے بزرگ بھی شامل تھے پاداش کا مداوا مستقیم تلاش کرنے کے لئے ...... !!

★

// بقیہ اشوک //

لیکن ؟ ۔۔۔ سمراٹ اشوک کو تو ایک گوتم مل گیا تھا ۔ گوتم کی شکشائیں ملی تھیں تب وہ سمراٹ اشوک بن سکا ۔ کیا آج کے اس اشوک کو کوئی گوتم نہ مل سکے گا ؟ ۔۔۔ "

★

شام بارک پوری

انسان اور زمین

عدالت کا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جج کا فیصلہ سننے کے لئے لوگ کھنچے کھنچے چلے آئے تھے۔ آج کارروائی کا آخری دن تھا۔ دونوں بھائی بھی اپنے اپنے کیس کا فیصلہ سننے کے لئے موجود تھے۔

بھائیوں میں جائداد کا جھگڑا تھا۔ ان کے والد اپنے پیچھے خاصی بڑی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ اچانک ایک دن گاؤں پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ ساجد نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ بڑا بھائی ماجد جان بچانے کے لئے گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تمام افتاد ساجد پر آن پڑی۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر زمین و جائداد کی رکھوالی کی تھی۔ اس کے لئے اُسے صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ وہ لوگ جو موقع کا فائدہ اٹھا کر زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کی جان کے دشمن بن گئے۔ اسے جھوٹے مقدمے میں پھنسوا دیا۔ یہاں تک کہ اسے چند دن جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑا۔ پھر اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے عدالت میں اپیل کی اور سرخرو ہو کر بری ہو گیا۔ اسے تن تنہا جائدادوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ تمام مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے بہت سے لوگوں کی دشمنی بھی مول لینی پڑی۔ مگر وہ ان کے مد مقابل ڈٹا رہا۔ اور آہستہ آہستہ تمام جائدادوں پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اور اس کا برا چاہنے والوں کو منہ کی کھانی پڑی۔

اب وہاں حالات معمول پر آچکے تھے۔ ہر چیز ساجد کے اختیار میں تھی۔ شہر میں [illegible]۔ ماجد کو اس کی خبر ہوئی کہ ساجد تن تنہا جائداد کا وارث بن بیٹھا ہے تو وہ گاؤں واپس آیا۔ اور اپنے بھائی سے تمام جائداد اور روپئے پیسے کا حساب کتاب طلب کیا۔

"بھائی جان۔ میں آپ کو پائی پائی کا حساب دینا چاہتا ہوں۔ آپ بد دل نہ ہوں۔"

"تم کیا حساب دوگے۔ تالاب کی تمام مچھلیاں فروخت کر کے عیش کرتے رہے ہو، پرکھوں کی حویلی کا ملبہ بیچ کر رقم ہڑپ کر لی۔ یہاں تک کہ حکومت نے جو زمین ترقیاتی کاموں کے لئے اپنی تحویل میں لے کر اس کا [illegible] جانہ ادا کیا تھا۔ وہ رقم بھی بنک سے نکال کر ہضم کر لی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے ان سب باتوں کا علم نہیں؟" ماجد غصے میں کھول رہا تھا۔

آپ تو زندگی کا صرف ایک رخ دیکھتے ہیں۔ میں نے کتنے جتن اور جان جوکھوں کے بعد جائداد بچائی ہے۔

[redacted]

اسے بھی تو مدنظر رکھئے: ساجد نے سنجیدگی سے کہا: ان تمام روپوں کا حساب میرے پاس موجود ہے۔ آپ اطمینان سے بیٹھ کر حساب و کتاب کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔"

"تمہاری نیت میں فتور ہے۔ تم مجھے کیا حساب دوگے۔ تمہارا ضمیر مردہ ہو چکا ہے": ماجد غصے میں آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ "میں بھی دیکھوں گا کہ تم مجھے میرے حق سے کیسے محروم کر سکتے ہو۔"

وہ طیش میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اور اپنے بھائی سے اپنے حصے کی جائداد لینے کی پوری طرح سے تیاری کرنے لگا۔ اس سلسلے میں ساجد کے دشمنوں نے بھی اسے بھڑکایا۔ اسے اپنا قدم جمانے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس لئے گاؤں کے ایک بارسوخ آدمی کی بیٹی سے شادی کر لی اور عدالت میں اپنے بھائی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔

عدالت کے کمرے میں کھڑا ماجد اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ "ساجد کتنا کمظرف اور لالچی ہے۔ اپنے بھائی کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ کیا والد کی جائداد کا وہ تنہا وارث ہے۔ کم از کم بھائی ہونے کے ناطے حساب و کتاب میں خرد برد نہ کرتا۔ مجھ سے اگر سچ سچ بتا دیتا تو میں اسے معاف بھی کر سکتا تھا۔

ادھر عدالت کے کمرے میں ساجد کرسی پر بیٹھا سوچ کے سمندر میں غرق تھا۔ "میرا بڑا بھائی بڑا ہی خود غرض اور احسان فراموش ہو گیا ہے۔ میں کتنی جفا کشی، جان پر کھیل کر اور کٹھنائیاں جھیل کر جائداد بچائی ہے۔ اس سلسلے میں مقدمہ بازی اور دوسری کاروائیوں میں بہت ساری رقم خرچ ہو گئی ہے۔ مگر اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ میری قربانیوں اور جاں فشانی کو بلا سے کوئی اہمیت نہ دے مگر بڑے بھائی کی حیثیت سے چھوٹے بھائی کے جذبات کا کچھ تو خیال کیا ہوتا۔"

جب ساجد چونکا تو دونوں وکیلوں میں بحث جاری تھی۔ اس وقت اس کی نظریں وکیل کے چہرے سے ہٹ کر جج کی طرف مرکوز تھیں۔ ہال میں بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف وکلا اپنے اپنے منطقی اور استدلانہ سوال و جواب میں مصروف تھے۔

ساجد پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وکیل استغاثہ نے چند ایسے نکتے اٹھائے تھے کہ اس کے وکیل سے کوئی ٹھوس جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ یہ لمحہ اس کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ اس کا چہرہ چند ساعت کے لئے فق ہو گیا۔ وہ تیر کے مانند ہال سے نکلا اور باہر کھڑے رکشا پر بیٹھ گیا۔ انتظار کا لمحہ اس کے لئے بڑا ہی صبر آزما تھا۔ وہ پہلو بدلنے لگا۔ وقت گزارنے کے لئے سگریٹ کا سہارا لیا مگر سگریٹ اس کے بے قرار دل کو سکون نہ پہنچا سکا۔ اکتا کر اس نے رکشا والے کو چلنے کے لئے کہا ہی تھا کہ اس کا ایک ملاقاتی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ "جج نے تمہارے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ تمام زمین کے مالک تم ہو اور مکان کا ماجد۔ اخراجات کے سلسلے میں بھی تمہاری جیت ہوئی ہے۔"

لیکن اس خبر سے اسے قطعی خوشی نہیں ہوئی۔ اس وقت اس کی آنکھیں تفکر اور پژمردگی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ دراصل اس فیصلہ نے اس کے جذبات میں ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ رکشا میں روانہ ہونے کے لئے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بھی خیال نہ رہا۔

عدالت کے کمرے سے بہت سے آدمی نکلے۔ ان میں اس کے دوست احباب اور رشتے دار بھی تھے۔ برآمدے میں ماجد کو گمبھیر اور شکست خوردہ دیکھ کر وہ لوگ

اسے تسلی دینے آئے اور ساتھ ہی دونوں بھائیوں میں صلح صفائی کی پیش کش بھی کی ۔

" اسے کہہ دینا ۔ آج سے اس کا بھائی مرگیا ۔ اب ہم دونوں کے رشتے ٹوٹ چکے ہیں ۔ آج سے میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔" ماجد نے طیش میں آکر جواب دیا ۔

اس طرح دو بھائیوں کی بے لوث محبت حرص و ہوس کی نذر ہوگئی ۔ خون سے خون جدا ہو گیا اور چھوٹے نے بڑے کے جذبات کو اپنی ہوس کے وزنی جوتوں تلے روند ڈالا ۔ اور بڑے نے چھوٹے کی خواہش کو غصہ و نخوت کی ریتی سے ریت ڈالا ۔

دونوں الگ ہوگئے اور یہ فاصلہ دن بدن بڑھتا گیا ۔

ماجد نے اپنے گھر میں تالا لگا کر اپنی بیوی کے ساتھ شہر میں کاروبار کرنے چلا گیا ۔ دن بدن اسے کاروبار میں نقصان ہونے لگا ۔ اس کے جوٹ کے گودام میں آگ لگ گئی اور تمام جوٹ جل کر راکھ ہوگیا ۔ اس نے جوٹ کا بیمہ بھی نہیں کرایا تھا ۔ وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہوچکا تھا ۔ یہ اس کی بدبختیوں کا آغاز تھا ۔ اس کا ذہن فکر و تردد کی آماجگاہ بن گیا تھا کیونکہ اب ہلاکت اور افلاس اس کے گھر کے مہمان بن چکے تھے ۔

اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگتا تھا ۔ چنانچہ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے گاؤں واپس آگیا ۔ یہ موسم سرما کی سنسان رات تھی ۔ ہر شخص سردی سے ٹھٹھر کر اپنے اپنے بستر میں دبکا ہوا تھا ۔ اس کی بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھی ۔ جب ساجد کو پتہ چلا تو اپنے بھائی سے ملنے چلا آیا ۔ اس نے ماجد کو افسردہ اور مضمحل بستر پر دراز پایا ۔ اس کی بے کسی و مجبوری د[illegible] کر ساجد کا دل خون کے آنسو رونے لگا ۔

اس مکان میں ساجد کی موجودگی کسی دھماکے کم نہ تھی ۔ اس کی شکل دیکھتے ہی

وہ چیخ پڑا ۔ " کیا تم یہاں میری بربادیوں کا تما[شا] دیکھنے آئے ہو یا میرے زخموں پر نمک چھڑکنے ۔۔۔۔

ساجد نے دھیمے لہجے میں کہا " سنا تھا کہ آپ مصائب میں گھرے ہوئے ہیں اس لئے میں آپ کی مد[د] کے لئے آیا ہوں ۔ میں آپ کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتا

" مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ۔ یہاں سے فوراً نکل جاؤ ۔ ایسا نہ ہو کہ میں اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکوں " ماجد غصے میں چیخ پڑا ۔

" بھائی جان ۔ میں آپ کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا [ہوں] فائلوں اور کھاتوں میں تمام حساب کتاب درج ہے آپ خود اکاؤنٹ دیکھ سکتے ہیں ۔ اس میں پائی پائی کا حساب لکھا ہوا ہے ۔ اگر آپ اس سے مطمئن نہ ہوں تو میں اپنے حصے کی آدھی زمین تک آپ کو دینے کو تیار ہوں ۔"

" تم سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تھے ۔ تمہیں [ہم] سے زیادہ زمین عزیز تھی ۔" وہ بدستور درشت لہجے میں [بولا] " مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ۔ مجھے تمہارے رحم کی بھیک نہیں چاہئے ۔"

غصے کی وجہ سے ماجد کے منہ سے جھاگ نکل [illegible]

وہ غیض و غضب سے پاگل ہوا جا رہا تھا ۔ [illegible] مکار ، فریبی ، جعلساز نظر آ رہا تھا ۔ ماجد کے بگڑے تیور [دیکھ] کر ساجد نے واپس چلے جانا ہی مناسب سمجھا ۔

ساجد میں زبردست تبدیلی آچکی تھی ۔ وہ ا[پنے] بھائی کو تباہ و برباد ہوتا دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھ رہا [تھا] درحقیقت وہ اپنے بھائی کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر ماجد

کی بے رخی نے اس کے قدم روک دیئے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنے بھائی سے مل کر تمام گلے شکوے مٹا دے گا۔ اپنی بزدلی اور جھجک کی وجہ سے دوبارہ اپنے بھائی سے ملنے سے قاصر رہا۔

اپنے بھائی کو تکلیف میں دیکھ کر اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ اس نے اپنی آدھی زمین بڑے بھائی کے نام منتقل کر کے دستاویز بذریعہ رجسٹری ڈاک بھائی کو بھیجوا دی مگر وہ رجسٹری واپس آ گئی۔ اس کا نام دیکھتے ہی اس کے بھائی نے وہ لفافہ جوں کا توں واپس کر دیا تھا۔ کھول کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

جاڑوں کی ایک خوشگوار شام تھی۔ وہ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہاں ماجد اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا لباس بوسیدہ ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ شادی کی رسم کے وقت ساجد ہر لمحہ اپنے بھائی کی حرکات و سکنات کا برابر جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بھائی سے جا کر لپٹ جائے تاکہ غلط فہمی اور بیگانگی کی دیوار گر جائے مگر اتنے لوگوں کے ہجوم میں اسے جھجک محسوس ہوئی۔ اس کے علاوہ ماجد کی بیوی جو اس کے لئے اجنبی تھی۔ آڑے آ گئی۔ اس لئے اس نے گھر ہی پر ملاقات کرنے کا ارادہ کیا۔

دوسری شام ساجد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا۔ اپنے بھائی کے گھر کے دروازے پر پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں سربمہر دستاویز تھی۔ اس وقت اندر سے آواز آتی سنائی دی۔ کوئی بار بار اس کا نام لے رہا تھا۔ نام لینے والی شاید ماجد کی بیوی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "شادی کی تقریب میں ساجد موجود تھا۔ وہ آپ کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ آپ ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔"

"ہنہ۔ وہ خود غرض دوسرے کے بارے میں کیا سوچے گا؟" اس نے کہا۔ "میں اسے خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسے اپنے متعلق سوچنے سے فرصت ملے، جب نہ دوسرے کے متعلق سوچے۔"

چند ساعت کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ سردی کے موسم میں بھی ساجد کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔ ماجد کی بیوی چولہے پر کیتلی میں کچھ گرم کرنے کے لئے باورچی خانے میں گئی تھی۔ کبھی کبھار بچے کے بلکنے کی آواز سنائی دی جسے ماجد تھپک تھپک کر سلا رہا تھا۔

کیتلی لئے جب ماجد کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی تو بولی۔ "شاید تم میری رائے سے اتفاق نہ کرو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم دونوں ہی ایک دوسرے کے متعلق سوچتے رہتے ہو لیکن زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتے۔"

"چھوڑو اس قصے کو ــ کوئی اور بات کرو۔ ماجد نے اکتاہٹ سے کہا۔ گویا ان خیالوں کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہتا ہو۔

ساجد کھڑکی کی آڑ سے بہت غور سے اپنے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ ماجد صحیح معنوں میں مفلسی اور تفکر کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اب وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ سانس پھول گیا۔ آنکھیں ابل پڑیں اور سانس رک رک کر چلنے لگی۔ وہ دمہ کا مریض تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی سانس پر قابو پایا۔ اس کی بیوی اس کا سینہ سہلا رہی تھی۔

بڑے بھائی کی بے بسی پر ساجد کے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک نامعلوم سی جھجک نے اس کے قدم روک لئے۔ ایک جھجک تھی جو اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی، اسے اپنے بھائی سے ملنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

نہ معلوم کتنی دیر تک وہ اسی جگہ مغموم کھڑا رہتا کہ سرد ہوا کے تیز جھونکوں نے اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی۔ اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی خاطر پچھواڑے کی کھڑکی سے سر بمہر دستاویز نشانہ لگا کر اندر پھینک دی تاکہ جب اس کے بھائی کی نظر فرش پر پڑے تو لفافہ کھول کر دستاویز پڑھ لے۔ لیکن قسمت کی آزمائش کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ لفافہ پھسلتا ہوا چارپائی کے نیچے جا گرا۔ اس نے سوچا کہ چلو کبھی جب اس کی بیوی کمرے میں جھاڑو لگائے گی تو چارپائی کے نیچے سے لفافہ ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے دل میں ایک قسم کا سرور اور اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے اسے منجمد کئے دے رہے تھے۔ مگر اپنے دل سے ایک بوجھ سا ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ خوشی خوشی اپنے گھر واپس آ گیا۔

ساجد کئی روز تک اس انتظار میں رہا کہ اس اقدام سے ماجد پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کئی روز ہو گئے۔ مگر ساجد نے کوئی مژدہ جانفزا نہیں سنا۔ دراصل یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ کئی دنوں سے ماجد کے گھر کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیئے کہ ماجد کی صحت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ کافی نحیف و لاغر ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔

ساجد نے غم بھلانے کے لئے بے تحاشہ شراب پینی شروع کر دی۔ اس کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی لیکن ماجد سے لو مٹی کے بغیر اپنی صحت کھو رہا تھا۔

ایک شام ساجد اپنے گھر میں بیٹھا کھویا ہوا تھا کہ ایک عورت گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اس نے ساجد کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ساجد اس کی جھلک دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ماجد کی بیوی یعنی اس کی بھابی ہے۔ ضرور ماجد پر اس وقت کوئی افتاد پڑی ہے۔ اس نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور اپنی بھابی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس نے دور سے دیکھا کہ ماجد کے مکان کی کھڑکیوں سے چھن چھن کر روشنی نکل رہی ہے۔

وہ گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ماجد اپنے بستر پر نڈھال رضائی اوڑھے پڑا تھا۔ اس کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ والے بستر پر اس کا بچہ لیٹا ہوا تھا۔

اس نے آہٹ پا کر دروازہ کی طرف دیکھا۔ ساجد کھڑا تھا۔ اس نے ساجد کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا جس سے ساجد کا دل کانپ اٹھا۔ وہ دھیرے سے آ کر بستر کے قریب بیٹھ گیا۔ ماجد نقاہت کے باوجود ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ماجد کی بیوی بچے کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔

"بھائی جان۔ یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی" ساجد کا دل رو پڑا۔

"وقت اور حالات انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتے" ماجد نے نرم لہجے میں کہا۔ "آج مجھے شرمندگی محسوس ہوتی کہ ایک معمولی سی زمین ہمارے خون کے رشتہ کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

"نہیں بھیا۔ اس میں کچھ میری بھی ہٹ دھرمی اگر آپ کو زمین سونپ دیتا تو کیا فرق پڑتا کیونکہ زر یہ سب دنیاوی چیزیں ہیں۔ مرنے کے بعد تو مجھے اتنی زمین کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سوائے چھ فیٹ زمین ..." ساجد نے اپنے اوپر لعن طعن شروع کر دی۔

ساجد۔ ایسی بات نہیں کرتے۔ میری خود غرضی

ں مجھے ضدی بنا دیا تھا۔ ورنہ نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی
وقت کا پنچھی اڑ چکا ہے تو میری آنکھ کھلی ہے۔"

"بھائی جان۔ میں چند روز قبل رات کو چھپ کر آپ کے
ان پر ضرور آیا تھا مگر میری بزدلی اور جھجک نے ہم میں
لح صفائی ہونے نہیں دی۔ اس لئے میں نے کھڑکی سے زمین
دستاویز فرش پر پھینک دی تھی کہ آپ کو مل جائے مگر
بتمتی سے وہ دستاویز چارپائی کے نیچے جا پڑی یہ دیکھئے"
یہ کہ کر اس نے چارپائی کے نیچے سے دستاویز نکالی اور
جد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ماجد بھیا! شاید آپ اسے میرے ہاتھوں
سے لیتے ہوئے اپنی توہین سمجھیں گے۔ اگر آپ واقعی صدق
ل سے مجھے معاف کر کے یہ قبول کر لیں تو میں سمجھوں گا کہ
یری دلی مراد پوری ہو گئی اور شاید اس طرح میری
غلطیوں کا ازالہ ہو سکے۔"

ماجد نے لفافہ چاک کر کے دستاویز لے لی۔ وہ
بہت کمزور ہو گیا تھا اس لئے بہت کم باتیں کر سکا۔

ساجد کئی دنوں تک اپنے بھائی کی خدمت
کرتا رہا۔ علاج جاری رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی صحت
بحال ہونے لگی تھی۔

ایک دن صبح ساجد جب اپنے بھائی سے ملنے
گیا تو اسے بہت ہشاش بشاش دیکھا۔ انشاء اللہ
آئندہ ہم لوگ ہنسی خوشی اور میل ملاپ سے زندگی گزاریں
گے۔

لیکن اچانک اس کے دوسرے دن بلڈ پریشر بڑھ
جانے کی وجہ سے اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسا۔

ساجد پر ناگہانی موت کا زبردست اثر ہوا۔ اس
کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ صرف اس کی انا کی بنا پر اپنا خون
ہی خون کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا۔ اگر ان دونوں
میں زمین کا جھگڑا کھڑا نہ ہوا ہوتا تو اس کا بھائی مصیبتوں
کا شکار ہو کر نہ مرتا۔

وہ اپنی بھابی اور بچے کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تاکہ
ان کی دیکھ بھال ہو سکے۔ اور بچے کی پرورش صحیح طریقے سے
کی جا سکے۔

ایک دن جب صبح کا سورج نمودار ہو رہا تھا۔ وہ
اپنے بھتیجے کو گود میں لئے برآمدے میں کھلا رہا تھا۔ اس کی
بھابی بچے کے دودھ کی بوتل لئے آئی۔ وہ اپنے ہاتھ میں
دودھ کی بوتل لے کر بچے کو دودھ پلانے لگا۔

اس وقت ماجد کے انتقال کو صرف ڈیڑھ ماہ ہوئے
تھے۔ اس عرصہ میں ساجد میں زبردست تبدیلی آ گئی تھی۔
پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور کم گو ہو گیا تھا۔ اور ہر وقت کسی
گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ آخر آج اس کی بھابی نے ٹوک دیا۔
"ساجد۔ تم آج کل بالکل کھوئے کھوئے سے ہو؟"

"نہیں بھابی۔ ایسی بات نہیں۔ دراصل انسان ٹھوکروں
سے تجربہ حاصل کرتا ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ معمولی سی زمین کے
جھگڑے کی وجہ سے میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا، اگر مجھے
پہلے سے اس کا اندازہ ہوتا تو بات اس حد تک نہیں بڑھتی۔"

"میں پہلے بھی انہیں سمجھاتی تھی کہ خون کا رشتہ سب
سے جذباتی اور پرکشش رشتہ ہے، اس لئے انسان تا
حیات نہیں بھول سکتا۔ بظاہر وہ زبان سے کچھ نہ کہتے تھے۔
میں محسوس کرتی تھی کہ ان کا احساس مردہ نہیں ہوا تھا
مگر موت سے مفر نہیں۔"

"بھابی زر اور زمین سب کچھ اسی دنیا میں رہ جاتی
ہے۔ موت کے بعد انسان صرف اعمال ساتھ لے جاتا ہے۔"

"میرا ان کا اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ خون کے
رشتے سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی رشتہ نہیں۔"

"نہیں انسانیت بھی بڑھ کر ایک رشتہ ہے!"

(بقیہ صفحہ ۳۱ پر)

آنند لہر

سمتیں

ایک لمبے بالوں والا شخص گنجے شخص سے مخاطب ہے۔

(لمبے بالوں والا شخص) سمجھ تو اس بات کی نہیں آتی کہ ان راستوں کو سمتوں میں بانٹ کر ہم نے کیا حاصل کیا۔

گنجا شخص۔ جب سے یہ راستہ سمتوں میں بٹا ہے سفر سفر نہ رہ کر بس ایک دوڑ بن گیا ہے

گنجا شخص اس کے لمبے بالوں کی طرف دیکھتا ہے اور لمبے بالوں والا اس کے سر کی طرف۔

وہ دونوں ساکت کھڑے ہیں اور پردے پر کچھ سائے ابھرتے ہیں۔

ایک بچہ۔ میری چار انگلیاں۔

دوسرا بچہ۔ میں بھی مصیبت میں ہوں کہ میری چھ انگلیاں ہیں۔

اسٹیج پر روشنیاں پڑتی ہیں جن کا آپس میں کافی تضاد نظر آتا ہے۔

ایک بچہ۔ میری ماں مجھ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ میں بہت تنگ ہوں۔ میری مرضی کی چیزیں مجھے کھانے کے لئے نہیں دیتی۔ نہ ہی میں اپنی مرضی کے کپڑے پہن سکتا ہوں۔

دوسرا بچہ۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ نہ ہی میں اپنی مرضی کے کپڑے پہن سکتا ہوں اور نہ ہی پسند کا کھانا ملتا ہے۔

پردہ پر ایک بہت بڑا سمندر دکھائی دیتا ہے۔ پھر ایک بہت بڑا صحرا۔

آواز۔ زندگی پھر بھی چلتی ہے۔

(وہ گنجا شخص اور لمبے بالوں والا وہیں پر کھڑا رہتا ہے)

(ایک لڑکی اور لڑکا اسٹیج پر آکر رونے لگتے ہیں)

اتنے میں ایک شخص جس کا چہرہ جوان ہے اور جسم بوڑھا وہاں سے گذرتا ہے۔ مگر وہ آواز بچے کی بولتا ہے۔

وہ شخص۔ تم کیوں رو رہے ہو۔

لڑکا۔ اس لئے کہ ایک دن ہمیں ضرور آپس میں بچھڑنا ہے۔ لیکن قسمیں ہم نے جنم جنم کا ساتھ دینے کی کھائیں ہیں۔

لڑکی۔ میرے جسم کے ابھار ڈھلتے ہی اس کی آنکھیں بھی

بدل جائیں گی ۔

(وہ دونوں پھر رونے لگتے ہیں)

لڑکی ۔ میری ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا ۔

(وہ دونوں مل کر بولتے ہیں)

کوئی بتائے کہ ایسا کیوں ہے ؟

شخص ۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں تمہاری ہر بات سُن توسکتا ہوں ۔ مگر اس کا جواب نہیں دے سکتا ۔

دونوں ۔ مگر ، کیوں ۔

شخص ۔ میں تمہارا ماضی ہوں اور تم سے آگے چلتا ہوں ۔

یہ بات کہہ کر وہ شخص چلا جاتا ہے ۔

اور وہ دونوں پھر رونا شروع کر دیتے ہیں ۔

اسٹیج پر دھواں ہی دھواں پھیل جاتا ہے ۔ اور شور سنائی دیتا ہے ۔

ایک لڑکی کچھ گاتی ہے ۔

آواز ۔ یہ ماضی ہے اور اِس کی آواز کتنی سریلی ہے ۔

ایک شخص چیختا ہے ۔

آواز ۔ اور یہ مستقبل ہے

کچھ کردار اسٹیج پر آتے ہیں اور مل کر یوں بولتے ہیں ۔ ہمارے گھروں کے آنگن اتنے پھیل گئے ہیں کہ دھرتی تنگ ہو گئی ہے ۔

پردے پر دو بچوں کے سائے نظر آتے ہیں ۔

ایک بچہ ایک طرف کھڑا ہے اور دوسرا دوسری طرف ۔

ایک بچہ ۔ دوسرے کی طرف گیند پھینکتا ہے ۔

دوسرا بچہ ۔ یہ مجھ تک پہنچ ہی نہیں سکتا

پہلا بچہ ۔ پیار نے جگہ اتنی زیادہ گھیر دی ہے کہ ایسا ہم کھیل بھی نہیں سکتے ۔

(وہ تمام کردار یہ کہہ کر چلے جاتے ہیں)

لڑکا اور لڑکی اسٹیج پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

اور پھر وہ دونوں رونے لگتے ہیں

ایک شخص وہاں سے گزرتا ہے

وہ شخص ۔ تم اور خوشی زندگی کے پل کے دو کنارے ہیں ۔ اور وقت کے دریا کو پار کرنے کے لئے ہر شخص کو ہر حال میں یہاں سے گذرنا پڑتا ہے

وہ دونوں ۔ ٹھہرو ، ہماری بات تو سنو

وہ شخص ۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں بات تو کر سکتا ہوں لیکن سن نہیں سکتا ۔

(یہ کہہ کر اس شخص نے الٹے پاؤں چلنا شروع کر دیا)

وہ دونوں ۔ لیکن تم کون ہو

وہ شخص ۔ میں تمہارا مستقبل ہوں ۔

وہ دونوں ۔ لیکن ہمارا حال کہاں ہیں ۔

اتنے میں وہ دونوں آگے چلنا شروع کر دیتے ہیں ۔

لڑکا ۔ زندگی کا راز مل گیا ۔ خوشی مناؤ ، ناچو ، گاؤ

لڑکی ۔ مگر ۔ اتنا تو بتاؤ کہ ہوا کیا ؟

لڑکا ۔ اب تمہارے سینے کے ابھار کبھی ڈھیلے نہیں ہوں گے

لڑکی ۔ وہ کیسے ۔

لڑکا ۔ ٹھہرو ، میں ابھی تمہیں وہ ترکیب بتاتا ہوں ، ہم دونوں پیچھے مڑ جاتے ہیں اس سے ہمارا ماضی مستقبل بن جائے گا اور مستقبل ماضی ۔

یہ کہہ کر وہ دونوں پیچھے مڑ جاتے ہیں ۔ اور وہیں اسٹیج پر ساکت ہو جاتے ہیں ۔

(پردے پر کچھ سائے نظر آتے ہیں)

ایک سایہ حیرانگی سے ۔ اُف ۔ اتنا بڑا حادثہ ۔

دوسرا سایہ ۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہے ۔
تیسرا سایہ ۔ لگتا ہے کوئی آدمی بھی بچا نہ ہوگا ۔
خاموشی چھا جاتی ہے ۔ اور سائے آپس میں کچھ باتیں کرتے ہیں ۔
ایک شخص ۔ کیا کہا ۔ تمام لوگ بچ گئے ۔
دوسرا شخص ۔ عجیب حادثہ ہے کہ اتنے بڑے حادثے سے تمام لوگ بچ گئے
طبلا بجنے کی آواز آتی ہے ۔ اور اسٹیج پر روشنیاں ہی روشنیاں دکھائی دیتی ہیں ۔
آواز ۔ اے خدا ۔ اگر لوگوں کو زندہ ہی رکھنا تھا تو اتنے بڑے حادثے کی ضرورت کیا تھی ۔
طبلا (یوں کہتا ہے) یہی زندگی ہے ۔
(ایک کردار جو لوگوں کی طرف پیٹھ کر کے بات کرتا ہے)
کردار ۔ اس کے بعد، تم یہ بھی پوچھوگے کہ ہمیں مارنا ہی تھا تو پھر پیدا کیوں کیا گیا ۔
سایہ ۔ تو یہ صحیح نکلا کہ نفی اور نفی جمع ہوتے ہیں ۔
کردار ۔ مگر تم تو سائے ہو ۔ تمہاری بات پر اعتبار کون کرے گا ۔
دوسرا سایہ ۔ گنتی گننے والے شخص کے منہ سے ہندسے پھسل جاتے ہیں ۔ اور بچوں کے ساتھ چپک کر اپنی عمر بڑھا دیتے ہیں ۔
کردار ۔ تم تو سائے ہو، تمہارے کہنے سے گننا بند کون کرے گا ؟
(اتنے میں وہ لڑکا اور لڑکی آگے چلنا شروع کر دیتے ہیں)
دونوں مل کر بولتے ہیں ۔ ہمارے آگے کون ہے
ایک شخص جس نے کالے کپڑے پہنے ہوئے ہیں ۔
تمہارا ماضی
وہ دونوں ۔ ہمارے پیچھے کون ہے ۔
ایک شخص ۔ جس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں ۔ تمہارا مستقبل
وہ دونوں ۔ اچھی طرح سن لو ۔ تمہارے پیچھے مڑنے سے ماضی مستقبل بن گیا ہے اور مستقبل ماضی
لڑکی اور لڑکا ہنسنا شروع کر دیتے ہیں ۔
وہ دونوں ۔ تم ہنس کیوں رہے ہو ۔
لڑکی اور لڑکا ۔ ہم روئیں تب بھی وہی ہوتا ہے ۔ جیسے ہونا ہوتا ہے
ہم ہنسیں تب بھی وہی ہوتا ہے ۔ اور اگر رونے یا ہنسنے
اور اگر رونے یا ہنسنے میں سے چننا ہے ۔ تو کیوں نہ ہنسنے کو چنا جائے ۔
سفید اور کالے کپڑوں والے شخص ایک دوسرے کے ساتھ پیٹھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مخالف سمتوں میں چلنا شروع کر دیتے ہیں ۔
اسٹیج پر شور ہی شور سنائی دیتا ہے ۔
ایک بڑھیا چرخہ کاتتے ہوئے نظر آتی ہے
لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے ہاتھوں کو چومتے ہیں
لڑکا ۔ میں تمہیں کیوں چوم رہا ہوں ۔
لڑکی ۔ اس لئے کہ میں تمہیں چوم رہی ہوں ۔
لڑکا ۔ پہلے تم نے بھی چوما
لڑکی ۔ نہیں یہ بات غلط ہے ۔ پہلے تم نے مجھے چوما
آواز ۔ پہلے اور پیچھے کے جھگڑے میں وقت ضائع کیوں کرتے ہو ۔ یہاں پہلے اور پیچھے کچھ بھی نہیں ۔ جو ہے سو ہے ۔ جو نہیں تو نہیں ۔
وہ دونوں چپ چاپ کھڑے ہیں
وہ دونوں ۔ یہ کون بولا ۔
آواز ۔ میں تمہارا حال ہوں
لڑکی ۔ دن بیت رہے ہیں ۔

لڑکا ۔ غلط، بالکل غلط، دن نہیں بلکہ ہم بیت رہے ہیں۔

(ایک بوڑھی عورت وہاں سے گذرتی ہے)

بوڑھی عورت ۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر ایک بات تم سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری اس بات کو ضرور مانو گے۔

وہ دونوں ۔ کہو

بوڑھی عورت ۔ تم تھوڑی دیر کے بعد بھیڑ کا حصہ بننے والے ہو۔

وہ دونوں ۔ مگر کیوں

بوڑھی عورت ۔ کیوں، کب اور کیسے ان سب باتوں میں الجھنے کے بجائے صرف اسی حقیقت کو مان لو، ایسا ہونے والا ہے۔

وہ دونوں ۔ مگر، اس سے کیا ہوگا۔

بوڑھی عورت ۔ بس، یہی کہ تم، تم نہ رہوگے۔ اور وہ وہ نہ رہوگے۔ بھیڑ کا حصہ بن جاؤ گے۔

وہ دونوں ۔ مگر اس میں برا کیا ہے

بوڑھی عورت ۔ بھیڑ کے لاکھوں کان ہوتے ہیں مگر یہ کچھ سن نہیں سکتی۔ بھیڑ کی لاکھوں آنکھیں ہوتی ہیں مگر یہ کچھ دیکھ نہیں سکتی۔ بھیڑ کے لاکھوں ہاتھ ہوتے ہیں مگر یہ کچھ چھو نہیں سکتی۔

(وہ دونوں رونے لگتے ہیں)

بوڑھی عورت ۔ رو کیوں رہے ہو۔

وہ دونوں ۔ اس لئے کہ ہم نے جنم جنم کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی ہیں۔

بوڑھی ۔ سچ تو یہ ہے کہ بھیڑ میں شامل ہر شخص نے ایسا ہی کیا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ بوڑھی عورت وہاں سے چلی جاتی ہے۔

وہ دونوں ۔ مگر سنو ۔ ہمیں ہمارے نام تو دے جاؤ۔

بوڑھی عورت ۔ میں مجبور ہوں۔ زبان بولنا چاہتی ہے۔ مگر پاؤں رکنا نہیں چاہتے۔ اتنا سن کر وہ دونوں بھی چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ لڑکی پیچھے رہ جاتی ہے۔

لڑکی ۔ ٹھہرو میں بھی آرہی ہوں۔

لڑکا ۔ اب رکنا میرے بس میں کہاں ہے۔

لڑکی ۔ تو اس کا مطلب تم بھیڑ کا حصہ بن چکے ہو۔

لڑکا ۔ تم دوڑ کر میرے قریب آجاؤ۔

لڑکی ۔ اب ایسا میرے لئے بھی ممکن نہیں ہے

لڑکا ۔ اس کا مطلب ہے اب تم بھی بھیڑ کا حصہ بن چکی ہو۔

لڑکی ۔ چلو میرا کوئی نام تو رکھ لو تاکہ بھیڑ میں مجھے پکار سکو۔

اسٹیج خالی ہو جاتا ہے۔ (کچھ لڑکیاں وہاں آتی ہیں اور یہ کہہ کر چلی جاتی ہیں)

ایک لڑکی ۔ ساری زندگی حادثے ہی تو ہیں

دوسری لڑکی ۔ یہ حادثے دروازوں، کھڑکیوں کے سوراخوں میں رہتے ہیں۔

تیسری لڑکی ۔ ہم جہاں بھی ہیں اسے ایک حادثہ سمجھ لیا جائے

چوتھی لڑکی ۔ ہمیں صرف جینا ہے۔

اتنے میں اسٹیج کے نیچے سے ایک کردار سامنے آتا ہے۔

وہ شخص ۔ اچھا سنو، مجھے خدا نے تمہاری خدمت کے لئے دھرتی پر بھیجا ہے۔ کیوں کہ جب بھی دھرتی پر پاپ بڑھتا ہے تو بھگوان دھرم کی ستھاپنا کے لئے کسی اوتار یا پیغمبر کو دھرتی پر بھیجتا ہے۔

ایک عورت ۔ مگر تم کرو گے کیا۔

وہ شخص ۔ میں تمہیں راستہ دکھاؤں گا۔

عورت ۔ مگر تم تو خود اندھے ہو، تم ہمیں کیا راستہ دکھاؤ گے۔

اتنے میں ایک شخص اسٹیج پر آکر ڈھول بجانا شروع کرا دیتا ہے۔

وہ شخص ۔ اچھی طرح سن لو۔ ہم سب کو خود اپنے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی باتوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔

ہی اتنے میں ایک لڑکی وہاں سے گذرتی ہے اور کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی جاتی ہے۔

وہ شخص ۔ یہ کیا، یہ کچھ کہے بغیر ہی چلی گئی۔

عورت ۔ کہتی بھی کیا۔

وہ شخص ۔ یہی کہ کہاں سے آئی ہے اور اسے جانا کہاں ہے

عورت ۔ اس کی خاموشی کا صرف یہی مطلب ہے کہ لوگ جو جوان ہوں ہوتے ہیں۔

(کچھ کردار اسٹیج پر آتے ہیں اور یہ کہہ کر چلے جاتے ہیں)

کردار ۔ جھوٹ کے پاؤں اس لئے نہیں ہوتے کیونکہ یہ بغیر پاؤں کے بھی چل سکتا ہے۔

دوسرا کردار ۔ بولنے والا شخص کچھ نہ کہہ سکا

تیسرا کردار ۔ خاموش رہ کر اس نے یہ راز کھول ہی دیا کہ دریا سمندر کی طرف کیوں جاتے ہیں۔

(وہ تینوں کردار وہاں سے چلے جاتے ہیں)

دو آدمی اسٹیج پر دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور اچانک رک جاتے ہیں۔

پہلا دوسرے سے مخاطب ہو کر ۔ جاؤ، مگر اس سے یہ نہ پوچھنا کہ وہ کب سے ہے اور کیوں ہے۔

اتنے میں دوسرا شخص وہاں سے چلا جاتا ہے اور تیسرا وہاں پر آتا ہے

تیسرا پہلے سے ۔ اب تمہیں یہ جگہ خالی کرنی ہوگی۔ کیونکہ یہاں پر ایک ہی آدمی ٹھہر سکتا ہے۔

پہلا ۔ مگر کیوں اتنی کھلی ہوئی جگہ ہے یہاں پر تو ہزاروں لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔

تیسرا ۔ نہیں بھائی، اصل میں یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں یہاں اکٹھے نہیں ٹھہر سکتے۔

پہلا ۔ مگر، کیوں

تیسرا ۔ کیوں کہ یہاں پر جو بھی ٹھہرتا ہے۔ اسے اس بچے کا باپ کہلانا پڑتا ہے اور باپ صرف ایک ہی آدمی بن سکتا ہے۔

اتنے میں ایک بچہ وہاں آکر کھیلنا شروع کر دیتا ہے

تیسرا شخص ۔ اس سے پہلے کہ وہ بچہ ہم دونوں کو باپ کہے تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔

پہلا شخص ۔ نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا، مگر یہ کہہ کر وہ بھاگنا شروع کر دیتا ہے

تیسرا شخص ۔ ارے رک کر میری بات تو سن لے۔

پہلا شخص ۔ رکنا کہاں میرے بس میں ہے۔ تم دوڑ کر میرے قریب آجاؤ۔

تیسرا شخص ۔ مگر دوڑنا کہاں میرے بس میں ہے۔

آواز ۔ ہر سیدھی لکیر اپنے اندر ٹوٹتے ہوئے دائرے رکھتی ہے۔

آواز ۔ بالکل سیدھی لکیروں نے ٹیڑھے زاویے بنائے۔

آواز ۔ ٹیڑھے راستوں پر چلنے والے مسافروں کے پاؤں سیدھے ہو گئے۔

آواز ۔ بچے نے کسی کو پتا نہیں کہا مگر سب نے اسے بیٹا ضرور کہا۔

اسٹیج خالی ہے اور دو شخص وہاں پر آتے ہیں۔

ایک دوسرے سے ۔ میں واپس آگیا ہوں۔ میری جگہ خالی کرو

دوسرا ۔ مگر واپس تو میں آیا ہوں

تیسرا آدمی ۔ جگہ کا اصلی مالک میں ہوں۔ اس لئے تم دونوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ اسے خالی کر دو۔

وہ تینوں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے کے گلے ملتے ہیں۔

تینوں مل کر بولتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم یہاں سے گئے ہی نہیں تو واپس کیسے آسکتے ہیں۔

پھر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔

پھر بولتے ہیں۔ مگر ہم جہاں سے گئے تھے وہ جگہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ لگتا ہے کہ یہ جگہ بھی ہمارے ساتھ ہی سفر کرتی رہی۔

وہ تمام وہاں کھڑے رہتے ہیں۔

آواز ۔ تیاگیوں کی خواہش آنکھوں سے گر رہی ہیں اور زمین خواب لے رہی ہے۔

اتنے میں ایک بوڑھی اور بوڑھا اسٹیج پر آتے ہیں۔

بوڑھی ۔ ہمارے ناموں کا کیا ہوا۔

بوڑھا ۔ عمر کھا گئی

بوڑھی ۔ اور عمر کا کیا ہوا۔

بوڑھا ۔ وہ ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے۔ اور اسے وقت نگل گیا

بوڑھی ۔ یہ وقت کہاں رہتا ہے

اتنے میں ان کے جوان سائے اسٹیج کے پردے پر نظر آتے ہیں۔

لڑکی ۔ اُف تم تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔

لڑکا ۔ تم تو میرے دل کے اندر اتر گئی ہو۔ میری آنکھیں صرف تمہیں دیکھنا ہی پسند کرتی ہیں۔

لڑکی ۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کب تک ساتھ دوگے۔

لڑکا ۔ جب تک چاند اور ستارے ہیں۔ گندم کے پودے جب تک جواں ہوتے رہیں گے۔ پھول جب تک اپنی خوشبو بکھیرتے رہیں گے۔

لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ جاتے ہیں۔

وہ تینوں شخص بولتے ہیں۔ بھیڑ میں انسان بٹ جاتے ہیں۔

ایک بہت بڑا صحرا پردے پر نظر آتا ہے۔ جس پر چلتے ہوئے وہ لڑکی اور لڑکا نظر آتے ہیں۔

لڑکی ۔ مگر ہم بھیڑ کا حصہ کیسے بنے

لڑکا ۔ ہم نے خود ہی اپنے ارد گرد بھیڑ اکٹھی کی۔

لڑکی ۔ وہ کیسے

لڑکا ۔ جسم تمہارے ساتھ لپٹ رہا۔ آنکھیں کسی کے چہرے کو چرا کر لائیں۔ کان دوسروں کے لفظوں کو ساتھ لائے۔ ہاتھوں نے اگر کسی بدن کو چھوا تو رشتہ قائم کر لیا۔ پاؤں اگر دو قدم کسی کے ساتھ چلے تو انہوں نے تعلقات بنا لیے۔

لڑکی ۔ تو پھر کیا ہوا

لڑکا ۔ یہ سب کچھ ہمارے ارد گرد جمع ہوتا رہا اور بھیڑ بنتی گئی۔

لڑکی ۔ تو تم نے اگر کسی کے بدن کی طرف دیکھا تو سچ یہ ہے کہ کسی اور نے میرے بدن کی طرف بھی دیکھا۔

(اتنے میں ایک شخص دوڑتا ہوا آتا ہے)

وہ شخص ۔ بھاگو، بھاگو

وہ دونوں ۔ کیوں کیا ہوا

وہ شخص ۔ سمندر صحرا کی طرف آرہا ہے۔

وہ دونوں ۔ اگر سمندر صحرا کی طرف آرہا ہے تو اس میں بھاگنے کی کون سی بات ہے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں بھی بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

چاروں شخص ۔ یہی تو بھیڑ کی خاصیت ہے۔

★

ندامت کے باب میں

۳ نظمیں

نجم سباگے

(۱)

وہ حق الا کی وسعتیں
اذاں کی خوش لحانیاں
سحر بھی منتظر رہے
صحیفے پر اثر بیاں کہ سجر سجر پُر فغاں
زار زار کہکشاں، کرے یہ کس کی حمد عیاں

خدا حسیں، خدا جواں
سلونی شام پر لکھے یہ کس نے قصے راہ کے
طائرِ خبیث بھی چلیں ہوا کو روندتے
کبھی جو چل پڑا جنوں کہ
قتل ہو صدائے جرس
نیند چادریں بنی۔ سحر ہوئی زماں زماں
میں رعشہ زد ترے سوا
عظیم کود میں ڈھیر ہوں
آسماں لگے ہے دور کہ رات رات قفس میں
میں کس قدر گناہ ہوں
میں کس قدر گناہ ہوں

(۲)

وہ سامنے تھی میرے
لدی پھندی سی بیل سی
ہیں حرف حرف مہر کے
پھنسا ہوا تھا دہر میں
عظیم چاہتوں کے نام
فصل کی راحتوں کا زخم
دلفریب قرب میں لمسِ ترک چاہ بھی
ساعتِ ذلیل تھی
ہوئی جو فصل گل ہوا
گیا سروں سے سب نشہ
میں کس قدر فریب تھا
میں کس قدر فریب تھا

(۳)

میں دھول میں اٹا ہوا
پون کی چاہتوں میں تھا
حریری آنکھ سا خلا
سفر کی ساعتوں میں تھا
قدم قدم پہ پُل صراط
قدم تھے مستعار سب
جسم میں ایک فتور سا
مگر لبوں پہ تھی دعار

مرحلے تمام تر
خواب زیست کے اثر
کڑے دلوں کی آس کا

عجب سا صلہ رہا کہ رات رات چار سو
فسوں کبھی کم نہ رت جگے
طرف طرف گھاؤ ہے
جو چل پڑے سو زندگی
تھے تو اضطرابیت
میں کس قدر عجیب تھا
میں کس قدر عجیب تھا

سہو مطالعہ

واحد محسن

لکھا ہے، پڑھا ہے
کتابوں میں یہ
کہ انساں کو اس کے
گنہہ کے عوض
جہنم ملے گا!
عذابوں کا پھر
سلسلہ بے گماں
سلسلہ جو کبھی
ختم نہ ہونے والا
وہی سلسلہ چل رہا ہے ہنوز
یہ دنیا جہنم ہے لوگو، یہاں
عذابوں میں ہے مبتلا
ہر بشر
بشر وہ کہ جس کی خطا کے عوض
جہنم میں جھونکا گیا ہے اُسے

یہی تو جہنم ہے
سکوں ابن آدم کو
اک پل نہیں ہے
اگر یہ جہاں ہے جہنم تو پھر؟
ہے جنت کہاں....؟

او، دور دیس کے ساتھی

حامد اکمل

اس شام کی تیرہ آنکھ سے
جھانکنے والے بوڑھے نے
اپنے پائپ کی راکھ
میرے آنگن میں جھاڑی
سرخی مائل بالوں والی بلی
غراتے غراتے جھپکی میری اور
آنکھوں نے منظر لہرایا
تو ڈوب گیا

تیرا وعدہ
گملے میں اگا اور کمھلایا
میں تجھ کو، تو مجھ کو یاد آیا (کیا یہ سچ ہے؟!)
دور دیس کے ساتھی!
باروروں کے پھول کھلائے تیری دھرتی
میری زمیں کانٹوں کی فصل اگائے
تو دھواں دھواں منظر کا سہاق
میں لہو لہو متروک بدن کا پیمانہ
منظر منظر گہرائی میں جب آنکھ کھلے
اس کی رنگت خیزی کا جب تجھ میں مجھ میں رنگ گھلے

اور پھر بھی نہ ہو پہچان تو
رت کب بدلے؟
رت آئینہ بن جائے تو صورت بدلے
کب ــ دور دیس کے ساتھی
تو اپنے بوجھل شانے سے مری لاش اتارے گا
اور ڈھونڈے گا

دھرتی پہ کھلے بارود کے پھولوں میں مٹی کی خوشبو
میں اپنے رحم کو سہلا کر بھی تجھے بھلا نہ پایا
اس شام کے دامن میں جب
احساس ہوا
کمھلایا۔ گملے کا ننھا پھول
اے دور دیس کے ساتھی
پھر یاد مجھے تو آیا۔

★

ڈاکٹر نوش

چشم و نگاہ کو ہے اگر تاب دیکھئے
ہر شے میں ایک جلوے کوئی نایاب دیکھئے

امید، انتظار، طلب، آہٹیں، گماں
کیا کیا بنے ہیں وصل کے اسباب دیکھئے

الزام داغ داغ یہ منسوب آئینہ
کیسے ذہین ہیں مرے احباب دیکھئے

چپ سے نہ اضطراب کا اندازہ کیجئے
اک موج نار بھی ہے تہہ آب دیکھئے

احباب تو کبھی کے دغا دے گئے نوش
کب تک بنا ہے ساتھ مئے ناب دیکھئے

کفیل امروہوی

اپنے ہی ہاتھوں خود اپنے لئے آزار نہ بن
بھولنے کے لئے اس شخص کو مے خوار نہ بن
ایک اک غم پہ بہا جتنے بھی آنسو چاہے
قہقہے کھل کے لگتے ہیں اداکار نہ بن
گھٹ کے رہ جائے گا تنہائی کی دیواروں میں
گھر میں نادار سہی لوگوں میں نادار نہ بن
ایک اک شخص کہے گا اسے دیوانہ پن
دیکھ اس دور میں زخموں کا خریدار نہ بن
دل حساس پہ الزام کوئی آجائے
پرخلوص اتنا نہ بن ایسا ملنسار نہ بن
ایک غم ہوگا گلا گھونٹ دیا بچوں کا
مگر احباب کے احساں سے گراں بار نہ بن
خودکشی کرنی پڑے تلخی حالات بڑھے
ایسی بے سود تمنا کا پرستار نہ بن
زیست سڑ جائے گی ناسور کی مانند کفیل
صرف زردار بن اس دور میں فنکار نہ بن

تبصرے

کتاب :- نظر نظر کے چراغ (تنقید)
نقاد :- رفیعہ شبنم عابدی
ناشر :- حسن پبلی کیشنز۔ بمبئی ۳
قیمت :- بیس روپئے
مبصر :- ڈاکٹر محمد منشی

"نظر نظر کے چراغ" رفیعہ شبنم عابدی کے سات تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے ایک صاف ستھرے ادبی ذوق اور صحت مند تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اس مجموعہ کا پہلا مضمون نہایت دلچسپ اور انوکھے انداز کا مضمون ہے جس میں تاریخ کی دو ایسی نامور شخصیتوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو مختلف عہد میں پیدا ہوئے اور ان کے کارناموں کی نوعیت بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ غالب اور مہاتما گاندھی ایک عظیم شاعر اور دوسرا عظیم سیاسی رہنما اور مصلح۔ طبیعتوں میں بنیادی اختلاف بلکہ تضاد کے باوجود محترمہ رفیعہ شبنم عابدی نے ان کے درمیان بہت ساری مشترک حضر حیات بڑی محنت اور جستجو سے تلاش کرلی ہیں۔ ان اختلافات اور مماثلتوں کی روشنی میں غالب اور گاندھی کی شخصیات کا تقابلی مطالعہ انہوں نے بڑے دلکش اور خیال انگیز انداز میں کیا ہے لیکن اس مجموعہ کا سب سے اچھا اور اہم مضمون سردار جعفری کی پیکر تراشی پر ہے۔ پیکر تراشی حقیقی شاعری کی جان ہے۔ تازہ کار اور نادر پیکر تراشی اچھی شاعری کی سب سے بڑی اور نمایاں پہچان ہے۔ رفیعہ شبنم نے سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی کا جو تخلیقی عمل پایا جاتا ہے اس کا نہایت کامیاب اور بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیہ کی روشنی میں سردار جعفری کی شاعری کا منفرد اور نمایاں کردار پوری طرح ابھر کر سامنے آتا ہے اور ان کی عظمت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ سردار جعفری نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر رفیعہ شبنم اس عہد کے چند اور شاعروں کی پیکر تراشی پر الگ الگ مضامین لکھ کر آخر میں ایک مضمون تقابلی اس میں شامل کردیں تو ایک نئے موضوع پر ایک اچھی کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اس مجموعہ کے دو اور کامیاب مضمون ہیں۔ "اقبال کی شاعری کا عالمی ہیرو" اور "فراق گورکھپوری اور رات" اقبال پر ان کا جو مضمون ہے اس میں انہوں نے بڑی محنت اور غور وفکر سے کام لے

کر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اقبال کے یہاں جو عالمی ہیرو کا تصور ملتا ہے وہ دراصل امام حسین علیہ السلام کا عظیم کردار ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اقبال کے کلام سے اتنے سارے حوالے پیش کئے ہیں کہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ فراق کی شاعری میں رات اپنی گوناگوں کیفیات کے ساتھ مختلف الجہات پیکر میں ابھرتی ہے۔ رفیعہ شبنم نے اچھوتے انداز میں فراق کی شاعری کے صحیح تناظر میں اس کا تجزیہ کیا ہے۔ جس سے فراق کی شاعرانہ عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ بیدی، جگر اور حسرت پر جو مضامین ہیں ان میں فکر و نظر کی وہ شگفتگی اور تازگی نہیں ملتی جو محولہ بالا مضامین میں پائی جاتی ہے۔ رفیعہ شبنم کے مضامین روشن امکانات کا پتہ دیتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں ایسی ناقدانہ بصیرت کا احساس ہوتا ہے جو ادبی تخلیقات کی اصل بنیادوں تک پہنچنے اور کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اپنے خیالات، نظریات اور نتائج کو واضح اور دلکش انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی ان کو آتا ہے۔ کتابت اور طباعت کے اعتبار سے یہ مجموعۂ مضامین اطمینان بخش کہا جا سکتا ہے۔

کتاب :۔ حصارِ شب (شعری مجموعہ)
فن کار :۔ اظہار سلیم
تقسیم کار :۔ اظہار سلیم، جامعہ روڈ، مسلم نگر، مالیگاؤں
مبصر :۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ
قیمت :۔ دس روپئے

"حصارِ شب" نوجوان شاعر اظہار سلیم کی شعری تخلیقات کا مجموعہ ہے جن میں غزلوں کے علاوہ چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ اسے غزلوں کا مجموعہ کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہیں ہوگا۔ یوں بھی اظہار سلیم کا شعری مزاج غزل کی صنف سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس مجموعہ میں ان کی کچھ ایسی غزلیں شامل ہیں جن کی پوری فضا روائتی اور رسمی انداز کی ہے۔ مثلاً

غم ان کو راس دل کو بصد ناز آگیا
یعنی اب ہم کو جینے کا انداز آگیا

وفا کے نام پہ کیا کیا سلوک تم نے کیا
کہ دل سے ہوک اٹھی چیر کر جگر نکلی

اس نوع کے اشعار محض مشق و مزاولت کا پتہ دیتے ہیں جن میں کوئی ایسی انوکھی ادا نہیں جو دل یا دماغ کو اپنی طرف کھینچ سکے لیکن ان کے یہاں ایسی غزلیں زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ بیشتر حصہ ایسی غزلوں پر مشتمل ہے جن میں ایک طرح کی تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں تجربات کی سچائی اور اظہار کے نئے پن دونوں کا پتہ چلتا ہے۔

زرد لمحات کی دھند چھائی ہوئی
خشک موسم کی اڑتی مہک اور میں

جلتی ریت ہے آنکھوں میں
خوابوں کے احسان کہاں

تمام منظر دیکھے ہیں مگر پھول اگتے ہیں راستوں میں
نہ جانے کب سے یار رشتہ تمھارے رشتوں سے کٹ چکا ہے

ایسے اشعار میں فن کار کی اپنی شخصیت کا نقش ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ندرت اور انفرادیت کے باوجود ان کی شاعری پر ایک گھٹی گھٹی سی کیفیت طاری نظر آتی ہے۔ کاش وہ حصارِ شب سے نکل کر زرنگار سحر کی جلوہ سامانیوں کی تاب لانے کا حوصلہ بھی رکھتے! اپنی ایک نظم "ایک سوال" میں وہ اس موڑ تک ضرور پہنچ گئے جہاں انسان کی بےحسی پر ان کو سخت حیرانی ہے۔ یہ

(بقیہ صفحہ)

سواد و صوت

محترمی تسلیمات!

امیر حیدر ملک ادبی ایوارڈ کے انعامی بورڈ نے میری کتاب "سلطان شیر شاہ سوری" کو جو قدر و منزلت عطا کی ہے میں اس کے لئے آپ سب کا ممنون ہوں لیکن کچھ اسباب کی بنا پر میں یہ انعام و اعزاز قبول کرنے سے مجبور ہوں۔ یوں بھی اس کے قبل ملک کے دوسرے اہم ادبی ادارے اس کتاب کو انعامات سے نواز چکے ہیں۔ میرے لئے وہی بہت ہے ۔۔۔ اور آپ لوگوں کی محبت ۔۔۔ امید ہے آپ اس مکتوب کو اپنے موقر اخبار "موجِ" اور ماہنامہ آہنگ میں شائع فرما دیں گے۔

نیازمند ڈاکٹر حسن آرزو

نوٹ :۔ ہم حسن آرزو صاحب کے درویشی کے قائل ہیں اور ان کی بات اٹھا نہیں سکتے۔ اس لئے ان کے سلسلے میں ہمارے ایوارڈ کے اعلان کو منسوخ کیا جاتا ہے۔

چیرمین کلچرل اکیڈمی

محترمی! تسلیم

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

آہنگ (اپریل ۸۴ء) کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔

آہنگ ادب و تہذیب کو تیز رفتاری کے ساتھ ارتقاء کے معراج کی جانب لئے جا رہا ہے۔ اس کے لئے آہنگ پریوار کی محنت قابل ستائش ہے۔

قارئین

اداریہ بہت خوب ہے۔ ادب میں وابستگی فنکار کے ذہن کو محدود کر دیتی ہے۔ فنکار کا کام سماج سدھارک کا نہیں ہوتا اور بقول شخص :۔

"ادب کسی بزرگ کی خانقاہ نہیں ہے جہاں بغیر ٹوپی پہن کر جانا منع ہو۔"

آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ "اسلامی ادب" کسی جماعت کی وقتی ضرورت ہو سکتی ہے۔ مگر ادب کا رتبہ اسے نہ مل سکا ہے نہ مل سکے گا۔

"آس پاس" (رباعیات) کا سلسلہ جاری رکھئے۔ شعری حصہ میں حسن نعیم، وہاب دانش، اور مشہود رسول کی غزلیں اچھی ہیں۔

آفاق حیدر، بنگلہ دیش

برادرِ محترم کلام صاحب! تسلیم

ایک عرصہ بعد آپ سے شرفِ تخاطب حاصل کر رہا ہوں۔ آہنگ پابندی سے زیر مطالعہ ہے۔ اکثر خیال آتا رہا کہ آپ کو خط لکھوں اور کچھ تخلیقات آہنگ کے لئے بھیجوں، لیکن لاپرواہی سے ایسا نہ ہو سکا۔ یوں بھی سوائے "شاعر" کے کئی برسوں سے کسی ادبی پرچہ میں میری کوئی تخلیق شائع نہیں ہوئی۔

عرصہ دراز کے بعد مخاطبت پر اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ آپ کی نذر کرتا ہوں۔

ایک مدت سے کٹی ہے ترکِ تعلق تم سے
ایک مدت سے رہا تجدید کے طالب ہم بھی

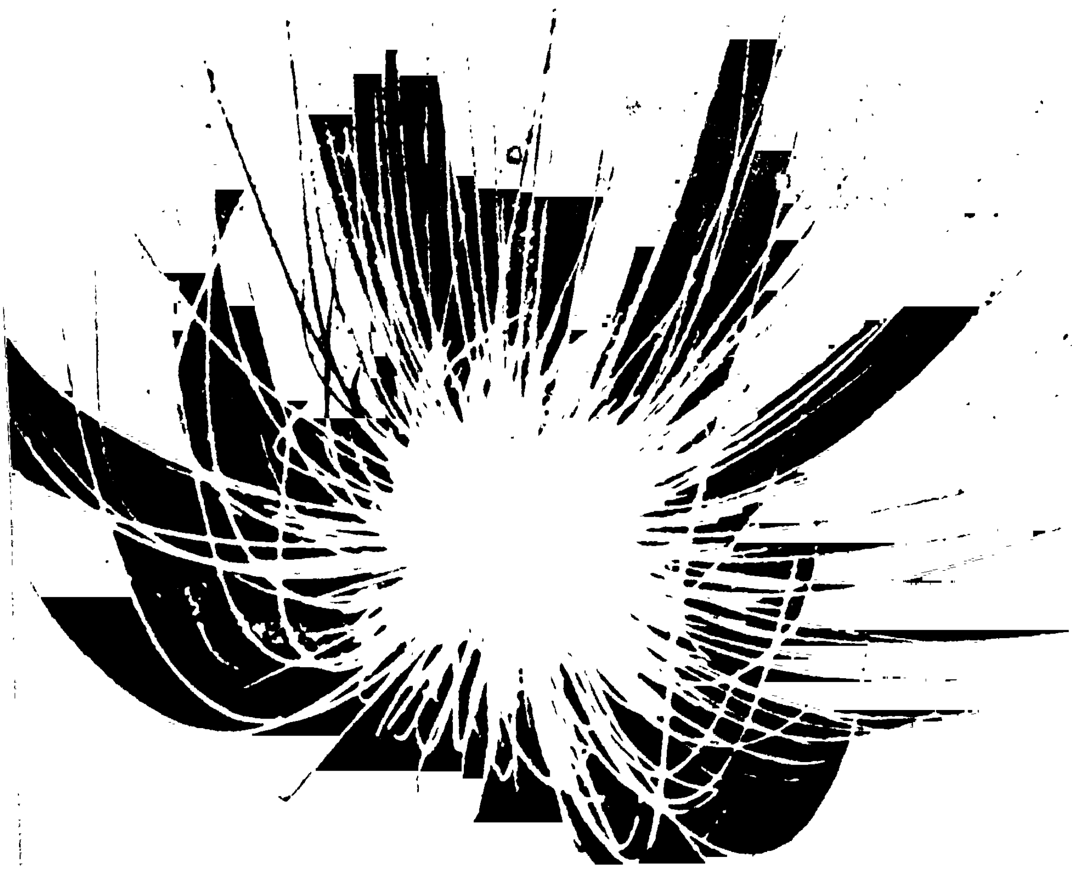
خدا کرے، آپ مع الخیر ہوں۔ اور اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں حسبِ سابق انہماک سے مشغول بھی ۔۔۔ اور ماہنامہ آہنگ سے تمام رفقاء کو سلام و نیاز

نیازمند - حامد اکمل، گلبرگہ

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. N. S. 1964

THE Aahang Urdu Monthly

The Cultural Academy Budh Gaya



PRICE 3/-00

JUNE 1984

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے چھتیس روپے

ایک شمارہ تین روپے

فون ۳۳۲

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشاہ حق، عبدالصمد

کتابت:۔ سید شمس الاحد گیاوی

محتویات

اداریہ

کشکول

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ اردو کتابوں کی قیمتیں بہت زیادہ رکھ دی جاتی ہیں اس لئے ان کی کھپت جلدی نہیں ہو پاتی۔ ایسی بھی کتابیں ہیں جن کی قیمت سو روپئے اور حد ہے کہ پانچ سو روپئے تک رکھ دی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض کسی اردو اکیڈمی کے مالی تعاون (جزوی ہی سہی) سے شائع ہوتی ہیں اور پھر ان پر انعامات بھی مل جاتے ہیں ـــــ گویا ایک کتاب کا، معترض کی نگاہ میں دو تین ہزار روپئے کا نفع مصنف کو ہو جاتا ہے۔ اور معترض بغیر کہے ہوئے گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ بھئی آگے بڑھو ـــــ اب اس سے زیادہ "خیرات" کیا مل سکتی ہے؟ مگر نہیں معترض کو یہ احساس بھی ساتھ ساتھ ہوتا ہے کہ اتنے کم منافع پر زندگی بسر نہیں کی جا سکتی تو وہ تجویز کرتا ہے کہ آخر مصنف کتابوں کے ذریعے ہی کمانے کھانے پر کیوں تلا ہوا ہے، اسے چاہئے کہ سبزی باغ میں موسمی پھلوں کی دوکان کر لے، مونگ پھلی کے ٹھیلے پر محلے محلے جاکر مونگ پھلی بیچے، درزی بن جائے، لکھنوی کرتے کی دوکان کھول لے اور یہ سب نہ ملے تو کسی کالج کا اردو لکچرر ہو کر طلبا کی عاقبت خراب کرے یا راشٹ بھاشا پریشد کا ممبر بننے کے لئے منسٹروں، چیف منسٹروں اور سابق منسٹروں کا چمچہ بن جائے ـــــ کوئی فورم، اردو کے نام پر بنا کر ہزاروں ہزار کا گرانٹ لے کر "ادیب" ہونے کا اعلان کر دے اور مختلف بورڈ اور کمیٹیوں کا ممبر بن کر اپنی ریاست اور ریاست کے باہر کا ٹور سکنڈ کلاس میں کرے اور A.C فرسٹ کلاس کا بنائے۔ دہلی میں ادیبوں کی کانفرنس کرے اور افتتاح اندرا گاندھی یا راجیو گاندھی یا کسی مرکزی وزیر سے کرائے، ستر سال سے اوپر

کے چند سرکاری صحافیوں کے علاوہ باقی سو پچاس ادب و زبان سے قطعاً ناواقف لوگوں کو جمع کر لے ــــ

غرض کسی طور پر تو کما کھائے مچھندر ـــ!

دقت یہ ہے کہ ایسی اور اتنی ضمیر فروشی کم لوگوں کے بس کی بات ہے۔

معترض نے یہ بھی لکھا ہوتا کہ اردو اکیڈمی میں دو وائس چیئرمین ایک سکریٹری اور دیگر ملازمین کی فوج رکھ کر اردو کی کتنی خدمت ہو رہی ہے ۔ یہ ریٹائرڈ لوگوں کی "پناہ گاہ" اور "راحت گاہ" بنا کر اردو زبان کی کتنی ترقی ہو رہی ہے. گرانٹ کی آدھی رقم بعض اردو اکیڈمیوں پر خرچ کرکے اردو کی کتنی ترویج و اشاعت ہو رہی ہے ؟

سرکاری خرچ پر چھپتے ادیبوں کی کتابوں کا جشن اجرا کرکے اردو کی بھلائی کیسے ہو رہی ہے ؟

یہ غیر ادبی اور مخصوص معیار کے پیش نظر "ان پڑھ" لوگ بعض اردو اکیڈمیوں کی مجلس عاملہ میں رہ کر کون سی تاریخی خدمت انجام دے رہے ہیں؟

باخبر

آس پاس

اس عنوان کے تحت پیش کئے گئے اقتا
کی ادارتی تحریک کا ثبوت جو ہم مہیا کرتے ہیں۔
پوری ذمہ داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ا
میں ایسے سیاسی مطالعوں کا رواج کہاں تک آ

ناگزیر

پنجاب کے مسئلے پر بالآخر مرکزی حکومت کو سخت رویہ اپنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ دہشت پسندوں سے نپٹنے کے لئے وہاں فوج طلب کر لی گئی۔ اور اس نے گولڈن ٹمپل میں بالخصوص اور پورے ریاست پنجاب میں بالعموم جس طرح اپنا بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا، وہ بہت لائق تحسین ہے۔ ہندوستانی مسلح افواج نے ہمیشہ الفت پر ثابت قدمی کی جو شاندار مثال قائم کی ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ گولڈن ٹمپل میں جب فوج گئی تو محفوظ ٹھکانوں میں چھپے ہوئے دہشت پسندوں نے بڑی آسانی کے ساتھ اسے اپنا نشانہ بنایا۔ بہت سے جوانوں کی جانیں گئیں۔ دہشت پسندوں کے پاس جدید ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ بہترین قیادت تھی۔ خود ہندوستانی افواج کے چند اعلیٰ افسران، گولڈن ٹمپل میں انہیں ٹریننگ دینے کے لئے موجود تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود ڈسپلن کی پابندی کرتے ہوئے انہیں جو بے مثال کامیابی ملی، وہ اظہر من الشمس ہے۔

پنجاب میں فوجی کارروائی ناگزیر ہو گئی تھی۔ پوری ریاست میں دہشت کا بول بالا تھا۔ پولیس اور انتظامیہ کی ساری تدبیریں بیکار ہو گئی تھیں۔ ہ
بے گناہ لوگ کتوں کی طرح مارے جا رہے تھے
حال یہ تھی کہ اگر کسی نے غلطی سے بھی اپنی زبا
دی جو دہشت پسندوں کو پسند نہیں آئی تو فوراً
کی جان گئی۔ آج کے دور میں اختلاف رائے کی
گنجائش موجود ہوتی ہے۔ دور جاہلیت میں با
اور راجاؤں کے خلاف جو زبان کھولتا تھا۔ اس
گدی سے کھینچ لی جاتی تھی۔ زیادہ نافرمانی کی صو
میں اس کے گھر بار کو اکھاڑ کے اس پر ہل چلا
جاتے تھے۔ ابھی امرتسر میں سکھ سمپلیہ
پی کے گھر کو جس طرح برباد کیا گیا، کیا بربریت کی
سے بڑی کوئی مثال مل سکتی ہے۔ ان کا قصور کی
۱۹۸۱ء میں لالہ جگت نرائن کے قتل کے سلسلے
انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر سنت جرنیل س
بھنڈراں والے کو گرفتار کیا تھا۔ ہریت لڑی کے
کو اس جرم میں قتل کیا گیا کہ انہوں نے اپنی داڑھ
رکھا تھا۔ ان کے ایک ہشتمار کو سکھ رسومات کا
تھا اس لئے مار دیا گیا کہ اس کی پریت لڑی کے
سے وابستگی تھی۔ راجیہ سبھا کے ممبر دی۔ این تیواری
کے لئے اس لئے تھا خاموش کر دیا گیا کہ وہ ہندو تھے

علمبردار تھے۔ انہوں نے ایک سکھ عورت سے شادی کر رکھی تھی۔ اکال تخت کے سابق جتھے دار کو اس لئے قتل کر دیا گیا کہ انہوں نے دہشت پسندوں کے ساتھ کہیں جانے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ سب واقعات ایسے نہیں ہیں جن سے بے توجہی برتی جائے، ایسے واقعات ہمارے مذہب سماج کے منہ پہ زور دار طمانچہ ہیں۔ انتظامیہ کی پریشانی یہ تھی کہ گردوارے مجرموں اور قاتلوں کے اڈے بنے ہوئے تھے جہاں پولیس کو جانے کی اجازت نہ تھی کیونکہ ملک سیکولر ہے جہاں ہر فرد کو اپنی پسند کے مذہب کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی پوری آزادی ہے۔ گولڈن ٹمپل میں غیر ملکی ہتھیار بڑے پیمانے پر جمع کئے گئے۔ ٹرانسمیٹر نصب کیا گیا، غرض یہ کہ ہر طرح کی مجرمانہ اور غیر قانونی حرکتیں کی گئیں۔ یہ صورت حال ملک اور قوم کے لئے بہت ہی تشویشناک تھی۔ پنجاب ایک سرحدی ریاست ہے جس کے اس طرف پاکستان ہے جو ہندوستان کو تنگ کرنے کا کوئی موقع بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اگر مرکزی حکومت، فوجی کاروائی میں ذرا بھی تاخیر کرتی تو پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جاتا، اس کی ساری ذمہ داری حکومت ہی پر آتی۔ اکالی دل نے اپنی چند مانگوں کو لے کر حکومت کے خلاف مورچہ لگایا۔ وہ ایک سیاسی جماعت ہے اور برسراقتدار جماعت کے خلاف وہ کوئی سیاسی حربہ اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن ہوا یوں کہ اس کی قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھوں سے چھین کر انتہا پسندوں اور دہشت پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جن کا مقصد توڑ پھوڑ اور ہنگاموں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بہرکیف، اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندو سکھ اور مسلمان اپنی قومی ذمہ داریوں کو سمجھیں، ایک دوسرے کے زخموں پر مرہم رکھیں اور ملک کے مفاد کو ہر حال میں مقدم رکھیں۔

پرانا قصہ

ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم بھیونڈی اور بمبئی کے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں کون سی رائے کا اظہار کریں۔ یہ فسادات تو ہماری قومی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں جن سے چھٹکارا پانا مشکل ہے، ہر جگہ ایک جیسی کہانی دہرائی جاتی ہے۔ کوئی چھوٹی سی بات فساد شروع کرنے کا بہانہ بنتی ہے اور پھر جب فساد شروع ہوتا ہے اور اپنے عروج کو پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ فساد کی تیاریاں تو بہت دنوں سے ہو رہی تھی کیونکہ جس منظم ذریعے سے یہ کاروائی ہوئی ہے۔ اس کی تیاری اچانک نہیں شروع ہو سکتی۔

شیوسینا کے سربراہ شری بال ٹھاکرے، بہت دنوں سے مسلمانوں کے لئے اپنے اندر بغض رکھتے ہیں۔ وہ بہت دنوں سے اس قوم کے بارے میں اپنے حقارت آمیز خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے کچھ زیادہ ہی شدت کا رویہ اختیار کیا۔ پالی ہل بمبئی کے ایک روڈ کا نام نرگس دت مارگ، رکھا گیا، نام کی تختی پر سبز روشنائی کا استعمال کیا گیا۔ بال ٹھاکرے کو اس معصومانہ کاروائی میں زبردست ملک دشمنی چھپی نظر آئی۔ نرگس ـــ فلم ایکٹریس، ایک مسلمان عورت تھی جس نے ایک ہندو سنیل دت سے شادی کی تھی۔ اس نے مرتے دم تک مہروفا کو پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ ملک اور قوم پر جب بھی کوئی مصیبت آئی۔ یہ میاں بیوی اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ سینہ سپر ہو گئے۔ نرگس کو ان کی بے لوث خدمات کے لئے راجیہ سبھا کا ممبر بھی نامزد کیا گیا تھا۔ لیکن بال ٹھاکرے نے

ہر فرقہ پرست کو یہ سب روشن باتیں کیسے نظر آسکتی ہیں۔ ان کے لئے تو یہی کافی تھا کہ نرگس، مسلمان تھی اور مسلمان کو بال ٹھاکرے کینسر کہتے ہیں۔

ہمیں حیرت اس پہ ہے کہ بال ٹھاکرے ایک مشہور کارٹونسٹ ہیں۔ ایک فنکار کا دل رکھتے ہیں۔ فنکار کا دل تو سمندر سے بھی زیادہ وشال ہوتا ہے۔ بال ٹھاکرے آخر کیسے فنکار ہیں جو معصوم اور بے گناہ لوگوں کی گردنیں کٹوا دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ایک ماں کے سامنے اس کے نوزائیدہ بچے کو قتل کر دیا جاتا ہے، ایک نئی نویلی دلہن کا سہاگ اس کی آنکھوں کے سامنے لٹ جاتا ہے، ایک ہرا بھرا گھر برباد کر دیا جاتا ہے، ایک ہنستے کھیلتے سماج میں آگ لگا دی جاتی ہے اور ایک فنکار یہ سب کرا کے اور دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ اگر بال ٹھاکرے واقعی فنکار ہیں، تب تو فنکار کی تعریف کو بدل دینے کی ضرورت ہے کیونکہ پھر آخر فنکار کے کیا معنی ہوتے ہیں۔

اس فساد میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو نئی کہی جائے۔ پولیس اور انتظامیہ حسب معمول اس پر قابو پانے میں ناکام رہی اور فساد اسی وقت رک سکا جب وہاں فوج طلب کر لی گئی اور وزیر اعظم نے بہ نفس نفیس بربادیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ریاستی وزیر اعلیٰ نے عدالتی جانچ کرانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس قسم کے فساد کی انتظامیہ جانچ (ADMINI-STRATIVE ENQUIRY) کرائی جاتی ہے جس کی رپورٹ کا کبھی پتہ ہی نہیں چلتا۔ مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ نے انتظامی جانچ کرانے کا اعلان کیا ہے لیکن ہوگا یوں کہ لوگ رفتہ رفتہ اس فساد کو بھی بھول جائیں گے اور جب دوسری جگہ بھی فساد ہوگا تب وہاں بھی یہ کہانی دہرائی جائے گی۔

★

گیا

ہنگ

نادم بلخی

چھوٹا ناگپور پر اردو زبان و ادب کا اثر

نوٹ ـــــــ [نادم بلخی - یہ نام ایسے کام کرنے والے کا ہے جو کام کو ہی کام کا انعام سمجھتا ہے ۔ تحقیق کا حق ادا کرنے والے ہی سمجھیں گے کہ یہ مقالہ کیا حیثیت رکھتا ہے - کلام حیدری]

چھوٹا ناگپور کا شمار بہار کے پچھڑے علاقوں میں ہوتا ہے ۔ اس سے کئی اضلاع کا تعلق ہے اور ہر ضلع کی بیشتر آبادی آدی باسیوں پر مشتمل ہے جن کی اپنی الگ الگ قبائلی بھاشائیں ہیں ۔ چھوٹا ناگپور میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کا جہاں تک تعلق ہے اس پر تحقیقی کام بھی ہو چکے ہیں ۔ خصوصی طور پر رانچی یونیورسٹی سے دو حضرات اپنا مقالہ پیش کرکے پی ایچ ڈی ، کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں ۔ ایک ڈاکٹر شمیم الدین ، لکچرر جنتا کالج ڈالٹین گنج اور دوسرے ڈاکٹر صدیق مجیبی ہیں ۔ شمیم صاحب کے مقالے کا عنوان "چھوٹا ناگپور میں اردو افسانے کا ارتقا" ہے اور مجیبی صاحب کا موضوع "چھوٹا ناگپور میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" ہے

تحقیق و جستجو سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹا ناگپور میں اردو زبان و ادب کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں ہے ۔ گرچہ یہ زبان عہد مغلیہ ہی سے اس علاقہ پر اپنا اثر ڈالنے لگی تھی ۔

ڈاکٹر نرمدیشور صاحب کی کتاب لینڈ اینڈ پیپل آف ٹرائبل بہار (LAND AND PEOPLE OF TRIBAL BIHAR) ۔ کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا ناگپور میں لگ بھگ انتیس ۲۹ قبائیلی بھاشائیں بولی جاتی ہیں ۔ وہ ان کی بھاشاؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے جو ٹیبل پیش کرتے ہیں اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان قبائیلی بھاشاؤں کا تعلق مختلف لسانی نسلوں سے ہے ۔ ان میں تیرہ ایسی ہیں جن کا تعلق آسٹرو ایشائی نسل (AS-TRO ASIATIC RACE) سے ہے ۔ چار کا تعلق ڈراویڈی نسل (DRAVEDIAN RACE) اور باقی بارہ بھاشاؤں کا تعلق ہند آریائی نسل (INDO ARYAIN RACE) سے ہے ۔ وہ حسب ذیل اس طرح ہیں :-

قبیلہ کا نام	ان کی مادری بھاشا	وہ زبان جس سے ان کی بھاشا کا تعلق ہے
(۱) اسور (ASUR)	اسوری	اسٹرو ایشائی
(۲) برہوا (BIRNR)	منڈری شاخ کی ایک بولی	"
(۳) بھونج (BHVNJ)	منڈاری / سدانی	ہند آریائی مخلوط

قبیلہ کا نام	ان کی مادری بھاشا	وہ زبان جس سے ان کی بھاشا متعلق ہے
(۴) ہو (HO)	ہو	اسٹرو ایشیائی
(۵) کرمالی (KARMALI)	کرمالی	"
(۶) کروا (KORWA)	کروا منڈاری کی ایک شاخ	"
(۷) کورا (KORA)	منڈاری کی ایک شاخ	"
(۸) کھریا (KHARIA)	کھریا	"
(۹) منڈا (MUNDA)	منڈاری	"
(۱۰) سوار (SEVAR)	کھریا	"
(۱۱) محلی (MAHLI)	محلی	"
(۱۲) سنتھالی (SANTHALI)	سنتھالی	"
(۱۳) چیرو (CHERO)	اپنی کوئی بولی نہیں بلکہ پڑوسی منڈاری بولی	" ہی کی شاخ ہے
(۱۴) بیگا (BAIGA)	سدانی (SADANI)	ہند آریائی
(۱۵) بنجرا (BANGRA)	"	"
(۱۶) بیدا (BAIDA)	"	"
(۱۷) بھنجیا (BHUNJIA)	"	"
(۱۸) برجیا (BIRJIA)	سدانی اور بنگالی مخلوط	"
(۱۹) چک بریک (CHIKBRAIK)	سدانی	"
(۲۰) گرویت (GORAIT)	"	"
(۲۱) کھروار (KHARWAR)	"	"
(۲۲) کسن (KISAN)	"	"
(۲۳) لہرا (LOHKA)	"	"
(۲۴) پرہیا (PARAHYA)	"	"
(۲۵) بھٹوڈی (BHATUDI)	مخلوط	"
(۲۶) گونڈ (GOND)	گونڈ	ڈراویڈی
(۲۷) مال پہریا (MALPAHRIA)	مالتو	"
(۲۸) اراں (ORAON)	کرکھ (KURUKH)	"
(۲۹) سوریا پہریا (SURIAPAHRIA)	مالتو (MALTU)	"

مذکورہ بالا تمام بھاشاؤں پر کھڑی بولی کا اثر ہے جس کا اردو کے ساتھ چولی اور دامن کا واسطہ ہے۔ ڈاکٹر

گیا

آہنگ

شاد نے اپنی کتاب میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لگ بھگ چھوٹا ناگپور کی تمام قبائیلی بھاشاؤں نے ہندی اثر
ل کیا ہے یعنی یہ الفاظ ہیگر ان پر کھڑی بولی کے اثرات ہیں جس کا اردو سے گہرا تعلق ہے ۔ ان بھاشاؤں کا اپنا کوئی
ص رسم الخط نہیں لیکن کچھ نہ کچھ اپنا ادبی مزاج ضرور ہے ۔ ان کے ادبی سرمایوں کو انگریزوں نے رومن رسم الخط
محفوظ کیا اور آج دیوناگری رسم الخط میں بھی ان کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے ۔ موقع نہیں کہ اس پہلو پر تفصیل سے
شنی ڈالی جائے ۔ کرنل ڈاسٹن کی کتاب انتھولوجی آف بنگال، اضلاع چھوٹا ناگپور کے تمام گزیٹر، ڈاکٹر نرمدیشور
پشاد کی مذکورہ بالا کتاب، جی استھا کی کتاب بھارت کے دارشنک استھان اور ان کے علاوہ بہت ساری کتابیں
ہیں جن سے اس علاقے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے ۔

چھوٹا ناگپور میں اردو زبان و ادب کے موضوع پر تو کچھ کام ہو بھی چکے ہیں لیکن اس کا ایک اہم ضلع پلاموں
جسے ہم کہتے ہیں اس طرف ابتک ہمارے تحقیق کی بھرپور نگاہیں نہیں اٹھی ہیں ۔ لہذا اس پہلو پر روشنی ڈالنا
سردست میں ضروری سمجھتا ہوں

ضلع پلاموں سے متعلق مواد فراہم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حسب ذیل کتابیں مدنظر رکھی جائیں ۔

(۱) انڈیا اینڈ دی جمبو لینڈ مصنفہ امرناتھ داس
(۲) ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ ان بہار از ڈاکٹر کے . کے . دتا
(۳) ہنٹرس اسٹیٹکل اکاونٹ پرگنہ
(۴) بہار تھرو دی ایجیز از آر . آر . دیواکر
(۵) پلاموں گزیٹر از ال . ایس ، اے
(۶) " " " پی . سی ٹیلنٹ (۱۹۰۷)
(۷) ڈپٹی کمشنر آف کی قدیم دستاویزیں
(۸) سنج کی رپورٹ
(۹) پلاموں کی تاریخی سرگزشت، مضمون فصیح الدین بلخی شائع شدہ کوئل ڈالٹین گنج
(۱۰) پلاموں کا اتہاس از رام دین پانڈے
(۱۱) پلاموں کا سانسکرتک ادھین از ہولداری رام گپتا
(۱۲) کوئل ندی کے کنارے کنارے از مہابیر ورما
(۱۳) احوال حسین آباد از ابوالاعجاز سید نوروز محمد عرف شریف حسین شریف
(۱۴) ۱۸۵۷ ان بہار ۔ چھوٹا ناگپور، سنتھال پرگنہ از پی . سی . رائے چودھری
(۱۵) پلاموں گزیٹر ۔ از پی . سی . رائے چودھری ۔
(۱۶) اراؤ ریلیجن اینڈ کسٹم از ایس سی . رائے
(۱۷) منڈا اینڈ دیئر کنٹری از ایس . سی . رائے

(۱۸) آر۔ ایس فوربس سٹلمنٹ رپورٹ ۱۸۷۲ء از فوربس
(۱۹) ڈی۔ ایچ۔ ای سنڈرس سٹلمنٹ رپورٹ ۱۸۹۵ء از سنڈر
(۲۰) سم سائیڈ لائٹ آن دی چیرو رولرس آف پلاموں از بی ویرو تم
(جرنل آف دی ہسٹوریکل ریسرچ جلد اول حصہ اوّل رانچی ۱۹۵۸ء)
(۲۱) سول ریبلین ان انڈین میوٹنی (۱۸۵۷ء) از ایس بی چودھری
(۲۲) حکومت کی جانب سے شایع شدہ مردم شماری کی تمام رپورٹیں

ریاستی سروے (۱۹۶۱ء) کے مطابق پلاموں ضلع کا رقبہ ۴۹۱۴ مربع میل یعنی ۱۲۷۲۷ مربع کیلومیٹر ہے اور سروے آف انڈیا کے مطابق ۴۹۲۵ مربع میل یعنی ۱۲۷۵۶ مربع کیلومیٹر ہے۔ دونوں سروے کی رپورٹ کے اپنے خاص ذرائع ہیں۔ لہذا ایک ہلکا سا فرق ۱۱ مربع میل کا ہے۔ پلاموں کا رقبہ صوبہ کے کسی دوسرے ضلع کے رقبہ کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے اس طرح پورے صوبہ کے رقبے کا جہاں تک تعلق ہے ۷۳۴، فیصد کی حیثیت پلاموں کا رقبہ رکھتا ہے۔ چنانچہ صوبہ کے تمام ضلعوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ رانچی، ہزاریباغ، سنتھال پرگنہ اور سنگھبھوم کے بعد پانچویں حیثیت نظر آتی ہے۔ پورے ملک کے ۳۲۸ ضلعوں میں پلاموں کا مقام اس اعتبار سے چوسٹھواں (64 th) ہے۔ اس کا رقبہ پورے تریپورہ یونین ٹیری ٹوری کے رقبہ (10666 K.M) سے بھی بڑا ہے۔ اور سکم کے رقبہ (7299 S.K.M) کا لگ بھگ ۱/۲ حصہ ہے۔ ملکوں کے مقابلے میں پلاموں ضلع کا رقبہ نیدر لینڈ کے رقبہ (33612 S.K.M) کا لگ بھگ ۱/۴ حصہ ہے اور لنکا کے رقبہ (65610 S.K.M) کا قریب قریب ۱/۵ حصہ رقبہ کے اعتبار سے ہے۔

(Dist. Cincus Hank-Book (1961) Plamu Vol 13 Page VIII)

آبادی کا جہاں تک تعلق ہے چھوٹا ناگپور کا یہ ضلع بھی اس کے دوسرے اضلاع کی طرح ایک ایسا علاقہ ہے جس کی آبادی میں اکثریت قبائیلیوں کی ہے۔ چیرو، اراؤں، کھروار، کوروا، پرہیا، برہوا، برجیا، منڈا، کھریا، بھگتا وغیرہ قوموں کے لوگ آباد ہیں۔ چیرو، اراؤں اور کھروار قوموں کا جہاں تک تعلق ہے ہر ایک کو فاتح، صاحب حکومت اور قلعہ رہتاس کے بانی ہونے کا دعویٰ ہے۔ کھروار قوم کو راجہ پرتاپ دھول کے کارناموں پر فخر ہے جو غالباً بارہویں صدی عیسوی کا حکمران تھا۔ اراؤں قوم کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ کرناٹک (دکن) سے آکر یہاں آباد ہوئی اور قلعہ رہتاس کی تعمیر کی۔ ان پر مسلمان ایک عرصہ تک فتح نہیں پا سکے۔ ۱۵۳۸ء کے قریب شیر شاہ نے مہارتو نامی چیرو سردار کو سر کر کے گرینڈ ٹرنک روڈ کو ان کے حملوں سے محفوظ کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چیرو قوم نے کسل خاندان کے راجپوت راجہ کو ہرا کر پلاموں پر قبضہ کیا۔ مختصر یہ کہ پلاموں کی باضابطہ تاریخ چیروں خاندان کے راجاؤں ہی سے شروع ہوتی ہے۔ جن کی برابر مسلمان حکمراں سے جنگیں ہوتی رہیں۔ اس خاندان سے پانچویں راجہ سبل رائے نے مسلمان فاتحوں کو کافی ہزیمت پہنچائی آخر کار گرفتار کر کے دلی لے جایا گیا جس کی بہادری کا حال سن کر بادشاہ نے اسے شیر سے لڑوایا تھا۔ اس کا بیٹا بھاگوت رائے اول پلاموں پر قابض ہوا صدق رائے اس

گیا

...ندان کا مشہور و معروف راجہ گذرا ہے۔ جس نے چھوٹا ناگپور کے راجہ کو شکست دیکر اس کی راجدھانی کو برباد کیا۔ راجہ پرتاب رائے کو اورنگ زیب کے عہد میں بہار کے گورنر داؤد خاں نے شکست دی۔ ...لفضل عہد اکبری میں پلاموں کے ایک پرگنہ جپلا کا ذکر کرتا ہے جو بعد میں حسین آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ ...ک جہانگیری صفحہ ۱۴۹ اور صفحہ ۳۵۳ میں یہ بھی لکھا ہے کہ پلاموں میں ہیرے کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ شاہ جہاں کے عہد کی تاریخوں میں بھی پلاموں کا ذکر ملتا ہے۔ شاہجہاں نامہ[1] صفحہ ۳۴۲ کے مطابق شائستہ خاں نے ۱۰۴۸ھ اور ۱۰۵۲ھ کے درمیان دو بار فوج کشی کی۔

پلاموں میں اردو فارسی کا اثر مغلوں کی فوج کشی کے بعد ہی سے پڑنا شروع ہوگیا۔ اس ضلع میں اردو اور فارسی زبان و ادب کا پہلا مرکز حسین آباد (جپلا) ہی نظر آتا ہے۔ تواریخ کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جپلا اور بلونجا پلاموں کے دو پرگنے تھے جو محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۰ھ تا ۱۱۶۲ھ) کے عہد میں نواب ہدایت علی خاں کو ملے۔ اور نواب ہدایت علی نے حسین آباد بسایا۔ یہیں سے اس کی تاریخی اہمیت شروع ہوتی ہے۔ پی سی رائے چودھری نے اپنی کتاب پلاموں گزیٹر میں یہ لکھا ہے کہ نواب موصوف نے حضرت امام حسین کے نام پر اس جگہ کا نام حسین آباد رکھا۔ حسین آباد کی تاریخ سترہویں صدی عیسوی کے اواخر سے شروع ہوتی ہے۔ فصیح الدین بلخی کی کتاب تاریخ مگدھ، ان کے مضمون پلاموں کی تاریخی سرگذشت مطبوعہ رسالہ کومل کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابوالاعجاز سید نو روز محمد عرف شریف حسین شریف کی کتاب احوال حسین آباد میں صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۳ درج ہے کہ نواب سید ہدایت علی خاں عین موسم گرما میں سفر کرتے ہوئے ایک درخت کے نیچے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ پناہ گزیں ہوئے۔ جس کا نام کرم تھا۔ چنانچہ نواب صاحب نے اس درخت کا نام سن کر یہ فرمایا کہ ہمارا کرم بھی اسی درخت کے ہمراہ ہے۔ فوراً حکم دیا کہ جنگل کاٹ کر اسے انسانوں سے آباد کیا جائے۔ (صفحہ ۱۱) چنانچہ قلعہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ دہلی سے رفقا اور عزیز و اقارب بلائے گئے۔ ہندو اور مسلمان بلا بلا کر آباد کئے گئے۔ تاریخ عماد السعادت کے مطابق نواب صاحب مورخ اور شاعر بھی تھے۔ (صفحہ ۱۶) ان کا انتقال ۱۷۶۵ء (۱۱۷۹ھ) میں ہوا۔ حسین آباد ہی میں دفن ہوئے۔ مزار اب تک موجود ہے۔ ان کے بعد ہندوستان کی ایک بڑی شخصیت ان کے بیٹے نواب غلام حسین خاں مصنف سیدالمناظرین کی ہے۔ ان کا اور ان کی شریک حیات واصلہ بیگم کا مزار بھی مع لوح مزار حسین آباد میں موجود ہے۔ غلام حسین خاں کو سیدالمناظرین کے مصنف ہونے کے سبب کون نہیں جانتا۔ سر جدو ناتھ سرکار نے ان پر تحقیقی مضمون جو میری نظر سے گذر چکا ہے ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ لکھا تھا۔ غلام حسین اپنے عہد کے ایک اچھے فارسی گو شاعر بھی تھے اور تخلص وفا کرتے تھے ان کا دیوان خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ جس کا ذکر قاضی عبدالودود مرحوم نے بھی کیا ہے (دیکھئے

---

[1] میرا ایک ریڈیو ٹاک رانچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو چکا ہے۔ اس کی سرخی "ضلع پلاموں پر ایک طائرانہ نگاہ" ہے۔ اس نشریہ میں ضلع پلاموں کی مختصر تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے لفظ پلاموں کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ میرا دوسرا ریڈیو ٹاک "ان کی صدائیں آتی ہیں" بھی رانچی ریڈیو اسٹیشن ہی سے نشر ہوا جو پلاموں فورٹ (Plamue Fort) کے تاریخی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

مقالات قاضی عبدالودود مطبوعہ بہار اردو اکیڈمی) اس کی اشد ضرورت ہے کہ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر
کی نظر ڈالی جائے اور علم و ادب کی دنیا میں انہیں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ شریف حسین کی کتاب احوال حسین
پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی خاندان کے ایک فرد پروفیسر طاہر رضوی مرحوم تھے۔ جو مقام حسین آ
۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ڈالٹین گنج ضلع اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے کلکتہ
گئے۔ ان کی انگریزی کتاب "پارسیز" کا فارسی میں ترجمہ پروفیسر مازندانی نے ایران میں کیا۔ ان کی دوسری کتاب
"خدمات ایران بہ اسلام" "یکسانی عقائد اسلامی وکیش وزرتشتی" "آیات قرآن" وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے
رضا شاہ پہلوی نے فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر دعوت دی اور بلوا کر تمغہ سے نوازا۔ ان کا ایک د
مطالعہ "فردوسی داروی" رسالہ سہیل خاص نمبر ۱۹۴۲ء میں میری نظر سے گذر چکا ہے۔ ان کی اہلیہ بیگم صفدر
سبزواری بھی ایک ادیبہ ہیں۔ کئی ناول لکھ چکی ہیں ایک ناول "خواب و بیداری" میری نظر سے گذر چکا ہے
نواب ہدایت علی خاں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے حسب ذیل اکابرین کا ذکر "احوال حسین آ
میں موجود ہے۔

غلام حسین خاں صفحہ ۱۳ تا صفحہ ۱۴، نواب سید علی نقی خان صفحہ ۱۴ تا صفحہ ۱۵ نواب سید علی خاں صفحہ ۱۵ تا ۱
وغیرہ۔ اس کتاب میں تمام اکابرین کے نسب نامے بھی موجود ہیں۔ حسین آباد سے تعلق رکھنے والی اور بھی قابل قدر
و شعری ہستیاں ہیں۔ مثلاً اسی خاندان کے حیات حسین طباطبائی ہیں جن کا ۱۹۷۳ء میں انتقال ہوا۔ یہ مشہور ش
سرپرکابری مرحوم کے شاگرد تھے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں ۱۹ عدد میری نظر سے گذر چکی ہیں۔ یہ بھی شعر
مجموعوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حال ہی میں میری نگاہ سے ان کے بہت سارے غیر مطبوعہ کلام گذرے ج
بیاضوں پر مشتمل ہیں۔ دو بیاض رباعی کی ہیں ایک نظموں کی، دو غزلوں کی باقی دو مشترکہ اصناف سے مت
چیزیں ہیں۔

لہ حسین آباد کی دوسری شخصیتوں میں مسرور حسین آبادی، غضنفر نواب دانش، رضا قاسم مختار مرحو
شریف حسین مرحوم وغیرہ ہیں۔ رسالہ ندیم اور سہیل کا جنہوں نے مطالعہ کیا ہوگا رضا قاسم مختار کے نام سے ضرو
ہوں گے مثلاً مہاراجہ رام نرائن موزوں پر ان کا مضمون سہیل کے خاص نمبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکا ہے
حیات حسین وفا حسین آبادی مرحوم پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے رجسٹریشن رانچی یونیورسٹی میں میرے زیر
ہوچکا ہے۔ اور الیاس انصاری ایم اے نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے۔

اب آئیے پلاموں کے صدر مقام ڈالٹین گنج پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ شہر ڈالٹین گنج کی عمر حسین آ
عمر کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ضلع کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ چیرو راجہ بھاگوت رائے کی حکومت ۱۶۳۰ء
۱۶۳۱ء تک رہی اس کے بعد اننت رائے کی حکومت ۱۶۳۱ء سے ۱۶۴۱ء تک رہی ۱۶۴۲ء میں
سپہ سالار شائستہ خاں نے اس پر چڑھائی کی۔ ۱۶۴۳ء میں پلاموں فورٹ مغلوں کے قبضے میں آ
کچھ دنوں بعد اننت رائے قلعہ پر پھر قابض ہو گیا۔ ۱۶۶۰ء میں داؤد خاں نے چڑھائی کی۔

... صرف چار ماہ کے لئے گوپال رائے گدی پر بیٹھا اس کے بعد سنہ ۱۶۶۲ء سے ۱۶۷۲ء تک مشہور چیرو حکمران مدنی رائے رہا جس کی حکومت تیرہ برسوں تک رہی اس کے بعد درگ پال رائے سنہ ۱۶۸۱ء سے ۱۶۹۷ء تک رہا۔ پرتاب رائے رہا۔ بھاپ رائے کے بعد درگ پال رائے سنہ ۱۶۸۱ء سے ۱۶۹۶ء تک رہا۔ اور اس طرح یکے بعد دیگرے کئی راجاؤں کا مختصر عہد رہا۔ رنجیت رائے کا عہد سنہ ۱۷۱۶ء سے ۱۷۲۲ء تک رہا اس کے بعد جے کشن رائے کا زمانہ آتا ہے اسی کے عہد میں ہندوستان کی مغل حکومت کا زوال شروع ہوتا ہے اس کے عہد میں مراٹھوں نے پلاموں کا راستہ دیکھا۔

لارڈ کلائیو کے عہد سے انگریزوں کی دخل اندازی پلاموں میں شروع ہو جاتی ہے۔ سنہ ۱۷۷۲ء میں جبکہ چیرو خاندان میں گدی کے لئے جھگڑا شروع ہوتا ہے تو جے کشن رائے نے رنجیت رائے کو قتل کر کے چھتر جیت رائے کو گدی پر بٹھایا۔ جے کشن کے پوتے گوپال رائے نے پٹنہ جا کر کیپٹن کیمک سے مدد مانگی۔ انگریزوں کی مدد سے حملہ ہوا چھتر جیت رائے سرگجا کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے بعد گوپال رائے کا بھائی چرامن رائے راجہ ہوا جس کے زمانے میں کافی بدامنی پھیلی اور انگریزوں نے پلاموں کے سارے علاقہ کو نیلام کر کے خود لے لیا اور ضلع گیا کے راجہ گھنشیام کو دیدیا۔ لیکن سنہ ۱۸۱۷ء میں برطانوی حکومت نے پلاموں کو واپس لے کر ضلع رام گڑھ میں ملا لیا بعد میں انگریزوں نے لسلی گنج کو پلاموں کا صدر مقام بنایا جو لیفٹیننٹ لسلی کے نام پر ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سنہ ۱۸۵۷ء میں یہ علاقہ غدر گھروار قوموں کے بھگتا لوگوں میں پتامبر اور نیلامبر کا شمار مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے۔ جنہیں انگریزوں نے پھانسی دیدی۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں جب چھوٹا ناگپور کے کمشنر کرنل ڈالٹن کے نام پر شہر ڈالٹین گنج بسایا گیا تو اسی کو ضلع کا صدر مقام قرار دیا گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ پلاموں کا علاقہ باضابطہ ضلع ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۹۲ء میں قرار پایا ستر اکتوبر سنہ ۱۸۹۱ء میں بنگال گورنمنٹ نے اس کا نوٹیفیکیشن کیا اور دوسرے گریڈ کا ڈپٹی کمشنر ایس. بی. گورڈن کو مقرر کیا (Vide Calcutta Gazette Part I Page 981) لیکن O'Malley اور Tallents سنہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۵ء کے پلاموں گزیٹیر میں پہلے ڈپٹی کمشنر کا نام ڈبلیو۔ آر۔ برج (W.R. Bright) بتاتے ہیں لیکن صوبہ بہار کے آثار قدیمہ کے ریکارڈ کے مطابق بقول پی۔ سی۔ رائے چودھری گورڈن ہی پلاموں کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہے (صفحہ ۲۳۱) یہ ہے ڈالٹین گنج کی تاریخ کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کا نام برجیرا باغ (Birjira Bagh) تھا جو راجہ مدنی کے نام پر ہے۔

اس وقت ادبی اعتبار سے ڈالٹین گنج ایک چھوٹے سے ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کی ایک بڑی شخصیت مرزا عبدالستار بیگ کی ہے جن کی کتاب مسالک السالکین تین ضخیم جلدوں پر مشتمل بڑی تقطیع پر ہے ڈاکٹر مظفر اقبال پروفیسر بھاگلپور یونیورسٹی کی مطبوعہ تھیسس میں اس کتاب اور اس کے مصنف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں کے مشہور رئیس ڈاکٹر عبدالحمید مرحوم جن کے نام پر محلہ حمید گنج ہے ایک شاعر بھی تھے۔ اور مسلم شعرائے بہار مولفہ احمد اللہ ندوی (جلد اول صفحہ ۲۸۷) (مطبوعہ کراچی) میں ان کا مختصر حال اور کلام موجود ہے۔ یہاں کے ایک شاعر منشی پیارے لال رت بھی تھے جن کا ذکر تذکرۂ ہندو شعراء ...

میں مولٰد فصیح الدین بلخی میں موجود ہے ان کے علاوہ امجد علی ہما، شیخ عبدل علی بشاش، مولوی یحیٰ سخن بھی اچھے شاعر تھے۔ ہما کا درج ذیل شعر تو بہت مشہور ہے۔

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا　　　اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

مولانا شمس الضحیٰ ابھی بہ قید حیات ہیں جو نوح ناروی کے شاگرد ہیں۔ مہجور شمسی مرحوم کو کون نہیں جانتا جن کے دو مجموعے "پردۂ ساز" اور "نوائے راز" (جس کا مقدمہ ڈاکٹر وہاب اشرفی کے زور قلم کا نتیجہ ہے) شائع ہو چکے ہیں۔ سید محمد ایوب شمیم بدری بھی ایک اچھے شاعر تھے جن کا کلام ہنوز (غیر مطبوعہ) ان کے صاحبزادے ڈاکٹر شعیب راہی کے پاس محفوظ ہے۔ شمیم ندوی کی نثر میں ایک مطبوعہ کتاب "انمول جواہر" ہے۔ قتیل کریمی اس وقت یہاں کے واحد صاحب دیوان شاعر ہیں۔ قتیل صاحب دو ردلیف وار دیوان مرتب کر چکے ہیں۔ ایک خالص نعتیہ کلام رکھتا ہے۔ شعیب راہی کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں ایک "گمنام کوچے کی صدا" شعری مجموعہ ہے اور دوسری کتاب "آتش لکھنوی۔ حیات اور شاعری" تحقیقی مقالہ ہے۔ نادم بلخی کے دو شعری مجموعے "آغاز سحر" اور "ذوق سفر" شائع ہو چکے ہیں۔ دو مجموعے "دوپہر کا دائرہ" اور بچوں کے لئے درسی نوعیت کا شعری مجموعہ "تحفے" دونوں ہی پریس کے حوالے ہو چکے ہیں۔ رباعیات کا مجموعہ "نقطوں کا حصار" مرتب ہو چکا ہے۔ جس میں ساڑھے تین سو سے زیادہ رباعیاں ہیں۔ عروض پر ایک کتاب "تفہیم العروض" بھی پریس میں جا چکی ہے۔ جس کا مقدمہ ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی شعرائے کرام ہیں۔ مثلاً بدر نیازی، مجیب نشتر، مجیب الرحمٰن اختر، رقیہ محوی، ڈاکٹر شمیم الدین، غفار پروانہ، مقیم شاد، ابرو جمالی، صغیر شاعر، پیارے حسن ساغر، پیارے مرزا ذکریا، مضطر، گویا عظیم آبادی وغیرہ۔ مشاعرے اس شہر میں ہر ماہ پابندی سے ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت پورے شہر کے اندر کئی کالج ہیں۔ مثلاً حسین آباد میں شہید بھگت سنگھ کالج۔ گڑھوا میں نامدھاری کالج، ڈالٹن گنج میں، جی۔ ایل۔ اے کالج، جنتا کالج، جودھ سنگھ نامدھاری مہیلا کالج۔ لا کالج، لوہیا کالج، بی۔ این کالج، جگن ناتھ مشرا کالج اور لاتیہار میں گاندھی کالج۔

چھوٹا ناگپور میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کا جہاں تک تعلق ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ضلع پلاموں نے شروع ہی سے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ پورے چھوٹا ناگپور میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کا جہاں تک تعلق ہے مجھے اتنا کہنے میں کوئی عذر نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام محفوظ کرانے والی ہستیوں میں بہت ساری ایسی ہیں جن کا تعلق عرصہ دراز تک چھوٹا ناگپور سے رہا ہے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ فصیح الدین بلخی مرحوم اپنی جس کتاب کے سبب علم کی دنیا میں مشہور ہوئے وہ اسی چھوٹا ناگپور میں لکھی گئی۔ تاریخ مگدھ لکھنے کا آغاز انہوں نے یہیں ۱۹۳۰ء میں کیا تھا۔ اور اسے پایہ انجام تک بھی یہیں ۱۹۴۳ء میں پہنچایا۔ اس لئے کہ وہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۶ء تک بحیثیت مجسٹریٹ ضلع سنگھ بھوم میں بمقام سرائے کیلا رہے۔ دوسری کتاب "نسوان ہند" کے مواد کا بیشتر حصہ انہوں نے سنگھ بھوم میں ہی رہ کر مرتب کیا۔ اپنی تیسری کتاب "النساء" بھی انہوں نے وہیں رہ کر لکھی۔ اختر اورینوی مرحوم کی مشہور کتاب "حسرت تعمیر" (ناول) ہے۔ اس کا

گیا

...ت وکردار کا چھوٹا ناگپور ہی سے ہے۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم کا بھی ایک عرصہ تک قیام
... رہا۔ اس علاقہ میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے کے لئے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق
... انہیں انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے مامور کیا تھا۔ چنانچہ وہ کئی برسوں تک رانچی میں مقیم رہے۔
... کا مشہور ناول " بے جڑ کے پودے " کو آپ پڑھیں گے تو محسوس ہوگا کہ اس کا منظر پس منظر اور مواد
... سے تعلق ہے۔ یہ سبھوں کو معلوم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو انگریزوں نے ایک عرصہ تک نظر
بند کرکے رانچی میں رکھا اور آزاد صاحب نے فروغ اردو کے لئے یہاں نظر بند رہ کر بھی بہت کچھ کیا۔ چھوٹا
ناگپور میں اردو زبان کے اثرات کا جہاں تک تعلق ہے میری معلومات کے مطابق یہاں کے راجاؤں کے پاس
اردو فارسی کی دستاویزیں موجود تھیں۔ ان میں کئی بذات خود اردو جانتے تھے۔ مثال کے طور پر ریاست
رائے گیلا کے رولنگ چیف اردو ہی میں دستخط کرتے تھے۔ یہ دستخط مہاراجہ آدت نرائن سنگھ دیو کا ہے۔
جن کا انتقال غالباً پچاسی برس کی عمر میں ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں ہوا اور اس دستخط پر تاریخ ۱۹۲۶-۲-۱۹
کی ہے۔

چھوٹا ناگپور میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے کے معاملہ میں صوفیائے کرام کا بھی بہت بڑا ہاتھ
رہا ہے۔ تبلیغ کے سلسلے میں وہ چھوٹا ناگپور کا دورہ کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کے ذریعہ اردو زبان کی بھی اشاعت
ہوتی تھی۔ سنڈر اپنی رپورٹ میں پلاموں کی درگاہوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ایک درگاہ لسلی گنج میں داتا انجان
شہید کی ہے۔ دوسری ڈالٹین گنج سے تین میل کے فاصلہ پر کوئل ندی کے اس پار چین پور (شاہ پور) میں
داتا ہاشم علی شاہ کی ہے۔ اسی طرح چیلا میں ایک درگاہ ہے اور ان سبھوں کا ذکر اس نے کیا ہے۔ مجھ سے
خود ایک بار ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب صدر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی (بی۔ جی) نے کہا کہ ان کے دادا
حضرت سید شاہ سلطان احمد مرحوم ومغفور ان کے والد بزرگوار سید شاہ حاجی امام الدین مرحوم ومغفور (ساکن
بی بی پور ضلع گیا) پلاموں ضلع میں خصوصی طور پر کافی اپنے مریدان رکھتے تھے۔ ان کے چچا سید شاہ ریاض الدین
صاحب آج بھی اس ضلع کا دورہ کرتے ہیں اور ان کے زیادہ تر مریداں پاٹن کے علاقہ میں ہیں۔ سر پیر کابری مرحوم
ایک اچھے اور مشہور ومعروف شاعر ہی نہیں بلکہ پیر طریقت بھی تھے اور ان کے اچھے خاصے مریدان پلاموں میں آج
بھی موجود ہیں۔

اردو زبان نے یہاں کی علاقائی بھاشاؤں میں اپنے الفاظ کس طرح داخل کئے ہیں یہ کام اہم لسانی موضوع
ہے جس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنے کا ابھی موقع نہیں پھر بھی مختصراً کچھ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں
سنڈر نے اپنی رپورٹ (۱۸۹۸ء) میں پلاموں کے جن مقامی دوہوں اور شاعری کا ذکر کیا ہے ان میں
بھی اردو، عربی اور فارسی کے الفاظ ملتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں (بحوالہ سنڈرس سٹلمنٹ رپورٹ ۲۴ر
اکتوبر ۱۸۹۶ء)

پیراگراف ۱۱۵ صفحہ ۳۵ :- بارہ مہینہ تیرہ جاس ؛ تب کرو گورا کے آس

مطلب :- بارہ مہینہ میں تیرہ بار ہل جوتو تب جاکر گورا دھان کی آس رکھو

پیراگراف ۱۴۹ :- لیوا، چیوا کھیتی جوگ تو تم کے لرکا
بھیلا تو بھیلا، نا نہیں تو گھیلا

مطلب :- لیوا کی کھیتی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا یہ کامیاب بھی ہوسکتی ہے اور نہیں بھی، اگر ناکامیاب ہوئی تو سارا کیا دھرا اکارت گیا۔

پیراگراف ۱۵۰ صفحہ ۳۹ :- بیرا مکئی دھاوا دے کپاس
گھنے بنے سنئی سے بس کاہیں لگے تپاس
(تپش ای جگری شکل)

مطلب :- مکئی اور کپاس کو گھنا بونا بیچ میں جگہ بھی چھوڑ دو۔ سن کا پودا اتنا گھنا ہونا چاہئے کہ بیچ سے ہوا کا گذر بھی نہ ہو۔

پیراگراف ۱۶۷ صفحہ ۴۲ :- باس گھر باس۔ لیوا گھر چیوا روپا گھر تویا
یعنی گھر بساتا ہے

مطلب : اس دھان گھر بساتا ہے لیوا دھان کا کوئی بھروسہ نہیں روپا دھان سے گھر بھر جاتا ہے۔

پیراگراف ۱۸۰ صفحہ ۳۹ گان کرکھی بیرل تل دھاوا دے کپاس
السین بنے صفائی (سن) تن کو ناہی لگے تپاس

مطلب :- کرکھی اور تل ساتھ ساتھ بنو اور کپاس کے بیچ کچھ فاصلے پر سن اس طرح بنو کہ ان کے پودوں کے بیچ سے گرم ہوا کا گذر نہ ہو۔

پیراگراف ۱۹۷ صفحہ ۴۸ :- گان کرکھی بیرل دھان دھاوا دے کپاس
السین برہنا بنیا سنائی لکھ ندلا گے تپاس

مطلب :- کرکھی ہلکی بنو روئی کا بیج ایک قدم کی دوری پر بنو اے میرے سنیاں (شوہر) سن اس طرح بنو کہ اس کے بیچ میں بہتی ہوئی گرم ہوا تمہارے مکھڑے کو نہ چھوئے۔

پیراگراف ۲۱۳ صفحہ ۴۸ :- بیمی سانس دے، شاہ مہاجن حاکم اگر گرہن ہوجی

مطلب :- مویشی کو آرام کا موقع دو تاکہ شاہ جی مہاجن اور حاکم کا قرض اور زمین کی مالگذاری ادا ہوسکے

پیراگراف ۲۳۷ صفحہ ۵۰ :- جو جیے گیہوں گھر آوے، تیسی کا تیل پیڑیا وے

مطلب :- جو کا کوئی بھروسہ نہیں کہ ہوگا یا نہیں گیہوں کے بارے میں اس وقت کہا جاسکتا ہے جب وہ گھر لایا جائے اور تیسی اس وقت تیسی ہے جب اسے پیڑ کر تیل نکالا جائے۔

سنڈرس رپورٹ میں زراعتی آلات سے متعلق شعری حصہ قابل ذکر ہے۔

Appendix XXIV. Page ccxiii

صفحہ ccxiv :- چوکاؤ بیشک سار۔ ساگ تھے تین بیشک گنا

گیا

تین سیر پہار کاندھ کے جوات
نو مٹھی کے پینا تیر کے نیوے دی ہے آر
سے میں پینے سی لیسار نا ہوے تو بھنڈیا کے دی سے گار

مطلب :- ہل کی کڑی بالشت بھر کی ہونی چاہیئے اس کا مٹھ (ہینڈل) ساڑھے تین بالشت بھر کا ہو تاکہ کاندھے پر دھر کے لے جانے کے لائق ہو نو مٹھی کا پینا (بیل ہانکنے کی چھوٹی لاٹھی) ہونا چاہیئے آر کی اونچائی پینا کے برابر ہونی چاہیئے۔ تب کھیت میں لی کسار دھان اگر نہ ہو تو شاعر کو گالی دو۔

یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اتوار کا دن دھان کے پودوں کے لئے اچھا ہوتا ہے۔ یہ دن مویشیوں کے آرام کا دن ہے لہذا روپنے، ہل جوتنے اور کھیت میں کام کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ لوہار بڑھئی بھی اس روز کام نہیں کرتے۔ یہاں کے دوہوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

سنڈرس رپورٹ ۱۸۹۸ء Appendix XXVIII Page CC VI

(۱) سومے کھیتی بدھے گھر ؛ جے نا جانے سے ای اکر
سمبار بدھ

مطلب :- سمبار کا دن کھیتی کے لئے ہے اور بدھ کا دن گھر کے لئے جو یہ قاعدہ نہیں جانتا اُسے جاننا چاہیئے

(۲) سان سمار پورب جائے ؛ بے گنا ہے لاٹھے کھائے
سنیچر سمبار (اردو کا اثر)

مطلب :- پورب کا سفر اگر تمنے سنیچر اور سمبار کو کیا تو بے قصور ہونے کے باوجود لاٹھی کھاؤ گے

منگل :- منگلا مکھ ہی ـــــ سدا سُکھ ہی
اردو

مطلب :- منگل کا دن سدا سکھی رہتا ہے یعنی ہر کام کے لئے اچھا ہوتا ہے

بدھ :- منگلو بدھ اتر کے کالو ؛ دکھن جا ئے تو ہوے بنالو

مطلب :- اتر جانے کے لئے منگل اور بدھ کا دن خراب ہے لیکن دکھن کا سفر کامیاب ہوتا ہے

جمعرات :- بیفے کہے مور کوئی دوس ؛ دکھن مت جا اِکو کوس

مطلب :- جمعرات کہتا ہے کہ میرا کیا قصور ہے ایک کوس بھی دکھن کی طرف مت جاؤ

جمعہ :- سُکہ کے بدری سنیچرے چھائی ؛ بھنڈاری کہے برسے نا جائی
بادل

مطلب :- جمعہ کے دن آسمان ابر آلود ہو اور سنیچر کے دن اندھیرا تو شاعر کہتا ہے کہ بارش ضرور ہوگی۔

ہوا کے بہنے سے متعلق یہ مثل ہے کہ اگر اتر پورب کے رُخ بہے گی تو ایک گھنٹہ کے اندر ضرور بارش ہوگی، اس ہوا کو اس علاقہ میں کوہسا کونی کہتے ہیں۔

شعر :۔ بہت ہے ہوا کو ہسا کونی ؛ بل ماری کے پانی پائب چونی

مطلب :۔ اے میرے بابو کو ہسا کونی ہوا بہہ رہی ہے میں جلد ہی آسمان سے پانی پیونگا

ایک مثل مشہور ہے کہ اگر دائرہ نما نشان کسی بیل کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے بیچ ہو تو وہ نحوست کی علامت ہے۔

اسی طرح درج ذیل دوہے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر بیل کو چھ دانت ہے تو وہ بہت اچھا ہے لیکن سات دانت والا بیل گھر کے کسی فرد کو کھا جاتا ہے۔

دوہا :۔ چھ دار کہے آوے جائے ؛ سات دار کہے مورے کھائے

مقامی بھاشاؤں پر اردو زبان اور کھڑی بولی کے کافی اثرات ہیں۔ پلاموں کے اندر جیسا کہ او ملے اہد چودھری نے اپنے گزیٹر میں لکھا ہے شادی کے تخت کو یہاں کے قبائیلی 'جہاز' (جہاج) کہتے ہیں جس پر دولہا اور دولہن کو بٹھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عربی کا لفظ ہے جو اردو کے ذریعہ ایسی بھاشاؤں میں بھی داخل ہو گیا ہے جن کا تعلق ہند آریائی سے نہیں بلکہ اسٹرو ایشیائی یا ڈراویڈی نسل سے ہے۔ جس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے اثرات تو اس علاقے پر بہت پہلے پڑ چکے تھے لیکن ادب کا فروغ بعد میں ہوا۔ پلاموں کے جنگلی دھاتوں کے ناموں پر اگر غور کیجئے تو اس کا ایک حصہ علاقائی بھاشاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دوسرے حصے کا تعلق فارسی اردو سے مثلاً گاؤں میں کراگا خرد، کراگا کلاں، پکھراہا خرد، پکھراہا کلاں، وغیرہ۔ ضلع پلاموں کا جہاں تک تعلق ہے پورے چھوٹا ناگپور میں اسی حصہ کو سب سے پہلے اردو نے متاثر کیا۔ یہاں ادب نواب حسین خاں ہی کے وقت سے فروغ پانے لگا یہی وجہ ہے کہ یہاں کے بہت سارے دھاتوں کے نام بھی اردو زبان کے رہین منت ہیں۔ مثلاً حسین آباد انھیں ہی کو مدنظر رکھئے گاؤں کے بہت سارے نام آپ کو ملیں گے۔ یعنی رسول پور، عاشق نگر، محسن نگر، امام نگر، حیدر نگر، سجواں سالم پور، دیوان بیگہ، کاظم نگر، خلیل پور، مبارک پور، علی نگر، فاطمہ چک، حسین نگر، احمد نگر، کریمن ڈیہہ، بیگم پورہ، حسین بندھ، شیخ پورہ، محمد گنج وغیرہ

اردو زبان کے فروغ میں چھوٹا ناگپور کے تمام اضلاع کا اپنی اپنی جگہ پر ایک مقام ہے۔ ضلع پلاموں کا ذکر میں نے کچھ تفصیل کے ساتھ کیا ہے اس کی وجہ بھی مذکورہ بالا سطور میں بیان کر دی گئی ہے۔ سنگھ بھوم کا جہاں تک تعلق ہے کچھ باتیں اوپر بیان کی جا چکی ہیں اس ضلع میں ادبی اعتبار سے اس کے صدر مقام چائباسہ کو وہ مقام حاصل نہیں جو آہنی شہر جمشید پور کو ہے۔ اسٹیل سٹی ہونے کے سبب ملک کے گوشے گوشے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا یہاں ایک اچھا خاصہ اجتماع ہوا۔ ان میں بہت سارے اہل قلم حضرات بھی ہیں جن میں بہتوں نے بود و باش یہیں کی اختیار کر لی ہے۔ ان میں شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی اور دوسری صنفوں سے تعلق رکھنے والے اہل قلم حضرات بھی ہیں مثال کے طور پر افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں ذکی انور مرحوم، آنجہانی ہربنس سنگھ دوست، گروبچن سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں حبیب [illegible] احمد عظیم آبادی، منظر شہاب، آزاد گرو واسپوری، سید شمیم احمد، بی۔ زیڈ مائل، منظر کاظمی، سردار [illegible]

واسطی، ظفر ہاشمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی دوسرے بہت سارے ہیں۔ ہزاری باغ ضلع کا جہاں تک تعلق ہے افسانہ نگاری کے میدان میں پروفیسر مسلم عظیم آبادی گذرے ہیں جو منشی پریم چند اور سدرشن کے ہمعصر تھے۔ نثر نگاری کی حیثیت سے ڈاکٹر شان احمد صدیقی اپنے تخلیقی مقالہ "کریم الدین اور ان کا عہد" کے سبب قابل ذکر ہیں۔ ضلع دھنباد اور اس کے قرب وجوار کا جہاں تک تعلق ہے غیاث احمد گدی کا نام ہندو پاک میں مشہور ہے۔ الیاس احمد گدی کو بھی کون نہیں جانتا۔ ان کے علاوہ شاعروں میں شان بھارتی، محبوب اکیلا کے نام قابل ذکر ہیں۔

رانچی ضلع اور خصوصی طور پر شہر رانچی کی حیثیت چھوٹا ناگپور کی شہ رگ کی ہے۔ مولانا آزاد۔ اختر اورینوی، اور سہیل عظیم آبادی کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ جس وقت انجمن ترقی ہند مصنفین کا اردو ادب میں بول بالا تھا۔ شہر رانچی میں اچھے خاصے اہل قلم موجود تھے۔ مثلاً کلام حیدری، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، امر ہندی، احتشر پیامی، وغیرہ، آج بھی بہت سارے اچھے اہل قلم موجود ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر رشد اختر، مسعود جامی، ڈاکٹر سمیع الحق، ڈاکٹر احمد سجاد، پروفیسر ابوذر عثمانی وغیرہ، شاعروں میں صدیق مجیبی، برکاتی فکری، وہاب دانش، پروفیسر رحمانی، نظر راجگوری وغیرہ ہیں ان کے علاوہ اور بھی اہل قلم ہیں جن کی ایک لمبی فہرست ہے۔

پیش نظر مضمون کا موضوع ایسا ہے کہ اگر ہر نکتہ اور ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ جو باتیں تحقیق وجستجو اور حقائق کی روشنی میں اوپر کہی گئی ہیں ان سے کم از کم اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ چھوٹا ناگپور پر اردو زبان وادب نے اپنا گہرا اثر ڈالا ہے اور اردو زبان و ادب نے بھی اپنے نقوش چھوٹا ناگپور کے علاقوں پر ثبت کئے ہیں۔ لہٰذا صوبہ بہار کے اس قبائلی علاقے میں اردو زبان وادب کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ صرف اتنا ہی کہہ کر میں اس مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں۔

★

تقریب۔ ناظم یوسف صاحب

طنز ومزاح نگاری سے باز آجائیں گے لیکن فقط کی اشاعت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ "البتہ" منظر عام پر آگئی اور عوام الناس کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس کے بعد بالکلیات کی اشاعت کا اعلان ہوا تو لگا کہ طنز ومزاح کا یہ سلسلہ ختم ہوا چاہتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور یوسف ناظم صاحب نے اعلان کیا کہ وہ ابھی "ذکر خیر" بھی کریں گے۔ عوام خوش ہیں کہ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ ذکر خیر کے بعد وہ کم از کم "فاتحہ خوانی" ضرور کریں گے۔

یوسف ناظم صاحب میدان طنز ومزاح کے وہ کھلاڑی ہیں جو برسوں سے مسلسل چوکے اور چھکے لگاتے جا رہے ہیں اور جن کے آؤٹ ہونے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ ہو سکتا ہے کسی دم قارئین اور ناقدین آؤٹ ہو جائیں اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ ہی رہیں۔

★

شہزاد منظر (کراچی) ——————

کرشن چندر ۔ چند یادیں

[کرشن چندر زندہ نہیں ہے۔ ان کی زبان سے جتنی باتیں کہلوائی گئی ہیں ان کی ذمہ داری مضمون نگار پر ہے۔ میرے بھی تعلقات کرشن چندر کے خاندان سے تھیں اور ہیں۔ میں ان باتوں کی سچائی کو جھٹلانے کی کوشش کئے بغیر ان سے متفق نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے یقین آتا ہے کہ انہوں نے کمیونزم اور پاکستان کے سلسلے میں وہ باتیں کہی ہوں گی جن کا ذکر داوین کے اندر کیا گیا ہے ——————

—————— کلام حیدری]

اردو کے مشہور اور صاحب طرز افسانہ نگار کرشن چندر کو گزرے سات سال ہوچکے ہیں۔ وہ ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے اور ۸ر مارچ ۱۹۷۷ء کو اس دیار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس طرح انہوں نے کل ۶۳ سال عمر پائی۔ اس عرصے میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ہمیشہ اردو ادب میں یاد رہے گا۔ اور ان کا شمار اردو کے اہم ترین ادیبوں میں ہوتا رہے گا۔ کرشن چندر اردو کے وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے معترضین اور نظریاتی مخالفین سے بھی اپنے فن کا لوہا منوایا اور معتقدین سے بھی۔ وہ ہر طبقے میں یکساں مقبول تھے اور ان کی مقبولیت صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھی وہ سارے دنیا میں پسند کئے جاتے تھے۔

اردو کے اس معروف افسانہ نگار کی ساتویں برسی کے موقع پر میں ان لمحات کو یاد کر رہا ہوں جو میں نے اس عظیم المرتبت افسانہ نگار کے ساتھ گزارے اور مختلف ادبی اور سیاسی موضوعات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔ یہ آج سے چھبیس سال قبل کی بات ہے۔ میں کرشن چندر سے اپنی گفتگو اس نوٹس کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں جو میں نے اس وقت لکھ لیا تھا۔

ستمبر ۱۹۵۷ء میں کرشن چندر فلم ساز اور ہدایت کار روپ کے شوری کی ایک فلم کے لئے مکالمے اور منظر نامے لکھنے کے سلسلے میں کلکتہ آئے۔ کرشن چندر ایک ہفتہ جنتا سینما کے قریب واقع مجسٹک ہوٹل میں مقیم رہے وہ اتنی خاموشی کے ساتھ آئے کہ کسی کو کانوں کان تک خبر نہ ہوئی۔ کلکتے میں کرشن چندر کے دوستوں

[illegible] مندوں کی کمی نہ تھی، لیکن انھوں نے خود کو عمداً روپوشں رکھا تاکہ فلم کا اسکرپٹ لکھنے میں رکاوٹ نہ
[illegible] انھیں معلوم [illegible] کہ اگر کسی کو معلوم ہوگیا کہ وہ مجسٹک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں، تو ملنے والوں کا تانتا
بندھ جائے گا اور وہ مقررہ وقت پر اسکرپٹ مکمل نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے کلکتہ میں اپنی آمد کو
اس وقت تک چھپائے رکھا جب تک ان کا اسکرپٹ مکمل نہیں ہوگیا۔ ان کی آمد کے ساتویں روز مجھے ان کے بارے
میں اطلاع مل گئی اور میں مجسٹک ہوٹل پہنچ گیا۔ میں اس سے قبل ان سے کئی بار مل چکا تھا۔ لیکن تفصیلی گفتگو کا موقع
بہت کم ملا۔ اتفاق سے کرشن چندر نے اسی روز فلم کا اسکرپٹ مکمل کر لیا تھا اور وہ فارغ ہو چکے تھے لیکن
انھیں بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔

میرے آنے سے انھیں بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں تنہا بخار میں تپ رہے تھے۔
کلکتہ ان کے لئے اجنبی شہر تھا اور انھیں فوری طبی امداد کی ضرورت تھی تاکہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو کر بمبئی
جا سکیں۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا۔ آپ آج کل اتنے خراب افسانے کیوں لکھ رہے
ہیں وہ کرشن چندر کہاں گیا جو ہمیشہ دل کش اور معیاری افسانے لکھتا تھا؟"

انھوں نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔ آپ نے ایمل ژولا اور بالزاک کے ناول پڑھے ہوں گے۔
بتائیے، ان کے کتنے ناول اچھے اور مشہور ہیں؟

میں نے جواب دیا "تین چار ناول۔ ایمل ژولا، "جرمینل" "نانا" اور "ارتھ" اور بالزاک کا "بڈھا گوریو" اور
ہیومن کامیڈی سلسلے کے چند ناول۔

کرشن چندر نے کہا۔ "بالزاک نے اپنی زندگی میں تقریباً پانچ سو اور ایمل ژولا نے تین سو ناول لکھے ہیں۔
ان میں سے آج چند ہی ناول زندہ ہیں اور ان ناولوں کے باعث ژولا اور بالزاک پہچانے جاتے ہیں۔

کرشن چندر نے تھوڑے توقف کے بعد پھر دریافت کیا۔ آپ کے خیال میں میرے کتنے فی صد افسانے ہمیشہ یاد
رہیں گے؟"

میں نے کم سے کم تخمینہ لگاتے ہوئے کہا "بیس فی صد سے زیادہ نہیں"

کرشن چندر نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تو بہت زیادہ ہے۔ کسی ادیب کو دوام بخشنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے
وقت کی چھلنی جب کسی ادیب کی تخلیقات کو چھانتی ہے تو کوڑا کرکٹ علیحدہ کرنے کے بعد چند ہی چیزیں باقی رہ
جاتی ہیں جو شاہکار اور کلاسیک کہلاتی ہیں۔"

کرشن چندر اپنے افسانوں کا معیار گرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ "ایڈیٹر حضرات افسانے کا پیشگی معاوضہ
بھیج دیتے ہیں جسے میں فوراً خرچ کر دیتا ہوں اور جب ان کی طرف سے تقاضے کئے جاتے ہیں تو میں افسانے لکھنے
بیٹھ جاتا ہوں۔ اس طرح کبھی افسانہ بہت اچھا ہو جاتا ہے اور کبھی بہت برا۔ مجھے خود بعض افسانوں کے غیر
معیاری اور خراب ہونے کا احساس ہے لیکن میں کیا کروں؟ مجھے افسانے پر زیادہ محنت کرنے اور اس پر
نظرِ ثانی کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

کرشن چندر نے بتایا کہ وہ ہفتے میں اوسطاً دو افسانے اور بعض دفعہ تین افسانے لکھ لیتے ہیں لیکن بعض دفعہ ہفتوں نہیں لکھتے۔ زود نویسی کے باعث افسانے کا معیار ہمیشہ برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔
میرے دریافت کرنے پر کہ "آپ اتنے افسانے لکھنے کے لئے موضوع کہاں سے لاتے ہیں؟" کرشن چندر نے کہا۔ "میرے ذہن میں افسانے کے سینکڑوں موضوعات کلبلاتے رہتے ہیں۔ بس صرف قلم اٹھانے کی دیر ہوتی ہے۔ افسانے خود بخود کاغذ پر منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔"
کرشن چندر نے بتایا کہ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، گجراتی حتیٰ کہ مراٹھی زبان کے بعض رسائل بھی ان سے بھاری معاوضے پر افسانے طلب کرتے ہیں اور ہزار اور پانچ سو روپے تک معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک مراٹھی رسالے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کا سال میں صرف ایک شمارہ شائع ہوتا ہے اور اس میں ان کا افسانہ ضرور شامل ہوتا ہے۔
کرشن چندر نے مزید بتایا کہ ایک بار وہ چیکوسلواکیہ کے ادیبوں کی یونین کی دعوت پر پراگ گئے۔ آمد و رفت کے لئے طیارے کا ٹکٹ اور قیام و طعام کا انتظام چیک ادیبوں کی یونین نے کیا۔ انھیں نقد روپے کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے ماہنامہ "شمع" دہلی کے مالک اور مدیر یوسف دہلوی سے اور "بیسویں صدی" کے مالک اور مدیر خوشتر گرامی سے ناول لکھنے کے عوض ایک ایک ہزار روپے پیشگی وصول کر لئے اور پراگ روانہ ہو گئے۔ انھوں نے واپس آنے کے بعد ان دونوں اداروں کے لئے ایک ایک لکھ کر دیدیا۔ کرشن چندر نے کہا کہ روس، چیکوسلواکیہ اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں میں ان کی تصانیف بے حد مقبول ہیں اور ان زبانوں میں ان کی تصانیف کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ ان ملکوں میں ان کی لاکھوں روپے کی رائلٹی بھی جمع ہے۔ لیکن اسے کمیونسٹ ممالک سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے وہ جب بھی ان ملکوں کے دورے پر جاتے ہیں، وہاں سے اشیا خرید کر لاتے ہیں۔ رائلٹی وصول کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔
کرشن چندر نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا کہ ان کے باقاعدہ دو سکریٹری ہیں۔ وہ ہر سکریٹری کی باقاعدہ تنخواہ ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کو بیک وقت مشاہرہ ادا کرنے کے لئے ان کے پاس کبھی رقم نہیں ہوتی۔ کرشن چندر اردو کے واحد ادیب تھے جو باقاعدہ سکریٹری رکھتے تھے اور وہ بھی دو دو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کمرشیل ادیب بن چکے تھے۔ اور افسانہ نگاری ہی ان کا واحد ذریعہ معاش تھا۔ وہ بے حد بدخط واقع ہوئے تھے۔ ان کی تحریروں کو پڑھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ ان کے سکریٹریوں کا کام ان کے افسانوں کے مسودے کو خوش خط لکھنا، افسانوں کو اردو سے دیوناگری رسم الخط میں منتقل کرنا، رسائل میں بھیجنا، ان کے مداحوں کے خطوط کا جواب دینا تھا۔
میں نے کرشن چندر سے پوچھا "آپ کے "سرائے سے باہر" اور "دل کی آواز" کے نام سے دو فلمیں بھی بنائی تھیں۔ پھر آپ فلمی صنعت سے الگ ہو گئے؟"
کرشن چندر نے جواب دیا "راکھ" کے نام سے تیسری فلم بھی شروع کی تھی، جو مکمل نہ ہو سکی۔

گیا

دراصل ایک عقیدت مند سیٹھ نے مجھے کئی ہزار روپے دیئے تھے اور موٹر کار بھی خرید کر دی تھی۔ لیکن دونوں فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں۔ اور مجھے کار بیچنی پڑی۔ ہندوستانی فلموں کے اتنے زیادہ کمرشیل تقاضے ہوتے ہیں کہ میری طرح شخص کے لئے ان تقاضوں کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ پھر فلم ساز، فلم کی کہانی میں اتنی تبدیلیاں کرتے ہیں کہ اس کی اصل شکل بگڑ جاتی ہے چنانچہ میں اب فلموں کے لئے کہانیاں نہیں لکھتا صرف مکالمے اور منظر نامے لکھتا ہوں، جو ایک غیر ادبی اور ٹیکنیکل کام ہے۔"

کرشن چندر نے اعتراف کیا کہ میں فلمی صنعت کے ناکام ترین مصنفوں میں سے ہوں۔ اس لئے مجھے فلموں میں بہت کم کام ملتا ہے۔ افسانہ نگاری ہی میرا ذریعہ معاش ہے۔

میں نے دریافت کیا آپ کے افسانوں میں پہلی جیسی رومانیت نہیں رہی، اب رومانیت کی جگہ تلخ حقیقت نگاری پائی جاتی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

کرشن چندر نے کہا کہ "اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں (یہ بات انھوں نے اس وقت کہی تھی۔ جب ان کی عمر ۳۲ سال تھی) پھر مجھ میں وہ پہلے جیسا جوش و ولولہ نہیں رہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں انسان کے رویہ بھی بدل جاتا ہے اور زندگی کے تلخ و ترش تجربات اسے سنجیدہ اور خشک مزاج بنا دیتے ہیں۔ لیکن میں کبھی کبھی رومانی تحریریں بھی لکھ لیتا ہوں جیسے "پانی۔ درخت" وغیرہ۔

میں نے گفتگو کا رخ سیاسیات خصوصاً بین الاقوامی سیاسیات اور عالمی کمیونزم کی جانب موڑنے کی کوشش کی۔ چند سال قبل روس کے مردِ آہن اسٹالن کا انتقال ہو چکا تھا۔ کمیونسٹ ممالک اور بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں زبردست انتشار اور اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ اس دور میں روس نے پولینڈ اور ہنگری میں کھلی فوجی مداخلت کی تھی۔ جس پر فرانس کے مشہور ادیب ژاں پال سارتر نے سخت الفاظ میں احتجاج کیا تھا۔ میں نے کرشن چندر سے پوچھا "پولینڈ اور ہنگری کی عوامی بغاوت کو کچلنے کے لئے روس کی فوجی مداخلت کہاں تک درست ہے اور اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔؟

کرشن[1] چندر نے روس کی جانب سے فوجی مداخلت کی پر زور مذمت کی اور اس بات پر گہرے افسوس کا اظہار کیا کہ روس عوام کی بے چینی کو کچلنے کے لئے سختی سے کام لے رہا ہے۔ انھوں نے عالمی کمیونسٹ تحریک کے بارے میں کہا کہ "کمیونزم کو مزید جمہوری اور انسان نواز ہونے کی ضرورت ہے۔"

کرشن چندر نے اس سوال کا اگرچہ ایک فقرے میں جواب دیا لیکن یہ فقرہ اپنی جگہ گہری معنویت رکھتا ہے اور اس سے کرشن چندر کا نظریہ حیات اور سیاسی فکر صاف اور واضح ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر کی اشتراکیت پسندی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے اگرچہ کبھی رکن نہیں رہے اور نہ انہیں خالص مارکسی کہنا مناسب ہے پھر بھی ان کی ہمدردی سوشلزم سے تھی۔ وہ سوشلزم کو عوامی مسائل کا حل سمجھتے تھے۔ ایسے شخص

[1] مجھے اس بات پر سو فیصدی شبہ ہے۔ شہزاد منظر ترقی پسند اور کمیونسٹ دونوں رہے ہیں مگر پاکستان میں وہ کیا ہیں میں نہیں جانتا —— کلام حیدری

کی زبان سے کمیونزم کے بارے میں ایسے خیالات و آرا کا اظہار کم اہمیت نہیں رکھتا۔

کرشن چندر سے میری آخری ملاقات جنوری ۱۹۶۴ء میں ایک بار پھر کلکتہ میں ہوئی۔ وہ اس دفعہ بھی ایک بنگلہ فلم "اُتر پھالگونی" کے اردو ورشن "ممتا" کا اسکرپٹ لکھنے کے لئے کلکتہ آئے تھے۔ وہ اس دفعہ "گرانڈ ہوٹل" میں "روپوش" تھے۔ ایک ماہ کی مکمل روپوشی کے بعد وہ جلوہ گر ہوئے تو کلکتہ کے ادبی حلقوں میں بھونچال آگیا اور ان کے پرانے دوست احباب اور عقیدت مند ان سے ملنے کے لئے ٹوٹ پڑے لیکن ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۴ء میں بہت فرق پیدا ہوچکا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے ہندو مسلم بلوے کے بعد کلکتے میں اکبار پھر شدید فرقہ وارانہ فساد برپا ہوچکا تھا۔ جس سے مسلمان بے حد مایوس اور سہمے ہوئے تھے۔ کرشن چندر بھی ہندو مسلم فسادات سے بے حد مغموم تھے۔ وہ مشرقی ہندستان (مغربی بنگال، اڑلیسہ اور بہار) کے مسلم کش فسادات کو ایک سوچا سمجھا منصوبہ اور "کولڈ بلڈیڈ مرڈر" سمجھتے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بار بار اس کا ذکر کیا اور بے گناہوں سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔

کرشن چندر ایک انسان دوست ادیب تھے۔ ان کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ہر خاص و عام ان سے گہری محبت اور عقیدت رکھتا تھا۔ ان کی انسان دوستی انھیں قوم پرستی سے اشتراکیت کی جانب لے آئی تھی۔ ان میں کبھی تنگ نظری نہیں رہی یہی وجہ تھی کہ وہ سلمیٰ صدیقی سے بہت قریب ہوگئے اور انھوں نے بالآخر سلمیٰ صدیقی سے نکاح کرلیا تھا۔ وہ پاکستان[1] کے قیام کو ہندو قوم پرستی اور برہمنی ذہنیت کا لازمی نتیجہ تصور کرتے تھے۔ انھیں پاکستانی عوام سے گہری محبت تھی۔ عصمت چغتائی جب پاکستان کے دورے پر آئیں تو انھوں نے ان کے ذریعے اپنے پاکستانی دوستوں کو پیغام محبت بھیجا اور پاکستان آنے کی شدید خواہش ظاہر کی لیکن وقت نے ان کے ساتھ وفا نہ کیا۔

★

---

[1] کرشن چندر کو ہندو ازم اور ہندو قوم پرستی کے خلاف استعمال کرنا اخلاقی طور پر بھی غلط ہے۔ واقعاتی طور پر تو اس پر یقین کرنا کرشن چندر کی توہین ہے — کلام حیدری

بقیہ :- ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات

۱۹۷۷ء، ۹۰، ۸۹، ۸۸، رباعیات	شاعر
"	رضا ابن فیضی
" خاکہ	فن کار
" بھٹکی ہوئی نیکی	عوض سعید
" (غزلیں)	شاعر
" غزل	مدحت الاختر
"	مظفر حنفی
"	ممتاز راشد

غزلیں	شاعر
غزل	کرشن موہن
"	اظہار سلیم
"	رفعت سروش
"	ظفر حمیدی

★

گیا

بدرالدین

اردو زبان اور رسم الخط

یہ حقیقت ہر کس و ناکس پر عیاں ہے کہ زبان اور رسم الخط کے درمیان ناقابل شکست تعلق ہوتا ہے۔ جس کو منقطع کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کوئی بھی شئے اپنی کثافت وہیئت کے مطابق اپنی شکل اختیار کرتی ہے۔ اسی طرح کوئی بھی زبان اپنے مزاج، ماحول اور کیفیت و کمیت کے مطابق ایک روپ ایک ڈھانچہ، ایک شکل، ایک ہیئت و جسم اختیار کرتی ہے۔ زبان کا تعلق انسان سے ہے اور رسم الخط کا تعلق زبان سے اور اسی مناسبت سے رسم الخط کا تعلق بھی انسان کے ساتھ مقدم ہے۔ انسان اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی و ترسیل زبان کے وسیلے سے کرتا ہے اور جب ان جذبات و احساسات کو محفوظ کرنے کی خواہش ہوتی ہے تو انسان اپنی زبان کے صوتی و لسانی خدوخال کے مطابق ایک منفرد رسم الخط کو اپنا لیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرنے لگ جاتا ہے۔ آج جو کچھ بھی انسان نے میراث کے طور پر پایا ہے تو صرف زبان اور رسم الخط کے وسیلے سے۔ اور اگر آثار قدیمہ کے وسیلوں سے اپنے اسلاف کے کارناموں اور قدیم تہذیب و تمدن کی باتوں کو جاننے کا شرف حاصل ہوا بھی ہے تو اس صورت میں بھی انسان کو ان باتوں کی تفسیر و تعمیر کے لئے زبان ہی کا سہارا لینا پڑا ہے۔ اور جب اعمال کے اندر زبان کے ہوا میں تحلیل ہوجانے کا اندیشہ موجزن ہوا تو انسان نے متعدد علامات و نشانات کا سہارا لینا شروع کیا۔ جب ان سے بھی تحفظ کی راہ میں تشکیک پیدا ہوئی تو اس نے رسم الخط زمان و مکان کے لحاظ سے ایجاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متضاد جغرافیائی ماحول کے اعتبار سے انسان نے اپنے لئے رسم الخط بنایا جو اس کی نفسیات و جبلت کی پوشیدہ باتوں کا امین بننے میں کامیاب ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ زبانیں اپنے رسم الخط کے ساتھ ہی اپنے ارتقائی منازل کو طے کرتی رہتی ہیں اور اپنے رسم الخط کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے۔ اردو زبان کے پس منظر میں ایک طویل تاریخ پوشیدہ ہے۔ عربی، ایرانی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے اسرار سربستہ کی نقاب کشائی کے لئے اردو زبان نے بھی اپنا منفرد رسم الخط اختیار کیا ہے جس کو کسی بھی حال میں ترک کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اردو اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ ہی جینا چاہتی ہے۔

زبان اردو نے عربی وفارسی رسم الخط کو تو اپنایا ہی ہے ساتھ ہی اس پر عربی وایرانی تہذیب وتمدن کے اثرات متعلقہ زبان وادب کے توسط سے مرتب ہوئے ہیں۔ صوتی اعتبار سے اردو زبان نے اپنی دلکشی وحسن کے اضافہ کے لئے چند عربی وفارسی آوازوں کو اپنے دامن وسیع میں جگہ دی ہے جو اب اس زبان کی مشاطگی کے لوازمات ہی نہیں، اس کی زندگی کے اجزائے ترکیبی بھی ہیں جن کو اس زبان سے کسی بھی حالت میں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں چند ایسے عربی وفارسی مصمتے استعمال ہوتے ہیں جن کے مترادفات مذکورہ ومتعلقہ زبانوں کے علاوہ کسی دوسری زبانوں کے مصمتوں میں نہیں مل سکتے۔

کلیم اللہ صاحب اپنے مضمون میں زبان اردو اور رسم الخط کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے معصومیت جھلکتی ہے اور یہ معصومیت حد سے تجاوز کر کے بیوقوفی کی سرحد کو پار کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایسا لگتا ہے کہ موصوف لسانیات کے اصول ونظریات سے مطلقاً واقف نہیں ہیں ساتھ ہی یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ موصوف بارہ برس دہلی میں رہے مگر بھاڑ ہی جھونکا کئے۔ چنانچہ ان کے مضمون کے حوالے سے چند حقائق کی طرف اشارہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں تاکہ ان کی طرح کے دوسرے سرپھرے لوگوں کو اپنی معصومیت نما بیوقوفی کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ اب آئیے موصوف کی زبان کے متن کا بیّن مشاہدہ کیجئے۔ اپنے مضمون میں موصوف کی زبان کے علمیت کا بھدّا مظاہرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

" اس صورت حال کو بدلنے کا ایک اہم راستہ یہ ہے کہ اردو کے رسم الخط کو بدلنے پر غور کیا جائے اور اب تک اس کے بارے میں جو غلط اور محض تصوراتی جذباتی رہے ہیں انہیں بدلا جائے اور سائنٹیفک نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ پچھلے پچاس سال میں دنیا کے کئی ملکوں نے اس طرف قدم اٹھایا ہے۔ ترکی نے عربی وفارسی رسم خط کی جگہ رومن خط اختیار کیا۔ سوویت یونین کی ازبک، ترکمان اور آذربائی خطّے کی جمہوریتوں میں جہاں ایک طرح کی ترکی زبانیں رائج ہیں فارسی رسم خط کی جگہ روسی رسم خط اختیار کر لی گئی ہے۔ انڈونیشی، ویت نامی اور کئی زبانوں نے بھی اپنے پرانے رسم خط بدل کر رومن خط اختیار کر لیا ہے۔"

لیجئے، موصوف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ترکی نے سیاسی انقلاب کی وجہ سے اپنے تحفظ کے لئے رومن رسم الخط کو اپنانا اپنا مقدر سمجھا۔ حالانکہ یہ کوشش بھی سراب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی کوئی بہت بڑی زبان نہیں ہے۔ ادب کے ذخیرے کے اعتبار سے یقیناً یہ دولت مند ہے۔ لیکن اس کے بولنے والے کی آبادی کے اعتبار سے بہت ہی چھوٹی اور محدود زبان ہے۔ اسی طرح ازبک، ترکمان اور آذربائی کے خطے کی جمہوریتیں بھی ایسی جگہیں ہیں جہاں روسیوں کا بول بالا ہے۔ روسی زبان چھوٹی اور محدود زبانوں کو اپنے بے صبر حلق کے نیچے اتار لینا چاہتی ہے، مذکورہ زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد محض ۴۰ (چالیس) لاکھ کے قریب ہے۔ دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ فی الوقت مذکورہ جمہوریتوں کے باشندوں کو احساس نہیں ہو رہا ہے اور یہ انقلاب ابھی صرف پچاس سال ہی تو گذرے ہیں اور پچاس سال کے اندر کسی بھی تہذیب وتمدن کے خاطر خواہ عروج

[illegible] کرنا دشوار سا امر ہے۔ اور کم از کم تہذیب و تمدن کی ودیعت کردہ چیزیں جیسے زبان اور رسم الخط کی
[illegible] کی ترقی و تنزلی کے ضمن میں کسی نتیجہ پر پہنچنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ لسانیات گواہ ہے کہ اس نوع کی متعدد
زبانیں اپنی زندگی سے محروم ہو چکی ہیں۔ اور بعض زبانیں رو بہ زوال بھی ہیں۔ ازبک، ترکمان، آذربائی کے خطے کی
جمہوریتوں کے لوگ ظاہر ہے کہ مایوسی و ہراس کی وجہ سے فارسی اور سر برآوردہ زبان کا سہارا لے کر زندگی کی راہوں
پر گامزن ہیں۔ ایسا کر کے انہوں نے کوئی بڑا کارنامہ تو انجام نہیں دیا ہے جس کی مثال آنے والی نسلوں کے سامنے
پیش کی جائے۔ چنانچہ لسانیات کے اصول و ضوابط کے پیش نظر اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ یہاں کی زبانیں
سو دو سو سالوں کے درمیان ختم ہو جائیں گی۔ جہاں تک انڈونیشیائی اور ویت نامی زبانوں کا تعلق ہے تو
ان کا وہی حشر ہوگا جو مذکورہ زبانوں کی سرشت میں مستقبل بعید میں واقع ہوگا۔ زبان اور اس کا رسم الخط
اور تہذیب و تمدن کوئی ایسی ویسی چیزیں نہیں ہیں جو دو چار سال یا بیس پچاس سال کے اندر ختم ہو جائیں۔
جب تک ان کے پیروکاروں اور استعمال کرنے والوں کا وجود صفحۂ ہستی میں باقی رہے گا تب تک یہ تمام چیزیں
باقی رہیں گی۔ بشرطیکہ متعلقہ چیزوں کے تحفظ و بقا کے لئے خاطر خواہ تنظیمی و تشکیلی اقدام کئے جائیں۔

زبان اردو مذکورہ بالا زبانوں کی طرح محدود اور قلیل زبان نہیں ہے کہ وہ اپنے موجودہ رسم الخط کو
بدلنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس لئے کہ یہ زبان ایک لنگوافرنیکا ہے جس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد
کئی کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ اردو اپنی موجودہ آبادی کے اعتبار سے اپنے موجودہ رسم الخط سے جدا
ہونے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی۔

اردو میں جہاں تک کلاسیکی ادب اور مشاہیر شعراء کے کلام اور تخلیقات کا فقدان کا مسئلہ ہے تو
اس کو محنت و کاوش اور مستعدی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کسی شخص کے مرض کے
علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا ہے نہ کہ جسم کے خوف سے چمڑے کو ادھیڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔
بعینہ ہی اردو زبان کے مسائل اور رسم الخط کی چند خامیوں کی بیماری کی وجہ سے اس کو اپنے چمڑے یعنی رسم
الخط سے الگ نہیں کر کے متعلقہ امراض مسائل کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اردو زبان
کو رومن رسم الخط کے سفید چمڑے سے ہم آہنگ کر کے بے ڈھب اور بدشکل کر دیا جائے۔

موصوف اپنے مضمون میں ایک جگہ مزید رقم طراز ہیں ——

"یہاں میں دیوناگری لپی اختیار کرنے کی حمایت نہیں کر رہا ہوں۔ اگر ہمیں اردو کو مٹنے
اور دوسری زبانوں میں جذب ہونے سے بچانا ہے تو رومن رسم الخط اختیار کر لینا چاہئے۔"

لیجئے جناب! یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ موصوف ایک طرف یہ بھی خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اردو کو
اور دوسری زبانوں میں جذب ہونے سے بچانے کے لئے رومن رسم الخط اختیار کر لینا چاہئے۔ یعنی ایک طرف
…ی رسم الخط کی "دیونگری" مصلحت پسندی اور نازیبا سیاست سے بچنے کی نصیحت بھی دیتے ہیں اور
جانب رومن رسم الخط کے گھڑیال کے خطرناک حلقوم میں اردو کو جھونکنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں اور الٹی سیدھی بات کہہ گذرنے سے ذرا تامل بھی نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے مشورہ کو عمل کے دائرے میں لانا تو درکنار سننے کے لئے بھی وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اور بالفرض اگر موصوف کی دلجوئی کے لئے اردو زبان اپنے موجودہ رسم الخط کی بجائے رومن رسم الخط کا لبادہ اوڑھ بھی لے تو کیا یہ اقدام صرف ہندوستان بھر ہی میں لئے جائیں؟ پاکستان، بنگلہ دیش، ماریشس، روس اور دنیا کے دیگر ممالک کی اردو آبادی کا کیا ہوگا؟ کیا وہ بھی رومن رسم الخط کو اپنا لیں گے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر موصوف کی نظر میں ایسا قدم لینا ممکن بھی ہے تو ان کو "انترمنترہ" کی جھولی لے کر رومن رسم الخط کی تبلیغ واشاعت کے لئے کمربستہ ہونا چاہئے۔

حضرت کو کم ازکم یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اردو زبان اپنے موجودہ رسم الخط کی وجہ سے ہی شناخت کے دائرے میں آتی رہی ہے اور آتی رہے گی۔ ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آشنا ہونا چاہئے کہ اردو زبان و ادب کے قدیم وجدید نمونوں میں عربی وفارسی کی بھرمار ہے اور انہیں الفاظ کی وجہ سے اس زبان کی شان و شوکت، دلربائی، جاذبیت اور حسن و دلکشی کے عناصر موجزن ہو سکے ہیں اور ان الفاظ واصوات کے نعم البدل دیوناگری اور رومن رسم الخط نہیں ہو سکتے۔ صرف یہی نہیں عربی وفارسی رسم الخط سے قطع نظر دنیا کا کوئی رسم الخط اس کے قائم مقامی کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ اردو اپنے "ہندوستانی پن" کو ثابت کرنے کے لئے بیشتر بلکہ پچھتر فی صد ہندوستانی آوازوں کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اپنے آپ کو ہندوستانی کہلانے کا مستحق ہو سکی ہے۔ اور فرض کیجئے کہ اگر رومن رسم الخط کو اپنا بھی لیا جائے تو اردو پاکستانی زبان (اب یہ الزام ذرا قدیم ہو گیا ہے) کے علاوہ ولائتی زبان بھی کہلائی جانے لگے گی۔ اور اس لئے بھی یہ زبان مزید الزام کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

دوسری جانب یہ حقیقت بھی پیش نظر ہونی چاہئے کہ ہر زبان کا رسم الخط ایک باضابطہ صوتی نظام سے عبارت ہے۔ اس صوتی نظام میں حسب ضرورت ترمیم وتنسیخ تو کی جا سکتی ہے لیکن اس کی شکل وہیئت کو کلی طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان بھی اپنا منفرد صوتی نظام رکھتی ہے جس کی نمائندگی کے لئے اس کے پاس مخصوص ومنفرد رسم الخط بھی ہے۔ اس زبان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرنا چاہئے جو کسی بڑی اور لائق اعتبار زبان کے لئے اپنایا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اردو رسم الخط حسب ضرورت، مناسب اور قرین تکمیل ہی نہیں بلکہ سائنسی بھی ہے۔

اردو رسم الخط کے پاس ایسے مصوتے ہیں جن کے قائم مقام عربی وفارسی رسم الخط کو چھوڑ کر دنیا کی کسی بھی زبان کے حروف نہیں ہو سکتے۔ دیوناگری اور رومن رسم الخط کی کیا مجال کہ اس فریضہ [illegible] دے سکیں۔ مثال کے طور پر ث، ش، ص، ء، غ وغیرہ مصمتوں کی آوازوں کی ادائیگی میں موخرالذکر رسوم تحریر کے اندر صلاحیت ہی نہیں ہے "ث" کی ادائیگی میں رومن رسم الخط کا کوئی بھی حرف کامیاب [illegible]

گیا

اس لئے کہ اس کے پاس محض ایک ہی صفیری نوکیلی مصمتہ (Fricative-apical consonant) 'S'
...ی کی وجہ سے 'ث' کی آواز کی ادائیگی کی ناکامیاب کوشش میں اس کو معافی مانگنا ہوتی ہے اور اگر
... یہ سستی ناکام کوشش بھی کی جائے تو 'وارث' کو 'Waris' اور 'ورثہ' کو 'Warsa' تحریر کیا جائے گا۔
... معنی کچھ سے کچھ ہو جانے کا امکان ہے۔ اسی طرح ذ، ز، ژ، ض، ظ جیسے تقریباً ہم صوت حروف کی قائم
مقامی کے لئے رومن رسم الخط کو ناکامیابی ہاتھ آجاتی ہے۔ اور غیر فطری طور پر ایسا کرنے کی کوشش کی بھی
جائے تو 'لہٰذا' کو 'Lahaza' 'زاہد' کو 'Zahid' 'نظر' کو 'Nazar' 'نذر' کو 'Nazr' 'ژاژ' کو 'Zaz' 'اژدہام'
کو 'Azdaham' 'ضبط' کو 'Zabt' 'بہر' کو 'Bahar' اور 'بحر' کو 'Bahr' لکھا جائے گا۔ نتیجہ یہ
ہوگا کہ استقاق و معنی کی تفہیم میں پیچیدگی پیدا ہو جائے گی اور اردو زبان ایک قابل حل معمہ بن جائے گی۔
اس لئے کہ رومن رسم الخط میں اردو کی مذکورہ آوازوں کے لئے محض ایک ہی حرف 'Z' ہے۔ اور اس
طرح کے بے شمار پیچیدگیاں ایسی صورت میں پیدا ہو جائیں گی۔

چنانچہ سائنسی دور میں فقدان وقت کے پیش نظر یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ اردو اپنے رسم الخط کو مناسب اور جائز قرار دیتی ہے اس لئے بھی جاتے جاتے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان سے "اردو رسم الخط" کو جدا کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔

★

حسین الحق ______

سورج کی پیٹھ پر

آقائے اسفندیار نفسی نے ٹھنڈا سانس لے کر ریڈیو بند کر دیا۔

اب سننے کو باقی کیا رہ گیا تھا؟

"بند کیوں کر دیا؟ خبروں کے بعد کلاسیکی موسیقی کا بڑا شاندار پروگرام ہوتا ہے" آقائے اسفندیار نفسی کی بیوی خانم دلفروز نے کہا جو ابھی ابھی قہوہ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"کیا روز روز یکساں گھسا پٹا پروگرام سنا جائے بھابھی! ذہنی عیاشی کی بھی تو حد ہوتی ہے" آقائے شہریار نے جلدی سے جواب دیا...... اور جواب دینے میں اتنی عجلت کی کہ آقائے اسفندیار سے پہلے جواب دینے کی کوشش عریاں ہو گئی۔

"حال شما بخیر؟" خانم دلفروز قہقہہ مار کر ہنس پڑی "آج تو آقائے شہریار بالکل عربوں کے انداز میں باتیں کر رہے ہیں۔ نہ ہوا فردوسی ورنہ چالیس ہزار اشرفیوں کے بجائے صرف تمہاری زبان طلب کرتا"

شہریار اور اسفندیار دونوں ہلکے سے مسکرا کر رہ گئے۔ خانم دلفروز مسکراتی ہوئی واپس جا چکی تھی۔

"یہ سب تو ممکنات میں تھا" اور ایسا ابھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ان کی پردہ پوشی سے کیا حاصل؟" جب خانم دلفروز اندرون حویلی میں جا چکی تو اسفندیار نے … مسکراہٹ کے ساتھ شہریار سے پوچھا۔

"عورتیں بہت جذباتی ہوتی ہیں اور موسیقی کی دلدا… بھی، میں نے وقتی طور پر بھابھی کو ایک جذباتی دھچکے سے بچایا ہے ورنہ خبر تو انہیں بھی آج یا کل مل ہی جائے گی" آقائے شہریار نے بڑی آہستگی سے اور ٹھہر ٹھہر کر کہا اور … ٹیبل پر پڑا دیوان حافظ اٹھا کر دیکھنے لگا، اور چاروں طرف ٹڈیوں کے پنجروں کی کھڑکھڑاہٹ گونجتی رہی۔

شہریار حافظ کی دیوان ہاتھ میں لئے چپ بیٹھا تھا اور اسفندیار سر کو صوفے کی پشت سے ٹیکے … میں گم تھا کہ اسفندیار کا بڑا لڑکا تبریز آندھی طوفان کی طرح داخل ہوا اور دونوں چونک کر اور اپنے اپنے صوفوں … سنبھل کر بیٹھ گئے، تبریز خاکی لباس پہنے ہوئے … پر ایک بڑا سا بلّا لگائے ہوئے تھا، جس پر بڑے … موٹے حرفوں میں لکھا تھا...... "مرگ بر......"

اسفندیار اتنا ہی پڑھ پایا تھا کہ تبریز اتنی … تیزی کے ساتھ اندرون حویلی میں چلا گیا۔

"کیوں آقائے اسفندیار؟ آدھا پڑھ کر رک کیوں گئے؟ آئندہ نسل کو اس کے مکمل وجود اور وجود کی … خصوصیات کے ساتھ تسلیم کرنے کی عادت ڈالو …" شہریار کے لہجے میں شکست کی ٹوٹن اور آگہی کے … کی امتزاجی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔

"حبیب من" اسفندیار نے شہریار کی طرف … "تبریز صرف ایک وجود نہیں وجود کے … استعارہ ہے اور یہ استعارہ …

[illegible] ہے۔ اور اسفندیار اور شہریار بھی وجود کے ایک
[illegible] استعارہ ہیں مگر یہ رخ صبا رفتار اسپ تازی کا
نہیں [illegible] اور خمیدہ کمر گھوڑی کا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ
[illegible] کمر گھوڑی کسی اسپ تازی پر نگاہ ٹھہر نہیں سکتی۔"
آقائے اسفندیار کی آواز میں سمندروں کا اوپری
[illegible] اور خزاں کی بھری دوپہر کا سناٹا شامل تھا۔
"لیکن یہ سب کچھ کیسا عجب ہے آقائے اسفند۔
یار؟" آقائے شہریار نے دیوانِ حافظ بند کرتے ہوئے
کہا۔ "کہ وقت ہمارے ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے
اور ہم ماضی کی گرد کو اپنی پیشانیوں کا صندل سمجھ رہے
ہیں۔"

"لیکن پیارے بھائی۔ مستقبل تو ہمارے لئے
سبک ہندی والے غالب دہلوی کا مصرعہ بنا ہوا ہے۔"
ماشاء اللہ۔ یہ نیا انکشاف ہے، اردو شاعری کا
مطالعہ کب سے شروع کیا، کیا سمجھتے ہو؟ ہندوستان اس
لالچ میں آکر ہماری تاریخ کے تسلسل کو روک لے گا؟"
"ارے نہیں، توبہ توبہ" آقائے اسفندیار قہقہہ
لگا کر ہنس پڑا جیسے اچانک وقت کا سارا بھیانک پن
اس کے ذہن سے نکل کر فراموشیوں کی وادیوں میں
پھیلی دھند میں کھو گیا ہو ـــــ لیکن پھر پل بھر ہی
میں دوبارہ اس کا چہرہ اس کے عہد کی ساری اذیتوں
دہشتوں اور خوفناکیوں کا اشاریہ بن گیا۔ "جب زندگی
صرف گھر کی چہار دیواریوں تک محدود ہو جائے اور اس
اذیت کی مدت طویل ہو تو اپنے ادب اور دیگر علوم
کے بعد تو ہمسایوں ہی کے ادبیات اور علوم و فنون
کا [illegible] آئے گا۔" اسفندیار نے اتنی آہستگی سے کہا جیسے
[illegible] کہ کہیں دیواریں اس کی بات نہ سن لیں۔
"اگر یہ [illegible] ہے تو خدا تمہاری عمر دراز کرے،

تم دنیا کے تمام علوم و فنون پر سند ہو جاؤ گے۔"
آقائے شہریار اٹھتے ہوئے مسکرایا اور پنجوں کے
بل چلتا ہوا دریچے کی طرف بڑھ گیا۔
"جیبی" اسفندیار نے آہستہ سے پکارا۔
"کیا ہے؟" شہریار بھی پنجوں کے بل چلتا ہوا دریچے
تک جا پہنچا۔
"کچھ سنتے ہو؟
"کیا؟"
"یہ چیخیں؟ یہ کراہیں؟ وہ دیکھو .... دیکھو..
.... دھند کا بہانہ مت خلق کرو ...... صلیبیں صاف
نظر آرہی ہیں، ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمارے یہاں ایک
عیسیٰ اور ایک عباس نہیں پیدا ہوا، سیکڑوں عیسائوں
اور سیکڑوں عباسوں نے جنم لیا ...... دیکھو ...... دیکھو۔
.... صفیں لگی ہیں ...... وہ گیا ...... اور وہ گیا ...
اور وہ گیا ...... ہم بھی عیسیٰ ہیں اسفندیار! ہم بھی عباس
ہیں ...... ہمارے بھی بازو کاٹ لئے گئے ہیں .... اور
ہمارے خدا نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے؟"
"نہیں اسفندیار۔" شہریار نے مسکرا کر کہا۔
"ہم عیسیٰ اور عباس نہیں ہیں .... ہم سعد ہیں ....
اور باہر چاروں طرف ابنانِ سعد گھوم رہے ہیں۔
شہریار اور اسفندیار دونوں دریچے پر کھڑے
سرگوشیوں میں الٹی سیدھی باتیں کرتے رہے اور
دریچے سے باہر کی فضاؤں میں چیخیں اور کراہیں گونجتی
رہیں ـــــ سرو کے درختوں کا قد کم ہو گیا تھا اور
لالہ سر جھکائے کھڑا تھا کہ اب کے رستم و سہراب نے
ایک دوسرے کو پہچاننا تو درکنار، پہچان کر بھی نہ
پہچاننے کی عیاری میں نجات جانی ـــــ"
اور فضاؤں میں پنجروں کی کھڑکھڑاہٹ گونج رہی تھی

"برادر عزیز از جان" اسفندیار اشہر کی طرف مخاطب ہوا۔ "ابھی تم نے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" اشہریار نے نظریں اٹھائیں

تم نے کہا، ہم سعد ہیں اور باہر چاروں طرف بہت سے سعد گھوم رہے ہیں۔

"بلے برادر!"

یکے رنگ فیصلے کی ساعت دھند میں کھو چکی جان من...... ہمارے ہمسائے کے یہاں صدیوں پہلے ایک جنگ لڑی گئی تھی جس میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ حق پر کون ہے...... ہم پر یہ ساعت صدیوں بعد آئی ہے کہ دوسرا ہمسایہ ہمیں ملزم ٹھہرا رہا ہے جب کہ ابتدا اسی کی طرف سے ہوئی ہے۔

"ہاں مگر انتہا تک پہنچانے میں ظالم کی شناخت کا عمل کیا صحیح جہت سے تکمیلیت کو پہنچا ہے؟

تم نے ابھی جس ہمسائے کا تذکرہ کیا، اس کے یہاں بھی یہ عمل ہمیشہ متنازعہ فیہ بنا ہے اور اس کے یہاں جانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ ہماری اپنی تاریخ کے صفحات پر بھی ایک قصبے کا تذکرہ موجود ہے۔

"ہاں..... اس قصبے کے کتے ہم ہیں!"

"برادر! تو نے کیا بات کہہ دی..... تجھے خبر ہے؟"

"ہاں میں اپنے عندیے سے باخبر ہوں!"

"نہیں برادر! یہ بحران اور سکرات کا عالم ہے، اس عالم میں مناظر بھی دھند میں کھونے لگتے ہیں اور خیال بھی...... تم اپنے بیان کی ہشت پہلویت سے خود آگاہ نہیں ہو، یا بعد کے توسیعی مراحل پر تمہاری نگاہ نہیں گئی ورنہ تمہیں اس مسافر کا حال یاد رہنا چاہئے تھا جو اس قصبے میں ایک رات کے لئے ٹھہرا اور میزبان نے رات کا پر تکلف دعوت کے بعد اسے ایک نہایت اندھیرے کمرے میں بند کر دیا۔ اور وہ رات بھر بستی میں خونخوار کتوں کی غراہٹیں سنتا رہا اور ایک دوسرے پر جھپٹنے اور ایک دوسرے کو نوچنے کی کیفیت محسوس کرتا رہا اور علی الصباح جب میزبان نے دروازہ کھولا تو اس کا چہرہ لہولہان نظر آیا، دریافت حال پر میزبان زار و قطار گریہ میں گرفتار ہوا اور یہ گویا ہوا کہ تمام رات اپنے آپ کو نوچتے رہنا ہماری تقدیر ہے۔"

"تب تو برادر گویا کہ ہم رات کے مسافر ہیں!"

"نہیں رات ہماری راہ میں آن کھڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں یہ طویل رات دھند میں گم ہے کہ چاند اور سورج ہمارے منطقے پر جگمگانا اور طلوع ہونا بھول گئے ہیں۔"

"مگر تبریز تو مرگ کا علم بردار ہے اور علویت و الوہیت کے درمیان حد فاصل قائم کرنے والا واپس آچکا ہے۔!"

"کیا واقعی حدِ فاصل قائم کرنے والا واپس آچکا؟"

"یہ ایک دوسرا سوال ہے۔"

"یہ دوسرا سوال کیسے ہو گیا برادر؟"

"ہاں یہ دوسرا سوال ہے کیونکہ فی الحال ہمارے لئے یہی بات زیادہ اہم ہے کہ وہ جمرۃ الاولیٰ کو پتھر مار رہا ہے۔ تب ایسے میں اگر کچھ ریزے چھٹک کر ادھر ادھر پڑ جائیں تب بھی اسے برداشت کرنا چاہئے کہ وہ آپ ہی آپ ایک زیادہ بڑے فریضے کی انجام دہی میں سرگرم ہے۔"

تو شہریار قہقہہ مار کر ہنسا......

ہنستے ہنستے بے دم ہو گیا......

اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ رونے لگا اور پھر بھی ہنسی گریہ آمیز ہنسی بھری سرگوشی میں بولا۔ "وہ ہمیں اکیلا کر رہا ہے اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہم اسے بیوقوف بنا رہے ہیں، قومی زندگی کا یہ ڈرامہ کتنا بھیانک

[illegible] بنتا ہے نظریہ قرار دینے کو جی چاہتا ہے۔ [illegible] الاولیٰ ہی اس کا نشانہ ہے تو سفارت خانے پہ عتاب کیوں ٹوٹا، مشرق و مغرب سب کی نفی کرنے والا، حدفاصل ہونے کا دعویٰ کرنے والا اپنے کتنے آدمی قربان کر چکا، شوریٰ کو اس نے پیروں تلے روندا، ظالم مظلوم کی شناخت کے نئے نئے معیارات اس نے قائم کئے آدمی کا گوشت کھانے والی کے بیٹے کا جادو چشم اس نے اوڑھا، میلی کچیلی گندہ عورت کی کوکھ میں پڑنے والے نطفے کا قلم اس نے سیکھا اور اس کے بعد بھی حدفاصل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ یوٹوپین اسٹیٹ کا شہری ہے اور عصری تقاضوں پہ تھوک کر ہنسنے کے مواقع پیدا کر رہا ہے دشمنوں کی تعداد بڑھانے والا بے دماغ بنیاد پسند چاروں طرف سے گھیرا جا رہا ہے اور اسے خود اپنے ارد گرد پھیلائے جانے والے جال کا پتہ نہیں کہ قلعہ بند کم از کم کھڑکی بھی کھولتا تو باہر کی فضا کا اندازہ ہو جاتا ....."

آقائے اسفندیار نفسی خاموشی سے شہریار کی باتیں سنتا رہا اور "گارجین" اور "لندن ٹائمس" کو پھٹے پرزے کر کے ویسٹ پیپر باسکٹ میں پھینکتا رہا۔

"پرانے اخبارات ہیں برادر!" شہریار نے ہنس کر کہا اور اسفندیار خفیف سا ہو گیا، پھر کچھ دیر بعد جانے کیا سوجھی اور بڑبڑانے لگا۔ "ظالم خود ہی پشیمان ہوتا ہے اگرچہ اس کی تعریف ہی کیوں نہ کی جائے اور مظلوم صابر ہوتا ہے اگرچہ اس کی سرزنش ہی کیوں نہ کی جائے۔" شہریار اس کی بڑبڑاہٹ سن کر چونکا، کچھ دیر خموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

پھر اس کی طرف بڑھا، اس کے قریب آیا، جھکا [illegible] دونوں ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھے اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "موت قریب ہے اور یہ تیرے اختیار میں نہیں ہے، دن اور رات تیزی سے گذر رہے ہیں، ایک لمحہ گذرنے نہیں پاتا کہ زمانہ بیت جاتا ہے، اپنی موت کی تعظیم کر اور ہمیشہ اس کے لئے تیار رہ۔"

اچانک دونوں چونک پڑتے ہیں۔

باہر سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوتی ہیں، کچھ لوگ چیخ رہے ہیں، کچھ لوگ قہقہے لگا رہے ہیں ......"

شہریار اور اسفندیار پنجوں کے بل چلتے ہوئے دریچے تک جاتے ہیں اور دریچے کے شگافوں سے جھانکتے ہیں۔ ایک جماعت ایک جماعت کو کھینچتی ہوئی پابجولاں لئے جا رہی ہے۔

کھینچنے والے خوش ہیں اور کھینچے جانے والے گریہ کناں ....."

سعد اور ابان سعد ......" اسفندیار بھینچے بھینچے لہجے میں بولا۔

ان میں سعد کون ہے اور ابان سعد کون ہے؟ شہریار نے بھاری آواز میں پوچھا۔ آواز اتنی بھاری اور بوجھل تھی جیسے ہزاروں من بھاری چٹان سے دبی ہو۔

تو اسفندیار کیا جواب دیتا!

اسفندیار کوئی جواب نہ دے سکا اور خلاؤں میں ایک تحریر جھلملاتی رہی۔

"نہ بہ آرزو بے نیاز تواں شد، نہ بجوہ آرائی جوان"

(نہ تو آرزوں سے چھٹکارا مل سکتا ہے اور نہ جوانوں کو [illegible] ہے)

تو خود آرا جوان سارے میں پھیلے ہوئے ہیں اور "ساواک" کا طعنہ عام ہے۔ وقت وقت کی بات ہے، زندگی یوں رنگ بدلتی ہے جیسے دھنک پھیلے اور پھر کچھ دیر بعد معدوم ہو جائے، کہاں ہے؟ [illegible]

...ں ہے ؛ جواب کون دے گا ؛ شہنشاہ داریوش کہتا ہے وہ حکومت جو ہمارے گھر سے جدا کر دی گئی تھی، ...ں نے وہ سب کچھ واپس لے لیا جو کہ چھین لیا گیا تھا، ...ں نے اپنے قبیلہ کی حالت ویسی کر دی جیسی کہ اس وقت تھی جب کہ کومٹ   نے اسے تہس نہس کیا تھا؛

داریوش شہنشاہ نے کہا
شہنشاہوں کو کہنے سے کون روک سکا ہے ؟
جس شہنشاہ نے جو کہنا چاہا وہ کہہ گیا جو کرنا چاہا وہ کر گیا

شہریار دریچے پر کھڑے کھڑے اچانک مڑتا ہے اور اسفندیار کے شانوں پہ ہاتھ رکھتا ہے

جب ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی تو اسفندیار چونکا "کیا بات ہے ؟"

"بتاؤ گے ؟" شہریار کا لہجہ عجیب سا ہے، آواز آنسوؤں میں گھلی ملی ہے مگر آنکھیں خشک ہیں

"کیا ؟" اسفندیار استفہامیہ انداز میں اس کی طرف متوجہ ہے۔

صبحوں اور شاموں کے اس طویل سفر میں سچ کا پیمانہ کتنی مرتبہ بدلا گیا اور کس نے تبدیل کیا اس کی تفصیل کیسے معلوم ہوگی ؟ ہم مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ مجبور اور بے بس انسان کہ ہمیں اشرف المخلوقات کا لقب دے کر خانہ خرابی کا مقدر سونپا گیا، ہمیں کبھی عجمی کہہ کر مغلوب کیا گیا اور اختلاف رائے کی سزا کے طور پر ہمیں بے گھر کر دیا گیا، کبھی غلیظ کھانے والا بتا کر حاصل کئے ہوئے علاقوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا گیا کبھی سائنس کا جشن منا تو ہم نے خود کو اجنبی محسوس کیا۔ "ساولک" والوں نے سپاٹ اور سادہ نظروں سے بھی دیکھ لیا تو چند جھڑکی زد میں آئے بچے کی طرح ہم نے خود کو مجبور میں گھرا محسوس کیا، مخالف، منافق اور واجب القتل ٹھہرایا گیا تو ہم اپنی نظروں میں خود غیر ہو گئے۔ اپنے سے خود خوف کھانے لگے، اپنے آپ پر سے اعتبار اٹھ گیا کہ جانے ہمارا کون سا عضو ہمارے خلاف گواہی دے کہ شہنشاہ فلاں اور شہنشاہ فلاں اور شہنشاہ فلاں نے کہا تو سچ کہا، لیکن سچ کیا ہے ؟ عام آدمی کا کہا اور محسوس کیا ہوا ؟ یا وہ جو شہنشاہ کہتا ہے ؟ سچ کو سچ سمجھنے کا کا پیمانہ کیا ہوگا ؟

اسفندیار سنتا رہا اور سنتے سنتے اچانک دریچے کے پاس ہی دو زانو بیٹھ کر دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا لیتا ہے ...... اور انتہائی ملتجی انداز میں کہتا ہے —

وہ کون ہے جس نے سورج اور ستاروں [illegible] دکھایا ؟
اس زمین کا نگہبان کون ہے ؟
اور اوپر آسمان کا جو کبھی نیچے ڈھلک [illegible] اترتا ؟
کون ہے اس پانی اور سبزہ زار کا پیدا کرنے والا ؟
اس کار آمد روشنی اور تاریکی کا خالق کون ہے ؟
خوش آئند خواب اور بیداری کس نے پیدا کئے ؟
اے مزدا سچ کی طرف میری رہنمائی کر !

شہریار اس کے دعائیہ پوز کو ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا ہے جس میں بے بسی اور طنز دونوں شامل دکھائی دیتا ہے !

وہ کچھ دیر اسفندیار کو اسی طرح دیکھتا رہتا ہے اور جھک کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور مسکراتا ہے !

ایسی مسکراہٹ جیسے کسی موسیقار کو پھانسی کی سزا سنانے کے بعد ستار دیدیا جائے اور [illegible]

...ش کر دی جائے ۔

اسفندیار دوزانو بیٹھا دعائیہ انداز میں بدبدا رہا ہے۔

اور شہریار اس کے دونوں کاندھوں پہ ہاتھ رکھے جھکا ہوا اسے دیکھ رہا ہے۔

ایک مرتبہ پھر اسفندیار اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

تو شہریار اسی دو دھاری تلوار کی سی مسکراہٹ میں کہتا ہے۔

پوچھ ہی رہے ہو تو یہ بھی پوچھ لو کہ ہم کیا ہیں؟ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس رنگ بدلتی دنیا میں ہم کون سا رنگ اپنائیں؛ سارے رنگ جھوٹے نکلے، ایسے کچے اور جھوٹے کہ ایک صدی بھی کوئی ٹھہر نہیں پایا، پوچھ ہی رہے ہو تو پوچھو کہ ہم کیوں جیتے ہیں؟ ہمارے جینے کا جواز کیا ہے؟ جب کہ ہمارے عمل کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ وہ کریں گے جو پیدائش کے پہلے لمحے سے موت کے آخری لمحے تک ہمارے دکھ سکھ کے شریک بھی نہیں ہوتے، کرسی فیصلہ کرتی ہے کہ فلاں ہمارا دوست ہے اور فلاں دشمن، فلاں شئے حرام ہے اور فلاں شئے حلال ......

پوچھ سکو تو پوچھو کہ ان بچوں اور بیویوں کا کیا قصور تھا جنہوں نے تڑپ تڑپ کر پل کے پل میں راکھ بنتے اور خاک ہوتے باپوں اور شوہروں کو دیکھنے کا کرب سہا!

تم اگر میرے دوست نہ ہوتے تو میں تمہیں واجب القتل سمجھتا! اسفندیار جھلا کر کہتا ہے۔

"خوش نصیب ہیں وہ": اچانک شہریار چیخ پڑتا ہے: "جنہیں تمہارے نام نہاد "علوی حکم" نے واجب القتل ٹھہرایا، ہم جیسے لوگ تو بد نصیب ہیں کہ قسطوں میں مرنا ہماری تقدیر ہے ...... یہ زندگی ہے؟ اسے زندگی کہتے ہیں؟ یہ زندگی نہیں ہے اسفندیار..... یہ جہنم ہے۔"

شہریار کا لہجہ آنسوؤں سے تر ہے اور وہ اپنی سسکیاں روکنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

اور اس جہنم میں کھلتے کھلکھلاتے گلاب، بیلے اور جوہی کی کلیاں، لالہ و نسترن کے شگوفے، بلبل، فاختہ اور مور، رودکی کی بوئے جوئے مولیاں اور حافظ کا رکنا باد ...... سب جل رہا ہے ...... اور بچانے والا کوئی نہیں ہے اسفندیار! سینے میں دل ہر پل دھڑکتا ہے، جب کوئی بچہ روتا ہے تو لگتا ہے کہ کہیں کسی سرحد پر، کسی اژدہام میں کوئی ماں مر گئی، کچل گئی، جب کوئی گولی چلتی ہے تو سینہ پھٹتا ہے کہ ایسی ہی کوئی گولی کسی معصوم کی جان لینے والی ہوتی ہوگی ......

تم کیا اور کون سے سچ کی تلاش میں ہو اسفندیار؟ اس کا جواب کس کے پاس ہے کہ یہ سب آب آتش خاک باد سے بنے آدمی ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہیں؟ گلا کسی کا کٹے درد تو یکساں ہوتا ہے پھر آدمی یہ درد محسوس کیوں نہیں کرتا؟ آدمی کس چیز کا مرکب ہے؟ انا عزت، وقار، مذہب، وطن، حق، باطل، کیا ان سب کے ملنے سے آدمی بنتا ہے؟ یا ان نظریات سے الگ بھی آدمی کا ہونا کوئی معنی رکھتا ہے۔ آدمی نظریے اور رویئے کی تخلیق کرتا ہے یا نظریہ اور رویہ آدمی کی تخلیق کرتا ہے۔

شہریار چیخ رہا ہے اور اسفندیار دعائیہ انداز میں بدبدا رہا ہے۔

اے مزدا سچ کی طرف میری رہنمائی کر
اے آہورا! مجھے راہ راست پر گامزن فرما.....!

شہریار اچانک قہقہہ لگاتا ہے۔

"تمہارا آہورا کیا تم کو راہ راست پہ گامزن کرے گا؟ وہ اپنے ہی راستے اہرمن کو آج تک کہاں ہٹا سکا ہے؟ دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا اسفندیار؟ حقیقت بس یہی ہے کہ مزدا ہار رہا ہے، چاروں طرف اہرمن کا راج ہے۔ کیا کیا سوانگ اس نے نہیں بھرے، عزت اور وقار سوانگ۔ مذہب اور وطن کا سوانگ، حق اور باطل کا سوانگ، عزت نفس اور بقائے انا کا سوانگ ...... سانپ رینگ رہا ہے بھائی! اور جانے کن کن جانے انجانے سمتوں سے انسانی داخل میں جگہ بناتا جا رہا ہے....."

اسفندیار نے دونوں کانوں میں انگلیاں دے رکھی ہیں۔

اور زور زور سے جھوم جھوم کر مناجات کے ورد میں مشغول ہے۔

صبح اور دوپہر کا خالق کون ہے؟

اور اس رات کا جو انسان کو عبادت کی طرف لاتی ہے؟

اے مزدا! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ سچ کی طرف میری رہنمائی کر

میں تجھ سے التجا کرتا ہوں اے آہورا! مجھے راہ راست پہ گامزن فرما!

شہریار چیخ رہا ہے اور ہذیانی انداز میں قہقہے لگا رہا ہے!

اور اسفندیار مناجات میں مشغول ہے!

مناجات جاری ہے، گریہ و فریاد جاری ہے، سوالات صف در صف ٹوٹ پڑ رہے ہیں اور جواب شتیلا تھا اور بصرہ کی سرحدوں پہ زخمی پڑا کراہ رہا ہے۔ اور دعاؤں کے لئے اٹھے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ اور آدمی کو راستہ نہیں ملتا، چاروں جانب دھند ہی دھند چھائی ہے اس دھند میں مسافران دشتِ تمنا تامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اور شہریار اور اسفندیار جیسے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند اندازے اور قیاس کی گنبد کے اسیر ہیں کیونکہ شہر پہ آسیب سوار ہے، خانم دلفروز بے خبر ہے اور سچ جاننے کا واحد ذریعہ وہ ہے جو سچ نہیں ہے۔

مگر یہ مسئلہ دراصل شہریار کا ہے

اسفندیار تو ریڈیو سُن کر خوشی سے اتنا بے خود ہو گیا کہ ریڈیو بند کرنا بھی بھول گیا اور خوشی میں ناچنے لگا شہریار نے اس بدمست کو دیکھا جو صرف یہ سُن کر خوشی سے بے قابو ہو گیا تھا کہ بصرہ جانے والی اہم شاہراہ پر قبضہ ہو گیا۔ اور تاسف میں گرفتار ہوا کہ ایں عزیز بے خبر از حق بود، اما بر حق کیست۔ علمبردار لاشریک ملاعزیہ کہ گرفتار آں پیغمبر بے کتاب، دعا دی مختلف اندوہمیں خ بے بصر ......"

شہریار کا جی چاہا کہ چینل بدل دے تاکہ اسفندیار یہ بھی سن لے کہ ہزاروں ہزار کی ہلاکت کی خبر بھی فضا میں گشت کر رہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسفندیار جس چینل پر ٹھہرا ہوا تھا وہاں چینل بدلنے سے بھی کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

تو اسفندیار خوشی میں محو رقص

شہریار اس بدمست کا متاسف انداز میں دیکھنے والا۔

ناچنے والا اور دیکھنے والا، دونوں اپنے اپنے حال میں گم تھے کہ خانم دلفروز بوکھلائی ہوئی داخل ہوئی۔

"ارے کچھ سنا؟"

"کیا؟" شہریار نے تھکے تھکے انداز میں اس کی جانب دیکھا

گو وہ ابھی ابھی آئی تھی ، بتانے لگی کہ موسیقی....."

"دیوار ہم گوش دارد" شہریار نے لپک کر خانم دلفروز کا منہ بند کر دیا۔ "تبریز اندر ہے۔!"

اور اسی لمحہ اچانک فضا بھیانک آوازوں سے بھر گئی۔ چاروں طرف سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ گرجتا گڑگڑاتا آسمان دور سے سفر کرتا آرہا ہے اور گھر کی چھتوں پر ٹک جا رہا ہے۔

ایک لمحہ کے لئے شہریار، اسفندیار اور خانم دلفروز جہاں جس حالت میں تھے وہاں اسی حالت میں کھڑے رہ گئے۔ پھر اچانک جیسے شہریار کو ہوش آیا اور وہ چیخا.....

"بم باری !"

اور تینوں مشینی طور پر زمین پر سینے کے بل لیٹ گئے۔

اور اسی لمحہ ایک زور دار آواز گونجی، گرجتا گڑگڑاتا آسمان چھت توڑ چکا تھا۔

پتہ نہیں کتنی چھتیں ٹوٹیں، کتنے مکانات ملبہ بنے اور ان ملبوں میں کتنے شہریاروں، اسفندیاروں اور خانموں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دنیا کی چھوٹی بڑی مسرتوں کے بارے میں سوچا، آغوچے اور خوبانیاں، گلاب ولالہ، سنبل و نسترن، سرو کے درختوں کی چھاؤں، چنار کی ٹھنڈی ہوائیں، محبوب کا آخری بوسہ، بچوں کی شریر مسکراہٹیں.....کتنی آرزوئیں تمنائیں اور خواب....."

سب دم توڑ چکے تھے، سب آنکھیں موند چکے تھے، سب ملبہ بن چکے تھے۔

اسفندیار بھی اور وہ کتاب بھی جو محو رقص ہونے سے قبل اسفندیار کے مطالعہ میں تھی۔

ملبہ بنے مکان میں ملبہ بنے اسفندیار کے بغل میں ملبہ بنی اس کتاب کا وہ صفحہ دیکھنے والا اب کوئی نہ تھا جس پر ہزاروں ہزار سال پہلے لکھا گیا تھا۔"

دار یوادش شاہ بزرگ شاہان شاہ کشور ہا (دیہا)

گشتاسپ، ہمامنشی نے یہ قصر بنوایا"

ہیہات......ہیہات !!

پتہ نہیں تبریز کس چینل پر دستیاب ہو سکتا ہے؟ اگر کسی کی بھی ملاقات اس سے ممکن ہو تو وہ اس سے پوچھے کہ ـــــ؟

؎ کیند آں دو کہ مست وخراب میگر دند
نشستہ پشت بر آفتاب میگر دند

★

بقیہ: دوڑتے دوڑتے.....

اندھی آنکھیں.....بالآخر وہ بھی ایک چٹان سے ٹکرا کر گر پڑا...

آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ مگر روشنی کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا.....اور پھر یہ ہوا کہ آنکھیں اندھیرے میں بند ہو گئیں مگر چہرے پر روشنی دیکھنے کی حسرتیں برابر باقی تھیں۔!

★

کوثر پروین

دوڑتے دوڑتے.....!

وہ ننھا سا ہاتھ تھامے ان دو بڑے سخت ہاتھوں کو پکڑے دوڑتا ہی چلا تھا۔

وہ اپنی ننھی سی آنکھیں گھما گھما کر اور اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اپنے اطراف پھیلے ہوئے اس سر سبز سبزے پر بیٹھ کر کچھ دیر کھیلنا چاہتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اس کے بالوں کو چھیڑ رہی تھیں۔ ٹہنیوں پر پھول اور کلیاں جھول رہے تھے۔ تتلیاں اِدھر سے اُدھر اڑ رہی تھیں۔ وہ ان رنگین تتلیوں کو پکڑنا چاہتا تھا مگر وہ ہاتھ جو اس کے ننھے ہاتھوں کو تھامے ہوئے تھے جھنجھلا جھنجھلا کر اسے ان کی آہنی تیز رفتاری سے دوڑنے کو کہہ رہے تھے۔ وہ اپنے ننھے ننھے پیروں سے ان کے ساتھ دوڑتا چلا جا رہا تھا، کبھی مڑ مڑ کر اس رنگین و دلکش منظر کو دیکھتا چلا تھا۔ جو لمحہ لمحہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی اس بے چینی کو دیکھ کر وہ سخت اور چوڑے چکلے ہاتھ جھنجھلا کر کہتے۔ تیز چلو...... جلد از جلد اس صحرا کو پار کر لو ورنہ یہ کانٹے تمہارے پیروں میں چبھ جائیں گے....... یہ کانٹے دار علاقہ جلد از جلد پار کر لو! اس نے معصومیت سے ان دو لمبے چہروں کی طرف دیکھا۔ ایک چہرہ، جس پر جھریاں شروع ہو چکی تھیں۔ خستہ حالی اور پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔ دوسرا چہرہ، جو بڑا ہی درد سے پُر تھا۔ سفید جلد پر جھریاں آ چکی تھیں، سر پر سفید بالوں کا جوڑا تھا۔ وہ ہاتھ جو اس کے ہاتھوں کو تھامے ہوئے تھا کانپ رہا تھا وہ ہانپ رہی تھی۔ مگر برابر دوڑ رہی تھی۔ اور یہ دونوں اسے اس حسین منظر کو صحرا کہہ رہے تھے۔ مگر...... مگر دوڑتے دوڑتے اس کے ہاتھ بڑے سخت ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر رکنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ہاتھ جو اس کو تھامے ہوئے تھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اب ان دونوں ہاتھوں کا بوجھ اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ اب وہ انہیں تھامے دوڑتا ہوا چلا تھا—!

ہر طرف سے گرم لو بڑھ رہی تھی۔ وہ رنگین منظر اس سے کافی دور چلا گیا۔ ہر طرف سے آندھی چل رہی تھی۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ کانپتے ہاتھوں کو پکڑے ان کے بوجھ کو گھسیٹتے چل رہا تھا۔ طوفان اب اپنے شباب پر تھا۔ وقت کا سورج شاید اب زمین کو جلانے کی فکر میں تھا۔ ہر طرف سے جسم جلنے لگا تھا۔ زمین تپ رہی تھی۔ وہ خود بھی ہانپنے لگا۔ یکایک ان دونوں، ہاتھوں نے رک کر اس کے ہاتھ میں ایک اور مرمریں ہاتھ تھما دیا۔ وہ مرمریں مجسمہ تھا۔ مگر اس کے حسین چہرے پر اداسی تھی۔ آنکھوں میں بلا کا درد تھا۔ اور چہرے پر تھکن کے آثار... شاید وہ بھی اب تک دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے اپنی تھکن کو بھلا کر اس چہرے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ فضا میں اس کے لئے بھی کوئی نغمہ ہو تو وہ اسے سننا چاہتا تھا مگر خود اس حسین چہرے کی تھکن دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ جہاں مسلسل دوڑنے سے تھک چکا تھا۔ اب وہ

منتشر ہو چکا تھا۔ وہ حسین چہرہ بھی مجسم غم تھا۔ وہ ایک بے جان ڈھانچہ دکھائی دے رہی تھی۔ ایک تیز طوفان پھر آیا۔ ہر طرف سے وہ مکمل طور پر طوفان کے گھیرے میں تھے۔ معاً انھوں نے ایک دوسرے کو سختی سے جکڑ لیا۔ جب کچھ دیر بعد کچھ طوفان تھما تو دیکھا، وہ دونوں جسم وہ دونوں ہاتھ جو اسے تھامے ہوئے تھے۔ طوفان میں کہیں گم ہو گئے تھے۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرانی و پریشانی سے تکنے لگے۔ دونوں کی نظروں میں سوال تھا مگر جواب...... جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب تلاش کریں، ہر طرف اندھیرا چھانے لگا۔ کہیں پوری طرح اندھیرا نہ چھا جائے۔ وہ پھر سے اس مرمریں ہاتھ کو تھامے دوڑنے لگا۔ مرمریں ہاتھ اسی طرح ہچکولے کھانے لگا۔ لیکن وہ اس کی پرواہ کئے بغیر تیز رفتار دوڑنے لگے تاکہ جلد از جلد روشنی کی حد میں داخل ہو جائیں...... ہر طرف ریت ہی ریت اور بیکراں میدان تھا۔ فضا میں ریت کے ذرات تیر رہے تھے۔ آسمان پر کالے کالے بادل منڈلا رہے تھے۔ ان کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ وہ صحرا کو جلد از جلد عبور کر لینا چاہتے تھے۔ مرمریں مجسمہ بڑی حسرت سے اپنے ساتھ دوڑنے والے کے چہرے کو تکتی شاید وہ کچھ دیر رکنا چاہتی تھی۔... لیکن وہ اپنی کمزوری اور رفتار دونوں کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ پھر اس گرم ریتیلے مقام پر کئی ننھے ننھے ہاتھ انہیں تھامے چلے گئے۔ اب اسے اپنے اس بوجھ سے زیادہ ان ننھے ننھے ہاتھوں کا بوجھ سنبھالنا تھا۔ جن میں کچھ چاندی کے ہاتھ تھے، اور کچھ سخت فولادی، وہ اب اپنی تیز رفتاری سے دوڑتا چلا تھا۔ وہ حسین مرمریں چہرہ شاید اب عادی ہو چکا تھا۔ وہ بھی ان ننھے ہاتھوں کو تھامے اس رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ مگر روشنی...... روشنی کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

وہ جلد از جلد ان ننھے ہاتھوں کو روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ننھے ہاتھ اس کی رفتار سے ڈر رہے تھے۔ بے بسی سے دونوں کی جانب تکتے یا پھر وہ بھی مڑ کے دیکھنے لگتے لیکن وہ جھنجھلا کر انہیں گھسیٹتے بڑھتا چلا تھا۔ شاید وہ بھی انہیں اس صحرا سے دور لے جانا چاہتا ہو۔ اندھیرا بڑھتا..... بڑھتا ہی چلا تھا۔ اس اندھیرے میں رفتار کو دیکھ کر کوئی ننھا ہاتھ چیخ پڑتا تو وہ جھنجھلا کر اسے ڈانٹتے وہ گھسیٹتے دوڑنے لگتا۔ کہیں روشنی اور دور ہی نہ رہ جائے۔ روشنی تک پہنچنے میں دیر نہ ہو۔

یہ کیا، یکایک ہر طرف گھپ اندھیرا، اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ان دونوں کے جسم بے جان ہونے لگے۔ اب وہ ننھے ہاتھ قدرے سخت ہو چکے تھے۔ اس نے فولادی ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔ اور ان چاندی کے ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔ اور ان چاندی کے ہاتھوں کو کسی اچھے محافظ کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا کہ یہ خراب نہ ہو جائے۔ مگر اسکی بڑھتی ہوئی تھکن کے ساتھ یہ چاندی کے ہاتھ بھی بڑھتے چلے گئے۔ لیکن اس اندھیرے میں کوئی ان کو تھامنے والا محافظ نہ تھا۔ وہ پھر بڑھتا گیا۔ ہلکے سے عکس میں کچھ بے جان سے خستہ حال ہاتھ بڑھے۔ وہ اپنی تھکان سے ڈر کر ان خستہ حال ہاتھوں میں، ان چاندی کے ہاتھ کو تھما دیا۔ وہ ہاتھ چیختے آواز دیتے ان کے ساتھ دوڑنے لگے۔ وہ دونوں بوسیدہ، بے جان سے ڈھانچے لئے ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ انھوں نے چاہا کہ اس اندھیرے ہی میں آرام کریں۔ مگر پھر طوفان شروع ہوا۔ اندھیرا بڑھتا چلا گیا۔ وہ پھر روشنی کی کھوج میں بھاگنے لگے۔ اس اندھیرے میں مرمریں ہاتھ ایک کھائی میں گر پڑا۔ وہ صرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر اکیلا ہی دوڑنے لگا پوری رفتار سے، تھکن، اندھیرا، کٹھن راستہ، نحیف جسم،

(صفحہ ۴۳ پر)

شیخ رحمٰن (اکولوی)

یوسف ناظم صاحب

یوسف ناظم صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً چار سال قبل اس وقت ہوئی تھی جب وہ چلنے پھرنے اور بات کرنے تک کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مجھے آٹھویں جماعت کو اردو پڑھانی تھی اور نصاب میں ان کا مضمون "جنون لطیفہ" مع تصویر و تعارف شامل تھا۔ یہ تھی میری ان سے پہلی غائبانہ ملاقات۔ "جنون لطیفہ" پڑھنے کے بعد مجھ پر ان سے ملاقات کرنے کا جنون، جنونِ لطیفہ سوار ہو گیا جو بعد میں جنون کثیفہ کی شکل اختیار کر گیا اور ایک دن میں بمبئی ان کے دولت کدہ پر جا پہنچا۔ یہ تھی میری ان سے پہلی بالمشافہ ملاقات۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اور مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ کیوں کہ کچھ بڑے فنکاروں سے متعلق میں نے جو کچھ سن رکھا تھا، ان کا رویہ اس لحاظ سے قطعی غیر متوقع تھا۔ میں نے سوچا یوسف ناظم صاحب کے بڑا فنکار ہونے میں شاید ابھی کچھ کسر رہ گئی ہے۔ بعد میں ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا اور مجھے یہ دیکھ کر انتہائی [illegible] ہوئی کہ وہ ایک اچھے فنکار ہی نہیں، اچھے انسان بھی ہیں۔ پھر ایک وقت آیا کہ انہیں میرے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے "بلاعنوان" کا مقدمہ جو ردّ مقدمہ کی شکل میں تھا، لکھ کر ان ملاقاتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور اس مقدمہ میں انہوں نے ہمارے تعلقات پہ دوستی کی مہر ثبت کر دی (یہ یوسف ناظم صاحب کی کمزوری ہے کہ وہ بہت جلد کسی سے متاثر ہو جاتے ہیں)

یوسف ناظم صاحب کئی لحاظ سے جی نی یس ہیں۔ وہ طنز و مزاح نگاری کرتے ہیں اور شاعری بھی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ایک دن میں نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو بولے "میرا اصل میدان طنز و مزاح ہے۔ شاعری میں اس لئے نہیں کرتا کہ لوگ مجھے شاعر کہیں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ مجھے غیر شاعر نہ سمجھیں۔"

ان کی خوش خطی بھی ان کے جینیئس ہونے کی ایک زبردست دلیل ہے۔ مشاہیر عالم کی لکھائی کا بھی یہی حال تھا ان کے اردو رسم الخط پر مختلف زبانوں کے رسم الخط کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اردو رسم الخط کو دیوناگری یا اور کسی دوسرے رسم الخط میں تبدیلی کرنے کے خواہش مند ہیں، وہ ان کے رسم الخط سے مستفیض [illegible]

...یں۔ ان کی خوشخطی کے یہ فوائد ہیں۔

(۱) مکتوب الیہ کا سارا کنبہ ان کا خط کوشش مشترکہ سے بیک وقت پڑھ لیتا ہے۔ فرداً فرداً پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وقت کی بچت ہوتی ہے۔

(۲) ان کے تحریر کردہ ایک لفظ پر کئی الفاظ کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس لئے حسب ضرورت ہم اپنے مطلب کے الفاظ تراش کر خود تسکین کا سامان کرسکتے ہیں۔

(۳) املا کی غلطی کا claim ہم نہیں کرسکتے۔

(۴) الفاظ کو پہچاننے کے سلسلے میں اچھی خاصی جسمانی، ذہنی اور عینی ورزش ہوتی ہے۔ جو تعلیمی تاش کھیلنے میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ بینائی بڑھتی ہے۔

(۵) محکمۂ آثار قدیمہ میں ریڈر (Reader) کی ملازمت مل سکتی ہے۔

خطوط نگاری میں غالب کے طرفدار ہیں۔ جوابی اور سوالی دونوں طرح کے خطوط لکھتے ہیں۔ اس معاملے میں بڑے Punctual ہیں۔ میری شادی سے ایک ہفتہ قبل ان کا خط آیا "شادی کی مبارک باد قبول کیجئے" شادی کے ایک ہفتے بعد دوسرا خط یا "پہلا بچہ مبارک ہو" پھر ایک ہفتہ بعد تیسرا خط ملا۔ "اب آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

آخری دو خط پاکر میں بیوی سمیت پریشان ہوگیا اور ہم ان کی شفایابی کے لئے دعا کرنے لگے۔ کہ دوسرے ہی دن چوتھا خط ملا، لکھا تھا۔ "مجھے اندازہ تھا کہ میرا دوسرا اور تیسرا خط پاکر آپ پریشان ہوگئے ہوں گے اس لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اور آپ لوگوں کی خیریت خداوند قدوس سے نیک چاہتا ہوں۔ آئے دن اخبارات میں خبریں آرہی ہیں کہ محکمۂ ڈاک کی چابکدستی کی بدولت عوام الناس کو ان کے خطوط برسوں بعد مل رہے ہیں۔ انہیں خبروں کو ذہن میں رکھ کر میں نے گذشتہ خطوط بالترتیب احتیاطاً قبل از وقت پوسٹ کر دیئے تھے کہ کسی طرح کی گڑبڑ ہونے پر بھی برِوقت مل جائیں۔"

یاد کے پورے ہیں، ایک چیز رکھ کر بھول جاتے ہیں تو دو چار دن کی تگ و دو کے بعد اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ (اسی طرح کافی مصروف رہتے ہیں) کبھی کبھی تو یہ کہہ کر یا لکھ کر بھی بھول جاتے ہیں۔ کوئی اس طرف توجہ دلائے تو کہتے ہیں۔ کچھ باتیں بھولنی ہی چاہئیں۔ سب باتیں یاد رکھنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ بہت سی باتیں میں صرف اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے کہہ دیتا یا لکھ دیتا ہوں۔

احتیاط پسندی وکفایت شعاری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ سر اور کنگھے کو اس طرح دور رکھتے ہیں کہ جیسے وہ ایک دوسرے سے الرجک ہوں۔ ڈرتے ہیں کہ کنگھی کرنے سے بچے کھچے بال بھی گر جائیں گے۔ جب کوئی بے تکلف دوست ان سے کہتا ہے کہ "گنجاپن عقلمندی کی علامت سمجھا جاتا ہے پھر آپ پورے گنجے ہونے سے کیوں ڈرتے ہیں؟" تو فوراً جواب دیتے ہیں "ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔" شاعر ہونے کے ناطے انہیں پورا پورا حق تھا کہ وہ غالب کی طرح کم از کم ۲½ تخلص دفعتاً فوقتاً

ستعال کرتے۔ لیکن انہوں نے یہاں بھی کفایت شعاری برتی اور اپنے اصل نام کا نصف بطور تخلص کے
ۂ وقف کر دیا۔ تخلص کے لئے کسی 'اِسم' کو زحمت نہ دے کر انہوں نے اردو گرامر پر احسان عظیم کیا ہے۔
ن ادبی کفایت شعاری کے لئے انہیں کوئی ادبی پرائز ملنا چاہئے۔

آپ انہیں جس زاوئے سے دیکھیں گے ایک طنز و مزاح نگار پالیں گے۔ ان کے لبوں پر کھیلتی ہوئی دبی
ی سی مسکراہٹ اور ان کی چال (لگتا ہے وہ چل نہیں رہے ہیں بلکہ دوڑنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔) ان
ے مزاح نگار ہونے کی علامتیں ہیں تو ان کے سر کے بال جو اکثر [illegible] کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔
ن کے طنز نگار ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

اکولہ میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی جانب سے "مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح کا ارتقاء" کے
نوان پر سیمینار ہوا تو جب بھی موقع ملا، اپنی چٹ پٹی باتوں سے محفل کو زعفران زار بناتے رہے۔ چند ایک
قعات رقم کر رہا ہوں۔ میرا دل رکھنے کے لئے انہیں بھی برداشت کر لیجئے۔

ڈاکٹر کے۔ اے۔ احمد صاحب کے ہاں دعوت میں مرچوں کے سالن کی قاب یوسف ناظم صاحب کے
سامنے آیا تو شوربے میں تیرتی ہوئی سالم مرچوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہیں؟"
"مرچیں" (کسی نے جواب دیا)
قاب سرکاتے ہوئے بولے "ظ انصاری صاحب کو ان کی زیادہ ضرورت ہے"
سب لوگ ہنسنے لگے، ظ انصاری صاحب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

سیمینار ختم ہوا تو مہمان فنکاروں سے فوٹو کھنچوانے کی درخواست کی گئی۔ فوٹو گرافر نے کیمرہ سنبھالا
یوسف ناظم صاحب بولے "پہلے یہ بتا دیجئے کہ مسکرانا کس کو ہے؟"

جب مقامی حضرات مہمان فنکاروں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے شروع کئے تو بے چارہ فوٹو گرافر
بوکھلا گیا اور جلدی جلدی فوٹوز کھینچنے لگا۔ جب اس نے دسویں فوٹو کے لئے پوزیشن لی تو انہوں نے بڑے اطمینان
سے پوچھا: "بھیا کیمرے میں فلم تو ہے نا؟"

ان کے ہاں متوازن طنز و مزاح کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ شاید وہ جانتے ہیں کہ آج کے انسان
کا دل کمزور ہے۔ وہ شدید طنز برداشت نہیں کر سکتا اور زور دار قہقہہ لگانے سے بھی اس پر دل کا دورہ پڑ
سکتا ہے۔ ایک باپ اپنے بچے کو اس کی غلطی پر ٹوکتا ہے، تنقید کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر ڈانٹ
پھٹکار بھی کرتا ہے۔ لیکن جب بچہ ڈانٹ پھٹکار سے دل برداشتہ ہو کر رو پڑتا ہے تو وہ شفقت پدری سے
اسے منا بھی لیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت یوسف ناظم صاحب کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے جملے چھوٹے
چھوٹے اور پر اثر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تخلیقات پڑھتے وقت آنکھوں پر بھی زور نہیں پڑتا۔ یہاں تک
کہ انہوں نے اپنی تصنیفات کے نام بھی مختصر رکھ چھوڑے ہیں (اپنی جگہ یہ بھی ایک ریکارڈ قائم کرنے والی بات
ہے) اکثریت دو حرفی ناموں کی ہے۔ ان کی تصنیف "فقط" منظر عام پر آئی تو خیال گزرا کہ اب وہ دستخط کر کے

مصطفےٰ مومن

نظم

درختوں سے سوکھتے پتے جھڑے
موسم کسی
خوف سے سرد پڑنے لگا
لیکن ہوا پیڑوں پہ سے گذرتی رہی
تمام پیڑ سوکھ کر کانٹا ہو گئے
آفتاب زہر اگلتا رہا
گلاب اور سبز گندم کے کھیت
ہر ایک شئے جلتی رہی
پہلے پتھروں سے نئی کونپل اگی
اشجار کی شاخیں مہکنے لگیں
پھر ایک نیا موسم پیدا ہوا
گاؤں، جنگل، شہر سب مہکنے لگے

★

ایم کے اثر

(نظم) قفسِ نادیدہ

مجھے تلاش ہے
اس گام زندگی کی، مگر
قنوطیت ہے کہ ڈستی ہے
مجھے رہ رہ کر
تلاش ہے تو سہی
یاسیت بھی ہنستی ہے
زبان خاموش ذہن شل
اداس وسعت مرے
ڈھونڈتے رہتے ہیں
اکثر اغیارِ راہِ سفر
مگر ہیں عزمِ سفر پر
مہیب پہرے لگے
یہ کیسا وقت ہے
بیوہ شکل ہو کر بھی
میری خوشی یہ ہے رقصاں کہ
بت بنا ہوں میں
عجب ہے تارِ نفس
ٹوٹ کر بھی ہنستا ہے
کہو اسے کہ
زبان ٹانک لے تو بہتر ہے
یہاں کفن میں بھی
لاشیں سلام کرتی ہیں

★

(غزلیں)

اطہر راز (لندن)

دل غم کا رازدار اگر ہے تو چپ رہو
تنہائیوں سے پیار اگر ہے تو چپ رہو
دنیا سے بے رخی کی شکایت ضرور ہے
اس دل پہ اختیار اگر ہے تو چپ رہو
اس اجنبی فضا میں زمانے کی کیفیت
چہروں سے آشکار اگر ہے تو چپ رہو
محفل کا رنگ کیا ہے کسی سے کہیں تو کیا
باقی ابھی خمار اگر ہے تو چپ رہو
یہ انقلاب حاصلِ تحریک تو نہیں
کچھ اور انتظار اگر ہے تو چپ رہو
گلشن خزاں کی زد میں اگر ہے تو کیا ہوا
فطرت پہ اعتبار اگر ہے تو چپ رہو
اس شب کے ہولناک اندھیرے میں صبح کا
اے راز اعتبار اگر ہے تو چپ رہو

اک سنگ دل کو دل سے سروکار پھر بھی ہے
یوں ہے کہ بے بسی سے ہمیں پیار پھر بھی ہے
اس بے وفا سے جرمِ وفا کا یقیں نہیں
دن رات بے قرار دلِ زار پھر بھی ہے
دل زندگی کی دھوپ میں تپتا ہے رات دن
ہمراہ غم کا سایۂ دیوار پھر بھی ہے
ہم بے طلب ہجومِ تمنا میں ہیں اسیر
عنوانِ دل کا گرمیٔ بازار پھر بھی ہے
اقرار ہے لبوں پہ تبسم کے ساتھ ساتھ
لیکن زبانِ شوق پہ انکار پھر بھی ہے
گو دوستی میں راز ہمیں دشمنی ملی
دل ہے کہ دوستوں کا طلبگار پھر بھی ہے

ناز قادری

نظر میں کہاں روشنی ہر طرف
ہے اب بھی وہی تیرگی ہر طرف

دھواں ہر طرف شعلگی ہر طرف
سلگتی رہی زندگی ہر طرف

فضائے اماں سو گئی ہر طرف
بس اک موجِ خوں جاگتی ہر طرف

ہم اپنے لہو میں نہاتے رہے
سسکتی رہی چاندنی ہر طرف

پرندے درختوں پہ گونگے سے
وہ چھائی خموشی گھنی ہر طرف

جو اپنے تھے وہ بھی نہ اپنے رہے
ملیں صورتیں اجنبی ہر طرف

نہ کوئی تنفس نہ کوئی صدا
قیامت کی تھی خامشی ہر طرف

صدف بے گہر آذری بے ہنر
رہی حکمراں بے بسی ہر طرف

دکھاتے رہے آگ دیر و حرم
پگھلتی رہی آگہی ہر طرف

وہ لمحہ بہ لمحہ بکھرنے لگا
فضاؤں میں خوشبو اڑی ہر طرف

زبانوں پہ تھا الاماں الاماں
ندی خوں کی بہتی رہی ہر طرف

بموں کے دھماکے دھواں ہی دھواں
فضا میں اڑی گرد سی ہر طرف

گلے میں خرد کے غلامی کا طوق
جہالت کی شاہنشہی ہر طرف

ہمیں اب بھی جمہوریت پر ہے ناز
اچھلتی رہی شانتی ہر طرف

★

سید شمیم گوہر

کچھ نہ محرابِ منقش کا اثر کام آیا
لاکھ بوسیدہ سہی اپنا ہی گھر کام آیا

اپنے خیموں کی طرف بھاگ گئے والے تھے سبھی
آخری وقت پہ میرا ہی ہنر کام آیا

حادثے آج تو رونق ہیں گزرگاہوں کی
تیرے ہمراہ نہ کچھ لطفِ سفر کام آیا

یار کوئی بھی نہیں، طرزِ مراسم ہی بہت
لہجۂ شوق نہ کچھ میرے مگر کام آیا

سب کو معلوم تھی تاریخِ عزائم لیکن
گھر سے نکلا نہ کوئی، میرا ہی سر کام آیا

عظمتیں ہر در و دیوار سے ظاہر تھیں بہت
اک مسافر کے لئے کوئی نہ گھر کام آیا

کس قدر دور رہتے ہم حسن و ادا سے گوہر
حوصلے خاک ہوئے، تیرِ نظر کام آیا

★

اسعد بدایونی
(علی گڑھ)

اسس ابر سے بھی قباحت زیادہ ہوتی ہے
جسے برسنے کی عادت زیادہ ہوتی ہے
وہ آبشار ہیں اس کے لبوں میں پوشیدہ
کہ جن سے پیاس کی شدت زیادہ ہوتی ہے
وہ میرے پاس نہ آنے کو دیتا ہے ترجیح
جب اس کو میری ضرورت زیادہ ہوتی ہے
رہوں جو گھر میں تو تنہائی کاٹنے آئے
چلوں جو راہ تو وحشت زیادہ ہوتی ہے
میں ایک شجر ہوں مگر برگ و بار سے آزاد
ہوا کی مجھ پہ عنایت زیادہ ہوتی ہے
یہاں ہمارے بھی دن تھے بزرگ کہتے ہیں
نئے لہو میں بغاوت زیادہ ہوتی ہے

محبوب شیدائی
(ڈھاکہ)

حصارِ ذات سے باہر نکل سکو تو چلو
تمہارے ساتھ زمانہ ہے چل سکو تو چلو
وہاں ہے خواب نہ آہٹ نہ رینگتے سائے
اکیلے پن سے تم اپنے بہل سکو تو چلو
مرے سفر میں ہر اک رُت سے کھیلنا ہوگا
تم اپنی آنکھ کا موسم بدل سکو تو چلو
کسی کے قد کا سہارا ہے پاؤں کی زنجیر
تم اپنے بل پہ یہاں سے نکل سکو تو چلو
وفا کی راہ میں ہوتی ہے سنگ کی بارش
مری طرح جو گلابوں سے کھِل سکو تو چلو
ضمیرِ سنگ سے چشمے بھی پھوٹ سکتے ہیں
خلوصِ دل سے حقائق بدل سکو تو چلو
سفر ہے درد ہے درماں یہی تک مگر محبوب
چراغِ راہ کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو

خورشید سحر

زمیں پاؤں کے نیچے نہ آسماں سر پہ
بس ایک قہر مسلسل ہے ناتواں سر پہ
یہ ایک بوجھ ہے لیکن متاعِ خیر نہیں
اٹھا کے رکھنے میں کیا ہے غبارِ جاں سر پہ
یہ روزِ شب کی اذیت بہت گراں جو ہوئی
خودی کو رکھ لیا کاندھے پہ اور مکاں سر پہ
وجود ہو گیا اپنا لہو لہو لیکن
اٹھائے پھرتے ہیں صدیوں کی داستاں سر پہ
جو مجھ پہ قرض تھا اس کو چکا دیا میں نے
مگر یہ کیا کہ ابھی تک ہے امتحاں سر پہ
تمہارے قہر سے پامال ہو نہیں سکتے
ہم اپنے ضبط کا رکھتے ہیں سائباں سر پہ

خورشید طلب

گھنے پروں کے پرندوں میں بھی اڑان نہیں
یہاں کسی کی بلندی میں آسمان نہیں
مجھے ٹٹول کے دیکھو مرا یقین کرو
مرا وجود حقیقت ہے داستان نہیں
تمام لوگ خیالوں کے گھر میں رہتے ہیں
یہاں کسی کا بھی اپنا کوئی مکان نہیں
مجھے بھگو گئی بارش یہ کھلا مجھ پر
کہ وہ درخت کا سایہ ہے سائبان نہیں
ہر ایک آنکھ میں عریاں ہے عکس خود غرضی
کسی کو وقت کی بے چہرگی کا دھیان نہیں
یہ کس نے راستے ہموار کر دیئے سارے
کسی کے پاؤں کے نیچے کوئی ڈھلان نہیں
یہ کس کا خوفِ طلب چیخنے نہیں دیتا
یہ کس کے حکم پہ ہلتی کوئی زبان نہیں

★

صابر فخرالدین

دل ہی جب تک پھٹے ہوئے تھے
اک دوجے سے کٹے ہوئے تھے
عمدہ سی تقریر تھی لیکن،
جملے سارے رٹے ہوئے تھے
جن کو تھی تنظیم سے نسبت
قریہ قریہ بٹے ہوئے تھے
گھر جب واپس آئے ہیں ہم
پاؤں تھکن سے پھٹے ہوئے تھے
دھوپ اور دھوپ کے قہر سے صابر
سارے میداں پٹے ہوئے تھے

شاداب رضی

نفس نفس اضطراب رکھ دے
ہماری آنکھوں میں خواب رکھ دے
اذیتیں بے حساب رکھ دے
اک آگہی کا عذاب رکھ دے
تمام نغمات بجھ رہے ہیں
نیا سا کوئی رباب رکھ دے
مجھے عطا ہو عطش کی دولت
نظر نظر میں سراب رکھ دے
اس عہد بسیار چہرگی میں
جو شئے نہیں دستیاب رکھ دے
حیات کی داستاں میں یارب
رفاقتوں کے بھی باب رکھ دے

★

تبصرے

کتاب :- بارش (شعری مجموعہ)
شاعر :- منظور ہاشمی
ناشر :- دائرے پبلی کیشنز، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
قیمت :- بیس روپے
مبصر :- ڈاکٹر محمد مثنیٰ

"بارش" منظور ہاشمی کا شعری مجموعہ ہے جو غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں کے مطالعہ سے تازہ ہواؤں میں سانس لینے کا احساس ہوتا ہے۔ غزل گو شاعروں کی بھیڑ میں ان کا چہرہ پہچانا جاتا ہے۔ ان کا لب و لہجہ اور ان کا طرز اظہار صرف نیا نہیں ہے، اس میں ایک گھلاوٹ، نرمی اور مترنم کیفیت بھی ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیتی ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ خاصا محدود ہے مگر اس پر ان کی گرفت مضبوط ہے کیونکہ ان کے تجربوں میں نئے پن کے ساتھ سچائی اور خلوص کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؂

یوں تو کہنے کو تمہارے بعد بھی زندہ رہے
لیکن اپنے آپ سے تا عمر شرمندہ رہے
دھند میں کھوئے ہوئے چہرے ابھی ڈوبے نہیں
کچھ ستارے رات بھر راہوں میں تابندہ رہے
اس بھری محفل میں اس کا چند لمحوں کے لئے
مجھ سے ملنا، بات کرنا، دیکھنا اچھا لگا
جن کا سچ ہونا کسی صورت سے بھی ممکن نہ تھا
ایسی ایسی باتیں اکثر سوچنا اچھا لگا
جھیل کی گہری نیلی آنکھوں میں
دل پہاڑوں کے ڈوب جاتے ہیں
اداس آنکھوں میں خوابوں کی فصل سوکھ گئی
مسیکر درخت کہاں ریت میں لگائے تھے
سارے وجود میں مرے رس گھولتا تو ہے
کم ہی سہی وہ مجھ سے مگر بولتا تو ہے

منظور ہاشمی کی غزلوں میں زبان و بیان کے اعتبار سے کلاسیکی نظم و ضبط اور رچاؤ کے ساتھ جدید پیکر سازی کا عمل اور موجودہ عہد کا زندہ احساس ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں اپنے نئے شعور اور بانکپن کے باوجود کہیں بھی نامانوس فضا کی حامل نظر نہیں آتیں۔ اپنے دور کے شعور و احساس کے ساتھ ان کی غزلیں ایک نیا حسن اور ایک نئی رعنائی رکھتی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ نئے تجربات کے ساتھ ان کے یہاں زیادہ وسعت، پھیلاؤ، اور گہرائی پیدا ہوتی جائے گی اور آگے چل کر ان کا نام غزل گو شاعروں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہوگا۔ اس مجموعہ کی کتابت بڑی فنکارانہ اور طباعت دلکش ہے۔

کتاب :- سات سمندر (شعری مجموعہ)
شاعر :- بدیع الزماں خاور
ناشر :- موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ
دریا گنج، نئی دہلی
قیمت :- بیس روپے
مبصر :- ڈاکٹر مثنیٰ

• سات سمندر • بدیع الزماں خاور کی غزلوں کا مجموعہ ہے جن میں غالب! ذائقہ بدلنے کی خاطر دو تین آزاد غزلیں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ بدیع الزماں خاور کی غزلوں میں جو بات سب سے پہلے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ان کا غیر رسمی پن ہے۔ غزل جیسی صنف سخن میں رسمی فرسودگی سے اپنے دامن کو اس درجہ بچالے جانا آسان نہیں۔ ان کے یہاں گھسے پٹے موضوعات اور پرانی کیفیات سے اجتناب کی زبردست اور شعوری کوشش نظر آتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ دلکشی اور پیکر سازی میں ندرت اور نیا پن لانے کا رجحان بھی خاصا نمایاں ہے۔ ان کے امتزاج سے ان کے بہت سے اشعار میں انداز فکر اور طرز احساس دونوں اعتبار سے تازگی اور جدت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی غزلوں میں خارجی فطرت اور موسم کی کیفیات کے ساتھ شدید وابستگی اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بالخصوص گاؤں کی دھرتی اور پانی سے ان کا رشتہ بڑا گہرا اور استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ساری چیزیں اکثر ان کے یہاں محسوسات کے پیکر میں کامیابی کے ساتھ ڈھل گئی ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نظر نواز تھا جس کا خرام بارش میں
دکھائی دیتی ہے خشک آج وہ ندی کتنی

میں زمیں پر تمہیں بونا ہی نظر آؤں گا
آسماں سے مرے یارو مجھے دیکھا نہ کرو

ذرا سا کاٹ کے پتھر کو دیکھ لے کوئی
نکل ہی آئے گا پانی اگرچہ چٹان میں ہے

چال ندی کی طرح چال گھٹاؤں جیسے
اس کے انداز میں ساون کی فضاؤں جیسے

کسی کی پیاس کہاں تک بھلا بجھائے گا
بلا کی دھوپ ہے، تالاب سوکھ جائے گا

میرا انجام سمجھ لو خود ہی
جسم مٹی کا ہے گھر پانی کا

نئی کیفیات، نئی تصویروں اور نئے طرز اظہار کے باوجود ان کی غزلوں میں احساس اور تاثر کی شدت ذرا کم ہی محسوس ہوتی ہے جس کی بدولت غزل کو اس کی اصل دھار نصیب ہوتی ہے۔ ان کا شعری مزاج روشن امکانات کا پتہ دیتا ہے۔ اس لئے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ آگے چل کر تجربات کی انفرادیت میں زیادہ شدت اور گہرائی آسکے گی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں وہ ساحرانہ کیفیت محسوس ہوگی جو اعلیٰ درجہ کی غزل گوئی سے عبارت ہے۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ بہت دلکش اور دلآویز ہے۔

★

بقیہ: سواد وصوت

کتنے گاؤں کو ویران کر دیا۔ اسی قربت کی وجہ سے ملک چک کے ذکر کو میں نے خاص دلچسپی سے پڑھا۔ کیا آپ کی [illegible] باجی کہانیاں بھی لکھا کرتی تھیں؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ملک چک کی کسی خاتون کی کہانی • اولتی کے سائے میں • ماہنامہ • آجکل • دہلی میں (غالباً ۵۰ء یا ۵۱ء میں) شائع ہوئی تھی۔ افسانہ نگار کا نام یاد نہیں رہا۔ آپ کی • یادداشت • پڑھ کر خیال آیا کہ شاید وہ آپ کی باجی ہی ہوں۔ افسانہ شائع ہونے کے زمانے میں بھی میں نے افسانہ نگار کو جاننے کی کوشش کی تھی لیکن قطعی [illegible] کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ اگر یہ آپ کی باجی ہی ہوں تو کیا ان کے بعد افسانے بھی شائع ہوئے تھے؟ اگر آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں تو [illegible] ہوں گا۔

• آہنگ • اور • موج • برابر مل رہے ہیں۔ سراپا سپاس [illegible] آپ کے اداریے کوزے میں دریا کی مثال ہوتے ہیں آپ کے [illegible] لفظوں کا بھونڈا استعمال نہیں ملتا جس سے تحریر کا تاثر [illegible]

ماہنامہ آہنگ
میں شائع شدہ تخلیقات کا
گوشوارہ

مرتبہ ——— ڈاکٹر محمد مثنیٰ

سال ۱۹۷۰ء

۱۹۷۰ء شمارہ		مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
ستمبر	۴۴	قلی قطب شاہ	ڈاکٹر شکیل احمد	اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کی شاعری کا جائزہ
"	"	سماج اور کرشن چندر کا ازم	غیاث اقبال	کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا سماجی مطالعہ
"	"	(افسانے)	فن کار	
		وہ ایک شخص	احمد یوسف	
		چپنے ہوئے دروازے اور یادوں کی یلغار	یوگ راج	
"	"	(ناولٹ)		
		کھوگئی آواز	عبدالصمد	
"	.	(نظم)		
		الف	پریم وار برٹنی	
		اگنی پرکشا	صبا اکرام	

شمارہ ۱۹۷۰	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
" "	زہر بھی زہر کی دوا ہے	صبا اکرام	
	(غزل)		
"		پرکاش فکری	
"		مظفر حنفی	
"		سلطان اختر	
"		سلطان سبحانی	
" ۸۵	(مضامین)		
" "	ادب اور عقیدہ	صفدر	ادب میں عقیدہ کی نوعیت کا تجزیہ
" "	مراثی انیس میں تصویریت	ڈاکٹر حاتم رامپوری	میر انیس کی پیکر تراشی کا مطالعہ
" "	ودیاپتی کے گیت	خلیل الرحمٰن ہاشمی	ودیاپتی کے گیتوں پر ایک تنقیدی نظر
	(افسانے)	(فن کار)	
" "	ایک خود کلامی	رشید امجد	
" "	شکستہ آئینے	نظام صدیقی	
" "	پیون	علی امام	
" "	زمین جاگتی ہے	مرزا حامد بیگ	
" "	ہمسفر	اسد قلیم	
" "	(نظمیں)	شاعر	
" "	وہ حرف و صوت، وہ صدا	زاہدہ زیدی	
" "	جواب خط	ساجدہ زیدی	
" "	فرسٹریشن	حق اعظمی	
" "	رباعیات	حرمت الاکرام	
" "	(غزلیں)	(شاعر)	
" "	غزل	مخمور سعیدی	
" "	"	لطف الرحمٰن	
" "	"	شمیم فاروقی	

شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۸۵	غزل	ظہیر غازیپوری	
"	"	وقار واثقی	
"	"	ساحل احمد	
"	"	ندیم گوپال	
"	"	صفدر	
"	"	رونق گیاوی	
	(تبصرہ کا) کتاب	(مبصر)	
"	خوشبو کا خواب	رام لعل نابھوی	
	شاخ لہو	شفیع مشہدی	
۸۶	(مضامین)	(مصنف)	
"	اقبال اور عالمی ادب	کلیم الدین احمد	عالمی ادب میں اقبال کے مقام پر ایک بحث
"	مغربی بنگال میں اردو تحقیق نگاری	عبدالمنان	اردو تحقیق نگاری کا مطالعہ مغربی بنگال کے آئینہ میں
"	(نظم)	(شاعر)	
"	میں سوداگر گیتوں کا	پریم وار برٹنی	
	(ڈرامہ)	(فن کار)	
"	بادشاہ سلامت خدا حافظ	زاہدہ زیدی (یوجین ایونیسکو)	
"	(غزل)	(شاعر)	
"	"	حسن نعیم	
۸۷	(مضامین)	(مصنف)	
"	نثری نظمیں، بحث کا ایک رُخ	باقر مہدی	نثری نظموں کی تنقید
"	اقبال اور عالمی ادب	عبدالمغنی	کلیم الدین احمد کے مضمون کا جواب
"	اداس راہی	رفیعہ شبنم عابدی	پریم وار برٹنی کی شاعری کا مختصر جائزہ
"	اقبال کا جمالیاتی شعور	ڈاکٹر حاتم رامپوری	اقبال کے جمالیاتی شعور کا تجزیاتی مطالعہ
"	(افسانے)	(فن کار)	
"	فساد	ڈاکٹر نریش	
"	ویرانے کا تنہا درخت	اختر واصف	
"	سیاہ سورج اور پوشیدہ دھبے	ساحل احمد	

۱۹۷۷ شمارہ (نظمیں)	(فن کار)	مضمون کا تعارف
〃 میری ہمراز	ساجدہ زیدی	
〃 〃 دو مسافر	عزمت اللہ اکرام	
〃 〃 (غزلیں)	(شاعر)	
〃 〃 غزل	ندا فاضلی	
〃 〃 〃	عادل منصوری	
〃 〃 〃	لطف الرحمٰن	
〃 〃 〃	حسن آرزو	
〃 〃 〃	کرشن کمار طور	
〃 〃 (تبصرہ) کتاب	(مبصر)	
〃 〃 غزل پس منظر پیش منظر	کلام حیدری	
〃 〃 راستے اور کھڑکیاں	کلام حیدری	
〃 ۸۸، ۸۹، ۹۰ (مضامین)	(مصنف)	
〃 〃 جدید غزل میں جنسی شعور	مصور سبزواری	جدید غزل میں جنسی شعور کی نشاندہی
〃 〃 جوگندر پال . فارسی س کی واپسی	ارتکاز افضل	جوگندر پال کے افسانوی فن کا نفسیاتی مطالعہ
〃 〃 مہجور شمسی	ناوم بلخی	مہجور شمسی کی غزل گوئی کا تجزیہ
〃 〃 سجاد ظہیر بحیثیت شاعر	عبدالقیوم ابدالی	سجاد ظہیر کی نثری نظموں کا تجزیہ اور غزلوں کا مطالعہ
〃 〃 اقبال ملٹن اور مسئلہ خیر و شر	جگن ناتھ آزاد	اقبال اور ملٹن کا تقابلی مطالعہ مسئلہ خیر و شر کے تناظر میں
〃 〃 نفس گرم کی تاثیر ہے	ساحل احمد	اقبال کے سماجی اور سیاسی شعور کا تجزیہ
〃 〃 اعجاز حیات (اقبال اور عالمی ادب)	منیر واحدی	کلیم الدین احمد کے مضمون پر ایک نظر
〃 〃 اقبال اور عالمی ادب	سید ابوالقاسم	کلیم الدین احمد کے مضمون پر ایک نظر
(افسانے)	(فن کار)	
بھاؤں بھوں	جوگندر پال	
میں اور وہ	یوگ راج	
ریزہ ریزہ سائے	عبدالصمد	
رشتے ٹوٹ گئے	شمیم افزا قمر	
بکھری اکائیاں	مناظر عاشق ہرگانوی	
ٹوٹتے لمحوں کا مسافر	ریاض قاصد	

(بقیہ صفحہ ۲۵۸ پر)

قارئین ———

سوادوصوت

گرامی قدر کلام حیدری صاحب!

گلہائے عقیدت!!

آہنگ پابندی سے مل رہا ہے۔

رحمٰن حمیدی کا "ناولٹ" "ڈوبتے انسان کا چہرہ" پسند آیا۔
قارئین اس ناول میں شروع سے آخر تک Involved رہتا ہے۔
اور ایک نفسیاتی کشمکش Then and Then کی کیفیت سے گذرنے لگتا ہے

"باخبر" کے تحت آپ لوگ موجودہ سیاسی صورت حال کا جو جائزہ لیتے ہیں وہ خوب ہے۔ کسی ادبی رسالے میں سیاسی یا نیم سیاسی صورت حال کو سامنے لانا بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

اِدھر گذشتہ چند برسوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ادب پر جمود کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ لیکن آپنے اِدھر کشکول میں محمد حسن، ادب میں وابستگی، اسلامی ادب وغیرہ کے سلسلے میں جو باتیں کہی ہیں اس سے مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ چند سال پہلے ادبی رسالے میں جو "کچھ" ہوتا تھا۔ وہ پھر ہونے لگا ہے۔ اور یہ ضروری ہے۔

شعری حصہ معیاری ہے۔

تسلیم انجم (رانچی)

مکرمی۔ تسلیم!!

آہنگ کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ!!

ڈاکٹر حسن آرزو کا پھر ایک مضمون پڑھنے کو ملا، علم الاعداد کی روشنی میں کلام حیدری کے تین افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔ جو پراثر اور معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے اور بھی مضامین لکھوایئے۔

ناولٹ نئے تکنیک اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ رحمٰن حمیدی اس ناولٹ میں کامیاب ہیں۔

نظم و غزلیں سبھی اچھے ہیں۔ لیکن حسن نعیم کی غزل کی بات کچھ اور ہے۔

سوادوصوت کا کالم جاری رکھئے اس کالم سے کافی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس دفعہ تبصرہ نہیں دیکھ کر کافی مایوسی ہوئی ڈاکٹر مشی کہاں کھو گئے ہیں۔ ان سے بھی تبصرہ لکھوایئے۔

آپکا فروغ صبا (پٹنہ)

پیارے بھائی!

سلام شوق

آپ کا افسانوی مجموعہ "گولڈن جوبلی" نظر سے گذرا۔ اس کے زیادہ تر افسانوں نے خود کو پڑھوالیا اور میں سمجھتا ہوں کہ افسانے کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ قاری کا دامن کھینچ لے اور بغیر پڑھے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دے۔ مجھے یہ خوبی چند ہی افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتی ہے — لیکن میں اس وقت آپ کے افسانوں پر گفتگو کرنے حاضر نہیں ہوا ہوں۔ مجھے تو اپنی زندگی کے کچھ "سچ" کے سلسلے میں کچھ کہنا ہے۔

آپ کا یہ افسانہ (؟) آپ کی زندگی اور افسانہ نگاری دونوں کے افہام و تفہیم میں بہت معاون ہے۔ اس سے کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کا علم مجھے نہیں تھا۔

یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ملک چک میں آپ کی خالہ رہتی تھیں اور اس گاؤں سے آپ کا جذباتی لگاؤ تھا۔ یہاں سے شمال و مغرب میں دو میل پر ایک گاؤں ہے میر غیاث چک، میرا مکان اسی گاؤں میں ہے۔ جی ہاں۔ اب تو مکان ہی رہ گیا ہے مکیں کہاں؟ ہمارے شہروں اور مشینی زندگی نے نہ جانے

(بقیہ صفحہ ۱۵۰ پر)

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. No. Gy 5/84
Phone—432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

— تنقیدی مضامین —

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-

The Cultural Academy, (Regd.) Gaya

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے ۳۶ روپے

ایک شمارہ ۳ روپے

فون ۴۳۲

جولائی ۱۹۸۴ء

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ ق، عبد الصمد

کتابت: امان اللہ گیاوی —— طباعت: ہند تعمیر پریس، گیا۔

محتویات

کشکول

مضامین

افسانے

نظمیں

مطبوعات

اداریہ

کشکول

METAPHYSICS اور تصوف دونوں کو ایک ہی شے ہمارے بعض نقادوں نے سمجھ رکھا ہے اور جب وہ بات تصوف پر کرتے ہیں تو کہیں کہیں ایسا لگنے لگتا ہے کہ انگریزی سے غیر ضروری طور پر متاثر یا مرعوب ہونے کی بنا پر یا کسی غلط فہمی کی بنا پر دونوں کو ایک شے سمجھ لیتے ہیں۔

تصوف تاریخی اعتبار سے تو حضرت علیؑ تک چلا جاتا ہے مگر حضرت علیؑ کی شخصیت تو علوم طریقت اور شریعت کے ان تمام اسرار و رموز سے واقف تھی کہ کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔

صوفی شریعت کو عملاً ایک ضروری لیکن زیادہ محنت کا کام نہیں سمجھتا جیسا کہ ہم عام لوگوں کے لئے یہ ہے۔ طریقت کے راستے کٹھنائیوں اور نفس کشی کے عمل سے گذر جانا اور صحیح سالم گذر جانا یہ عام آدمیوں کی بات نہیں ہے اور نہ ہی محض زہد و تقویٰ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

شاعری ہی کیا ادب عالیہ کی ہر صنف معراج پر پہونچتی ہے تو فلسفہ بن جاتی ہے، فلسفہ ادب عالیہ سے اخذ کیا جاتا ہے، فلسفہ کے تحت ادب عالیہ تخلیق نہیں ہوتا۔ یہی بات اردو شاعری میں بھی ہے کہ تصوف نے شاعروں کو بھی INSPIRE کیا ہے۔ دراصل صوفیوں کے خیالات و ان کے احکامات کی پیروی بہت سے شاعروں نے بھی کی ہے اور یوں اردو شاعری کا رشتہ تصوف سے جڑا ہے۔

تصوف کو صوفی بزرگوں کی باتوں سے سمجھا جا سکتا ہے اور بعض مرتبہ بعض لوگ اسے رہبانیت کے مماثل سمجھ لیتے ہیں۔ رہبانیت،   کی دین ہے جو روحانی عمل نہیں ہے دنیا کی خدمت کیلئے وقف ہونے کا نام ہے اور اس سے اگر یہ صفت ہی جاتی رہتی ہے تو یہ محض دکھاوا بن جاتا ہے

تصوف دنیا میں رہکر نفس کشی کے ذریعہ خالق حقیقی سے قربت حاصل کرنے کا نام ہے اور جب دائرے میں تصوف کو لے آنے کا مفہوم بھی یہی ہے معبود حقیقی کی قربت حاصل ہو کیونکہ اس "قربت" سے زیادہ قیمتی شے دنیا و دیں میں ہو ہی نہیں۔

—— کلام حیدری

راجندر سنگھ ورماسوز

اردو ادب پر مغربی اثرات

جیسے شبنم گلستاں میں طرح طرح کے پھولوں کی خوشبوئیں مکمل ملی ہوتی ہیں۔ عالمی ادب کی تشکیل میں بھی مختلف زبانوں کے ادب کے ذائقے شامل ہوتے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلتا اور خربوزے سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ لیکن ایک ادب کے دوسرے ادب پر اثرات کا تعین نہایت نازک کام ہے۔ توارد اور عکس و مشابہت کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ فلاں فن پارہ فلاں پارے کے طفیل وجود میں آیا ہے۔

یورپ اور خصوصاً انگریزی تہذیب اور فکر و فن کے ہمہ گیر اثرات ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بیسویں صدی کے آغاز سے ہی پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ دورِ جدید میں ہمارے قلم کاروں نے اپنے مطالعہ کو انگریزی ادب تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ انگریزی تراجم کے توسط سے سارے یورپ کے فکر و فن سے فیضان حاصل کیا ہے۔ نتیجہ میں ہندوستانی فنکاروں کے ذہنی افق کی توسیع ہوئی اور وہ یورپی ادبیات کی تازہ ترین تحریکوں میں ذہنی شرکت کرنے لگے۔ مغربی نمونوں سے استفادہ کا عمل وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا۔ اور نیا ہندوستانی ذہن آفاق گیر بنتا چلا گیا چنانچہ منظوم تراجم کا ایک سیلاب سا آ گیا۔

مخزن، ریویو، ادبی دنیا، ہمایوں اور زمانہ ایسے اردو رسالوں نے تراجم کی رفتار کو تیز کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اس طرح نیا ادب تیزی کے ساتھ عالمی تحریکوں، نئے ادبی نظریوں اور تازہ اسالیب سے ہمکنار ہو گیا۔

جدید فرانسیسی شاعری کے اثرات اردو شاعری میں ایلیٹ اور ایذرا پاونڈ کے ذریعے سے داخل ہوئے جدید فرانسیسی شاعری کا اہم رجحان اردو میں ہمارے دور کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ فرانسیسی تمثیل نگاری کی تحریک نے استعارہ، رمزیت اور لفظی معنویت کو بڑھاوا دیا۔ اس کا مدعا انسان کے تحت الشعور کی اندھیری گپھاؤں میں پلنے والے اسرار کو فاش کرنا تھا۔ روایتی زندہ بیان کی جگہ علامتوں اور اشاروں کی زبان کو اپنایا گیا۔ اسی تحریک سے متاثر ہو کر راشد، میراجی اختر الایمان، حبیب الرحمٰن ضیا جالندھری، مجید امجد اور یوسف ظفر ایسے ایمائی اور اشاراتی انداز کے شعراء نے اردو شاعری کے روایتی انداز بیاں کو بدل کر رکھ دیا۔ احمد ندیم قاسمی اور زبیر، کمار شاد نے فرانسیسی شاعری کے زیر اثر کامیاب ترائیلے لکھے سارتر اور کامیو کے نظریہ لغویت کا بھی اردو ادب پر گہرا اثر پڑا ہے۔

عظیم ... شاعر ... [illegible]

مغرب کے باہمی رشتے کو پہچانا اور آفاقی نکتہ نظر اور طرز بیاں کو فروغ دیا۔ علامہ اقبال پر گوئٹے کا زبردست اثر دکھائی دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ابھرنے والی جرمن ادبی تحریک اظہاریت تاثریت اور علامتیت بھی اردو ادب پر کافی اثر انداز ہوئیں۔ سٹیفن ملارمے، [illegible] اور رلکے نے جدید اردو نظم نگاری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔

روسی ادیبوں کا اثر اردو دنیا میں مدتوں سے محسوس کیا جا رہا ہے ـــ منشی پریم چند نے ٹالسٹائی کے اثرات کا اعتراف کیا ہے۔ کیا اکتوبر انقلاب کے بعد روس سے جو نظریاتی یا تخلیقی طوفان اٹھا اس نے اردو ادب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ترقی پسند تحریک ادھر زور و شور سے چلی اور گورکی کے افکار سے اسے خاص تقویت ملی۔ منٹو اور بیدی نے سماجی طنز اور حقیقت نگاری کے ابتدائی سبق گورکی سے ہی سیکھے۔

انگریزی نثری اسٹائل کے زیر اثر حالی اور سرسید نے اردو نثر کے اسلوب کو یکسر بدل دیا۔ قدیم پر تصنع، مسجع اور مقفیٰ نثر کی جگہ سادہ، متوازن اور شگفتہ نثر نے لے لی جس میں سائنسی حقیقت کا رنگ جھلکتا ہے۔

مغربی اثرات سے اردو میں جدید طرز کے افسانے انشائیے، سفرنامے اور ناول لکھے جانے لگے۔ بہترین مغربی افسانوں اور ناولوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اور ان نمونوں کو سامنے رکھکر اردو ادیبوں نے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کی۔

مغربی ڈرامے کے زیر اثر اردو ڈرامہ ایک سانچے میں ڈھلنے لگا۔ نئے ڈراموں میں کرداروں کی انفرادی اور سماجی کشمکش کو نئے ماحول کے ساتھ پیش کیا جانے لگا۔ ایلین

، تھامس گالزوردی کا ڈرامہ بیکٹ کے [illegible] کے عہد رہے ہوئے ادوار سے فیضان حاصل کیا گیا۔ یک بابی ڈرامے کا رواج ہوا۔ موضوع، اسلوب، تکنیک اور اسٹیج ہر لحاظ سے مغربی ڈراموں سے استفادہ کیا گیا۔ فلم کی آمد سے اسٹیج ڈرامے کو زک تو پہونچی۔ لیکن اردو ڈرامے کا ترقی یافتہ روپ ریڈیو ڈرامے کی صورت میں خوب نکھرا۔ ڈاکٹر محمد حسن، ریوتی سرن شرما، بیدی، منٹو، اظہر افسر اور عمیق حنفی کے ریڈیو ڈراموں اور کمار پاشی، رفعت سروش اور سلام مچھلی شہری کی ٹیلی ویژن تمثیلوں نے ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ یوں تو آپ زمانہ قدیم کے استادوں کی اصلاحات تذکروں اور ادبی خطوط کو تنقید کا نام دے سکتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں باقاعدہ تنقید کا آغاز [illegible] مغربی کے اولین حالی کی تصنیفات سے ہی ہوتا ہے۔ بعد کو بجنوری اور طباطبائی کی تاثراتی تنقید اور عسکری کی ہیئتی تنقید کا سرچشمہ فیضان بھی انگریزی نئی تنقید ہی تھی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر محمد حسن، بلراج کومل اور عمیق حنفی نے جمالیاتی تنقید کو بڑھاوا دیا۔ بعض بہترین جدید تر تنقیدی اسلوبیات سے اور عبدالغنی ایلیٹ کی مذہبی اور اخلاقی تنقید سے متاثر ہوئے۔ احتشام حسین، آل احمد سرور، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور اختر اورینوی نے جدید مغربی انداز کی خالص اور مکمل تنقید کی تشکیل کی۔ تقابلی تنقید کا رواج ہوا۔ فن تبصرہ نگاری کو فروغ ہوا۔ اس سلسلہ میں عبدالحق، شمس الرحمان فاروقی، باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، خلیق انجم اور رام پرکاش راہی کے نام معتبر ہیں۔ اس طرح مغربی تنقید کے [illegible] کی جڑیں ہمارے ادب کی سرزمین میں گہری پیوست ہو گئیں۔ بقول ایلیٹ اس وقت کی تنقید اپنے دامن کو زیادہ سے زیادہ وسیع کر رہی ہے۔ اور اردو تنقید اس کا رخ [illegible]

نہیں ہے۔

یوں تو یورپی اثرات کے طفیل تمام تر اردو ادب کی کایا پلٹ ہوئی لیکن جدید اردو نظم پر یہ اثرات سب سے گہرے پڑے۔ نظم ہی اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس نے یورپی شاعری کے فکر و تہذیب کے گوناگوں اثرات کو اپنے اندر کلیتاً سمو لیا۔ اور نتیجہ کے طور پر اردو شاعری کی بہترین نمائندہ اور با تعقل شہری۔

یوں تو نظم نگاری اردو شاعری کے ابتدا سے لے کر ۱۸۵۷ء تک فارسی سے مستعار اصناف قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہجو، شہر آشوب کی صورت میں رائج رہی۔ لیکن جدید اردو نظم کا آغاز انجمن پنجاب لاہور کے ہاتھوں ۱۸۶۷ء میں ہی ہوا۔ جب حالی اور آزاد نے نئی نظم نگاری کی بنیاد ڈالی۔ شبلی، اکبر، سلیم، چکبست، ناظر، شوق، سرور اور محروم نے حالی کی قومی شاعری کی روایات کو بڑھا دیا۔ شرر نے نظم معریٰ کی طرح ڈالی۔ مغربی نظموں کے منظوم ترجموں کے ذریعے نئے اسلوب سامنے آئے۔ اور اردو نظم کی فضا نکھری۔ انگریزی نظموں کے ترجمہ اور اخذ و قبول کا بہترین عمل اقبال کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ پرانی ہیئت سے انحراف کئے بغیر اقبال نے فنی تکمیل کی طرف بڑھا قدم بڑھایا۔ جعفر ... جاپانی ہائیکو کے طرز پر مختصر نظمیں لکھیں۔ آج کل یہ ہائیکو کی تقلید میں لکھی گئی۔ منیر نیازی قاضی سلیم، شہریار، باقر مہدی، صلاح الدین پرویز اور علیم الاسلام کی مختصر نظموں میں زیادہ تحریک، نمو اور تاثیر ہے۔

۱۹۳۵ء میں اشتراکی تحریک کے زیر اثر ترقی پسند ادب کی بنیاد ڈالی گئی۔ انفرادی فکر اور انفرادی تجربے کی جگہ اجتماعی کرب اور اجتماعی مسائل کا انتخاب کیا گیا۔ سادہ مانوس اسلوب اور عوامی اپیل کا چلن ہوا۔ بعد کو ن م راشد کی رہنمائی میں نوجوان شعراء کی ایک اور جماعت حلقۂ ارباب ذوق کی تشکیل کی گئی۔ جوش، فیض، سردار جعفری مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر ایسے بلند قامت شعراء کی نظموں نے دھوم مچا دی۔ اسے نیا آہنگ عطا کیا۔ پر تصنع اور فرسودہ ڈکشن اور امیجری سے نجات دلائی۔ ... لدھیانوی، براج کومل، راج نرائن راز، وحید اختر، ... ساجدہ زیدی، رام کرشن اشک، زبیر رضوی، مظہر ... رفعت سروش، عادل منصوری، محمد علوی نے اردو نظم کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ انہوں نے شخصی طرز احساس اور ... زاویۂ نگاہ پر اصرار کیا۔ قطعاً یہ شاعری کی لفظیات کو ترک ... پیرایۂ اظہار میں فرق اور وقار پیدا کی۔ رمزیت متنوع ... ان شعراء کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اس مختصر جائزے سے ظاہر ہے کہ اردو ادیبوں نے جمالِ ہمنشیں سے فیض یاب ہونے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ خواہ جمال ایران ہو خواہ فرانس اور انگلستان کا۔ اقبال کا شمار سے پہلے اور بعد کو بھی ہمارے ادیبوں کا ایمان رہا ہے کہ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ہمارے فن کار کی ایک آنکھ درون دل دیکھتی ہے تو دوسری آنکھ دل و دماغ کے دریچوں میں سے باہر کی طرف رہتی ہے۔ اور یہ شیوہ اردو ادب کے روز افزوں فروغ کے لئے ایک فال نیک ہے

سید شمیم گوہر

نثری شاعری یا صرف نثر پارہ

اُردو میں جب سے نثری شاعری کا چلن ہوا ہے مختلف مسائل سے وہ مسلسل دوچار ہوتی رہی ہے بعض تسلیم صنف کے موضوع پر اتنی بحثیں کبھی نہیں ہوئیں۔ جس کے مقدر میں صنف ہونے کا جواز تک نہ ہو اسے اپنے کسی خوش گوار مستقبل کا انتظار بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ نثر کی ایک جدید دریافت پر شاعری کا خول چڑھانا اور مغرب کی تماشا کن کاوشوں کو ہماری روایت سے جوڑنا ایک سعی لاحاصل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ایسی نثری شاعری کے نمونے ہماری قدیم کتابوں سے ثابت ہیں اور دوسری طرف یہ بھی فرمایا جاتا ہے کہ اسکی ڈوائی مغرب سے آئی ہے کتنی حیرت کی بات ہے کہ بیر تراں اور بودلیئر وغیرہ ہماکی ایجاد سے پہلے اردو والوں کو اپنی قدیمی کتابوں پر اتنی بھی گرفت نہیں تھی کہ اس سے پہلے بھی نشاندہی کرپاتے نثری شاعری وجود میں آئی تو حوالے بھی ظاہر ہونے لگے جب کہ مغربی ادبار خود ابھی تک اپنی قدیم کتابوں سے ایسی شاعری کو وابستہ نہیں کرپائے۔ سنسکرت کی قدیمی یا الہامی کتابوں کے حوالہ سے طرز استدلال پیش کرنے کا ایک شوق تو ہوسکتا ہے مگر اصولی رکھ رکھاؤ اور ذمہ دارانہ تحقیق کو کوئی تقویت نہیں پہونچتی۔ جدت طرازی کی بنیاد پر کچھ مغربی شعرا نے شہرت ضرور حاصل کرلی مگر اس تحریک کی سمادھی پر اب خود بھی پھول چڑھانے نہیں جائے اور یہاں یہ حال ہے کہ پورے والہانہ طور سے مغرب کی جدت پیش کیا جارہا ہے۔ ایک رخ سے یہ بھی سوچیے کیا قدیمی کتابوں کی ترتیب اور نزول کے وقت آہنگ آمائی اور الفاظ تراشی کے اسی اہتمام کو سامنے رکھا گیا تھا جسکی بنیاد پر ہم نثری شاعری کی علامت کا جواز مہیا کرتے پھر رہے ہیں، کیا ہر دور میں اپنے مخصوص آہنگ اور اسٹائل کا رواج نہیں رہا ہے محض دور کی کوڑی لانے سے ادب کا تعارف نہیں ہوتا تلاش حق سے ادب کو جاودانی ملتی ہے تحقیقات کو اگر یونہی بے لگام چھوڑ دیا جائے تو شاید خالص نثر نام کی عبارت نہ باقی رہ جائے ہر طرف شاعری ہی شاعری نظر آنے لگے۔ کون نہیں جانتا کہ پوری سورۃ رحمٰن شعری آہنگ سے بھری پڑی ہے بلکہ پورا قرآن حکیم توانی سے آراستہ و پیراستہ نظر آتا ہے مگر ہم اس کے حرف

کو بھی شاعری سمجھنے سے عاجز ہیں مذہبی نقطۂ نظر سے اس لئے تسلیم نہیں کر سکتے کہ قرآن حکیم کو شاعری سمجھنا کفر ہے موجبہ ادبی نقطۂ نگاہ سے اس لئے گوارہ نہیں کر سکتے کہ یہی اسکا پیدائشی نثری اسلوب ہے۔ خود اردو میں نہ جانے کتنے قصے افسانے موجود ہیں جس کی پوری زبان شعری فضا میں ڈھل ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر ان نگارشات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی گئی اور منثور شاعری کے اثرات الہامی کتابوں میں اس لئے تلاش کر لئے گئے کہ بات زرا تحقیقی اور قابلِ توجہ بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید میں اوریجنلیٹی کا ماحول اب تک نہیں پیدا ہو پایا ہے اور سرخیلِ کارواں بننے کا سب کو شوق ہے۔

نثری شاعری کی بابت کہا یہ جاتا ہے کہ عروض سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اردو میں یہ مغربی تجربہ اردو شاعری کی روایات سے آزاد ہے۔ برجستہ خیالوں کی بندش، جدید تراکیب و اضافات اور غیر مانوس لفظوں کا تعارف، لفظی آہنگ کی تلاش، اور ابہام نوازی ہی اسکی بنیاد ہے اور انہیں اجزا کے مرکب کو نثری شاعری کا نام دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ شاعری کے لئے عروض کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن اپنے مضمون میں کسی شاعر کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

شعری گویم بہ از آبِ حیات
من ندانم فاعلاتن فاعلات

(ماہنامہ شاعر نثری نظم اور آزاد غزل نمبر ص۱۲)

(دوسرے مصرع میں "بگویم" لکھا ہے حالانکہ "ندانم" ہونا چاہیئے) میں نہیں جانتا کہ اب تک کسی نے اس قول پر غور کیا یا نہیں مگر مجھے اس قول نے ضرور چونکایا ہے۔ دانشوروں نے اس بات کی یقیناً تائید کی ہے کہ شاعری کیلئے عروض کا جاننا کوئی ضروری نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تقطیع، ارکان، اور حرفی متحرکات وغیرہ سے نہیں بھی واقفیت رکھتا ہے تو بھی شاعری کر سکتا ہے۔ فن عروض کی لاعلمی کے باوجود بحر و وزن کا سلیقہ عام ہے اور یہی سلیقہ یا ذہن کی موزونیت لاشعوری طور پر عروضی اجزا میں ضم ہو جاتی ہے ظاہر ہے بحر و وزن بھی عروض ہی کے حصے ہیں لہذا کوئی بھی شاعر کلی طور پر عروض سے دامن بچا کر گذر ہی نہیں سکتا۔ مذکورہ قول میں "فاعلاتن فاعلات" کی لاعلمی جس شعری نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ یہ قول منثور شاعری کی تائید میں ہے جبکہ فارسی شاعری میں منثور شاعری کا کوئی بھی تصور نہیں پایا جاتا۔ پھر اسکے علاوہ بات شعر کی ہو رہی ہے نثری شاعری کی نہیں اور نثری اشعار سے محروم ہے۔ اس قول کا سوا اسکے اور کوئی مطلب نہیں کہ چند ضروری اصول و قرائن کے پیشِ نظر بخوبی شاعری کی جا سکتی ہے۔ اردو شعراء کی آج کثیر تعداد فن عروض سے کوئی واقفیت نہیں رکھتی مگر شاعری جم کر کرتی ہے۔ شاعر کے قول سے "فاعلاتن فاعلات" سے بیزاری ضرور ظاہر ہوئی مگر اسکے باوجود بھی اس قول کی ترتیب میں وزن کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ نثری شاعری کی محافظت میں ڈاکٹر محمد حسن اس

ول کو کیسے نقل کر گئے میرے نزدیک ایک لطیفہ کے سوا اور کچھ نہیں ۔

نثری شاعری کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی کہ اسکو تجربہ کے نام پر آزمایا ضرور گیا مگر تجربہ کے فوائد اور نتیجہ خیز امکانات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ۔ دنیا کا کوئی تجربہ محض اندھیرے میں پروان نہیں چڑھتا اور نہ ہی اندھیرے میں جنم لینے والی تحریک کی ارتقاء کے لئے کثرتِ استعمال کا معیار کارگر ثابت ہوتا ہے شراب نوشی کا سلسلہ برسہا برس سے جاری ہے مگر آج تک کسی مذہب میں اسکی فضیلت نہیں بیان کی گئی ۔ یہ حقیقت ہے کہ جتنی اہمیت تجربہ نوازی کو حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ سالمیت، ضابطہ، اور صالح پیش رفت کی ضرورت پڑتی ہے ۔ انجن کی ایجاد پر لوگ تجربہ کی ناکامی پر نہیں بلکہ ایک عجیب سے تجربہ کی کامیابی پر چونک پڑے تھے مگر ہم نثری شاعری کی ناکامی پر چونکنے کے لئے مجبور ہیں ۔ حیرت ہوتی ہے جب کچھ لوگ نثری شاعری کو سائنسی ارتقاء کی صف میں شمار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ جب دنیا کے ہر شعبے میں ترقی ہو سکتی ہے تو نثری شاعری کا تجربہ کیوں نہیں کامیاب ہو سکتا ۔ ظاہر ہے جب موازنہ کی صورت حال ایسی ہوگی تو اسکی موجودہ ہیئت میں تبدیلی بھی کیسے کی جا سکتی ہے ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جب ریڈیو کا تجربہ کیا گیا تو ریڈیو بن گیا مگر نثری شاعری آج تک شاعری نہ بن سکی ۔ ریڈیو کا ایک چھوٹا سا آلہ ہٹا دینے پر اسکی آواز بند ہو سکتی ہے تو بحر و وزن کو غارت کر دینے پر شاعری کیسے رہ سکتی ہے ۔ محض غیر عروضی لفظی آہنگ کی بنیاد پر نثری شاعری وہ دلربائی اور حرارت کہاں سے پیدا کر سکتی ہے جو آواز و کاغذ کی حد سے نکل کر دل کی گہرائیوں تک اتر تی چلی جاتی ہے اور شعر کا ایک لفظ ذہن میں روشنی بن کر آباد ہو جاتا ہے

بے حد سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ نثری شاعری کی تحریک طلبائے ادب اور کچے ذہنوں کو سب سے زیادہ نقصان پہونچا رہی ہے ۔ قد آوری کے نشے اور بحثوں کے تسلسل نے ان طالب علموں کے تعلیمی مستقبل کا بھی کچھ خیال نہ کیا جس شاعری کی گمراہ کن آسانی جنھیں بحر و وزن اور ردیف و قوافی کے جاننے سے بھی محروم کرتی جا رہی ہے ۔ وہ اساتذۂ ادب جو نثری شاعری کے موضوع پر لمبی لمبی باتیں کرتے ہیں انہیں خود خبر نہیں کہ اس شاعری کی تدریس کیا ہے اور اصول و ضوابط کا پیمانہ کیا ہے ؟ دیگر اصناف سخن کی طرح اگر ایک متعلم ادب نثری شاعری کے قواعد پر سوالات کر بیٹھے تو کیا کوئی بتا پائے گا کہ اس کی تدریسی بنیاد کیا ہے اور اس کے اصول و قانون کیا کیا ہیں ۔ مقام تعجب ہے کہ ان سوالات پر غور کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا ۔ کیا نثری شاعری پر اتنی تشریح درس کے لئے کافی ہے کہ اس میں لفظی آہنگ ہو، ابہام ہو، جدت طرازی ہو اور نئی ترکیبوں سے آراستہ ہو کیا ان باتوں سے قواعد کی تدریس کا تقاضا مکمل ہو جاتا ہے ۔ صد افسوس کہ جس شاعری کی تدریس ممکن نہ ہو، قواعد کی تابانی میسر نہ ہو حتی کہ پیمانۂ اصلاح تک نہ ہو وہ ادب' ادب کے نئے متوالوں کو سوا گمراہی کے اور دے بھی کیا سکتا ہے ۔

سب جانتے ہیں کہ شاعری کی زبان کو الفاظ کے پرکھنے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ سمجھا جاتا ہے لفظوں کی صحت اور اسکے اعراب و حرکات کے سلسلے میں بحور سے بہتر کوئی طریقہ نہیں مگر نثری شاعری نے ان ساری نزاکتوں کو تباہ کر کے رکھ دیا

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

حمید سہروردی (مہاراشٹر)

بے ربطگی

میرے بستر میں سلوٹیں کیسے آئیں۔ مجھ سے پہلے کون یہاں آیا تھا! در و دیوار خاموش ہیں —— کچھ تو کہو —— کوئی ہے یہاں —— میری کوئی نہیں سنتا —— ایسا کیوں —— ؟ کیا میری آواز کسی کو نہیں سنائی دے رہی ہے —— وہاں کون ہے۔! کونے میں —— میں آگے بڑھتا ہوں —— کوئی نہیں ہے —— پھر مجھے سایہ کیسا نظر آیا —— ! کوئی تو ہوگا ——

ہاہاہا —— ہہ ہا —— ہنہ ہا —— ہا ——

برف کی سِل پر سر رکھ کر کچھ دیر سوچو —— بیتے ہوئے لمحے کتنے نازک تھے۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بس دھندلا دھندلا ایک لامحدود اور نامکمل حاشیہ تھا —— ہوس —— وہ مرتی ہی نہیں —— ازل سے ابد تک رہے گی ——

...... تم کون ہو —— ؟ میں کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے —— ! در و دیوار بھی خاموش ہیں —— کیا میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ میری گھڑی، میرے ہاتھ پر نہیں ہے۔ اب وقت کیسے معلوم ہوگا۔ وقت کا تعین کیسے کیا جائے گا —— ارے ارے

دیکھو تو سہی، میرے دونوں بازو مجھ سے علاحدہ ہو ر
کیا گھڑی کی ناراضگی ہے —— کوئی ہے —— دیکھ
دیکھو میرے پیر بھی ہل رہے ہیں —— ارے یہ کیو
سے الگ ہو رہے ہیں —— کوئی سنتا ہی نہیں ——
کوئی ہے —— میرے دونوں بازو بے یار و مددگا
چیخ رہے ہیں —— دیکھو تو، میرے پیر سر پر ار
ہیں —— اور ذہن معدہ میں پہنچ رہا ہے ——
دل ناف میں پھنس رہا ہے —— میری آنکھیں ——
ارے میری آنکھیں —— کوئی ہے —— باپ ر
باپ، میرا سر خدا کے لیے میرا سر ستے لے جاؤ —— ہا
اگر چاہو تو میرا معدہ لے جاؤ ——

...... مگر میں کس سے باتیں کر رہا ہوں۔
سب کس سے کہہ رہا ہوں —— ! کیا میرا سر بھی غا
اور معدہ بھی —— ! آنکھیں نہیں، میں آنکھیں نہ
دوں گا —— تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے —— بزد
...... میں تمہیں قتل کر دوں گا ...... مگر کس

......

.... مگر میں کس کو قتل کر دوں گا۔ میں ک
سے کہہ رہا ہوں! کیا مجھے چکر آ رہا ہے ....؟

میں خواب دیکھ رہا ہوں — ارے کیا سب کچھ لے جا
رہے ہو — میرا سر، میری آنکھیں —— آنکھیں محفوظ
ہیں نا!

اور سر ——

ہاں!

وہ دیکھو سامنے غار، مکڑی کا جالا اور سانپ
—— کدھر —— ؟

تمہاری آنکھوں کے بالکل سامنے ——

میری آنکھوں کے بالکل سامنے تو صرف چٹیل
میدان ہے ——

تم کون ہو —— ؟

مردہ اور زندہ لمحوں کی پکار ——

کیا کہا —— مردہ اور زندہ لمحوں کی ——
مکھی اڑتی ہی نہیں، ابھی ابھی تمہارے ہونٹوں
پر تھی ایسا کیوں ——

کہاں ہے مکھی ——

وہ دیکھو، تمہاری آنکھوں کے بالکل سامنے ——
غار، مکڑی کا جالا اور سانپ —— مکھی دریں منڈلا رہی
ہے۔

آں .... آ .... ں .....

ہاں، اس طرف ہی اڑ گئی....... تمہارا احساس
تمہاری بصیرت اور تمہاری بینائی کہاں ہے۔

آں .... ا:........ ں .....

کیا ہم ایک ہی درخت کے پھل ہیں؟ جو کئی صدیوں
پرانا ہے۔ تاریخ داں بھی اپنی توانائی کو بے مصرف جہاں
لہر ہر خود کو ... اور ندامت میں کہہ گئے کہ ہم دراصل
کچھ بھی نہیں ہیں — اور یہیں سے ہم مختلف خانوں میں بٹ گئے
جنہوں نے پا بکھ جان لیا، انہی لوگوں ایک کریلا بھٹ میں
مٹھاس جیسا ذائقہ پیدا کر لیا۔ اور ہم سب دھوکے کی
بن گئے۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں علاحدہ ہوں۔ اور تم بھی
علاحدہ میں سڑک پر چلتے ہوئے، سبھی لوگوں سے علاحدہ
ہوں۔ ہر رنگ کی اپنی اپنی پہچان ہوتی ہے۔ کیا میرا وجود بے
معنی ہے؟ اپنی اہمیت تو سبھی کو قبول ہے۔ کتنے ہی لوگ
روزانہ سڑک پر بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ سبھی واقف
کار تو نہیں ہیں۔ کیا ہم ایک درخت کے پھل نہیں ہیں؟
اور ہم ہمارے جذبات —— تمہارے اور میرے اندر
بامعنی بھی رہے ہیں ——

تم کون ہو —— ؟

لوگ بے نام و نشان خود کو اسپتال سے شمشان
گھاٹ تک لے جاتے ہیں —— قابل رحم —— سیال
بیداری سنگلاخ زمینوں کو کبھی اپنے خاطر میں نہیں لاتی
—— وہ سخت اور بنجر زمینوں پر ایسے ہی وار کرتی ہے
کہ اس کی صورت تم اور زرخیز زمینوں میں مشکل ہو جاتی
ہے۔ ممکن ہے، راہ میں آئے ہوئے پتھروں اور
خذف ریزوں سے متوحش ہو۔ لیکن کب تک —— ایک
وقفہ کے بعد، جب وہ ان پر سوار ہو جاتی ہے تو ان
کے چہروں کو مسخ کر کے اپنے میں شامل کر لیتی ہے۔
تاکہ ان کا ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہو۔

.... بامعنی آنکھیں ہوتی ہی نہیں۔ یہ نیند اور
سونے کے درمیانی تعلق سے واقف ہی نہیں۔ جب
سرخ ہوتی ہیں تو کبھی شراب لگتی ہیں اور کبھی خون
—— خون زیادہ تر سیال بیداری واضح علامت

سمجھا جاتا ہے......ہمارے باپ دادا گردن سے پیر
تک بھلے رہے ۔ اور اب ہم گردن سے اوپر ہی اوپر
ہو رہے ہیں ۔ تمہارا معدہ محفوظ ہے نا!
کتنے ہی درخت بادوباراں کے باوجود بھی ٹس
سے مس نہیں ہوتے ۔ کچھ تو ہوا کے جھونکے کے ساتھ
ہی لڑکھڑا جاتے ہیں ان کے لڑکھڑا جانے کا مبین ثبوت
ہمارے اطراف گھرے ہوئے درختوں میں مل جاتا
ہے ۔

کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔ ؟

ہاں ۔۔۔ ان کی آنکھیں مسلسل بیداری سے
جل رہی تھیں ان کے سامنے چٹیل میدان ہی تھے ۔
اور تمام دشاؤں کے راستے اپنا دامن پھیلائے ہوئے
تھے ۔ دعوتِ فکر ۔۔۔ تو وہ آنکھیں ساری دشاؤں
میں پھیل گئیں ۔ کچھ آنکھوں کو بت پسند آئے اور
کچھ کو پھیلی ہوئی آگ ۔۔۔ بت پرست آنکھیں
مملکتی جوش میں مست دکھن تھیں ۔۔۔ اور آگ پسند
مصلحتیں بچانے لئے سرشار ۔۔۔ بت پسند آنکھیں
مملکتی جوش و خروش کو پائے تکمیل تک پہنچانے
میں کامیاب و کامران ہو گئیں ۔ اور آگ پسند آنکھوں
نے اپنی صورت بگاڑ لینے میں اپنا ثانی نہیں چھوڑا ۔
تمہاری آنکھیں......
آں...... ہاں........
سامنے غار، مکڑی کا جالا اور سانپ نظر آ رہے
ہیں ۔۔۔ ؟
مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے...... تم کون
ہو ۔۔۔ ؟ تم کون........

رحم دل وہ لوگ بھی نہیں .... جن کی لڑکیاں
رات بستر میں خاموش نہیں سوتی، ہماری تصویریں
آنکھوں کے اندر چھپا لیتی ہیں ۔ قابلِ رحم کوئی بھی
نہیں...... تم سوچ رہے ہونا.........!
الفاظ نے لغت اور اصطلاحوں سے کسمسا کر سلاخوں
کو توڑ دیا تو وہ لامحدود دشتوں میں کھو گئے ۔ صرف
بہرے رہ گئے ۔ تم سوچتے ہی رہو ۔۔۔ خواہش مند
لڑکیاں اور تم میرے ہی ہو ۔۔۔ میں آوارہ بادل
ہوں ۔۔۔ تم آوارہ بادل ہو ۔۔۔ ؟

ہاہہ ۔۔۔ ہہ ہا ۔۔۔ ہہ ۔۔۔ ہا ۔۔۔
بستر میں سوئے ہوئے بھی چاروں طرف سے ایک ہی
آواز آ رہی ہے ۔۔۔ میرے سامنے کوئی لکیر
بھی نہیں اور لکشمن ریکھا بھی نہیں اور نا ہی یاجوج اور
ماجوج کی دیوار، آزو بازو سے سب کچھ غائب ہو
چکی ہیں ۔۔۔ سر پر آسمان نہیں اور پیروں کے نیچے
زمین بھی نہیں ہے ۔۔۔ کیا واقعی میرے جسم کے اعضاء
مجھ سے علاحدہ ہو چکے ہیں ۔۔۔ ؟!
ہاہاہا ۔۔۔ ہہ ہہ ہہ ۔۔۔ ہو ہو ہو

تم کون ہو بابا ۔۔۔ !؟ میں نامعلوم
نامعلوم ۔۔۔ ؟ ۔۔۔ آنکھیں حیرت
سے پھیلتی ہیں ۔
●●

بقیہ / نثری شاعری یا حسرت

علم بحر کی بنیاد پر صحت الفاظ کی شناخت بھی خطرے میں پڑ گئی ہیں کہتا
یہ جانتا ہوں کہ جب نثری شاعری میں ایسا ایک بھی جوہر پوشیدہ نہیں ہو تو محض
منظوم [illegible] کے مجموعہ کو شاعری کہنے سے کیا فائدہ ۔ اگر نثری شاعری کے بجائے
اسکا نام "نثر پارہ" رکھ دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے ۔ ہم نثر پارہ کے نام سے بھی

نثار احمد صدیقی

خشک آوازیں

شعلوں کی سرخی ارض و سماں کی وسعت میں شدت سے پھیلنے لگی۔ ریگ زار کا ریزہ ریزہ دہک اٹھا ریگستان کے در و دیوار لرز اٹھے۔ ساری فضا ایلدھن کی طرح شعلہ بداماں ہو گئی، ہر فرد و بشر کے اضطرابی لہریں پھیل گئیں۔ ہر ہونٹ پر ایک ہی سوال انگڑائیاں لے رہا تھا۔ یہ کیسی آگ ہے؟ اس قدر سوزش و تپش کیوں ہے۔! بجھانے پر اور کیوں بھڑک اٹھتی ہے۔؟ یہ آگ تو جسم و جاں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دے گی۔

لوگ خوف و دہشت سے لرزہ براندام تھے۔ بے چارگی اور بے پناہی کا احساس بحرِ بیکراں کی طرح پھیل رہا تھا۔ بشر کی زباں الاماں الاماں کے ورد سے سرخ ہو چکی تھی۔ اور ان کی دردناک صدائیں اندھے پتھروں کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ اس دہشتناک گرج اور آتش دیگیر سے کئی چہرے ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ ہر وجود پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ ہر شکل و ہیئت چہرے موت و زیست کی لکیروں کے درمیان ایستادہ تھے۔ ان کی آوازیں خشک ہو چکی تھیں۔ ان کے آنسو شعلوں میں جذب ہو کر فنا ہو چکے تھے۔ ان کا آدھا وجود زندہ تھا ان کے جسموں کے گوشت سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شہید و غازی کا محاسبہ کرنے والی زبان کٹ چکی تھی۔ اور اسفل السافلین کی حکایتیں زندہ ہو رہی تھیں۔ آتش زدہ چہروں پر ایک ہی سوال تھا کب آتش خانماں برباد سے نجات ملے گی، سوزش و جلن کی اذیت ناک کرب سے کب نجات ملے گی۔؟ خوف و دہشت سے آوازیں لرز رہی تھیں۔ یادِ الٰہی اور خدائے الٰہی کا ذکر زور و شور سے ہو رہا تھا۔ جن و بشر نے ورود وظائف کے بعد پوچھا ــــ "اب کیا ہوگا؟ ــــ؟

جن و بشر نے نیلگوں آسمان کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف خلا ہی خلا تھا۔ گول دہکتا سورج منہ پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ انہیں محسوس ہوا وہ قطرہ قطرہ فنا کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ان کے وجود کی ہریالی لمحہ بہ لمحہ خشک سے خشک تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور اب وہ پیاسے شعلوں کے مانند بے چین و بے قرار ہیں تشنہ لبی اور جانکنی کی اضطرابی کیفیت بڑھتی جا رہی ہے۔ سجدہ کرنے والے اپنی اپنی شکن آلود جبیں دیکھ رہے ہیں۔ شناخت سے محروم ہونے والے چہروں کے شمار میں مصروف ہیں۔ لیکن ان کی آواز خشک ہوتی جا رہی ہے ــــ یک بیک زبردست دھماکے سے ایک تیز روشنی بلند ہوئی۔ متحرک ہونٹ خود بخود ساکت ہو گئے۔ دستِ دعا میں لرزش آ گئی۔ سجدہ کرنے والے چونک اٹھے۔ ایک مجذوب کی گرجدار آواز فضا میں گونجی ــــ "یا الٰہی۔ یہ ماجرا کیا ہے"۔؟!

لوگ اس کی باتوں پر ہنس پڑے۔ سیاہ چہرے والوں نے اسے آگاہ کیا — چودہ صدی ختم ہو چکی ہے، تم نے نئی صدی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے۔ نجات دہندہ کے ظہور کا وقت ہے۔ اپنی اپنی نگاہیں بصد احترام و ادب سے جھکا لو کہ وہ ہمارے لیے جنت کی بشارت لایا — !

جن و ملائک، فرد و بشر سب سکتے میں آ گئے —
حاضرین کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ آنکھیں حیرت و استعجاب میں ڈوب گئیں۔ ساکت لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی "آگ سے ظہور میں آنے والا جنت کی بشارت کیونکر لا سکتا ہے۔! جہنم کے پجاری نے جنت کی بات چھیڑی ہے"۔

اخوان الشیاطین نے باآواز بلند نعرہ بلند کیا اور اپنی اپنی آستینیں چڑھالیں۔ ملائکہ کی سرزمین پر قتل و خون —!!

حاضرین افسردگی و سراسیمگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اخوان الشیاطین کے رہبر کو دیکھا۔ اور اسفل السافلین کی حکایتوں کی نوک پلک سنوارنے لگے۔ رہبر کے دہن سے شعلے خارج ہو رہے تھے۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے دھوئیں کے مرغولے پھیل رہے تھے۔ اس کے جسم سے گندھک اور تیزاب کی بدبو پھیل رہی تھی اس کے تاریک چہرے اور سیاہ گھنے بالوں کے درمیان کالا ناگ پھن پھیلائے حاضرین کو ڈس رہا تھا۔ مرنے والوں کی ہڈیاں وہ خوفناک جبڑے سے چوس چوس کر پھینک رہا تھا۔ موت کا سناٹا اور قیامت کی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا پہ گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے خوفناک جبڑے کو کھول کر زبردست قہقہہ لگایا "اے زندہ قوم کی مردہ نسل، یوم الحساب اور یوم الوعید کی باتیں کرنے والو — تمہارا مہدی تمہارے روبرو آچکا ہے اور تم ہو کہ غفلت کی نیند سو رہے ہو — تمہاری دھرتی نے تمہیں سب کچھ دیا لیکن تم بھوکے اور پیاسے ہو اور تمہاری شہہ رگ پر تیز دھاری خنجر ہے۔"

پھر اس لبادے سے شعلہ جوالا پھوٹ پڑا۔ نگاہوں کو خیرہ کرنے والی تیز روشنی پھیل گئی۔ یک لخت اس کی آواز خشک ہو گئی۔ اس کی ہڈیاں جل کر راکھ ہو گئیں گوشت اور ہڈی کی بدبو فضا میں پھیلنے لگی۔ چند لمحے میں اس کا وجود جل کر سیاہی مائل ہو گیا لیکن اس کی زبان صحیح و سالم تھی۔ تر و تازہ زبان لیکن اس کی آوازیں خشک ہو چکی تھیں —!!

بقیہ	خلاء میں تیرتا بڈھا

اور غم کا بوجھ اس کے حوالے کر کے ٹھٹھاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے — دراصل اس کے ٹھٹھا میں اس کے دل کی بھڑاس کی تہہ جمی ہوتی ہے۔"

"مگر وہ بڈھا کہاں غائب ہو جاتا ہے؟"

"وہ تو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے — مگر ہوتا یوں ہے کہ ایسے موقعوں پر ہماری تیسری حس بے حس ہو جاتی ہے اور ہم اسے دیکھ نہیں پاتے ....."

"چہ ..... چہ ......"

سب نے پھر افسوس کیا اور سر کو جھکا لیا — ٹھیک بارہ بجے، دیر میں گھنٹہ بجا اور سب عام مسافروں کی طرح تھکی ہاری بوجھل سانس لیتے ہوئے — اور ایک دوسرے سے انجان ہو کر ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ گئے —

مشرف عالم ذوقی (بھوجپور)

خلا میں تیرتا بڈھا

مشینوں کی گھڑگھڑاہٹیں خاموش ہیں چمنیوں
نے دھواں اگلنا بند کر دیا ہے۔ نحیف جسموں میں توانائی
کی لَو پیدا ہوئی ہے۔ باہر کئی چوکیاں پڑی ہوئی ہیں۔
مشینوں کو بند کر کے اندر کا آدمی باہر کی کھلی فضا میں
نکل آیا ہے —— فضا میں مشینوں کی چھوڑی ہوئی
چیخیں موجود ہیں —— جاں گسل دھواں اب بھی
نتھنوں میں سمایا ہوا ہے —— ان سے ذرا ہٹ
کر دوسری جانب کاروانِ اربابِ نشاط کے شور ہیں۔
اور خاموش سسکتے ہوئے ہونٹوں کی کراہ ہے ——

"آدمی کتنا دکھ گیا ہے" ——

کنارے والی چوکی پر پلتھیا مارے بیٹھے
ہوئے ایک آدمی کی تھکی بوجھل آواز ابھری ہے ——

"تم نے کھانا کھایا —— ؟"

"بیٹی کی شادی ہونے والی ہے" ——

"چمنیوں کا دھواں اندر جا کر کینسر اور ٹی۔ بی
پیدا کرتا ہے" ——

"اب پھر گھنٹہ بجے گا اور ہماری شناسائی مشینوں
اور بے جان آوازوں کی بے ہنگم آواز میں کھو جائیگی"

——

پھر ایک طویل خاموشی —— شاید باتیں ختم
ہو گئیں —— یا مشینوں کے بیچ رہکر آدمیت کے
رشتے کا احساس بھی ختم ہو گیا —— اور ہمارے
اندر صرف گھڑگھڑاہٹ رہ گئی ہے —— ہدبلتے
ہوئے ہونٹوں کی گھگھراہٹ ——

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہے —— باتوں کے
بے ربطگی کا احساس شدت سے ہوتا ہے —— ہر
کوئی اپنے دکھے زخم دکھانے کا خواہش مند ہے ——
جسم میں سیکڑوں لاتعداد پلّو پیدا ہو گئے ہیں ——
جو مشینی فضا سے پیدا ہوئے پسینوں پر منڈلاتے رہتے
ہیں ——

"اپنی آنکھیں دیکھتے ہو......؟"

"لگتا ہے تو لگتا ہے کوئی کرن آنکھ میں اڑ کر
پڑ جائے گی —— اور آنکھ ہمیشہ کے لئے قوتِ
بینائی سے محروم ہو جائے گی"۔

"گھبراؤ نہیں —— میں بھی تمہارے ساتھ ہوں"

——

آوازیں پھر ٹھنڈی پڑگئی ہیں ـــــ جیسے اس ایک تسلی بخش جملے کے ساتھ سب کی تسلی ہوگئی ہے۔

"اب آدھا گھنٹہ اور رہ گیا ہے ـــــ ایک بجنے والا ہے ـــــ گھنٹہ پھر بجے گا ـــــ اور ہم پھر سے مشین بن جائیں گے" ـــــ

"ہم آدمی ہی کب تھے" ـــــ

"ہم تو جنم کے مشین ٹھہرے" ـــــ

"ڈاکٹر کہتا ہے چمنیوں کا دھواں اندر جا کر کینسر اور ٹی بی پیدا کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔"

"بس کرو ۔۔۔۔۔۔ بس کرو ۔۔۔۔۔۔"

کئی آوازیں کراہتی ہیں ـــــ سب پھر خاموش ہوگئے ہیں ـــــ سر کو جھکا لیا ہے ـــــ اور بے حس ہو کر خلاء میں گھورنا شروع کر دیا ہے ـــــ خلاء میں ان کے سارے جوابات موجود ہیں ـــــ وہاں ایک ہمدرد اور تسلی دینے والا بڈھا بھی موجود ہے ـــــ جو انکی چندھی آنکھوں کے بجھتے خواب دیکھ کر آہستہ آہستہ گول گول شکلوں میں واضح ہو کر انہیں بھرپور تسلیاں دیا کرتا ہے ـــــ

"خلاء میں تمہیں کیا نظر آتا ہے؟" آواز پھر تحقیق کرتی ہے ـــــ

"بہت کچھ" ـــــ

"اپنی بے جان لاش" ـــــ

اور ـــــ؟

"اسی میں سارا مفہوم دفن ہے ـــــ فہم ہو تو سمجھنے کی کوشش کرو" ـــــ

"ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اب ہم سمجھنے یا سوچنے کی کوشش بھی کریں تو دماغ کام نہیں کرتا" ـــــ

"اصل میں اب ہمارے دماغ میں بھی مشین فٹ ہوگئی ہے ـــــ جو ہر لمحہ گھڑگھڑاتی رہتی ہے ـــــ اور اپنا کثیف دکراہیت آمیز دھواں چھوڑتی رہتی ہے" ـــــ!

"سنا ہے تمہارے بیٹے کا ایکسیڈینٹ ہوگیا ـــــ کانونٹ میں پڑھ رہا تھا نا؟"

اس کے چہرے پر کوئی زہریلا دھواں سرایت کر گیا ہے ـــــ کئی چہرے اس کی جانب مڑ گئے ہیں ـــــ آنکھوں آگے دھندلا اندھیرا چھا گیا ہے ـــــ سب پھر خاموش ہوگئے ہیں ـــــ

سب کا یہی مسئلہ ہے ـــــ مشین کب کام کرنا چھوڑ دے ـــــ کون کہہ سکتا ہے ۔۔۔۔۔؟

"تیرا بیٹا اگر بڑا آدمی بن جاتا تو تجھے کیا ملتا ـــــ؟ تو اس وقت اسے دیکھنے کو زندہ بھی رہتا ـــــ؟ پھر کیا فائدہ ـــــ اپنے نحیف جسم پر بیٹے کے مستقبل کا محل کھڑا کرنے سے ـــــ؟؟

وہ پھر خاموش ہوگیا ہے ـــــ آنکھیں دوبارہ گول گول پتلیوں میں بٹ کر خلاء میں گھورنے لگی ہیں ـــــ وہ آہستہ سے اپنے چہرے کی سخت کھال ٹٹولتا ہے ـــــ پھر ایکدم سے چونک پڑتا ہے ـــــ

"رگھو! تیری بیوی کا کیا ہوا ـــــ!"

"وہ تو کب کی ٹی۔ بی کی مرگئی" ـــــ

"تو نے خبر نہیں دی" ـــــ

"تو نے پوچھا ہی کب تھا" ——

"مگر اس کا یہ مطلب ....؟"

رگھو پھر ہنستا ہے —— کس کس کی خبر لیتا رہے گا تو —— یہاں تو بیچارے سوں ساتھیوں کے رشتے دار روز ہی بیماریوں میں مر جاتے ہیں —— تو روز پوچھے گا تو اپنے سوالوں کی تاب نہ لا سکے گا —— دیکھتا نہیں ہمارے چہرے سکڑ رہے ہیں —"

"ہاں — ہمارے چہرے سکڑ رہے ہیں —— وہ چپ ہو گیا ہے —— پھر ہلکے سے اپنے جبڑے، انگلیاں، اور بدن کے کئی دوسرے اعضاء کو آہستہ سے تھپتھپاتا ہے ......

"ہاں تو سچ کہتا ہے —— کس کس کی خبر لی جائے —— جب خود اپنی ہی خبر معلوم نہیں ہوتی۔ جانتا ہے آج ایک انوکھی بات ہوئی —— جب فیکٹری آنے کے لئے تیار ہو رہا تھا اور آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو محسوس ہوا جیسے آئینہ ہی بدل گیا ہو — ایکدم سے اپنی پہچان کھو دیا تھا آئینہ نے" ——

"نہیں یار پہچان ہم خود کھو دیتے ہیں —— آئینہ تو وہی رہتا ہے" ——

"مگر ہم تو برسوں سے وہی ہے —— وہی وقت کے مارے ہوئے بیمار سا —— بھلا ہماری پہچان ......"

"—— اب ٹکڑوں ٹکڑوں بٹ کر ہم ہونے لگی ہے" ——

—— "اور ہم سمجھتے ہیں —— آئینہ اپنی شناخت کھو رہا ہے" ——

"پھر کیا ہوا" —— !

"میں نے اپنے چہرے کو کئی بار دیکھا —— سچ کہتا ہوں دوست —— وہاں ایک بالکل دوسرا چہرہ تھا —— ایک بڑی بکھری بڑھی ہوئی داڑھی والا بڈھا تھا جو اپنی چندھی آنکھوں سے میرے گزرے پل مجھے دکھا رہا تھا" —

رگھو چونکا —— اور اس کے ساتھ سب [illegible]

—— "وہی ہوگا —— وہی —— یاد ہے — ہم جب بھی تھکے ہارے یہاں چوکیوں پر بیٹھتے ہیں تو دن بھر کی تھکاوٹ اور مشین کی بے ہنگم جسم میں سمائی ہوئی چیخوں کو خلا کو اڑا دینا چاہتے ہیں —— تب وہی بوڑھا خلا سے گول گول متعدد دائروں میں بٹ کر ہماری جانب دیکھا کرتا ہے اور ہمیں تسلیاں دیا کرتا ہے" ——

"مگر وہ تو بڑا ہمدرد ہے" ——

"مگر آج اسی نے میرے گزرے پل اچانک آئینے میں آکر مجھے واپس کر دیئے —— وہی بڑی بڑی داڑھی والا، تسلیاں دینے والا بڈھا ایکدم سے بھیانک بن گیا" ——

تب رگھو نے ایک لمبی سانس لی —— آنکھوں کو کڑکڑایا —— آنکھوں سے ایک ٹھنڈا خشک قطرہ باہر چھلکا —— پپڑی جمے ہونٹ میں سکڑ گئے ——

"ایسا میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے —— [illegible] میرے پاس بھی آ چکا ہے —— [illegible] گزرے دنوں کی [illegible] دے گیا [illegible]

روپوش ہو گیا ــــ تب سے جسم گرتا ہے ــــ اندر ان گنت گھاؤں ہیں ــــ ان گنت چھبتی آنکھیں ہیں ــــ جو گھاؤ اور زخمی گھاؤں کے ریشے میں گھس کر چبھن پیدا کرتی ہیں ــــ اور جب خلاؤں میں جھانکتا ہوں تو وہاں ایک طویل خاموشی کا سناٹا دیکھتا ہوں ــــ ......

" رکھو...... رکھو ...... رو نہیں رکھو......

چپ ہو جا...... ہاں تو تمہارے ساتھ آگے کیا ہوا" ــــ

میرے ساتھ ــــ

وہ ایک پل کو ٹھہرا ــــ " اچانک میرے چہرے پر بھی کئی جوڑ پڑ گئے ــــ کئی شکنیں پیدا ہو گئیں ــــ آئینہ لمحہ لمحہ اپنی تاب کھوتا گیا ــــ دھندلاتا گیا ــــ مدھم پڑتا گیا ــــ میں نے سمجھ لیا کہ اب آئینہ اپنی پہچان کھو رہا ہے ــــ اس خیال سے ڈر کر میں نے گزرے دنوں کی خوبصورتی میں دیکھنا چاہا...... مگر وہاں ایک بھی خوبصورتی کا لمحہ نہ تھا بلکہ کئی بدنما، بھیانک اور بدصورت گڑھے دکھائی دیے جو روشن ہوتے جا رہے تھے......

" افسوس...... افسوس...... تمہارے گزرے دنوں میں ایک بھی لمحہ خوبصورت نہ تھا ــــ ورنہ تم بوڑھے کے ذریعے بخش دیے جاتے ــــ خیر آگے کیا ہوا......؟

" پھر؟" وہ ایکدم سے چونکا ــــ " پھر آئینہ دھندلا پڑ گیا ــــ اور وہاں وہ خلا روالا بڈھا اپنی بڑی بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ، اپنی کریہہ شبیہ لیے حاضر تھا ــــ اس کے ہاتھوں میں میری سڑی ہوئی تعبیریں تھیں ــــ اور پل میں مجھے محسوس ہوا ــــ آئینہ نہیں بلکہ خود میں اپنی پہچان کھو رہا ہوں ــــ اور بڈھا میری جانب میری سڑی ہوئی خواہشوں والا پھل اچھال رہا ہے ــــ پھر بڈھے نے میرے زخمی کاندھے پر ایک لوبخ سہارا لٹکا دیا......

اور ایک بے ہنگم ٹھٹھا لگاتا ہوا آئینہ سے رخصت ہو گیا...... پھر میں نے آئینہ میں دوبارہ چہرہ دیکھا ــــ وہاں متعدد ٹکروں والا ایک شکستہ ڈھانچہ پڑا تھا،

" چہ...... چہ......"

سب نے افسوس کیا اور سروں کو جھکا لیا۔ وہ بھی بے حد مغموم ہو گیا تھا ــــ چند لمحوں تک اپنی خشک آنکھوں کے نم ہونے کا انتظار کرتا رہا ــــ پھر جب ایسا ہو گیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بے خیالی میں فسردہ قدموں سے آگے بڑھ گیا ــــ

" چہ...... چہ......"

سب نے پھر افسوس کیا ــــ

" ایسا ہوتا ہے ــــ جب غم حادی ہو جاتا ہے تو وہ بڈھا ہماری سونی آنکھوں کے دھندلکے سے ہوتا ہوا خلا میں پیدا ہوئے دائروں میں سمٹ کر ہمارے سامنے آجاتا ہے ــــ اور ہمیں تسلیاں دیا کرتا ہے ــــ اور پھر جب یہ سمندر ابھان لیتا ہے تو بڈھا بھی لاچار ہو جاتا ہے ــــ!

(بقیہ ص۱۴ پر)

گیا

قمر الہدیٰ فریدی

آگ میں پھول

الاؤ جل رہا تھا۔ لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ آگ کی لپٹیں آسمانوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ بستی کے سارے لوگ اس جگہ اکٹھا تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ نوجوان نیم دائرے کی شکل میں ناچ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی بدمستیاں عروج پر پہنچنے لگیں۔

اچانک فضا میں ایک آواز ابھری — اب اسے الاؤ میں ڈال دو — " چنانچہ اس کو جھکو لے دے کر الاؤ میں پھینک دیا گیا۔ میدان میں ایک ساتھ بے شمار قہقہے گونجے۔ اور پھر وہ سب وحشیانہ طور پر رقص کرنے لگے۔

"اے آگ تو ٹھنڈی ہو جا —" یہ ایک حکم تھا، بس [illegible] شعلوں سے حرارت چھین لی۔ اور تب اسے وہ رات یاد آئی جب پہلی بار وہ روشنی کی تلاش میں نکلا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ اور اس اندھیرے میں اسے روشنی کی تلاش تھی۔ وہ گھر سے نکل کر باہر میدان میں پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا اور سوچا، یہ ستارے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے انہیں دیکھتے ہی رہو۔ اور ہیں کتنے سارے۔ گننا چاہو تو گن ہی نہ سکو۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آسمان کتنا سونا سونا سا معلوم ہوتا۔ اور وہ، جو قطب تارہ ہے، کہتے ہیں ......

ارے یہ تو چاند نکلا چلا آرہا ہے۔ بھئی! واہ! کتنا حسین اور کس قدر روشن ہے۔ لیکن یہ داغ جو ...... اونہہ! چھوڑو بھی۔ دیکھو کیسی پیاری اور بے داغ چاندنی ہے۔ مگر چار دن ہی کی تو ہے۔ پھر وہی اندھیری رات — ذہن کے کسی گوشے میں خیال ابھرا۔ اور اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا، کاش! اندھیرے اجالے کی آنکھ مچولی کا راز دنیا والے سمجھ سکتے۔ لیکن نہیں! ان سے اس قسم کی توقع فضول ہے۔ یہ بے چارے تو پتھر کے ایک بھدے سے ٹکڑے کو تراش کر بت بناتے ہیں اور پھر اس کے آگے اپنے سر رکھ دیتے ہیں۔ کس کو کس کے آگے جھکنا چاہئے؟ پتھر کو سر کے آگے یا سر کو پتھر کے آگے؟ اتنا بھی نہیں جانتے! تو پھر ...... سوچتے سوچتے یکایک اس کی نظر سامنے والے مکان کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں اس کا چچا خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ حسب معمول اس نے جھونپڑے میں ایک چراغ جلا رکھا تھا۔ مٹی کا چھوٹا سا دیا جو چقماق سے جل اٹھتا اور ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بجھ جاتا۔ اور پھر ......! یہ کیسی روشنی ہے جو [illegible] پیچھے اندھیرا چھوڑ جاتی ہے؟ روشنی کے آگے اندھیرا [illegible] آگے روشنی؟

ایک کے بعد ایک، یا دونوں ساتھ ساتھ؟

مگر کیوں؟ بھلا وہ بھی کوئی اجالا ہوا جو اندھیرے کا ساتھی ہے! داغ داغ ...... میلا میلا ...... بجھا بجھا سا! کیا یہی تلاش و جستجو کی آخری منزل ہے، یا اس کے آگے بھی کچھ ہے؟

سناٹا طاری تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔ اور وہ خیالات کے سیل رواں میں بہا چلا جا [illegible] اچانک روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ اور اس کا سارا وجود لو [illegible]

جاگ اٹھا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے قدم اٹھائے اور آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے چہرے سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اور پھر وہ نور بڑھتا گیا، پھیلتا ہی گیا۔ اب وہ اجالوں کے جھرمٹ میں چلا جا رہا تھا۔

دوسرے دن بستی والوں نے اسے دیکھا اور وہ حیران رہ گئے۔ انہیں اس کا یہ روپ پسند نہ آیا۔ انہوں نے اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ تب اس نے چلا چلا کر لوگوں کو مخاطب کیا۔ اور وہ سب سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

پھر ایک وہ دن بھی آیا جب وہ سب کے سب بستی کے باہر میلے میں گئے ہوئے تھے۔ اور اس نے عبادت گاہ میں گھس کر اپنی قوم کے معبودوں کی خبر لی تھی۔ کسی کا ہاتھ توڑا تھا کسی کی ناک اور کسی کا سر۔ اور پھر بڑے بت کے کاندھے پر کلہاڑا رکھ کر واپس لوٹ گیا تھا ____

"تم نے ہمارے خداؤں کی توہین کی ہے، تمہیں سزا دی جائے گی ____" قوم نے اس سے کہا۔

"تم، بھلا تم مجھے کیا سزا دو گے، سزا دینے کا حق منصف کو ہے، مجرم کو نہیں ____"

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ لیکن کسی نے ایک نہ سنی، اسے سزا دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اور جب ان کا سلگایا ہوا الاؤ اس کے لئے چمن بن چکا تھا، وہ آگ کے شعلوں کے درمیان کھڑے کھڑے ایک بار پھر مسکرایا۔ اس کا دل خدائے قدیر کی حمد و ثنا کے جذبات سے بھر گیا۔ وہ جھکا اور اس نے سجدے میں سر رکھ دیا۔ باہر وحشیانہ رقص اب بھی جاری تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگ سے باہر نکل آیا۔

اچانک رقص تھم گیا۔ آوازیں ڈوب گئیں۔ گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔

ارے! یہ تو .... یہ تو زندہ ہے! ان کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ گئیں۔

دیکھو اب یہ کیا کرتا ہے۔ شاید کچھ کہے گا۔ ہاں کچھ نہ کچھ کہے گا ضرور۔ ان دنوں تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے رہنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ کانوں میں انگلیاں ڈال لو۔ پھر بھی اس کی آواز پردۂ سماعت سے ٹکرائے بغیر نہیں لوٹتی۔

وہ سب دم بخود کھڑے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ آئندہ لمحات میں اس کے منہ سے نکلنے والے متوقع کلمات سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر کانوں تک لے جا سکیں۔

اس نے ایک نظر ان سب کو دیکھا اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

لیکن یہ کدھر جا رہا ہے؟ یہ راستہ تو بستی کی طرف نہیں جاتا۔ تو کیا .... یہ ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے ____؟ انہوں نے کچھ عجیب سا اضطراب محسوس کیا۔

"اے سنو! کہاں جا رہے ہو تم؟" ____ ان میں سے بعض نے اسے پکارنا چاہا۔ لیکن آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

چند نوجوان جوش میں آگے بڑھے اور پھر رک گئے۔ وہ جا رہا ہے، وہ جا رہا ہے۔ ارے کچھ کرو۔ اوہ! اوہ! انہوں نے بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور نگاہیں ملتے ہی ہر شخص ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگا۔

وہ نہایت اطمینان سے اپنے راستے پر گامزن تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت بھی چلی جا رہی تھی۔

حفیظ صدیقی (پاکستان)

اُسے علم ہے (ایک نظم)

اُسے علم ہے
میں جہاں جاؤں گا
اس کی صورت،
ہر اک گام پر ساتھ میرے رواں ہی رہے گی
ہر اک موڑ پر
میرے کانوں میں اس کی صدا گونجتی ہی رہے گی

اسے علم ہے
میں جدھر جاؤں گا
اس کی یادیں
خنک چھاؤں بن کر
میرے سر پہ سایہ کریں گی۔

اسے علم ہے
میں کہیں بھی ہوں،
اور ہر کامیابی کسی کی بھی حاصل ہو مجھ کو
مرا دل اسی کی امانت ہے
اور اس کی گہرائیوں میں وہی جاگزیں ہے
رگ و پے میں بہتا ہوا سرخ خوں،
صرف اس کے تصور سے ہی گرم ہے

اسے علم ہے
میں کہیں بھی رہوں، اس کے لئے ہوں۔
(اسی طرح سے
جس طرح وہ کہیں بھی ہو، میرے لئے ہے)

اسی واسطے
وہ کبھی بدگماں مجھ سے ہوتا نہیں

آساں نہیں ہے زندگی کرنا

مہدی پرتاب گڈھی

تراجی کیفیت اذہان پر انساں کے طاری ہے
ہر اک لمحہ ہماری زندگی پہ آج بھاری ہے
اندھیرے کا تسلط ہو چلا ہر سو فضاؤں میں
نہیں ہے زیست کے قدموں کی آہٹ ان ہواؤں میں
جو مرمٹتے تھے کل تک حسن کے ادنیٰ اشاروں پر
تھکے بیٹھے ہیں اب وہ کوہکن بھی رہگذاروں پر
ہر اک چہرے پر اک فصل جراحت لہلہاتی ہے
مسرت دل گرفتہ ہو کے خود آنسو بہاتی ہے
مگر یہ زندگی کر نیکی صورت اور یہ بیزاری
یہ بے کیفی، یہ بے چینی، یہ مایوسی نہیں اچھی
کریں ہم کس لئے ہر لمحہ ماضی کی عزا داری؟
نچوڑیں کیوں نہ اپنے حال کے لمحوں سے سرشاری
غنیمت ہے جو لمحے دے مشیت زندگی ہم کو
اٹھائیں حظ بھلا کر اپنے ماضی کے ہر اک غم کو

کریں کیوں درد کی تشہیر زخموں کی نمائش سے
کہ ہوتے ہیں سبک سر چھوڑ کر گھر اشک کے قطرے
ہم آنکھیں پھیر لیں کیوں اپنی دھرتی کی بہاروں سے
کریں ہم کیوں نہ کسب نور خود اپنی فضاؤں سے
سکوں جھلسے ہوئے اعصاب کو ہرگز نہ آئے گا!
نہ جب تک اپنی ناکامی پہ انساں مسکرائے گا
سراغ ذات پانا ہے، رموز زیست کا عرفاں
جو اس طوفان سے گذرے یقیناً ہے وہی انساں

نظمیں

رياض صدیقی : ـــــــــ

لٹ گیا شہر وفا

بجھ گئے زخم کھلے پھول مگر
شور ہے گردشِ زنجیر کا پہلے کی طرح
شہر جاناں پہ رقیبوں کی عنایات وہی
عرض شوق کو پیرایہ اظہار نہیں
ہاتھ پر ہاتھ تہہ رنگ ہوئے جاتے ہیں
دور تک کوچہ و در ہیں خاموش
سر بازار کوئی حل کا طلبگار نہیں
کس تقسیم کریں دولت جاں کی میراث
کون سمجھے گا یہاں دیدہ تر کی تفسیر
لٹ گیا شہر وفا دستِ صبا ٹوٹ گیا
کوئی آواز سر وادی سینا نہ رہی
ذہن پر جبر کرو فیض نظر کی خاطر
اور اس ساعتِ ہجراں کو شبِ وصل کہو
ہے یہی
فصل سکوں چاک گریباں ڈالو" ـ

ـــــــــ : ساجدہ زیدی

ایک نظم

مگر یہ قہقہے !!
یخ بستہ روحوں کے
دیارِ نیم خفتہ کمیں گاہوں کے
بے آہنگ خراشوں سے زیادہ
کچھ نہیں
کچھ بھی نہیں ......
جلتی ہوئی آنکھوں کے
تابندہ شرر بجھنے نہ دو
بجھنے نہ دو دل کا الاؤ،
آج ـــــــ
یا
کل ـــــــ
تم بھی اسرارِ مسرت پا ہی جاؤ گے

ترقی اُردو بیورو کی سرگرمیاں

چند اہم منصوبے

اردو انسائیکلو پیڈیا اور مختلف لُغات کی تیاری و اشاعت ترقی اُردو بیورو کے اہم منصوبوں میں سے ہے۔

۱۔ **اردو انسائیکلوپیڈیا** (۱۲ جلدیں تیار) ۴ جلدیں زیرِ نظرِ ثانی

۲۔ **انگریزی اردو لغت** (۵ جلدیں تیار) پہلی جلد زیرِ اشاعت

۳۔ **اردو اردو لغت** (۵ جلدیں تیار) زیرِ نظرِ ثانی

۴۔ **اردو اردو لغت برائے طلبا** (ایک جلد تیار) کتابت زیرِ تصحیح

۵۔ **فرہنگ سیاسیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۶۔ **فرہنگ ادبی اصطلاحات** (ایک جلد) پریس میں ہے

اصلاحات سازی

۱۸ شعبوں میں تقریباً ۱۲۲۰۰۰ اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں۔

۱۔ **فرہنگ اصطلاحات کیمیا** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۲۔ **فرہنگ اصطلاحات انسانیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۳۔ **فرہنگ اصطلاحات معاشیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

۴۔ **فرہنگ اصطلاحات حیوانیات** (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

لسانیات، جغرافیہ، نباتیات اور تاریخ و سیاسیات کی فرہنگوں کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

چند نئے منصوبے

۱۔ اُردو کتابوں کی ببلیوگرافی

(چھاپہ خانے کی ایجاد سے لیکر ۱۹۴۷ تک)

ملک کی اہم لائبریریوں میں کام کیا جائیگا۔ فی الحال
مولانا آزاد لائبریری
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کام جاری ہے۔
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام عنقریب شروع کیا جائے گا۔

۲۔ اُردو اداروں کی ڈائرکٹری

ترقی اردو بیورو اور ملک کی تمام اردو اکیڈمیوں کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے اور باہمی تعاون سے یہ ڈائرکٹری مرتب کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح کئی اور اہم کام کیے جا رہے ہیں۔

کتابت اور خطاطی کے تربیتی مراکز

اب تک ۲۰ تربیتی مراکز ملک کے مختلف علاقوں میں قائم کیے گیے ہیں۔ ان میں دو مراکز اعلا فن خطاطی کی تربیت اور تین مراکز بطور خاص خواتین کے لیے ہیں۔ جلد ہی ایسے اور مراکز بھی قائم کیے جائیں گے

ردو ٹائپ رائٹر اور طباعتی کمپیوٹر

ترقی اردو بیورو نے ملک میں [illegible] تجارتی طور پر اردو ٹائپ رائٹر [illegible] تیاری کے [illegible] کام کیا ہے۔ چنانچہ اب اردو ٹائپ [illegible] بہتر [illegible] اور آسانی [illegible] ہو گیا۔ [illegible] تیاری کے سلسلے میں بھی کوشش کی جا رہی ہے۔

[illegible] اور [illegible] پروگرام

۔ مراسلتی کورس : ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو سیکھنے کے خواہشمندوں کے لیے انگریزی اور ہندی کے ذریعہ تعلیم سے اردو سکھانے کا [illegible] کو [illegible] بھی شروع کر دیا جائے گا۔ [illegible] کا کام مکمل کیا جا رہا ہے۔

تحقیقی رسالے کی اشاعت : ترقی اردو بیورو کی [illegible] سرگرمیوں کے [illegible] ماہی ترجمان "اردو دنیا" [illegible] ایک [illegible] ماہی معیاری تحقیقی رسالہ بھی جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ ابتدائی تیاریاں جاری ہیں۔

مطبوعات کی نمائش اور فروخت

ترقی اردو بیورو ملک کے مختلف اردو مراکز میں ہر سال اپنی کتابوں کی نمائش اور فروخت کا انتظام بھی کرتا ہے پچھلے سال بیورو نے دہلی، بھوپال، مدراس اور کلکتہ جیسے اہم مقامات پر اپنی کتابوں کی نمائش لگائی تھی۔ گذشتہ مالی سال کے دوران ۳۱۱۴۵ روپے کی مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس طرح اب تک کل ۱۰۰۶۵۶ء۱۰ روپے مالیت کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں۔

بچوں کا ادب

ترقی اردو بیورو اردو میں بچوں کی اچھی اور معیاری کتابوں کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں بھی کوشاں ہے۔ اب تک [illegible] کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

طبی کتابیں

طب یونانی کی عام ضرورتوں کے علاوہ نصابی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئی کتابیں لکھائی جا رہی ہیں۔ اب تک دس (۱۰) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

علمی، ادبی، سائنسی اور تکنیکی کتابیں

مختلف علوم و فنون سے متعلق اب تک ۵۵۴ کتابیں شائع کی ہیں ان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جو اپنے موضوع پر اولین تصانیف ہیں اور کئی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں گذشتہ مالی سال کے دوران مختلف علوم و فنون سے متعلق [illegible] کتابیں شائع ہوئی ہیں جو از خود ایک ریکارڈ اشاعت ہے۔

یہ کتابیں مختلف ریاستوں میں کسی بھی بک سیلر سے خریدی جا سکتی ہیں براہ راست بیورو سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں

تفصیلات کے لیے ذیل کے پتہ پر لکھیں

ترقی اردو بیورو

شعبہ [illegible]
فروخت
نمائش

ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم، نئی دہلی [illegible]

پرویز رحمانی

اَب

ناک، بے بو باس
آنکھیں، روشنائی سے جدا
سماعت، خامشی سے پُر
زباں، بے نطق......
دنوں پر، اندھے سورج کا تسلط
شبوں پر، نقطہ نقطہ سیاہ تارے
اور کالے چاند کا قبضہ.....
نیندیں، رت جگوں کی سوچ.......
ذہن و دل
ٹھہری ہوئی اک آخری سچائی پر مرکوز
اپنی ساعتیں
لمحہ بہ لمحہ دھڑکنیں سہتے ہوئے
احساس
خوف کی پیلی صلیبوں پر!
لٹکتا نیلا جسم........

ملکہ خورشید

معمول

ٹوسٹ، مکھن
جائے۔
خالی پیالیاں
سائیکل، گلیاں
دکانیں۔
سنیما کے پوسٹر،
سبز باغوں کی طرف
پیہم بلاتے۔
لاٹریوں کے ٹکٹ!
اس سڑک کے پار
دفتر۔ فائلیں،
دردِ سر اور چڑچڑاہٹ
زندگی کے مستقل
عنوان ہیں!

تعبیر!

تر ہوتی گئی گردشِ خوں
وزِ تخلیق سے جلتا ہی رہا پہلوئے جاں
ی صورت سے سبک ہو نہ سکا جسمِ گراں
ہیلتا ہی رہا خوابوں کا فسوں
نگی روح کی شبنم سے بجھائی نہ گئی
رأت شوق کی تعبیر تو دیکھ
سرکشیدہ رہا فردوس میں بھی مارِ سیاہ
رونقِ بزمِ جہاں بن گیا آدم کا گناہ
واب تخلیق کی تعبیر تو دیکھ

الیاس عشقی: ———

ظہیر غازیپوری ———

پندار

معنویت کی بے انتہا وسعتیں
جب نگاہوں میں ہوں
تو زمیں، دشت، صحرا، سمندر، سبھی
نقشِ موہوم سے لگتے ہیں
نیلے پانی میں تحلیل ہوتے ہوئے!
پھر بھی
افکار کی کشتِ زرخیز میں
میں نے دیکھا ہے اکثر
کہ صرف ایک نقطہ بھی
پندار ہوتا ہے
ابہام و تفہیم کا ——— !

ممتاز راشد

تھکن کے ساتھ بڑھا حلقۂ نظر میرا
ہوا نہ ختم کسی موڑ پر سفر میرا
خود اپنے آپ کو سمجھا کے لوٹ آیا ہوں
کوئی بھی بس نہ چلا جب ہجوم میرا
بھٹک رہا ہوں میں حالات کے اندھیروں میں
چمک رہا ہے ترے آنسوؤں سے گھر میرا
ملا جو قرب تو روشن ہوئے سبھی خاکے
ترس رہا تھا اسی آگ کو ہنر میرا
وہ شور تھا نہ سنی اپنے جسم کی آواز
بلا رہا تھا مجھے کب سے ہم سفر میرا
میں گھر گیا ہوں مکانوں کے درمیاں راشد
پڑا نہیں ابھی سایہ زمین پر میرا

یحییٰ خالد

میں نے دیکھے ہیں ایسے منظر بھی
دور رہتے تھے جہاں پہ پتھر بھی
ہائے دیوانگی جو دل میں تھا
نام اس کا ہے اب زباں پر بھی
اپنا مفقود رہی تمازت تھا
بستیوں میں تھے سیکڑوں گھر بھی
کب لٹیروں سے میرا گھر لٹتا
ان کے ساتھی تھے گھر کے اندر بھی
کون خالد کا آشنا بنتا!
وہ مسافر تھا اور بے گھر بھی

★

محسن بھوپالی

خیالِ خام کی اے دوست انتہا بھی ہے
تمام شہر کبھی ہم نوا ہوا بھی ہے
حصار کھینچنے والو مآل تو سوچو
بھنور کی موج کے آگے کوئی رکا بھی ہو
فضا خموش ہوئی تو زمین بولے گی
کہ جستجو کا کہیں سلسلہ رکا بھی ہے
چنو وہ لفظ معادن ہوں جو مکنے میں
وہ وقت آئے گا سوچو گے یہ کہا بھی ہے
ہماری جان پہ دہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

آذر حفیظ

جتنا باوفا سمجھا، اتنا بے وفا پایا
ہم نے تم کو کیا سمجھا، ہم نے تم کو کیا پایا
ہر طرف اندھیروں کی آہنی فصیلیں تھیں
ہو گئی سحر واپس جب نہ راستا پایا
غم جسے سمجھتے تھے، دشمنِ دل و جاں ہے
دل کا ہم نشیں دیکھا جاں کا آشنا پایا
ہم کہ ہیں وفا پیشہ شرمسار رہتے ہیں
دیکھ تیری چاہت کا ہم نے کیا صلا پایا
زخم حشر کا طالب پھر بھی ہنستا رہتا ہے
پھول جب کھلا کوئی دل نے آئینہ پایا
ہم نے اپنی ہستی کو وہم کی طرح دیکھا
اور اپنے خوابوں کو صبر آزما پایا

غزلیں

نذیر فتح پوری

نہیں اُڑوں تو ہوا احساس کچھ ندامت کا
اڑوں تو لوگ کہیں مجھ کو برگِ آوارہ
نہ جانے کون سا جھونکا ہوا کا گل کر دے
میں راستے کا دیا ہوا مرا بھروسہ کیا
اے دوست! چہرے بدلنا نہیں مری فطرت
میں ایک دل کا ہوں، میرا ہے ایک ہی چہرا
چمن اداس، فضا مضمحل، گھٹن دل میں
اب ایسے حال میں جینا ہے اک سوال نما
نہ جانے کتنی حدود کا سفر کیا پھر بھی
مجھے تلاش تھی جس کی میں اس کو پا نہ سکا
ستم شعار، ستم آشنا، ستم پرور!
خطاب اس نے دیئے ہیں نذیر کو کیا کیا

دلکش اعظمی

۱

سنہرے پھول درختوں سے ٹوٹ کر برسے
لرز لرز گئے پتے ہواؤں کے ڈر سے
وہ صرف عکس اجالے میں جسکو دیکھا تھا
اندھیرا آیا تو بچھڑ جا ملا وہ پیکر سے

نہ روک پائیں مگر اس کو سرخ زنجیریں
جو رات جسم پہ ڈالے نکل گیا گھر سے
رگڑ سے پیڑوں کی چنگاریاں ہی نکلی تھیں
دھواں گذر گیا ہر اک درخت کے سر سے
تمام موجیں وہیں کھیت ہو گئیں دلکش
بہاؤ دریا کا ٹکرا گیا جو پتھر سے

★

اشرف آتاری ____

حادثوں سے، وہ ڈر گیا ہوگا
سر جھکا کر گذر گیا ہوگا
مدتوں سے تھا وہ یہاں لیکن
آج وہ اپنے گھر گیا ہوگا
پوچھ لوں؟ اب مجھے بلایا کیوں؟
اب، تو غصہ اتر گیا ہوگا
چھوڑ کر اپنا گھر وہ آیا تھا
جانے وہ اب کدھر گیا ہوگا
چھین کر مجھ سے میرا صبر و سکوں
اور کس کس کے گھر گیا ہوگا
ہجر کی رات کیوں نہیں ٹلتی
وقت شاید ٹھہر گیا ہوگا

احمد پرکاش ____

ارے کیوں بات کرتے ہو دکھوں کی
بہم بانی ہے رنگین موسموں کی
مرے شوکیس میں کچھ دل رکھے ہیں
کمی ہے بس یہاں پہ دھڑکنوں کی
ہم اپنے آپ سے کچھ ڈر گئے ہیں
نہ باتیں چھیڑیئے گا آئینوں کی
زبان و دل پہ قابو کیجئے گا -!
یہاں پہ ہے کمی گنجائشوں کی
تمناؤں نے اندھا کر دیا ہے
شکایت کیوں کریں ہم پتھروں کی

مطبوعات
دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا

زاویہ نگاہ	ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی	۲۵	روپیے
احتشام حسین نمبر (آہنگ) مرتبہ کلام حیدری		۲۵	،،
نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	مہدی جعفر	۳۰	،،
اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	۳۰	،،
تلمیحات	کلام حیدری	۲۰	،،
بابا لوگ	غیاث احمد گدی	۸	،،
پڑاؤ	غیاث احمد گدی	۲۵	،،
روشنائی کی کشتیاں	احمد یوسف	۱۵	،،
الف لام میم	کلام حیدری	۱۵	،،
ارتقا مرتبہ	کلام حیدری	۱۵	،،
پس دیوار	عبدالصمد	۲۰	،،
یہ لوگ (خاکے)	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	۱۸	،،
گولڈن جوبلی	کلام حیدری	۲۰	،،
شعلے بھڑک اٹھے (ڈرامہ)	نثار احمد صدیقی	۸	،،
رگ سنگ	بدر اورنگ آبادی	۱۵	،،
عکس (انٹرویو کا مجموعہ)	نثار احمد صدیقی	۱۰	،،
افکار منتشر	بدر اورنگ آبادی	۸	،،
گلشن نمبر (آہنگ) مرتبہ	کلام حیدری	۲۵	،،

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا ۸۲۳۰۰۱


1984

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۲ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے ۳۶ روپئے

ایک شمارہ ۳ روپئے

فون ۴۳۲

اگست ۱۹۸۴ء

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبدالصمد

کتابت: شہزاد انجم قمری — طباعت: ہند لیتھو پریس گیا

محتویات

اداریہ

کشکول

تصوّف اردو شاعری میں خصوصاً اور ادب میں عموماً ایک تحریک کی صورت میں نہیں رہی ہے کیونکہ اس میں پروپیگنڈہ، پبلیسٹی، حکمرانوں کی پشت پناہی وغیرہ کا کوئی ہاتھ نہیں رہا ہے مگر اس ذہنی اور وجدانی رجحان میں ایسی کشش رہی ہے کہ اس فلسفے کے تصوّرات کا اردو شاعری پر وسیع اور گہرا اثر اردو کی ابتدا سے ہی پڑتا رہا ہے۔ تصوّف کو بعض نے "زوال آمادہ تصور" بتایا ہے اور سمجھا ہے، دراصل کوئی فلسفہ اپنے نقطۂ عروج پر جب پہونچ جاتا ہے اور اسے کوئی ایسا جینیس میسر نہیں آتا جو اسے اور آگے، اور بلندی تک لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کے ماننے اور جاننے والے اپنے آپ کو دہراتے لگتے ہیں۔ اس لئے ایسا دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ فلسفہ ہی بذات خود جامد اور سرد ہوگیا ہے اور اس کی کیفیت بنجر زمین کی سی ہوگئی ہے جس میں کچھ پیدا نہیں ہوسکتا۔

اسی لئے بعض نے اقبال کے مطالعے کے سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ اقبال نے تصوف کی پست ہمتی پسندی اور بے عملی کو ضرر رساں کیا ہے اور وہ حرکی قوتوں کے مداح اور مبلغ ہوئے۔ تصوف کا تعلق عام طور پر جسے "عملی معاملات" کہا جاتا ہے اُس طرح کا نہیں ہوتا جس طرح کا دنیاوی میار اور عمل ہوتا ہے تصوف میں جذب اور دروں بینی کی جو حرارت ہوتی ہے اسے عام میار سے دیکھنے پر اس کا احساس ہونا ... تصوف "پست ہمت پسندی" اور "بے عملی" کا نام ہے یہ رجائی اور حرکی فلسفہ ہے جس کے حلقے میں دنیا اور ... دونوں ہیں۔ مگر ہر بڑے فلسفے کی طرح اس سمندر کے غوطہ خور کم ہیں اور اس میں غوطے لگا کر موتی نکال لانے والے تو اور بھی کم ہیں۔ شناوری بغرضِ شناوری اردو کے تقریباً ہر اہم شاعر کے یہاں ہے مگر کم ایسے ہیں جو تصوف کو دل میں اتار سکے ہوں۔ ذہنی فلسفے بہت ہیں مگر "ذہن و قلب" کا فلسفہ تصوف اور ویدانت کے سوا شاید کوئی نہیں۔

تصوف سیدھے یعنی براہ راست "بڑھے چلو" "انقلاب زندہ باد" نہیں ہے۔ یہ ذہن کے دریچوں

سے قلب کے نہاں خانوں تک کا وہ راستہ ہے جو نفس کشی اور پیر و فقیر کی تقلید اور پیروی کی روشنی میں ہی نظر آتا ہے اور آسکتا ہے۔ یہ جھنجھوڑتا نہیں ہے، انسان کو "انسانیت" کی پہچان کی دیدہ وری دیتا ہے یہ INSPI-RATION ہے REVOLT نہیں ہے ـــــ مگر مجھے بتایا جائے کہ کون سا انقلاب بغیر INSPIRA-TION آیا ہے اور آسکتا ہے۔ خصوصاً ذہنی انقلابات جو قلب و نظر کی دنیا بدل دیں، اور کائنات اور ماورائے کائنات کے اسرار و رموز کے پردے ہٹا دیں۔

تصوف میں اضطراب ہوتا ہے اضطرار نہیں۔ بے قراری ہوتی ہے، مجبوری نہیں۔ اور اسی لئے میں تصوف کو ایک عملی اور تحریکی فلسفہ مانتا ہوں، بات میرے ماننے کی نہیں ہے بلکہ میں نے تصوف کے سچے علم برداروں اور عامل بزرگوں کے یہاں اور ان کے توسط سے اردو شاعری میں تحریک، حرارت اور تخلیقی اضطراب دیکھا ہے۔

"مسائل تصوف" سے زیادہ غالب کو اس بات پر زیادہ فخر تھا کہ ان کا بیان یعنی طرزِ بیان تصوف ایسا تھا کہ وہ ولی کہے جاتے اگر بادہ خوار نہ ہوتے۔ حالانکہ غالب کی بادہ خواری ایک طرف اُن کے مسائل تصوف زندہ، چلتے پھرتے اور INSPIRE کرتے ہوئے ہیں۔ جامد اور سرد نہیں ہیں۔

زندگی سے گریز جدید ہزیمتی اور موت پسند فلسفوں میں ہے کیوں کہ صنعتی اور خالص دنیاوی رجحانات یہی دے سکتے ہیں۔ لیکن تصوف تو ایک شہر ایک ملک نہیں، کائنات اور ماورائے کائنات پر سوچنے اور حاصل کرنے کے لئے INSPIRATION دیتا ہے۔

تصوف کے اس POSITIVE عمل پر نگاہ نہ رکھنے والا تصوف کے متعلق محض بندھی ٹکی باتیں کرتا ہے اور باتوں کی تکرار سے خواہ مخواہ جمود کا شبہ گزرنے لگتا ہے۔

کلام حیدری

سلسلہ ۲

کلام حیدری

شمس الرحمٰن فاروقی اور میر کی شرح

(جواز شمارہ ۲۰)

وصل و ہجراں دو جو منزل ہیں یہ راہِ عشق میں
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

فاروقی صاحب کا شارح کی حیثیت سے جو انداز ہے وہ ان کا خاص ہے۔ اس شعر کے سلسلے میں خاص باتیں انھوں نے یہ بیان کی ہیں:

۱۔ شعر کا ابہام قابلِ داد ہے۔
۲۔ یہ واضح نہیں کیا کہ دل وصل سے ہجر کی طرف جا رہا تھا یا ہجر سے وصل کی طرف یا کشاکش تھی۔
۳۔ ہجر کو راہِ عشق کی ایک منزل کہنا بھی بہت خوب ہے۔
۴۔ 'مارا گیا' میں یہ بھی اشارہ ہے کہ راہ زنوں کے ہاتھ مارا گیا یا اپنی ہی طاقت کم ہو جانے کے باعث جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔
۵۔ غریب بمعنی "مسافر" بھی ہے اور بمعنی 'بے چارہ' بھی۔

میری گذارش یہ ہے کہ اس شعر میں "قابلِ داد" حد تک ابہام نہیں ہے۔ عشق کی منزل سوائے وصل کے شاعری میں مجھے اور کہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ ہجر میں مرجانا تو عام بات ہے۔ وصل میں مارا جانا اصل بے چارگی ہے حسرت آمیز ——— "وصالِ یار" کا شادیٔ مرگ ہونا۔ نادر بات ہے اور 'غریب' کے ایک معنی نادر شے بھی ہے۔ میر کے زمانے میں رہزنی ہوتی تھی ——— یہ عجیب منطق ہے! جیسے آج رہزنی نہیں ہوتی ہے۔ دِل نہیں رہا ——— مارا گیا ——— راہِ عشق میں۔ منزل کے ایک معنی مکان اور گھر بھی ہے یعنی دل کے یہی دو گھر ہیں ——— وصل اور ہجر ——— لفظ 'اِن' اشارہ کرتا ہے کہ یہی معنی شعر میں لئے گئے ہیں ——— راہِ عشق کا مفہوم سیدھے عشق کا راستہ ——— عمومی بات ہے' جیسے "خدا کی راہ میں دیدے" یہاں راہ کے معنی راستہ نہیں بلکہ 'سبیل' ہے۔ اب راہ کی جگہ سبیل رکھ کر دیکھئے۔ شاید ناچیز کی بات آپ تک پہنچ جائے۔

کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اس کے کوچے میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا

فاروقی بہت سی باتیں کہتے ہیں:

۱۔ اس شعر میں ایک ایسا افسانہ ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔

۲۔ لیکن لطف یہ ہے کہ افسانے کا صرف ایک حصہ الفاظ میں پیش کیا ہے (غالباً فاروقی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے مصرعے میں افسانے کے ایک حصے کا وضاحت کے ساتھ اظہار ہے کیونکہ الفاظ کے ذریعہ تو بہرحال دوسرے مصرعے میں بھی باتیں کہی گئی ہیں جا ہئے سمجھنے کے لئے سب کچھ قاری کے تخیل پر چھوڑ دیا گیا ہو)

۳۔ میر نے معشوق کی گلی میں ٹھکانہ بنایا ہے۔

۴۔ اس کی (میر کی) ذہنی کیفیت نوبت کہیں وحشت کی ہے۔

۵۔ دوسرے مصرعے میں افسوس کے لہجے میں کہا گیا ہے کہ اسے وحشت تو تھی ہی، بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا اور جب اٹھ کھڑا ہوا تو اس کی وحشت پر خفا ہو کر معشوق نے اسے قتل کر دیا یا لوگوں نے اسے سنگسار کر دیا۔

۶۔ لیکن دوسرے لہجے میں پڑھئے تو مصرعۂ ثانی میں ایک موہوم سی امید کا بھی اظہار ہے گویا اپنے دل کو سمجھا رہے ہوں، جس طرح بری خبر ملنے پر دل کو سمجھاتے ہیں اور اس خبر کو اچھے معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہیں اٹھ کر چلا گیا ہوگا۔

فاروقی کی باقی باتیں کہ شعر کنایاتی اسلوب کا بے مثال نمونہ ہے غزل کی رسومیاتی دنیا کے الفاظ کے باوجود کئی سطحیں شعر میں ہیں ——— تشریح نہیں، تنقید یا تبصرہ کہی جائیں گی۔

میری ناچیز گذارشات:

۱۔ "شعر میں افسانہ ہے اور افسانہ ڈرامائی ہے" فاروقی کی بات کا مفہوم یہی ہے۔ ڈرامائی شعر ہے۔ کیونکہ پہلے مصرعے میں 'اطلاع' میں جو اچانک پن ہے وہ ڈرامائی ہے ——— مگر دوسرے مصرعے میں یہ ڈرامائیت نہ قائم رہی نہ بڑھی۔

۲۔ بیٹھے بیٹھے اُٹھ گیا ہوگا ——— فاروقی نے اٹھ گیا ——— کے گیا کو کھڑا کر دیا ہے اور اسی پر یہ باتیں بھی کھڑی کر دیں کہ معشوق نے قتل کر دیا، لوگوں نے سنگسار کر دیا وغیرہ وغیرہ

۳۔ بیٹھے اٹھ گیا ہوگا کہہ کر میر نے معشوق اور گلی والوں سب کو بری الذمہ کر دیا ہے۔ مر جانے کو اُٹھ جانا کہتے ہیں، وحشت میں اٹھ گیا، عشق کا قصور ہو، وحشت کا ہو مگر معشوق کو میر الزام نہیں دیتا۔ گیا لفظ کو 'کھڑا' مان کر فاروقی نے میر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

۴۔ 'امید موہوم'، کہ اٹھ کر بھاگ گیا ہوگا ——— یہ شعر کے ایک لفظ سے بھی ظاہر نہیں ہے، لہجہ بدل کر پڑھئے یا کچھ بھی کیجئے ——— 'اٹھ گیا' کا مطلب سیدھے مر گیا ہی سمجھا جائے گا۔ اُٹھ کر بھاگ گیا ——— کیوں؟ سنگساری کے خوف سے؟ معشوق کے قتل کر دینے کے ڈر سے؟ یہ سب باتیں اس شعر سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتیں۔ بقیہ ص ۱۹

باخبر

آس پاس

اس عنوان کے تحت پیش کئے گئے افکار "باخبر" کی آزادی تحریر کا ثبوت جو مہیا کرتے ہیں۔ اتنا ہم پوری ذمّہ داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ادبی رسالے میں ایسے سیاسی اور نیم سیاسی مطالعوں کا پیش کرنا کارآمد ہے۔

— کلام حیدری

جنگ اور محبت میں

جموں کشمیر میں سیاست کا جو نیا باب کھلا، اگرچہ وہ بہ انداز دیگر کھلا، اس کی توقع عرصے سے کی جا رہی تھی۔ سیاسی پنڈتوں کا خیال تھا کہ وہاں فاروق محمد اللہ کی حکومت کو برخواست کرکے صدر راج قائم کر دیا جائے گا، لیکن ہوا یوں کہ خود فاروق عبداللہ کی جماعت کے بارہ ممبروں نے اُن سے علیٰحدگی اختیار کر لی اور اس طرح ان کی سرکار خود بخود اقلیت میں آگئی۔ اکثریت کا اعتماد کھونے کے بعد انہوں نے گورنر کو اسمبلی تحلیل کرنے اس کا اجلاس بلا[illegible] کا جو مشورہ دیا، گورنر کے لئے

وہ قابل قبول نہیں تھا، دوسری طرف ان بارہ ممبروں نے جی ایم شاہ کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ اور اسمبلی کے ۲۶ کانگریس ممبروں نے اُن کی حمایت کا اعلان کر دیا، اس طرح گل شاہ، واضح طور پر اسمبلی میں اکثریت کے لیڈر ثابت ہو گئے۔ اس صورت حال میں گورنر کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ استعفےٰ دینے سے انکار کرنے پر وہ فاروق عبداللہ کی حکومت کو برخواست کرکے گل شاہ کو وزارت بنانے کے لئے مدعو کریں، سو انہوں نے وہی کیا۔ کشمیر میں جو کچھ ہوا، وہ سب کچھ آئین کے پس منظر میں ہوا، اسے غیر آئینی نہیں کہا جا سکتا۔ حزب مخالف جماعتیں فاروق

عبداللہ حکومت کی برخواستگی پر جو واویلا مچا رہے ہیں اس
کا تعلق 'اخلاقیات' سے ہے۔ لیکن 'اخلاقیات' کے تعلق سے
ہنگامہ کرنے کا ان کے پاس کیا جواز ہے جبکہ خود جنتا حکومت
میں آدھی درجن ریاستوں میں ان سرکاروں کو برخواست
کیا گیا تھا جنہیں اسمبلی کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔
ہندوستان کی موجودہ سیاست میں جب کوئی شخص اخلاق
اور 'مورل' وغیرہ کا نام لیتا ہے تو اس کی دماغی صحت پہ
شبہ ہونے لگتا ہے۔ سیاست میں ایسے عناصر کو گاندھی جی
اپنے ساتھ ہی لیے گئے تھے اور پھر ان کا آج تک پتہ نہیں
چلا۔ اب رہے فاروق عبداللہ تو جب وہ خود اپنی جماعت
کے لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر نہیں چل سکے تو پھر اب ان کے
پاس دعویٰ کرنے کو اور کیا رہ جاتا ہے۔ اب انہیں سیا
کے تپتے ہوئے ریگزاروں سے گزر کر خود کو کندن ثابت
کرنا پڑے گا۔ اب تک انہوں نے جو کچھ بھی کھایا وہ سب
ان کے باپ شیخ عبداللہ کی کمائی تھی۔ ڈیڑھ سال تک
کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد بھی فاروق
ابھی میدان سیاست میں نووارد ہی سمجھے جائیں گے ورنہ وہ
مرکز اور اندرا گاندھی سے ٹکر لینے کی بات کبھی نہیں
سوچتے۔ کشمیر انتظامیہ پر ان کی مکمل گرفت نہیں تھی ورنہ
ریاست کے اندر ان کے دور میں جو ہنگامہ آرائیاں ہوتی
رہیں، ان کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ گل شاہ کی وزارت
بظاہر ایک مضبوط وزارت دکھائی دیتی ہے۔ انہیں کانگریس
پارٹی کے ۲۶ ممبران اسمبلی کی مکمل حمایت حاصل ہے نیشنل
کانفرنس کے جن بارہ ممبروں نے فاروق کا ساتھ چھوڑ کر
ان کی حمایت کی، ان سبھوں کو وزیر بنا دیا گیا۔ گل شاہ
نہ صرف شیخ عبداللہ کے داماد ہیں بلکہ وہ ان کے سب
سے قریبی ساتھی اور وفادار بھی، اتنا ہی قریب کے محض
اپنی خوشنودی کے لئے شیخ صاحب نے مرزا افضل بیگ
کو حکومت اور پارٹی دونوں سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال
باہر کیا تھا۔ انہیں انتظامیہ کا بھی خوب تجربہ ہے۔ دیکھنا
یہ ہے کہ وہ مرکز کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کو کس طرح
برقرار رکھتے ہوئے اپنی گدی کو سلامت رکھ سکیں گے۔
جہاں تک کشمیر کی سیاست کا سوال ہے، بدلی
جماعت وہاں کا خاصہ ہے۔ شیخ عبداللہ کی پہلی وزارت
جب ۱۹۵۳ء میں برخواست کی گئی تھی تو ان کے بعد جن
لوگوں نے حکومت کی تشکیل کی تھی، وہ کوئی اور نہیں ان کے
قریبی ساتھی اور معتمد تھے۔ ساتھیوں کی حمایت قسم کھلانے
اور بزرگوں کی مزاروں پر حلف اٹھانے سے حاصل نہیں
ہوا کرتی، اس کے لئے وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو
ہریانہ کے وزیر اعلیٰ بھجن لال کرتے رہتے ہیں۔ سیاست
کا معاملہ جنگ اور محبت کا معاملہ ہے جس میں ہر چیز جائز
سمجھی جاتی ہے۔

باریک مسئلہ

بہار کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا،
بہت سی وجوہات کی بنا پر نکالے گئے، ان میں ایک بڑی
وجہ ریاست پر کروڑوں روپئے کا اوور ڈرافٹ
(over draft) کے بوجھ کا ہونا بھی تھا۔ وہ جب
بھی کوئی اسکیم بناتے تو ان کی راہ میں وسائل کبھی حائل نہیں
ہوپاتے تھے، جس کے نتیجے میں ریاست پر قرض اور اوور
ڈرافٹ کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا، مرکز کی کانگریسی حکومت
اس سلسلے میں بہت فکرمند تھی، معاملہ اگر بنگال جیسی غیر
کانگریسی حکومت کا ہوتا تب تو کوئی بات نہیں تھی کہ وہ
ان کا اپنا مسئلہ تھا۔ اور انہیں ہر حال میں اس سے
نمٹنا تھا۔ بنگال نے اپنے اوور ڈرافٹ کو پورا کرنے کے
لئے بنگال کی آٹھ یونیورسیٹیوں کے ملازمین کے مختلف
فنڈ کو ریاست کے مالی فنڈ میں منتقل کرنے کا حکم دیا

جس سے وہاں ایک عجیب صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ بہار میں چندر شیکھر سنگھ نے اس وعدے کے ساتھ گدی سنبھالی کہ وہ اوور ڈرافٹ کے مسئلے کو حل کر دیں گے، تب پھر یوں ہوا کہ سرکار نے مختلف مدوں پر جو روپے منظور کئے تھے، ان کی ادائیگی روک دی گئی، بہار کی مختلف یونیورسٹیوں کو کئی کروڑ روپے دیئے گئے تھے، وہ سب انہیں نہیں ملے، نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹیوں کی انتظامیہ کے روزمرہ کے کاموں میں رکاوٹ تو پڑی ہی، یونیورسٹیوں کے پاس اپنے ملازمین کو دینے کے لئے پیسے بھی نہیں بچے، تین چار ماہ تک گاڑی یونہی کھینچی گئی، ادھر ریزرو بینک نے ۳۰ جون تک ہر قسم کے کاروبار پر پابندی لگا دی۔ بہار میں اتنا بڑا مالی بحران اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا گیا، ہر طرح کی اسکیمیں ٹھپ تھیں، سرکاری خزانے میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اللہ اللہ کر کے ۳۰ جون گزرا اور وزیر اعلیٰ چندر شیکھر سنگھ نے بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ اب بہار پر ایک پیسے کا بھی اوور ڈرافٹ نہیں ہے۔ خیر، یہ بات خوشی کی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ بہار کی چھ کروڑ آبادی میں ایسے لوگ کتنے فی صد ہیں جو ان مالیاتی باریکیوں کو سمجھتے ہیں، انہیں تو پینے کو پانی نہیں ملتا، بجلی نہیں ملتی، بازار میں روٹی جس دام میں آتی ہے، وہ دام ان کی جیبوں میں نہیں، حد تو یہ ہے کہ ہر مہینے مشاہرے کے نام پر جو چند ٹکے ان کی جیبوں میں آتے تھے ان سے بھی وہ محروم ہو گئے۔ ایک پرانا مقولہ ہے کہ ہمیشہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے لیکن سرکار اس مقولے کو سننا ہی نہیں چاہتی تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

بے جا تاخیر

پنجاب میں آرمی ایکشن کو تقریباً ڈیڑھ ماہ ہو گئے ہیں لیکن اب تک معاملہ جوں کا توں ہے۔ سرکار نے بہت ہی مجبور ہو کر اور آخری حربہ کے طور پر وہاں فوج بھیجی تھی اور جیسا کہ وزیر اعظم نے واضح کر دیا تھا کہ اس میں نہ کسی کی جیت ہے نہ ہار۔ لیکن اس کے بعد یہ یقین تھا کہ وہاں صورتحال کو بہتر بنانے کے لئے فوراً کارروائی کی جائے گی، سو نہیں کی گئی۔ اکالی دل سے بات چیت کرنے کا یوں بھی سوال نہیں اٹھتا ہے کہ جن سے بات کی جا سکتی ہے وہ جیلوں میں بند ہیں اور تلوار لٹکا کر ان سے بات چیت نہیں ہو سکتی۔ چند بنیادی مطالبے ہیں جن میں چند تو مذہبی نوعیت کے ہیں، ان کو فوراً تسلیم کیا جانا چاہئے جیسا کہ وزیر اعظم نے بہت ہی قبل اعلان کیا تھا، دوسری مانگوں میں چنڈی گڑھ اور پانی کے مسئلے ہیں، یہ بھی جائز مطالبے ہیں جنہیں تسلیم کئے جانے میں اب کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک کہ مرکز اور ریاست کے تعلق کا سوال ہے تو یہ مسئلہ تنہا پنجاب کا نہیں ہے تقریباً ساری ریاستوں کا ہے۔ مرکزی حکومت نے اس مسئلے پر غور و خوض کے لئے سرکاریہ کمیشن کی تشکیل ہے جس کی رپورٹ آ جانے پر ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب بال مرکزی حکومت کے آنگن میں ہے پہل اسے کرنی ہے اور اس میں بہت تاخیر ہو رہی ہے۔ گولڈن ٹمپل میں فوج کشی سے صحیح یا غلط سکھ فرقے کے جذبات کافی مجروح ہوئے ہیں۔ سکھ کوئی غیر نہیں، ہمارے اپنے ہیں۔ اس فرقے کے چند افراد کی غلط حرکتوں کی وجہ کر پوری قوم کو مطعون نہیں کیا جا سکتا اس میں کوئی شک نہیں کہ سکھ ان چند افراد کی حرکتوں پر بھی شرمندہ ہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے زخموں پر مرہم رکھا جائے۔ لیکن یہ مرہم صرف باتوں سے نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لئے کچھ کرنا پڑے گا۔ خود وزیر اعظم نے "HEALING TOUCH"

کی بات کی ہے لیکن اس میں کیوں تاخیر ہو رہی ہے، خدا کو معلوم سکھ چاہتے ہیں کہ گردواروں کو جو نقصانات پہنچے ہیں، ان کی تلافی اور مرمت وہ خود کریں، ان کے ہاں کرسیوا، نام کی ایک اہم چیز ہے۔ سرکار کو یہ فکر اپنے سر لینی ہی نہیں چاہیئے، اس سے مسئلہ اور الجھ جائے گا، اسے اس سلسلے میں سکھوں کے جذبات کی قدر کرنی چاہیئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ گردواروں کے اندر اب تک فوج کیوں موجود ہے۔ فوج گردواروں کے باہر بھی قیام کر سکتی ہے اور اس سے بھی اس کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ جوں جوں گردواروں کے اندر فوج کے قیام کی مدت بڑھ رہی ہے، توں توں بے چینی اور بددلی بڑھ رہی ہے۔ مرکزی حکومت نے جہاں انتظامیہ میں سدھار کے لئے مختلف کارروائیاں کی ہیں، وہاں اسے اس مسئلے پر بھی فوراً دھیان دینا چاہیئے۔

نشانہ

گیا شہر والوں کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری یہ ہے کہ ۱۵ر جولائی سے یہاں ٹی۔ وی۔ ریلوے اسٹیشن کا افتتاح ہونے جا رہا ہے، وزرات داخلہ کی وزیر شریمتی رام دلاری سنہا اس کا افتتاح کرنے تشریف لا رہی ہیں سرکار کا منصوبہ یہ ہے کہ ۱۹۸۵ء تک ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں ٹیلی ویژن پہنچا دیا جائے، اس سے قبل سرکار گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچانے کا اپنا نشانہ پورا کر چکی ہے، اس سے قبل ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں پینے کے پانی کے مسئلے کو حل کیا جا چکا ہے۔

سرکار کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچ چکی ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ بہار میں پٹنہ کو چھوڑ کر کسی بھی شہر میں کیا رانچی، کیا گیا، کیا دربھنگہ کیا مونگیر، کیا بہار شریف، آدھے گھنٹے بھی بجلی نہیں ملتی۔ پینے کا پانی نہیں ملتا۔ گاؤں گاؤں پینے کا پانی پہنچایا گیا ہے لیکن خود سرکاری رپورٹ یہ ہے کہ ۸۵ فیصد کل بیکار پڑے ہیں اور سرکار کے پاس ان کی مرمت کے لئے نہ تو وقت ہے نہ پیسہ۔ گاؤں گاؤں میں ٹی۔ وی۔ پہنچ جائے گا تو اس سے عوام کو کیا فائدہ ہو جائے گا۔ کتنے لوگ ٹی وی خریدیں گے ——— ہاں سرکاری فائلوں میں سرکار کو یہ لکھنے کا موقع ضرور مل جائے گا کہ نشانہ پورا کیا گیا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ حکومت کے اندر صرف اندھے بہرے گونگے اور بستے ہیں لیکن کوئی اپنی آنکھوں کو بند کر لے، کانوں میں سیسہ ڈال لے اور منہ میں گھونگھنیاں ڈالے پڑا رہے تو کوئی اس میں کیا کر سکتا ہے سوائے دعا کے، سو ہمارے ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ اٹھے رہیں گے۔

ریشماں سُہیل

غالبؔ ۔ عوامی شاعر و ادیب

غالبؔ صدی کے سلسلے میں غالب کے کلام اور مکتوبات پر ملکی و غیر ملکی نقادوں نے جو تبصرے کئے ہیں اُن کے مطابق غالب ترقی پسند اور پرولتاری شاعر و ادیب ہیں۔ ان نقادوں نے حالی سے بجنوری تک لکھی گئی تنقیدوں اور تبصروں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان میں ایسوں کی کمی نہیں۔ جن کی نگاہ کلام غالب کے صرف اس پہلو پر رہی جو ان کی آزاد، خیالی، زندہ دلی، رِندمشربی اور حسن پرستی کا آئینہ دار ہے اور ثبوت میں اس طرح کے اشعار پیش کئے جاتے رہے۔

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں، جس کے بازو پر، پریشاں ہو گئیں

ایک صدی اسی وہم میں گزر گئی۔ دورِ حاضرہ کے نقادوں نے البتہ اپنی تلاش و تحقیق میں غالب کے کلام میں بعض دیگر مضامین کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ان میں عبدالرحمٰن بجنوری اور احتشام حسین خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے غالب کی شاعری کو سماجی پس منظر میں پرکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ سجاد ظہیر اور بعض روسی ناقدین مثلاً بابا جان غفوروف چیلیشیف، گلیبوف اور ایس پلاتو انے غالب کے فارسی کلام میں تنقید کے نئے پہلو پیش کئے جن میں سائنسی، سماجی سیاسی اور اقتصادی مائل کی کارفرمائی بدرجۂ اتم ہے۔ ان نقادوں نے غالب کے اردو کلام اور مکاتیب میں غالب کے نظریہ اور عمل کے ربط کو بھی تلاش کیا۔

غالب کے اشعار و مکتوبات میں سائنسی غور و فکر، ترقی پسند خیالات اور سیاسی شعور میں ہم آہنگی ہے۔ اس طرح غالب کے شعر و ادب میں فنی محاسن کے علاوہ نظریہ حیات کا ایک جامع تصور ملتا ہے۔ بے شک غالب عوامی شعر و ادب کے خالق ہیں۔

ایک ہی شاعر کے کلام کو مختلف نقاد مختلف نظروں سے دیکھتے ہیں اور مختلف تشریح کرتے ہیں۔ ان کو اس بات سے بحث نہیں کہ شاعر کے افکار اُن کے اپنے خیالات سے متصادم ہیں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سیاسی اختلافات کی بنا پر کسی رہنما کے بیانات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے جس کی تردید بعد میں خود اسی رہنما کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

ٹھیک یہی حالت ان نقادوں کی ہے جو غالب کے افکار کو نہیں سمجھ سکے اور غالب کے کلام کی مختلف شرح بیان کرتے رہے تاکہ غالب کے کلام کو اس قدر نزاعی بنا دیا جائے کہ لوگ حقیقی تلاش کے راستے سے ہٹ جائیں۔ غالب اپنے کلام کی غلط شرحوں کی تردید کرنے کے لئے آج زندہ نہیں ہیں لیکن انہوں نے ان نقادوں کے لئے اسی وقت اشارہ کیا تھا۔

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب\
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

اسد اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں\
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل\
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا\
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مے کشی کو نہ سمجھو بے حاصل\
بادہ غالب! عرقِ بید نہیں

واسطے فکر مضامینِ متیں کے غالبؔ\
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

سائنس سرچشمۂ حیات ہے۔ سائنس غور و فکر اور تحقیق کے بعد انسان کو صحیح نتائج سے باخبر کرتی ہے اور عمل کی دعوت دیتی ہے۔ سائنسی ایجادات مخلوق خدا کو بہتر زندگی گزارنے کا طریقہ بتاتی ہے۔ غالب سائنس کی افادیت سے واقف تھے۔ غالب کے بیشتر اشعار و مکتوبات میں سائنسی غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ انھوں نے فطرت کا مشاہدہ، عقلیت پسندی، روشن خیالی اور یقین و اعتماد کی تلقین کی ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
(تخلیقِ کائنات کے پس پردہ کوئی شعوری طاقت کام نہیں کر رہی)

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا
(سائنسی طریقۂ کار قیاس کا متحمل نہیں)

سب کہاں [illegible] لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک [illegible] صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
(مسئلہ تناسخ۔ مادہ فنا نہیں ہوتا بلکہ شکلیں بدلتا رہتا ہے)

ہے کہاں، تمنا کا دوسرا قدم؟ یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو، ایک نقشِ پا پایا
(کائنات کی وسعتوں میں کرۂ ارض کی حقیقت اور دوسرے کروں کے امکانات)

مضمحل ہو گئے، قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں
(ایک ایسی حقیقت جس کا اعتراف ماہرین حیاتیات اور اطباء عام طور پر کر رہے ہیں۔)

جب ۱۸۴۷ء میں سرسید احمد خاں نے غالب سے ابوالفضل کی آئینِ اکبری کا پیش لفظ لکھنے کی تجویز پیش کی تو غالب نے اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے ایک فارسی مثنوی لکھ دی۔ اس کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:—

"ہم اب بھی چقماق سے آگ پیدا کرتے ہیں جب کہ انگریز ماچس سے آگ حاصل کرتے ہیں نہ معلوم انھوں نے سمندر پر کیا جادو کر دیا ہے کہ دھواں جہازوں کو اڑائے لئے جاتا ہے۔ اس بھاپ

کی قوت سے کشتی دریا میں اور ریل صحرا میں مسافت طے کرتی ہے۔ یہی بھاپ ریل کے پہیوں کو حرکت دیتی ہے اور بیل اور گھوڑے کا کام دیتی ہے۔ بھاپ سے جہاز چلتے ہیں۔ اب ہوا اور موج کی کوئی حاجت نہیں۔ اس ہوشیار قوم کے کاروبار پر نظر کرو۔ یہ ایسی جدت ہے جو ہمیں سیکھنی چاہیے۔"

سائنسی غور و فکر کے بغیر ترقی پسند خیال کی ترجمانی ناممکن ہے۔ رجعت پرستی اور قدامت پرستی ترقی پسندی کے منافی ہے۔ غالب یقیناً ترقی پسند شاعر و ادیب تھے۔ بین الاقوامیت انسان دوستی، حق گوئی، جدت پسندی اور مساوات غالب کے ترقی پسند خیالات کے نقیب ہیں۔

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں (بین الاقوامیت)

آخر کار گرفتار سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا "

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے (انسان دوستی)

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا، میرے بعد "

ناگوار ہے ہمیں احسانِ صاحب دولتاں
ہے زرِ گل بھی نظر میں جوہرِ فولاد، یاد (مساوات)

نظر بہ نقص گدایاں کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعوائے چمن بسی ہے "

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں "

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جاوے

غرورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جائے (حق گوئی)

غالب تمام نوعِ انسان سے محبت و اخوت رکھتے تھے۔ انسان دوستی ان کا مذہب تھا۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ہر شخص سے خوش اخلاقی اور محبت سے پیش آتے تھے ان کے شاگردوں اور دوستوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی بھی تھے غالب نے ہمیشہ مساوات کا سبق دیا۔ ذات پات، مذہب و ملت، رنگ و نسل زبان اور تہذیب کی دیواریں مساوات اور محبت و اخوت کی راہ میں حائل ہو کر انسان کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور زندگی کو وسیع تر بنانے سے روکتی ہیں۔ اس لئے وہ ایک ایسا نظام چاہتے تھے جس میں مساوات ہو، عوام کی سلطانی ہو۔ ایک خط میں مرقوم ہے ؎

"اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

سائنسی غور و فکر سے آراستہ اور ترقی پسند خیالات سے لیس ہونے کے بعد سیاسی شعور کی ضرورت ہے۔ سیاسی شعور سماج کی سیاسی، اقتصادی آزادی کے لئے انقلاب کو آواز دیتا ہے۔ غالب شعری اصطلاح میں سماجی حالات بیان کرتے ہیں ... مطلب ذہنی کے دائرہ میں دیکھنے والے نہیں سمجھ سکتے۔ غالب کے بدخواہ بقول غالب

... رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
... نہ سمجھے خدا کرے کوئی

غالب کو ... ہم ...

... کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کچھ لوگ غالب کو کسی مخصوص مسلک و عقیدے کا پیرو قرار دیتے ہیں جس کی تردید غالب یوں کرتے ہیں ؎

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو، ماوراء النہری

لیکن غالب انسانیت پرست ہیں وہ بین الاقوامی تصور رکھتے ہیں۔ وہ بین الاقوامیت کی تلقین کرتے ہیں وہ امن دوستی اور محبت کی تعلیم دیتے ہیں۔ غالب سچے مسلمان بھی ہیں جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے ؎

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غالب کے اشعار و مکتوبات اپنے وقت کے سنگین مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں سماجی بے بسی کا احوال ہے۔

ہم نے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینۂ پرخواہانِ دار

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

کب تلک پھیرے اسدؔ لب ہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی اے ساقیٔ کوثر نہیں

برہم ہے بزمِ غنچہ، بہ یک جنبشِ نشاط
کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل ہوا نہ مانگ

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب اپنے دور کے عوام سے جڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ملک کی بدلتی ہوئی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالت کا عوام میں رہ کر جائزہ لیا۔ انہوں نے تیموری سلطنت کے غیر منصفانہ روایات اور جاگیرداری نظام پر اس وقت وار کیا جبکہ ان کے ہم عصر دربار میں شرف حاصل کرنے اور نو وارد آقاؤں سے مراسم استوار کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

تیغ در کف، کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد اے آرزوئے مرگِ غالب مژدہ باد

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

قیامت ہے، کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا

تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟"

شرح و آئین پہ مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت
اینجا عزیز بود، آنجا چگونہ

(خاندانِ تیموریہ میں دستور تھا کہ بادشاہ کی اولادوں میں سے جب کوئی شہزادہ مرجاتا تھا تو اس کی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اس کی سرکار بدستور ہی رہتی تھی۔)

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

غالب کے افکار میں سیاسی شعور کی پختگی ہے ؎

ہے تماشا گاہ سوز تازہ، ہر یک عضو
جوں چراغانِ دوالی صف بصف جلتا ہوں

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مکتوب میں بھی برطانوی نظام حکومت پر جا بجا تنقید کی ہے ؎

"بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں دہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہوگا، جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا۔

(خط بنام میر مہدی مجروح ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء)

"روز اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر یہاں دیکھا کہ بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔"

(خط بنام مجروح مورخہ ۲ فروری ۱۸۵۹ء)

"بلنگ صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے گورنمنٹ نہ ہوئے قصاص نہ لیا اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا۔

(خط بنام مجروح)

"شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔"
(خط بنام یوسف مرزا مورخہ ۱۵ جولائی ۱۸۵۹ء)

بہت کم اشعار ہی کلاسک سے تعلق رکھتے ہیں جس میں شاعر اپنی ذاتی زندگی سے متعلق لکھتا ہے۔ قدرت کا یہ حسین عطیہ آشوب زمانہ کے ہاتھوں جب محرومی میں تبدیل ہو جاتا ہے تب شاعر میں قنوطیت پسندی اور پست ہمتی آجاتی ہے۔ شکوہ و شکایت اور ہجر و غم موضوع بن جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر حقیقتاً ایک فطرت کے مشاہدات سے معمور دل و دماغ ہی حوصلہ اور بلند ہمتی سے کام لیتا ہے اور نئے نظام کی تبدیلی کی خواہش کرتا ہے۔

غالب بھی سماجی بے بسی پر تعزیت کرتے ہیں تو کبھی سماجی ناانصافی کا شکوہ کرتے ہیں۔ کبھی حسرت و غم سے مبہوت رہ جاتے ہیں تو کبھی نئے نظام کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ غالب کے کلام میں سائنسی غور و فکر اور ترقی پسند نظریات سے مزین سیاسی شعور کی پختگی ہے۔

تیرے کوچے کا ہے مائل دل مضطر میرا
کعبہ ایک اور سہی قبلہ نما اور سہی

تم ہو بت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

غالب کے نظریہ اور عمل میں ربط ہے۔ وہ سراپا عشق اور ایک حوصلہ مند انسان ہیں۔ غالب نے دشت جنوں اور جہد حیات کی صعوبتوں میں بھی انقلاب و آزادی کا پیغام دیا ہے۔

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگ جادہ سر کوئے یار رکھتے ہیں

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں ایک مشت خاک ہے

اے آرزو شہید وفا خوں بہا نہ مانگ
جز بہر دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

جانِ مطربِ ترانہ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

ہے تنگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آتش فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

بقیہ: شمس الرحمٰن فاروقی اور میر کی شرح

ساری باتیں قاری کے سامنے ہیں۔ 'اٹھ گیا' کو صحیح اور محاوراتی معنی میں نہ لینے کا سارا ڈرامہ فاروقی کی تشریح میں آگیا ہے۔ فاروقی کی شعرفہمی پر حرف نہیں آتا' یہ تو بس ایسا ہے کہ بڑا شاعر قاری، شارح سب کو صدیوں اپنے اشعار کی غواصی میں مشغول رکھتا ہے۔

جمیل زبیری
پاکستان

درد کا رنگ

میں اس وقت کراچی کے ہوائی اڈے پر اپنی چھوٹی بہن اور اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھڑی ہوں۔ میرے شوہر مجھ سے کچھ دور کھڑے ہوئے اپنے کسی جاننے والے سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت وردی میں ہیں۔ جب وہ یہ لباس پہنتے ہیں تو کتنے اچھے لگتے ہیں۔ آدمی چاہے کیسا ہی ہو مگر وردی پہن کر ضرور اسمارٹ لگنے لگتا ہے۔ آج ہم لوگ عبیر کو لینے آئے ہیں۔ عبیر کی بھاوج زاہدہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ دور ایک صوفے پر بیٹھی جہاز کے آنے کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ بہت موٹی ہو گئی ہے۔ بچپن میں جب اس کی اور میری دوستی ہوئی تھی اس وقت وہ اتنی موٹی نہیں تھی۔ اسے اپنے موٹاپے کا بہت دکھ ہے۔ وہ جب کبھی غور سے میری جانب دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں بجائے خلوص اور دوستی کے حسد اور جلن دکھائی دیتی ہے۔ وہ مجھ سے کیوں جلتی ہے شاید اس لئے [illegible] کے بعد اتنی موٹی ہو گئی اور میں ابھی تک ویسی ہی [illegible] کبھی [illegible] کی بات ہوئی۔

لندن سے آنے والا ہوائی جہاز آ گیا ہے، مسافر اتر رہے ہیں۔ زاہدہ مجھے اشارے سے عبیر کو دکھا رہی ہے۔ بچے تالیاں بجا رہے ہیں مگر میں [illegible] ہوں۔ وہ بار بار مجھے عبیر کو دکھانے کی کوشش کر رہی ہے "تجھے نظر نہیں آتا کیا تیری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔" مگر مجھے تو نظر تب آئے جب میں دیکھنے کی کوشش کروں۔ وہ بارہ سال بعد لندن سے آیا ہے تو میں کیا کروں۔ زاہدہ کے اشاروں کی مدد سے اسے دور سے دیکھنے کی کوشش کیوں کروں۔ وہ ذرا دیر میں خود ہی یہاں آ جائے گا۔ شاید زاہدہ اپنے دل میں سوچ رہی ہے جب ہم گھر چلے جائیں گے اور جب عبیر ذرا آرام سے بیٹھے گا اس وقت اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھوں گی۔ ہونہہ! کتنی بے وقوف ہے زاہدہ۔ میرے پاس عبیر سے کہنے کے لئے کچھ نہیں۔ بس مجھے تو اس سے ایک ہی سوال پوچھنا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ بارہ سالوں میں اتنا بدل کیوں گیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ اتنے دنوں میں مجھے ایک خط بھی کیوں نہیں لکھ سکا۔

کسٹم ہو چکا ہے، اب مسافر باہر آ رہے ہیں۔ اس وقت مجھے عبیر سامنے ہی نظر آ رہا ہے۔ زاہدہ ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میرا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری ہے۔ میں بڑی دیر سے اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ عبیر میرے چہرے کو دیکھ کر میرے احساسات کا اندازہ نہ کر سکے جو بات آج تک کسی کو نہیں معلوم ہونے دی اس کا اظہار اب بھی نہ ہو تو اچھا ہے۔ عبیر اب ہمارے پاس آ گیا ہے۔ زاہدہ میرے شوہر کا تعارف کرا رہی ہے۔ وہ میرے شوہر سے ہاتھ ملا رہا ہے۔ اس کے بعد وہ میری طرف بڑی توقعات سے متوجہ ہوا ہے مگر میں نے اسے سلام کرنے کے بجز اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے میری آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا ہے اور کوئی شے تلاش کی ہے۔ مگر وہاں [illegible] کے لئے [illegible] اپنی آنکھیں جھکا لی ہیں۔ وہ ان دنوں میں بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ [illegible] باوجود

اس کا رنگ کچھ اور سیاہ ہو گیا ہے۔ اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔ اس کی ہنسی بھی بدل گئی ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہنستا ہے جیسے کوئی منہ چڑا رہا ہو۔ بہرحال مجھے اس سے کیا، وہ جیسا بھی ہو۔ اس کی شکل میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہو مجھے اس سے کیا مطلب۔ اس سے میرا کیا رشتہ ہے سوائے اس کے کہ وہ میری بچپن کی ایک دوست کے شوہر کا بھائی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی رشتہ ہوا ـــــ اس کا سامان آ گیا ہے۔ اب ہم لوگ کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ اگلی سیٹ پر میرے شوہر کے قریب بیٹھا ہے۔ میں، زاہدہ اور بچے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ میرے شوہر اس سے لندن کے حالات پوچھ رہے ہیں۔ وہ وہاں کی زندگی کی تعریفیں کر رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ میری طرف مڑ کر اس طرح دیکھ رہا ہے گویا اپنی جھوٹی سچی کہانیوں کی داد مانگ رہا ہو۔ اس کی بھاوج بڑے انہماک سے اس کی باتیں سن رہی ہے۔ بچے کبھی کبھی بیچ میں بول پڑتے ہیں۔ زاہدہ کو ان کا بولنا بڑا ناگوار گزر رہا ہے وہ انہیں اشارے سے چپ رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے میں اس سے کہوں اب گھر چل کر ہی سب قصے سن لینا۔ بچوں کا دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔ مگر میں بالکل چپ ہوں۔ کہنا تو بہت کچھ ـــــ چاہتی ہوں مگر کس سے کہوں اور کیا کہوں۔ میرے دل میں جو ایک زخم تھا اس کا کسے پتہ ہے۔ بارہ سال گزر گئے وہ اب مندمل ہونے لگا تھا، آج پھر سے ہرا ہونے لگا ہے۔ زندگی ایک ڈگر پر آ گئی تھی۔ مجھے زندہ رہنے کی ساری آسائشیں مہیا ہو گئی تھیں۔ خدا نے مجھے دو بچے بھی عطا کر دئیے تھے مگر میں آج پھر بارہ سال پیچھے لوٹ گئی ہوں۔ جب میں نے اسے زاہدہ کے گھر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ یہ اس زمانے میں ایک شریر سی لڑکی تھی اور اسے دیکھتے ہی مجھے [illegible] دیا تھا۔ میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا اور [illegible] سنگم سو جھوں کا مذاق اڑایا تھا۔

وہ کھسیانا سا ہو گیا تھا۔ زاہدہ نے شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا تھا مگر میں اسی طرح ہنستی رہی تھی، یہاں تک کہ عبیر خود ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔

ہم لوگ گھر پہنچ گئے ہیں۔ سامان اتروا کر گاڑی سے اندر لایا جا چکا ہے۔ بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے ہیں۔ میری چھوٹی بہن مہمانوں کے لئے کھانا تیار کرنے چلی گئی ہے۔ میرے اوپر ایک عجیب سی تھکن سوار ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں سے بالکل شل ہو گئے ہیں۔

زاہدہ اور عبیر دوسرے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں انہیں اس طرح باتیں کرتے ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ مگر نہ معلوم عبیر کون سی الف لیلیٰ سنا رہا ہے۔ میں نے بھی ہمت کر کے منہ ہاتھ دھو کر ہلکا سا میک اپ کر لیا ہے۔ میں نہیں جانتی میں نے اس وقت میک اپ کیوں کیا ہے؟ کیا عبیر کو دکھانے کے لئے؟ انسان بہت سی باتیں نہیں بھی کرنا چاہتا ہے مگر اس کے باوجود کرتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں۔ عبیر بالکل میرے سامنے بیٹھا ہے۔ میرے شوہر میرے سیدھے ہاتھ پر بیٹھے ہیں۔ عبیر کی نظریں ذرا دیر بعد اٹھتی ہیں اور میرے چہرے پر آ کر رک جاتی ہیں۔ وہ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔ شاید وہ میری اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا کہ اس سے پہلے جب میں نے اسے دیکھا تھا تو میں چنچل اور شوخ لڑکی تھی۔ یہ صحیح ہے اس وقت مجھے سوائے ہنسنے اور دوسروں کا مذاق اڑانے کے اور کوئی کام نہ تھا مگر آج میں دو بچوں کی ماں اور گھر کی ایک ذمہ دار عورت ہوں۔ میری شوخی میرے قہقہے، میرا مذاق اڑانے کا انداز سب گذرے وقتوں کی کہانیاں بن چکے ہیں۔ زندگی کتنے ہی موڑوں سے گذر کر اب اس جگہ پہنچ چکی ہے جہاں سے واپس آنا ناممکن ہے۔ میرے شوہر ایک اچھے انسان ہیں۔ وہ میری خوشی اور آرام

[illegible]نیال رکھتے ہیں۔ میرے بچے بڑے اچھے ہیں۔ مجھے ان سے
[illegible] محبت ہے۔ جب وہ اسکول سے آکر مجھ سے آہستہ سے پیار
[illegible] ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں اب اور کسی خوشی کی
[illegible]ت باقی نہیں رہی مگر عبیر نے اتنے سال بعد آکر مجھے ایک
[illegible] جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ میں نے جن یادوں کو وقت کی ریت میں
[illegible] دبا رکھا تھا وہ آج پھر باہر نکل آئی ہے۔ میں آج پھر اپنے
[illegible] کو اتھاہ سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس کر رہی ہوں۔

کھانا ختم ہو چکا ہے۔ سب لوگ خاموش ہیں صرف
[illegible] اپنے سفر کے قصے سنا رہا ہے اور ساتھ ہی کبھی مجھے اور کبھی
[illegible]ن کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں اس میز سے اٹھ
[illegible] بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر میرے شوہر کو ان قصوں میں
[illegible] دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اٹھنے کا ارادہ کیا ہے
[illegible] ہر دفعہ انہوں نے مجھے زبردستی بٹھا لیا ہے۔ میں طبیعت
[illegible] بہ ظاہر بیٹھی ہوئی ہوں مگر میرا ذہن کہیں اور ہے۔ پچھلی
[illegible] زمانے [illegible] مجھے بہائے لئے چلے جا رہے ہیں۔ میں
[illegible] جا رہی ہوں۔ میری ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئی
[illegible] مونچھیں میرا تعاقب کر رہی ہیں اور مجھے گھسیٹ کر پیچھے لئے
[illegible] جا رہی ہیں۔ میں نہیں نہیں کہتی کھنچی چلی جا رہی ہوں۔ مجبور د
[illegible] ....

یہی وہ عبیر ہے جس کی شادی پہلے زاہدہ سے ہونے
[illegible] والی تھی مگر عبیر کے بھائی کو زاہدہ پسند آ گئی تھی اور اس نے
[illegible] بھائی سے زاہدہ سے شادی کر لی تھی۔ اس شادی
[illegible] زاہدہ کی رائے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ اب بھی عبیر کو
[illegible] بہت عزیز رکھتی تھی اور اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے قریب رکھنا
[illegible] چاہتی تھی۔ شاید اس نے اس لئے سوچا تھا کہ وہ میری شادی
[illegible] سے کرا دے افسوس یہ [illegible] تب میں عبیر کی مونچھوں
[illegible] نہ تھی۔ وہ مجھ سے لڑکی تھی مگر میں نے اپنی
[illegible] مطابق اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر [illegible]

لیا تھا۔ وہ میرے سامنے ہمیشہ عبیر کی تعریفیں کیا کرتی مگر میں
اس کی ہر بات کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جب ہم دونوں
تنہا ہوتے اور مجھے سنجیدگی کا دورہ ہو جاتا تو وہ کہا کرتی اچھا
ہوتا کہ اب تیری بھی شادی ہو جاتی۔ میں چپ رہتی۔ وہ
بار بار مجھ سے پوچھتی ”بتا تو کس سے شادی کرے گی“ مگر
میں کوئی جواب نہیں دیتی۔ اس وقت میرے گھرانے میں کتنے
ہی اچھے لڑکے موجود تھے۔ میری ہی طرح شوخ اور چنچل۔
وہ ایک ایک کا نام لیتی مگر میں ان لڑکوں کو تو اپنے سامنے
بچہ سمجھتی تھی۔ میرے ذہن میں شوہر کا تصور جب بھی
آتا تو وہ ہمیشہ ایک سنجیدہ سا انسان ہوتا۔ وردی پہنے ہوئے
.... آخر میں نے اسے ایک روز بتا ہی دیا۔ اس نے
مجھے سمجھایا۔ ”پگلی“ عبیر میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو
تجھے پسند ہیں“ مگر اس کی مونچھیں۔ میں قہقہہ مار کر ہنس
دی۔ ”مونچھوں سے کیا ہوتا ہے کل صاف کروا دوں گی۔“

میرے شوہر کو نیند آنے لگی ہے۔ وہ ایک لمبی
جماہی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میرے خیالات کا شیرازہ
بکھر گیا ہے۔ ہم لوگ اپنے بستروں پر لیٹ گئے ہیں۔ میں
سونے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن آج نیند مجھ سے کوسوں
دور چلی گئی ہے۔ یہ بات بہت دنوں تک میری سمجھ میں نہیں
آئی تھی کہ آخر وہ میری شادی عبیر سے ہی کیوں کرانا چاہتی
تھی۔ لیکن مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ دراصل میری دوستی
اور قرب سے فائدہ اٹھا کر عبیر سے نزدیک رہنا چاہتی تھی۔
یہ دنیا کتنی عجیب ہے مگر میں نے آج تک زاہدہ کو معلوم
نہیں ہونے دیا ہے کہ میں اس کی چال کو سمجھ گئی تھی۔ جب
عبیر کو پتہ چلا کہ مجھے اس کی مونچھیں ناپسند ہیں تو اس نے
مونچھیں صاف کر دی تھیں۔ وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ
نظر آنے لگا تھا اور جس روز مجھے یہ معلوم ہوا کہ پہلے اس کی
شادی زاہدہ سے ہونے والی تھی مگر اس کا بھائی بیچ میں

حائل ہو گیا تھا، اس دن سے مجھے عبیر سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ مگر میں نے کبھی اس کے سامنے اس کا اظہار نہ ہونے دیا تھا۔ اس کے لئے میں اب بھی ایک شریر اور چنچل لڑکی تھی اور طرح طرح اسے تنگ کرتی رہتی لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے، میرے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے، وہی عبیر جو مجھے پہلی نظر میں کچھ عجیب سا لگتا تھا اب پہلے سے بہت اچھا لگنے لگتا تھا فاصلے آہستہ آہستہ کم ہو ... رہے تھے۔

اوہ ... میں سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔ صبح ہو گئی ہے۔ سب لوگ اٹھ چکے ہیں۔ میرے شوہر نے میرا انتظار کئے بغیر چائے تیار کروں ہے۔ میری بہن نے ناشتہ میز پر لگا دیا ہے۔ میں گھبرا کر مسہری سے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آئی ہوں، میری آنکھیں بوجھل ہیں۔ میں نہا دھو کر ناشتے کے لئے میز پر آگئی ہوں۔ سب لوگ ناشتہ کر چکے ہیں۔ میرے شوہر تیار ہو کر ... ہیں۔ بچے بھی تیار ہو کر اسکول کے لئے میرے قریب آئے ہیں اور معمول کے مطابق مجھے پیار کر کے چلے گئے ہیں۔ عبیر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہے۔ آج اس نے بھی اپنی وردی پہن لی ہے، مگر وہ الجھی الجھی پریشان... آخر اسے آج یہ لباس پہننے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے جلانے کے لئے یا اس لئے کہ مجھے یہ لباس بے حد پسند ہے۔ مگر اسے کیا معلوم ہو سکتا ہے زاہدہ نے اسے بتایا ہو۔ خیر جو بھی ہو۔ وہ کوئی بھی لباس پہنے مجھے اس سے کیا۔ میں نے اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے مگر میں نے صرف آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا ہے، مگر کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ البتہ زاہدہ نے اس سے بڑے عجیب سے انداز سے پوچھا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے، اور کب واپس کب آئے گا؟ جس کے جواب میں اس نے کہا ہے کہ وہ جہاز کی کمپنی میں جا رہا ہے اور شاید شام تک واپس آجائے گا۔ ساتھ ہی اس نے میری جانب دیکھ کر کہا ہے "دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا" اور اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر چلا گیا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اس کی توقع کے خلاف بہت بے اعتنائی برتی ہے۔ جس کا اسے یقیناً دکھ ہے۔ اس کے رویے سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ میں ڈرتی بھی ہوں نہ معلوم وہ مجھ سے کیا کہہ دے۔ کوئی ایسی بات جس کے کہنے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں زندگی کی بہت سی منزلیں طے کر کے کافی آگے بڑھ چکی ہوں۔ میں اب شوخ و شریر لڑکی نہیں ہوں بلکہ دو بچوں کی ماں ہوں۔ وہ وقت جب میرے دل میں پہلی مرتبہ ایک کسک سی ہوئی تھی بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ میں انتظار کرتی رہی تھی مگر اس نے اس وقت مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا میں چپکے چپکے آگے بڑھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اپنی شرارتوں کی اوٹ میں پھر مجھے ایک روز معلوم ہوا کہ وہ چپکے سے چلا گیا ہے۔ ہم سب کو چھوڑ کر ..... مجھے چھوڑ کر۔ جاتے وقت وہ کسی سے نہیں ملا۔ زاہدہ سے بھی نہیں۔ اپنے بھائی سے بھی نہیں۔ وہ بہت دور چلا گیا تھا ..... میرے شہر سے دور اس ملک سے بھی دور، سمندر پار۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جلد لوٹ آئے گا، پھر میں اس سے پوچھوں گی .... تم اس طرح کیوں چلے گئے تھے۔ مگر دن، ہفتوں، مہینوں اور پھر سالوں میں بدل گئے۔ میری شادی ہو گئی۔ میں دو بچوں کی ماں بن گئی۔ بارہ سال گزر گئے، بارہ سال، اس تمام عرصے میں اس نے مجھے کوئی خط نہیں بھیجا۔ میری خیریت تک دریافت نہیں کی۔ اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ وہ ایکدم اسطرح کیوں چلا گیا تھا۔ میں ہمیشہ اپنے سے سوال کرتی رہتی تھی اور میں نے اس سوال کے ہزاروں جواب سوچے۔ پھر خود ہی انہیں رد کر دیا ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ..... یہ بھی نہیں ہو سکتا ..... آج بارہ سال بعد جب

اپس آگیا ہے، میرا جی چاہتا ہے، میں اسے سامنے بٹھا
ں سے صرف اتنا پوچھوں تم ضرور جاتے۔ تمہیں روک کون
تھا۔ مگر یہ تو بتا دیتے کہ کیوں جا رہے ہو؟ مگر اب میں
سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتی۔ کچھ پوچھنے اور بتانے کا وقت
ر چکا ہے، جس طرح یہ بارہ سال گذر گئے ہیں۔ اسی طرح
ی کے باقی سال بھی گذر جائیں گے اور کسی کو پتہ تک نہیں
گا۔

شام ہو گئی ہے اور عبیر واپس آگیا ہے۔ آتے ہی
زاہدہ کو علیحدہ لے گیا ہے۔ کچھ دیر دونوں میں آہستہ
ستہ بات چیت ہوئی ہے اور اس کے بعد انہوں نے میرے
رے میں آتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ وہ لوگ آج رات ہی
ور جا رہے ہیں۔ اس نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی منگوا
ہیں۔ میں یہ سن کر بھی خاموش ہوں۔ باوجود کوشش
ان سے یہ نہیں پوچھ سکی کہ انہوں نے ایک دم لاہور
نے کا فیصلہ کیوں کر لیا۔ شاید عبیر کو میری بے اعتنائی سے
لیف پہنچی ہے اور اسی لئے وہ گھر سے جلد از جلد چلا
انا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے اس کا چلا جانا ہی بہتر ہے۔

آج عبیر کو گئے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گذر چکا
ے۔ اس عرصے میں مجھے نہ تو اس کی ہی کوئی اطلاع ملی ہے
ر نہ ہی زاہدہ نے کوئی خط لکھا ہے۔

مگر ابھی ابھی مجھے زاہدہ کی ایک مشترکہ دوست کا
ط ملا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ زاہدہ نے بڑی کوشش کی
یہ عبیر اس کی چھوٹی بہن سے شادی کر لے، میں بھی اس
وشش میں شریک رہی، لیکن وہ ٹالتا رہا، آج اتفاقاً
بیر سے میری ملاقات زاہدہ کے گھر ہوئی جب زاہدہ ہم دونوں
ے لئے چائے بنانے گئی ہوئی تھی تو میں نے اس سے
وچھا، آخر تم اس کی بہن سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔
انتی ہو اس نے کیا جواب دیا۔ اس نے کہا "عقیلہ جانتی
ہو جب تک میں انگلستان میں تھا زاہدہ مجھے خط لکھتی رہی کہ
جسے تم اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ ہمیشہ تمہارا انتظار کرتی رہی
ہے، تم سے ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ وہ تمہیں یاد کرتی ہے
اور جب میں واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ میں نے تو
تمہیں اپنی بہن سے شادی کے لئے بلایا ہے۔ میں عام حالات
میں اس کی بہن سے شادی کر لیتا مگر اب نہیں کر سکتا۔
زاہدہ نے مجھے فریب دیا ہے۔ میں کتنے چاہ سے پاکستان آیا تھا
کہ کوئی میرا منتظر ہوگا۔ لیکن میں نے کسی کی آنکھوں میں
انتظار نہیں دیکھا۔ میں نے کسی کو اپنے لئے بے تاب نہیں پایا۔
میرا یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں جہاں سے آیا تھا وہیں واپس
جا رہا ہوں۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ میں جہاز پر ملازم ہوں
-------- میں اپنا دل بہلانا جانتا ہوں۔ میں نے جس
طرح بارہ سال گذارے ہیں اسی طرح زندگی کے باقی دن بھی
گذار لوں گا۔ میں نے بارہ سال پہلے ایک غلطی کی تھی مگر اب
میں دوسری غلطی نہیں کر سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے اٹھ
کر چلا گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ اگلے دن پتہ چلا کہ وہ واقعی
انگلستان چلا گیا ہے، شاید کبھی نہ آنے کے لئے۔

وہ واپس چلا گیا ہے، مگر وہ آیا ہی کیوں تھا۔ وہ خود
تو نہیں آیا تھا۔ اسے آنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ زاہدہ میری بچپن کی
دوست ہے۔ کیا آج کی دنیا میں دوستی اسی طرح نباہی جاتی
ہے۔ کیا زاہدہ نے دوستی کا حق ادا کر دیا؟ میرا ذہن ماؤف
ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ عبیر شاید ہمیشہ کے لئے واپس
چلا گیا ہے۔ اس مرتبہ بھی عبیر مجھ سے ملے ہوئے بغیر۔ میرا
سوال میرے ہونٹوں پر مچلتا چھوڑ کر

ڈاکٹر نریش

نائب تحصیل دار

سوشیل بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ طرح طرح کے خیالات سے پریشان اس کا ذہن بئیر کے جھینے جھینے سرور سے کھل پڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اردو کا بھارتیہ کرن ہونا ہی چاہیے۔ جب تک اردو کو مکمل طور سے ہندوستان کی مقدس سرزمین کے ساتھ جوڑ نہیں دیا جائے گا، اس کی حفاظت کرنا مشکل ہوگا۔"

کہتے کہتے وہ کچھ جذباتی ہو رہا تھا۔ کوہ شوالک میں بے خطر بہتے ہوئے جھرنے کی کل کل گویا اس کی تائید کر رہی تھی۔ اوپر کے پتھر پر بیٹھا ہوا سوشیل ہمیں متفق دیکھ کر مزید جذباتی ہو گیا تھا۔ نائب تحصیلدار بور ہو رہا تھا اکتا رہا تھا۔ اس نے دھیرے سے ڈرائیور کے کان میں کہا۔

"کہاں آ پھنسے ان غلط لوگوں میں یار...."

میں نے سن لیا تھا اور جی میں آیا تھا کہ ایک تھپڑ رسید کر دوں اس کے پھولے ہوئے گال پر۔

اس جھرنے کو ہم نے "جوئے یار" نام دیا ہوا تھا۔ کبھی کبھار ہم جب اس عمر افزا مقام پر آتے تھے تو زندگی جیسے کورنش بجا لاتی تھی۔ اس روز لکھنؤ سے رام لعل آگئے تھے۔ ہم اور سوشیل انہیں جوئے یار پر لے آئے تھے۔ راستے میں ہمارے تحصیلدار دوست نے اپنے گھر پر ایک مختصر استقبالیہ تقریب کر دی تھی۔ یا یہ کہیے کہ اس سے ہماری آؤٹنگ کی شروعات ہو گئی تھی۔ نائب تحصیلدار اس کا اشارہ پاتے ہی بیئر کی بوتلیں لے آیا تھا۔ تحصیلدار نے بیئر سے بھرے ہوئے گلاس ہماری طرف بڑھانے کے بعد میز پر بھرے پڑے ایک گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

"آپ بھی پیو نائب صاحب"

نائب نے نہایت معصوم مگر معنی خیز نگاہوں سے تحصیلدار کو دیکھا تھا۔ ادب کے بار سے اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے گلاس اٹھانے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں گلاس اس کے ہاتھ سے چھلک نہ جائے۔ تحصیلدار کے سامنے بیٹھ کر بیئر پینے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ ہم سب نے بھی اس سے پی لینے کا اصرار کیا تھا۔ تحصیلدار صرف دفتر میں ہی چھوٹے بڑے کا لحاظ رکھتے تھے، گھر پر نہیں۔ نائب تحصیلدار نے جیسے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا تھا اور ایک ہی سانس میں ایسے پی گیا تھا جیسے وہ اپنی گھبراہٹ پر بیئر کا پردہ ڈال رہا ہو۔

دوپہر کا کھانا اور بیئر کی بوتلیں گاڑی میں رکھ کر جب ہم جوئے یار کی طرف روانہ ہوئے تھے تو تحصیلدار ہمیں پہاڑوں کا جغرافیہ سمجھا رہا تھا۔ نائب خاموش تھا۔ ایک لفظ بھی گویا اس کی زبان سے ادا ہونا مشکل ہو۔ اسے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن تحصیلدار کے سامنے سگریٹ پینے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہمارے اصرار کرنے پر اس نے جھینپتے ہوئے سگریٹ ہونٹوں میں دبا ہی لی لیکن وہ اسے اپنے فطری انداز میں پی نہیں پا رہا تھا۔ بیڑی کو آخری کش تک کھینچنے والے نائب نے جب تقریباً آدھی

بی ہوئی سگریٹ کار کی کھڑکی میں سے باہر پھینکی اور منہ میں بھرے دھوئیں کو اندر ہی نگل لینے کی کوشش کی تو اس کی صورت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔

لیکن جوئے یار تک پہنچتے پہنچتے اس کی جھجک جیسے ختم ہونے لگی تھی۔ وہاں پہنچ کر اسے گلاس کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔ برف میں لگے بیئر کی بوتل کو جھرنے کے پانی سے مزید یخ کر کے پینے کی جو خواہش ہم سب کے دل میں تھی، اس کے دل میں قطعاً نہ تھی۔ اس نے بوتل کا کارک کھولا اور منہ سے لگا لی۔ غٹ غٹ پوری بوتل اپنی توند میں انڈیل لینے کے بعد اس نے اپنی بھوری مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جیسے راحت کی سانس لی تھی۔

سوشیل اب خاموش تھا۔ وہ تھک سا گیا تھا۔ بیئر کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی وہ پہلے کی طرح سنجیدہ منظر تھا ماحول بوجھل سا ہو رہا تھا۔ رام لعل کو شعر یاد آنے لگے تھے

"وہ حسن کافر اللہ اکبر"

سوشیل کے ماتھے پر ابھریں سنجیدگی کی لکیریں ایک ایک کر کے کھلنے لگیں۔ رام لعل کا گنگنانا ختم ہوتے ہوتے سوشیل کی کشادہ پیشانی صاف ہو گئی تھی۔ گھرے ہوئے بادل چھٹنے سے مطلع صاف ہو گیا تھا لیکن ہوا میں ابھی بھی سیلن بھری ہوئی تھی۔

نائب نے دوسری بوتل کھولی اور اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جیسا وہ پہلی کے ساتھ کر چکا تھا۔ میں پتھر سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شہری زندگی سے نفرت کا احساس جوئے یار پر آ کر جیسے کافور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی اور میں پیگ لگا دی۔

"میں میں بیریاں چوں بیر لیا یا
بھابی تیری گلہڑے دے رنگ دا"

(بھابی! میں بیریوں میں سے تیرے گال کے رنگ کا بیر لایا ہوں)

نائب کو جیسے موقع مل گیا تھا۔ وہ کھل اٹھا مسرت کا تاثر اس کے خط و خال پر بہت بے جوڑ ہو کر نمودار ہوا تھا بولا۔

"بات ہوئی نا جناب۔ ایک آدھ اور آنے دیجئے۔"

اور پھر میرے بولنے سے پہلے ہی کان پر ہاتھ رکھ کر خوب بلند آواز میں وہ گا اٹھا، ایک پنجابی ٹپہ، ایک ایسا ٹپہ جسے سن کر تحصیلدار سمیت ہم سب چونک پڑے۔ گندی گالیوں اور فحش الفاظ سے بھرپور ٹپہ اس کے منہ سے نکل کر آس پاس چاروں طرف گھر گیا تھا اور ہم جیسے اس سے برس رہی ہو گی میں بھیگنے سے خود کو بچا رہے تھے۔ میری بوتل میں بچی ہوئی بیئر کو ایک ہی سانس میں سمیٹ کر نائب نے آنکھیں بند کر لیں اور پٹے پر ٹپہ چھوڑا۔ بابے کے جتنے بند اسے یاد تھے وہ سب سنا کر اس نے ڈرائیور کی گود میں اپنا بھاری بھرکم جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ نہ جڑ سکا۔ کھانا کھا کر ہم لوگ جوئے یار سے اتر کر سڑک پر اترنے لگے تو تحصیلدار کا پاؤں بیئر کی ٹوٹی ہوئی بوتل پر جا پڑا۔ جوئے یار میں تحصیلدار کے گرم خون کی پتلی سی تیلی تیر گیا۔ سوشیل نے فوراً اپنا رومال اس کے پاؤں پر باندھ دیا۔ خون رکنے لگا اور رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔ نائب کو اس کی کچھ فکر نہ تھی۔ اس کے لئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اس نے پٹی باندھ رہے سوشیل کو ایک نظر دیکھا اور نیچے اترنے لگا۔ سڑک پر آ کر وہ کار میں جا بیٹھا۔ اب اسے دروازہ کھولنے کی فکر بھی نہ تھی۔ یہ فکر بھی نہ تھی کہ پہلے تحصیلدار صاحب بیٹھ جائیں تب وہ خود بیٹھے گا۔ پانچ نمبر بیڑی اس کے ہونٹوں میں سلگ رہی تھی۔

دھیرے دھیرے چل رہی کار اسے بہت لطف دے رہی تھی۔ "بالو" اس کی زبان سے از خود نکل رہا تھا۔ ٹپے کے بول اس کے ہونٹوں پر کھیل رہے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ صرف گاڑی تھی جو نائب کے لوک گیتوں کی سنگت میں محو

تھی اور تھی ہماری خوشی۔ دُور دُور تک پھیلیں پربتوں کی خاموش وادیاں۔

پان لینے کے لئے کار کو چوراہے پر روکا گیا تو پولس والے نے ٹوک دیا تھا۔ تحصیلدار کو پہچان کر سپاہی کھسیانا سا ہو گیا تھا لیکن تب تک ڈرائیور کار کو آگے بڑھا کر ایک طرف لگا چکا تھا۔ نائب کے اندر کا نائب تحصیلدار بیدار ہو چکا تھا۔

" کون سالا روکتا ہے؟ اسے معلوم نہیں ہم کون ہیں؟ شام تک برتن بکے ہوں گے حرامزادے کے۔ بتاؤ سالے کو، سیلوٹ نہ کرے تو سالے کو شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑے۔

بقیہ ص " لڑائی "

ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر کہا۔

" نہ مکان چھوٹنے کا غم ہے اور نہ ہی ماں باپ کا پھر ؟ ـــــ اس سوال پر اس کی بیوی پھر پھپھک کر رو پڑی اور روتے روتے کہنے لگی۔

یہاں سے چلی تو جاؤں گی مگر بال بچوں کی اُس سے !!۔

اُس نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پتھرا گیا۔

بقیہ " تبصرے "

مجموعوں میں وہ نظریاتی مضامین ضرور شامل کریں گے اِس سے اُن کی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ لگانے میں زیادہ آسانی ہو گی۔ کتاب کے شروع میں احمد یوسف صاحب کا ایک مختصر مگر معنیٰ خیز تعارف شامل ہے
کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ دلکش ہے۔

بیئر جیسے وہسکی کا کام دے گئی تھی۔ نائب تحصیلدار کا جسم نشے سے السا رہا تھا لیکن اس کے اندر کا نائب بیدار تھا، چاق چوبند۔ وہ نائب تحصیلدار جو فحش زبان بولتا ہے اپنی تحصیل میں خود کو مطلق العنان بادشاہ سے کم نہیں سمجھتا، جو صرف جوان لڑکیوں کی بات کرتا ہے، جیسے شراب کی ہر ورائٹی کا نام اور ذائقہ معلوم ہے۔ وہ نائب تحصیلدار جو غراتا ہے گرجتا ہے، گھرتا ہے اور گھر کر اتنا برستا ہے کہ کتنی ہی جھونپڑیاں اس کے بہاؤ میں بہتی چلی جاتی ہیں۔

ایوب جوہر
بنگلہ دیش

لڑائی

بات بہت معمولی سی تھی جیسے وہ خود محسوس کر رہا تھا، لیکن نہ جانے اس معمولی سی بات میں کون سی چنگاری چھپی ہوئی تھی جو اس کے ذہن کو پھپھولے پہ پھپھولے لگا رہی تھی۔

بات اتنی سی تھی کہ اسے موجودہ مکان سے شفٹ ہو کر اپنے نئے سرکاری کوارٹر میں منتقل ہونا تھا جو تقریباً چھ ماہ قبل اس کے نام الاٹ ہو چکا تھا اور اصولی طور پر اسے کوارٹر الاٹ ہونے کے چند ہفتوں کے اندر منتقل ہو جانا چاہئے تھا، لیکن اپنی بیوی کی طرح طرح کی تاویلات نے اسے اب تک منتقل ہونے سے روک رکھا تھا، اور یہی معمولی سی بات اس کے ذہن میں کیل بن کر چبھ گئی تھی۔

بات یہ نہیں تھی کہ اس کی بیوی موجودہ مکان سے شفٹ ہونے کے حق میں نہیں تھی، مکان چھوڑنے کے لئے تو وہ ایک پاؤں پر کھڑی تھی۔ لیکن آدمی اپنی مرضی کا مختار کل کب رہا ہے؟ آدمی تو محض ایک لفظ بے بس ہے، حالات کے دھاگے میں کھنچا ہوا محض ایک کٹھ پتلی۔ اور اس حقیقت سے وہ بھی آگاہ تھا اور یہ اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ آخر چھ مہینے کیوں اور کس طرح گذر گئے۔ اور وہ اب تک اپنے الاٹ شدہ کوارٹر میں کیوں نہ منتقل ہو سکا۔ لیکن......

لیکن ہی وہ لفظ ہے کہ جہاں کوئی اور چھور نظر نہیں آتا۔ اور تب ہی آدمی جھنجھلا جاتا ہے۔ جھنجھلاہٹ جسے شعور کی ضد کہتے ہیں، جھنجھلاہٹ جسے بے کسی اور بے بسی کی انتہا کہتے ہیں اور وہ شاید اسی انتہا کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔

اُس روز بھی وہ کافی جھنجھلا گیا تھا۔

ابھی دفتر سے آ کر اس نے کپڑے بھی نہ بدلے تھے کہ ایک متعین وہ آواز طنز بن کر اس کے کانوں میں اتری۔

"کیا ہوا آپ نے کوارٹر الاٹمنٹ کے سلسلے میں کوئی بات کی؟"

اس نے اپنا چہرہ ہراساں بنایا تھا اور تقریباً اپنی دونوں آنکھیں اپنے چہرے سے باہر نکالتے ہوئے اپنی بیوی کو جواب دیا تھا۔

"تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے؟"

"اونہہ، آپ کو کیا ہے، دن بھر گھر میں رہتے تو پتہ چلتا یہاں تو زندگی عذاب بن گئی ہے۔"

"کیوں، ماں باپ کے گھر سے اتنی جلدی جی اکتا گیا؟"

"ماں باپ کا گھر اپنی جگہ، مجھے کیا حصہ بخرا کرنا ہے ویسے اگر آپ کچھ سوچتے ہوں تو یہ دوسری بات ہے۔"

اپنی بیوی کے آخری جملے پر تقریباً وہ تلملا کر رہ گیا تھا لیکن کرتا بھی کیا، کہ وہ ایک آدمی تھا اور آدمی اپنی مرضی کا مختار کل کب رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ موجودہ مکان چھوڑنے کے بعد اسے کن کن مسائل سے دوچار ہونا ہوگا سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ جہاں سرکاری کوارٹر تعمیر ہوا تھا وہاں اس کا اپنا ماحول قطعی نہیں تھا لیکن اس مسئلے کو تو کبھی اس نے نظر انداز کر دیا تھا کہ آخر اپنا ماحول بھی کبھی کہاں نہ یہ تو محض سوچ کی آنچ ہے ورنہ ہو سکتا

سے دیکھو تو خدا کہلائے اور ان ہی نظروں میں حقارت بھر
لو تو پاؤں کی ٹھوکر کے سوا کچھ نہیں، اور پھر یا تو ل تو رہنے
سہنے کا نام ہے لہٰذا رہنے سہنے سے پہلے گھر آنا کیوں؟ لیکن
مسئلے اور بھی تھے۔ جہاں وہ رہ رہا تھا وہاں مکان کے ساتھ ہی
اس نے ایک چھوٹا سا کارخانہ کر رکھا تھا جہاں سے دو چار
پیسے ہی نہیں آ رہے تھے بلکہ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش
گپیوں کا اڈہ بھی تھا۔ لیکن اس مسئلے سے بھی اس نے سمجھوتہ
کر لیا تھا کہ کیا ہے دو چار گھنٹوں کا ہی تو فرق پیدا ہوگا یعنی
جو وقت وہ فی الحال اپنے کارخانے کو دے رہا ہے وہ نہیں
دے پائے گا۔ اس سے نقصان کا اندیشہ تو ہے لیکن اپنے
کاریگروں کی نیک نیتی، اہلیت [illegible] مد نظر رکھتے
ہوئے اس نے اپنے آپ کو سمجھا [illegible] تھی کہ یہ مسئلہ
بھی کوئی خاص مسئلہ نہیں [illegible] بچوں کی تعلیم
کا اور اس کی نظر میں یہی سب سے اہم مسئلہ [illegible] لئے کہ اس
کے بچے موجودہ مکان سے قریبی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔
ظاہر ہے ان کی آمد و رفت پر اس کی جیب سے ایک پیسہ
خرچ نہیں ہو رہا تھا لیکن موجودہ مکان چھوڑ کر سرکاری
کوارٹر میں منتقل ہونے کے معنی تھے کہ صرف بچوں کی آمد و رفت
پر بیس سے پچیس روپئے یومیہ خرچ کرنا پڑے گا۔ اور
وہ اپنے موجودہ حالات کے پیش نظر اتنی بڑی رقم خرچ کرنے
کا اہل نہیں تھا۔ یہ اور اسی طرح کے کئی چھوٹے بڑے
مسائل ایسے تھے جنہیں وہ اچھی طرح محسوس کر رہا تھا اور
یہی وجہ تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے سسرال والوں
سے نباہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن اس کی
[illegible] ــــــ اس کی بیوی تو جیسے پانی میں بھیگ رہی
تھی [illegible] دیکھتے ہوئے الاؤ میں گھری ہوئی تھی تو اس پر
ضد تھی کہ جیسے بھی ہو جہاں بھی ہو مجھے اس جہنم سے
نکالو اور اس کی بیوی کی یہ ضد اپنی جگہ درست
بھی تھی اس لئے کہ وہ بڑے چاؤ سے اس گھر میں آئی تھی۔
کہ جو بھی ہو یہ گھر اس کے والدین کا ہے جہاں اس کے ساتھ
عام کرایہ دار کی طرح کوئی برتاؤ نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ گھر اس
کا اپنا گھر ہوگا، اپنا گھر جہاں سکون ہی سکون اور خوشی
ہی خوشی ہوگی۔

لیکن اس کی بیوی کو یہ کہاں معلوم تھا کہ ان دنوں
تمام رشتہ دار کھنکتے ہوئے سکوں کے زیر اثر پروان چڑھتے
ہیں، سکوں کی کھنک جتنی زیادہ ہوگی رشتوں کی چمک اتنی
ہی زیادہ ہوگی اور جہاں سکوں کی کھنک کم ہے یا نہیں کے
برابر ہے۔ وہاں خونی رشتے بھی ساتھ کھو بیٹھتے ہیں۔ بہرحال
اس کی بیوی کو علم ہو چکا تھا کہ ان دنوں رشتوں کا بازار کیا ہو
گیا ہے اور یہ اس کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا کہ جہاں اس کی
بیوی دن رات اٹھتے بیٹھتے اپنے میکے کا راگ الاپتی تھی اب
نہ صرف میکے کے نام سے چڑنے لگی تھی بلکہ شدید طور پر اپنے
میکے کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار بھی کرنے لگی تھی۔ لیکن اپنی
بیوی کے میکے کے خلاف شدید رد عمل کے باوجود وہ پھر
بھی اس کے لئے تیار نہ تھا کہ موجودہ مکان چھوڑ کر کوئی
مصیبت اوڑھ لی جائے لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس سے اپنی
بیوی کی بے بسی بھی نہیں دیکھی جا رہی تھی روز روز کے
جھگڑے، لڑائی اور تو تو میں میں سے وہ خود عاجز آ چکا
تھا کہ دفتر سے آؤ تو بیوی کو اپنی ماں اور بہنوں سے لڑتا
ہوا دیکھو اور دفتر جاؤ تو ساس، سالیاں اور سالوں کو
اپنی بیوی سے الجھتا ہوا پاؤ اور سارا سکون غارت۔ پھر یہ
کہ اس کی بیوی کا رونا دھونا اور بچوں کا یہ طعنہ دینا کہ ابا
کو سب کچھ کرنے کو ہوتا ہے لیکن اس جہنم سے نکلنے کے لئے
نہیں ہوتا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری دلخراش حقیقتیں
ایسی تھیں جنہیں وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا جب
محکمے کی جانب سے کوارٹر الاٹمنٹ کے لئے درخواستیں

طلب کی گئیں تو اس نے آنکھ بند کرکے درخواستیں دے دیں اور ہونی یہ ہوئی کہ درخواست بھی منظور کر لی گئی اس روز واقعتاً اس [illegible] گھر میں عید ہو گئی جب اس کی بیوی [illegible] بچوں کو یہ خبر [illegible] کہ کوارٹر [illegible] الاٹ ہو چکا ہے۔

اور پھر [illegible] تو [illegible] اس [illegible] بیوی اور بچوں [illegible] کا [illegible] کرتے ہوئے [illegible] کہ اب [illegible] نہیں [illegible] ہونی چاہیے بلکہ کل [illegible] کوارٹر میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس نے بچوں اور بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اب اتنی جلدی کیا ہے۔ کوارٹر الاٹ ہو چکا ہے ہمیں منتقل ہونا ہی ہے اور ابھی تو اس میں نہ بجلی ہے نہ گیس اور نہ پانی لہٰذا ہمیں کچھ دنوں تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ اس پر اس کے بچوں نے کہا کہ ابو ہم کیتی جلا کر رہتی گے کراسن پر کھانا پکائیں گے اور ٹیوب ویل سے پانی لیں گے لیکن اب ہم نانی بارٹی ایک منٹ نہیں رہیں گے۔ بچوں کی تائید میں اس کی بیوی نے بھی سر ہلا دیا۔ لیکن اس نے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ بیگم یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ صرف کراسن تیل پر روزانہ پندرہ سے بیس ٹاکا تک خرچ ہوگا، پندرہ بیس ٹاکا کے نام پر بیوی کے کان کھڑے ہوئے پھر یہ طے پایا کہ ٹھیک ہے گیس آجائے تب ہم شفٹ کریں گے۔

اور گیس کے انتظار میں دو مہینہ بیت گئے۔

بہرحال دو مہینے بعد گیس لائن مکمل ہوئی تو اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اب تم چاہو تو کوارٹر میں منتقل ہو سکتی ہو گیس کی خبر سے اس کی بیوی اور بچے بہت خوش [illegible] لیکن اس کی بیوی نے سوچتے ہوئے کہا کہ جب گیس [illegible] ہے تو پانی اور بجلی آنے میں کیا دیر ہوگی لہٰذا دس پندرہ دن اور دیکھ لیا جائے۔ اس کی بیوی کی رائے معقول تھی۔ ویسے بھی پانی تو بے حد ضروری ہے لہٰذا وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ بہرحال پانی اور بجلی کا مسئلہ بھی پندرہ بیس دنوں میں حل ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو یہ خوش خبری سنائی تو ایک بار پھر اس کے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خصوصاً اس کے بچوں پر بڑا خوشگوار اثر ہوا کہ اب وہ اپنے نئے گھر میں چلے جائیں گے اور یہ کہ دن رات کی جھک جھک بک بک سے نجات مل جائے گی۔ لیکن جب معاملہ درپیش ہوا کہ سامان کب اٹھوایا جائے تو اس کی بیوی نے ایک تیخ لگا دیا۔ اس نے کہا کہ مر بیوں سے سنتی آ رہی ہوں کہ بھادو کے مہینے میں مکان تبدیل نہیں کرتے۔ اور بزرگوں کی بات ماننی چاہیے۔ اپنی بیوی کے اس بے تکے پن پر وہ ایک لمحہ چڑ چڑا سا گیا۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے اس کی بیوی کی بات ہی درست ہو، آخر بزرگوں نے بھادو کے مہینے میں مکان تبدیل نہ کرنے کی ہدایت کی ہے کچھ نہ کچھ اس کی وجہ تو ضرور ہوگی۔ اور پھر اپنی اس سوچ پر خود ٹھٹھر ما گیا۔ اس نے سوچا۔ آدمی کتنا بے بس ہے۔ صرف دو سال پہلے وہ اس قسم کی بات سننے کا روادار تھا بلکہ کوئی بھولے سے بھی اس کے سامنے کسی توہم کا ذکر کرتا تو وہ ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے اس کی آنکھوں میں تکلیف ہوئی ہے اور ڈاکٹروں سے علاج کرا کرا کر تقریباً مایوس ہو گیا ہے، وہ کس قدر بدل گیا ہے؟ اس نے سوچا اور ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینگ پڑی۔

بھادو کا مہینہ گزرا تو ایک بار پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"بیگم، بھادو تو الوداع کہہ گیا ہے اب کیا ارادہ ہے؟"

اس کی بیوی [illegible] تیکھی نگاہوں سے دیکھا [illegible] بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے میں اپنی مرضی سے یہاں پڑی ہوئی ہوں، میرا کیا ہے آپ ابھی کہیں میں ابھی چلنے کو تیار رہوں۔"

اپنی بیوی کے تیکھے تیور دیکھ کر اس نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔

"ارے تم برا مان گئیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کب تک......"

"کب تک کیا، ابھی سامان اٹھوائیے، میں ابھی چلوں گی، مگر ہاں اپنی بڑی بٹیا سے بھی پوچھ لیجئے۔ آئندہ ہفتہ سے اس کا امتحان شروع ہو رہا ہے۔"

ارے یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب ہفتہ دس دنوں میں کیا رکھا ہے۔ بچی کا امتحان ہو جائے تب ہی یہاں سے اٹھنے کی تیاری کرنی چاہئے اس نے اپنی بیوی کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیگم، تم تو خواہ مخواہ الجھ گئیں۔ میں نے تو یوں ہی بات اٹھائی تھی۔ بہرحال اب بچی کے امتحان میں کیا ہے دس پندرہ دن اور سہی،" اس کی بیوی نے اس کی طرف دیکھا، نظروں نے نظروں کا پیغام لیا [illegible] پر مسکراہٹ رینگ پڑی۔

بچی کا امتحان ختم ہو چکا تھا اور وہ منتظر تھا کہ اس بار اس کی بیوی ہی اپنی جانب سے کچھ کہے گی۔ لیکن پورے سات دن گذر گئے اور اس کی بیوی کا عندیہ پردہ نشیں ہی رہا تو آٹھویں دن اس نے خود پوچھا۔

"بیگم اب کیا ارادہ ہے۔ اب تو بچی کا امتحان بھی ختم ہو گیا۔"

"ارادہ کیا ہے [illegible] تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے [illegible]

آرہی ہوں آپ جب کہئے گا میں چلنے کو تیار ہوں مگر اب ایک ہفتہ بعد بقرعید ہے اور ...."

"اور کیا؟" وہ اپنی بیوی کی بات پر جھنجھلا گیا۔ "پھر تم یہ کہو گی کہ ایک ماہ بعد محرم ہے اور دو مہینے بعد گیارہویں شریف اور ... ... اس کا مطلب ہے ماں باپ کی جوتی ہی کھانی تھی تو مجھے کوارٹر الاٹ کرانے کے سلسلے میں کیوں پریشان کیا۔" اس نے کچھ اس طرح سے یہ باتیں کہیں کہ اس کی بیوی بلبلا اٹھی اور پھر جھر جھر اس کے آنسو بہنے لگے۔ بیوی کو اس طرح روتے دیکھ کر تقریباً وہ سٹپٹا سا گیا اور اپنی نظریں نیچے کئے سوچنے لگا۔ وہ بھی عجیب آدمی ہے، وہ مکان چھوڑنے کے لئے آخر اتنا بضد کیوں ہے؟ اسے اتنی جلدی کیوں ہے۔ جبکہ جلدی اس کی بیوی کو ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ اس کی بیوی کے ایما پر کوارٹر اس نے حاصل کیا تھا۔ لہذا اس کی بیوی کو جلدی ہونی چاہئے تھی۔ [illegible] یہ تو مدعی سست اور گواہ چست والی بات ہو گی۔ اپنی اسی سوچ پر وہ خود شرما گیا۔

دفتر سے وہ ابھی ابھی واپس ہوا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ کیونکہ بچے تمام کے تمام خوش تھے اور اس کی بیوی کمرے کے ایک کونے میں اسی طرح اُجاڑ اجاڑ بیٹھی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی کسی کا ماتم کر کے اٹھی ہو۔ اس نے معنی خیز نگاہوں سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے آج تو یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے گھر میں کوئی ہو ہی نہیں۔" اس کی بیوی نے اس کی جانب ایک نظر دیکھا اور تقریباً سسکتے ہوئے کہا۔

"آپ ابھی جائیے اور [illegible] لائیے میں اب ایک

منٹ یہاں نہیں رہوں گی۔"

"اُس نے حیرت سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا اور کہا کہ ابھی تو بقرعید کو تین دن باقی ہیں، اور ...."

"اور کچھ نہیں، آپ ابھی جاکر ٹرک لائیے، میں ایک پل یہاں نہیں ٹھہروں گی۔" اس کی بیوی نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے بیٹے سے دھیرے سے پوچھا۔ بات کیا ہے؟ ــــ اس پر اس کے بیٹے نے تمام تفاصیل سے آگاہ کیا کہ آج نانی ماں اور اماں میں پھر جھگڑا ہوا ہے اور فلاں فلاں باتیں ہوئی ہیں وہ جھگڑے کی تفصیل سن کر زیر لب مسکرایا اور اس نے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بیگم یہ ٹھیک ہے ہمیں یہاں سے اٹھنا ہے لیکن ہم اپنا نفع اور نقصان بھی تو دیکھیں گے اور یہ کہ ہم مفت میں یہاں نہیں رہتے، کرایہ دیتے ہیں لہٰذا ہمیں کوئی دھکے مار کر تو نہیں نکال سکتا۔ اور اب بقرعید کو تین روز رہ گئے ہیں، لہٰذا جذباتی بننے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، ہم اطمینان سے بقرعید بعد ہی یہاں سے اٹھیں گے۔" اس نے یہ باتیں اس انداز میں کہیں کہ اس کی بیوی کو بھڑنے کا موقع نہیں مل سکا، البتہ اس کے ہونٹوں پر تھرتھراہٹ سی ضرور ابھری لیکن دوسرے لمحے وہ شانت ہو گئی۔

بقرعید کو گذرے آج چھٹا دن تھا۔ لیکن اب بھی اسے اپنی بیوی کی جانب سے مکان چھوڑنے کا کوئی سگنل نہیں ملا تھا۔ اور وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس بار اس سے غلطی ہو گئی ہے کہ بقرعید سے تین دن قبل جب وہ یہاں ایک منٹ رہنے کے لئے تیار نہ تھی اس وقت ہی گرم لوہے پر ضرب لگا دینی چاہئے لیکن اس نے بقرعید تک ٹال کر شاید ٹھیک نہیں کیا تھا۔ اور ادھر تہوار کے موقع پر دوبارہ ماں بیٹی میں میل بھی ہو چکا تھا، ممکن ہے اس کے ارادے میں تبدیل ہو گئی ہو۔ بہر حال اس نے ہمت کر کے ساتویں دن اپنی بیوی سے پوچھ ہی لیا۔ اور خلاف توقع یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ اس کی بیوی نے اس بار کوئی بحث نہیں لگایا اور سنجیدگی سے کہنے لگی کل صبح ٹرک لے آئیے آج رات ہم تمام سامان باندھ لیں گے۔

بیوی کا جواب سن کر اسے اطمینان ہوا۔ دوسرے دن وہ صبح صبح اٹھا اور ایک ٹرک پکڑ کر لے آیا۔ اس کی بیوی نے مکان پر تمام اسباب باندھ رکھے تھے۔ لہٰذا سامان اٹھوانے میں دیر نہیں لگی۔ صرف آدھ پون گھنٹے کے اندر تمام اسباب ٹرک پر لوڈ کر دیئے گئے۔ بچے بھی ٹرک پر سوار ہو گئے۔ اب وہ صرف اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلے تو ٹرک چھوڑا جائے لیکن تقریباً نصف گھنٹہ کے بعد بھی جب اس کی بیوی آتی دکھائی نہیں دی تو وہ جھنجھلاتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ کمرے کے اندر اس کی بیوی اس طرح ساکن و خاموش بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس پہ کسی نے سحر کر دیا ہو۔ اس نے اپنی بیوی کو عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

" اب کیا ہو گیا تمہیں؟ تمام سامان اُٹھ چکا ہے بچے جا چکے ہیں اور تم اب تک کمرے کے اندر بیٹھی ہوئی ہو؟ "

اس کی بیوی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر بھبک بھبک کر رو پڑی۔ اس نے غور سے ایک بار پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور تقریباً چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔

کیوں، ماں باپ کے چھوٹنے کا غم ہے یا مکان چھوڑنے کا؟ ــــ اس کی بیوی نے ہچکی لیتے

بقیہ صـ ۲۷

نسیم سترکھی
پاکستان

کھیت، تالاب اور نواں شخص

وہ سب کے سب صدیوں پہلے گھاس کاٹا کرتے تھے۔ گھاس کاٹتے کاٹتے ان کی عادت ہرے بھرے کھیتوں کو کاٹنے کی پڑ گئی۔ بڑے بڑے اُگے ہوئے سرسبز پودوں کو بڑی پھرتی کے ساتھ چند لمحوں میں کاٹ ڈالتے۔ پودوں کے کاٹنے کا ان کا عجب انداز تھا سب سے پہلے وہ کھیت کے چاروں طرف قطاریں بنا کر کھڑے ہو جاتے پھر وہ ایک ساتھ اپنے اپنے ہاتھوں میں لوہے کے تیز دھار والے ہتھیار تھامتے پھر ان میں سے ایک شخص اشارہ کرتا۔ آن کی آن میں سارے کھیت کے ہرے بھرے پودے کٹ کر زمین پر گر پڑتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان میں سے کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر آپس میں یوں باتیں کرنے لگے ــــــــــــــ

"کھیتوں کو کاٹتے کاٹتے ایک زمانہ بیت گیا" ایک بولا

"اس کے علاوہ اور ہم کیا کر سکتے ہیں" دوسرے نے کہا

"ہم لوگوں کو کچھ اور کرنا چاہیئے" تیسری آواز

"ہم سب اتنے پڑھے لکھے بھی تو نہیں ہیں" چوتھے نے زبان کھولی

"ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ہم سب ہزاروں سال پہلے بھی یہی کیا کرتے تھے" پانچویں نے خیال ظاہر کیا

"ہمارا خاندان ہمارا کنبہ یہی کام کرنے کی ترغیب دیتا ہے" چھٹے نے آہستہ سے کہا

"ہماری برادری کے بہت سے لوگ یہ کام کرتے کرتے اپنی زندگیاں ختم کر دی ہیں" ساتویں نے [illegible] کر کہا

"یہ سب کچھ درست ہے مگر اس پیشہ سے ہم تھک چکے ہیں" آٹھویں نے رکتے رکتے کہا

"اگر تم میرا ساتھ دو اور جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمھیں دوسرا کام بتاؤں گا" نویں نے سمجھاتے ہوئے کہا

سب نے یک زبان ہو کر نویں شخص کی تائید کی اور اس کا ساتھ دینے کا یقین دلایا۔ نویں شخص نے پھر مزید کہنا شروع کیا ــــــــ اچھا تو سنو ــــــــ تم سب بڑے تالاب پر اکٹھا ہو جانا لیکن [illegible] وقت آسمان پر بکھرے ہوئے تارے اپنی جھلملاہٹ ختم کر دیں اور صبح کے آثار نمایاں ہوں [illegible] تم سب

وہاں پہنچ جانا اگر سورج کی کرنیں زمین پر آ گئیں تو تمہارا جانا بیکار ہو گا۔

دوسرے دن آدھی رات ہی سے وہ سب اپنے گھروں سے چل دیئے اور منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ نویں شخص نے بڑے تالاب کے ایک کونے پر کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ کو شمال کی جانب کیا اس کا ہاتھ اٹھتے ہی تمام لوگ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ جنوب کی طرف کیا تالاب کی دوسری جانب بھی ایک قطار بن گئی اس طرح نویں شخص نے اپنے ہاتھوں کو باری باری سے چاروں سمتوں کی طرف کر کے تالاب کے چاروں طرف افراد کو کھڑا کر دیا۔

اب تالاب ان سب کے گھیرے میں تھا جب نویں شخص کو مکمل یقین ہو گیا کہ اس کے حکم پر کام کی تکمیل ہو رہی ہے تو اس نے اپنی بوری کی طرف دیکھا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ بوری میں ہاتھ ڈال کر اندر سے ایک بڑا سا جال نکالا اور آگے بڑھ کر تالاب پر پھینک دیا۔ جال تالاب پر گرتے ہی تمام آدمیوں نے جال کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر پورے تالاب پر پھیلا دیا ——— یہ بڑا تالاب اس گاؤں میں ابھی حال میں بنایا گیا تھا۔ یہ تالاب زیادہ پرانا تالاب نہ تھا لیکن تھا بڑا خوبصورت۔ اس تالاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی تمام مچھلیاں ہمیشہ پانی کے اوپر اچھلتی کودتی رہتی تھیں۔ کوئی مچھلی پانی کے اندر جانا پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ سورج کی روشنی جس قدر ان کے جسموں پر پڑتی اسی قدر ان میں چمک دمک پیدا ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مچھلی کا رنگ مختلف تھا۔ اکثر رات کو یہ چاند کی روشنی اپنے جسموں میں جذب کرتی تھیں۔ اس لئے رات کو بھی یہ پانی کی اوپری سطح پر تیرتی رہتی تھی ان مچھلیوں کی نشوونما میں چاند اور سورج کی براہ راست روشنی مددگار ثابت ہوتی تھی۔ جال کے پڑ جانے سے بہت سی مچھلیاں جال میں پھنس کر پھڑ پھڑانے لگیں۔ جو بچ گئیں انھیں مجبوراً پانی کی نچلی سطح پر جانا پڑا۔ اندر کی زمین دیکھ کر جب وہ اوپر آنے کی کوشش کرتیں تو انھیں پتہ چلتا کہ ان کے سروں پر جال پھیلا ہوا ہے نتیجتاً انھیں پھر زمین کا رخ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔

ادھر نواں شخص تالاب کے کنارے کھڑا مسکرا رہا تھا اس کے تمام ساتھی بھی بہت خوش تھے کہ انھیں ایک نیا پیشہ ہاتھ لگا ہے۔ جو اس سے پہلے انھوں نے کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔ اب ان سب نے اس کام کو روزانہ کا معمول بنا لیا روزانہ صبح تڑکے تالاب پر پہنچ جاتے اور جال کو پورے تالاب پر پھیلا دیتے کچھ عرصہ کے بعد وہ سب پھر یکجا ہو کر اس طرح باتیں کرنے لگے ———

"جب مچھلیاں اوپر نہیں آئیں گی تو ہمارا جال ڈالنا بیکار ہے" پہلی آواز

"اندر رہتے رہتے ان کی نسل ختم ہو جائے گی" دوسری آواز

"اگر مچھلیاں نہیں ہوں گی تو تالاب سے کیا فائدہ" تیسری آواز

ان کی یہ باتیں سن کر نویں شخص نے ان کو گھور کر دیکھا اور بولا ——— تم میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ قانون فطرت کے تحت مچھلیوں کی جبلت ہے کہ وہ پانی کے اندر رہ کر زندگی بسر کریں۔ اس صورت میں وہ ہرگز مر نہیں سکتیں اور نہ ہی ان کی نسل تباہ ہو گی بلکہ ایک عرصہ دراز کے بعد وہ پانی کے اندر رہنے کی عادی ہو جائیں گی تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ——— رہا تالاب کا سوال تو بڑے بڑے جنگلوں میں درخت ہوتے ہیں۔ ریگستانوں میں ریت ہوتی ہے اور پہاڑوں پہ پتھر ہوتے ہیں ——— یہ کہہ کر نواں شخص خاموش ہو گیا ———

اس کے ساتھی اس کی یہ باتیں سن کر کچھ دیر کے لئے ایک گہری سوچ میں پڑ گئے۔ جب وہ چونکے تو اس طرح سوالات کرنے لگے ______

" مچھلیاں پکڑنے کے اگر ہم عادی ہو گئے تو کھیت کاٹنا بھول جائیں گے " پہلا سوال

" یہ ہمارا آبائی پیشہ ہے " دوسرا سوال

" ہماری آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔" تیسرا سوال

ان کے یہ سوالات سن کر نواں شخص سر پکڑ کر بیٹھ گیا کافی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر یک بیک سر اوپر اٹھا کر کہنے لگا ______ اگر یہ بات ہے ___ تو اس طرح سے کرو کے آدھے آدمی پودے کاٹتے رہیں اور آدھے تالاب پہ جال ڈالتے رہیں اس طرح تم سب مطمئن بھی رہو گے اور تمہارا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا

______ پھر یوں ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد نواں شخص مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ سب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ___ اچھا ہوا مر گیا ___ اس کو مرنا ہی چاہیئے ___ مگر اس کے بتائی ہوئی باتوں پر ہمیشہ دل و جان سے عمل کرتے رہے یہ عمل صدیوں تک نسلاً در نسلاً جاری و ساری رہا۔ کہتے ہیں کہ ہزاروں سال بعد ان کی ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جس نے اپنے آباء و اجداد سے صرف انحراف ہی نہیں کیا بلکہ اپنی تاریخ تبدیل کر دی ان کی یہ نئی نسل کہتی تھی نہ ہم کچھ کاٹیں گے اور نہ پکڑیں گے بلکہ کچھ اور کریں گے پھر وہ مٹی کے برتن بنانے لگے۔

صغرا مام

دشنام طرازی

دشنام طرازی دوسرے فنون کی طرح ایک فن ہے۔ اس میں الفاظ کی بندشوں اور تراکیب پر خاص میان دیا جاتا ہے۔ اس میں ذہنی اختراع کی بھی کافی گنجائش ہے۔ اور جب کبھی کوئی دشنام طرازی پر اتر آتا ہے تو شعوری طور پر وہ اس علم کے لغت میں چند نئے الفاظ کا اضافہ ضرور کر جاتا ہے۔

دشنام طرازی کے کچھ اپنے آداب ہوتے ہیں۔ اولاً تو اس میں روانی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ روانی سے شنام طرازی با اثر اور دیرپا ہوتی ہے۔ دوئم یہ کہ دشنام طرازی عموماً بہ آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ وہ تان نہیں مدھر ساز پر گایا جا سکے۔ فریق ثانی کا گالی سن کر خوش رہ جانا آداب دشنام طرازی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

گالی عموماً بے عمل شروع کی جاتی ہے۔ مگر اس کے عمل کو دو آتشہ کرنے کے لئے ماہر دشنام طراز باعمل گالیاں ی دیتے ہیں۔ باعمل گالیوں میں صرف زبان کو ہی حرکت نہیں دی جاتی ہے بلکہ جسم کے دوسرے اعضا کو پوری حرکت ے کر گالیوں کی طبی تشریح بھی کر دی جاتی ہے۔

گالیاں تہذیبی اقدار کی وہ گرانقدر عطیات ہیں جو ورثے کی شکل میں پشت در پشت منتقل ہوتی آئی ہیں ر ہر پشت نے زمانے کے مزاج کے مطابق گالیوں کو فنی اور ادبی نقطہ نظر سے نکھارا اور سنوارا ہے۔ جب کوئی چھوٹا اپنی توتلی آواز میں گالی بکتا ہے تو لوگ بجائے بُرا ماننے کے اس سے محظوظ ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ محسوس تے ہیں کہ تہذیب کی یہ قدریں جو انہوں نے اپنے پرکھوں سے حاصل کی تھیں اگلی نسل کی قلوب میں اتار دی ہیں۔ طرح وہ خود کو ایک سماجی ذمہ داری سے سبکدوش محسوس کرتے ہیں۔

گالیوں کو سماجی قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ شادیوں میں میراثنیں سمدھی اور سمدھن کی شان میں جو سیٹھنے پڑھتی ہیں وہ اس ادب کی صنف مغلظات کی عمدہ ترین تخلیق ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کا اسے سن کر محظوظ ناسماجی قبولیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ صرف شادی کی رسمیں ہی نہیں کچھ تہواروں کو ہی بغیر گالیوں کے منایا نہیں جا سکتا۔ ہولی ایک ایسا تہوار ہے جو اد[illegible] انسانوں کو جدید ترین گالیوں کو ترتیب دینے کے لئے دعوت م دیتا ہے۔ اس طرح ہولی کو آپ صنف مغلظات کا [illegible] مشاعرہ کہہ سکتے ہیں۔

گالیوں میں طبقاتی نظام کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ کچھ خاص طبقوں کی گالیاں مخصوص ہوتی ہیں۔ اور یہ ایک طبقہ کی گالی دوسرے طبقے کے لئے بے معنی ہوتی ہے۔ مثلاً علماء طبقہ کی سب سے بڑی گالی "کافر" اور "جہنمی" ہے۔ سیاسی طبقے کی سب سے بڑی گالی "فاشسٹ" اور "ڈکٹیٹر" ہے۔ لیڈروں کا ایک طبقہ دوسروں کے خلاف اپنے دل کا بھڑاس اسے فاشیشٹ اور ڈکٹیٹر ہی کہہ کر نکالتا ہے۔ ادبا کے حلقوں میں سب سے د بیز گالی "ناقابل اشاعت" ہے۔ یہ گالی بیچارے ابھرتے ہوئے ادیبوں کو رسائل کے مدیران سے اکثر سننی پڑتی ہے۔

غصہ گالی کا محرک بھی ہوتا ہے اور پیداوار بھی۔ لیکن دونوں حالات میں فرق یہ ہے کہ غصہ جب کہ گالی کا ہمیشہ محرک ہوتا ہے، پیداوار ہمیشہ نہیں۔ گالیوں سے غصہ کا پیدا ہونا اور پیدا نہ ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ دشنام طراز کون ہے؟ اگر کہیں دشنام طراز کے لب شیریں ہیں تو ایسی گالیوں سے بڑا لطف آتا ہے۔ اور گالیاں سننے والا بے مزہ نہیں ہوتا بلکہ مشتاق رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو گالیاں سننے کے لئے وہ ایسے شیریں لب والوں کو چھیڑتا بھی ہے۔ چچا غالب بھی رقیب کے پردے میں گالی کے اس مزے کا اعتراف کرتے ہیں ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب!
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

گالی کمزور اور بے بسوں کے لئے عمدہ ہتھیار ہے۔ جبر اور تشدد کرنے والوں کے خلاف کمزور اور لاغر حضرات اپنے جذبات کی تسکین گالیاں دے کر ہی کرتے ہیں۔ گالیاں ہی ان کے دل کے غبار کے اخراج کا ذریعہ بنتی ہیں اور گھٹن اور ذہنی تناؤ کم کرتی ہیں۔ اس طرح طبی نقطۂ نظر سے گالیاں اس تناؤ بھری دنیا میں مظلوموں کے لئے ایک نعمت ہے۔

اسی ذہنی تناؤ کو کم کرنے اور غبار خاطر کے اخراج کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے شعرا نے بھی اس صنف کو ہاتھ لگایا ہے اور یہ شعرا کا اعجاز ہے کہ جب انہوں نے گالیوں کو ہاتھ لگایا ہے تو یہ محض کوچوں اور گلیوں میں تیرنے والے بے معنی الفاظ ہی نہیں رہ گئے بلکہ نوک خامہ سے سج سنور کر صنف ادب کی صف میں شامل ہو کر ہجو کی شکل میں اپنی جگہ بنالی۔

آئیے اب اس کا تجزیہ کیا جائے کہ انسان آخر گالیاں کیوں دیتا ہے۔ چونکہ عموماً گالیاں فطری جنسی عمل یا غیر فطری جنسی عمل کی لفظی تشریح ہی ہوتی ہیں اس لئے علم نفسیات کے ماہرین نے اس کی توضیح جنسی عمل کی ناآسود کی شکل میں کیا ہے۔ مگر اس کلیہ کو قبولیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ چھوٹے بچے اور صنف نازک پر ایسی گالیاں کیوں کہہ دیتے ہیں جس پر وہ قادر ہی نہیں۔

دوسری وضاحت یوں کی گئی ہے کہ جب انسان خود کو بے بس اور مجبور اور خود میں مقابلے کی صلاحیت نہیں پاتا ہے تو وہ گالیاں بکتا ہے۔ اس طرح گالیاں فرد کی اپنی کمزوری اور مرد مقابل کی توانائی کا کھلا اعلان و اعتراف ہے اس لئے پہلے انسان اپنے سے کافی بزرگ یا مضبوط شخص کو پیٹھ پیچھے گالیاں دیا کرتا تھا۔ مگر جب سے انسان نے اپنی عظمت اور انسانی مساوات کا سبق سیکھا ہے وہ اب پیٹھ پیچھے گالیاں نہ دے کر بڑے بزرگوں کو منہ پر ہی گالیاں دینے میں فرانس کے تاریخی نعرے LIBERTY EQUALITY & FRATERNITY کی کامیابی تصور کرتا ہے۔

لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ انسان صرف مجبوری، بے بسی، کمزوری اور غصے کی حالت میں ہی گالیاں بکتا ہے۔

گالیوں کے کچھ اور بھی مواقع ہوتے ہیں۔ مثلاً جب صبر انتظار کا پیمانہ چھلک اٹھے۔ اسی لئے پلیٹ فارم اور بس اسٹینڈ پر آپ منتظرین کی زبانوں سے ٹرینوں اور بسوں کی شان میں قصیدے سن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنے مریض کے انتظار میں اور وکلاء اپنے موکلوں کے انتظار میں اکثر گالیاں دیتے ہوئے سنے گئے ہیں۔ اسطرح جب صبر کا پیمانہ چھلک اٹھتا ہے تو گالیوں کے قطرے ٹپکتے ہیں۔

کچھ لوگ گالیاں دینے کے اس طرح خوگر ہوتے ہیں کہ گالیوں کے بغیر اپنے جملے کا آغاز ہی نہیں کر سکتے۔ وہ اس انداز سے گالیاں بکتے ہیں جیسے آغاز تکلم سے پہلے کسی کو مخاطب کر رہے ہوں۔ جس طرح عقرب قصداً نیش زنی نہیں کرتا بلکہ یہ اس کی مجبوری ہوتی اس طرح کچھ حضرات گالیاں قصداً تو نہیں دیتے ہیں بلکہ دشنام طرازی ہی ان کا انداز تکلم ہوتا ہے اور اگر کوئی اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ گالیاں کیوں بک جاتے ہیں تو وہ بڑے پیار سے گالی دیکر ہی کہتے ہیں کہ بھلا اسے آپ گالی تصور کرتے ہیں۔

یہ تو بات رہی گالیاں دینے والوں کی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو گالیاں سننے کے خوگر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر بغیر گالی کے مخاطب کیا جاتا ہے تو اس بے نیازی سے ان سنی کر جاتے ہیں جیسے انہیں مخاطب ہی نہ کیا گیا ہو۔ اور وہی جب ان کے حق میں چند مخصوص کلمات خیر کہہ دیئے جاتے ہیں تو بڑی شان سے مسکراتے ہوئے رجوع ہوتے ہیں۔

گالیوں میں موزونیت اور ممکنات کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ بہت سی گالیاں انسان ایسی دے جاتا ہے جو طبعی طور پر ناممکن ہوتے ہیں۔ یا جس کے عمل درآمد پر وہ قدرتی اور طبعی طور پر قادر نہیں ہوتا۔ مستورات جب گالیاں بکتی ہیں تو انہیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ بہت سی گالیوں پر انہیں عملی قدرت حاصل نہیں۔

حکومت کے ایک شعبہ نے بھی گالیوں کو شرف قبولیت دے رکھا ہے۔ اس شعبہ میں دشنام طرازی ملازمت کی کامیابی کی امین ہے۔ اس شعبہ میں دشنام طرازی میں حسب مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس شعبہ میں ملازمت ملتے ہی اپنے ماتحت کو گالی دینے کا حق ملازمت کی خصوصی مراعات کی شکل میں ملتا ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ دشنام پر اتر آئیں میں آپ کو یہ بتا کر رخصت ہوتا ہوں کہ یہ شعبہ پولس کا ہے۔

بلراج کومل

ساحل

خوشبوؤں، بدبوؤں کے
متضاد، مخالف
سیلابوں سے بچ کر آئے لوگ
ایک ایسے ساحل پر
اب اترے ہیں
جو لمحہ لمحہ کٹتا جاتا ہے
مبہم، پُرنم، رفتار سے پیچھے پیچھے ہٹتا جاتا ہے

ایک پیڑ کے نیچے جوت جگائے
دور دیس سے آنے والوں کی تم آس لگائے
صدیوں سے چپ چپ بیٹھی ہو
ننھے کی پیاری نیند، سہانے سپنے
بیداری اور خواب کی سیماؤں میں ایسے الجھے ہیں
وہ روتے روتے
تھوڑی دیر ہوئی تھی پل بھر سویا تھا

تم ساحل تھیں
تم پر بھی آخر کیا گذری
تم آنے والوں کے زخموں کے گیت
اندھیری راتوں میں
اکثر رو رو کر گاتی ہو
سیلا... میں بہتی جاتی ہو

زہر خواب

نشیب وقت کی
سیاہ دلدلوں میں
روز و شب کا
بےگماں سفر
ہمارے سر پہ آسماں ہیں، زیر پا زمیں ہے
خلط میں آفتاب، ماہتاب
اور نجوم
غلیظ ذائقوں میں
لجلجے غلیظ ذائقوں، جہنموں میں
رینگتے، پکارتے ہوئے
تمام لوگ

یہ شب نہیں
یہ روز نور بھی نہیں
یہ میں نہیں، یہ تم نہیں
سروں کے گنبدوں میں
بولتے تعفنوں کی گونج

جو شخص تتلیوں کے خواب دیکھتا تھا
وہ جلو میں تتلیوں کے چل دیا تھا
قہر خواب
وہ شخص ایک زمانہ ہو گیا ہے
پی کے سو گیا تھا
زہر خواب - !!

سوھن راہی

یہ سب تم کیوں نہیں لکھتے؟

ہیومن چین[1]، نیوکلیئر ایج[2]
فضا کی دھڑکنوں میں
دھرتی کی قبر میں
رنگوں کی چیخ
پھولوں اور کلیوں کی تباہوں پر
خونی گلکاریاں
آواز کی رفتار پر حاوی
مزائل اور راکٹ
بلیک ہول[3] سے زیادہ پُرکشش
قوم پرستی اور مذہب کے
اندھے اور لذت کش غار
آدمی اور آدمیت کے تحفظ کے لئے
فلک بوس محل
جن کے برقی کنولوں میں
صدیوں سے محکوم معیشت جل رہی ہے
یہ سب تم کیوں نہیں لکھتے؟
۲ کس وقت کی سُرنگ میں سانس لے رہے ہو

کس عہد میں
اپنی ذات کا رونا رو رہے ہو
اپنی انا کا ماتم کر رہے ہو
کس رات کی سیاہی کا تذکرہ کر رہے ہو
کیا اس رات کی سیاہی کا؟
جس میں دو سو انہتر (۲۶۹) عالم
موت نے کڈنیپ[4] کر لیئے
۳ کس رات کا تذکرہ کر رہے ہو
کیا اس رات کا
جس میں مظلوم دوشیزائیں
بھوک کے جہنم سے نجات پانے کے لئے
ریگستان کے امیرزادوں کی حرم سراؤں میں
رقص کیا کرتی ہیں
۴ کس رات کا رونا رو رہے ہو
کیا اس رات کا؟
جس میں بے گناہ مسافروں کی
گاڑیاں اُلٹ دی جاتی ہیں

---

1. HUMAN CHAIN
2. NUCLEAR AGE
3. BLACK HOLE
4. KIDNAP

۵ تم اس دور کو لکھو ____
تم اس عہد کو لکھو ____
جس میں سانس لینے کے لئے
اب ہوا بھی زہریلی ہے
جس میں پانی ___ آدمی کا بہترین ساتھی
اپنی چمک کھودے گا
جس میں آج کا انسان
ایندھن بن کر جل رہا ہے
جس میں آسماں کے نیل سے
دن کا رس برسانے والی کرنوں کی ٹکیا
کونٹیمنیشٹ ہو کر 5. CONTAMINATE
کبھی نہ زائل ہونے والا زہر برسائے گی
۶ تم اس فرعون کو لکھو
جو دلوں میں نفرتوں کا زہر گھول رہا ہے
جو فضا میں اپنی وحشت کا پرچم لہرا رہا ہے
۷ تم اس نظام کو لکھو
جو تمام سمندروں کو اپنی بے پناہ بانہوں میں
قید کرنا چاہتا ہے
تم ان کو لکھو
جو اپنی دھرتی کے انسانوں کو
اوروں سے بہترین انسان سمجھتے ہیں
جو اپنی آزادی کو خدائی نعمت
اور دوسروں کی آزادی کو غلامی تسلیم کرتے ہیں
۸ سمندری لٹیروں کی سانسوں میں پھنکارتے ہوئے
نفع خوری کے سانپ کیپیٹلسٹ 6. Capitalist
وقت کے نوالے چباتے ہوئے کیپٹلسٹ
ہاتھوں میں بارود کی ہنڈیاں تھامے ہوئے سیاستداں
سینوں میں آبِ صحرا لئے ہوئے ازم فروش
ان دیکھے سورگ اور نرک بیچنے والے بت پرست
ان جانے جہنم کا خوف دینے والے تقلید کار
یہ سب لکھنے کے عنوان ہیں
تم ان کو بھی لکھو
۹ مونالیزا کے گلوں میں 7. MONA LISA
لیزر بیم سے چمکتے ہوئے ہار 8. LASER BEAM
جن کی دمک ہمارے شعور کو اغوا کر لیتی ہے
جسموں پر بھڑکیلے اور شوخ لباس
جن کے رنگوں میں
میری دنیا کے انسانوں کا خون جھلک رہا ہے
سڑکوں پر شور مچاتی ہوئی درندہ گاڑیاں
جو افلاس زدہ اور مزدوروں کو کچل دیتی ہے
آکسفیم چلڈرن چیریٹی اور وار آن وانٹ کے نام پر
جلتی ہوئی دکانیں 9. Oxfam
جن کی بیشتر کمائی 10. Children Charity
دکانوں کے مالک کھا جاتے ہیں 11. War on Want
تم ان کو لکھو
یہ سب تم کیوں نہیں لکھتے
۱۰ تم جس جگ میں سانس لے رہے ہو
شاید اب اس کے چند ہی سال باقی ہیں
اس کے بعد ____ 12. ICE AGE
ایک مہیب اندھیرا ____ آئس ایج
صدیوں پر محیط ایک ماتم
روح اور جسم سے بے تعلق ایک ماتم
نہ روزِ حشر، نہ جنت، نہ جہنم
نہ نرک نہ سورگ
صرف ایک حقیقت بیکراں ماتم
شاید جو ہم سب کا مقدر ہے
جس کو تم نہیں لکھ سکو گے۔
[illegible]

شاہد میر

قہقہے نقرے مکانوں سے بچھڑ جائیں گے
دن نکلتے ہی بھرے شہر اجڑ جائیں گے

دور ہی دور سے محسوس کرو خوابوں کو
ریت کے نقش ہیں چھونے سے بگڑ جائیں گے

میرے احساس کے پودے ہوں کہ یادوں کے شجر
تیز آندھی میں سبھی جڑ سے اکھڑ جائیں گے

ایک ہلکا سا اشارہ ہی ہماری جانب
پھر تو ہم باد مخالف سے بھی لڑ جائیں گے

رائگاں تو نہیں جائیں گے گہر اشکوں کے
یہ مرے قصر خیالات میں جڑ جائیں گے

مندمل ہونے لگے زخم بدن کے شاہد
کوئی دن میں یہ چمن زار اجڑ جائیں گے

اکرام الحق اورنگ

مئے کہاں پی اس نے، خود اس کو ہی ساغر پی گیا
میکدے میں ظرف سے اپنے جو بڑھ کر پی گیا
دیکھنے والوں سے تم انجام اس کا پوچھ لو
ضد میں وہ پینے کو تو میرے برابر پی گیا
ہائے گلشن پر کھلا اب موسم گل کا فریب
جب لہو ہر شاخ گل کا دور صرصر پی گیا
کون اس کی ثالثی کے واسطے آگے بڑھے
خون تھا مظلوم کا ظالم کا خنجر پی گیا
آگ تھی، پانی تھا، خم تھا، اشک تھے کہ خون تھا
ضبط غم میں کیا کہوں کیا دیدۂ تر پی گیا
خشک دریاؤں کے سینے ہیں شہادت کو کھلے
اپنی سیرابی کو کتنا اک سمندر پی گیا
دیکھئے اورنگ اس دستور میخانہ کو داد دے
جام اہل ظرف کا کم ظرف لے کر پی گیا

★

پرکاش نیواری

تھی بلا کی کشمکش لمحوں کی آہٹ ایسی تھی
خونچکاں تھا ذہن، نس نس میں کھچاؤ ایسی تھا

زندگی کی ہر گھڑی گذری لرزتے کانپتے
وقت کے ماتھے پہ تیوری کی چڑھاوٹ ایسی تھی

ایک پل کو بھی نہ ہونٹوں پر تبسم آ سکا
زندگی کے جام میں غم کی گھلاوٹ ایسی تھی

روز و شب جلتا رہا محرومیوں کی آگ میں
میرے ماتھے پر مقدر کی لکھاوٹ ایسی تھی

راز ابھرنے کا کسی برقِ بلا کو مل گیا
آب جوئے غم کی لہروں پر لکھاوٹ ایسی تھی

ایک پل میں بہہ گیا امید کا کچا گھڑا
تھا عجب طوفان، دریا کی چڑھاوٹ ایسی تھی

عمر بھر پرکاش صحراؤں میں ہم بھٹکا کیے
دیگ عشرت کے سرابوں میں چھلاوٹ ایسی تھی

فردوس گیاوی

اک دریچہ نہیں دیوار میں گھر کیسا ہے
ہونٹ لوگوں کے سلے ہیں یہ نگر کیسا ہے

ہم جہاں ہیں وہاں آباد ہے راون ہر سو
کوئی بتلائے ہمیں رام نگر کیسا ہے

چار جانب ہے اجالوں کا سمندر پھر بھی
چونک اٹھتا ہوں ہر آہٹ پہ یہ ڈر کیسا ہے

کوئی ترسیل کی صورت ہی نہیں اب باقی
کس سے دریافت کروں شہرِ ہنر کیسا ہے

خود پہ کرتا ہے شب و روز ستم ہنس ہنس کر
سوچتا ہوں کہ وہ پتھر کا جگر کیسا ہے

آندھیوں میں تو سبھی پیڑ زمیں بوس ہوئے
پھر بھی فردوس سلامت وہ شجر کیسا ہے

قاضی حسن رضا

رنگ نکھرا دعاؤں کی تاثیر کا
رُخ بدلنے لگا اپنی تقدیر کا
منہدم کر دیا میں نے اپنا مکاں
ایک پہلو نکل آیا تعمیر کا
آندھیاں سارے منظر کو دھندلا گئیں
اڑ گیا رنگ ہر ایک تصویر کا
بات کے زخم پہنچے ہیں گہرائی تک
آنچ دینے لگا لفظ تحریر کا
میرے اشعار پر بحث ہونے لگی
خوب حیلہ ملا میری تشہیر کا
ایک خواہش ہی کی تھی تمنا نے ولے
بن گئی مسئلہ وہ بھی کشمیر کا

فریاد راوی

نہ روک پائی مری آستین کی خوشبو
اسے کبھی لے گئی بہلا کے بین کی خوشبو
گلاب اُگے تھے مرے شہر کے ہر آنگن میں
مگر فضا میں تھی رقصاں مشین کی خوشبو
مرے وجود کا مجھ کو دلا گئی احساس
مرے گماں سے لپٹی یقین کی خوشبو
نہ جانے کون سی مٹی [illegible] تھی گملوں میں
گلاب دینے لگے یاسمین کی خوشبو
میں آسمان پہ پہنچا مگر ستانے لگی
مرے وجود سے لپٹی زمین کی خوشبو
بس ایک آن میں سارے جہاں میں پھیل گئی
بتوں کے شہر سے اٹھی جو دین کی خوشبو

★

تبصرے

کتاب کا نام : تاریخ ناگ پور
مصنف، ناشر اور تقسیم کار : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگپور
قیمت : دس روپئے
مبصر : بدر اورنگ آبادی

تاریخ ماضی کو کھنگھالنا اپنے ماضی، اپنی تہذیب اور اپنے ورثہ کی تلاش ہے اور جو بھی شخص اس کام کا بیڑہ اٹھاتا ہے وہ لائق صد تشکر ہے۔ اور یہ بھی ایک اہم تاریخی حادثہ یا تاریخی اتفاق ہی ہے کہ ڈاکٹر ساحل نے اپنے تحقیقی مقالہ "ناگپور میں اردو" پر اشاعت کی غرض سے نظر ثانی کی تو ناگپور کی ایک الگ تاریخ مرتب ہو گئی۔ اور وہ تاریخ بھی ایسی جس میں "دیوگڑھ کے حکمرانوں کی اتنی جامع تاریخ ملے گی جو اس سے پہلے کسی زبان میں منظر عام پر نہیں آئی" اور بقول مصنف "یہ کتاب اردو میں ناگ پور کی پہلی تاریخ ہے۔" اس لحاظ سے بھی مصنف کی کاوشیں قابل ستائش ہیں۔

تاریخ ایک خشک مضمون ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ واقعات کو پیش کرنے میں مؤرخ کچھ اتنی سادگی برتتا ہے کہ مضمون اور بھی پھیکا پھیکا سا ہو جاتا ہے اور پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل چونکہ لٹریچر کے آدمی ہیں اس لئے تاریخ ناگپور کے واقعات و کردار کو پیش کرنے میں بھی انہوں نے شگفتگی اور ہنرمندی کا خیال رکھا۔ اس لئے کتاب کا مطالعہ ناگوار نہیں ہوتا۔

ناگپور کی تاریخی حیثیت دیوگڑھ حکومت کے قیام کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے دیوگڑھ حکومت کی بہت ساری تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں۔ گونڈ قبیلہ کے جاٹبا نامی شخص نے مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ۱۶۰۵ء (۵۵۶ھ) میں اس چھوٹی سی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ چنانچہ اس وقت سے آخری مسند نشیں، راجہ محمد اعظم شاہ (انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا) تک تفصیلات درج ہیں۔ اس کے بعد بھوسلوں کے دور حکومت کی داستان ہے جن کے خاندان کا چھترپتی شیواجی کے خاندان سے گہرا تعلق ہے ان حکمرانوں کی فتوحات، ان کی دور اندیشی، ان کی فیاضی اور غیر عصبیت کی داستان ہے جس کے باعث ان کی حکومت برار سے کٹک (اڑیسہ) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور پھر انگریزوں کی عیاری!—— کسی بھی ملک یا قوم کی تاریخ۔ جنگ و صلح، تدبر و لغزش، رواداری و مکاری اور فتح و شکست کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور "تاریخ ناگپور" ارتقائی سفر میں بھی ایسے واقعات کی کمی نہیں۔

واقعات کی بیان کی جھلک تو مؤرخ کے لئے بالکل ضروری ہے لیکن انہیں قلم بند کرنے کے وقت مؤرخ کے ذاتی اور جذباتی خیال کا اظہار تاریخ نویسی کا عیب ہے اور "تاریخ ناگپور" بھی اس عیب سے مبرا نہیں
ڈاکٹر ... [illegible]

محمد اعظم شاہ) کے بیٹوں نے اس کے انتقال کے فوراً بعد ہندو مذہب اختیار کرلیا اور باپ کی نعش کو بھی نذرِ آتش کر ڈالا" مذہب کی تبدیلی تو ایک واقعہ تھی لیکن مؤرخ کے تاسف (یا مسرت) سے تاریخ کے طالب علم کو کیا واسطہ؟ اگر ڈاکٹر ساحل کو افسوس تھا تو یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا جسے پردۂ خفا میں رہنا ہی زیادہ مناسب تھا۔

ناگپور کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ڈاکٹر ساحل کا خیال ہے کہ "چونکہ یہ علاقہ ناگ پھنی کے درختوں سے گھرا ہوا تھا اس لئے ناگ پور کے نام سے یاد کیا جانے لگا" لیکن ضلع ناگپور کے اجمالی تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی کئی ندیوں میں سے ایک کا نام "ناگ" ہے اس لئے زیادہ قرین قیاس ہے کہ اسی کے نام پر "ناگپور" رکھا گیا۔ یہ پرانا دستور بھی تھا اور پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جس کو ہم آج "ناگ پھنی" کہتے ہیں وہ اس زمانہ میں بھی ناگ پھنی کہا جاتا تھا۔

تاریخ کے مطالعہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب یقیناً افادیت کی حامل ہے۔

کتابت و طباعت اچھی ہے اور مواد اور صفحات (۱۲۰) کے لحاظ سے قیمت (دس روپئے) مناسب ہے۔

کتاب کا نام : تخلیقی نقوش
مؤلف کا نام : مصطفٰے فطرت
ملنے کا پتہ : ۹/۳ حسن پوریہ۔ کشمیری محلہ لکھنؤ۔ یوپی
قیمت : دس روپئے
مبصر : ڈاکٹر محمد تمنی

"تخلیقی نقوش" عہد حاضر کے بہت سارے معروف اور غیر معروف شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس مجموعہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ شعراء نے خود ہی کلام کا انتخاب کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مختصر حالات زندگی بھی شامل کر دیئے ہیں۔ شعراء کو اپنے کلام کا انتخاب اور خود ہی حالات زندگی قلمبند کرنے کے لئے آمادہ کر لینا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں ان حالات سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اس دشواری کے پیش نظر جناب مصطفٰے فطرت مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پیش لفظ اردو کے اہم اور معتبر نقاد کا مرہون منت ہے جس میں انہوں نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "مختصر ہونے کے باوجود یہ انتخاب ہر قسم کے ذہن و جذبہ کی آسودگی کا سامان فراہم کرتا ہے اور مختلف قسم کے فنی انداز نظر ایک جگہ مل جاتے ہیں۔"
کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ انتخاب اطمینان بخش ہے۔

کتاب کا نام : مدعا (شعری مجموعہ)
شاعر کا نام : ظہیر صدیقی
مبصر : ڈاکٹر محمد تمنی
پتہ : ظہیر صدیقی، جیون پرکاش منظر الحق پتھ۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

مدعا ظہیر صدیقی کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس میں تنوع کی خاطر چند قطعات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں ظہیر صدیقی اگرچہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن غزل کے میدان میں بھی ان کی آواز نمایاں اور منفرد ہے۔ ان کا چہرہ بھیڑ میں بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری کی اساس کلاسیکی ہے۔ لیکن اس پر انہوں [illegible]

تعمیر کی ہے وہ فکر و احساس اور لفظیات کے اعتبار سے تازگی اور طرفگی کی جھلکیاں دکھاتی ہے

دشت آواز میں لفظوں کے شجر دے یارب
شاخ در شاخ معانی کے ثمر دے یارب

اُن کی غزلوں میں ٹکنولوجی کے طفیل تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیبی اور سماجی زندگی کے تناظر میں سچے انسان کی گمشدگی کا کرب شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُن کا یہ انفرادی درد جب غزل کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو اظہار کے نئے ڈھنگ، لفظوں کو برتنے کے نئے طریقے اور معنویت کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

مل کے بھی سب سے الگ چہروں کے اس سیلاب میں
تیل کا قطرہ ہے گویا اک بھرے تالاب میں
اس دور کشمکش میں اے کاش یہ ممکن ہو
تو سوچے کہ بس میں ہوں میں سمجھوں کہ بس تو ہے
شہر میں آنے سے پہلے وضعداروں میں نہ تھی
یہ ندی اتنی مہذب کو ہساروں میں نہ تھی

یہ چمکیلی مصنوعی تہذیب کے نیچے دبی ہوئی انسانی روح کی پکار اور کراہ ان کی غزلوں کا بنیادی عنصر ہے جس کے گرد ان کی تخلیقات گردش کرتی ہے۔ جو کھیل اُن کی آنکھوں کے سامنے مسلسل کھیلا جا رہا ہے اور جسے دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں تھک گئی ہیں وہ ان کے لئے محض ایک تماشا بن کر نہیں رہ گیا۔ مشاہدہ کے دوران ان کا دل پگھلتا رہا اور ان کا ذہن سوچتا رہا۔ یہی تجربات جب تخلیقی عمل سے گزر کر غزل کے سانچے میں ڈھل گئے تو فکر و احساس کی سچائی اور انفرادیت کی بدولت قاری کے دل و دماغ کو اپنی جانب کھینچنے لگے۔ ان تجربات پر ان کی شخصیت کی چھاپ نہایت واضح اور نمایاں ہے۔ غزل میں اس منزل تک پہنچنا آسان نہیں کیونکہ اس میدان میں روایت زدہ رسمی اور مصنوعی اشعار کا ایک انبار سا لگا ہوا ہے۔ ان کے کچھ اچھے اشعار دیکھئے

زخم سارے معتبر تھے سسکیاں نامعتبر
جرأت اظہار یعنی میرے یادوں میں نہ تھی
خوش قسمت ہیں وہ بھی کتنے جن کی لاشوں کو صحرا نے
اوس کے قطروں سے نہلایا تند بگولوں میں دفنایا
کم ہے آگ نہ آنسو کم ہیں اندر باہر جوں کا توں ہے
سورج سارا پانی پی لے پھر بھی ساگر جوں کا توں ہے
ہونٹ کے پھول ہیں اوس آنکھوں کی ہے چاند عارض کا ہے رات زلفوں کی ہے
اس کرایہ کے تاریک کمرے کو ہم آؤ مل جل کے گلشن بنا لیں ذرا

جس شاعر کے یہاں غزل کے ایسے تہہ دار، پراثر اور تازہ کار اشعار پائے جاتے ہیں اس کی غزل گوئی اپنے اندر کتنی توانائی اور بھرپور امکانات رکھتی ہوگی کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟ غزل کے ڈکشن کو پوری طرح برتتے ہوئے انہوں نے جس طرح ہماری قلب و نظر کی دنیا میں تازہ ہوا اور نئی روشنی کا سامان فراہم کیا ہے اس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ جہاں تک ان کے قطعات کا تعلق ہے ان میں ابھی وہ دھار پیدا نہیں ہوئی ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں میں پائی جاتی ہے تاہم ان کے بعض قطعات میں آخری مصرع میں وار بھرپور ہے اور فنی اعتبار سے یہ پوری طرح کامیاب کہے جا سکتے ہیں مثلاً

صورت قاتل عیاں ہوتی نہیں
تیر میں لپٹی کماں ہوتی نہیں
قتل کی تفتیش کوئی کیا کرے
زخم کے منہ میں زباں ہوتی نہیں

کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ دلآویز اور خوبصورت ہے سرورق جاذب نظر ہے۔

کتاب: شرارِ جستجو (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
ناشر: ناہید عالم۔ کانکے بوریا روڈ۔ رانچی
قیمت: ۳۰ روپئے
مبصر: ڈاکٹر محمد متین

"شرارِ جستجو" قیصر ضحیٰ عالم کے ان تنقیدی اور علمی مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کے متعدد ادبی جرائد میں شائع ہو کر سنجیدہ قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انہیں کتابی شکل میں شائع کر کے انہوں نے زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں چار مضامین لسانی مسائل سے متعلق ہیں۔ "کچھ لسانیات کے متعلق" ایسا مضمون ہے جس میں نئے سماجی اور عمرانی علوم کی روشنی میں جدید لسانیات کے مضمرات اور اس کی اہمیت پر انہوں نے نہایت عالمانہ انداز میں بحث کی ہے۔ درس و تدریس میں لسانیات کا علم کتنا اہم اور بہتر رول ادا کر سکتا ہے اس مسئلہ پر انہوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ "اردو انگریزی ذو لسانی آمیزش" میں زبان کے فطری ارتقا کے قوانین اور اصول کی روشنی میں انگریزی الفاظ کے ہاتھوں سے اردو اور انگریزی کی مخلوط تراکیب، اور ذو لسانی تجربات کی حقیقت پسندی، فطری پن اور افادیت کا پتہ چلتا ہے۔ "انگریزی اخبارات میں دخیل ہندوستانی الفاظ" سے انگریزی زبان کے صحافیوں کی فراخدلی اور وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پھیلاؤ، وسعت اور مقبولیت کے بھید کھلتے نظر آتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے تنگ نظر صحافی اور ادیب اس میلان اور رجحانات سے سبق حاصل کر سکتے ہیں اور تسلیط کے گھروندے سے نکل سکتے ہیں۔ "مروجہ اور روزمرہ کے چند فقرے" میں مگدھی پر اودھی کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اس نوع کے مضامین کی کمی کے پیش نظر ان مضامین کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری پر ان کے فن کا اُس کے تہذیبی، سماجی اور فکری پس منظر میں بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کے فن کے فکری محرکات، کائناتی بصیرت، انسانی دوستی، فنی شعور اور اسلوب کے حسن اور رعنائی کا گہری نگاہ سے تجزیہ کر کے ان کی اصل عظمت کی بنیادوں کو تلاش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ ادب اور اخلاق کے ربط و تعلق کی نوعیت اور اہمیت پر انہوں نے "ادب اور اخلاقیات" "آرنلڈ کا مذہبی نقطہ نظر" اور "یزدان و اہرمن" میں مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب میں اخلاق کے ایک اعلیٰ تصور سے عظمت اور برگزیدگی پیدا ہوتی ہے۔ فراق پر ان کا مضمون تاثراتی ہے لیکن اس سے فراق کی شخصیت اور فن دونوں کی صحیح تصویر ابھرتی ہے۔ میں اسے ان کے اچھے اور کامیاب مضامین میں شمار کروں گا۔ ان سارے مضامین کے مطالعہ سے ان کے وسیع مطالعہ، متوازن نقطۂ نظر، تحلیل و تجزیہ کی صلاحیت، سنجیدہ ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ انہیں اپنی باتیں کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ ان کے اسلوب میں ادبی آب و رنگ کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جو کمی کھٹکتی ہے وہ نظریاتی مضامین کی کمی ہے جس سے ان کے تنقیدی نقطۂ نظر پر زیادہ بھرپور روشنی پڑ سکتی ہے۔ صرف عملی تنقید اور تاثراتی تنقید کے مضمون سے اصول و نظریات کے اخذ کرنے میں بعض نا گزیر غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ نقاد کا صحیح نقطۂ نظر اس کے نظریاتی مضامین کے ذریعہ واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ان سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنے تنقیدی انداز نظر کی وضاحت کے لئے آئندہ

بقیہ …

ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا گوشوارہ

مرتبہ ـــــ ڈاکٹر محمد مثنیٰ

سال ۱۹۷۸ء

شمارہ نمبر	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۹۱/۹۲	المیہ اور نقش آخر	شمیم افزا قمر	اشتیاق حسین قریشی کے ایک ڈرامہ "نقش آخر" کا تنقیدی مطالعہ
	افسانے	**فنکار**	
	پیاس	ریاض قاصدار	
	نظمیں	**شاعر**	
	اگر ازل سے یہی چلن ہے	وزیر آغا	
	اِذنِ سفر	نجم عثمانی	
	سبھی منتظر ہیں	″	
	غزلیں		
	غزل	سلطان اختر	
	″	طارق جامی	
	″	توصیف تبسم	
	″	محمود احمد اسیر	
	″	صفدر	
	″	ثاقب	
	متفرقات		
	خصوصی مطالعہ	ظہیر صدیقی	

نمبر شمارہ	متفرقات	مصنف	مضمون کا تعارف
	مباحثہ جدید شاعری ترتیب: نثار احمد صدیقی	شرکاء: محمود سعیدی ظہیر صدیقی، پرکاش فکری	نئی شاعری پر ایک مباحثہ ہے۔
	تبصرہ (کتاب)	مبصر	
	اوراق (افسانہ نمبر)	رام لعل نابھوی	
	دبستان آتش	کلام حیدری	
	جلوۂ نمو	"	
	نغموں کا سفر	"	
	راستہ وانا اجنبی	عشرت ظہیر	
۹۳/۹۴			
	۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے	نظام صدیقی	
	شیوۂ پیمبری اور شاعری	صفدر	
	افسانے	فنکار	
	خصوصی مطالعہ	م۔ ق۔ خان	
	غزلیں		
	غزل	فضا ابن فیضی	
	"	مظفر حنفی	
		جگن ناتھ آزاد	
	"	ظہیر غازی پوری	
		عشرت ظفر	
	متفرقات		
	تبصرہ (کتاب)	مبصر	
	ہندوستانی مشرقی افریقہ میں	رام لعل نابھوی	
	شعور	کلام حیدری	
	اوراق (جدید نظم نمبر)	عشرت ظہیر	
	سنگی دوپہر کا سپاہی	عشرت ظہیر	
۹۵/۹۶	جمیل مظہری ایک تنہا مسافر	سالک لکھنوی	جمیل مظہری کی شاعری کا تجزیہ
	اُن میں سے ایک — کلام حیدری	شمس آذر	کلام حیدری کے فن اور شخصیت پر ایک طائرانہ نظر

شمارہ نمبر	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
	میر کی مرثیہ نگاری	فریدہ بخاری	میر کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ
	ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ ایک نابینا عربی شاعر	شمس الحق شمسی	ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شاعری پر ایک نظر
	اقبال کی شاعری بچوں کے لئے	شکیل نوازش رعنا	بچوں کیلئے اقبال کی شعری تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ
	افسانے	**فنکار**	
	خانہ بدوش	عبد المتین	
	چہرہ	ساحل احمد	
	محور	نعیم اختر	
	سکھ کی نیند	مسلم سلیم	
	نظم	**شاعر**	
	پرندوں کے نام	شاہد میر	
	غزلیں		
	غزل	خلیل الرحمٰن اعظمی	
	"	ظہیر صدیقی	
	"	وکیل اختر	
	"	سلطان اختر	
	"	ظہیر غازی پوری	
	"	شاہد کلیم	
	"	حق اعظمی	
	"	رونق گیاوی	
	"	نصر حمید خلش	
	"	بدر نظیری	
	متفرقات		
	بیاد خلیل الرحمٰن اعظمی		
	نقش و تاثر	بہ نام نظر	
	تبصرہ (کتاب)	**مبصر**	
	افکار	کلام حیدری	
	کیا نام نہ ہوگا	"	

شمارہ نمبر	تبصرہ (کتاب)	مبصر	مضمون کا تعارف
	اقرار	کلام حیدری	
	الفاظ کا سفر	"	
	یاران شہر	عشرت ظہیر	
	شب آشنا	"	
۹۷/۹۸			
	نئی غزل کا ایک اور مطالعہ	نظام صدیقی	نئی غزل کا مطالعہ
	شاعر کی موت	ڈاکٹر قمر خاتون	مصطفیٰ زیدی کے فن کا مطالعہ
	تمثیل کا مفہوم اور سب رس	عبدالمنان	سب رس کا مختصر تجزیہ
	ڈاکٹر عبدالرؤف بحیثیت مترجم	محمد بدرالدین	
	افسانے	**فنکار**	
	ڈاکٹر	کنور سین	
	کھوئے ہوئے راستوں کی شب	حمید سہروردی	
	کہانی سنو گے	کلام حیدری	
	نظمیں	**شاعر**	
	سفر زادوں کے نام	سلطان اختر	
	دودھ کا عذاب	ساحل احمد	
	ساگر منتھن		
	غزل	سالک لکھنوی	
	"	فضا ابن فیضی	
	"	مظہر امام	
	"	ظہیر غازیپوری	
	"	جمیل ظہیر	
	گیت	رونق گیاوی	
	ڈرامہ		
	صوری تخلیق۔ اصور خالق	تق اعظمی	
	تبصرہ (کتاب)	**مبصر**	
	بشارت	کلام حیدری	

شمارہ نمبر	تبصرہ (کتاب)	مبصر	مضمون کا تعارف
	مراٹھی کا مطالعہ	کلام حیدری	
	۱۹۷۷ کا شعری ادب	//	
	معیار، دوسرا شمارہ	//	
۹۹/۱۰	**مضامین**	**مصنف**	
	ایک شعر	احمد یوسف	مظہر امام کے ایک شعر کا تنقیدی تجزیہ
	افسانے	**فنکار**	
	روم نمبر ۲۸	عوض سعید	
	نیند	ہرچرن چاولہ	
	ہزاروں خواہشیں ایسی	نظام صدیقی ق	
	باولا	بی اے کلکرنی / سلام بن رزاق	
	نوحہ گر	کے کے کھلر / مجاہد علی	
	نظمیں	**شاعر**	
	نظم	فیض احمد فیض	
	عرفان	مخمور سعیدی	
	جدائی کی پیاس کا آخری سفر	ریاض مجید	
	نظمیں	سید احمد شمیم	
	داغ سورج کے چہرے کا	عتیق اعظمی	
	ٹھنڈی ٹھنڈی سوچ	//	
	غزلیں		
	غزل	پریتم وار برتی	
	//	صدیق نجیبی	
	//	حسن آرزو	
	//	بدنام نظر	
	//	شمیم [illegible]	
	//	شا[illegible]	
	//	سعد نسیم ہاشمی	
	//	شام رضوی	

شمارہ نمبر	غزل	شاعر	مضمون کا تعارف
		چندر بھان خیال	
	متفرقات		
	مباحثہ مختصر افسانہ اور اس کی تنقید	شرکاء: جوگندر پال، شہاب جعفری اور دوسرے	
	رائٹرز نوٹ بک	جوگندر پال	
	تبصرہ	**مبصر**	
	تصورات عشق و خرد	کلام حیدری	
۱۰۱			
	جدید نظم ۔ پاکستان میں	انور سدید	پاکستان میں جدید نظم کے ارتقا کا ایک مختصر مطالعہ
	پرواز غبار ۔ ایک تنقیدی جائزہ	ظہیر صدیقی	حکیم غبار بھٹی کے کلام کا تنقیدی جائزہ
	پاکستانی ادب — دائرے اور گھسان	طارق جامی	پاکستان میں ادبی سرگرمیوں اور ان سے متعلق حلقوں کا جائزہ
	غالب کی شاعری میں نسائیت	طارق سعید	غالب کی شاعری میں نسائیت کی تلاش
	افسانے	**فنکار**	
	پتنگ	م ۔ ق ۔ خان	
	ہڈیوں کا ٹینگر	احمد اسرار	
	ندائے کوہ	ستیش چندر / جاوید اقبال	
	نظمیں	**شاعر**	
	اے میرے شہر	شرون کمار ورما	
	نالۂ نہور	شاہ مقبول احمد	
	کافور کی انگلیاں / سوچ کا بوجھ	صفدر	
	خون کا رشتہ	اعجاز اعظمی	
	سلیٹ، سوال	آمنہ ابوالحسن	
	غزلیں		
	غزل	مظفر حنفی	
	"	عبدالرحیم نشتر	
	"	رؤف خیر	

شمارہ نمبر	غزلیں	شاعر	مضمون کا تعارف
	غزل	مختار شمیم	
	"	ساحل احمد	
	"	احتشام اختر	
	"	جعفر عسکری	
	تبصرہ	**مبصر**	
	سمور (جون، اگست ۸۰ء)	سلام حیدری	
	معنی کی تلاش	"	
۱۰۲	**مضامین**	**مصنف**	
	نئی کہانی کا سفر	ڈاکٹر سید محمد عقیل	نئی کہانی کی سمت کا مختصر تجزیہ
	علم نجوم کی مختلف شاخیں اور ہمارے شعراء	ڈاکٹر حسن آرزو	اردو شاعروں کے علم نجوم سے شغف کی کہانی
	اقبال اور آئن اسٹائن	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	اقبال کی شاعری پر آئن اسٹائن کے نظریات کا اثر
	افسانے	**نگار**	
	پل صراط	اقبال متین	
	بھوت پریت	جوگندر پال	
	بھیوت لنگم	کنور سین	
		علی امام	
	امن میں گڑے ہو پاؤں	اختر واصف	
	نظمیں	**شاعر**	
	سمندر کتنا گہرا ہے	بہ نام نظر	
	ٹھٹھرتے لمحوں کی نظم - ۲	شاہد کلیم	
	مقبرے پر تنہا ستارہ، ایک کتبہ	مظہر نوری	
	۵ نظمیں	سلیم شہزاد	
	غزلیں		
	غزل	عشرت الاکرام	
	"	شمیم فاروقی	
	"	[illegible]	

مضمون کا تعارف	شاعر	غزلیں	نمبر شمارہ
	مصور سبزواری	غزل	
	محسن بھوپالی	"	
	فاروق شفق	"	
	شمیم رسول	"	
	رونق گیاوی	نعت	
	مبصر	تبصرہ (کتاب)	
	رام لعل نابھوی	راستے کی دھول	
	عشرت ظہیر	نوابی دربار	

مطبوعات دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا

زاویہ نگاہ	ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی	۲۵ روپیے
نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	مہدی جعفر	۳۰ روپیے
تفہیمات	کلام حیدری	۲۰ روپیے
روشنائی کی کشتیاں	احمد یوسف	۱۵ روپیے
ارتقا	مرتبہ: کلام حیدری	۱۵ روپیے
یہ لوگ (خاکے)	ڈاکٹر محمد محسن	۱۸ روپیے
شعلے بھڑک اٹھے (ڈرامہ)	شارا حمد صدیقی	۸ روپیے
پڑاؤ	غیاث احمد گدی	۲۰ روپیے
عکس (انٹرویو کا مجموعہ)	شارا حمد صدیقی	۱۰ روپیے

احتشام حسین نمبر (آہنگ)	مرتبہ: کلام حیدری	۲۵ روپیے
اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	۳۰ روپیے
بابا لوگ	غیاث احمد گدی	۱۵ روپیے
الف لام میم	کلام حیدری	۱۵ روپیے
پس دیوار	عبد الصمد	۲۰ روپیے
گولڈن جوبلی	کلام حیدری	۲۰ روپیے
رگ سنگ	بدر اورنگ آبادی	۱۵ روپیے
افکار رفتہ	بدر اورنگ آبادی	۸ روپیے
فکشن نمبر (آہنگ)	مرتبہ: کلام حیدری	۳۵ روپیے

ملنے کا پتہ

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا ۔ بہ

AAHANG - URDU MONTHLY - AUG - 1984

آزادی — ایک نعمت — ایک موقع

۳۷ سال قبل ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑدی تھیں اور ہم آزاد ممالک کی صف میں شامل ہو گئے تھے

تب سے ہم نے زندگی کے تمام میدانوں میں [illegible] کی سمت ترقی کی

- آج ہمارے کسان قوم کی ضرورت کے لئے کافی اناج پیدا کرتے ہیں۔
- صنعتی پیداوار میں ہم نے دنیا کے تمام ملکوں میں ایک قابل فخر مقام حاصل کر لیا ہے۔

نیا بیس نکاتی پروگرام ہماری مسلسل عملی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے تاکہ سب کو سماجی اور اقتصادی انصاف مل سکے۔

صرف ایسے نشانے پر کاربند رہ کر ہم اندرونی اور بیرونی طاقتوں کے خلاف اپنی آزادی اور ملکی سالمیت کا تحفظ اور دفاع کر سکتے ہیں

آئیے۔ آزادی کے 38 ویں سال میں داخل ہوتے ہوئے ہم سخت محنت اور لگن سے کام کرنے کا عہد کریں۔ تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔



R.N. Regd. 4253/64
P.T. Regd. No. Gy 5/84
Volume—432

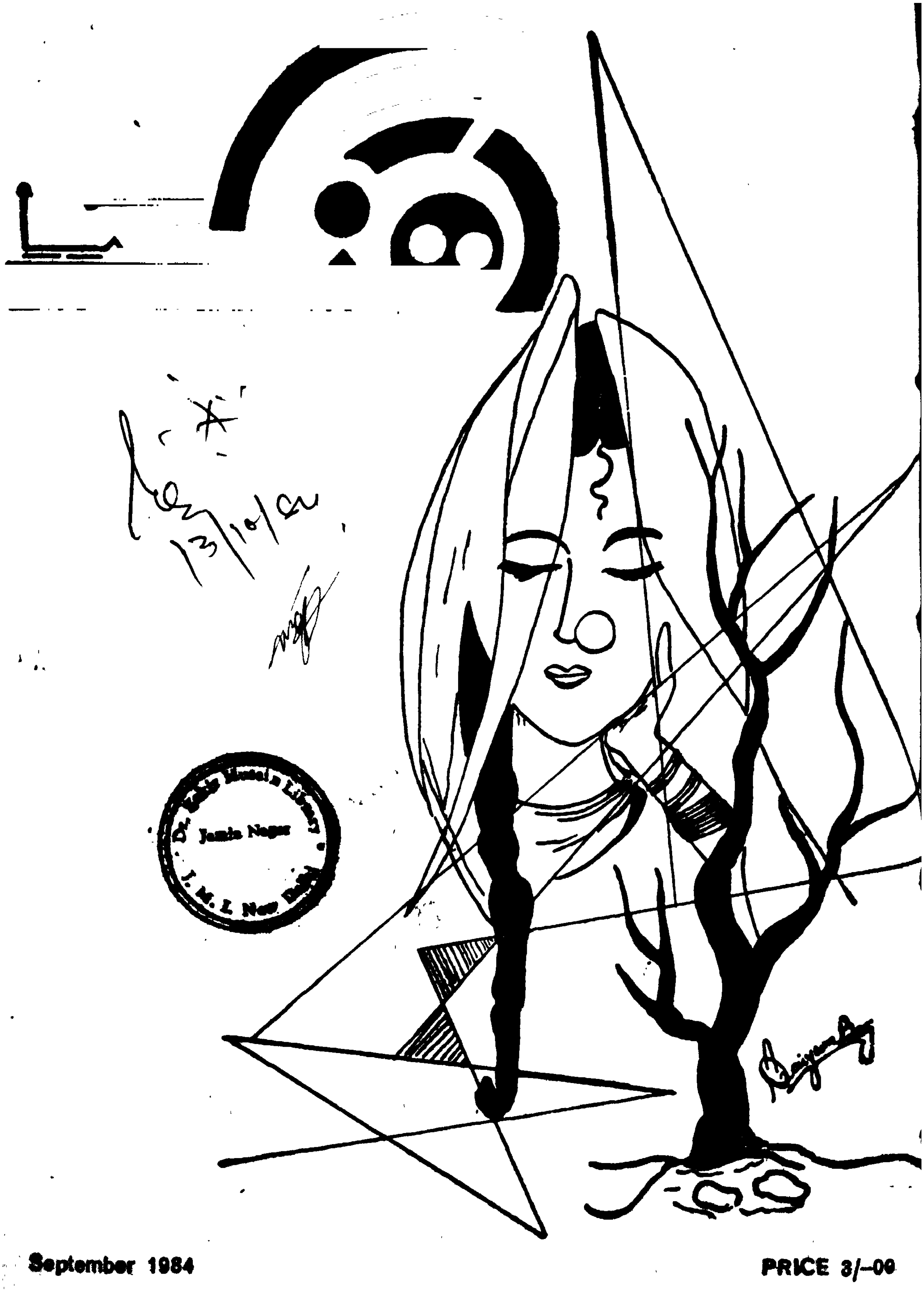
THE **Aahang** Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

ـ تنقیدی مضامین ـ

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-

The Cultural Academy, (Regd.) Gaya



September 1984

PRICE 3/-00



دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے	چھتیس روپئے
ایک شمارہ	تین روپئے

فون نمبر ۲۳۲۴

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبدالصمد

دی کلچرل اکیڈمی گیا کی تمام مطبوعات (کتابیں، رسائل، پمفلٹ) میں شائع ہونے والی ادبی و نیم ادبی تخلیقات میں نام، مقام، واقعات، ادارے اور کردار ساری چیزیں سو فیصد فرضی ہوتی ہیں۔ حقیقی افراد، مقام واقعات اداروں اور کردار سے اس کی مماثلت یا مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔ جس کے لئے کلچرل اکیڈمی کے کسی فرد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر، اراکین، معاون، کارکن یا مصنف پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ——— ادارہ

• کتابت: سید عبدالاحد گیاوی •

محتویات

★

a

اداریہ

کشکول

پاکستانی ادب کا انتخاب پانچ جلدوں میں آچکا ہے، جب ایک نئی جلد ہمارے پاس آتی ہے تو پاکستانی ادیبوں اور شاعروں اور نقادوں کے لئے 'مرحبا' کہنا پڑتا ہے۔ جس لگن اور محنت سے پاکستانی اردو ادبا اردو کو دنیا کی زبانوں کے ادب کے مقابلے پر لا رہے ہیں وہ ہمارے لئے لائق تقلید بھی ہے اور قابل رشک بھی۔

اردو انٹرنیشنل کے کئی شمارے ٹورنٹو سے موصول ہوئے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اردو اپنی جنم بھومی میں چاہے اجنبی ہوتی جا رہی ہو مگر وہ بین الاقوامی حیثیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ اردو انٹرنیشنل کا معیار ادب اور معیار پیش کش دونوں ہمارے لئے باعث تقویت ہے۔

ہم ان کوششوں کی کامیابیوں اور ان کامیابیوں کے عروج کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

اردو برادری کی کوئی سرحد نہیں ہے، اردو سیاسی مصلحتوں کی اسیر نہیں ہے، اور وہ جغرافیائی حد بندیوں سے بلند ہے۔ اور یہ افتخار اردو کے علاوہ ہندوستان کی کسی زبان کو میسر نہیں ہے۔

اردو کے جیالے اور روشن دماغ اور محنتی ادبا اور شعرا اور نقاد اور قارئین کو ہم سلام کرتے ہیں اور جو چھوٹا سا دیا کلچرل اکیڈمی نے جلا رکھا ہے اس کو تاحیات اپنا خون جلا کر بھی روشن رکھیں گے۔

ہماری اردو برادری دنیا کے جس کونے میں بھی ہو اس انتہائی مخالف حالات میں ہماری باتوں کو یاد رکھے ـــــ یہی ہمارے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔

ـــــــــــــ غلام حیدری

باخبر

(اس عنوان کے تحت پیش کیے گئے افکار 'باخبر' کی آزادیِ تحریر کا ثبوت ہے جو ہم مہیا کرتے ہیں۔ اتنا ہم پوری ذمہ داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ادبی رسالے میں ایسے سیاسی اور نیم سیاسی مطالعوں کا پیش کرنا کارآمد ہے —— کلام حیدری)

آس پاس

فریبِ پیہم

ہندوستان میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو موت اور زندگی کے بارے میں عام ڈگر سے ہٹ کر ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ انہیں مذہب کی طرح عزیز ہے اور اس کو وہ کسی قیمت پر چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ اس پر ان کی ساری زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس کے بارے میں ایک دو نہیں، ہزاروں افراد یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ مرے نہیں، زندہ ہیں۔ ہندوستان میں ہی اور کسی مناسب موقع پر سامنے آجائیں گے۔ آزادی سے کئی سال قبل نیتا جی کی موت ایک ہوائی حادثے میں ہوگئی تھی۔ آزاد ہندوستان کی حکومت نے اس کی تحقیق کے لئے ایک اعلیٰ کمیشن کی تقرری کی جس نے بہت ہی چھان بین کے بعد حکومت کو اپنی رپورٹ دے دی جس میں نیتا جی کی موت کی تصدیق کر دی۔ پھر بھی گاہے گاہے یہ سوال اٹھتا رہا۔ جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں تو شری سمر گوہا جیسے لیڈر نے ایسی فضا بنا دی تھی کہ لگتا تھا اب نیتا جی کا ظہور ہو جائے گا۔ پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ ابھی اس نمائندے کو ایک سفر میں ایک دلچسپ شخصیت کی ہم سفری کا موقع میسر آیا —— کیپٹن چوپڑہ، جو نیتا جی کے نام کی ایک انجمن کے سکریٹری ہیں۔ انہیں کے بیان کے مطابق وہ دوسری جنگ عظیم میں جرمن کے مورچے پر موجود تھے۔ ان کی عمر چوراسی سال ہے۔ دیکھنے میں بہت ہی چاق و چوبند ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہی نہیں، ایمان ہے کہ نیتا جی زندہ ہیں اور انہیں ان کے مقام کی واقفیت ہے لیکن مصلحتوں کے پیش نظر وہ اس بات کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے سبھی وزرائے اعظم اور بڑے لیڈروں کو نیتا جی کی موجودگی کی خبر رہی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا جب ۱۹۶۴ء میں انتقال ہوا تو ان کی لاش کو آگ دینے والوں [illegible] جی [illegible] کوشش

نرائن کا انتقال ہوا تو ان کی آخری رسومات میں بھی نیتا جی بہ نفس نفیس موجود تھے اور یہ کہ بہت سے لوگوں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ کیپٹن چوپڑہ نے یہ انکشاف بھی کیا کہ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے موقع پر نیتا جی مکتی باہنی کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس نمائندے کو نیتا جی کی بہت سی حالیہ تصاویر بھی دکھائیں جن میں نیتا جی لمبی داڑھی رکھے ہوئے سادھو جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ دریافت کرنے پر کیپٹن چوپڑہ نے بتایا کہ چونکہ برطانوی حکومت نے انہیں جنگی مجرم واضح کر رکھا ہے اس لئے نیتا جی سامنے نہیں آتے کہ حکومت ہند کا حکومت برطانیہ سے یہ خفیہ معاہدہ ہے کہ وہ تمام جنگی مجرموں کو بشمول نیتا جی، برطانوی حکومت کے حوالہ کر دے گی۔ کیپٹن چوپڑہ نے اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں جن کا ذکر مناسب مواقع پر کیا جائے گا۔ لیکن اس موقع پر اردو کے ایک بہت بڑے شاعر علامہ جمیل مظہری کے مشہور شعر کا ایک مصرعہ بے ساختہ یاد آتا ہے ـــــ

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ادھر حال ہی میں سنت جرنیل سنگھ بھنڈران والے کو سکھ قوم میں شہید کا درجہ حاصل ہوا ہے تو سکھوں میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا ہے کہ بھنڈران والے زندہ ہیں اور کسی مناسب موقع پر سامنے آئیں گے۔ وہ فوج اور سرکار کے اس بیان کو ماننے کو تیار نہیں کہ ان کی موت ہو چکی ہے اور ان کی آخری رسومات ادا کی جا چکی ہیں۔ یہاں تک کہ بھنڈران والے کے سگے بھائی نے بھی ان کی موت کی تصدیق کیا ہے جو فوج میں صوبیدار ہیں اور گولڈن ٹمپل کے اندر جانے والی فوج میں شامل تھے۔ مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں پر

مکمل سیاسی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اور کسی کے کہنے سننے سے اتنی آسانی سے اس میں تبدیلی نہیں لائی جاتی۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستانی سیاست میں ایک جامع معاشی لائحہ عمل تیار کرنے کی بجائے اس قسم کی باتوں کو اہمیت دی جاتی ہے اور عوام کے معصوم جذبات سے کھیلنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔

ذخیرہ رکھنا چاہئے

کئی سالوں کی خشک سالی کے بعد اس وقت بہار میں بارش کا بول بالا ہے۔ دو مہینہ قبل جب سے مانسون کی آمد ہوئی ہے، کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا جب یہاں کے تقریباً سبھی حصوں میں زوردار بارش نہیں ہوئی ہو۔ ایک درجن سے زیادہ ضلع سیلاب کے لپیٹ میں ہے اور لاکھوں افراد اس سے متاثر ہو چکے ہیں۔ کٹیہار میں تو ضلع کے اڈیشنل کلکٹر تک پانی کی نذر ہو گئے۔ سرکار ریلیف کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ یہ ہنگامہ زیادہ سے زیادہ برسات کے قیام تک باقی رہے گا۔ اس کے بعد [illegible] بھی بھول جائیں گے اور [illegible] گی اور اگر خدانخواستہ اگلے سال خا[illegible] ہوئی تو پھر لوگ خشک سالی کے [illegible] ریلیف کا نام سننے میں آئے گا [illegible] نہیں آئے گا کہ یہ [illegible] حد قیمتی پا[illegible] ہو جاتا ہے، اس کو کسی طرح بھی جمع [illegible] کیا جائے۔ برسہا برس سے سنتے آئے ہیں کہ روس امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں پانی کا ذخیرہ رکھنے کا بے حد مناسب انتظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارش ہو یا نہ ہو، انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ [illegible]

یہ ہے کہ سڑکوں پر جو سرکاری نل لگے ہوئے ہیں، ان میں نوے فی صد ایسے ہیں جنہیں بند کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ جب ان میں پانی آنے کا وقت آتا ہے تو دن بھر پانی بہتا رہتا ہے اور ضائع ہوتا ہے۔ سرکاری افسروں کی گاڑیاں سینکڑوں بار گزرتی ہیں لیکن کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ کہیں کہیں تو یہ حالت ہے کہ نالیوں سے پانی کے جو نل گزرتے ہیں وہ ٹوٹے ہوئے ہیں اور نالیوں کا گندہ پانی ان میں مل کر کیا کیا بیماریاں پھیلا رہا ہے، اس سے ارباب اختیار ناواقف نہیں ہیں۔ یہ الگ بات کہ جان بوجھ کر انجان بنے ہیں۔

ضرورت ہے

بہار کے وزیر اعلیٰ چندر شیکھر سنگھ قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنا ایک وعدہ بہ شرط تاریخ پورا کر دکھایا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جولائی میں پٹنہ میں اردو بھون کی بنیاد رکھ دیں گے ــ سو انہوں نے رکھ دیا۔ اس کی تعمیر کے لئے ایک خطیر رقم بھی دی، شہر پٹنہ کے قلب میں ایک بیش قیمت زمین کا حصہ بھی دیا تھا، اس علاقے میں خدا بخش لائبریری، گورمنٹ اردو لائبریری کی عمارتیں بھی ہیں، تیسری عمارت اردو بھون کی ہو جائے گی، اس طرح وہ پورا علاقہ اردو حلقہ سمجھا جائے گا۔ بہار میں قبل ہی سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جا چکا ہے۔ سینکڑوں اردو مترجموں کی بحالی ہو چکی ہے۔ بہار اردو اکیڈمی اور انجمن ترقی اردو بہار کے دفاتر کے لئے جگہ اور عمارت کی منظوری

دینا کانگریس حکومت کی فراخدلی کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ لیکن اقلیت کے لئے سب سے اہم مسئلہ روزی روٹی کا ہے۔ الیکشن کی آمد آمد ہے۔ ہم سرکار سے یہ جاننا چاہیں گے کہ اس نے اس مسئلے کے حل کے لئے اب تک کیا کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں اقلیتی تعلیمی ادارے ہیں لیکن ان میں کام کرنے والے معلموں کی وقت پر تنخواہ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔ پوری ریاست میں آدھے درجن کے لگ بھگ اقلیتی کالج ہیں۔ ان میں منظور شدہ جگہوں پر کام کرنے والے معلموں کو سرکاری فنڈ سے تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن گرانٹ کی منظوری دو سال، تین سال پر ایک بار ہوتی ہے۔ یہ کھلی ہوئی ناانصافی اور تفریق ہے۔ برسہا برس سے مانگ کی جا رہی ہے کہ سرکار جو گرانٹ دو سال، تین سال پر دیتی ہے، اسے ہر مہینے دے دیا کرے تاکہ ان اداروں میں کام کرنے والے معلموں کی روٹی دال کا مسئلہ حل ہو سکے۔ لیکن اس میں کون سی مصلحت ہے کہ سرکار دم سادھے بیٹھی ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اقلیتی فرقہ کے افراد کمر باندھ کر اٹھ کھڑے ہوں۔ الیکشن کے موقع پر جو چاہیں منظور کرا لیں۔ پھر پانچ سالوں تک کوئی ان کی بات بھی نہ سنے گا ـــــ

★

ڈاکٹر ابو محمد سحر

دو چشمی ھے

ہندوستانی زبانوں کی مخصوص آوازوں کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے جو حروف اردو حروف تہجی میں موجود ہیں ان میں ہائے مخلوط یا دو چشمی ھے ایک خاص حرف ہے۔ ابتدا میں یہ حرف ہائے ہوز یا ہائے مدوّرہ کی ایک متبادل شکل کے طور پر اختیار کر لیا گیا تھا۔ عربی اور فارسی میں ہائے مدوّرہ اور ہائے دو چشمی میں صرف صدری اختلاف ہے، صورت میں کوئی فرق نہیں [illegible] دو میں رفتہ رفتہ دو چشمی ھے کو ہائیہ (ہکار) آوازوں کی نمائندگی کے لئے استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوا، یہاں تک کہ اب ایک عرصے سے متفقہ طور پر اس کا یہی مقصد سمجھا جاتا ہے۔

یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اردو رسم الخط میں ہائیت (ہ[illegible]) کو استعمال کرنے کا خیال سب سے پہلے کب پیدا ہوا۔ پروفیسر سید محمد سلیم کے مطابق [illegible] سب سے پہلے اس کا اہتمام ۱۸۳۳ء میں کیا گیا۔

> "سب سے پہلے اس کا اہتمام نواب محمد فخر الدین حیدر آبادی نے سبعۂ شمسیہ کی طباعت کے موقع پر ۱۸۳۳ء میں کیا۔ پھر مولوی سید عبد اللہ بن بہادر علی نے شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمہ قرآن مجید میں یہ اہتمام کیا جو ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں مطبع احمدی، کلکتہ سے طبع ہوا۔" [۱]

غالباً انیسویں صدی کے وسط تک یا اس کے کچھ ہی بعد یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ ہائیہ آوازوں

---

[۱] اردو رسم الخط از پروفیسر سید محمد سلیم، کراچی، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۳۔ اس کتاب میں عیسوی سنہ ۱۸۳۸ء کے بجائے [illegible] درج ہے۔ چونکہ ۱۲۵۴ھ مطابق ہے ۱۸۳۸ء کے اس لئے تصحیح کر دی گئی ہے۔

کے الفاظ میں متعلقہ حروف کو دوچشمی ہے کے اشتراک سے لکھنا چاہئے تاکہ اس میں اور ہائے ملفوظ میں امتیاز کیا جا سکے اور تلفظ کی صحیح ترجمانی ہو سکے۔ چنانچہ اردو کے قاعدوں میں متعلقہ حروف کے ساتھ دوچشمی ہے کی تقطیع الگ سے شامل کی جانے لگی تھی۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے قاعدے میں یہ تقطیع ہائے مدوّرہ کے بعد اکیسویں نمبر پر ہے اور اس میں مندرجہ ذیل اندراج ملتا ہے۔

بھ ، پھ ، تھ ، ٹھ ، جھ ، چھ ، دھ ، ڈھ ، ڑھ ، کھ ، گھ

دوسرے پیش نظر حالیہ قاعدوں میں سے چار قاعدوں میں لھ ، مھ اور نھ کا اضافہ کیا گیا ہے ، حالانکہ ڑھ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان قاعدوں میں ان کی تقطیعاں الگ کی گئی ہیں۔ صرف دو قاعدوں میں ان کو حروف تہجی کے معاً بعد درج کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک قاعدے میں دس کو لیا گیا ہے اور دوسرے میں تیرہ کو۔ اکثر قاعدوں میں پہلے ان کو بغیر کسی اعراب کے لکھا گیا ہے۔ اعراب کی مشق بعد میں درج کی گئی ہے، صرف ایک قاعدے میں انھیں بغیر اعراب کے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ زبر، زیر اور پیش کی مشق لکھی گئی ہے۔

ان قاعدوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوحرفوں کے ان مجموعوں کو حروف تہجی میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ان کی ترتیب ہندی کے بجائے اردو حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے۔ تاہم صورت میں عموماً ان پر کوئی اعراب نہیں ملتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حروف تہجی کے نام ہیں مثلاً الف ، بے ، پے ، تے وغیرہ جبکہ دوحروف کے ان مجموعوں کا کوئی نام یا تلفظ نہیں ہے۔ ہندی کے طرز پر ان کو پڑھنے کا طریقہ اردو کا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کو اور دیگر ہائیوں کو اردو کے سادہ حروف کے بعد اپنے اپنے مقام پر حروف تہجی میں شامل کیا جاتا تو سادہ حروف کے طرز پر ان کا تلفظ اس طرح متعین کیا جا سکتا تھا۔

بھے ، پھے ، تھے ، ٹھے ، جھیم ، چھے ، دھال ، ڈھال ، رھے ، ڑھے ، کھاف
گھاف ، لھام ، مھیم ، نھون ، وھاؤ ، یھے

اس طرح کم سے کم تلفظ کی حد تک ان کو مفرد حروف کا درجہ مل جاتا لیکن ایک تو حروف تہجی کی تعداد بڑھ جاتی، دوسرے سادہ حروف کے ساتھ دوچشمی ہے کا اشتراک برقرار رہتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہائیہ آوازیں بدستور دوحروف کا مجموعہ رہتیں اور ایک حرف کی شکل نہ پیدا ہوتی۔ اردو میں چونکہ یہ ایک حرف نہیں ہیں اس لئے ان کو کوئی نام نہیں دیا گیا۔

اردو رسم الخط میں ہائیہ آوازیں [illegible] حروف سے مل کر ظاہر ہوتی ہیں۔ اصطلاحاً دو حروف کے یہ مرکبات دوحرفے (Digraphs) ہیں۔ دوچشمی [illegible] ہائے مدوّرہ کی [illegible] آواز ہے۔ لیکن اپنی صورتی امتیاز کی بنا پر مخصوص حروف سے مل کر ہائیہ [illegible] کو جنم دیتی ہے۔ اردو حروف تہجی میں دوچشمی ہے کا یہی اصل مصرف ہے۔

اردو میں دوحرفوں کے ان مجموعوں [illegible] دیتے ہیں۔ کسی لفظ یا اصطلاح کی [illegible] میں ان کو صحیح طور پر [illegible] ہائیوں کے لئے مختلف حروف

گیا

ہجّی میں مفرد حروف کی موجودگی بھی اس غلط فہمی کا باعث ہوئی ہے کہ یہ مفرد حروف ہیں۔ اس سے کہیں کہیں حروف ہجّی کی ترتیب کے متاثر ہونے کا بھی اندیشہ پیدا ہوا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کی ابتدائی تین جلدوں تک ان کو مروجہ ترتیب کے مطابق درج کیا گیا ہے مثلاً الہام کے بعد الھڑ، بہار کے بعد بھاری، ڈویژن کے بعد ڈھایا، کہا کے بعد کھات وغیرہ، چوتھی اور آخری جلد میں بھی گ کے بعد گھات درج کیا گیا ہے۔ لیکن ناپ کے بعد نابھ، ناتا کے بعد ناتھ اور لاکٹ کے بعد لاکھ ملتا ہے۔ دور حاضر کے بعد اہل قلم نے لغت میں ان کے الگ الگ ابواب قائم کرنے کا مشورہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کو دو حروف کا مجموعہ سمجھنا غلط ہے، حالانکہ دو چیز اتنی کھلی ہوئی ہے اس کو غلط سمجھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ زبان اور علم زبان سے رکھنے والوں کے علاوہ اہل لسانیات نے اس غلط فہمی کو تقویت پہنچانے میں خاص طور سے حصہ لیا ہے۔

کسی زبان کے حروف عموماً اس کے مختلف آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ان میں ایک ہی آواز کے لئے ایک سے زائد حروف پائے جاتے ہیں اور یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ ایک مفرد آواز دو حرفوں کے ذریعے سے ادا کی جاتی ہے۔ اردو کے بعض اہل لسانیات اردو میں ہم صوت حروف کی موجودگی کے بہت شاکی ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ہر منفرد آواز کی ترجمانی کے لئے ایک مفرد حروف کا وجود ضروری سمجھتے ہیں۔ اردو رسم الخط میں ہائیہ آوازوں کی ادائیگی کے جائزے میں ان کے یہاں یہ غلط فہمی دیکھنے میں آتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں رقم طراز ہیں:-

"وہ (اردو کا طالب علم) گھر، بھر، تھر، جھڑ وغیرہ الفاظ میں /گھ/ کو گ اور ھ /بھ/ کو ب اور ھ اور /تھ/ کو ت اور ھ سے مرکب آوازیں سمجھتا ہے۔ حالانکہ صوتی نقطہ نظر سے یہ منفرد آوازیں ہیں نہ کہ مرکب۔ ... اردو کے استاد بچے کو ہمیشہ گ ھ ر (زبر) گھر اور ب ھ ر (زبر) بھر پڑھاتے ... اور پڑھاتے رہیں گے۔"[1]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ... ہیں:-

"اردو کی ابتدائی قاعدوں میں جھ، کھ وغیرہ ہکار آوازوں کو سادہ آوازوں پر ہائے دوچشمی کے اضافے کی حیثیت سے سمجھا جاتا اور پڑھایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کا طالب علم ڈھال، کھال وغیرہ الفاظ کو چار آوازوں یعنی ڈ ھ ا اور ل یا ک ھ ا اور ل کا مجموعہ سمجھتا ہے جو غلط ہے۔ ڈھال میں /ڈھ/ اور کھال میں /کھ/ دو آوازوں سے مرکب نہیں بلکہ /ڈھ/ اور /کھ/

---

[1] اردو صوتیات کا خاکہ از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، بحوالہ اردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ۱۹۷۱ء ص ۶۸۔
آگے چل کر یہی بات اردو رسم الخط کی کم مائیگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دہرائی ہے (ص ۹)۔ ایک اور مضمون "اردو حروف ہجّی کی صوتیاتی ترتیب" میں لکھا ہے کہ "یہ سہل پسندی اس صوتیاتی مغالطے کا باعث بن گئی ہے کہ ڈھ مرکب ہے (ڈ + ھ) سے جب کہ ڈھ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے ایک مفرد آواز ہے۔" دیکھئے اردو زبان اور ادب از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ۱۹۷۴ء ص ۱۷۴

منفرد آوازیں ہیں۔ [1]

مجھے اس خیال سے اختلاف نہیں کہ ہائیہ آوازیں منفرد ہیں۔ تاہم خود ایک اہل لسانیات کو اس سے اختلاف ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں

"یہ درست ہے کہ ہائیہ آوازوں میں وقفیہ کے ساتھ "ہ" شیر و شکر ہوگئی ہے کہ پوری آواز ایک ہی کوشش اور ایک جھٹکے میں ادا ہوتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ ہائیہ آوازیں مفرد یا بسیط ہیں "ہ" کے شیر و شکر ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ ہم ان آوازوں کو مخلوط اور بمنزلہ مفرد قرار دے سکتے ہیں۔ [2]

ایک دوسرے مضمون میں انھوں نے پھر لکھا ہے :

"صوتیات کے رو سے ہائیہ آوازیں مفرد نہیں مخلوط (Complex) ہیں جن میں "ہ" وقفیہ سے گھل مل کر ایک جان ہوگئی ہے۔" [3]

لیکن یہ فنی قسم کا اختلاف ہے۔ اس قسم کے اختلافات اہل لسانیات میں قدم قدم پہ پائے جاتے ہیں حالانکہ وہ لسانیات کو ایک نہایت سائنٹیفک علم کہتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ہائیوں کو مفرد آوازیں نہ ماننے کے باوجود ڈاکٹر شوکت سبزواری ان کے ہجے اسی طریقہ کو صحیح کہتے ہیں جو ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے پیش نظر ہے۔

"گھر کا صحیح اور حکمیاتی تجزیہ 'گھ + ر' اور بھر کا بھ + ر ہے اور ان کے ہجے گ ر ھ زبر گھر نہیں بلکہ گھ ر زبر گھر ہیں۔" [4]

یہ محض ایک مفروضہ ہے کہ اردو کا طالب علم یا استاد ہائیہ آوازوں کو دو آوازوں سے مرکب سمجھتا ہے۔ اسے ان آوازوں کو دو حرفوں سے مرکب سمجھنا چاہیے۔ دو آوازوں سے مرکب سمجھنا بے خبری کی وجہ سے ہو سکتا ہے جو کسی اصولی بحث میں قابل اعتنا نہیں۔ لفظ گھر کا تجزیہ انشا نے بہت پہلے اس طرح کیا ہے۔

"مانند کاف و ہائے گھر بمعنی خانہ در ہندی کہ در کتابت سہ حرف است و در تلفظ دو۔" [5]

یعنی گھر میں کتابت میں تین حرف ہیں اور تلفظ میں دو۔ واضح رہے کہ الفاظ کے ہجے میں حروف مکتوبی کا لحاظ رکھا جاتا ہے صرف تلفظ کا نہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اختلاف رائے سے قطع نظر کر کے ہائیہ آوازیں مفرد ہیں۔ ان کو مرکب

---

[1] اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، طبع دوم ۱۹۶۴ء، ص ۳۶

[2] اردو لسانیات از ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۹۷۵ء، ص ۴۷

[3] اردو لسانیات، ص ۳۸

[4] اردو لسانیات، ص ۳۸

[5] دریائے لطافت، ص ۹ بحوالہ اردو لسانیات، ص ۶۸

یں سمجھنا غلط ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ اردو میں یہ دو حرفوں سے مل کر تحریر میں آتی ہیں۔ ان کو جب مرکب
ے یا کہتے ہیں تو یہی تحریری شکل مراد ہوتی ہے۔ یہ تحریری شکل دو حرفوں کا مجموعہ ہے۔ اس کو ایک حرف
نا اسی طرح کی غلطی ہے جس طرح ہائیہ آوازوں کو مرکب سمجھنا۔ اہل لسانیات کو مایوسی ہوگی، لیکن اس
ی میں گھر، بھر، جھر اور ڈھال، کھال وغیرہ کے پڑھانے یا ہجے کا وہی طریقہ درست قرار پاتا ہے جو مکتبوں
قاعدوں میں رائج ہے۔ گھر، بھر، جھر میں آوازیں دو ہیں لیکن حرف تین ہیں۔ اسی طرح ڈھال اور کھال
[illegible] ہیں لیکن حرف چار ہیں۔ دو حرفوں کو ایک حرف قرار دینے یا ان کو ایک حرف کی طرح
میں لانے کا نہ تو کوئی جواز ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ہندی میں ہائیہ آوازوں کے گیارہ حروف مانے ہیں[۵۱]۔ ڈاکٹر گوپی چند
ے اور ڈاکٹر گیان چند ان کی تعداد دس بیان کرتے ہیں[۵۲]۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ڑھ کو انھوں نے چھوڑ
ہے۔ اس کا مزید سبب یہ ہے کہ ڑھ ہندی کے مقررہ حروف تہجی میں شامل نہیں ہے۔ تحریر میں ڈھ کے
ایک نقطہ لگا کر ڑھ کا کام لیا جاتا ہے [illegible] پڑھنا وغیرہ الفاظ ایک ہائیہ حرف سے لکھے جاتے
یہ طریقہ ایسا ہی ہے جیسے ہندی کے مقررہ حروف تہجی میں ڑ نہیں ہے لیکن تحریر میں ڈ کے نیچے نقطہ لگا کر ڑ
م لیا جاتا ہے۔

اردو میں ہندی کے مذکورہ گیارہ ہائیہ حروف کو [illegible] جا سکتا ہے۔

کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، تھ، [illegible]، ڑھ

لیکن ہندی میں ہائیہ آوازیں اور بھی ہیں جن کے لئے جداگانہ حروف نہیں ہیں۔ ان میں نھ، مھ، لھ
وازیں ہائے ہندی (ہ) کے اشتراک سے لکھی جاتی ہیں۔ ڑ کی ہائیہ آواز کے لکھنے کا ہندی میں انتظام
ہے۔ اردو میں دو چشمی ہے کے اشتراک سے یہ تمام آوازیں لکھی جاتی ہیں۔

الیس۔ اے۔ صدیقی کے مطابق انشا نے اردو کی ہکار آوازیں سترہ شمار کی ہیں[۵۳]۔ ڈاکٹر محی الدین
ی زور اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی اُن ہائیہ آوازوں کو مانا ہے جن کے لئے ہندی میں جداگانہ
ف نہیں ہیں۔ لیکن بعض اہل لسانیات پر ہندی کے نظام تہجی کی پختگی کا رعب اتنا غالب ہے کہ اس
سرمو انحراف نہیں کرنا چاہئے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس کی توجیہ اس طرح کی
کہ ہائیت کو ہائے مخلوط جزوی میں تقسیم کر دیا ہے[۵۴]۔ اسی طرح ڈاکٹر گیان چند ہائیت اور "ہائے مخلوط"

---

[۵۱] اردو صوتیات کا خاکہ، بحوالہ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۷

[۵۲] اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ص ۳۲، ۴۲ اور لسانی مطالعے از ڈاکٹر گیان چند، طبع دوم، ص ۱۵۱

[۵۳] ادب اور لسانیات از الیس اے۔ صدیقی، ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۷

[۵۴] اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو، ص ۳۵

[۵۵] لسانی مطالعے، ص ۹۰

میں امتیاز کرتے ہیں[2] مقصد یہ ہے کہ ہائیہ آوازیں صرف وہی ہیں جن کے لئے ہندی حروف تہجی میں دس حروف ہیں۔ دیگر آوازیں ہائیہ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو نھ، مھ اور لھ میں ہاہیت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن [illegible] کا منطقی نتیجہ قبول کرنے سے کترا جاتے ہیں۔ کھ، دھ، بھ وغیرہ کی فہرست میں ان کا اضافہ [illegible] فرماتے ہیں کہ ان کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اضافہ نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ [illegible] بنتے ہیں اور دلھن اور دولہن کا تلفظ متعین ہے[5]۔ گنتی کے الفاظ تو کئی ہو سکتے [illegible] لفظ بھی ہو تو اسے لکھنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تلفظ کا اختلاف بھی لفظ کے لکھنے [illegible] حقیقت یہ ہے کہ ہندی میں جن ہائیہ آوازوں کے لئے مفرد الفاظ نہیں ہیں ان بھی ہائیہ [illegible] لھو، چولھا، آ. لھا) مھ (کمھار، بامھن، تمھارا) نھ (کنھیا، انھوں، انھیں) رھ (سرھانا، [illegible]) وھ (وھن[6]) پھ (پھال، پھن)۔

الفاظ کو بولنے اور نثر میں پڑھنے میں سکون وحرکت اور صوتی ادائیگی کا فرق ہو سکتا ہے لیکن شعر میں وزن کی پابندی کی وجہ سے ہیر پھیر کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایک آواز کی جگہ دو آوازیں نہیں پڑھی جا سکتیں۔ ذیل میں کچھ الفاظ کے لئے مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ان میں بھی بالکل اسی طرح ہاہیت ہے جس طرح کھ، گھ، چھ وغیرہ کے الفاظ میں پائی جاتی ہے۔

شیریں ان لبوں کی رکھتا جو تو تو کولھو
پانی سے تجھ کو پیتلا اے نیشکر نہ کرتے

آتش

پھول جھڑتے ہیں جو ہنسنے میں دلھن کے منہ سے
میری مالن انھیں پھولوں کا بنا لا سہرا

امیر مینائی

بامھن کی بنتی کر کے لگے کہنے کشن جی
تم نے ہمارے حال پہ کرپا بڑی یہ کی

نظیر اکبر آبادی

میرے کمھار کے بیچ میں آتا ہے بار بار
کمبخت پاؤں بھی نہیں تھکتے ملال کے

امیر مینائی

ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمھار

سودا

---

[1] اردو حروف تہجی کی صوتیاتی ترتیب، اردو زبان اور ادب، از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ص ۱۷۴۔۱۷۵

[2] [illegible]

ایسا تھا بانسری کے بجیّا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنھیّا کا بالپن

نظیر اکبر آبادی

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرھانے دھرے دھرے

میر

سرھانا کو چھوڑ کر ہندی میں اس طرح کے الفاظ دو حرفوں کے اشتراک سے لکھے جاتے ہیں تو دوسرے
ؔاظ بھی اسی طرح لکھے جا سکتے تھے اگر اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو اردو میں ہائیہ آوازوں کے لئے جداگانہ مفرد
ؔوف کی عدم موجودگی کوئی عیب نہیں ہے۔ لیکن اردو کے بعض اہل لسانیات نے دیوناگری رسم الخط کو اپنے
ؔن میں اتنا مثالی تصور کر رکھا ہے کہ وہ ان حروف کی کمی کو اردو رسم الخط کی کم مائیگی پر محمول کرتے ہیں۔
ؔس کے برعکس ہندی کے مدن گوپال کا خیال ہے کہ سنسکرت میں ہائیوں کے لئے الگ حروف اس لئے بنانے
ؔے کہ سنسکرت کا قدیم یونانی سے سابقہ نہیں پڑا۔ ان کو قدیم یونانی اور رومن رسم الخط کے طرز پر اردو
ؔ ہائیوں کو دو حرفوں سے لکھنے کا طریقہ اتنا اہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی یوروپی دماغ کا نتیجہ قیاس
ؔتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ خوبی ایشیا کے کسی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہے[1]

اردو رسم الخط میں دوچشمی ہے مخصوص سادہ حروف سے مل کر ایک نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔
ؔن اس کی بنا پر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ اردو حروف تہجی کا ایک مستقل حرف ہے۔ اس کے باوجود کہ اسے ہائیت
نمائندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے ایک محدود مفہوم میں ہائے مخلوط کے متبادل کے طور پر بھی اس کا استعمال
ؔا ہے۔ خط نستعلیق میں یا خط نسخ کی آمیزش کی وجہ سے کتابت میں اس کا اچھا خاصا چلن ہے۔ اس
ؔے ... ہائے ملفوظ کی حیثیت سے بھی اس کی شناخت ضروری ہے۔ اردو کے جو قاعدہ نویس حروف
ؔ میں اس کو درج نہیں کرتے وہ گویا حرف کی حیثیت سے ... کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی
ؔح بغیر اعراب کے بھ، پھ، تھ وغیرہ کے جداگانہ ا... ح سے گمان ہوتا ہے کہ وہ ان کو مفرد حروف سمجھتے ہیں۔
ؔ طریقہ بغیر سمجھے بوجھے اختیار کر لیتے ہیں۔ دونوں ... توں میں یہ بالکل غلط ہے۔

قاعدوں میں دوچشمی ہے کو ... یا ترتیب میں لازمی طور پر درج کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں کیا
ؔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آگے چل کر یہ ہائیہ آوازوں کی نمائندگی میں کہاں سے آجاتی ہے اور طالب علم
ؔے کس طرح پہچانتا ہے۔ مخصوص سادہ حروف اور دوچشمی ہے کو ہائیات کے املا کا صحیح مقام بھی ہائے
ؔرہ کے بعد زیر، زبر اور پیش کی مشقوں میں ہے۔

دوچشمی ہے کے سلسلے میں اردو پر سب سے بڑا ستم ترقی اردو بورڈ کراچی کے لغت میں کیا گیا ہے جس

[1] اردو لسانیات از ڈاکٹر شوکت سبزواری ...

پروفیسر عنوان چشتی
شعبۂ اردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

اعجاز صدیقی ـــ شخص اور عکس

[اعجاز صدیقی سے میرے ذاتی تعلقات رہے ہیں، عنوان چشتی نے اعجاز صاحب پر یہ مضمون لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ سچائی ہی سچائی ہے۔ ہر چند کہ ناکافی ہے۔ مگر ایک رسالے کی بساط ہی کیا ہوتی ہے اس لئے سب کچھ تو لکھا بھی نہیں جا سکتا ـــــــــــــــــ کلام حیدری]

ہر شخص کے غم و خوشی کا انحصار ذہنی اور جذباتی رشتوں پر ہوتا ہے۔ جن کا تعین ہر دو اشخاص کے تعلق کی نوعیت کرتی ہے۔ میرے اور اعجاز صدیقی کے درمیان خلوص اور ذہنی ہم آہنگی کا رشتہ تھا۔ اس لئے ان کے اچانک بچھڑنے کا کتنا غم ہوا، بتا نہیں سکتا۔ مجھے اعجاز صدیقی صاحب سے ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ تعارف حاصل تھا۔ یہ تعارف رفتہ رفتہ تعلق میں بدل گیا۔ ۱۹۵۳ء میں میں ہائی اسکول کا (دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اسی سال میرے وطن (قصبہ منگلور ضلع سہارنپور) میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ جس میں دیگر شعراء کے علاوہ جناب کرشمیر مٹھی مرحوم نے بھی شرکت کی تھی۔ انہوں نے مشاعرہ میں ایک نظم "سلام اے مسافر" سنائی تھی۔ جس نے بہت متاثر کیا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی نظم پر نظم لکھی تھی اور اس کو اپنے والد محترم پیرزادہ شاہ انوار الحسن صاحب (سجادہ نشیں درگاہ حضرت شاہ عثمان بانگیر چشتی منگلور) کو دکھا کر شاعر کو اشاعت کے لئے بھیج دیا تھا۔ میری توقع کے خلاف اعجاز صدیقی صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے اس نظم کو پسند کیا اور لکھا تھا کہ اس نظم کو چھپنے کے لئے اور کہیں نہ بھیجئے۔ نظم شاعر میں شائع ہو گئی۔ کسی مبتدی کو معیاری رسالے میں شائع ہونے سے جو خوشی ہوتی ہے۔ وہ مجھے بھی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد میری دوسری تخلیقات بھی شاعر میں شائع ہوتی رہیں مگر اعجاز صدیقی صاحب سے شرف ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۹۵۸ء سے

۱۹۶۴ء تک میرا قیام آگرے میں رہا۔ آگرہ اعجاز صاحب کا وطن ہے۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں اعجاز صدیقی آگرے آئے تو ان سے ملاقات ہوئی اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آگرے میں ان کا قیام اپنے ایک عزیز کے یہاں تھا۔ اس دوران ان سے طویل ملاقاتیں رہیں۔ میرے ذہن پر شاعر کے اداریوں کا اثر تھا۔ اعجاز صدیقی صاحب نے گذشتہ بیس برسوں میں ان اداریوں کے ذریعہ لگاتار اردو کی حمایت کی ہے اور اردو کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا کلام میری توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس میں جوکس بل اور عصری تقاضوں اور حقیقتوں کا شعور ملتا ہے، وہ یگانہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مگر اپنی الگ پہچان بھی رکھتا ہے۔ ان کے خطوط میں اخلاص، ہمدردی اور اپنائیت ہوتی تھی۔ اس نے بھی مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کی تحریروں کا نقش ملاقات کے بعد اور گہرا ہو گیا۔ میں نے اعجاز صدیقی کے پیکر میں ایک حساس اور دردمند، مخلص اور وضع دار انسان کا دل دھڑکتا ہوا محسوس کیا۔

اعجاز صاحب منحنی قامت اور پستہ قد انسان تھے۔ مگر ان کے ارادوں میں صلابت تھی۔ چشم سے جھانکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھلی لگتی تھیں۔ پان کے بہت شوقین تھے۔ مگر دن میں کئی بار کلی کرتے اور دہن صاف کرتے تھے۔ ان کا رنگ گندمی، ناک طویل اور آگے سے قدرے پھیلی ہوئی تھی۔ سر پر ٹوپی اوڑھتے تھے اور شیروانی نیز چھوٹی مہری کا پاجامہ پہنتے تھے۔ مجھے ان کی ہیئت اور وضع اچھی لگتی تھی۔ اس میں مشرقی شرافت اور وضع داری کا رنگ تھا۔ اعجاز صاحب کا انداز گفتگو سادہ مگر دلکش تھا آواز ہلکی تھی۔ آہستہ آہستہ بولتے تھے۔ ان کی گفتگو میں گھن گرج نہیں تھی۔ میدانی ندی کا سا بہاؤ اور ٹھہراؤ تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات کہتے تھے۔ گفتگو کے دوران متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ نہایت پرسکون انداز میں بات کرتے۔ گفتگو کے دوران پرسکون رہتے۔ کسی ہیجانی کیفیت کا اظہار نہیں کرتے۔ چہرے پر کبھی کبھی جذبے جھلک اٹھتے۔ لیکن گفتگو کے دوران ناک منہ نہیں بناتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جس معاشرہ کے پروردہ تھے۔ اسی میں نشست و برخاست، آداب محلس اور طرز بود و ماند کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے ان کی ذات سے کسی خفیف الحرکتی کے سرزد ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ ۱۹۶۲ء میں، میں ایم اے اردو کا امتحان دے رہا تھا۔ دوران گفتگو ان سے ریسرچ کا ذکر آیا۔ نہایت ہمدردی اور دلچسپی سے میری باتیں سنیں اور مجھے سیماب اکبرآبادی پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ ۱۹۶۲ء میں میں نے ایم اے کیا تو انھوں نے مزید دلچسپی کا اظہار کیا۔

۱۹۶۲ء میں جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ میرا قیام آگرے میں تھا۔ آگرہ یونیورسٹی میں کوئی نگراں نہیں تھا۔ آگرے میں پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن تو ہوتا تھا۔ لیکن امیدوار کو نگراں کا انتخاب علی گڑھ، دہلی یونیورسٹی، وکرم یونیورسٹی یا الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایم اے کے بعد میرے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ اس دشواری کا ذکر اعجاز صاحب سے خطوط میں کر چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دہلی میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب سے بذریعہ خط میرا تعارف کرایا۔ اور مجھے وہیں سے "سیماب ... حیات اور شاعری" پر کام کرنے کے لئے مشورہ دیا۔

... ۱۹۶۲ء تک تحقیق کے موضوع کے سلسلہ میں ان سے مراسلت رہی۔ اعجاز صاحب کو

سیماب اکبرآبادی اور دبستان اکبرآباد سے ایک ذہنی اور جذباتی لگاؤ تھا۔ چونکہ میں سیماب اکبرآبادی پر کام کرنا چاہتا تھا اس لئے مجھ سے بھی ایک ذہنی قربت محسوس کرتے تھے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خطوط کے اقتباسات پیش کر دوں، جن سے ان کی علمی دلچسپی، سیماب اکبرآبادی پر کام کرانے کی لگن اور مجھ سے تعلق خاطر پر روشنی پڑتی ہے۔ ۲۸ر مئی ۱۹۶۳ء کے ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

"۲۰ر مئی کا محبت نامہ ملا۔ اس سے پہلے بھی دو خط ملے تھے اور وہ تفصیلی خط بھی جس میں آپ نے اپنے تحقیقی مقالے کے لئے عنوانات لکھے تھے۔ آپ کا یہ تفصیلی خط یکم اپریل کا تھا۔ اور عین اس وقت ملا تھا جب کہ خواجہ احمد فاروقی بمبئی آئے ہوئے تھے۔ وہ تین دن یہاں رہے اور میرا بیشتر وقت انہیں کے ساتھ گزرا۔ انجمن ترقی اردو (جس کا میں جنرل سکریٹری ہوں) نے بھی انہیں مدعو کیا گیا۔ ایک تو وہ یہاں آئے ہوئے تھے دوسرے آپ کی یاد دہانی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں ان سے آپ کے متعلق بات کر لیتا۔ لیکن میں نے مناسب نہ سمجھا۔ میرے ان کے تعلقات بے حد قریبی ہیں اور بے تکلفانہ بھی۔ اس کے باوجود ممکن تھا کہ وہ اس کے کچھ اور معنی لیتے۔ میں نے بھی فیصلہ کیا کہ ان کے جانے کے بعد آپ کے تحقیقی مقالے کے بارے میں انہیں لکھوں گا۔"

اس اقتباس سے اعجاز صاحب کی دور اندیشی اور احتیاط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مجھ سے لگاؤ تھا۔ وہ میرے کام سے غافل نہ تھے۔ اور دل سے چاہتے تھے کہ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کی نگرانی میں سیماب اکبرآبادی پر تحقیقی مقالہ لکھوں۔ چنانچہ ۸ر جون ۱۹۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں نے بہت کوشش کی کہ آج آپ کو خط چلا جائے لیکن نہ جا سکا البتہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کو خط چلا گیا۔ ان کے خط کی نقل کرا کے آپ کو بھیج رہا ہوں۔ تاکہ آپ کے علم میں بھی یہ بات آجائے کہ میں نے انہیں کیا لکھا ہے ان کے نام تعارفی خط الگ سے بھی لکھ دیا ہے جو اس خط کے ساتھ منسلک ہے"

اس خط کے ساتھ اس طویل خط کی نقل موصول ہوئی۔ جو انہوں نے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے نام تحریر کیا تھا۔ یہ خط بھی اعجاز صاحب کے ہینڈ رائیٹنگ میں ہے۔ جس کو انہوں نے لکھا کہ "نقل کرا کے بھیج رہا ہوں" اعجاز صاحب نے میرے تحقیقی کام کے سلسلے میں جو طویل خط خواجہ احمد فاروقی صاحب کو لکھا تھا، وہ مرحوم کی محبت اور شرافت کا مظہر ہے۔ اس لئے اس کو من و عن یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۸ر جون ۱۹۶۳ء

برادر گرامی ۔۔۔ تسلیم

آپ بمبئی تشریف لائے۔ مدتوں بعد چند ساعتیں ... کے ساتھ گزارنے

میں بڑی مسرت ہوئی تھی۔ کتنی ہی ضروری باتیں آپ سے کرنا تھیں لیکن آپ کی مصروفیتوں نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو بالمشافہ ہی ہو سکتی ہیں۔ دیکھئے اب کب اس کا موقع آتا ہے۔ میرا اپنا یہی عالم ہے مصروفیت میں اضافے ہی ہوتے رہتے ہیں۔

جن دنوں آپ یہاں تشریف لائے تھے۔ جناب عنوان چشتی ایم اے کا ایک نہایت ضروری خط آیا ہوا تھا۔ چاہا تھا کہ ان کے سلسلے میں آپ سے بات کروں مگر وہ بھی نہ ہو سکی۔ عنوان چشتی آگرہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منگلور ضلع سہارنپور کے معزز ترین پیرزادوں کے خاندان سے ہیں۔ جاگرفی[1] میں ایم اے کیا تھا۔ عرصہ سے شعیب محمدیہ کالج آگرہ میں لکچرر ہیں۔ محض اس ادارے کی اعانت کے خیال سے، یہ وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ نہایت ذہین و متین اور قابل نوجوان ہیں۔ اس سال انہوں نے اردو میں ایم اے کر لیا ہے۔ فرسٹ کلاس فرسٹ آئے ہیں۔ ادیب کامل بھی ہیں اور گہرا تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون[2] جون کے شاعر میں شائع ہو رہا ہے۔ شاعر بھی بہت اچھے ہیں۔ اچھے ادبی پرچوں میں ان کا کلام شائع ہو رہا ہے۔

عنوان صاحب کی دلی تمنا ہے کہ ان کے نگراں آپ ہوں۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ کی نگرانی اور تربیت سے متعدد ذہین لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے وہ نہ صرف اپنی منزل پر پہنچے ہیں بلکہ ان کا ایک معیار بھی متعین ہو گیا ہے۔ عنوان صاحب کا موضوع ہے سیماب اکبرآبادی شخصیت اور شاعری۔ اس موضوع پہ لکھنے کے لئے وہ بہت دن سے مُصر تھے۔ ان کے علاوہ پچھلے ۴ سال میں کئی لوگوں نے مختلف یونیورسٹیوں سے اس موضوع پر کام کرنا چاہا لیکن اپنی مصروفیتوں اور الجھنوں کی بنا پر میں نے ان کی اعانت سے انکار کر دیا۔ لیکن عنوان صاحب سے انکار کرتے نہ بنی اور میں نے ذمہ داری لے لی ہے کہ والد مرحوم پر پھیلے ہوئے مواد کو فراہم کرانے میں ان کی زیادہ سے زیادہ مدد کروں گا۔ جس شخصیت کو انھوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے چونکہ وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے اس لئے انہیں کافی محنت کرنا ہو گی۔ بہت پڑھنا اور کنگھالنا پڑے گا۔ وہ اس کے لئے تیار ہیں۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہوں۔

۱؎ جغرافیہ

۲؎ فانی کی تنقیدی شاعری کے عنوان سے یہ مضمون شاعر شمارہ جون ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا

حضرت والد مرحوم سے اور مجھ سے آپ کو جو قلبی لگاؤ ہے۔ عنوان صاحب میری زبانی اور کچھ شاعر کے ذریعہ اس کا پہلے سے علم تھا۔ انہیں یقین ہے کہ آپ کی رہنمائی ان کے تحقیقی مقالے کو ایک گراں قدر چیز بنا دے گی اور وہ منظوری کے بعد اشاعت پذیر ہو کر ادب و تاریخ و تحقیق کی کتابوں میں ایک اضافہ ہوگا۔

عنوان صاحب آپ سے ملنے کے لئے دہلی آنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ میرا تعارفی خط لے کر حاضر ہوں گے۔ امید کہ آپ ان کی پذیرائی فرمائیں گے۔

آپ کے مزاج کیسے ہیں۔ تازہ شاعر مل گیا ہوگا۔ شاعر کے ایک نہایت اہم خاص نمبر کے سلسلے میں عنقریب دفتر سے ایک خط آپ کے نام جانے والا ہے۔ اس سلسلے میں بھی آپ کی بھرپور توجہ کا طالب ہوں۔ محبت نامے کا منتظر رہوں گا۔

پاکستان میں گزشتہ ماہ جنوری میں والد مرحوم کی بارہویں برسی کے سہ روزہ پروگرام میں بزم مقالات کی صدارت ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی اور مشاعرہ کی صدارت مہدی علی صدیقی سیشن جج کراچی نے کی تھی۔ وہاں والد مرحوم کے مقبرے کی تعمیر پر بہت زور دیا گیا۔ حکومت کو متوجہ کیا گیا۔ والد مرحوم ایک وسیع قطعہ زمین پر قائد آباد میں، قائد اعظم محمد علی جناح کے مزار کے بالکل قریب آسودۂ خواب ہیں۔ سیماب میموریل کمیٹی کے صدر، انجمن اسلامیہ اور جناح کالج کراچی کے سکریٹری جناب ریاض الدین احمد ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ہندوستان سے بھی حکومت پاکستان پر زور ڈلوایا جائے۔ مزار پر محترم مولوی حامد حسن قادری صاحب کا ایک بہت ہی اچھا قطعہ تاریخ کندہ ہے۔ میں نے تو مزار شریف دیکھا نہیں ہے۔ تصاویر آئی تھیں۔ قریب ہی ایک پرانی مسجد بھی ہے امید کہ یہ ایک بہت خوبصورت جگہ ہو جائے گی۔ اور ایک شاندار مقبرہ تعمیر ہو سکے گا۔ میری مصروفیتیں اب تک بہت سے کاموں میں مانع رہیں۔ میں خود کو بڑا مجرم سمجھتا ہوں۔ لیکن اب پوری طرح والد مرحوم کے سلسلے کے کاموں کی طرف متوجہ ہونے کا پختہ ارادہ کر چکا ہوں۔ ان کی ۲۴ غیر مطبوعہ تصانیف کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ بھی عنقریب شروع ہو جائے گا۔ مجھے ہر قدم پر آپ کی اعانت اور آپ کے مشوروں کی ضرورت ہے۔ تلامذۂ سیماب تو ایک وسیع اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ [illegible] بار مجھے مواد فراہم کرنے کے لئے لکھا لیکن میں وقت نہ نکال سکا۔ [illegible]

اعجاز صدیقی

یہ خط اعجاز صدیقی صاحب کی کیفیاتِ مزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ اور دوسری طرف ان کے اسلوب نثر کا نمونہ بھی ہے۔ خیر تو اس خط کے پہنچنے کے بعد میں اعجاز صاحب کا خط لے کر دہلی آیا اور اس سلسلے میں خواجہ صاحب سے گفتگو کی۔ لیکن بعض اسباب سے اس وقت خواجہ صاحب یا دہلی یونیورسٹی کا کوئی استاد میرا نگراں نہ بن سکا۔ اسی زمانے میں، میں نے پروفیسر گیان چند جین صاحب سے رجوع کیا انہوں نے میرا نگراں ہونا منظور کر لیا لیکن ان کا تقرر جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا۔ اور انھوں نے بھوپال کو خیرباد کہہ دیا۔ اگرچہ یونیورسٹی میں جموں کا کوئی استاد نگراں نہیں بن سکتا تھا۔ اس لئے معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ مجبوراً میں نے الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر سید مسیح الزماں صاحب سے رجوع کیا مگر موضوع بدلنا پڑا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۶۴ء میں میرا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ہو گیا اور میں یہاں چلا آیا۔ میں بعض ناگزیر وجوہ سے سیماب اکبرآبادی پر تحقیقی کام تو نہ کر سکا لیکن اس دوران اعجاز صاحب سے بہت خط و کتابت رہی۔ اور انہیں سمجھنے کا موقع ملا۔ دہلی کے قیام کے دوران ان سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں، سینکڑوں خطوں کا تبادلہ ہوا۔ ایک آدھ بار اختلاف بلکہ شدید اختلاف کا موقع بھی آیا۔ لیکن ان کے خلوص اور جذبۂ ہمدردی میں کمی نہیں دیکھی۔ وہ ہمیشہ محبت سے خط لکھتے رہے۔ اپنے بہت سے خطوں میں اپنی علالت، گھر کے حالات اور بہت سی ذاتی باتیں لکھی ہیں۔ مجھے کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے اپنا رازدار بنا رہے ہوں۔ ان کی محبت اور اعتماد کی بات تھی۔ ابھی حال ہی میں اعجاز صدیقی صاحب ۸رجنوری ۱۹۷۸ء کو آل انڈیا مشاعرہ میں شرکت کرنے دہلی آئے تھے۔ ۹رکو دن میں اور شب میں میرے غریب خانہ پر مہمان رہے۔ شام کو میرے ہمراہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر حاضری دی اور ۱۱رکو واپس بمبئی چلے گئے تھے کتنی محبت اور کتنا خلوص تھا ان میں۔ اب ان کی یاد آتی ہے تو دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ افسوس کہ یہ پیکر اخلاص و وضع داری ۹رفروری ۱۹۷۸ء کو ۷ بجے صبح بمبئی کے ہرکشن داس اسپتال میں ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ... افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

۱۹۶۶ء میں اعجاز صدیقی کی طویل نظم خوابوں کا مسیحا منظر عام پر آئی۔ اس نظم کا موضوع پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت ہے۔ نہرو ایک شخص نہیں شخصیت تھے۔ شخص سے شخصیت بننے کا عمل قطرے سے گہر بننے کا عمل ہے۔ پنڈت جی کی شخصیت میں وہی آبداری نظر آتی ہے، جو گوہر کو گوہر بناتی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کو پنچ شیل کے نام سے ایسے رہنما اصول دیئے جو ہندوستانی سیاست اور سماج کے لئے ناگزیر ہیں۔ اعجاز صدیقی نے اپنی نظم خوابوں کے مسیحا میں نہرو کی شخصیت اور اصولوں کو جس شاعرانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سے اعجاز صاحب کی قادرالکلامی اور نہرو شناسی کا اندازہ ہوتا ہے وہ محض نہرو شناس بھی نہ تھے بلکہ دل سے نہرو کا احترام کرتے اور پنچ شیل کو ضروری سمجھتے تھے اس کتاب کا مقدمہ میں کرشن چندر نے لکھا ہے۔

" نظم میں وہ تمام حقیقتیں پائی جاتی ہیں جو پنڈت نہرو کی ذات سے وابستہ

تھیں۔ ان کا فلسفہ، ان کے نظریات، ان کی سیاسی بصیرت، امن عالم کے لئے
ان کی انتھک کوشش۔ ان کی پاکیزگی، افکار و خیالات ــــ انسان اور انسانیت
کی فلاح و بہبود کے لئے نیک تمنائیں ــــ ہندوستان کی نجات اور اس کی ترقیوں
کے لئے ان کی مسلسل اور طویل کاوشیں، ان کا عزم و استقلال ان کی معصوم و
محبوب شخصیت اور ان کی عظمت اعجاز صدیقی کی اس نظم کے ہر بند سے آشکار
ہے ــــ"

اس میں شک نہیں کہ اس نظم میں نہرو کی شخصیت اور اصولوں کی وہ خوشبو ہے۔ جس سے ہندوستانی سماج مہک رہا ہے۔ میرے خیال میں کسی شاعر کے لئے یہ بات اہم ہے کہ وہ ان اصولوں کو کس طرح پیش کرتا ہے۔ اعجاز صدیقی نے اس طویل بیانیہ نظم میں نہرو کی شخصیت اور اصولوں کا محض بیان نہیں کیا۔ بلکہ اس میں حسنِ بیان بھی ملتا ہے۔ یہی بات اس نظم کو شاعری بناتی ہے۔

جس کی تابش سے ستاروں کی لویں تھرائیں
لمس سے جس کے فروزاں ہوئی قندیل سحر
ظلمتیں اپنی تگ و تاز سے خود گھبرائیں
اس نے جب ڈال دی مستور اندھیروں پہ نظر

ــــــــ

علم و حکمت کے چراغوں کو جلا کر جس نے
ایک زرتار و پر انوار ردا پھیلا دی
فکر و دانش کے خزانوں کو مٹا کر جس نے
ذہن تاریک میں انسان کے ضیا پھیلا دی

ان بندوں میں اسکی تابش سے ستاروں کی لوؤں کا تھرانا، جس کے لمس سے قندیل سحر کا روشن ہونا، ظلمتوں کا اپنی تگ و تاز سے گھبرانا، علم و حکمت کے چراغوں کو جلا کر ایک زرتار ردا پھیلانا، فکر و دانش کے خزانوں کو لٹا کر ذہن تاریک کو منور کرنا وہ جذباتی ردعمل ہے جو ایک طرف نہرو سے اعجاز صدیقی کے والہانہ لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف اس لگاؤ کو شعری اور تخلیقی اظہار کی سطح عطا کرتا ہے۔ اگر اعجاز صدیقی صاحب کی شاعری میں یہ فنکارانہ جمال نہ ہوتا تو اس میں وہ کیفیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی جو شاعری کے لئے ضروری ہے۔ اس نظم کا ایک اور بند پڑھئے۔

ذہن میں جس کے تھی پر امن بقائے باہم
ذہن میں جس کے تھا ان عالم بے تیر و تفنگ
یوں بلند اس نے کیا امن کا رنگیں پرچم

گھٹ گیا اپنے ہی ماحول میں ہر شعلۂ جنگ

چند خاکے نئی تہذیب کے ایوانوں میں
چند خاکوں میں دمکتے ہوئے ماضی کے نقوش
چند خاکے طرب آثار گلستانوں کے
چند خاکوں میں سرِ شوق بہاروں کے جوش

ان بندوں میں ایک طرف نہرو کے ترک اسلحہ کی کوشش کی طرف بلیغ اشارہ ہے اور دوسری طرف نئے ہندوستان کی تعمیر کی شدید خواہش کو شعری پیکر عطا کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ آزادی کے بعد فرقہ پرستی نے قومی یک جہتی کی ردا چاک چاک کر دی۔ بڑھتے ہوئے افلاس نے مساوات اور خوشحالی کے خواب کو جھٹلا دیا۔ جہالت اور کم سوادی نے علم اور شرافت کو سرنگوں کر دیا۔ فرقہ پرستی کو یک جہتی سے، افلاس کو سوشلزم سے اور جہالت کو علم سے مٹانے کا جو مشورہ نہرو نے بہت پہلے دیا تھا۔ وہ آج بھی شمع ہدایت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نہرو کے اصولوں کی روشنی میں نئے ہندوستان کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ مسز گاندھی انہیں اصولوں کو رہنما بنا کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہندوستان کی سالمیت، ترقی اور خوشحالی کے لئے یہ ایک ہی جادہ ہے۔ اعجاز صدیقی کا وجدان بہت قوی تھا انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ نہرو کی شخصیت اور اصول وقتی اور ہنگامی چیز نہیں بلکہ ایک پائدار حقیقت ہے جس کو انھوں نے خوبصورت شعری پیکر عطا کیا ہے۔ میری رائے میں جو سادگی اور بے ریائی ان کی شخصیت میں تھی وہی ان کی نظم خوابوں کا مسیحا کا طرۂ امتیاز ہے۔

نوٹ :- یہ مضمون اعجاز صدیقی کی وفات کے فوراً بعد لکھا گیا تھا۔ لیکن اب معمولی سے حذف و اضافہ کے بعد اشاعت پذیر ہوا ہے

★

بقیہ :- دو چشمی ھے

کا چند جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس لغت میں ایک طرف دو چشمی ہے کو حروف تہجی میں جگہ نہیں دی گئی ہے تو دوسری طرف بھ، پھ، تھ وغیرہ کے الفاظ کو ب، پ، ت وغیرہ کے الفاظ کے بعد ترتیب دے دیا گیا ہے جبکہ حروف تہجی میں ہائے دو چشمی کی جگہ ہائے مدوّرہ کے بعد ہے۔ حروف تہجی اور ان کی ترتیب میں اس بے جا مداخلت اور بے راہ روی کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے لغت سے جس غلط فہمی اور خلفشار کو ختم ہونا چاہیے تھا وہ نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ اور بڑھے گا۔

حسین الحق

"خضرِ راہ" ـــ راہ گم

(بہتر نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں)

تصوف زمانۂ قدیم سے انسانی فکر کا ایک دلچسپ اور مقبول تر پہلو رہا ہے بادجودیکہ اس پر اعتراضات کا بھی انبار ہے، پھر بھی اعتراض کرنے والے خود علم تصوف سے کترا کر گذرنے کی ہمت نہیں رکھتے، نتیجہ یہ ہے کہ اس کی حمایت اور مخالفت دونوں میں صدہا کتابیں ہیں

"خضرِ راہ" ان کتابوں کے شمار میں ایک اور اضافہ ہے۔

"خضرِ راہ" کے مصنف جناب قیوم خضر بحیثیت عالم، ادیب، انشا پرداز اور مشفق بزرگ لائق احترام ہیں اور میں شخصی طور پر ان کی عالمانہ بزرگانہ اور مشفقانہ صفات کا شیدائی ہوں مگر کتاب زیر مطالعہ سے میں پوری طرح متفق نہیں ہو پایا۔

مصنف نے اس کتاب کے تین ابواب قائم کئے ہیں۔

باب اول :- اشارات (اسلامی تصوف کا تجریدی مطالعہ)

باب دوم :- محاضرات (روزہ اور اس کی حقیقت)

باب سوم :- توضیحات (مختصر قاموسِ تصوف)

باب اول کی ابتدا میں مصنف یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ـــ

"خالص تصوف ایک ایسے علم کا نام ہے جس سے پاکیٔ نفس، صفائی اخلاق اور ظاہر و باطن کی درستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں، اور یہ احوال وہ ہیں جن سے انسان کو دنیا میں ذہنی و روحانی سکون اور آخرت میں دائمی مسرت اور ابدی سعادت نصیب ہوتی ہے۔" (صہ ۱)

اور اس سے بھی پہلے پیش لفظ میں وہ یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ اپنے عقیدۂ خاص یعنی مسلکِ حنفیہ کے مطابق اسلامی تصوف کا تعارف کرائیں گے۔

لہٰذا میں دست بستہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مصنف نے ہر جگہ خالص تصوف کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اسلامی تصوف کا اپنے عقیدۂ خاص یعنی مسلکِ حنفیہ کے مطابق تعارف کرایا ہے۔ لہٰذا میں حیرت میں ہوں کہ مسلکِ حنفیہ کے مطابق پیش کیا جانے والا تصوف خالص کیسے کہا جائے گا؟

مصنف فلسفے کی "بھول بھلیوں" کا بھی کچھ اس انداز میں تذکرہ کرتے ہیں کہ معاملہ "اعتذار" سے آگے بڑھ کر "تحقیر" تک پہنچنے لگتا ہے حالانکہ اسلام کے پہلے کلمے ہی میں پورا فلسفہ موجود ہے، کلمے کا پہلا جزو (لا الٰہ الا اللہ) لازمان و لامکاں، محیطِ کل اور لامحدود طاقت و قوتِ کبریائی کا استعارہ ہے اور دوسرا جزو (محمد الرسول اللہ) اس لازمان و لامکان و لامحدود کے زمان و مکاں، حد و حساب، اور اندازہ و قرینہ کی سرحد میں داخل ہو کر مقامِ بشریت تک پہنچنے کا اشاریہ ہے جسے صوفیا نے "تنزلاتِ ستّہ" کے نام سے یاد کیا ہے اور جو فلسفۂ تصوفِ اسلامی کا ناقابلِ فراموش پہلو ہے، مگر مصنف "حضرت..." نے ان تمام نکات کو فلسفے کی "بھول بھلیاں" قرار دیا ہے، اور اس کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے جیسے یہ کوئی بہت ہی مکروہ اور گمراہ کن چیز ہو جس سے مصنف خود بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بچنے کا مشورہ دیتے ہیں، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود خدا اور مذہب کو بھی فلسفے کی مدد کے بغیر پوری طرح سمجھا ہی نہیں جا سکتا، اس لئے فلسفہ اگر بقول شخصے صرف سوالات ہی کھڑا کر سکتا ہے تب بھی یہ کیا کم ہے؟ کہ اس دور میں اطمینان کی افیون کھلانے والے لوگ زیادہ ہیں اور سوال کی بے چینی میں مبتلا کرنے والی صلاحیتیں بہت کم!

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جو ذہن سوالات سے گھبراتا ہو اسے بیدار ذہن کہتے ہوئے زبان لڑکھڑا جاتی ہے کیونکہ اگر ہم بموجب حدیث قدسی صرف اس کی صفات پر بھی غور کریں تب بھی فلسفے سے گریز ناممکن ہے بلکہ مذاہب کی تاریخ لکھنے والوں نے تو خدا کے احساس اور فلسفہ کے معرضِ وجود میں آنے کے لمحے کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ جہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھا کہ میں کیا ہوں؟ کب سے ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ کون ہے جو اس پورے کارخانۂ اسباب و علل کی "علتِ عظمیٰ" ہے؟ کیا کوئی "علتِ عظمیٰ" ہے؟ اگر ہے تو کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ کب سے ہے؟ کب تک رہے گا؟ ...... وغیرہ وغیرہ .... وہیں سے فلسفے کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے اور اگر اوپر اٹھائے گئے سوالات کو صرف "فلسفے کی بھول بھلیاں" کہہ کر گذر جایا جائے تو ہماری دانش کا خدا ہی حافظ ہے!!

دوسرا اہم سوال جس کا ابتدائی سطور میں میں نے بہت ہی سرسری طور پر تذکرہ کیا تھا، وہ بھی اپنی جگہ [illegible] کر رہا ہے کہ کیا صرف اسلامی تصوف کو خالص تصوف کہا جا سکتا ہے؟ اب تک خالص تصوف کا مطلب وہ تصوف تھا جس میں نظری مسائل کو زیادہ اہمیت حاصل ہو اور جو تصوف فلسفہ کے تمام مکاتیب میں عرفانِ خدا اور

عرفانِ کائنات کے سلسلے میں مشترک رہے ہوں۔ اسی لئے وحدت الوجود، وحدت الشہود، فنا و بقا، جبر و قدر، اور اس قسم کے دوسرے ایسے تمام مباحث بالعموم خالص تصوف کے زمرے میں آتے ہیں۔ شاید اسی لئے "سفینۃ الاولیا" اور "سبحات" و "لمعات" وغیرہ کو خالص تصوف کی کتابوں کے زمرے میں رکھا جاتا ہے مگر "اللہ نور السموٰت" مصنفہ جناب علی الحق اور "اسلامی تصوف" مصنفہ جناب سید احمد عروج قادری وغیرہ جیسی کتابیں خالص تصوف کی ترجمان نہیں سمجھی گئیں، مگر مصنف "خضر حیات" اپنے خاص مسلک یعنی عقیدۂ حنفیہ کے مطابق تصوف کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اور اسے خالص تصوف کا نام دیتے ہیں ....

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے! آخر خالص تصوف ہے کیا؟

یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب مصنف "خضر راہ" کے یہاں اگر آپ تلاش کرنا چاہیں گے تو آپ کو بتایا جائے گا کہ "خالص تصوف ایسے علم کا نام ہے جس سے پاکیٔ نفس، صفائیٔ قلب، ظاہر و باطن کی درستگی ذہنی اور روحانی سکون اور آخرت میں دائمی اور ابدی مسرت کے مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں" اور میں حیرت میں ہوں کہ میں کیا عرض کروں؟

فصوص الحکم، کشف المحجوب، سبحات، لمعات، تصوف اسلام، [illegible] تصوف اور تمام ملفوظات، مکتوباتِ صوفیائے کرام کو جس حد تک میں (اپنی اوقات اور بساط بھر) سمجھ پایا ہوں، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خالص تصوف ایسے علم کا نام ہے جس کے ذریعہ "قیام القلب مع اللہ" کے بنیادی مقصد کی تکمیل ہوسکے اور اس بنیادی مقصد کی تکمیل کے نتیجے میں پاکیٔ نفس، صفائیٔ قلب اور ظاہر و باطن کی درستگی کے مقاصد حاصل ہوجاتے ہیں، گویا مصنف نے جس چیز کو اولیت عطا کی ہے۔ دراصل اس کا درجہ ثانوی ہے، سچ تو یہ ہے کہ جادۂ تصوف کے مسافر کے نزدیک قیام القلب مع اللہ (یا عرفانِ خدا اور خدمتِ خلق) کا اگر کوئی سب سے بڑا مقصد ہوسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف رضائے الٰہی ہے اور اس کے علاوہ ہر مقصد، ارادہ، اور خواہش بے معنی ہے بلکہ تصوف میں "ترکِ ترک" کی منزل پر جب صوفی پہنچتا ہے تو وہاں "ترک ماسوا اللہ" بھی دکھاوا بن جاتا ہے کہ فرد جب "قیام القلب مع اللہ" کی منزل سے آگے بڑھ کر "قائم بالحق" ہو جاتا ہے تو پھر وہ باقی ہی کہاں رہتا ہے کہ ترک و اختیار کا مسئلہ اٹھ سکے!

اور جہاں تک ذہنی و روحانی سکون کا مسئلہ ہے تو اس راہ [illegible] کبھی لعنت کا درجہ حاصل نہیں کرسکا، صوفیا کے یہاں جو سوز و گداز، رقیق القلبی [illegible] اور نالہ و نغمہ [illegible] کیفیت ملتی ہے وہ ذہنی اور روحانی سکون کا نتیجہ نہیں بلکہ [illegible] کا نتیجہ ہے جو ہر سچے عاشق کی [illegible] کا آخری نقطہ ہے۔ کہ ہجر میں لذتِ ملنے ....

لہٰذا [illegible] خالص تصوف صرف "قیام القلب مع اللہ" [illegible] قیام القلب مع اللہ بکو سمجھنے او[illegible] اور جہاں تک [illegible] ہے، یہاں بھی یہی "قیام [illegible] فار لکھنؤ

تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ ۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو یہ سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) کے مطابق انسان کو قائم بالحق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی سے صوفی کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے کہ "صوفی وہ ہے جو احساسِ وجود نہ رکھتا ہو (ص ۲۵)
ظاہر ہے کہ احساس وجود کی نفی وہی کر سکے گا جو قائم بالغیر نہ ہو کر قائم بالحق ہو چکا ہو۔

حالانکہ سوال یہ بھی ہے کہ غیر کہاں ہے ؟ مگر مصنف خضر راہ سوالات سے بہت گھبراتے ہیں کہ بات فلسفے تک پہنچنے لگتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے وحدت الوجود اور وحدت الشہود سے کترا کر گذرنا ناممکن تھا۔ لہٰذا مصنف کو ان دو بنیادی مسائل کی آنچ تو سہنی ہی پڑی ہے اور اس آنچ کی شدت سے بچنے کے لئے اور اسے مدہم کرنے کے لئے مصنف نے وحدت الشہود کے تئیں ہمدردانہ رویہ بھی اختیار کیا ہے مگر یہ تو انہیں بھی تسلیم ہے کہ وجود اور شہود پر جو مباحث ہیں وہ الفاظ کے مختلف استعمال کا نمونہ ہیں ورنہ اگر وجود والے کہتے ہیں کہ یہ کائنات اس کی ذات کا صفاتی اظہار ہے تو شہود والے اس کائنات کو اس اصل وکل کا ظل اور سایہ قرار دیتے ہیں ، وجود والے غیرِ حق کی نفی کرتے ہیں تو شہود والے شیش محل میں نظر آنے والے متعدد تاج محلوں کی مثال دیتے ہیں ، وجود والے وجود کی وحدت کے قائل ہیں تو شہود والے مشاہدے کی وحدت کے قائل ہیں ، اور یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ مشاہدہ وجود ہی کا ہوتا ہے غیر وجود کا نہیں تو پھر مشاہدے کی وحدت وجود کی کثرت کیسے ثابت کر سکتی ہے ؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلسفۂ وحدت الوجود فرد کو جبر کا عادی ، بے عمل اور قدرے گمراہی کی منزل تک پہنچاتا ہے اور فلسفۂ وحدت الشہود اس سے بچاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بس ایک "ہوائی فائر" ہی ہے کیوں کہ اگر یہ پوری کائنات اس کا ظل اور سایہ ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ انسان ساکت رہے اور اس کا سایہ متحرک رہے ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہزار آئینوں والے کمرے میں اصل قمقمہ گل رہے اور تمام آئینوں میں نظر آنے والے قمقمے روشن رہیں ؟

ایسا کبھی ممکن ہی نہیں لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اگر جبر انسان کا مقدر ہے تو خواہ آپ وجود کی وحدت مانئے یا مشاہدے کی اس سے مفر نہیں البتہ آپ کا ذاتی کمند اس منزل پر پہنچی ہوا ہو جہاں علامہ اقبال پہنچے تھے کہ وہ عمل کا قائل ہونا نہیں چاہتے تھے بلکہ بزعم خود اپنی انفرادی خودی کے اثبات کے قائل تھے تو آپ اپنے کو خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا شعبدہ دکھا سکتے ہیں مگر ذرا ہزار آئینوں والے کمرے میں خود ساکت رہ کر ان شیشوں کو متحرک کر دیجئے تو کچھ بات بنے :

اور اگر آپ ایسا نہیں کر پاتے (اور آپ ایسا یقیناً نہیں کر سکتے) تو خالق اور مخلوق کے درمیان غیریت کا شعبدہ دکھانے کی کوشش بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اور جہاں تک نیکی کا مسئلہ ہے ، میں تو محسوس کرتا ہوں کہ اگر فرد ایمانداری کے ساتھ یہ محسوس کرے کہ وہ غیر حق نہیں ہے ، تو یہ فرد جو حق ہے اس فرد سے زیادہ ذمہ دار ، نیک ، ایماندار اور حق کے مطابق فرد بن سکتا ہے جو اپنے کو ظل ، سایہ ، شبیہہ اور نتیجہ

شہود سمجھتا ہے ـــ

بات بس اتنی سی ہے کہ دریا، ندی، نہر، تالاب، جھیل، نالہ، نالی اور کیچڑ میں پایا جانے والا پانی اپنی اصل میں تو پانی ہی ہے مگر چونکہ کیچڑ نالی، نالہ اور جھیل و نہر کا پانی اپنے کل یعنی سمندر سے دور ہے اس لئے اپنی کمیت، کیفیت، صلاحیت الگ الگ مدارج کے مطابق اپنے اثرات مرتب کرپاتا ہے اور اسی لئے جب تک نالی کا پانی نالی میں ہے اسے نالی ہی کا پانی کہا جائے گا۔ بلکہ نالی ہی کہا جائے گا سمندر نہیں مگر اس سے سمندر اور نالی کے درمیان جو غیریت ثابت ہوتی ہے۔ وہ ظاہری ہے باطنی نہیں۔

وجود اور مشاہدے کے درمیان بھی جو غیریت ہے وہ بھی ظاہری اور لمحاتی ہے کہ وہ لمحہ جب آگیا جب شکار شکاری کی زد پر آجائے (یزداں بہ کمند آور) تو پھر بقول مصنف "خضر راہ" ہی شکار اور شکاری کے علاوہ کچھ نہیں بچتا، قیوم خضر صاحب نے شکاری کا تذکرہ کیا ہے۔ میں انہیں کی مثال میں ذراسی تحریف کا مرتکب ہونا چاہتا ہوں کہ صوفی اور خدا کے درمیان بھی شکار اور شکاری ہی والا معاملہ ہے مگر یہاں معاملہ الٹا ہے، صوفی خود شکار ہے، البتہ یہ ایسا شکار ہے جو شکاری کا منتظر ہے ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

قیوم خضر صاحب کی شکار اور شکاری والی مثال ایک لمحاتی معاملہ ہے مگر یہاں یہ سلسلہ دائمی ہے، لہٰذا وجود قیام القلب مع اللہ کا ساعی ہے وہ از ابتدا تا انتہا سوا اللہ کے کچھ نہیں دیکھتا، کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا ـــ (ھوالاول والاخر والظاھر والباطن) اور جب کچھ مشاہدے میں آہی نہیں رہا ہے تو اس کا اظہار کیسے ہو؟

" سوال ...... سوال ...... سوال ......"

اور مصنف خضر راہ مذہب میں سوال کے قائل نہیں کہ ان کی نظر میں "بھول بھلیاں" ہے ـــ

لہٰذا اب بہتر یہی ہے کہ آگے بڑھا جائے ـــ

ص ۱۶ ـــ فلسفۂ تصوف کی ابتدا ـــ مسلمانوں کے یہاں صوفیانہ مباحث کی ابتدا کا تذکرہ!

ایمانداری کا تقاضہ یہ تھا کہ ہندوستان و یونان وغیرہ کے فلسفیانہ اور صوفیانہ رویوں کا بھی جائزہ لیا جاتا

ص ۱۷ ـــ نفسِ تصوف ـــــــــــــــــــ

ص ۲۰ ـــ تصوف کے سلسلے میں غلط فہمیوں کا ازالہ ـــــــــــــــــــ

ص ۲۲ ـــ خالص تصوف کا ماخذ ـــــــــــــــــــ

ص ۲۴ ـــ صوفیانہ لباس اور نفسِ تصوف کی حقیقت کے متعلق ـــــــ

مندرجہ بالا عنوانات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بھی مصنف نے بڑی زیادتیاں اور جانبداریاں کی ہیں تمام معاملات کو اپنے عقیدۂ خاص یعنی "مسلک حنفیہ" کے مطابق تشریح و تاویل کا شرف بخشا ہے مگر اسے "ٹوپی" خالص تصوف" کی پہنا دی ہے۔

ص ۴۴ ـــــ سماع کی حقیقت

اس عنوان سے جو گفتگو کی گئی ہے اور آگے چل کر بحالت سماع، اعضا کی مختلف حرکات کی جو تاویل کی گئی ہے وہ عذر لنگ ہے، ذاتی اپج ہے، مخالفین کے لئے تمسخر کا سامان ہے، صوفیائے سلف اور بزرگان حاضر کسی کے یہاں اس قسم کی تاویل کبھی بھی معتبر نہیں سمجھی گئی۔

از ص ۵۳ تا ص ۷۳ ـــــ محاضرات (روزہ اور اس کی حقیقت

اسلامی تصوف میں ادائیگی فرائض کے بغیر صوفی کا ہر عمل غیر معتبر ہے اس لئے روزہ صوفی کے عمل کا ایک لازمی جزو ہے مگر یہاں بھی مصنف غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، تصوف میں شرعی فرائض منزل نہیں طریقہ کار کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ اصل وکل کی حیثیت سے تصوف سے زیادہ شرع اور فقہ کے زمرے میں آتے ہیں کیونکہ ہر معتبر صوفی ادائیگی فرض ضرور کرتا ہے مگر اس سلسلے میں اس کا رویہ فقیہہ سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً صوفی کے روزے کی مثال کے سلسلے میں حضرت سلطان اولیا نظام الدین محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے جن کے لنگر سے بقول پروفیسر خلیق نظامی ستر ستر من پیاز کے چھلکے روز پھینکے جاتے تھے مگر خود حضرت محبوب الٰہی صرف چند چھوہارے اور چند گھونٹ پانی سے افطار کرتے تھے اور رفقا کے اصرار پر گریہ میں مشغول ہوتے تھے کہ پتہ نہیں خلق خدا میں کس کس کو آج کھانا نصیب ہوا، یہ فقیہہ کا روزہ نہیں صوفی کا روزہ ہے صوفی کے روزے کا ایک اور نمونہ حضرت مولانا فخر دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت میرزا مظہر جانجاناں کی اس محفل میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں رمضان کے دنوں میں حضرت مولانا فخر صاحب نے روزہ توڑنا اور اس کا کفارہ کرنا گوارہ کر لیا مگر اس سائل کا دل توڑنا گوارہ نہیں کیا جو مذکورہ بالا حضرات کے سامنے افطار سے کچھ پہلے پیالے میں پانی لے کر چلا آیا تھا۔

البتہ یہ سچ ہے کہ یہ خواص کا مقصد ہے عوام اور عوامی اور نمائشی پیروں کا نہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ قلت خواص فقیہہ کے روزہ کو صوفی پر لادنے کا جواز پیدا کر سکے اور اس پر مزید یہ کہ "روزہ اور اصلاح امراض جسمانی" جیسا عنوان بھی اسلامی تصوف کے ذیل میں آجاتا ہے۔

ع خامہ انگشت بدنداں ہے مگر کیا کہیے!

ص ۷۴ ـــــ ماہ رمضان میں ہونے والے اہم واقعات کی تفصیل درج ہے۔

شاید یہ بھی اسلامی تصوف کے تجزیدی مطالعہ کے ہی ذیل میں آئے گا؟

باب سوم ـــــــ

ویسے، تو ہر باب کے دو عنوانات ہیں مگر مندرجہ بالا تیسرے باب کے تین عنوانات ہیں

(۱) توضیحات

(۲) تصوف میں استعمال ہونے والے کچھ لفظوں کے لغوی و اصطلاحی معانی اور ان کی وضاحت

(۳) مختصر قاموس تصوف

اب ان تین عنوانات کے پیش کی جانے والی قاموس تصوف کا کچھ نمونہ ملاحظہ کیجئے

(۱) افطار (۲) اجتہاد (۳) اجماع (۴) اوباش (۵) بشر حافی (۶) تراویح (۷) تہجد (۸) تحشیہ (۹) جنابت (۱۰) حبس دوام (۱۱) رمضان (۱۲) روزہ (۱۳) زکوٰت (۱۴) سیاست (۱۵) شریعت (۱۶) شارع (۱۷) شعبان (۱۸) صحیحین (۱۹) عاشورہ (۲۰) عیدین (۲۱) علم شریعت (۲۲) علم تفسیر (۲۳) علم حدیث (۲۴) علم بیان (۲۵) عقیقہ (۲۶) عقد نکاح (۲۷) کسوف (۲۸) لیلۃ القدر (۲۹) مکروہ تحریمی (۳۰) مکروہ تنزیہی (۳۱) تکفین میت (۳۲) محاضرات (۳۳) نمرود (۳۴) کفن پہنانے کا طریقہ۔ اب قارئین حضرات ذرا غور فرمائیں۔

(الف) افطار، اجتہاد، اجماع، تراویح، تہجد، جنابت، رمضان، روزہ، زکوٰت، شریعت، شعبان، عیدین، علم شریعت، عقیقہ، عقد نکاح، کسوف، لیلۃ القدر، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، تکفین میت اور کفن پہنانے کا طریقہ وغیرہ کا تعلق فقہ اور شرع سے ہے

(ب) صحیحین اور علم حدیث وغیرہ کا تعلق ظاہر ہے کہ علم حدیث سے ہے

(ج) حبس دوام تصوف کی کوئی اصطلاح نہیں ہے، حبس دم ہونا چاہئے تھا

(د) شارع کا معنی مصنف لکھتے ہیں "کشادہ راہ" حیرت ہے کہ شارع علیہ السلام یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذہن میں نہیں آئے۔

(ہ) بشر حافی — ایک بزرگ کا نام (اگر حضرت بشر حافی کا اسم گرامی قاموس تصوف میں شامل ہو سکتا تھا تو باقی ہزاروں ہزار صوفیا نے کیا قصور کیا تھا؟)

(و) تحشیہ، عاشورہ، سیاست، محاضرات، اوباش اور نمرود وغیرہ کو کن علوم کی اصطلاحات کی صف میں رکھا جائے۔ اس کا فیصلہ قارئین خود کر لیں اس لئے کہ جناب خضر نے تو انہیں بھی اصطلاحات تصوف ہی قرار دیا ہے اور میں اس سلسلے میں خاموش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

اور اب آئیے اس کتاب کی دو سب سے دلچسپ باتیں ملاحظہ کیجئے۔

اول تو کہ اس کتاب کے سرورق پر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اسلامی تصوف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے گا مگر (پیش لفظ اور قاموس تصوف کے علاوہ) تصوف پر صرف ۴۵ صفحہ لکھا گیا ہے اور تقریباً ۵۵ صفحہ تصوف اور اتباع شریعت، (میں متمنی ہوں کہ کوئی ایسی کتاب لکھی جاتی جس میں ایک عنوان ہوتا "شریعت اور اتباع تصوف") روزہ اور اس کی حقیقت، روزہ اور روحانی ارتقاع، روزہ اور تزکیہ نفس، روزہ اور اظہار عبدیت، روزہ اور محبت انسانی، روزہ اور ترتیب النفس، روزہ اور قوت ارادی۔ روزہ اور اصلاح امراض جسمانی۔ افطار، تراویح، تہجد، اولاد پر ماں باپ کا حق، اقربا اور اعزہ کے حقوق، والدین پر اولاد کے حقوق، شوہر پر بیوی کا حق، ہمسایہ کے حقوق، دوستوں اور ہم صحبتوں کا حق، عام مسلمانوں کا حق، رمضان، روزہ، زکوٰت، شعبان، شب برات، صدقہ، عاشورہ، عیدین، عقیقہ، عقد نکاح، فطرہ، لیلۃ القدر اور نوزائیدہ بچے کی دیت، تکفین میت، اور کفن پہنانے کا طریقہ وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت گفتگو کی سپلا

نکل گئی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مندرجہ بالا عنوانات کا صوفی سے کوئی تعلق نہیں یقینی طور پہ مندرجہ بالا معاملات ایک صوفی کی زندگی کا لازمی جزو ہوتے ہیں مگر یہ تصوف کی منزل نہیں ہے۔ منزل تک پہنچ جانے کا طریقہ کار ہیں یا پہنچ جانے کے بعد ظہور میں آنے والے عمل (صالح) کا ایک ہلکا سا نمونہ ہیں۔

شکوہ یہ ہے کہ قیوم خضر صاحب نے ثانوی مسائل کو اولیت عطا کی۔

اور اصل مسائل تصوف پر گفتگو غیر ضروری سمجھی

دوئم یہ کہ روزہ پر مصنف نے اتنا زور دیا ہے کہ نماز کی اہمیت کم ہوتی نظر آنے لگتی ہے، صورت حال یہ ہے کہ روزہ کے لئے ۱۸ صفحے کا پورا ایک باب وقف ہے اور اس کے بعد بھی جی نہیں بھرا تو قاموس تصوف میں "ر" کے ذیل میں رمضان اور روزہ کے بارے میں ڈھائی صفحہ پھر لکھا گیا مگر "ن" کے ذیل میں "نماز" کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا گیا کہ "نماز کے لغوی معنی ذکر اور فرماں برداری کے ہیں، شرعی اصطلاح میں عبادتوں میں سے ایک طریقہ عبادت ہے۔"

حالانکہ روزہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ عذر بھی سنتا ہے، بوڑھوں اور بیماروں کو معاف بھی کرتا ہے اور روزہ کے بیان میں یہ بھی بشارت دیتا ہے کہ اللہ تمہارے لئے آسانیاں پسند کرتا ہے۔

مگر نماز تو بدنی عبادتوں میں ایسی عبادت ہے جس سے کسی حالت میں سبک دوشی نہیں۔

مگر قیوم خضر صاحب نماز جیسی ناگزیر طاعت و عبادت کا تذکرہ اتنا سرسری کرتے ہیں کہ شک پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ کیوں نماز کی اہمیت کا احساس نہ دلا کر روزہ کی اہمیت دو بالا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے؟ جب کہ یوں بھی ایک مہینے کا مہمان سال بھر کے مہمان سے زیادہ خوش دلی کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے!

کتابیات

کتابیات کے بارے میں کچھ حسرت رہی جا نہیں چھوڑتی کہ بقول مصنف یہ کتاب تصوف کے مسائل پر لکھی گئی ہے مگر کتابیات کے باب میں ان کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جن سے مصنف نے استفادہ کیا ہے، کہیں "ملفوظات خواجگان چشت" کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

کیا تصوف پر کوئی ایسی کتاب معتبر سمجھی جا سکتی ہے جس میں "ملفوظات خواجگان چشت" سے استفادہ کئے بغیر مصنف آگے بڑھ گیا ہو؟

مگر نہیں.........میں اپنے خیال کی خود تردید کرنا چاہتا ہوں، یہ صحیح ہے کہ تصوف پر لکھی جانے والی کتاب کو ملفوظات خواجگان سے استفادہ کرنا چاہئے، مگر یہ کتاب "مختصر راہ" تو میرے خیال میں تصوف پر لکھی ہی نہیں گئی ہے لہذا اس پر "ملفوظات خواجگان چشت" سے استفادہ کرنے کی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی۔

دراصل یہ کتاب اسی پرانی ذہنیت کی ایک تازہ کروٹ ہے جو تصوف کے سمندر پر شفقت کا بند باندھنے

کی مسلسل کوشش کرتی رہی ہے۔ اور یہ کتاب ـــــ فقہ میں بھی صرف حنفی فقہ اور مسلک کی تبلیغ کرتی ہے۔

اور اب آخر میں اس کتاب کے حوالے سے بہار اردو اکیڈمی کے ارباب اقتدار سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اکیڈمی نے اب اپنا طریقۂ کار بدل دیا ہے؟ کیونکہ پہلے تو سنا تھا کہ بہار اردو اکیڈمی اردو زبان و ادب کی خدمت اور ترویج و بقا کے لئے بنائی گئی ہے اور کسی فرقے اور مذہب کی تبلیغ سے اسے کوئی سروکار نہیں رہے گا۔

مگر یہ کتاب بتاتی ہے کہ بہار اردو اکیڈمی کے ذریعہ نہ صرف اسلام کا بلکہ مخصوص حنفی فقہ کا بھی پرچار کیا جاسکتا ہے۔

حیرت ہے کہ صوبہ بہار کے دوسرے علمائے کرام اپنے مذہبی مسودات اکیڈمی میں برائے اشاعت کیوں نہیں جمع کرتے۔

★

سید احمد شمیم

جمشید پور میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء

چھوٹا ناگپور کے شہروں میں جمشید پور کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کا پہلا لوہا اسی شہر میں ڈھلا اور جمشید پور کا پہلا شعر بھی غالباً اسی عہد میں کہا گیا۔

جمشید پور اپنی پشت پر کسی قدیم تہذیبی اور تمدنی روایت کی وراثت نہیں رکھتا، لیکن ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کے قیام کے ساتھ ہی دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں آکر بسنے لگے۔ اسی لئے جمشید پور کو اگر مختلف زبانوں اور ثقافتوں کا گلدستہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہار کا یہی تنہا شہر ہے جس کی صنعتی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کو بھیم، پانکسی اور دالگا کی موجوں نے بھی سیرابی بخشی ہے۔

جہاں تک شعر و ادب کا سوال ہے، اردو کی پہلی محفل ادب "نظم پروین" کے نام سے مولانا ابوالفرح کماکی، مولانا افضال الحق کرم، مولانا منظور الحق جود مینائی، عار بارک پوری اور عاشق شہابی نے سجائی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں عابدی سیمابی، عشرت عظیم آبادی، ضیا دکنی، غلام محی الدین انجم اور مسٹر فلپس بھی یہاں کی ادبی محفلوں کو زینت بخش رہے تھے۔ ان میں صرف عابدی سیمابی پرانے دنوں کے یادگار کے طور پر اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ضعیف، سماعت سے محروم اور چلنے پھرنے سے معذور۔

سنا ہے کہ اس زمانے میں بھی ہرے بھرے جنگلوں، سرمئی پہاڑیوں، اونچی نیچی بل کھاتی سڑکوں کے اس نوخیز شہر میں کئی معرکۃ الآرا مشاعرے ہوئے جن میں اپنے وقت کے نامور اساتذۂ فن سیماب اکبرآبادی، ناطق لکھنوی، ناطق گلاؤٹھوی، جوش ملیح آبادی نے شرکت کی۔ مولانا ابوالفرح کماکی کی شخصیت اس شہر میں مینارۂ نور تھی۔ ان کا شمار کاملین فن میں کیا جاتا تھا۔ شاعری میں خاص قسم کا طنطنہ اور لہجے میں مردانگی تھی۔ مولانا افضال الحق کرم، سنجیدہ شاعر اور بڑے عالم دین تھے۔ مولانا جود مینائی سخت اور سنگلاخ زمینوں کے دلدادہ تھے۔

کہتے ہیں کہ وقت یکساں نہیں رہتا۔ زمانہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور ہواؤں کی سمت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ وقت کے ساتھ بزرگوں کی بساطِ ادب سمٹتی گئی، نیا موسم آیا، نئی ہوائیں چلیں [illegible] نئی خوشبوئیں بکھر آئیں۔
اب شاعری صرف اظہار فن نہیں رہی، اثباتِ زندگی کا آئینہ بھی بنی۔ [illegible] میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔

جس کے پہلے جنرل سکریٹری سید سہیل واسطی چنے گئے۔ اور شہر کے تقریباً تمام لکھنے والے اس انجمن سے وابستہ ہوئے۔ جن میں رونق دکنی، احمد عظیم آبادی، کیف پرتاپ گڑھی، حبیب آروی، بی۔ زیڈ۔ مائل، مقبول نقش، فرحاں واسطی، کامتا پرشاد ہوش، پنڈت جوہر میانوی اور کرتار سنگھ خاک قابل ذکر ہیں۔

سہیل واسطی اور فرحاں واسطی کچھ دنوں کے بعد نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہو گئے اور بزم کاوش کی بنیاد ڈالی۔ سہیل واسطی اپنے بڑے بھائی فرحاں واسطی کے مقابلے میں زیادہ ذہین تھے۔ نظم و نثر دونوں میں اظہار کی منفرد صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے نظمیں، غزلیں اور رباعیات بھی کہیں۔ افسانے اور مضامین بھی لکھے اور جارج آرویل کے مشہور ناول ۱۹۸۴ء کا اردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن سہیل واسطی کی اصل شناخت ان کی شاعری سے ہوتی ہے۔ ان کے لہجے میں ایک مخصوص تیکھا پن پایا جاتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سہیل واسطی کہیں کسی جگہ جم کر نہ رہ سکے۔ ان کا سب سے بڑا المیہ خود ان کی اپنی ذات کا حصار تھا، جس سے وہ پل کو بھی باہر نہ نکال سکے۔ آخر کار ۱۹۷۰ء کی جولائی کو سبھوں سے روٹھ کر، سبھوں کو چھوڑ کر، لہولہان انا کی یہ شخصیت اس دنیا سے چپ چاپ رخصت ہو گئی۔

ان کی نظموں کا مجموعہ "سطحِ آئینہ" ۱۹۸۲ء میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ غزلوں اور رباعیات کا مجموعہ ہنوز اشاعت سے محروم ہے۔

سہیل واسطی کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدہ ہونے والے حضرات میں رونق دکنی، کیف پرتاپ گڈھی اور حبیب آروی مرحوم، ریاستی انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے۔

مقبول نقش پاکستان چلے گئے، جہاں ان کی طویل نظم "جوئے خوں" اور بہت ہی خوبصورت شعری مجموعہ "نوشتہ" شائع ہو چکا ہے۔ حبیب آروی اب دنیا میں نہیں رہے۔ حبیب صاحب خاص لہجے کے شاعر تھے۔ "حرف و ضرب" اور "زمزمے" کے نام سے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی قیادت سہیل واسطی کے علیحدہ ہونے کے بعد بی۔ زیڈ۔ مائل نے سنبھالی۔ اور اس انجمن کے پلیٹ فارم سے گرجن سنگھ، بہر بنس دوست، حمید قیصر، نشتر سلام، اسد معصوم، شفیق اعجاز، فضل چھپروی، حامد عالم، دل رضوی، عبدالرزاق کھڑگپوری اور ل۔ م۔ شاہد کے نام ابھرے۔ ۱۹۶۰ء تک یہ انجمن جمشید پور میں اردو چہل پہل کا مرکز رہی، پھر آہستہ آہستہ اس کی رونقیں کھو گئیں اور یہ تقریباً مردہ ہو گئی۔ پھر جب ۱۹۸۰ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو ملک گیر پیمانے پر متحرک بنانے کی کوشش کی گئی تو یہاں میں اس کی ذمہ داری منظر شہاب کو سونپی گئی اور شاخ جمشید پور کے جنرل سکریٹری ساغر برنی بنائے گئے، لیکن زندگی کے آثار ہنوز ناپید ہیں۔

گئے دنوں میں یہاں کے ایک بزرگ شاعر سالک آروی کے شاگردوں نے بھی حلقہ سالک کی بنیاد رکھی تھی، جس میں عاشق نوادوی، آزاد گورداسپوری، جمیل مظہر، جمال مینائی اور اسلم بدر خاص طور پر شریک تھے۔ سالک صاحب کے انتقال کے بعد یہ حلقہ بکھر گیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں میں سے اکثر اس شہر کو چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن وہ جو اس دنیا میں نہیں رہے۔ اسد معصوم، حامد عالم اور بہر بنس دوست خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسد معصوم آتشزنی کے حادثہ کا

شکار ہوئے اور نوجوانی میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ حامد عالم افسانہ نگار تھے۔ بلاشبہ ان میں ابھرنے کی بڑی صلاحیت تھی لیکن مستقل افلاس اور نامساعد حالات سے تنگ آکر تیزی سے ابھرنے والا یہ کہانی کار ایک دن اپنے آپ کو چھلگو ندی کی موجوں کے حوالے کر گیا۔ پتہ نہیں اس کی بیوی اور بچے کہاں ہیں۔ ہربنس دوست کئی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے ڈرامے بھی لکھے، کہانیاں بھی لکھیں اور ناول بھی۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ "گیت اور چیخ" ناول "بلندی کی طرف" "اور ڈرامہ "جسٹا پگھلتا ہے" اپنے زمانے میں کافی پسند کیا گیا تھا۔ ہربنس دوست نے امن کے موضوع پر اردو اور دیگر کئی ملکی زبانوں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کی کہانیاں اور نظموں کی ایک ضخیم اینتھولوجی "ہم امن چاہتے ہیں" شائع کی تھی۔ لیکن اس کی بنیادی دلچسپی اسٹیج سے تھی۔ پھر وہ بمبئی کی فلمی [illegible] فلموں کی کہانیاں اور منظر نامے لکھے اور کچھ فلموں میں ہلکا پھلکا کام بھی کیا۔ پھر ایک عورت کی محبت [illegible] اور نہ جانے کس صدمے کے تحت خودکشی کر لی۔ ہربنس دوست کی یادیں اب بھی آنکھیں نم کرتی ہیں۔

جمشید پور کے موجودہ بزرگ شعرا میں مولانا شاکر گیاوی، عابد کاسیابی، رونق دکنی، کیف پرتاپ گڈھی، احمد عظیم آبادی، بی۔ زیڈ۔ مائل، کامتا پرشاد ہوش، منظر شہاب اور عبرت مورانوی کا نام لئے جا سکتے ہیں۔ جناب شاکر گیاوی نے خود کو عبادت و ریاضت کے لئے وقف کر دیا ہے، اور ان کی مذہبی اور اصلاحی نظموں کا مجموعہ "حجازی نغمے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ عابد کاسیابی شعر گوئی ترک کر چکے ہیں۔ رونق دکنی ایک عمر گذار نے کے بعد بھی لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کی چیزیں اکثر رسائل میں نظر آجاتی ہیں۔ مجموعۂ کلام "متاع ہنر" ۱۹۸۳ء میں شائع ہو [illegible] علاوہ انھوں نے انگریزی ناول کا ترجمہ بھی کیا ہے، جو لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ کیف پرتاپ گڈھی [illegible] بھی ملازمتوں سے سبکدوش ہو کر سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ احمد عظیم آبادی کو بہار میں [illegible] کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ احمد صاحب کے تین مجموعے "سازینہ" "احاطے" اور "دعا کی واپسی" شائع ہو چکے ہیں۔ کیف پرتاپ گڈھی کا اب تک کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا ہے۔ اپنے ہم عصروں میں زبان و بیان پر جو قدرت انھیں حاصل ہے اس کا اعتراف اُن کے مخالفوں کو بھی ہوگا۔ کیف صاحب شاعری میں مقصدیت کے قائل ہیں۔ اور روایت کے پاسدار۔ مگر نئی آوازوں کو بھی محبت اور توجہ سے سنتے ہیں۔ بی۔ زیڈ۔ مائل کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ انہوں نے یہاں کی نئی نسل کی ذہنی تربیت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے مارکسزم اور سوشلزم کے قائل ہیں۔ ان کا لہجہ یقین کی روشنی سے تابناک ہے اور ہم عصروں سے جدا ہے۔ عبرت مورانوی شہر کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں "بہار و خزاں" کے نام سے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ پچیس سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ منظر شہاب لہجے کی نفاست اور جذبے کی آنچ کے شاعر ہیں۔ ایک زمانے میں انہوں نے "چاندنی رات" "ساقی نامہ" اور "ایک رات" جیسی خوبصورت اور طویل نظمیں اردو شاعری کو دی تھیں۔ لیکن کریم سٹی کالج کے پرنسپل ہونے کے بعد شاعری سے ان کا رشتہ تقریباً ٹوٹ کر رہ گیا۔ خدا کا شکر ہے انہوں نے اپنے اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے استوار کر لیا ہے۔ اور اب ان کے لہجے میں نئی دلآویزی پیدا ہو گئی ہے۔

اسی نسل کے بعد کے شعرا کی فہرست خاصی طولانی ہے اور ان میں اکثریت ایسے شاعروں کی ہے جو آج بھی استاد اور شاگردی کی روایت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن چند نام ایسے ضرور ہیں جن کی شاعرانہ صلاحیت کو نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان میں طیب واسطی، جوہر بلیاوی، شیدا چلبی، شمس فریدی، شمس صدیقی، شائق مظفر پوری، شمیم مدنی، حفیظ بیتاب، اسلم بدر، تاباں واسطی اور رضوان واسطی کے نام یاد آرہے ہیں۔ طیب واسطی زبان وبیان پر توجہ دیتے ہیں۔ جوہر بلیاوی، شمس صدیقی، حفیظ بیتاب، روایت اور جدت کے درمیان چلتے ہیں۔ جوہر بلیاوی نے زندگی کو تیاگ اور تپسیا کی طرح بھوگا ہے۔ اور اس تپسیا اور تیاگ کی آنچ ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر وائی۔ وی۔ یوشیدا چلبی اردو زبان کے پہلے چینی شاعر ہیں۔ شائق مظفر پوری کی غزلوں کا ایک مجموعہ "نیا سورج" شائع ہو چکا ہے۔ شمیم مدنی نسوڑ شاعر ہیں۔ شمس فریدی ملازمت کے تعلق سے ان دنوں مسقط میں ہیں۔ انہوں نے نئی حسیت کی خوبصورت شاعری کی ہے اور سید احمد شمیم کی شرکت میں نئی نظموں کی ایک انتھولوجی "گلوب" شائع کر چکے ہیں۔

جمشید پور میں نثر لکھنے والوں کی ہمیشہ بڑی کمی رہی ہے۔ ہربنس دوست کا نام پہلے ہی لیا جا چکا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہندوستان گیر شہرت کے افسانہ نگار گربچن کی کہانیوں کا مجموعہ حال ہی میں "کالا سورج" کے نام سے شائع ہوا ہے کریم سٹی کالج کے قیام کے بعد زکی انور بھی اسی شہر میں آبسے تھے، زکی انور کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انہوں نے اردو فکشن پر تقریباً ساڑھے تین سو کہانیاں، دو درجن سے زائد ناول اور پچاسوں ریڈیو فیچر اور ڈرامے دیئے۔ زکی انور کو کہانی کے فن پر بڑی مہارت تھی۔ لیکن ۱۱ر اپریل ۱۹۷۹ء کو باد سموم کا جھونکا چلا تو ظلمتوں میں امن اور انسانیت کا چراغ جلانے والا یہ فنکار ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا۔

جدید نسل سے تعلق رکھنے والے نثر نگاروں میں سب سے اہم نام منظر کاظمی کا ہے، منظر کاظمی نے یوں تو جدید حسیت کو اپنی بعض کہانیوں میں اسلامی روایات کے پس منظر میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے فن کی اصل شناخت "لکشمن ریکھا" "ایک کجلائی ہوئی شام" "ٹاور آف بیلون" میں ملتی ہے۔ جن میں معاشرتی، سیاسی اور انسانی کرائسس کو بیان کیا گیا ہے۔ منظر کاظمی کی انفرادیت اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے بیان کی تمام تر اشارتی اور تمثیلی خوبیوں کے باوجود زمین سے اپنا رشتہ بہت مضبوط رکھتا ہے۔ بالکل نئے کہانی کاروں میں انورامام کا نام بھی قابل ذکر ہے "جونک" اس کی ایک خوبصورت اور کامیاب کہانی ہے۔

جمشید پور میں نقادوں کی بڑی کمی رہی ہے۔ کبھی کبھار منظر شہاب، منظر کاظمی، ڈاکٹر نثار مصطفےٰ اور جوہر بلیاوی کے مضامین نظر آجاتے ہیں۔ نثار مصطفےٰ کی ایک تنقیدی کتاب "راجندر سنگھ بیدی شخصیت اور فن" ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکی ہے۔

جمشید پور میں خواتین لکھنے والیوں میں ماضی کا ایک نام سلطانہ فاطمہ واسطی ہے۔ اُن کے بعد طلعت بدر فاطمہ اور انیس فاطمہ کے نام ابھرے۔ ۱۹۶۴ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد یہ دونوں بہنیں بنگلہ دیش چلی گئیں۔ معلوم نہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ نئے لکھنے والیوں میں محمودہ نعمی اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ نعمی شاعرہ ہیں۔ اور ان کی آواز میں ایک ایسی پیاس ملتی ہے جو اندر کے ویرانوں کا پتہ دیتی ہے۔

پریس کی محرومی، جمشید پور کی ادبی سرگرمیوں کی راہ میں ہمیشہ سے رکاوٹ رہی ہے۔ پھر بھی بعض حوصلہ مند گاہے گاہے چند ایک ماہنامے اور ہفتہ وار نکالتے رہتے ہیں، اس سلسلے میں فی الحال کچھ نام یاد آرہے ہیں۔

(۱) ماہنامہ "نظام ادب" ایڈیٹر شمیم پھلواروی

(۲) ماہنامہ طفل	ایڈیٹر	پرنس دوست
(۳) 〃 مشعل	〃	بی۔ ایس۔ گل
(۴) 〃 آئندہ	〃	سہیل واسطی
(۵) ہفتہ وار اتحاد و ترقی	〃	نقیب آروی
(۶) 〃 روشنی	〃	ل۔ م۔ شاہد
(۷) 〃 ہندی	〃	قدوس یحیٰی
(۸) 〃 دستک	〃	زکی انور، منتظر کاظمی
(۹) 〃 بزم		حسن نظامی کراچی
(۱۰) 〃 ہم لوگ		فخر الدین واصل
(۱۱) 〃 آزاد صدا		〃
(۱۲) سہ ماہی ترسیل		شاہینہ امام

ان میں صرف "آزاد صدا" (ہفتہ وار) برائے نام زندہ ہے۔ اور کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔ جمشید پور کی اُردو آبادی بہار کے دوسرے شہروں کی اردو آبادی کے مقابلے میں اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ بعض ذی حیثیت حضرات کے تعلیمی فروغ کے لئے ذاتی سطح پر بعض بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جمشید پور میں اردو علم و تہذیب کی پہلی شمع جناب سید تفضل کریم مرحوم کے مبارک ہاتھوں سے روشن ہوئی۔ اور آج کریمیہ ٹرسٹ کی نگرانی میں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے پورا ایک تعلیمی کمپلیکس چل رہا ہے۔ کریمیہ ٹرسٹ کے علاوہ حاجی عبدالحکیم کی نگرانی میں چلنے والا کیپمو ریل ٹرسٹ ہے۔ ان دو ٹرسٹوں کے علاوہ اُردو بولنے والوں کی نگرانی میں کئی اسکول اور دینی مدارس کی خدمات کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ جو اپنے محدود وسائل کے باوجود مصروف کار ہیں۔ جن میں سے علامہ ارشد القادری کے زیر اہتمام و انصرام چلنے والا مدرسہ فیض العلوم اپنی شاندار عمارت کے لئے قابل رشک ہے۔ اور اہم بات یہ کہ اس مدرسہ کے تحت فیض العلوم گرلز ہائی اسکول، اور فیض العلوم ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بھی چل رہے ہیں۔

"آل انڈیا یونیورسٹی اُردو ٹیچرز کے سیمینار میں پڑھا گیا۔"

الف لام میم ——— کلام حیدری

o دتی کلچرل اکیڈمی ماہنٹڑ جگ جیون نیوز گیا o

ممتاز احمد خان

پھیلاؤ

لسٹ کا پیٹ فرمائشوں کے کیڑوں سے بھرا پڑا ہے!

اس کے ذہن میں ایک طوفان بپا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ ان کیڑوں کو مسل دے تاکہ لسٹ کا پیٹ خالی ہو جائے۔ وہ گزشتہ بیس سال میں یہی خواہش کرتا آیا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

شیروانی زیب تن کرکے وہ دفتر چلا آیا ہے۔

اس کے کلرک اسے انکھیوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ جانتا ہے ان میں سے ایک دو اسے دل ہی دل میں گالیوں سے بھی نواز رہے ہوں گے۔ پھر اس نے چاروں طرف اکتا کر دیکھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جس سیٹ پر وہ بیٹھا ہے وہ اسے نگل جائے گی اور اس کے بعد وہ قبر کے کیڑوں کا چارہ بن جائے گا۔

دفتر میں وہی بھیڑ بھاڑ، ٹائپ رائٹروں کی کھٹ کھٹ۔ کلرکوں کی الٹی سیدھی باتیں، افسروں کا رعب داب، چپراسیوں کی خرمستیاں، غرض مندوں کی خوشامدانہ باتیں۔ راشی لوگوں کے جوڑ توڑ اور فائل وقت پر نہ ملنے کی شکایتوں کا ماحول جاری و ساری ہے۔ وہ شیروانی اتار کر کرسی کے پر پھیلا دیتا ہے اور حسب معمول آواز لگاتا ہے — آج کے سب فائل لے آؤ۔ خورشید — اور کلرک خورشید بڑبڑاتا ہوا کام پر لگ جاتا ہے — سب فائل ڈسپوز DISPOSE ہو گئے تو ہمیں ملے گا کیا خاک؟

سامنے دیوار پر جلی حرفوں میں لکھا ہے —

رشوت لینے اور دینے والا۔ دونوں جہنمی ہیں۔

پر کون اس پر کان دھرتا ہے؟

لیکن ہر ایک دو روز بعد وہ اپنے کلرکوں سے کہتا ہے۔ ان الفاظ کو پڑھو اور ان پر عمل کرو۔

ہا-ہا-ہا-ہا— وہ سب ہنستے ہیں لیکن وہ بدمزہ نہیں ہوتا کہ اس کا کام تو نیکی کا پیغام پہنچا دینا ہوتا ہے — آگے بس!!!

دو فائل بھگتانے کے بعد وہ لسٹ کو کرتے کی جیب سے نکال کر میز پر رکھ کر پڑھنے لگتا ہے۔

تینوں بچوں کے سلے سلائے دو یونیفارم مونوگرام کے ساتھ — بارہ پنسلیں — پانچ کتابیں۔ سولہ کاپیاں ایک سطر والی اور چھ کاپیاں چار لائن والی اور بڑی نوجوان لڑکی کے لئے سینڈل کیوں کہ وہ ایک عرصے سے پھٹا پرانا سینڈل پہن رہی ہے اور اسے اب اسکول فنکشن میں شریک ہونا ہے۔ اور اس فنکشن کا افتتاح حکومت کے ایک عالی عہدیدار کو کرنا ہے۔

لسٹ سے نظر ہٹا کر وہ لکڑی کی پلیٹ کو دیکھتا ہے جس پر لکھا ہے "سپرنٹنڈنٹ" پھر اسے یاد آتا ہے کہ گزشتہ رات اس کی جھکی

بیوی نے اس پر کئی لاکھ الفاظ کی بارش کی تھی کہ جس سے اس کا موڈ چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا — میں کچھ نہیں جانتی۔ کل یہ سب چیزیں آجانا چاہئیں، خواہ چوری کرو یا قرض لو۔ سمجھے۔ بدھوؤں کی طرح سر کیوں ہلا رہے ہو۔ کیا زبان سل گئی ہے ؟؟

"خدا تیری اصلاح کرے بھاگوان" بس وہ اس قدر کہہ سکا تھا۔

وہ خریداری پر اٹھنے والی رقم کا تخمینہ لگاتا ہے۔ تین سو روپیہ — جب کہ اس کی جیب میں محض پچاس روپے ہیں — ڈھائی سو روپے کا فرق اور تنخواہ میں دس دن باقی ہیں — اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کس سے قرض لے ؟ وہ قرض لینے سے حتی الامکان بچتا رہا ہے کہ ایمان دار مقروض تار عنکبوت میں پھنسی مکھی کی مانند بن کر رہ جاتا ہے۔

اچانک اس کا منجھلا لڑکا بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ سب سے چھوٹی بچی کو چوٹ لگ گئی ہے اور کافی خون نکل گیا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے نائب سے کچھ کہہ کر باہر آجاتا ہے۔ رکشہ والا ادھیڑ عمر کا شخص ہے مگر وہ ضد کر رہا ہے کہ وہ دو روپے اوپر سے لے گا۔ رکشے والے کی گردن میں تسبیح بھی پڑی ہے۔ وہ اپنے لڑکے کے ساتھ رکشے میں بیٹھ جاتا ہے۔ رکشہ ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔

[illegible] کے دفتر ہی کا سا ماحول ہے۔ [illegible] — کام میں دیر — غیر انسانی رویئے۔ ڈاکٹروں کا اغماض اور ڈسپنسروں کے نخرے اور نرسوں کا ادھر سے ادھر "ہونہہ" کہہ کر گزر جانا — اپنی بچی کی مرہم پٹی کرا کے وہ گھر لوٹ آیا ہے۔

اب پھر سست ہے اور وہ — یوں لگتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ اب وہ قرض حاصل کرنے پر کمر باندھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس طرح اسے آئندہ ماہ ملنے والی تنخواہ کا ایک چوتھائی حصہ گنوانا پڑے گا۔

قرض حاصل کر کے وہ بے اختیار سمندر کی طرف مڑ جاتا ہے۔ سمندر طغیانی پر ہے۔ بچپن میں وہ شام کے وقت دریا پر چلا جایا کرتا تھا۔ اب سمندر کے جاہ و جلال کو دیکھ کر وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ ندی اور دریا کا عظیم الشان پھیلاؤ ہے۔ مگر کیا میری زندگی میں کبھی پھیلاؤ نہیں آئے گا ؟ میری زندگی ندی سے دریا بنی مگر یہ دریا کسی کو سیراب نہ کر سکا !! کیا میں سمندر بن پاؤں گا؟ پھر اسے خود ہی اپنے بے سرو پا خیالات پر ہنسی آجاتی ہے۔ سمندر کی لہریں اس کے گھٹنوں تک آ آ کر گزر جاتی ہیں مگر وہ اپنے خیالوں میں گم ہے۔ پھر رات پڑنے لگتی ہے۔ اب وہ گھر جانے کے لئے ساحل سے پرے چلا آیا ہے۔ آخری بس کا کنڈکٹر بد رنگی آواز میں مسافروں کو بلا رہا ہے۔ وہ کھٹ سے بس میں بیٹھ جاتا ہے۔

اپنے گھر پہنچ کر اسے یہ المناک خبر سننا پڑتی ہے کہ لاہور سے اس کا چچا زاد بھائی معہ بچوں کے اگلے روز پہنچنے والا ہے۔ در اصل [illegible] طویل عرصے بعد [illegible] بے تکان بولے چلے جا رہی [illegible] تقریر کے موضوع کا تعلق غریب [illegible] کے یہاں مہمانوں کی آمد سے پیدا شدہ گمبھیر مسائل سے ہے۔ وہ اسے تسلی دینے لگتا ہے اور بتاتا ہے کہ مہمانوں کے لئے خدا نے رزق کا سامان پہلے ہی فراہم کر دیتا ہے۔

اس کا چچا زاد بھائی خاصا بوڑھا ہو چکا ہے

ہ ایک زمانے تک بنک میں گن مین رہا تھا۔ اس لئے
یشہ تنگ دستی سے گزر بسر کرتا رہا تھا۔ مگر اب ؟
ہ اسے تفصیل بتا رہا ہے کہ اس کے ڈپلومہ یافتہ ٹیڈے
دو بیٹے سعودی عرب میں ہیں اور خدا کے فضل سے
ں ہزار روپے بھیجتے ہیں ۔ تیسرا والا خراد مشین کا
ام سیکھ رہا ہے اور کسی دن وہ بھی دبئی یا کسی اور
یل فروش عرب ملک کو سدھار جائے گا۔ اس کی
ایک لڑکی اسکول میں ٹیچر ہے۔ اپنا جہیز مزے مزے
سے تیار کر رہی ہے۔ اس کا چچا زاد بھائی مزید بتا رہا
ہے کہ وہ خود اپنے گھر میں پرچون کی دکان کھول کر
تین ہزار روپے ماہوار نفع کما رہا ہے۔ وہ ان باتوں
کو غور سے سن رہا ہے۔ پھر وہ اچانک پوچھتا ہے۔
"رفیع بھائی — آپ اسی محلے میں رہتے ہیں
اب تک ؟"
"توبہ کرو جی۔" وہ سینہ پھلا کر جواب دیتا ہے۔
"ہم نے ماڈل ٹاؤن میں بنا بنایا بنگلہ خرید لیا ہے۔"
اس کی بیوی کے کان ان دونوں کی طرف
لگے ہوئے ہیں لیکن زبان سے وہ بڑبڑانے کا کام لے
رہی ہے۔
"میرے دونوں لڑکے پرسوں سعودی عرب سے
آرہے ہیں" اس کا چچا زاد بھائی اسے بتانے لگتا ہے
"میں نے سوچا تمہارے یہاں قیام کر لوں اس طرح دونوں
سے تمہاری ملاقات بھی ہو جائے گی اور ہمارے تمہارے
پرانے رابطے بھی بحال ہو جائیں گے۔"
جواباً وہ اسے بتاتا ہے کہ شہلا میٹرک میں ہے
اس کا چچا زاد بھائی کہتا ہے ... بڑی
پیاری بچی ہے۔ خدا نصیب اچھا کرے۔
شہلا ... جاتی ...

اس کا بھائی اس کے کان کے قریب منہ لا کر
کہتا ہے : "ویسے تمہارے لڑکوں کو بھی خدا ......" وہ
اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیتا ہے۔ نہ جانے کیوں ؟
اچانک اس کا دل چاہا کر سمندر پر جائے اور
اس سے ہمکلام ہو۔
پھر اچانک اس کے دونوں بڑے لڑکے باہر سے
بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ دونوں ہانپ رہے ہیں۔ ان کے
کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے ہیں اور چہروں پر سے
خون بہہ رہا ہے۔ شاید باہر ان کی کسی سے لڑائی ہوئی
ہوگی۔ اس کی بیوی نے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ
اٹھا کر دونوں کو بڑے بڑے کوسنے دینا شروع کر
دیئے ہیں — خدا کرے تم دونوں کو .... تم
دونوں ..... تم ....
وہ تڑپ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہے
"ان لوگوں کو بد دعا نہ دے بھاگوان — کبھی کے
برے الفاظ ...."
اس کے ساتھ وہ لمبی آہ بھرتا ہے۔
اور وہ اسے حیرت سے تکنے لگتی ہے
مگر وہ اپنی بیوی سے بے نیاز دونوں بچوں
کو پیار کرنے لگتا ہے۔

بدر اورنگ آبادی

انتظار

..... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فائلوں کے انبار میں ایک کار کا ہیولیٰ فائل کے اندر رینگنے لگتا اور میں حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا کہ یہ کار میری فائل میں کیسے گھس آئی۔ کہاں کار کی لمبائی اور یہ ننھی منی فائل! لیکن ذہن کا تو کوئی سائز نہیں!! —
اور تب مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ کار کے لئے سوچنا کوئی غیر فطری عمل نہیں تھا لیکن یہ بس ایک سایہ تھا جو چھلاوے کی طرح آیا اور گذر گیا۔ اور یہ بات فائلوں کی گرد میں ہی دب کر رہ جاتی اگر سلام بھائی سے ملاقات نہ ہو جاتی اور ملاقات اتنی گہری نہ ہو جاتی کہ میرے گھر پر ان کا آنا جانا شروع ہو جاتا اور میں سلام بھائی کی کار میں اکثر ان کے ساتھ گھومنے نکل جاتا۔ پہلی بار تو ایسی انجانی مسرت چھائی رہی مجھ پر کہ میں اپنی محسوسات کو سمجھ ہی نہ سکا لیکن رفتہ رفتہ جب حیرت نا کیاں دور ہوتی گئیں تو ..... عجیب عجیب منظر سامنے آنے لگے۔ گاڑی جب چلتی تو باہر کے سبھی لوگ مجھے چھوٹے چھوٹے دکھائی دینے لگتے — "ایسا کیوں لگتا سلام بھائی؟" اور سلام بھائی کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقص کر جاتی — سلام بھائی ہیں ہی ایسے آدمی کہ بیشتر سوالوں کا جواب ان کی مسکراہٹ دے دیتی ہے لیکن میرے سوال کے جواب میں ان کی مسکراہٹ میرے پلے نہیں پڑی — کچھ دنوں بعد گاڑی سے کچھ بے تکلفی بھی بڑھ گئی اور ایک دن .... ایک دیہاتی سر پر گٹھری لئے چلا جا رہا تھا کہ میں نے زور سے ہارن دبا دیا اور دیہاتی بے چارہ اچھل کر فٹ پاتھ پر بھاگا — میرا دل خوشیوں سے بھر گیا — —
"کمال کرتے ہیں آپ! ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو؟" "چھوڑیئے سلام بھائی، اگر ہوتا تو کار کو یا ہم لوگوں کو تو کچھ نہیں ہوتا — ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھر پھیل گئی جس کو میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ لیکن ایک رات کا سفر مجھے آج تک یاد ہے جب اندھیرے کو چیرتی ہوئی گاڑی چل رہی تھی تو گاڑی کے ہیڈلائٹ سے نکلتی ہوئی سیدھی اور تیز روشنی راستے منور کر دیتی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ہیڈلائٹ کی روشنی سے پرے کچھ نہیں ہے — دنیا کی حد یہیں ختم ہوتی ہے! اور یہ تجربہ جاری رہتے اگر ایک دن جبار مجھے ٹوک نہیں دیتے۔

"آج کل سلام بھائی سے ملاقات ہو گئی ہے تو لوگوں کو آپ بالکل بھول ہی گئے؟" اور پان سے بھرے منہ سے پھوٹتی ہوئی ہنسی مجھے کار سے اتار لائی۔

"نہیں! یہ مین روڈ — فرایا لال سے چرچ تک کیسے چھوٹ سکتی ہے؟ چھوڑئے۔ چلئے۔ چائے پی جائے"

"ہاں۔ ہاں۔ وہ تو ہوگا ہی" صمد کی کھنکتی آواز گونجی اور یہ ٹولی حسب معمول ایک ہوٹل کی میز پر جم گئی اور چائے اور سگریٹ کے دھوئیں منتشر ہوتے رہے۔

اور پان کھانے کے بعد پانچ آدمیوں کا یہ قافلہ بکھر جاتا
اور پھر ہر شخص اپنے آپ میں سمٹا سمٹا یا وقت کی پابندیاں
جھیلتا رہتا۔ اس معمول میں کسی تغیر یا تبدیلی کا کوئی امکان
ہی نہیں دکھائی دیتا۔

لیکن اس معمول میں جب بھی کوئی کار گرد اڑاتی
ہوئی میرے پاس سے گزر جاتی تو پائپ سے نکلتا ہوا
دھواں مجھے گیس چیمبر کی یاد دلا دیتا اور گرد!...... کب
تک ہم لوگ گرد اور دھواں اپنے پھیپھڑوں میں اتارتے
رہیں گے؟ اور ایک۔ دو بار ایسا بھی ہوا کہ راستہ
صاف رہنے کے باوجود پیچھے آتی ہوئی کار سے بار بار
بار سائرن کی طرح بجنے لگتا اور ہم لوگ بالکل کنارے
آجاتے جیسے کار کو ہم لوگوں کے سایہ سے بھی محفوظ رکھنا
مقصود ہو۔ اور برسات میں! برسات میں تو پیدل چلنے
والے کار والوں کے لئے ذریعہ مسرت ہوتے۔ یہ صورتِ
حال ناقابل برداشت ہو رہی تھی گرچہ یہ صورتِ حال
نئی نہیں تھی لیکن سلام بھائی کی کار پر کئی بار سفر
کرنے کے بعد اس صورت حال کو ایک نئی سمت عطا
ہو گئی تھی۔

"کیا علاج ہے صغیر صاحب؟"

"علاج تو ہے — ایک سائیکل خرید ..."

"سائیکل! خیال تو بڑا اچھا ہے لیکن بھائی یہاں
تو تنخواہ ملنے کے پہلے ہی حساب کرنا پڑتا ہے کہ کتنا قرض
کاٹ کر کس کو ادا کیا جائے اور سائیکل ..."

"ارے اس کی تنخواہ اتنا بڑا ...
آپ نے؟ دفتر سے ایڈوانس مل جائے گا"
حسب معمول فضا میں گونجا ...

...... اور اسی طرح ایک شام
پر ایک چمچماتی نئی سائیکل کھڑی ...

پر خوب زور زور سے گھنٹی بجائی جسے سن کر بچے باہر نکل
آئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی سائیکل کی گھنٹی
بجا کر پوری دنیا کو پکار سکتا تھا۔

"دیکھو۔ دیکھو۔ یہ نئی سائیکل ہے نا؟ یہ میں
نے خریدی ہے۔" اور کواڑ کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی
روپا اور اس کے بدن سے لپٹ کر کراہتی ہوئی ساڑی
کی چمچماہٹ یکسر معدوم کر دی۔ اے کاش!۔

"روپا۔ دفتر سے ایڈوانس لے کر یہ سائیکل میں نے
خریدی ہے۔ میرے پاس تو......"

"ہاں۔ ٹھیک ہی تو کیا۔ اتنی دور دفتر اور روزانہ
پیدل جانا اور آنا۔ ڈور زندہ یہاں پر ہے۔"

یہ تھا روپا کا ایثار۔ قمیص یا پینٹ کا رفو کرنا
ہو۔ یا ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکنے ہوں یا پھٹے ہوئے کالر
کو الٹنا ہو، وہ یہی کہتی کہ "آپ کے پاس کپڑے نہیں
ہیں۔ بنوا کیوں نہیں لیتے۔"

"لیکن میں کیسے کہتا کہ "روپا، تمہاری یہ ساڑی
کب کی ہے؟ تم ایک ساڑی کیوں نہیں خرید لیتیں۔"

"ایسا کرتا ہوں روپا، کہ سائیکل بیچ دیتا ہوں۔
دفتر میں تو ایڈوانس کی رقم قسطوں میں کٹے گی لیکن
مجھے ... یکمشت مل جائیں گے اور بچوں کے اور تمہارے
کپڑے......"

"کہاں کی ... ہیں آپ بھی۔ کتنی مشکل سے تو ایک
چیز آئی ہے گھر میں!" روپا کے کمھلائے ہوئے چہرے پر
پھیلنے والی مسکراہٹ کی میں تاب نہ لا سکا ——
... انگارے ... سلگتی ہوئی چنگاریوں
... تو ... اور یہ سائیکل میری زندگی
... بن گئی۔

جب ... جانے کے لئے میں سائیکل پر سوار ہو کر

مین روڈ پر ابر [illegible] تو مجھے لگتا جیسے پوری دنیا میرے پیروں تلے ہو اور میں چاہوں تو اسے روند سکتا ہوں اور غیر شعوری طور پر میری انگلیاں سائیکل کی گھنٹی پر چلتی رہتیں اور ٹن ۔ ٹن ۔ ٹن ۔ ٹن کی آواز میرے خون کو گرما دیتی جیسے میں یہ اعلان کرنا چاہتا تھا کہ میں بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ لوگوں کو کچھ کنارے ہٹ کر میرے لئے راستہ چھوڑنا پڑے ...... لیکن وہ دوسرا منظر نہ جانے کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ جب کسی کار کی آواز ملتی تو میں اپنی سائیکل کو خود ہی کنارے کر لیتا ــــ ایسا [illegible] تو ہے لیکن کیا ایسا ہونا ہی ہے کہ پیدل چلنے والے سائیکل کی گھنٹی سن کر راستہ چھوڑ دیں اور کار کا ہارن سن کر سائیکل سوار کنارے ہو جائیں اور کار والے ــــ ان کو بھی سائیڈ دینا ہی پڑتا ہے ــــ پھر مجھے کار کی ہیڈ لائٹ یاد آگئی اور میں نے بہ ہزار دقت اپنی سائیکل میں ڈائنامو والی لائٹ لگوائی اور روزانہ کسی نہ کسی بہانہ میں رات کے وقت سائیکل لے کر گھر سے نکل آتا کہ شاید میری سائیکل کی روشنی میں حد بندیوں کو دکھلا سکے لیکن روشنی [illegible] ہوئے شہر میں خود میری سائیکل کی لائٹ [illegible] ــــ اور ان دونوں بچے مجھے [illegible] ان کا کھیل پسند آتا، رویا کی تمام باتیں [illegible] معلوم ہوئیں اور نہ کھانے میں نمک کم معلوم ہوتا [illegible] زیادہ مرچ کی شکایت ہوتی اور نہ ... [illegible] فائلوں کے بوجھ سے دبے ہوئے جسم و ذہن رکھنے [illegible] لوگوں کے لئے دیگر سامان تفریح اور میں کیا؟

منگوں بھری ایک شام تھی ۔ میں نہا دھو کر اور [illegible] بچوں کو چمکارتا اور رویا کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا سائیکل لے کر گھر سے نکل گیا ۔ رویا کی مسکراہٹ مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی اور اس وقت نہ میں اس کی ساڑی دیکھ سکا اور نہ بچوں کے کپڑوں پر لگے ہوئے پیوند! میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سرشار سائیکل کی لائٹ جلا کر، گھنٹی بجاتا ہوا بڑیا تو کی طرف نکل کھڑا ہوا ۔ راستے میں کار کے ہارن کی آواز ملی لیکن میں کنارے نہیں گیا ۔ کیا یہ ضروری تھا؟ اور اگر یہ ضروری تھا بھی تو کیا وہ انتظار نہیں کر سکتا تھا ۔ اچانک ہارن سے بڑی کرخت آواز نکلی اور زوردار چرچراہٹ کے ساتھ کار ٹھیک میرے پاس آکر رک گئی ۔ میں گھبرا کر سائیکل سے اتر آیا اور کار کے اندر سے گرجتی ہوئی آواز باہر آئی ــــ

"سالے سو روپئے کی سائیکل پر چلتے ہیں اور لگتا ہے کہ لاٹ صاحب ہی جا رہے ہوں ۔" اور ساتھ ساتھ کار کی ہیڈ لائٹ بھک سے روشن ہوگئی اور گاڑی فراٹے بھرتی روانہ ہوگئی ــــ دنیا مجھے گھومتی نظر آنے لگی اور میں نے زمین پر تھوک دیا ۔ اور اس روز سے مجھے اس دن کا انتظار ہے جب کار کی ہیڈ لائٹ ہی زندگی کی حد مقرر نہیں کرے گی ۔

★

گیا

پہلا قتل

منیر جہاں (کنیڈا)

کوئی شریک نہ پاکر
اور تنہائی سے گھبرا کر
اپنی چھوٹی سی بچی کو
میں نے اک شب پاس بلایا
اور بتایا
تنخواہ اب کے بھی کم ہوگی
چھٹی میں نے زیادہ لے لی
گھر کا کرایہ
بجلی کا بل
دودھ کے پیسے
فیس تمہاری
جانے یہ سب کیسے ہوگا ؟
چھوٹا سا معصوم سا چہرہ
سخت پریشاں
آنکھ میں فکر کے بادل چھائے
ننھے سے ماتھے پر بل تھے
دھیمے لہجے میں وہ بولی
"اب کیا ہوگا — اب کیا ہوگا۔

کتنی فکریں کتنے خدشے
اک جملے میں جاگ رہے تھے
میں اس سے اس کا بچپن
بے فکری کے خواب سہانے
سب کچھ اک لمحے میں چھینا

ان لمحوں کو صدیاں بیتیں
پھر بھی اب تک
میری بچی کے ماتھے کی
اک اک سِلوٹ
دنیا سے پوچھا کرتی ہے
اب کیا ہوگا ؟
اب کیا ہوگا ؟ ●

روشنی کے بوجھ

ڈاکٹر ابرار الحسن (پیرس)

ہوا اڑائے ریشم بادل کے پردے
چھن چھن کر پیڑوں سے اتریں روشنیاں
جیسے ابھرے بچے پہ معصوم ہنسی
ڈھونڈ نہ پاؤں ان سے حسیں تصویر کہیں
جنگل تیرہ بخت نہیں۔

چھن چھن کر چھتنار سے برسو روشنیو..
پودوں کی رگ رگ میں تیرو روشنیو
جنگل کے سینے کے کونوں کھدروں میں
دبے ہوئے اسرار بہت
خواب گزیدہ نشہ میں سرشار بہت
نیند نگر کو تجنے پہ اصرار بہت
کونپل کونپل پھوٹنے پہ تیار بہت
بوڑھے پیڑا نہ رستہ روکو
ان خوابوں کو جی لینے دو
چھن چھن کر چھتنار سے برسو روشنیو۔
چھن چھن کر چھتنار سے برسو روشنیو
اس معصوم ہنسی میں گرچہ ربط نہیں
پل بھر میں آنسو بن جائیں ضبط نہیں
اس موتی کے قلب میں اترو روشنیو
اور چمک اس کی چمکاؤ روشنیو
چھن چھن کر چھتنار سے برسو روشنیو
نگر نگر میں تم سے ہلکی چیز نہ پاؤں
گراں کرن کے لیکن برسوں بوجھ اٹھاؤں ●

نصر قریشی

"مداوا"

(نظم)

بے سبب دل جلانے سے کیا فائدہ؟
سیلِ خوں نظموں، غزلوں سے رکتا نہیں
قومی یک جہتی پر لیکھ بیکار ہیں
فرقہ وارانہ ہنگامے تقریروں سے کب دبے؟
اِک اہنسا کے پیکر کو گولی ملی
لاش انسانیت کی سرِ راہ بے کفن
اپنی مظلومیت کی کہانی کہے
راہ رو اَن سنی کرکے آگے بڑھیں
صاحبِ عصریت کا کفن کو کاڑھے ہوئے
زندگی کا بدن نیلا کرنے ہی کی گھات میں ہے
زہر رگ رگ میں پھیلا رہا ہے
تلخ سچائی کا گھونٹ کون ہنس کر پیئے
آگہی کے چراغوں کو ظلمت کی آندھی بجھا ڈالے گی

○

ہم جئیں، خواہ دنیا مرے، ٹھیک ہے
دوسروں کے مقابر پہ اپنا محل گر بنے، ٹھیک ہے
ساری آسائشیں، عیش و راحت ملے، ٹھیک ہے
خواہ یہ سب فسادات ہی سے ملیں، ٹھیک ہے
سربلندی کا موقع یونہی ہاتھ آجائے گا

○

شاعرو، لیکھکو، مصلحو!
مفسدوں، مخبروں، مجرموں سے یہ ٹکراؤ کیا؟
مصلحت کی رِدا اوڑھ لو
اور اگر ایسے ہی صلح کل کے ہو دیوانے تو
برین واشنگ ضروری ہے سب کے لئے
ساری درسی کتابیں بدلنے کا نعرہ بنو
زخمی انسان مرنے سے بچ جائے گا !!!

Brain washing

غزلیں

اویس احمد دوراں

تمہیں سردار ہو گلشن کے یہ بتلا دینا
کوئی ہمسر ہو تو دیوار میں چنوا دینا
مطلق الحکم ہیں سب اندلوں گھبرائے ہوئے
یہ خبر اس کے حضور آج ہی پہنچا دینا
سر اٹھائے گا زمانہ یہ کہے دیتا ہوں
جونہی ایسا ہو اسے دار پہ کھنچوا دینا
میرے تاریک مکاں میں اسے ہوگی تکلیف
اے صبا اس کو گلستاں ہی میں ٹھہرا دینا
اب کسی چیز پہ بھولے سے بھی مچلا نہ کرے
میرے دوراں دل پہ خوں کو یہ سمجھا دینا

منیر سیفی

تتلیوں کے پروں کو کترا کر
یاد بیتے دنوں کی تازہ کر
خود شناسی بہت ضروری ہے
روبرو آئینے کے بیٹھا کر
بول کے بیچ تو سب کو چونکا دے
ایک دن شہر میں تماشا کر
کوئی چنگاری جاگ جائے گی
راکھ خوابوں کی مت کریدا کر
میں کلب میں تو ہنس رہا ہوں منیر
رو پڑوں گا پھر اپنے گھر جا کر

اویس احمد دوراں

غمگیں ہیں دلفگار ہیں میرے یہاں کے لوگ
دامانِ تار تار ہیں میرے یہاں کے لوگ
پیدا کیا ہے جھوٹے مسیحاؤں نے جسے
اس درد کے شکار ہیں میرے یہاں کے لوگ
کیا جانئے ہیں کب سے جگر سوختہ مگر
انساں کے غمگسار ہیں میرے یہاں کے لوگ
گردن اگرچہ خم ہے اطاعت کے بوجھ سے
لیکن حریف دار ہیں میرے یہاں کے لوگ
دوراں انہی کے زخم سے پھوٹے گی روشنی
مانا کہ سوگوار میرے یہاں کے لوگ

★ ★

تبصرے

نام کتاب :- انداز بیاں اور (شعری مجموعہ)
مصنف :- ہاشم عظیم آبادی
صفحات :- ۲۵۲ (مجلد)
قیمت :- پچیس ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ (براہ راست مصنف سے) [illegible]
مبصر :- بدر اورنگ آبادی

کتاب کا نام اس دعوی کی طرف ... شعوری یا غیر شعوری، اشارہ ہے کہ ہاشم عظیم آبادی کا انداز بیاں دوسرے شعراء کے مقابلہ میں، کچھ اور ہی ہے۔ زیرو فلیسر) سید حسن اور قتیل داناپوری نے اس مجموعہ کو توصیفی کلمات کے ساتھ سراہا ہے اور عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) نے لکھا ہے کہ غالب کی زمین میں مزاحیہ اور طنزیہ اشعار کا یہ دیوان یقیناً ادبی دنیا کے لئے ایک تحفہ ہوگا" اس انفرادیت کا اندازہ خود شاعر نے تعلی کے کئی اشعار میں کیا ہے۔ جیسے

(۱) سودا کی باچھیں کھل گئیں [illegible] اُٹھے
ہاشم نے وہ غزل کہی جو میر سے نہ ہو

(۲) تمہیں تکتے ہیں حسرت سے صف اول کے شاعر بھی
تمہارے شعر پر ہاشم جو اتنا شور تحسین ہے
(صفحہ ۲۲۸)

(۳) جن کے کلام سادہ ہوں، پھیکے ہوں جن کے شعر
پی لیں وہ دھو کے ہاشم شیریں سخن کے پائو
(صفحہ ۱۲۸)

یہ بات بڑی حد تک قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کی ہر تخلیق نہ آفاقی ہوتی ہے اور نہ معیاری لیکن اگر تمام تخلیقات کا دسواں حصہ بھی مقررہ معیار پر پورا اتر جائے تو یہ تخلیق کار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ہاشم عظیم آبادی کو اچھی غزلیں کہنے پر بلا شبہ قدرت حاصل ہے۔ وہ "نام خدا وہ جوہر قابل ہے آئینہ" (ص ۱۳۵) جیسی سنجیدہ غزل بھی کہہ سکتے ہیں اور "وہ کیا قہر تھا ہاشم جو مرتا کوئی دن اور" (ص ۱۷) جیسی اچھی غزل کہنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس غزل کے دو اشعار تو ظرافت و طنز کے نمونے کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) بے پردہ خواتین کی بے راہ روی پر
بچوں کی طرح پھوٹ کے روتا کوئی دن اور

(۲) ملتی نہ چراگاہ سیاست میں اگر گھاس
میدان ظرافت میں تو چرتا کوئی دن اور

اس کے علاوہ بھی ایسے متفرق اشعار کی ایک اچھی خاصی تعداد اس مجموعہ میں ہے جن کو پڑھ کر لب خندہ آفریں "بھی ہوتا ہے اور "دل جراحت آگیں" بھی مثلاً

(۱) مقصد یہ ہے کہ زیادہ سنو اور بولو کم
جب ہی تو کان دو ہیں مگر اک زبان ہے (ص ۱۴۵)

(۲) باپ کو بیٹے نے ہاشم جب کہا "یو ڈیم فول"
کس قدر مسرور جاہل باپ یہ سن کر ہوا (ص ۳۴)

(۳) یہ گھونگھٹ لیا۔ یہ برقعہ کیا، ردا کیا
بچھا جب آنکھ کا پردہ، رہ لیپ (ص ۲۶)

(۴) اے شیخ نظر والوں کو الّو نہ بناؤ
سجدے کے نشاں اور ہیں گھٹنے کے نشاں اور (ص ۶۷)

(۵) دانہ بھی بکھرا چن چن کے دانہ اڑ گئے
جال میں اک پھنس گیا الو کا پٹھا آشنا (ص ۱۴)

(۶) گیسوئے دُم بریدہ یہ ٹیڑھی کلاہ ہو
تم پر حسین چھوکرے کا اشتباہ ہو (ص ۱۳۱)

ظرافت کا پہلا کام ہے "لب خندہ آفریں" پیدا کرنا لیکن ہنسانے کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی کو اس انداز سے گدگدی لگائیے کہ وہ ہلکی سی گدگدی کے بعد ہی ہنسنے لگے اور دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کوشش میں ناکامی ہو تو سینہ پر چڑھ کر خوب گدگدایا جائے۔ ہاشم عظیم آبادی نے دونوں ترکیبیں استعمال کی ہیں بلکہ دوسری متبادل ترکیب ہی کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ جیسے ؎

(۱) چھن گیا جب سے قلمدانِ وزارت آپ سے
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا (ص ۵)

(۲) شیخ نے قرآن کے معنی کو طولانا کیا
حال جو داڑھی کا ان کے (کی ؟) ہے وہی تفسیر کا
(ص ۵)

پہلی ترکیب ہنرمندی ہے اور دوسری ترکیب ایک بھونڈا عمل جس سے پرہیز لازم ہے۔

ظریفانہ شاعری میں عاشق کے سر اور محبوب کی چپل کا تذکرہ عام ہے لیکن ہاشم عظیم آبادی کے کلام کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے۔ دوسرا محبوب موضوع رہتا ہے بے چارہ شیخ یعنی مولوی —— ہاشم عظیم آبادی کے ہاتھوں مولوی کی درگت بھلا کیوں نہ بنتی۔ انہوں نے بھی مولوی کی خبر لی ہے۔ خصوصاً شیخ کے گھٹے ہوئے سر کی۔ لیکن مولوی کی حجامت بنانے میں ہاشم عظیم آبادی حد سے کچھ تجاوز کرتے نظر آتے ہیں اور کلام ظریفانہ نہ ہو کر مبتذل معلوم ہونے لگتا ہے۔ جیسے

(۱) یوں تو ہے سہل ہر اک کام کا آساں ہونا
مولوی کے لئے دشوار ہے انساں ہونا (ص ۲۲)

(۲) مغز کے بدلے تیرے سر میں ہے کوڑا واعظ
بس خرافات ہی منبر سے سناتا ہے مجھے (ص ۲۴)

(۳) یہ رقص ممبری حضرت کا ہے توہین ممبر کی
جزاک اللہ مولانا یہی خصلت ہے بندر کی (ص ۱۷)

[لفظ "ممبری" اور "منبر" کے بجائے "ممبری" اور "ممبر" شاید کتابت کی غلطیاں ہیں۔]

ہاشم عظیم آبادی کی ظریفانہ غزلوں میں کبھی محاورے بڑے خوبصورت ڈھنگ سے استعمال کئے گئے ہیں اور اس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جیسے

(۱) زبردستی پلائی پھر بھی برتی احتیاط اتنی
کہ دھبہ تک نہ آیا حضرت واعظ کے دامن پر (ص ۶۹)

(۲) میری ہی آنکھ کا تنکا نظر آیا سب کو
ورنہ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں تو شہتیر بھی تھا (ص ۱۴)

لیکن محاوروں کے استعمال میں غیر محتاط ہو کر انہوں نے غلط استعمال بھی کیا ہے۔ جیسے

(۱) بلبل کو کیا پسند ہو ماحول باغ کا
بالا ہو جب کہ بول گلستاں میں زاغ کا (ص ۳۸)

"بول بالا ہونا" ایک محاورہ ہے لیکن اسے توڑ کر اس ڈھنگ سے برتنا جائز نہیں۔

(۲) ٹوٹے جوتے کی طرح باچھیں کھلیں عاشق کی
آپ دکھلا دیں اگر چہرۂ خنداں اپنا (ص ۴)

خوش ہونے کے لئے باچھیں کھلنا کا استعمال تو بہت مناسب ہے لیکن اس کے ساتھ "ٹوٹے جوتے" کی کیفیت

ہار انمل بے جوڑ ہے۔

فن شاعری ایسے مصرعوں کی تخلیق کی اجازت دیتا جن میں "ضم کا پہلو" شامل ہو اور ایسے مصرعے معیوب جاتے ہیں اور اگر جان بوجھ کر ایسے مصرعے موزوں کئے تو یہ بھکڑپن ہے۔ ہاشم عظیم آبادی کا کلام بھی اس سے پاک نہیں۔ جیسے

۱ آئے ظالم کی چھری اس پہ پلٹ کر کس وقت
زیرِ زانو ہو قصائی کے یہ بوچر کس وقت (ص۵۵)

! تمہارے راکٹوں کو کیوں نہ دیکھے وہ حقارت سے
تصور میں دو عالم کا تماشا جس کو حاصل ہے
(ص۱۷۵)

فن شاعری کا دوسرا تقاضہ یہ ہے کہ جو الفاظ استعمال جائیں انہیں بحر و اوزان کو برقرار رکھنے کے لئے، گھٹا کر نہ پڑھنا پڑے۔ جس مصرعے میں ایسے الفاظ آجاتے عرف عام میں "سکتہ" کہا جاتا ہے۔ ا[illegible] ور مطالبہ فن کا ــ وہ یہ کہ مصرعے "[illegible]" سے پاک لیکن "دیوانِ ہاشم عظیم آبادی" [illegible] جیسے

ان جیسے کپڑوں ہی سے نمایاں [illegible] (ص۱۱)
میں لفظ کپڑوں ہی کی "واؤ اور نون" بحر سے خارج ہے وں ہی" کو "کپڑہی" پڑھنا پڑے گا۔

۲ بارگناہ تا حدِ امکاں اٹھایئے (ص۱۴۳) بحر کی موزونیت برقرار رکھنے کے لئے "حدِّ" کو "حد" لکھنا پڑا جو غلط ہے۔ شاعر نے ایک دوسرے مصرعے میں اس لفظ کو تشدید ساتھ صحیح طور پر استعمال کیا ہے۔

بڑھیے نہ حدِّ شرع سے آگے نکاح میں

۳ مرے بیگم کی ہمشیر آج میرے گھر میں مہماں ہے (ص۱۶۰) میر" کی رنگرتی ہے۔

۱۴ شیخ کو راس نہ آیا اس بڑھاپے کا نکاح (ص۸۲)
"یہ" زائد ہے۔

۵ گھٹاتے جا رہے ہیں وزن اپنا اور بوجھ اس کا (ص۹۵)
"وَزنْ" کو "وَزَن" پڑھنا پڑتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر طرح کی کوششوں کے باوجود اردو کتابوں میں کتابت کی ایک دو غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ لیکن جب ایسے غلط الفاظ کی کثرت ہو اور غلط کتابت کے نتیجہ میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں نظر آئیں تو کتاب بے دلی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ خود فنکار نے تو یہ غلطی نہیں کی ہے۔ "انداز بیاں اور" میں ایسے غلط الفاظ کئی ہیں۔ جیسے

۱ "آپ کے زلف پریشاں کو سنوار آئی ہے" (ص۱۲)
"کی" ہونا چاہئے

۲ "مرے بیگم کی ہمشیر آج میرے گھر میں مہماں ہے" (۱۶۰)
بیگم کے لئے "مرے" کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے

۳ "ہمارے شیخ جی کے توند کی گولائی ہے ایسی" (۱۵۱)
"کی" ہونا چاہئے۔

۴ "شرافت کا ہے باقی ایک قطرہ خوں مرے رگ میں"
(ص۱۳۹) "مری" ہونا چاہئے

۵ غریب قیس حویلی میں اپنے لیلیٰ کی (ص۶۳)
"اپنی" ہونا چاہئے۔

غالب کی زمین میں ۲۳ مزاحیہ اور ظریفانہ غزلوں کا یہ مجموعہ بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے اور کتابت و طباعت صاف ستھری ہے۔ صفحات اور جلد کے تناسب سے قیمت زیادہ نہیں۔ ہاشم عظیم آبادی کا یہ دیوان "ادبی دنیا کے لئے ایک تحفہ ہوگا۔" اس میں تو شک نظر آتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ لوگ اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور انتظار کریں گے کہ ہاشم

مظیم آبادی کا [illegible] مجموعہ کلام خوب سے خوب تر ہو۔

نام پرچہ [illegible] آگ کا دریا۔ (پندرہ روزہ)
ایڈیٹر [illegible] اچاریہ شوکت خلیل
پتہ [illegible] بھون، لہیریا سرائے (دربھنگہ)
قیمت [illegible] سالانہ تیس (۳۰) روپے۔ فی شمارہ۔ ایک روپیہ۔
مبصر [illegible] اورنگ آبادی

نہ اچاریہ شوکت خلیل کا نام کیا ہے اور نہ "آگ کا دریا" کا گرچہ ممکن ہے کہ "اردو داں حلقوں میں یہ نام نیا لگے۔ اچاریہ شوکت خلیل ادبی اور صحافتی زندگی کے پچیس سال مکمل چکے ہیں لیکن تھکے نہیں۔ یہ پندرہ روزہ اردو اخبار" انہوں نے اس عزم کے ساتھ جاری کیا ہے کہ۔

(الف) "مسلمان بھائیوں کے آئینی حقوق کے تحفظ ...... کی جدوجہد سے کبھی گریز نہ کریں"

(ب) "...... فرقہ وارانہ میل ملاپ کی فضا بنا سکیں ......"

(ج) ...... جی حضوریوں اور ملت فروشوں کی چال سے مسلمانوں کو وقت پر خبردار کرتے رہیں۔"

یہ تو آئیڈیل ہے لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کی کیا صورت ہوگی، یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا کیونکہ اکثر صحافیوں نے یہ خواب دیکھا۔ اگر اچاریہ اپنی سعی میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کی خوش قسمتی ہوگی۔ ہمارے سامنے جو شمارہ ہے لیکن اس کے متحولات مندرجہ بالا آئیڈیل کے مطابق نہیں۔ وہی نسخے ہیں جو کسی بھی اردو اخبار میں ملتے ہیں۔ بھیونڈی کے روح فرسا فسادات کے پس منظر میں سینہ کوبی، ۲۷ مئی کو سیوان میں ازیرا علیٰ کے ذریعہ کیئے گئے وعدوں اور اعلانات پر اپنے شبہات کا اظہار کیا

لئے اداریہ، اور" اسلامی معاشرہ میں نکاح کا تصور" (ایک مضمون) کو مسلمانوں کے لئے مختص کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ادبی گوشے میں پانچ غزلیں، ایک ہندی نظم کا ترجمہ اویس احمد دوراں کا ایک مضمون "ادب میں ناوابستگی کا مہلک تصور" اور دوسرے کچھ عام موضوعات ہیں جو کسی بھی حال میں شوکت خلیل کے عزائم کی نشاندہی نہیں کرتے۔ ایک مضمون ہے "جنسی غلط فہمیاں" جسے اس مقصد کے تحت سلسلہ وار شروع کیا گیا ہے کہ "جنسیات کے موضوع پر خاموشی کے برت کو توڑنے کی ضرورت ہے تاکہ اس گھٹن اور بے چینی کا خاتمہ ہو سکے" مقصد بلاشبہ بڑا پاک ہے لیکن یہ مضمون جو سوالنامہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے اس اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے کی اگلی کڑیاں افادی پہلو پیش کر سکیں۔

خیال تھا کہ شاید اگلے شمارہ سے ایسے مضامین شائع کئے جائیں جو مسلمانوں کے دکھ درد کا مداوا بن سکیں لیکن اگلے شمارہ کے نفس مضمون کے اعلان نے اس خیال کو بھی شکست دیدی۔ قارئین کے خیالات اور نظریئے کے کالم، رشتہ فراہم کرنے کے اشتہارات اور فلمی دنیا کے تفصیلی حالات! ۔۔ یہ سبھی باتیں تو کسی بھی اخبار میں مل سکتی ہیں پھر وہ عزائم کیسے پورے ہوں گے جس کے لئے شوکت خلیل نے اللہ سے دعا مانگی ہے؟

بہرحال [illegible] اردو برادری میں ایک اور اخبار کی شرکت قابل خیر مقدم ہے۔ [illegible] طباعت بہت صاف ستھری ہے [illegible] اکثر اردو [illegible] بہتر ہے۔ اخبار میں دلچسپیوں کے مواد [illegible]

سواد و صوت

- تنویر ستیش ۔ (الہ آباد)
- محمد بدرالدین ۔ (بھاگلپور)
- نسیم ستوکھی ۔ (پاکستان)
- نوشاد نوری ۔ (ڈھاکہ)

محترمی
سلام مسنون

جون ۸۴ء کا شمارہ دیکھنے کو ملا بہت پسند آیا۔
اس شمارے میں خاص طور پر حسین الحق صاحب کا افسانہ "سورج کی پیٹھ پر" بہت پسند آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محترم نے اس افسانے میں بڑی محنت کی ہے مگر کہیں کہیں پر زبان کی غلطی کر گئے جیسے درگذر اسے لئے بھی کیا جاسکتا ہے کیوں کہ مجموعی طور پر افسانہ بہت خوبصورت ہے، جس عنوان یا جس موضوع کو محترم نے لیا ہے اس پر ابھی تک میری نظر میں نہ تو ہندی میں اور نہ ہی اردو میں کوئی افسانہ گذرا۔
"صبا رفتار اسپ تازی" یہاں پر محترم دھوکا کھا گئے۔

پروفیسر محمد بدرالدین صاحب کا مضمون "اردو زبان اور رسم الخط" ہم جیسے طالب علموں کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے مجھے بہت پسند آیا اور میری کئی الجھنیں دور ہوگئیں میری طرف سے جناب کی خدمت میں مبارک باد پیش کیجئے گا
غزلوں کا انتخاب بھی بہت اچھا لگا خاص طور پر شمیم گوہر صاحب کی غزل نے خاصہ متاثر کیا۔
آپ کا :- تنویر ستیش

محترمی ایڈیٹر صاحب، تسلیم و عزت
توقع قوی ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔
آہنگ جولائی ۸۴ء کے شمارے میں آپ کا کشکول کے تحت لکھا گیا اداریہ بصارت نواز ہوا۔ آپ نے بہت ہی بے باکانہ انداز میں حقیقت کی پیش کش کی ہے، طبیعت بہت خوش ہوئی کہ اس دور میں بھی غیر جانب داروں کی کمی نہیں۔ اللہ کرے کہ زور قلم میں چار چاند لگ جائیں !!
نیاز کیش :- محمد بدرالدین

جناب کلام حیدری صاحب ۔ آداب
"آہنگ" مارچ ۸۴ء اور اپریل کے دونوں شمارے موصول ہوئے۔ یاد آوری کا بہت بہت شکریہ یوں بھی میں بہت پابندی سے حیدر ملک یا صہبا لکھنوی کے یہاں جا کر آہنگ کا مطالعہ ضرور کرتا تھا اب جب سے آپ نے بھیجنا شروع کر دیا ہے تو بڑے اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ آپ کا اداریہ کشکول بڑی خصوصیت کا درجہ رکھتا ہے یہ اپنے اختصار کے ساتھ ساتھ ادب کے اہم مسائل کی جانب قاری کی توجہ مبذول کراتا ہے مارچ کے شمارہ

کا اداریہ جس کا آخری پیراگراف کچھ اس طرح سے تھا کہ "اسلامی ادب .... بہت اچھا لگا۔ ان اہل فکر اور دانشوروں کے لئے یہ ایک چیلنج بھی ہے جو ادب کے اس نئے خانے کی تلاش میں سرگرم عمل ہیں اور اسے جبراً مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

"آس پاس" کے عنوان سے جو سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی ہوتی ہے اس سے بھی مجھے ایک خاص لگاؤ ہے کیونکہ ہندوستان سے جتنے بھی ادبی رسائل یہاں آتے ہیں ان میں صرف ادب ہوتا ہے میرے خیال آہنگ ایک ایسا رسالہ ہے جس میں ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاسی سماجی زندگی کی ایک [illegible] عموماً ادیب مدیران [illegible] ان [illegible] اکثریہ کہا جاتا [illegible] اگر کھنڈے دل سے [illegible] معاشرے کے سیاسی سماجی حالات [illegible] کر رہا ہے۔ ایک افسانہ نگار عموماً اپنی کہانی [illegible] ٹوٹی پھوٹی سڑک نلکے میں پانی کی کمی [illegible] کا اظہار صرف پیرائے بیان کو بدل کر [illegible] استعاروں سے مدد لے کر کرتا ہے [illegible] ایک لیڈر کے جبر و تشدد اس کی بدانتظامی کا اظہار ایک انوکھے انداز سے کرتا ہے لیکن وہ سیاست ہی ہوتی ہے اب اگر وہی باتیں ایک آسان اور سیدھے پیرائے بیان میں ظاہر کر دی جائیں تو میرے خیال میں ادب کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی ادبی جریدہ کے معیار میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے بلکہ ادیبوں کی معلومات میں اضافہ کا ذریعہ ہو سکتا ہے [illegible] ضرور کہوں گا کہ اپنے عنوان "آس پاس" [illegible] اور وسعت دیجئے تاکہ [illegible]

بھی لا سکے۔

ناچیز نسیم ستر کھی

برادرم کلام حیدری سلامت رہو

آہنگ کا شمارہ بابت جون نظر سے گذرا شہزاد منظر کا مضمون "کرشن چندر۔ چند یادیں" پڑھا۔ اس مضمون پر تمہارے نوٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ تمہارا زہرناک اظہار ہی مضمون کی زہرناکی کا ازالہ کر سکتا تھا، سو تم نے اپنی ذمہ داری پوری کی

تم نے حواشی میں لکھا ہے کہ "شہزاد منظر ترقی پسند اور کمیونسٹ دونوں رہے ہیں مگر پاکستان میں وہ کیا ہیں، میں نہیں جانتا" ـــــ مجھے اس کا علم نہیں کہ کلکتہ میں وہ کیا تھے لیکن سابق مشرقی پاکستان میں سات آٹھ سال کے قیام کے دوران وہ نہ کمیونسٹ تھے اور نہ ترقی پسند۔ ایک [illegible] روزنامہ اور ریڈیو میں ایک روزنامہ سے وابستہ تھے۔ ترجمہ کرتے تھے پروف دیکھتے تھے اور تنخواہ لیتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر اس شخص یا ادارے سے مطابقت رکھتا تھا جس سے ان کو تنخواہ ملتی ہو۔

اور بنگلہ دیش سے پاکستان کوچ کرنے کے بعد انہوں نے اپنی نوٹ بک کے مندرجات سے صرف لینا شروع کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نوٹ بک میں حسن ناصر، جوش اور فیض نے سبھی کچھ باتیں قلمبند کرائی ہوں۔ اس حالت میں ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ان کی نوٹ بک کے مندرجات کی اس پیمانے پر تدوین و تالیف میں ان کی تنخواہ کس شخص یا کس ادارہ سے وابستہ ہے۔

[illegible] نورگی

ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا گوشوارہ

سال ۔ ۱۹۷۹ء

مرتبہ :- ڈاکٹر محمد مثنیٰ

نمبر شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۱۰۳	قاضی عبدالودود	حسن آرزو	قاضی عبدالودود کی سیرت و شخصیت مختلف قوتوں کی روشنی میں
〃	کعبۂ ارباب فن — بیچنہ	ڈاکٹر رفعت سجاد	بیچنہ کی علمی اور ادبی اہمیت
〃	ناول کی زبان	طارق سعید	ناول کی زبان پر ایک تنقیدی نظر
۱۰۴	تذکرہ نگاری کی روایت اور اس کی تنقیدی اہمیت	عقیل احمد	تذکرہ نگاری کا تنقیدی جائزہ
〃	کتابوں کی باتیں	مہدی جعفر	نئی کتابوں کے بارے میں تنقیدی گفتگو
〃	رشید امجد اور ریت پر گرفت	علی حیدر ملک	رشید امجد کے افسانے [illegible]
〃	غلام عباس آنندی والے	عبدالصمد	غلام عباس کے فن کا تجزیہ
۱۰۵	ادب اور سیاست	محمد علی صدیقی	ادب اور سیاست کے رشتے پر ایک نظر
〃	تاریخ میں ہیرو کا تصور	محمد اشتیاق	ہیرو کا تاریخی کردار
〃	روشنائی کی کشتیاں ایک جائزہ	علی امام	احمد یوسف کی کہانیوں پر ایک تنقیدی نگاہ
۱۰۶	ادب اور ثقافت	محمد علی صدیقی	ادب اور ثقافت کے تعلق پر ایک نظر
〃	عندلیب ناشنیدہ	معظم الہما	جوشش عظیم آبادی کی شاعری پر ایک نظر
〃	"پہچان کا درد" کی شاعری	طیب انصاری	حمید الماس کی شاعری پر ایک نظر
〃	جدید کنڑا شاعری	ڈاکٹر حمیدہ جلیلی	جدید کنڑا شاعری پر ایک نظر
۱۰۷	ترقی پسندی اور جدیدیت	محمد علی صدیقی	ترقی پسندی اور جدیدیت کا تنقیدی جائزہ
〃	جدید اردو افسانہ	ڈاکٹر احمد سجاد	جدید افسانے پر ایک نظر

نمبر شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۱۰۷	اقبال کا انجم شناس (نجومی، ارضی اور مریخی)	حسن آرزو	اقبال کی انجم شناسی کا تجزیہ
〃	فسانۂ عجائب کا اسلوبیاتی مطالعہ	طارق سعید	فسانۂ عجائب کے اسلوب کا تنقیدی تجزیہ
۱۰۸	بے محاورہ	علی احمد فاطمی	جوگندر پال کی کہانیوں پر ایک تنقیدی نظر
〃	قاضی عبدالودود کی نثر نگاری	ڈاکٹر منصور عالم	قاضی عبدالودود کی نثر کا تنقیدی مطالعہ
۱۰۹/۱۱۰	مکتوبات جگر مرادآبادی	تارا چرن رستوگی	جگر کی غزلوں کے بنیادی عناصر کا تجزیہ
〃	عبدالرحمن بجنوری کا نثری آہنگ	طارق سعید	بجنوری کی نثر کا تجزیہ
〃	نئی شاعری کا ایک اور مطالعہ	اسلام عشرت	نئی شاعری پر ایک تنقیدی گفتگو
۱۱۱	اقبال کے شاگرد معنوی جمیل مظہری	ڈاکٹر احمد سجاد	جمیل مظہری کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ
〃	اردو افسانے کا ایک معتبر نام۔ ممتاز شیریں	علی احمد فاطمی	ممتاز شیریں کی کہانیوں پر ایک تنقیدی نظر
〃	فرہنگ غالب کی تدوین	عبدالرحیم شارق	غالب کی شاعری میں الفاظ کے مخصوص مفہوم کا تجزیہ
۱۱۲	اریکیڈیا کا ایک رند	باقر مہدی	جاں نثار اختر کی شخصیت کا ایک مطالعہ
〃	تحریک تاثریت اور ادب	انور سدید	تاثریت کی تحریک کا ادب پر اثر
〃	مخدوم الملک	ڈاکٹر شمس الحق شمسی	حضرت مخدوم الملک کے کارناموں پر ایک نظر
〃	حسن نعیم نئی غزل کا دانشور	راجندر بالی	حسن نعیم کی غزل کا تجزیہ
۱۱۳	انشائیہ	رام لعل نابھوی	انشائیہ پر ایک مضمون
〃	الف۔ لام۔ میم۔ ایک مطالعہ	بدر اورنگ آبادی	کلام حیدری کی کہانیوں کا تجزیہ
۱۱۴	اردو افسانے کی تین آوازیں	علی احمد فاطمی	جوگندر پال، کلام حیدری اور رتن سنگھ کی کہانیوں کا تنقیدی مطالعہ
〃	"شعور" پر ایک نظر	مہدی جعفر	"شعور" کے تیسرے شمارے پر ایک تنقیدی نگاہ

افسانے	افسانہ نگار	نمبر شمارہ	افسانے	افسانہ نگار
کتاب دار کا خواب	انور نوال	۱۰۴	اوپر سے گرتا اندھیرا	ساجد رشید
[illegible] محمود درلو	حمید سہروردی	〃	اندھیرے سے باتیں کرنے والا	احمد عثمانی
[illegible] بدل	[illegible] شفق	〃	ڈرائنگ روم	ظہیر کیفی

شمارہ نمبر	افسانے	افسانہ نگار	شمارہ نمبر	افسانے	افسانہ نگار
	زینے	احمد اسرار گاندھی	۱۱۰/۱۰۱	بے ثمر کے پودے	اسرار گاندھی
	بند دروازہ	مشتاق احمد نوری	〃	وصیت	ایس۔ ایم۔ عباس
		(فرانز کافکا)	۱۱۱	کہانی کا بڑھاپا	مرزا حامد بیگ
	افسانے (اور ان کا خصوصی مطالعہ)	شمیم صادقہ	〃	اجڑی بستی	بنت مسعود
	دوسرے دن کی کہانی	رشید امجد	〃	کمپیوٹر	علی امام نقوی
	دلدل ۲	شفق	۱۱۲	صورت ایک بیکسی کی	احمد یوسف
	افسانے سے باہر	شمس نعیم	〃	خشک بوندیں	ملک خورشید
	میں دو منزہ ہو جاؤں	اختر واصف	۱۱۳	عجوبہ	جوگندر پال
	سکون کے درمیان	اسرار گاندھی	〃	اندیشہ	اکرام باگ
	وجود کی جنگ	آنند لہر	〃	دور کے ڈھول	فردوس حیدر
	افسانے (اور ان کا خصوصی مطالعہ)	حمید سہروردی	〃	تماشا	م۔ ق۔ خان
	الٰہی عین	حسین الحق	۱۱۴	آنے والا	احمد یوسف
	روشنی سے سہما ہوا سناٹا	ظہیر کیفی	〃	رشتوں	حسین الحق
۱۰	آخر گت	مرزا حامد بیگ	〃	دوسرا پاگل	ابن کنول
	گلدان کا پھول	انور خان	〃	ایک شام	شمیم صادقہ

نظم	شاعر		نظم	شاعر
کلام حیدری کے نام	ظہیر صدیقی	۱۰۴	پندار	ظہیر غازیپوری
سماپت	کرشن موہن	۱۰۵	پانچ مختصر نظمیں	صفدر
فن اور بدن	〃	〃	غم / میرا کردار	حرمت الاکرام
مقناطیس	〃	〃	صوت کا عفریت	حفیظ آتش
سمندر (میں) خذف ریزے			شہری	〃
عکس آگہی	اعجاز اعظمی	۱۰۶	ایک بے نام نظم	بلراج کومل
بازیافت	〃	〃	ایک نظم	بدنام نظر
دنیا تو گونگی ہے	ظہیر غازیپوری	〃	ایک سوال	کلیم راہی

نمبر شمارہ	نظم	شاعر
۱۰۶	واقعہ سخت	رؤف خیر
〃	خیال رزق	〃
〃	ادراک کے بعد	عبدالمتین نیاز
〃	سنجو ریزہ	صفدر
〃	ہمیں کیا خبر تھی	شکیب نیازی
〃	چہار سمت	〃
۱۰۷	چہ نسبت خاک را	رؤف خیر
〃	تم کہاں کھو گئے	〃
〃	سوچ کا کرب	نصر قریشی
〃	میں کی تلاش	علقمہ شبلی
〃	لفظ رسوا ہوئے	عبدالرحیم نشتر
〃	آخر شب	صفدر
〃	استغفار	
۱۰۸	نظمیں	بمل کرشن اشک
〃	پانچ نظمیں	ارمان شام نگر
〃	لفظ کا معنی سے رشتہ	نعیم اشفاق
〃	واحد متکلم کی چیخ	〃
〃	پذیرائی	خاطر حافظی
〃	اکائی	ہاتف شیرکوٹی
۱۰۹/۱۱۰	سیل، بدن	ساجدہ زیدی

نمبر شمارہ	نظم	شاعر
۱۰۹/۱۱۰	نظمیں	بمل کرشن اشک
〃	عذاب	ظفر غوری
〃	اجڑے منظر کی نظم	〃
〃	کلکتہ ۳	اختر یوسف
۱۱۱	ایک نظم	بمل کرشن اشک
〃	شام جب ٹھہرتی ہے	چندر بھان خیال
〃	جستجو	حفیظ آتش
〃	فرمان ارضی	جعفر عسکری
۱۱۲	تمہارے سلسلے سے کچھ نظمیں	اکرام باگ
〃	سبز کہرے ہیں	اختر یوسف
〃	پونم کی رات	صابر دت
〃	عرصہ سہی آفاق	خالد سعید
۱۱۳	تین نظمیں	حرمت الاکرام
〃	روبوٹوں کے شہر میں الف بریکس	اشہر ہاشمی
۱۱۴	ایک لمحہ ننگے لفظ	بمل کرشن اشک
〃	ایک نظم	فیاض رفعت
〃	ایک حقیقت	نعیم اشفاق

نمبر شمارہ	کتاب	مبصر
۱۰۳	ادبی تحقیق	کلام حیدری
۱۰۴	بھیگا ہوا کاغذ	عبدالصمد
۱۰۵	آڑی ترچھی لکیریں	〃

نمبر شمارہ	کتاب	مبصر
۱۰۵	ادبی تنقید	عبدالصمد
۱۰۶	شاعری	عبدالصمد
〃	اس حمام میں	نثار احمد صدیقی

نمبر شمارہ	کتاب	مبصر	نمبر شمارہ	کتاب	مبصر
۱۰۷	شعلوں کا شجر	کلام حیدری	۱۱۲	دائرے سے باہر	کلام حیدری
"	سفر جلتے دنوں کا	کلام حیدری	"	پہلا پتھر	نثار احمد صدیقی
۱۰۸	فنکار سے فن تک	کلام حیدری	۱۱۳	زیر بار	کلام حیدری
"	ساگر اور لہریں	نثار احمد صدیقی	"	کہرہ کہرہ دھوپ	نثار احمد صدیقی
"	لکیریں اور خاکے	عبدالصمد	۱۱۴	لوحِ بدن	کلام حیدری
"	عصری آگہی	عبدالصمد	"	نیا ادب	کلام حیدری
۱۰۹/۱۱۰	باہر کفن سے پاؤں	کلام حیدری	"	مزامیر	نثار احمد صدیقی
"	سایہ سایہ دھوپ	نثار احمد صدیقی			

غزلیں

نمبر شمارہ	نام شعراء
۱۰۳	ندا فاضلی، سلطان اختر، فضا ابن فیضی، مظفر حنفی، ڈاکٹر نریش
۱۰۴	بشر نواز، حامدی کاشمیری، محسن بھوپالی، ساحل احمد، ناظم جعفری، ادیب حسن ادیب
۱۰۵	حسن نعیم، شاہد احمد شعیب، کرشن موہن، مختار شمیم، سید احمد شمیم، عبدالمتین نیاز، شہپر رسول، فاروق شفق
۱۰۶	مظفر حنفی، جعفر عسکری، صفدر، عبدالمتین نیاز، شرون کمار ورما، جاوید شہبازی، علقمہ شبلی، آزاد گلاٹی، اعجاز الغنی
۱۰۷	عزیز قیسی، شفیع اللہ خاں راز، عشرت ظفر، بیتاب بیلی بھیتی، فاروق شفق، شرون کمار ورما، عتیق حاذق، طارق منظور، شہپر رسول، محمد علی اثر۔
۱۰۸	اسلم شیخ، شہاب للت، صدیق مجیبی، نصیر پرواز، شاہد میر، ظفر غوری، ظفر صہبائی، عرش صہبائی، نادم بلخی، رئیس مالیگانوی، رفیق جعفر، مختار احمد عاصی
۱۰۹/۱۱۰	عزیز قیسی، نصر قریشی، علقمہ شبلی، [illegible] فاروق شفق، شرون کمار ورما، شکیل مظہری، سیدہ شان معراج، شاہد کلیم، [illegible] نوری، [illegible] وارثی، جاوید شہبازی، شاہین بدر، سید شمیم گوہر۔
۱۱۱	[illegible] حرمت [illegible] نصر قریشی، [illegible] غوری، سلیم شہزاد، فاروق شفق،

نمبر شمارہ	نام شعراء
۱۱۱	شکیل مظہری، شہیر رسول، سید احمد شمیم، سحر سعیدی۔
۱۱۲	عزیز قیسی، مظفر حنفی، نجیب رامش، شاہد میر، مصحف اقبال توصیفی، مصور سبزواری، الدین ثاقب، راج کھیتی، پرکاش تیواری
۱۱۳	منظر شہاب، مظفر حنفی، کرشن موہن، ظفر غوری، ماجد الباقری، ظفر صہبائی، صفدر، علقمہ شبلی احسن، شبیر، شمیم گوہر، تسلیم انجم، حصیر نوری، ملکہ خورشید
۱۱۴	صدیق مجیبی، کرشن کمار طور، شہیر رسول، نصیر پرواز، مصور سبزواری، دلکش اعظمی، یوسف زئی، دیوندر گوتم، تسلیم انجم، نجم عثمانی، مسلم سلیم۔

متفرقات

نمبر شمارہ	عنوان		
۱۰۴	تھیوری آف ریلیٹی ویٹی	ڈرامہ	پربھات مکرجی / سعیدہ شہ
۱۰۵	رپوٹر تاثر		اختر واصف
۱۰۶	خوشامد	انشائیہ	محمد جہاں
۱۰۸	انٹرویو	(شوکت حیات سے)	نثار احمد صدیقی
۱۰۹/۱۱۰	آثار قدیمہ	مزاحیہ	قدرت اللہ شہاب
۱۱۱	قطعات		کرشن موہن
″	رقص جمیل	مزاحیہ	مسعود طارق
۱۱۲	حسن عسکری کا خط		
″	بھائی کی تلاش	ڈرامہ	اصغر بٹ
۱۱۳	قرۃ العین حیدر ایک گفتگو		کلام حیدری، حسین الحق
۱۱۴	رباعیات		سلطان اختر

R. N. Regd. 42538/84
. T. Regd. No. Gy 5/84
hone—432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

تنقیدی مضامین

کلام حیدری

PRICE Rs 20/-

The Cultural Academy, (Regd.) Gaya



ماہنامہ
گیا
ہنس
قرۃ العین حیدر جلسے سے مخاطب ہیں
انسان نے سب سے پہلے گیت گائے۔ لیکن ہمیں لوک کتھائیں بھی ملتی ہیں۔
بودھ ۔ دیومالا ۔ عبرانی اور اسلامی قصے ۔ الف لیلیٰ۔
منظر امام
EVENTS
au pair girl

Gaya

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گجیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرحِ خریداری

بارہ شمارے — چھتیس روپے

ایک شمارہ — تین روپے

فون ۴۳۲

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

اسیڈیٹرز

نوشاد حق، عبدالصمد

کتابت [illegible] الہدی [illegible]

محتویات

گیا

اداریہ

کشکول

تصوف کو نیا ذہن جب سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ مغربی مفکرین کے فلسفوں، عقیدوں اور ان کی تعلیمات سے اس قدر بھرا ہوا ہوتا ہے کہ اسے تصوف میں کبھی MYSTICISM کی پرچھائیاں نظر آنے لگتی ہیں، کبھی اس کا ذہن رہبانیت کی طرف چلا جاتا ہے۔ کبھی "کرامات" کے لئے وہ عقلی دلائل کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے اور پھر پراگندہ ذہن ہو کر خود اپنے آپ پر اور تصوف پر بھی شک کرنے لگتا ہے۔ MYSTICYSM کے تحت شاعری کرنے والے شعراء سترھویں صدی عیسوی کے ہیں۔ جبکہ تصوف کی تاریخ دوسو ہجری سے شروع ہوتی ہے اور وہ کبھی ردعمل کے طور پر نہیں بلکہ ایک مذہبی سلسلے کے طور پر رہبانیت یا نروان کے تصورات کے ظاہری تصورات سے الجھ کر تصوف پر غور کرنے والا نیا ذہن (مسلم ذہن) چونکہ دن بدن اپنی مذہبی روایات سے ناواقف یا نیم واقف ہوتا جا [illegible] لئے تصوف جو خالص دینی جڑوں کے ساتھ وجود میں آیا۔ اس کا سراغ نئے ذہن کو نہیں [illegible] دلیل، عقل اور زیادہ سے زیادہ کتابی مطالعے کے سہارے تصوف کو سمجھنا چاہتا [illegible] وجدان کو استعمال میں نہیں لاتا، اس لئے اس کا پراگندہ ہونا، بے سمت ہونا، بے راہ [illegible] جانا لازمی امر ہے۔ مجھے اس بات پر تعجب نہیں ہوتا۔ مگر میرے ذہن میں یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ تصوف کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اگر نمائشی پیروں" کی صحبت پر بھروسہ کیا جائے تو گمراہ کن اور خود تراشیدہ روایات کے اہتمام سے ہی جان پہچان ہو سکتی ہے۔ اور پھر آج تو یہ پہچان اور بھی مشکل امر ہے کہ مرید کس کا ہوا جائے؟ کیونکہ "پیری" اب پیشہ بھی ہو گئی ہے اور خاندانی وراثت بھی۔ حالانکہ صحیح معنی میں صوفیت سجادہ نشینی اور خاندانی وراثت نہیں ہو سکتی۔ اس تذبذب میں نیا ذہن اپنی "عقل" پر بھروسہ کرتا ہے۔

اور دل کا اسے پاسبان بنائے رکھتا ہے۔ صوفی کے دل کی پاسبانی خود صوفی کرتا ہے اور عقل تو بہت دور تک ساتھ دینے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی۔

میری باتیں شاید اقتباس کی روشنی میں یہ بتا سکیں کہ نیا ذہن کہاں تک پہنچ پاتا ہے اور تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے وہ کیسے کیسے اپنی عقل پر تکیہ کرتا ہے۔ جن صاحب کے مضمون سے یہ اقتباس نیچے دیا جا رہا ہے وہ شروع میں صحیح اور سچی باتیں چند سطور میں کہنے کے بعد فوراً ہی بھٹک گئے ہیں مثلاً:

''صوفی ازم ایک ایسے عمل (حالانکہ کردار کہنا چاہئے تھا۔ حیدری) کا نام ہے جو انسان کو دنیوی پراگندگیوں سے نکال کر انتہائی ارفع و اعلیٰ جاردو[illegible] لے جاتا ہے، انسان زمرہ بھی رہتا ہے اور دنیاوی آلائشوں سے آزاد بھی رہتا ہے، ایک صوفی عام انسانوں کی طرح اپنے وجود کا احساس بھی رکھتا ہے، یعنی اپنے ارد گرد کا شعور بھی رکھتا ہے اور یہ یقین بھی کہ وہ دنیا میں موجود ہے، دوسری طرف اسے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ وقت سے قبل ہی دنیاوی بندھنوں سے آزاد ہو چکا ہے، گویا صوفی دو طرح کا شعور رکھتا ہے بشری بھی اور حقی بھی ہے''

(تصوف اور اس کی روایت، محمد اشرف چودھری۔ پاکستانی ادب پہلی جلد ص ۲۶۳)

اس مضمون میں چودھری صاحب نے یہ لکھا ہے:

''صوفی ازم کے غلط تاثر دینے میں مغربی مفکرین کا بڑا ہاتھ ہے۔''

مغربی مفکرین کی میں تھوڑی وضاحت کرنا چاہتا ہوں، ان مغربی مفکرین میں کرسچین اور ملحد دونوں طرح کے مفکرین کا ہاتھ رہا ہے اور یہ کام انہوں نے بے سمجھی میں نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کو ''کل'' کی حیثیت سے اپنے مقام سے گرانے کے لئے اس کے ہر پہلو پر اس طرح کے حملے انہوں نے کئے ہیں۔ جو بادی النظری میں بڑے عالمانہ اور دانشورانہ لگتے ہیں۔ حالانکہ 'دانشوری' ہی کا جو مغربی تصور ہے وہ صالح اور صحت مند نہیں ہے، کجا یہ کہ وہ صوفی ازم کو سمجھتے!

کلام حیدری

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

(فراق صاحب — چند جھلکیاں)

فراق صاحب کی غیر معمولی ذہانت، انوکھی شخصیت، ناقدانہ بصیرت اور شاعرانہ عظمت کے چرچے ان دنوں اپنے شباب پر تھے جب میں پہلے پہل الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے سال اول میں داخل ہوا تھا۔ پہلے ہی دن شعبۂ انگریزی کی شاندار اور پروقار عمارت کی بالائی منزل پر شیروانی میں ملبوس، بغل میں کتابیں دبائے، آنکھوں کی پتلیوں کو ایک مخصوص انداز میں گھماتے ہوئے فراق صاحب نظر آئے۔ وہ اپنی بھاری بھرکم اور رعب دار آواز میں بعض پرانے طلبا سے باتیں کرتے ہوئے اپنے کمرہ کی طرف جا رہے تھے میری طرح اور نووارد طلبا بھی ان کو نہایت استعجاب اور تحیر کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی پوری شخصیت اپنے انوکھے پن اور انفرادیت کی وجہ سے بے پناہ کشش کی حامل بن گئی تھی۔ ان کی طرف دھیان دیئے بغیر گزر جانا کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ یہ پہلا ہی نقش اتنا گہرا اور دیرپا ثابت ہوا کہ جیسے یہ ابھی کل کی بات ہو۔ اس دن فراق صاحب انتہائی خوش لباس نظر آ رہے تھے، ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے باقاعدگی اور خوش سلیقگی ٹپک رہی تھی۔ میں نے سوچا آج یونیورسٹی کا پہلا دن ہے شاید اسی لئے ظاہری باتوں میں رکھ رکھاؤ کی کیفیت نظر آ رہی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ سب محض "موڈ" کا کرشمہ ہے۔ چند ہی دنوں بعد بڑے ہی منتشر اور بکھرے بکھرے انداز میں نظر آئے۔ چھڑی ہاتھ میں لئے ہوئے کتاب کے مطالعہ میں مستغرق چاروں طرف سے بے خبر، اضطراب اور بے فکری کا پیکر۔ اس کے بعد تو دونوں طرح کی کیفیات کا ایک سلسلہ نظر آیا، کبھی یہ عالم کبھی وہ عالم۔ مگر ان کی شخصیت کی طرفگی اور انوکھی شان ہر پہلو سے جھلکتی رہتی تھی۔ اس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی بڑے نامور اساتذہ اور بین الاقوامی شہرت کے عالموں کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ پروفیسر تارا چند، پروفیسر بینی پرشاد، پروفیسر رام پرشاد ترپاٹھی، پروفیسر رانا ڈے، پروفیسر

کرشنن، پروفیسر جے۔ کے۔ مہتا، پروفیسر ایس سی۔ دیب، پروفیسر این۔ آر۔ دھر اور پروفیسر امرناتھ جھا (وائس چانسلر) جیسے لوگ درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ علم کا ایک دریا موجزن تھا مگر ان سب کے ہوتے ہوئے بھی فراق صاحب کی آن بان نرالی تھی حالانکہ وہ محض لکچرار تھے۔ اسے ان کی بدنصیبی اور ان سے زیادہ شعبۂ تعلیم کی بدنصیبی کہئے کہ ان کے جیسا آدمی اپنی عمر کے آخری دنوں میں تھوڑے عرصے کے لئے ریڈر کے عہدہ تک پہنچ سکا لیکن حقیقت یہ ہے کہ فراق صاحب جیسے لوگوں کے لئے یہ ظاہری اور نمائشی عہدے کوئی معنی نہیں رکھتے ایسے لوگ تو جس کرسی پر بیٹھ [illegible]

اتنی معقولیت، اہمیت اور شہرت کے مالک ہونے کے باوجود وہ اپنے آئی۔ سی۔ ایس کے لیے نامزد کئے جانے کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے اور بار بار اس خصوصیت کا ذکر کرتے تھے۔ یہی نہیں، اپنی انگریزی دانی کا اعتراف انگریزوں کے منہ سے انھیں بہت بھاتا تھا اور ان باتوں کا ذکر وہ اپنی گفتگو اور تقریر میں اکثر کرتے تھے۔ انھیں اپنی شاعرانہ عظمت اور فکری بصیرت پر بے حد اعتماد تھا لیکن اس کے باوجود [illegible] اس نوع کے پیچیدہ احساس [illegible] ان کے مداحین اور معترفین کی نظر میں فراق صاحب کی شخصی [illegible] عظمت اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے [illegible] بالاتر رہی مگر خود ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں محرومی کا یہ احساس ہمیشہ موجود [illegible] صاحب جو کبھی کبھی انگریزی زبان و ادب اور انگریز اساتذہ کا ذکر کرتے وقت احساس مرعوبیت سے [illegible] تعلقات ان ہندوستانی اساتذہ کے لب و لہجہ اور انداز [illegible] کا نہایت جارحانہ [illegible] کی تعلیم انگلستان [illegible] کی رہین منت ہوتی۔ ہم لوگوں کو ان کے اس رویہ پر بڑی حیرت ہوتی تھی مگر کون جانے انسانی شخصیت کی یہی بوالعجبی اس کی دلکشی اور رنگینی کا باعث بھی ہو۔ بات ہو رہی تھی فراق صاحب کے علمی وقار اور شاعرانہ [illegible] کی اور ذکر چھڑ گیا ان کی شخصیت کے اندرونی تضاد کا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا یہ پہلو اس قدر نمایاں اور حاوی تھا کہ اس کے ذکر کے بغیر ان کے بارے میں بات ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ بہت سی باتیں نہایت خیال انگیز اور فکر خیز ڈھنگ سے کرتے تھے مگر کبھی کبھی اپنی بات کو منوانے کی دھن میں اتنی دور نکل جاتے کہ ان کے انداز بیان کی ڈرامائی کیفیت اور مرعوب کن حوالے بھی ان باتوں کی بے حقیقتی کو چھپانے سے قاصر رہتے۔ ان کی تقریروں، تحریروں اور باتوں سے استفادہ کرنے اور روشنی حاصل کرنے کے لئے نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی لازمی شرط تھی کیوں کہ ان کی ہر بات پر ایمان لانا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں اکثر ایسے تنقیدی نکتے اور بصیرت افروز گوشے محسوس ہوتے تھے جو بڑے بڑوں کے یہاں بھی شاذ ہی نظر آتے مگر ادھر ادھر کی باتوں کی بھی ان کے یہاں کمی نہ تھی جن سے گریز ضروری تھا۔ مجموعی طور پر ادب اور تہذیب سے متعلق مسائل پر جتنی گہری، نادر اور فکر انگیز باتیں ان کی تقریروں اور لکچروں میں [illegible] دوسرے عالموں اور ادیبوں کے یہاں نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ عام ادبی [illegible] علمی حلقوں میں ان کا نام ان کی کوتاہیوں کے باوجود بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔

فراق صاحب بڑے جامع قسم کے آدمی تھے۔ اپنے شعبہ کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ سے بھی تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے اور تازہ ترین مسائل پر بحثیں چھیڑتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی یہ بحثیں اتنی شدت اختیار کر لیتی تھیں کہ ان سے ناخوش گوار صورت حال پیدا ہو جاتی۔ اپنی رائے کی قطعیت پر ہمیشہ اصرار کرتے کیوں کہ دوسروں کی رائے کا لحاظ اور احترام ان کے مزاج کے منافی تھا مگر وہ اتنے صاف دل کے انسان تھے کہ ان تلخیوں اور ناگوار باتوں کو بہت جلد بھلا دیتے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ بہت جلد خفا ہوتے مگر ان کی خفگی دیر تک قائم نہ رہتی کیوں کہ جس طرح دوسروں کو ناراض کرنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اسی طرح لوگوں کو منانے اور تعلقات کو نبھانے میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ جوش صاحب سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی لیکن ایک رات جب مستی و سرشاری کا عالم طاری تھا دونوں میں زبردست تو تو میں میں ہوئی اور معاملہ اتنا بڑھا کہ بول چال تک بند ہو گئی۔ فراق صاحب نے اس کا شکوہ ایک ... باتیں بھی کیا ہے۔ فراق صاحب نے دوستی کی تجدید میں پہل کی کیوں کہ زیادہ دنوں تک اس صورت حال کو جھیل لینا ان کے بس کی بات ...

ایک دفعہ علی گڑھ میں ... قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ... علم تھا ... ہوسٹل میں میرے کمرے کے برابر راہی معصوم رضا ... چھوٹے بھائی مہدی رضا کا کمرہ تھا۔ ایک ... کے سامنے میں راہی ... یہاں ٹھہرے ہوئے ... میں مظفر شاہ جہاں پوری بھی تھے۔ انہیں سے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی والے مشاعرہ میں فراق صاحب ... رہے ہیں جن کو لینے کے لئے وہ اسٹیشن جا رہے تھے ... فراق صاحب کھلے کر میرے ہی کمرے میں آ گئے۔ یونین کے سکریٹری حفیظ زیدی نے ان کے قیام کا انتظام جذبی صاحب کے یہاں کر رکھا تھا لیکن میں نے راستہ میں فراق صاحب کی ... سے ان کو خلیل ... اعظمی) کا مہمان بنا دیا۔ سوچا خلیل صاحب کے یہاں زیادہ ... بے تکلف فضا ... میں ... خلیل کے ساتھ انجم اعظمی رہتے تھے اور ان دنوں ان کے یہاں ... کے ... ظاہر ... روپوش تھے جو الہ آباد میں فراق صاحب کے عزیز طالب علم رہ چکے تھے۔ وہ اتنے انقلابی خیالات رکھتے تھے اور اس قدر فعال تھے کہ سرکار نے ان کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے تھے۔ ان کو وہاں دیکھ کر فراق صاحب بڑے خوش ہوئے۔ کچھ ہی دیر میں جذبی صاحب اور راہی بھی وہاں آ گئے۔ پھر کیا تھا انتہائی دلچسپ اور خیال افروز باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو شام تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ شعر و شاعری اور ادبی تنقید پر جو باتیں ہوئیں وہ کچھ کم خیال انگیز نہیں تھیں مگر فحاشی اور عریانی کے مسئلہ پر جس دقت نظر اور جامعیت کے ساتھ انہوں نے روشنی ڈالی اس کی یاد ذہن میں آج تک تازہ ہے۔ وہ بڑے ہی اچھے موڈ میں تھے اور مستقل ذہانت کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔ ان کو مناسب اور دلچسپ لطیفوں کی مدد سے اپنی گفتگو کو دلکش ... آتا تھا۔ ... باتیں کرتے تھے مگر کیا مجال جو کبھی ... کا احساس ہو ... ان کی ... ان کے فن گفتگو ... کہ ... اس ... کی

شکل اختیار کرلیتی تھی۔ ان کا ڈرامائی انداز ان کی شخصیت کا ایک لازمی اور اہم جزو تھا۔

ایک بار میں ایک ادبی کانفرنس کے سلسلے میں اپنے عزیز دوست اشتیاق عابدی کے ساتھ وزیر منزل (لکھنؤ) میں سجاد ظہیر صاحب سے ملنے گیا۔ فراق صاحب ان کے مہمان تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی سردار جعفری نے شاہراہ (دلی) میں ان کے بعض نظریات اور خیالات کی سخت الفاظ میں تنقید کی تھی۔ سردار جعفری کا نام آنا تھا کہ فراق صاحب یکایک غضب ناک ہو اٹھے۔ کہنے لگے سردار کیا اور ان کی شاعری کیا! [illegible] انگلستان میں دکانوں کے اشتہارات تک یہاں کے ادیبوں کے تخلیقی ادب سے بہتر ہوتے ہیں۔ اشتیاق عابدی نے گفتگو کا رخ موڑنے کے خیال سے ڈاکٹر رام بلاس شرما کے بعض مضامین کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مگر فراق صاحب نے ان کو دو تین جملوں میں نپٹا کر پھر سردار جعفری کی خبر لینی شروع کر دی۔ بنے بھائی (سجاد ظہیر) ان ساری باتوں سے بے نیاز ان کے آرام و آسائش سے متعلق چیزوں کی تیاری اور دیکھ بھال میں لگے رہے۔ تحمل کا پیکر بنے سب کچھ ان سنی کرتے رہے۔ میں ان کے صبر و ضبط کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ چائے پر ان کا موڈ پھر خوشگوار ہو گیا۔ ڈھیر سارے لطیفے سنائے گئے اور محفل زعفران زار بن گئی۔ نیاز حیدر کے قہقہوں نے اس سلسلے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ فراق صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے مشاعرہ میں جانے کی تیاری کرنے لگے اور ہم لوگ اجازت لے کر واپس ہو لئے۔

کچھ دنوں بعد علیگڑھ میں سنجیدہ [illegible] ادب کے ایک جلسہ میں ملاقات ہوئی۔ احتشام صاحب مرحوم اور سرور صاحب بھی موجود تھے۔ فراق صاحب [illegible] مشاعرے کے افتتاح کے لئے دعوت دی گئی تھی اور جب انہوں نے "عالم گیرت" میں اپنی نظم [illegible] تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ آج کی رات کا وقت اس کے ختم ہونے کی نوبت [illegible] تھے کہ دیکھئے کلام [illegible] کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ منتظمین مشاعرہ [illegible] جائے۔ حاضرین میں سے کچھ غیر مہذب نوجوانوں نے دو چار فقرے کسے [illegible] صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ہندی زبان و ادب کے [illegible] پر ایک سناٹا طاری ہو گیا اور تھوڑی دیر کے لئے ایسا لگا کہ اب شاید فراق صاحب [illegible] بولتے ہی رہیں گے۔ اچانک ان کا غصہ کافور ہو گیا اور [illegible] مشاعرہ شروع [illegible] منتظمین کی جان میں جان آئی۔

ان سے آخری ملاقات [illegible] الہ آباد میں ان کے گھر پر ہوئی۔ ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب (مرحوم) کے مکان پر ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر وہاب اشرفی [illegible] ہوئے تھے۔ فراق صاحب خاصے کمزور ہو [illegible] اور کہیں آنے جانے میں ان کو بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ بار بار مسیح صاحب کو ٹیلیفون کر رہے تھے کہ وحید اختر کو بھیجو۔ چنانچہ وحید اختر، وہاب اشرفی، جعفر رضا اور [illegible] ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب (مرحوم) کے مکان پر حاضری دینے کے بعد فراق صاحب کے مکان واقع بینک روڈ پر پہنچے۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے کمزوری سے نڈھال [illegible] گھڑیوں کی [illegible] تھیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

وحید اختر نے کہا اچھا تو یہ آپ کا لنچ ہے۔ فراق صاحب بڑے زور سے ہنسے اور کہنے لگے نہیں یار۔ ککڑیاں کھانے کا بے حد جی چاہتا تھا مگر منہ میں ایک دانت بھی نہ رہا۔ اس لئے یہ ترکیب نکالی ہے۔ پھر وہاب صاحب کی طرف دیکھ کر بولے Who are you darling ؟ جن لوگوں نے وہاب صاحب کو دیکھا ہے۔ وہی اس سوالیہ فقرے کا پورا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ میں نے ان کا تعارف کرا دیا۔ جسمانی طور پر اس قدر کمزور ہو جانے کے باوجود ان کی ذہانت، بذلہ سنجی، مزاح اور حاضر دماغی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کہنے لگے جب جی گھبراتا ہے تو اکبر الہ آبادی کی قبر کے پاس جا کر تھوڑی دیر بیٹھ رہتا ہوں بڑا قلبی سکون محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد کافی دیر تک بڑے منطقی انداز میں صفر اور نفی کے تصور پر باتیں کرتے رہے۔ فراق صاحب جب سنجیدگی کے ساتھ اس نوع کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے تھے تو ان کی شخصیت کا اصل جوہر کھل کر سامنے آجاتا تھا۔ بعد میں وہاب صاحب نے کہا کہ اب کہاں اس پایہ کی ذہانت دیکھنے کو ملے گی اسے تو یہ اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔ اور ہوا واقعی ایسا ہی۔ جس دن انھوں نے اپنے عزیز اور چہیتے شاگرد راجندر کمار گرگ کے مکان پر آخری سانس لی اس دن اردو غزل، اردو تنقید اور درس و تدریس کا ایک عہد ختم ہو گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

★

بقیہ غلط نامہ عبد المنان کا نام تحریر پذیر ہو گیا ہے اور موصوف کے مضمون بعنوان "ڈاکٹر عبد الرؤف بحیثیت مترجم" کے سامنے "محمد بدر الدین" لکھا گیا ہے جبکہ ہونا چاہئے تھا۔

مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
تمثیل کا مفہوم اور سبب رس	محمد بدر الدین	سب رس کا مختصر تجزیہ
ڈاکٹر عبد الرؤف بحیثیت مترجم	عبد المنان	

اب ناچیز عرض گذار ہے کہ آہنگ کے عنقریب کے شمارے میں اس غلطی کا ازالہ فرمادیں اور قارئین حضرات کو ایک بڑی غلط فہمی سے بچائیں۔ میں اس کے لئے ہمیشہ کا ممنون و مشکور رہوں گا۔

ایک گذارش اور یہ ہے کہ خاکسار کے دو مضامین بعنوانات "زبان کی پیدائش اور اس کے نظریات" اور "اردو مصوتے اور مصمتے — چند مباحث کی روشنی میں" بغرض اشاعت ارسال خدمت کئے گئے ہیں۔ توقع ہے کہ انہیں بھی عنقریب کے شمارے میں شائع فرما کر مشکور و ممنون ہونے کا موقع عنایت کریں گے۔ اور مزید کیا عرض کروں؟ بقیہ لائق شکر ہے

نیاز کیش و طالب دعا

محمد بدر الدین

علی حیدر ملک (پاکستان)

افسانے کا ہاتھ، تنقید کا پتھر

اُردو میں افسانہ ایک توانا اور مقبول صنف ہے لیکن کچھ نقاد ایسے بھی ہیں جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ افسانہ اور افسانہ نگاروں پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں اور اپنی ساری صلاحیت یہ باور کرانے میں صرف کر رہے ہیں کہ افسانہ ایک غیر تخلیقی، معمولی اور حقیر صنف ہے۔ ایسے نقادوں میں دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ـــــ شمس الرحمان فاروقی اور محمود ہاشمی۔ شمس الرحمان فاروقی اپنے ایک گمراہ کن عنوان والے مضمون "افسانے کی حمایت میں" میں کہتے ہیں کہ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ افسانہ ایک معمولی صنف سخن ہے اور علی الخصوص شاعری کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ کوئی کھیل محض اس وجہ سے عظیم نہیں ہو جاتا کہ اس کا کھیلنے والا بادشاہ یا وزیر اعظم ہے۔ دوسری طرف یہ بھی غور کیجئے کہ آپ نے گلی ڈنڈے میں یدطولی حاصل کر بھی لیا تو کیا ہوا؟ آپ کو کرکٹ کے [illegible] کے مقابلے میں تو نہیں رکھا جا سکتا۔"

فاروقی مثالیں دینے کے عادی ہیں مگر [illegible] انھوں نے جو مثال [illegible] اس کا اطلاق افسانے پر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو اس سے جو [illegible] کے اخذ کردہ نتیجے [illegible] ہوگا۔ افسانے کو گلی ڈنڈا اور شاعری کو کرکٹ [illegible] جا سکتا ہے [illegible] اور مفروضہ تو آپ جو بھی چاہے [illegible] ایک کھیل [illegible] جنھیں بادشاہ یا وزیر اعظم کہا گیا ہے [illegible] فائز ہونے [illegible] یا وزارت عظمیٰ تو صرف کسی مصنف [illegible] ادب کی دنیا [illegible] کا کون ایسا بادشاہ یا وزیر اعظم ہے [illegible]

فاروقی صرف افسانے کی نفی نہیں کرتے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ناول پر بھی حملہ کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔
"میں اسی لئے ناول کو بھی شعر سے کمتر مانتا ہوں۔ افسانہ تو پھر افسانہ ہے"
اب فاروقی کو کون بتائے کہ ناول لکھنا صرف ایک کتاب لکھنا نہیں بلکہ ایک دنیا تخلیق کرنے کے مترادف ہے۔ شعر خواہ کتنا ہی بڑا ہو یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ گھروندے بنانے اور اسے پسند کرنے والے تخلیق کائنات کی پیچیدگیوں اور عظمت کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس کے اسرار سے واقف ہو سکتے ہیں۔ یہاں فاروقی کی یہ ستم ظریفی بھی ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے افسانہ یا ناول کا موازنہ شاعری کی کسی ایک صنف سے نہیں بلکہ جملہ تمام اصناف سے کیا ہے جس میں رزمیہ سے لے کر مفرد اشعار تک آجاتے ہیں۔ محمد حسن عسکری کو تو ـــــ فاروقی بھی مانتے ہیں۔ یاد کیجئے کہ ناول کے ضمن میں انھوں نے کیا کہا تھا۔

"ہر دور میں کوئی نہ کوئی صنف ادب ایسی ہوتی ہے جسے انسانی تقدیر کا کوئی نہ کوئی تصور تخلیق کرنے کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اس تصور میں چونکہ اس پورے معاشرے کی روح کھنچ آتی ہے اس لئے اس دور میں یہ صنف ادب کی تمام اصناف سے اعلیٰ اور برتر سمجھی جاتی ہے۔ یونان میں اور شیکسپیر کے انگلستان میں یہ درجہ المیہ کو حاصل تھا۔ پچھلے سو سال سے یورپ میں یہ فریضہ ناول انجام دے رہا ہے اور بیسویں صدی میں جوئس جیسے ناول نگاروں نے اپنے قارئین سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ان کے ایک ناول کو پڑھنے اور سمجھنے میں لوگ پوری پوری عمر لگا دیں۔ یہ مطالبہ اس لئے بے جا نہیں کہ انسانی تقدیر کے مسئلے کی تفتیش میں بیسویں صدی کا ناول شاعری سے بھی آگے رہا ہے۔ انسانی اقدار کی نئی تشکیل اور انسان کی تعریف متعین کرنے کی کہم اس ناول نے اس طرح اپنے ذمہ لی ہے کہ نفسیات اور فلسفہ تو ابھی تک اس کے پیچھے گھسٹ رہے ہیں۔" (آدمی یا انسان)

اب ذرا محمود ہاشمی کی بھی سنئے ـــــ فرماتے ہیں۔

"اندلوں افسانہ مختصر ہو یا طویل، یہ خالص ادب کے دائرے میں نہیں آتا۔ ادب یا لٹریچر یا آرٹ، نام ہے شاعری، مصوری، موسیقی کا لیکن یہ افسانہ بیچارہ خواہ مخواہ گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح ادب کے چکی میں پس رہا ہے" (تخلیقی افسانہ کا فن)

ہاشمی کے خیال میں افسانہ مختصر ہو یا طویل یہ بحیثیت صنف خالص ادب کے دائرے میں نہیں آتا لیکن یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے اس کے لئے "ان دلوں" کی شرط کیوں لگائی ہے؟ کیا پہلے افسانے کا شمار ادب میں ہوتا تھا اور بعد میں اسے ادب کے زمرے سے خارج کر دیا گیا؟ اگر وہ یہی کہنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں یہ بتایا جائے کہ تاریخ ادب میں یہ حادثہ یا واقعہ کب اور کیوں کر رونما ہوا؟ کیا واقعی آرٹ یا لٹریچر محض شاعری، مصوری اور موسیقی کا نام ہے؟ افسانے کو تو خیر گھن کی طرح پسنے دیجئے لیکن رقص نے کیا قصور کیا تھا جو آپ نے اسے یک بینی و دو گوش آرٹ کی دنیا سے نکال باہر کیا؟

سلہ ہاشمی تفریح کے آدمی ہیں ... پر لگانا زیادتی کرنا ـــــ ادیب

ہاشمی کہتے ہیں کہ "افسانہ، کہانی، قصہ عام ذہن کی فطری پیداوار ہے۔ ہر شخص خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بالکل جاہل دن بھر میں دو چار دس پانچ افسانے ضرور تراشتا ہے۔ انھیں بیان کرتا ہے اور اس کا اظہار بھی اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔" سوال یہ ہے کہ افسانہ اگر عام ذہن ہی کی سہی فطری پیداوار ہے تو کیا شاعری اور دوسرے فنون غیر فطری پیداوار ہیں؟ فطری اور غیر فطری کی بحث سے قطع نظر ہاشمی نے جو بات افسانے کے بارے میں کہی ہے وہی بات غالباً اس سے زیادہ صحیح طور پر شاعری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ شاعروں میں فلمی اور قوال شاعروں سے لے کر رمضان میں سحری کے وقت جگانے والی ٹولیوں تک کے شاعر موجود ہیں۔ آگے چل کر محمود ہاشمی رقمطراز ہیں — "افسانہ اور تخلیقی ادب کے درمیان ایک بُعد ضرور محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے ناقدین نے بھی افسانے پر یا تو بالکل توجہ نہیں دی یا پھر ایک آدھ مضمون پر اکتفا کیا ہے......... ناقدین کی افسانے سے عدم توجہی کا قصہ صرف اردو کا نہیں ہے بلکہ انگریزی ادب کے ناقدین میں بھی افسانے سے اس قدر تو نہیں لیکن مجموعی طور پر بے توجہی کی شکایت ہے۔ البتہ فرانس میں افسانے کے ساتھ خاصا انصاف کا سلوک کیا جاتا ہے۔ یوں بھی افسانے کا ارتقاء بڑی حد تک فرانس کا مرہون منت ہے۔" ہاشمی زورِ بیان میں اپنی تحریر کے تضاد کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ناقدین نے اگر افسانے کی طرف توجہ نہیں کی تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکلا کہ افسانہ اور تخلیقی ادب کے درمیان ایک بُعد موجود ہے۔ پھر افسانے کا ارتقاء جب فرانس کا مرہون منت ہے اور وہاں اس کے ساتھ خاصا انصاف کا سلوک بھی ہوا تو شکایت کس بات کی؟ ہاشمی کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ افسانے کا ارتقاء فرانس کے علاوہ روس کا مرہون منت رہا ہے اور وہاں بھی اس کے ساتھ خاصا انصاف ہوا ہے۔ رہ گیا انگریزی افسانہ تو انگریزی میں افسانے کی صنف اتنی ترقی یافتہ نہیں جتنی کے فرانس، روس اور بعض دوسرے ممالک میں ہے اسی لئے انگریزی میں اس کی طرف توجہ بھی کم ہوئی۔ ویسے کسی صنف پر تنقید کا کم لکھا جانا لازمی طور پر اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس صنف میں اچھے یا بلند پایہ فن پارے نہیں پیش کئے گئے۔

بات دراصل یہ ہے کہ کوئی صنف بجائے خود بڑی یا چھوٹی، عظیم یا حقیر نہیں ہوتی۔ اس صنف کے لکھنے والے اسے عظمت یا پستی بخش دیتے ہیں۔ ڈرامے کی صنف کو لیجئے۔ عالمی سطح پر یہ ایک قدیم اور پُرعظمت صنف سمجھی جاتی ہے۔ قدیم یونان اور پراچین ہندوستان سے لے کر جدید انگلستان تک اس صنف میں فن کے جتنے جلیل اور جمیل نمونے پیش کئے گئے ہیں وہ آدمی کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں لیکن اردو میں ڈرامے کی کیا حالت ہے اسے سوچ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر۔ آپ اس سے کیا نتیجہ نکالیں گے؟ آیا یہ کہ ڈراما ایک ناقص صنف ادب ہے یا یہ کہ اردو میں بڑے ڈراما نگار نہیں پیدا ہوئے؟ ظاہر ہے پہلی بات صحیح نہیں ہو سکتی ورنہ انگریزی، فرانس اور جرمن زبانوں میں اتنے بڑے ڈرامے کیسے نظر آتے؟ دوسری بات ہی صحیح ہے کہ اردو میں کوئی بڑا ڈراما نگار پیدا نہیں ہوا جو اس صنف کو عظمت و وقار عطا کرتا۔

صبا اکرام (پاکستان)

جدید افسانہ اور کھوئی ہوئی پہچان

معاشرہ مکمل طور پر صنعتی پھیلاؤ کی زد میں نہ آچکا ہو اور اس کا رشتہ پوری طرح فطرت سے کٹ نہ گیا ہو تیز وقت کے پہیوں میں وہاں ہوائی جہاز کی تیز رفتاری نہ آچکی ہو تو ایسے معاشرے میں زندگی بتدریج طے ہو رہی ہوتی ہے۔ آدمی کے تجربات کی کڑیوں میں کڑیاں ایک ایک کرکے جڑتی جاتی ہیں اور ایک زنجیر سی بنتی چلی جاتی ہے۔ یعنی زندگی میں ایک طرح کا تسلسل قائم رہتا ہے جو آدمی کو اس کے ماضی سے کٹنے نہیں دیتا۔ اس کی یادداشت کے آئینے میں ہر گزرے ہوئے کل کا کوئی نہ کوئی تجربہ یا مشاہدہ منعکس ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے، اور اس طرح اس کے اندر ہی اندر اس کی اپنی ایک تاریخ کے مرتب ہوتے رہنے کا ایک سلسلہ [illegible] ہے۔ یہی مسلسل آدمی [illegible] رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط تک برصغیر کے بڑے شہروں کی زندگی میں [illegible] یہی صورت حال تھی۔ زندگی بتدریج طے ہو رہی تھی۔ ہر شخص خود اپنی پہچان تھا۔ کیونکہ اس کا رشتہ اپنے آج سے۔ اور آج سے پہلے والے کل سے اور اس سے پہلے گزرے ہوئے سارے کل سے کسی نہ کسی طور برقرار تھا۔ مگر پھر ہوا یہ کہ بتدریج طے ہوتی ہوئی زندگی کی رفتار میں مشینی تیز رفتاری آنے لگی۔ اور زندگی بتدریج طے ہونے کی بجائے جستوں میں طے ہونے لگی۔ شروع شروع میں ایک جست سے دوسری جست کے درمیان کا فاصلہ کچھ کم تھا۔ پھر کچھ زیادہ ہوا، اور پھر اتنا زیادہ ہو گیا کہ زندگی میں جو ایک تسلسل تھا وہ ختم ہو کر رہ گیا۔ بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی نے آدمی کے تجربات میں اس قدر تنوع پیدا کیا کہ اس کی یادداشت انہیں اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہو گئی۔ لہذا ہر آج رفتہ رفتہ اپنے گزرے ہوئے کل سے بچھڑتا گیا اور نتیجے کے طور پر صنعتی معاشرے کا آدمی اپنی پہچان سے دور ہو گیا۔ اس کی پہچان کا کھو جانا اور اس کی فردیت کا گم ہو جانا ایک ایسا

المیہ ہے جو اس معاشرے کے آدمی کو اندر سے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔

اس کیفیت کو مشہور امریکی ادیب CHARLES REICH نے اپنی کتاب "THE GREENING OF AMERICA" میں 'زندگی میں موت' سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے

"OF ALL FORMS OF IMPOVERISHMENT, THE LOSS OF SELF IS THE MOST DEVASTING, EQUAVALENT TO DEATH IN LIFE."

مشینی عہد کے پیدا کردہ معاشرے میں 'زندگی میں موت' کی اس کیفیت کا اظہار اردو کے جدید افسانوں میں بھی نظر آجاتا ہے۔ اے خیام نے اپنے افسانہ "ویرانہ" میں اس معاشرے میں رہنے والے فرد کو پتھر کے بے جان بت اور برف کے تودے سے تشبیہہ دی ہے جو زندگی کی حرارت سے یکسر محروم ہے۔ اور قمر احسن کے افسانہ "یا مصطفےٰ" میں یہ فرد ایک ایسی جیتی پھرتی لاش نظر آتا ہے، جس کی آنکھیں زندگی کی چمک سے خالی اور چہرہ جینے کے احساس سے عاری ہے:

——" وہ حیرت سے ان سہمے ہوئے چہروں کو دیکھتا رہا۔ ان میں زندگی کے آثار کہاں ہیں۔ یہ بت ہیں، اپنی اپنی جگہوں پر ایستادہ بت، پتھر کے مجسمے، بے جان، پلپلے روئی کے گالوں کی طرح۔ ٹھنڈے یخ، برف کے تودوں کی طرح۔"

"ویرانہ" اے خیام

——" اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے بالکل الگ الگ رہتی تھیں جذبات سے عاری سپاٹ آنکھیں۔ عرصہ ہوا جب اس کی آنکھوں سے چمک غائب ہو گئی تھی۔ اور چہرے سے تمام احساسات کی لکیریں معدوم ہو گئی تھیں۔"

"یا مصطفےٰ" قمر احسن

شناخت کے گم ہو جانے کے المیئے کو جدید افسانہ نگاروں نے بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور اور اسے اپنے افسانوں کا موضوع بھی بنایا ہے۔ اس المیئے کے نتیجے کے طور پر مشینی عہد کا انسان جس صورت حال سے دوچار ہوا ہے، اس کا اظہار ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ تمام افسانہ نگاروں کے یہاں سے اس چھوٹے سے مضمون میں مثالیں پیش کرنا تو دشوار ہے۔ اس لئے دو تین افسانوں سے اقتباس پیش کرنے پر ہی اکتفا کروں گا۔

——" میری پہچان نے موت کا ذائقہ چکھ لیا ہے، اور اب مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ ہیں، میں ہوں۔"

"بے زمیں، بے آسماں" علی حیدر ملک

——" اس نے دماغ پر بہت زور ڈالا۔ اُسے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ

وہ کہاں سے آیا تھا، اسے کہاں جانا تھا۔ وہ کہیں سے آیا بھی تھا یا یہیں پیدا ہوا تھا۔"

"بے نام وقت کی کہانی": مشتاق قمر

"چہرے کے نام پر کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ محض داڑھی تھی یا پھر آنکھیں...... انگلیوں کی جگہ لمبے لمبے نوکدار ناخن، گویا اپنے ہی ناخنوں سے کرید کرید کر چہرے کو لاپتہ کرلیا تھا اس نے۔"

"پشت" انیس رفیع

مشینی عہد کے آغاز کے ساتھ ہی پرانی قدروں کی شکست وریخت شروع ہوگئی اور ماضی اپنی اہمیت اور قدروقیمت کھونے لگا۔ ایک نیا طرز زندگی سامنے آیا جس کے تحت آدمی کے لئے ہر لمحہ نئے سماجی تقاضے تھے اور اس کو نئے معاشرے میں زندہ رہنے کے لئے ان تقاضوں کے مطابق ہر لمحہ نئے چہروں سے خود کو آراستہ کرنا تھا۔ اس امر نے پرانے معاشرے کے سیدھے سادے آدمی کی پہچان کو چھین کر اسے ناٹک کا کردار بنادیا۔ اب اس کی زندگی میں اصلی چہروں سے زیادہ مکھوٹوں کو اہمیت حاصل ہوگئی اور زلیست کرنے کی بجائے ROLE PLAYING اس کی روزمرہ زندگی کا معمول بن گیا۔

"روز شہر جاکر اپنی ذات کا کچھ حصہ کھو آتے ہو، اور روز تمہارا چہرہ بدلتا ہے۔
وہ شخص جو ناشتہ کرکے آفس جاتا ہے اور شام کو واپس نہیں آتا، ایک اجنبی واپس آتا ہے۔"

"بدلتا ہوا چہرہ" ساگر سرحدی

آدمی کی یادداشت ہی اس کو اپنے تمام تر پس منظر کے ساتھ زندہ رکھتی ہے، اور اس کے سہارے اس کا حاضر اس کے ماضی سے جڑا رہتا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے حاضر میں اس کا ماضی سانس لے رہا ہوتا ہے۔ وہ کل جو کچھ تھا، پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اور آج جو کچھ ہے، یہ سب کچھ اس کی یادداشت کی گرفت میں ہو تبھی آدمی کی پہچان گم ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔ لیکن ہوا یوں کہ بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی نے جب وقت کے پہیوں کو مشینی تیز رفتاری عطا کردی اور ساتھ ہی سماجی تونگوں کی ترقی میں بھی تیز رفتاری آئی تو خود اپنے پیچھے بھاگتے لوگوں کے قدموں نے اس قدر گرد اڑائی کہ آدمی کی یادداشت کی کتاب میں لکھے حروف کی سیاہی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ جس نے رفتہ رفتہ اس کی پہچان کو دھندلا کر رکھ دیا۔ رشید امجد اور زاہدہ حنا

کے افسانوں میں یہ پہلو بڑی خوبصورتی سے بیان ہوا ہے

— "اس کی یادداشت کی چڑیا صدیوں کے گنجلک چہرے پر پھیلی ہوئی پہچان کو بہت دیر سے دانہ دانہ چگ رہی تھی۔ لیکن جب بہت دیر کے بعد بھی شجر شناختن کی گود سے یاد کے ہمکتے بچے نے سر نہ اٹھایا تو اس کے دل میں سرسراتی خوشی مرجھاہٹ کی کھردری مٹھی میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔"

"نارسائی کی مٹھیوں میں" رشید امجد

— "اور تب یاد کی انگلیاں وقت کی بند مٹھی میں پھڑپھڑاتے ہوئے لمحوں کے ان پرندوں کو محسوس کرنا چاہتی ہیں جو موجود کی شاخ سے اڑے اور نامعلوم کی طرف پرواز کر گئے۔"

"زیتون کی ایک شاخ" زاہدہ حنا

مشینی عہد نے جن مسئلوں کو جنم دیا ان میں ایک اہم مسئلہ BRAIN DRAIN کا بھی ہے۔ بیسویں صدی میں جس بڑے پیمانے پر یہ مسئلہ انسانیت کو درپیش ہوا اس سے پہلے کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس مسئلے نے آدمی کو اس کی اپنی سرزمین اور اپنے ماحول ہی سے دور نہیں کیا بلکہ اس کو اس کی پہچان سے بھی کوسوں دور پہنچا دیا۔ وہ اجنبی سرزمین پر، اجنبی چہروں کے درمیان، اجنبی آوازوں کے بھنور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں باہر سے مسلسل سمٹتا گیا اور اندر سے اس کا وجود انتشار کی تند ہواؤں میں سوکھے پتوں کی طرح بکھرتا رہا۔ اس صورت حال نے اس کو NOSTALGIA میں مبتلا کر دیا جس کے نتیجے کے طور پر وہ باہر اپنی پہچان کے رشتے استوار کرنے کی بجائے اپنی ذات کے نہاں خانوں میں ایک ایسی سماجی اور جغرافیائی دنیا کی تلاش میں بھٹکنے لگا جو اس کے NOSTALGIA کو سہارا دے سکے۔ اس کی اس کیفیت نے اجنبیت کے احساس کو کم کرنے کی بجائے اور بھی شدید کر دیا۔ اور اس نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے سمبندھ جوڑنے کی بجائے اپنی ایک چھوٹی سی مصنوعی دنیا میں ہی سمٹ سمٹا کر رہ لینے میں عافیت جانی۔

— "ان ملکوں کی ہوا بڑی خطرناک ہے۔ آدمی کے تن پر اتنی تیزی سے اثر کرتی ہے کہ وہ صرف اپنے لئے ہی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اپنے ہی بارے میں سوچتا ہے اور کسی سے گہرا سمبندھ رکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"ہوا کے دوش پر" جتندر بلو

— "پہلے لوگ اہل خانہ تھے۔ وہ جہاں بھی ہوتے تھے اپنے گھر کے اندر ہی ہوتے تھے۔ مگر ہم خانہ بدوش ہیں۔ یعنی ہم نے اپنے گھر کی خواہش کو دل سے نکال کر کندھوں پر ڈال لیا ہے۔"

"عمود" جوگیندر پال

— "اندر بہت ہجوم تھا۔ بے شمار کاؤنٹر تھے جن پر عورتیں اور مرد قطاروں میں کھڑے

تھے۔ ہر کاؤنٹر پر تختی لگی تھی۔ کسی پر لکھا تھا۔ یہاں ہاتھ بھنائے جاتے ہیں ایک جگہ تحریر تھا، وصولی سے قبل ہاتھوں کا معائنہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک جگہ لکھا تھا، خوش حالی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اپنے ہاتھ برآمد کیجئے اور زرمبادلہ کمایئے۔"

"ہاتھ بیچنے والے" نجم الحسن رضوی

یہاں ایک طرف تلاش معاش کی خاطر، اور بیشتر صورتوں میں ہوس زر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی سرزمین کو چھوڑ کر سمندر پار کے ملکوں کو جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہیں دوسری طرف دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کا ایک رجحان بھی پیدا ہوا۔ اور جب اکہری شخصیتوں والے سیدھے سادے دیہاتی اپنی پہچان کا سرمایہ اپنی گٹھری میں لئے صنعتی شہروں میں داخل ہوئے تو انہیں بھی لٹنے میں دیر نہ لگی۔ بے چہرہ لوگوں کی بھیڑ میں کب اور کس طرح ان کی گٹھری غائب ہو گئی اس کا انہیں علم بھی نہ ہو سکا۔ اور پھر ہر قدم پر نئے تجربات اور نئے تقاضوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر اپنی شخصیت کو بیک وقت مختلف سانچوں میں ڈھالنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ جس کے نتیجے میں وہ اور تو سب کچھ بنتے رہے، لیکن پھر کبھی وہ نہ بن سکے جو وہ اصلاً تھے۔ اب ان کے خالی ہاتھوں میں ان کی پہچان کے لئے کبھی کارخانوں میں ملازمت کی پرچی تھی، کبھی راشن کارڈ، کبھی مکان کے کرائے کی رسید اور کبھی بسوں اور ٹراموں کے ٹکٹ :

"سارے چہرے تھکے ہوئے تھے۔ ساری انگلیوں میں تیرہ پیسے کے ٹکٹ دبے ہوئے اپنی قیمت کھو رہے تھے۔ پارک سرکس سے دھرم تلہ تک ان تیرہ پیسوں کے ٹکٹ کا اپنا وجود ہے جو مسافروں کے اترتے ہی یا دھرم تلہ پہنچتے ہی ختم ہو جائے گا۔ میں نے سوچا اور اپنی انگلیوں میں دبے ہوئے ٹکٹ کے نمبر چبانے لگا۔"

"اپنا رنگ" ظفر اوگانوی

موجودہ صنعتی معاشرے میں آدمی کے پہچان کے گم ہو جانے کے جو چند اسباب خود جدید افسانوں کے حوالے سے میں نے محسوس کئے انہیں اوپر بیان کر دیئے ہیں اور ان اسباب کی جو جھلکیاں جدید افسانے میں نظر آئی ہیں، ان میں سے بھی چند مثالیں اقتباسات کی صورت میں پیش کر دی ہیں۔ آخر میں ایک نفسیاتی پہلو کا بھی ذکر کر دوں جو انہیں افسانوں کے حوالے سے سامنے آیا ہے اور جو اوپر بیان ہونے سے رہ گیا ہے۔ دراصل شناخت کی گمشدگی کے نتیجے میں جو صورت حال سامنے آئی اس کا منفی اثر جب آدمی کے دل و دماغ پر ہوا تو وہ ایک طرح کی SHIZOPHRENIC کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی اس کیفیت کا اظہار جدید افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں شعور کی رو کی تکنیک کے ذریعہ بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ اس ضمن میں سریندر پرکاش کے "تلقارمس" اور "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" اور قمر احسن کے "آگ، الاؤ اور صحرا" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

آدمی کی کھوئی ہوئی پہچان کے مسئلے کو موضوع بنا کر لکھے گئے افسانوں میں جو ایک کمی مجھے بار بار کھٹکتی ہے وہ اس مثبت پہلو کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر نظر انداز کرنا ہے جو شناخت کی گمشدگی کے نتیجے میں سامنے آیا ہے۔ یعنی ایک پہچان کے چھن جانے کے بعد جدید عہد کے آدمی کے لئے معاشرے میں اپنی پسند اور اپنی صلاحیت کے مطابق اپنا ایک رول منتخب کرنے کا جو موقع مل سکتا آیا ہے۔ وہ پرانے معاشرے میں دستیاب نہیں تھا۔ آدمی جس پہچان کو لے کر ہوش سنبھالتا تھا، اسی کے ساتھ مر بھی جاتا تھا۔ وہ اگر یہ چاہتا بھی تھا کہ اپنے معاشرے میں ایک نئی پہچان اپنا کر زندگی بسر کرے تو اولاً تو اس کے مواقع وہاں دستیاب نہیں تھے اور اگر کوئی ایسی صورت نکل بھی آتی تو معاشرہ اسے اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مگر جدید معاشرے میں ساری خرابیوں کے باوجود انتخاب کا ایک تنوع اس کے سامنے آیا ہے وہ اب اپنی پسند اور اپنی صلاحیت کے مطابق اپنی ذات کی تشکیل نو کر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جدید افسانے کا دامن اتنا تنگ نہیں کہ جدید معاشرے کے خارزار سے چنے گئے کانٹوں کے ساتھ یہ چھوٹا سا ایک پھول بھی اس میں سما نہ سکے۔ لیکن اس کے لئے جدید افسانہ نگاروں کو اپنی نظر میں وسعت پیدا کرنی ہوگی۔

★

نصیر افسانے کا علمیہ ....

اگر مختلف ادبی اصناف کی حدود اور ساخت کو مد نظر رکھا جائے تو غزل سے زیادہ ناقص اور کنزرویٹو (CONSERVATIVE) صنف شاید ہی کوئی اور نظر آئے گی لیکن اردو اور فارسی میں کئی صدیوں کا جینیس اس پر صرف ہو گیا ہے۔ لہٰذا غزلیہ شاعری نہ صرف یہ کہ بڑی شاعری بن گئی ہے بلکہ اس کا موازنہ دنیا کی دوسری اصناف کی اعلیٰ ترین شاعری سے کیا جا سکتا ہے۔ محمود ہاشمی اپنے مذکورہ بالا مضمون میں یوں کہتے تو ہیں کہ ــــ "افسانے کے معاملے میں میں تنگ نظری کا شکار نہیں ہوں" لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اور فاروقی دونوں افسانے کے سلسلے میں ایک طرح کی تنگ نظری اور تعصب کے شکار ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دونوں شاعری کی تنقید لکھتے اور خود بھی شاعری کرتے ہیں۔ فاروقی جرأت مند ہونے کی بنا پر اپنے نام سے اور ہاشمی ناہید ثانی بن کر۔ دونوں کو نئی بات کہنے کا شوق ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر نئی بات صحیح بھی ہو۔ پھر بھی یہ لوگ نئی بات کے شوق میں غلط باتیں بھی دھڑلے سے کہتے ہیں۔ سب سے آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے افسانے کا مطالعہ اس تسلسل اور انہماک کے ساتھ نہیں کیا ہے جس طرح کہ شاعری کا ــــ لہٰذا افسانے اور ناول کے بارے میں ان کی آرا بھی زیادہ تر بے وزن اور گمراہ کن ہوتی ہیں۔

★

ڈاکٹر [illegible] عباس [illegible]

کلچر اور زبان

سرزمین ہندوستان ایک ایسی دنیا ہے کہ جس میں آنے والے کون تھے اور یہاں کے اصل باشندے کون تھے — یہ ایک دلچسپ بحث کا موضوع ہے مگر جب ہم ہندوستان پر ایک خطۂ ارضی کی حیثیت سے توجہ دیتے ہیں تو بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ جہاں تک ہماری فکری پرواز ساتھ دیتی ہے، یہاں آنے والوں کا ہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ یہاں سے جانے والوں کا نہیں۔ اس طرح بہت ممکن ہے یہاں کے اصل باشندوں میں دراوڑ لوگ کبھی نہ ہوں؟

اسی کش مکش میں جب ہم علم الالسان کے ذرائع ابلاغ کا سہارا لیتے ہوئے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر دنیا میں کسی قدیم ترین انسانی برادری کے وجود کا امکان پیدا ہوگا تو وہ ہندوستان یا ایشیا کے مشرقی علاقوں ہی میں ہوگا یعنی یہ بات امکانی ہے کہ مشرق کا [illegible] انسان کی جسمانی، ذہنی اور سماجی یا ثقافتی سرگرمیوں کے لئے اہم ترین خط تصور کیا جاسکتا ہے بظاہر یہ بات اس لئے بھی قرین قیاس لگتی ہے کیونکہ اس پورے بڑے علاقہ میں آباد ہونے کی تمام [illegible] قدرت نے ایک طویل مدت سے یہاں کچھ اس طرح مہیا کر رکھی ہیں کہ انسان اپنی جودت فکر کی [illegible] کے لئے جتنی بھی کدوکاوش کرنا چاہئے کرے اور جب چاہے اپنی آنکھیں بند کرکے مکمل طور پر وہ دنیا [illegible] سے بے خبر ہوکر میٹھی نیند سوئے۔

[illegible] تفصیل میں جانے کے بجائے اگر ہم ہندوستانیوں کو صرف دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے جائزہ لینے کی کوشش کریں اور اس تقسیم میں دیگر لسانی و نیز قبائلی تفریق کی آمیزش میں

...اور کوشش کریں تو بہتر ہوگا... گروہ ہم آریائی اور ماقبل آریائی سماج سے متعلق تصور کر سکتے ہیں
...آریائی کون لوگ تھے... اس مسئلہ پر تقریباً دنیا کے تمام محققین اپنے طور پر نظریات پیش کرتے رہے ہیں۔
...اس موضوع پر نیز اس کی وضاحت میں ضمنی طور پر اتنی اطلاعات ملتی رہی ہیں کہ جتنی شاید کسی دوسرے
...گروہ کے لئے میسر نہیں مگر ماقبل آریائی گروہ کے ذیل میں وہ تمام تحریکات شامل ہو جاتی ہیں جو آریائی
...لوگوں سے قبل کے ہندوستان میں موجود رہی ہوں گی۔

ہندوستان میں آنے والے بیشتر مغرب ہی سے داخل ہوئے اس لئے ہمارے خطۂ ارض
میں ثقافتی و نیز لسانی ہیئتوں کو پہچاننے اور ان کے تدریجی عمل کو سمجھنے کے لئے ہمیں خاص طور پر
مغربی ہندوستان پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا چاہئے تاکہ ان پریشان کن اور الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے
کے لئے مناسب جواز مل سکیں۔

آریاؤں کی آمد سے پہلے کے آبادیاتی نظام میں جو لوگ پیش پیش نظر آتے ہیں وہ وادیٔ سندھ
کی تہذیب سے پہچانے جاتے ہیں گویا جو فرہنگ وادیٔ سندھ یا اس کی ہم زمانہ ہمارے ملک میں
موجود تھی وہ آریائی فرہنگ سے متقدم رکھتی ہے۔ آریائی فرہنگ ہمارے لئے دلفریب اور پائیدار
یقیناً ہے مگر محققین کی خوشہ چیں سے جو دھندلے نقوش ہمارے سامنے آتے ہیں ان سے یہ قیاس
کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی فرہنگ و تمدن کے عروج کا دور کوئی آٹھ ہزار سال قبل رہا ہوگا مگر افتاد
زمانہ اور قدرت کے ستم نے اس دور کی نشانیوں کو ہمارے درمیان روشن نہیں ہونے دیا۔ ہمارے
مدنی شعور کی مثال کوئی پانچ ہزار سال قبل کی میسر ہے۔ ہمارا گمان ہے کہ جب وہ معاشرہ زوال پذیر
ہوا اور آریاؤں کی بربریت کا شکار ہوا ہمیں اس وقت سے اپنے فکر و علم کی صلاحیتوں کا علم ہوتا
ہے۔ ہمارا وہ معاشرہ آریاؤں کے زیر اثر تو آگیا مگر اپنی تہذیبی صلاحیت اور فنکاری لیاقت کی بنا پر
آج بھی دنیا کے ممتاز تہذیبی درجہ سے کسی طرح کم نظر نہیں آتا۔ موہن جودارو کے آثار سے ہمیں واضح
طور پر اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آبادیاتی نظام اور اس کے زمانہ کے تمام معاشرہ جن میں گجرات
وغیرہ اور شمال میں ٹیکسلا کے علاوہ شملہ کے آس پاس آثار قدیمہ سے حاصل کردہ اطلاعات، باوجود
یکہ ابھی باقاعدہ کسی سائنسی نظام کے تحت ثبوت کے طور پر پیش نہیں کی جاسکیں۔ مگر پھر بھی
آئندہ جب بھی ہم ہندوستانی ترقی یافتہ فکر و فن کو اپنے اساطیری علوم کے سہارے سے پہچاننے
کی کوشش میں کامیاب ہو سکیں گے ہم کو بہت ہی دلچسپ اور معنی خیز نتائج کا علم ہوگا جو دنیا کے دیگر
ترقی یافتہ و غیر ترقی یافتہ ذریعہ علوم یعنی European System of education & learning میں
ایک نئے موڑ کی کرن نظر آئے گی۔

اپنی اطلاعات کی محدود روشنی میں ہم یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں جو
قومیں آکر باہر سے آباد ہوئیں وہ شمال مغرب اور شمال مغربی علاقوں میں آباد ہوئیں اس کے علاوہ ماقبل

آریائی دور جب مغربی علاقوں سے دریائی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ہندوستانی تاجر مغربی ایشیائی ساحلوں سے اور وہاں کے لوگ ہندوستانی ساحلوں پر جنوب مغربی علاقوں تک آتے رہتے ہوں گے۔ آریائی دور میں جب ماقبل آریائی ادراک و لطافت مگر آریائی اساطیر یعنی [illegible] مادیت و جمود کا شکار ہو گئی اور شمال، مغرب و شمال میں اپنی طاقت کے جاہ و جلال سے وحدت پسندی کی بنا پر جنوبی علاقوں میں اپنے روحانی جوہر کو منوانے کے لئے برسر پیکار ہوئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ترقی یافتہ بستیاں موجود تھیں جنہوں نے جنوبی ہند کے حکمرانوں یا مغربی ایشیائی [illegible] کو آریائی عقائد سے بچا رکھنے کے لئے مذہبی جنگوں میں ساتھ دیا تھا۔ اس واقعہ سے یہ [illegible] ہے کہ [illegible] تجارت کا سلسلہ آریاؤں کی آمد سے پہلے بھی موجود رہا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ ماقبل آریائی تہذیب کے ہندوستانی عناصر عرب اقوام سے باقاعدہ ارتباط رکھتے ہوں۔ ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں بھی ہمیں چینی یا دوسری مشرقی ایشیائی اقوام کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستانی خطۂ ارض پر آریائی اثرات سے پہلے کا ترقی یافتہ دور اپنے عروج و زوال کی داستان اپنی زبان سے پیش کرنے کی صلاحیت بظاہر پیدا نہیں کر سکا۔ غالباً کچھ اس وجہ سے کہ وہ اپنی میراث کو ایکدم مٹ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، دوسرے اس لئے بھی کہ میراث کو اپنے بعد تک واقف کرانے کے جو ذرائع ان کے پاس تھے وہ ہم تک واضح اور صاف طور پر نہیں پہنچ سکے۔ پھر بھی کھدائی اور آثار قدیمہ کے وسیلوں سے استنباط کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ لوگ (ماقبل آریائی) بہت ترقی یافتہ تھے۔ دوسرے یہ کہ ثانوی ذرائع سے ہم کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج دنیا کی قدیم زبانوں میں ان لوگوں کے الفاظ کا سرایت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ اپنے علم کو دوسروں تک کچھ اس طرح پہنچا سکے تھے کہ ان قدیم زبانوں میں یہ الفاظ اساطیری شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ہماری آریائی زبان سنسکرت میں سیاروں وغیرہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں جبکہ بابلی (Babyloinom) زبان میں وہ خداؤں کے نام ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کیسے یہ الفاظ سیاروں اور مادی چیزوں سے منتقل ہوتے ہوئے روحانیت کے علمبردار ہو گئے۔

ہمارے سامنے جب ہندوستانی فرہنگ یا کلچر کے قدیم ترین نمونے موہن جو داڑو اور ہڑپا کی کھدائی سے منکشف ہوئے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان آج سے پانچ یا ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے مدنی شعور و نیز ایک مکمل نظام حیات رکھتا تھا جس میں ذات پات کا مفہوم اور چھوٹے بڑے کی درجاتی معنویت نام کو بھی نہیں تھی۔ یہاں لوگ اپنے کاموں کو انجام دینے کے لئے تخصیص ضرور حاصل کرتے تھے مگر کام کرنے والا ایک ذی حیثیت شہری تھا، نہ کوئی کام اچھا تھا اور نہ برا۔ کاموں کو انجام دینے سے درجات کا تعین نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے اپنے کاموں میں تخصیص حاصل کرنے والے سب ہی لوگ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شادی بیاہ میں ذات پات اور پیشے

حیثیت سے لوگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خدا کا وجود۔ ایک الہیاتی اور مافوق البشر کا تصور تھا مگر زندگی کے عام حالات میں ان کا عمل دخل نہیں تھا البتہ ماں کی اہمیت کا تصور ہمیں ضرور محسوس ہوتا ہے جو ممکن ہے خاندان کی مرکزیت کی بنا رہا ہو جیسے بہت سے لوگ اپنے بزرگوں کی یاد کو باقی رکھنے اور ان کے صفات بار بار یاد کرنے کی غرض سے اپنے گھروں میں ان کے فوٹو لگاتے ہیں جو بھگوان کی حیثیت نہ رکھتے ہوئے بھی ایک عزت و احترام کے ساتھ ساتھ عام تصویروں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسے فوٹو صرف زیبائش کے لئے نہیں ہوتے بلکہ اپنے کردار میں ایک مرکزیت کو باقی رکھنے کے لئے لٹکائے جاتے ہیں تاکہ ذہن ان کے روشوں کی طرف بار بار متوجہ ہوتا رہے۔

ہڑپہ ممکن ہے موہن جوداڑو کے مقابلہ میں معاشی اعتبار سے کمزور رہا ہو۔ یا پھر وہ ایک ایسی آبادی ہو جس کو موہن جوداڑو کے مقابلے میں قدرتی یا جغرافیائی سہولتیں کم رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہڑپہ والوں کو سمندری راہوں کے بجائے صرف خشکی پر ہی اکتفا کرنا پڑتی ہو جس کے سبب ان کی تجارتی زندگی اور بیرونی اقوام یا ممالک سے میل جول میں کمی کی بنا پر ترقی کی راہیں مقابلتاً محدود رہی ہوں اس لئے ان کی زندگی میں وہ معیاری صورت پیدا نہ ہوسکی ہو جو موہن جوداڑو کے لوگوں نے محسوس کرلی تھی۔ ان دونوں شہروں کے حالات میں تہذیبی یکسانیت ہونے کے باوجود معاشی حالات کا فرق محسوس کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں شہری نظم وضبط کا عمل موجود تھا اور ملک چھوٹے چھوٹے معاشروں میں بٹا ہوا تھا۔ چونکہ ہر فرد انسانیت کے اصول "جیو اور جینے دو" پر گامزن ہوکے ایک دوسرے کا راستہ بنانے پر یقین رکھتا تھا اس لئے شہروں میں ایک دوسرے پر تسلط حاصل کرنے کے بجائے بھائی چارہ اور مدد کرنے کے جذبہ میں سرشار تھا۔

ہمارے سماجیاتی محققین جب بھی کسی انجان جگہ کو دیکھتے ہیں جس میں ہمارے مندروں کی طرح کی خصوصیات ملتی ہیں تو اس کو فوراً پوجا سے جوڑ کر اس میں بھگوان کے درشن کرنے لگتے ہیں جبکہ بہت ممکن ہے اس معاشرہ میں بھگوان ابھی پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ ہوسکتا ہے وہ مفکرین و علما کی فلسفیانہ موشگافیوں کی نشست گاہیں رہی ہوں جہاں لوگ کسی ایک برنامہ کے تحت ملتے ہوں اور علمی مباحث میں وقت صرف کرتے ہوں جس سے ہمارے محققیں کی پیش کردہ پوری کی پوری تصویر ہی دوسری طرح منعکس ہوجاتی ہے۔ اس لئے محققین کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی اطلاعات میں اپنے اندازوں کو بہت ہی محتاط طور پر پیش کریں اور آہستہ آہستہ جب ایسی باتوں پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالی جائے تو تمام قرائن و علل پر غور کرتے ہوئے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

مندرجہ بالا سطور میں موہن جوداڑو اور ہڑپہ کا موازنہ کرتے ہوئے جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے ہڑپہ معاشی حیثیت سے کچھ کمزور رہا ہو اس لئے کہ اصل مٹی کی بنی ہوئی

تھی اور وہاں کی دریافت شدہ چیزوں اور موہن جوداڑو کی دریافت شدہ اسباب زندگی میں معاشی فرق کا شبہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کا بھی امکان ہے کہ یہ مفروضات کسی دوسرے شواہد کی بنا پر قابل توجہ نہ ہوں اس لئے اپنے مقدور بھر محققین کو قطعی فیصلے کرنے سے پہلے تمام ممکن اندازوں پر گہری نظر رکھنا چاہیئے تاکہ ہم دوسروں کو گمراہی میں مبتلا نہ کریں۔

آریاؤں کی آمد سے پہلے کا ہندوستان وادی سندھ سے لے کر مشرق وسطیٰ تک کی فرہنگ ہائے رنگا رنگ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہوئے زندگی کے اس عمل میں گامزن تھیں جہاں ابھی تک ایک دوسرے پر اپنی طاقت منکے استعمال کا عمل نہیں تھا (باوجودیکہ مشرق وسطیٰ میں یہ طاقت کا عمل شروع ہو چکا تھا جس کی مثال بابل و نینوا و ماد رحقامنشی وغیرہ سے ملتی ہیں) بلکہ اپنی فکری صلاحیتوں کا بامعنی اور مثبت اثر و نفوذ تھا جو زندگی میں خوشحالی اور اطمینان بخش تھا مگر کوئی چوتھی ہزارویں صدی قبل مسیح سے مشرق وسطیٰ میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوا۔ بابل و نینوا کی تہذیبیں مٹنے لگیں۔ مصر تباہ ہونے لگا، شام کا علاقہ ہریالی سے بربادی میں منتقل ہوگیا۔ مگر ہندوستان میں سندھ کی فرہنگ ابھی بھی اپنے تیکھے پن کے ساتھ آرام وچین سے قائم تھی۔ ایک علاقہ کے اثرات دوسرے علاقہ پر آج کل کی طرح تبدیلیاں نہیں لاتے تھے اسی لئے شاید وادی سندھ اس عارضی خوشحالی کے راز سے واقف نہ تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ آریائی طوفان بار بار اپنے مرکز سے اٹھتا رہا ہوگا۔ مگر جیسے جیسے وہ اپنی کلیدی محور سے نکل کر خوشحالی کے مراکز تک پہنچتا رہا ہوگا وہ اپنے بربری مزاج کو آبادیاتی نظام کی صلاحیتوں کی طرف میں غرق کرتا گیا ہوگا اور پھر وہی بربری قوم آبادیاتی نظام کے نشے میں سرشار ہوکر نامور شہریوں کی صلاحیتوں کے علمبردار بنتے گئے ہوں گے ہندوستان میں بھی یہی عمل کارفرما ہوا۔ وہی لوگ جو ایران میں اوستا، ژند، پاژند و دیگر عالی پیغاموں کے پیغمبر بنے اسی طرح ہندوستان میں جب وہ داخل ہوئے جو ایک عظیم تہذیب و تمدن کا مسکن تھا ان کی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ تاریخی ادوار میں جس طرح منگولوں کی تباہ کاریاں دنیا کی بساط سے فراموش نہیں کی جاسکتی اسی طرح وادی سندھ نے بھی شاید اس سے پہلے کبھی اس طرح کی کایا پلٹ کا تصور نہ کیا ہوگا۔ موہن جوداڑو کے کھنڈرات سے کچھ محققین نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے وہاں کسی وبا یا آسیبی مصیبت نے آبادیوں کو ایکدم ختم کردیا ہو۔ مگر دیگر اسباب اس سے انکار کرتے ہیں۔ بربریت میں بڑی طاقت ہوتی ہے وہ اپنے تسلط کے لئے صرف تباہی ہی کو ایک راستہ سمجھتی ہے اور فکر و فہم اپنے عروج میں ہی زوال کے اسباب رکھتی ہے۔ طاقت کا جادو فکر و فہم سے نبرد آزما ہوکر اپنے قالب میں فکر و فہم کو سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو طاقت کا جارحانہ عمل وقت کے مرہم سے مندمل ہوجاتا ہے اور بربریت شرافت و نجابت کے جامہ میں نظر آنے لگتی ہے۔

ایسا ہی ایک عمل ہندوستانی معاشرہ میں بھی انجام پایا جب وادی سندھ کے لوگوں کی اصل بھی شک و شبہ میں پڑگئی اور یہ کہنا مشکل ہوگیا کہ اس تہذیب کے علمدار کون تھے اور انھیں

رفتارِ زمانہ نے کہاں چھپا دیا۔ ممکن ہے آنے والا زمانہ اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر فی الحال یہ عقدہ لاینحل اسی طرح اندازوں پر چلتا رہے گا۔

میرا یہ اندازہ ہے کہ ہندوستانی فرہنگ و معاشرت جس پر ہم جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ اپنے عملی دور سے گذر کر قنوطیت کا شکار ہو گئی اور ایک بہت ہی بے معنی تعداد دا اپنے علم و فضل میں یکتا بے روزگار تھی، آریاؤں کے وجود سے یاس کا شکار ہوتے ہوئے آریاؤں کی حاشیہ نشینی میں منہمک ہو گئی۔ ان لوگوں نے آریائی بولی کو علمی زبان بنانے اور اپنے فکر و علم کے خزانوں کو اپنے حقیقی آقاؤں کی استعداد فکر کے مطابق پیش کرنے کی کوشش شروع کی جا سکے نتیجے میں بولی کی ترسیل کی اکائیاں جو ابھی اپنی کم مائگی کے سبب ابواب علوم میں افہام و تفہیم سے قاصر تھیں اس لئے ان عالم خدمت گاروں نے اپنی علمی زبان کے الفاظ کو آقاؤں کی بولی میں پیوست کرتے ہوئے ایک نئی مگر پرمغز زبان کو جنم دیا۔ یہ زبان تھی جو بولی کی حیثیت میں آریائی تھی مگر معیاری زبان کی حیثیت سے یہاں کی علمی زبان سے بے پناہ مستفید ہوئی تھی۔ اسی طرح کے عمل تمام دنیا میں انجام پائے تھے جس کی بنا پر ہمیں ہند آریائی اور ہند ایرانی زبانوں کی گروہ بندی کی ضرورت پڑی تاکہ انڈو یورپین گروہ میں ایک سلسلہ باقی رکھتے ہوئے بھی ان کے علیحدہ علیحدہ اثرات کا تفصیلی جائزہ مقامی یا ملکی حالات میں کرنے سے قاصر رہ جائیں ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کی لسانی کیفیت کا باقاعدہ ایک جائزہ لیں۔ اور پھر ان الفاظ کو جو ہماری زبانوں میں آج سے بہت سال پہلے عام تھے ان کو دوسری آریائی و نیز سامی زبانوں میں تلاش کریں اس طرح ہمیں یقین ہے کہ ہم کسی بامعنی اور نفع بخش نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ بھی جائزہ لینا پڑے گا کہ وہ علوم اور شیاتی جس کو آریائی نظام سے پہلے کے لوگ اپنے انتخاب کردہ درک و علم سے حاصل کر چکے تھے آریاؤں کے لئے اساطیری شکل میں پیش کرنے کے لئے مجبور تھے تاکہ ماقبل آریائی علم و فضل جو ذہنی علم قوم کے لئے معنی خیز تھا وہ بھی ایسی پسپت یا عدم ثقافتی ماحول کے لئے اس کا سمجھنا اور قبول کرنا ہی ناممکن تھا یہی امکان ہے کہ ابتدائی دور میں ہندوستانی معلومات کا جو ذخیرہ ہم کو وید میں ملتا ہے اس سے پہلے ابھی تک کسی منظم و مرتب کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں آیا۔

★

مسرور آلدوی

بچے

آج میں آپ کا تعارف ڈکٹیٹروں کے ڈکٹیٹر سے کرانے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مورخوں نے ہٹلر، مسولینی، فرانکو، چارلس اول اور زار کی ماورائیت اور تشدد کے واقعات کو خوب خوب نمک مرچ لگاکر آپ کو سنائے۔ تیمور و چنگیز کو ہمارے عظیم شاعر اقبال نے "اللہ کے نشتر" جیسے بے مثل خطاب سے نواز دیا۔ مگر آج جس عظیم ہستی، جس بے مثال ڈکٹیٹر کے متعلق آپ سے محو گفتگو ہوں، اسے قلمبند کرنے میں تاریخ کے اوراق بھی خوف کھاتے ہیں۔ اس بے مثال ہستی کی ہیبت سے مورخ کا خوں ریز قلم کانپنے لگتا ہے۔ اس کی ہیبت چھا ہی جاتی ہے۔ اس ہستی بے مثال کے سامنے دبدبۂ نادری اور شوکت تیموری بھی کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔

اس کے پاس مال و دولت تاج و تخت نہیں ہے مگر طبیعت غزنوی پائی ہے۔ اس کے پاس چنگیز کی خوں آشام تلوار بھی نہیں۔ مگر اس کی ادا میں چنگیزیت کو شرماتی ہوئی۔ پل میں تولا پل میں ماشہ۔ اگر جنگ کے لئے آمادہ ہوتی ہے ہستی تو شیر [illegible] تاب سے بڑھ کر اور اگر [illegible] دھیان آیا تو معصوم غزال ہو گئی۔

چنگیز کی چنگیزیت، نیپولین کی [illegible]، بابر کی شجاعت، ہٹلر کی شرارت، اور سقراط کا تجسس — ان ساری خاصیتوں کی [illegible] ایک یہ ہستی ہے۔

[illegible] سکتی ہے۔ [illegible] اژدہے کو اپنے دانتوں سے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کچل سکتی ہے۔ شیر [illegible] اور [illegible] کے سینے پر کھیلتا ہو۔ اس کی لغت بھی عمیق اور اس کی محبت بھی عمیق، بات میں سادہ [illegible] آزاد [illegible] سادہ ہیں [illegible] اس کی نظر حکیمانہ مگر [illegible]

انجمن میں بھی جیسے خلوت میسّر نہیں مگر شمع محفل کی طرح سب سے جدا۔ سب سے بے نیاز، لیکن سبھی اس کے مداح اور جاں نثار، اس کی ناقابل تسخیر سلطنت کا میں ایک محکوم و مجبور فرد ہوں۔ اس کی ملوکیت میں قدم قدم پر عجائب شعبدوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اس کی سلطنت میں نہ تخت و تاج ہے اور نہ ہی لشکر و سپاہ۔ مگر پھر بھی وہ میروں کا میر اور شاہوں کا شاہ ہے۔

مگر قابل حیرت یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں جس قدر بھی تاناشاہ ہوئے۔ انہوں نے اگر ذرا سا بھی ناک بھوں چڑھائی اور ظلم و ستم کی راہ اپنائی تو عوام اور مورخوں کے شکار بنے۔

عوام نے ان کے خلاف لاٹھی سنبھالی تو مورخوں نے قلم۔ مگر میں نے جس عظیم اور بے مثال تاناشاہ کا تعارف آپ سے کرایا ہے اس کی ہستی اس قدر بارعب اور عجیب و غریب ہے۔ بلکہ اس کی کرامت کہیے کہ اس کے غصے پر پیار آتا ہے۔ ادبا اور شعرا اس کی تعریف میں قصیدے لکھتے ہیں۔ ماہر نفسیات ان کے حرکات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ ایک انگریز شاعر نے تو اسے انسانوں کے والد محترم کے خطاب سے ہی نواز دیا —— امید ہے کہ اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے کس عظیم ڈکٹیٹر کا تعارف آپ سے کرایا ہے۔ اب زیادہ آپ کو کشمکش و پیچ میں کیوں رکھوں —— یہ خاکہ تھا، یہ تصویر تھی میری پیاری بچی لبنیٰ مسرور کی۔ اور شاید دنیا کے سبھی بچے کی۔ کیونکہ بچے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کوئی رنگ کوئی نسل نہیں ہوتی۔ ان کی زبان ایک اور شہرت عالمی ہوتی ہے۔

اب ہماری بیٹی لبنیٰ کو ہی لیجئے۔ ابھی ابھی ۹؍ جون ۸۴ء کو آپ چھ ماہ کی ہوئی ہیں۔ مگر ذرا غصّہ تو ملاحظہ فرمایئے۔

میں ان کی تعریف میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں مگر اُدھر ان کا حسین و ذہین ستم مجھ پر مسلسل جاری ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدھی رات گذر چکی ہے۔ نیند کا جارحانہ حملہ ہم لوگوں پر ہو رہا ہے اور ادھر لبنیٰ کا غصّہ آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ بچے کا "حکم" فرمان موسوی کا درجہ رکھتا ہے۔ سوالیہ اور نیند سے بوجھل آنکھوں سے رحم کی اپیل کرتا ہوں۔ لیکن بھلا ڈکٹیٹر کو کبھی ان اپیلوں پر رحم آیا ہے۔ وہ جب غصے میں آتا ہے تو لیگ آف نیشنز (League of Nations) اور ورسائی امن کانفرنس کے ساری شرائط اور مقاصد کو طاق پر رکھ دیتا ہے۔ اور وہی کرتا ہے جو اس کا دل کرتا ہے۔ اور بچے تو ڈکٹیٹروں کے ڈکٹیٹر ہوتے ہیں

بچے کے غصہ کو ٹھنڈا کرنا بہت دشوار عمل ہے۔ غصے میں جب بچے مچل جاتے ہیں تو انہیں قابو میں کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ بچے کی انتہائی ضد کے آگے ہمارے تمام حربے بیکار ہو جاتے ہیں۔

بچے اور بوڑھے کی ذہنیت ایک ہوتی ہے۔ مگر بچے کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کا سابقہ ماضی سے پڑتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پرانی اشیاء اور قدیم چہروں کو حیران حیران

سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کے کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہوا وہ خود بھی بوڑھوں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور تب اس کا پیچھا ماضی سے چھوٹتا ہے۔ اب وہ اپنے اردگرد نئے نئے چہروں، نئی نئی ایجادوں، نئی نئی تہذیب و ثقافت کو دیکھتا ہے اور ہجو نگار بن جاتا ہے۔

بچہ سراپا حیرت ہوتا ہے اور بوڑھا سوالیہ نشان (؟) بچہ نظیر اکبرآبادی کی نظم ہوتا ہے اور بوڑھا مرزا محمد رفیع سودا صاحب کی ہجو۔ بچہ گیلی لکڑی ہوتا ہے اور بوڑھا شیشم کی سخت لکڑی، بچہ "نپولین کا عروج" ہوتا ہے تو بوڑھا واٹرلو۔

بچہ کسی کتاب کا حسین و جمیل سرورق ہوتا ہے۔ ایسا حسین سرورق کہ کتاب دیکھتے ہی پیار آ جائے اور پڑھنے پر آپ خواہ مخواہ مجبور ہو جائیں۔ بوڑھا کتاب کا صفحہ آخر ہوتا ہے۔ اگر کتاب معیاری اور اچھی رہی تو اس کے خاتمہ پر منہ سے تعریف نکلتی ہے ورنہ لوگ منہ بنا لیتے ہیں۔ نقاد شمشیر بکف ہو جاتا ہے۔ یہی حال بچے کے ساتھ ہے۔ جب وہ عہد طفلی سے عہد شباب کے نشیب فراز سے گذرتا ہوا ضعیفی کی منزل میں قدم رکھتا ہے، اس مدت تک اگر اس میں اچھی خصوصیات رہیں تو تعریفیں ہوتی ہیں نہیں تو بری کتابوں کا سا حال ہو جاتا ہے۔

بچے کی زبان "جدید ادب" کی طرح ہے دونوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ مگر بچے ذرا عقلمند واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنی زبان کی اشاعت سے پرہیز کرتے ہیں۔

بچہ وہ نپولین ہے جس کے لئے کوئی واٹرلو نہیں۔ وہ ناقابل تسخیر ہوتا ہے۔ اور واقعی بچوں جیسی آہنی ہستی کو کوئی شکست بھی کیوں کر دے سکتا ہے جو آگ سے کھیل سکتا ہو، جس کے سامنے اژدہا و شیر نر بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ مجاہد غازی اور خدا کا پراسرار بندہ ہوتا ہے۔

لیکن دودھ کی شیشی ایک ایسا ہتھیار ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس ناقابل تسخیر ہستی کو بہ آسانی قابو میں کر لیا جاتا ہے۔ دودھ کی شیشی کو دیکھتے ہی اس کی ساری چنگیزیت اور ہٹلریت کافور ہو جاتی ہے۔

بچے کا ذہن سادہ کاغذ ہوتا ہے اور بوڑھے کا ذہن بھری ہوئی ڈائری۔ بچے اور بوڑھے دونوں بستر پر قیلولہ فرمانے کے عادی ہوتے ہیں۔ دونوں ضد کرتے ہیں۔ فرمائشیں کرتے ہیں، چیختے ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں، غصہ کرتے ہیں۔ ایک کی نظر دودھ کی شیشی پر ہوتی ہے تو دوسرے کی چائے کی کیتلی اور پان کی گلوریوں پر۔ دونوں کی فرمائشیں پوری کر دیجئے پھر چشم زدن میں پن ڈراپ سائیلنس۔ دونوں میں ایک امتیازی فرق یہ ہوتا ہے کہ بچہ بستر سے فرار چاہتا ہے اور بوڑھا بستر کا مداح ہوتا ہے۔ وہ بستر نشین ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی ساری کائنات بستر کے گرد ہی رقص کناں رہتی ہے۔

بچے "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کر سکتی" کے قائل ہوتے ہیں۔ اب ذرا میری بے بسی دیکھئے۔ میں اپنے بیڈ پر مضمون لکھنے بیٹھا ہوں، میرے ارد گرد کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ میری بچی کبھی میرے سینہ پر سوار تو کبھی اس کی کتابوں پر لیٹنا۔ اسی درمیان مجھے ایک کتاب کی سخت ضرورت

محسوس ہوئی۔ جو لغت کے میرے ریڈنگ روم میں تھی۔ میں نے اسی درمیان حفاظتی تدبیر کرلی۔ کتابوں کو تکیوں کے نیچے پناہ دی۔ لیٹرپیڈ اور قلم کو بھی اسی طرح پروٹیکشن (Protection) دیا اور تب مسہری کے نیچے اپنا آہنی شخصیت کو سمیٹ کر کتاب لانے چلا گیا۔ تب کتاب لے کر اپنے کمرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تیسری جنگ عظیم شروع ہو چکی ہے۔ ساری پناہ گزیں کتابوں پر جارحانہ حملہ ہو چکا ہے۔ اور ہماری مسہری ہیروشیما اور ناگاساکی کی صورت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ "برطانیہ" بیسوں حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ تو "فرانس" کی تہذیب مٹ چکی ہے۔ مایہ ناز مضمون نگار ہیزلٹ اپنی کتاب کے ساتھ تباہ رہا ہے۔ جیمس جارج فریزر اپنی اولاد بوکے ساتھ تڑپ رہا ہے۔ برٹرنڈرسل مجروح ہو چکا ہے۔ یورپ کے "نشاۃ ثانیہ" کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ارسطو، اپیکیورس، کانٹ، ہیگل، نطشے کے فلسفوں کی مٹی پلید ہو چکی ہے۔ غرض کہ کہاں تک شمار کروں۔ بس یوں سمجھئے کہ پوری دنیا تباہ ہو چکی ہے۔ مسہری پر اوراق کے لاشوں کا ڈھیر لگ چکا ہے۔ شیشے کا خوبصورت یادگار جگ اب زمین پر بے شمار کرچیوں میں تبدیل ہو کر قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ قلم کی نب کند ہو کر ٹوٹ گئی ہے۔ اور تمام کراہتی اور تڑپتی ہوئی کتابوں اور ان کے مظلوم اوراق کی لاشوں پر بیٹھی ہوئی ہماری عظیم فاتح اور تاناشاہ بیٹی یعنی روم کے نیرو کی طرح قہقہہ لگا رہی ہے۔ اور اس وقت بھی "تاریخ ہند" دو حصوں میں تقسیم ہو کر اس کے دونوں ہاتھوں میں بے بس ہو رہی ہے۔ میں نے کمروں کا جائزہ لیا تو سیلنگ فین کی آندھی میں سارے کاغذات اور اخبارات کے بکھرے پورے کمرے میں بکھرے ہوئے ملے۔ مگر ڈکٹیٹروں کے ڈکٹیٹر یعنی بچے کی یہی تو خصوصیت اور ادا ہوتی ہے کہ ان کی اس چنگیزیت اور بربریت کے باوجود بھی ان پر بے اختیار پیار آجاتا ہے۔ قبل اس بات کے کہ ہماری بیگم تولب مسرور صاحبہ اور روزویلٹ سابق صدر امریکہ کی صورت میں ورسائی امن معاہدہ لے کر کمرے میں جلوہ گر ہوں اور ہماری اس عظیم تاناشاہ کا حال بھی جرمنی کے ناخلف کی طرح کر کے اپنا غصہ اتاریں۔ میں نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ سینہ سے لگایا اور خوب خوب پیار کرنے لگا۔ مگر تب تک اس کا ارمیری عینک پر ہو چکا تھا۔ زمین پر جگہ جگہ کرچیوں اور بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا ہوا میں حکیم الامت کا یہ شعر گنگناتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا ؎

آبِ رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

داڑھی، چشمہ، مٹی، چاقو، شمع اور پانی کے بچے جانی دشمن ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی بچے دیوانہ وار لپکتے ہیں۔

بچے اور بوڑھے میں ایک امتیازی فرق چشمہ اور داڑھی کا بھی ہوتا ہے۔ بچے ان دونوں

ــتے بے نیاز رہتے ہیں۔ جبکہ اکثر بوڑھے ان دونوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بچے اطمینان سے سب کے بدن کو بطور ہاتھ روم استعمال کرتے ہیں جبکہ بوڑھے بیچارے اس حسین عمل سے محروم رہتے ہیں۔

سوداؔ اور میرؔ کے یہ اشعار بچے کے رعب و دبدبہ کے شکار صاف معلوم ہوتے ہیں۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ۔۔۔ سودا کے بالیں پر ہوا جو شور قیامت
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے (میرؔ) ۔۔۔ خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے (سوداؔ)

آپ اس شیر خوار بچے کو صرف بشر سے نہ دیکھیں اور اس کے جلیل و جمیل، حرکات و سکنات کا مذاق نہ اڑایئے کیونکہ قدرت نے نسلوں اور قوموں کی تباہی اور ارتقا کی ساری طاقتیں اسی ننھے سے شیر خوار کو بطور تحفہ عطا کی ہیں۔

سادہ کاغذ اور قلم بچے کی اگر نظر پڑ جائے تو کچھ بے ٹیڑھے میڑھے خطوط کھینچے بغیر نہیں مانتے۔ ان ٹیڑھی میڑھی لکیروں کو دیکھ کر اکثر صاحب جلال بزرگوں کو حال قال آجاتا ہے۔ مجھے ایسے جلال بزرگوں پر حیرت ہوتی ہے۔ جو یہ نہیں سمجھتے کہ کل یہی ٹیڑھی میڑھی لکیر اقبالؔ کی نظم، شیکسپیر کا ڈرامہ ابوالکلام آزاد، مہدی آفادی اور فرحت اللہ بیگ کی آب کوثر سے غسل فرمائی تحریر، لیونارڈو ونچی، مائیکل انجلو، رافیل اور پکاسو کا آرٹ، ہیزلٹ کے مضامین، آئنسٹائن کا فارمولہ اور برٹنڈرسل کے فلسفہ میں تبدیل ہو جائیں گی۔

مجھے فرانس کے اس عظیم مفکر روسو پر بھی حیرت ہوتی ہے جس نے آزادی اور مساوات کا پہلی بار نعرہ بلند کیا تھا۔ مگر بچے کو دیکھ کر وہ بوکھلا گیا اور یہ فتویٰ دیا کہ بچے کو آزادانہ طور پر اس کے ذاتی خیالات پر چھوڑ دیا جائے صحیح نہیں ہے۔ بچوں کے ظلم و ستم سے وہ اس قدر خوفزدہ رہا کہ جب فخرالجنس میں شہنشاہ کا ظلم بڑھا تو اس کا قلم یہ معرکتہ الآرا جملہ لکھ گیا۔

"MAN IS BORN FREE, BUT EVERY WHERE HE IS IN CHAINS."

(انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر ہر جگہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے)

قصہ مختصر یہ کہ بچہ سوالات ہوتا ہے وہ ہر نئی بات کے متعلق اس قدر پے در پے سوالات کرتا جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری علمی، اخلاقی اور ثقافتی ترقی بھی تو اسی تجسس کی مرہون منت ہے تو پھر آپ جوان کے سر توڑ بننے پر انگشت بدنداں کیوں ہیں۔ بچے عادات کا بیٹا ہوتا ہے جبکہ بوڑھے اس کے غلام ہوتے ہیں۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا جیسی چنگیزی ادا بچوں کی وہ خصوصیات ہے جس پر جس قدر اوراق سیاہ کئے جائیں کم ہے۔ بچہ وہ آہنی ہستی ہے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ہے۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان ہے بچہ۔ وہ شمشیر سکندر کا طلوع ہے۔ اب چلئے قصہ تمام ہوا اور ہمارا یہ مضمون بھی تمام ہوا۔ کیونکہ ہماری عظیم فاتح نے ہمارے بدن کو بطور باتھ روم استعمال کر لیا اور میرے

(بقیہ صفحہ ۳۸

طاہر نقوی (کراچی)

تنکوں کا موسم

پہلے پہل وہ اس بڑے شہر میں آیا تو کئی روز ایک بڑے چوراہے کی گھاس پر سویا جہاں اس جیسے اور بھی موجود ہوتے۔ ان میں سے کوئی تیل مالش کر رہا ہوتا کوئی چمپی اور کوئی اپنا بدن دبلوا رہا ہوتا۔ اپنے گاؤں سے جو پیسے ساتھ لایا تھا وہ مزدوری تلاش کرتے کرتے اب ختم ہونے کو آرہے تھے۔ حالات کی مجبوری اس پر سوار نہ ہوتی تو اکثر خالی پیٹ ہی اس چوراہے کی گھاس پر جا پڑتا اور تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھ دن چڑھے کھلتی، اس وقت اپنے کو اکیلا پاتا کیونکہ اس کے آس پاس دوسرے سونے والے جا چکے ہوتے

آج بھی جاگنے کے بعد وہ شاخ میں لٹکے ہوئے خشک پتے کی طرح تنہائی محسوس کرنے لگا اور اپنی آنکھیں دونوں ہتھیلیوں سے مل کر کچھ لمحے اپنے سامنے بھاگتے ہوئے ٹریفک کو دیکھتا رہا۔ جس سے اس کا سر چکرانے لگا اور نظریں بھاری ہو کر آنکھوں کے سامنے دائروں کی شکل میں ناچنے لگیں۔ اس اذیت سے بچنے کی خاطر گھاس پر پڑے ہوئے پانی کے پائپ سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے تھوڑا سا پانی پیا تو اسے فرحت محسوس ہوئی اس لئے کچھ دیر وہ گھاس پر بیٹھا رہا۔ اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا۔ آخر کہاں جائے اور کہاں جاکر مزدوری تلاش کرے۔ اپنی زندگی کے تپتے ہوئے میدان میں اسے دور دور کوئی سایہ دار درخت نظر نہ آتا۔ زندگی اس کے پاس سے گذرتی چلی جارہی تھی۔ اور وہ ہاتھ بڑھا کر زندگی کے ان لمحوں کو مٹھی میں پکڑ لینا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کے باوجود اس بھاگتے ہوئے شہر کے ہجوم میں اپنے آپ کو ردی کاغذ کے ایک پرزے کی طرح بالکل غیر اہم سمجھنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا اپنے گاؤں سے چلتے وقت اس کے دل میں طرح طرح کے خوابوں اور امنگوں [illegible] تھے کیونکہ ہر شخص اپنے وجود میں ان گنت تمناؤں کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح اس شہر میں آکر اس نے سوچا کہ یہاں خوب کمائے گا

چند برس کے بعد اپنے بال بچوں میں لدا پھندا جائے گا تو سارے گاؤں کے لوگ اسے بھی رشک بھری نظروں سے دیکھیں گے اور اس کے پاس اپنے اپنے بچوں کو شہر میں کام دلانے کی سفارش کرنے آئیں گے ۔ مگر یہاں آکر اس کے یہ سارے خواب ڈھیر ہو گئے اور اپنی زندگی کے گھپ اندھیروں میں اس کے لئے قدم آگے بڑھانا دشوار ہونے لگا ۔

اسی سوچ میں گم وہ اٹھ کر غیر ارادی طور سے ایک جانب یوں چل دیا گویا اب تک خود اپنے آپ کو تلاش کرتا پھر رہا ہو اور اس تگ و دو میں دوسروں کی بے رحمی کی مضبوط اور اندھیری کوٹھری کے بند دروازے پر گھڑی گھڑی پہنچ جاتا۔ اسی کیفیت میں ایک گلی سے گزرتے ہوئے اسے لکڑی کی ایک ٹال نظر آئی تو اسے تسلی ہوئی۔ تپتی دھوپ میں پیدل چلنے کی وجہ سے اب اس کا حلق خشک ہو چکا تھا اس لئے وہ پانی پینے کے خیال سے ٹال کے پاس پہنچا اور وہاں اپنے ہی لوگوں کو دیکھ کر اپنائیت اور غیر شعوری خوشی محسوس ہوئی۔ وہاں موجود لوگ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آئے تو اس کا دل بڑھا اور ان کے پاس موٹے موٹے بانوں والے پلنگ پر جا بیٹھا۔ شعور اور لاشعور کی گہرائیوں میں جلتے ہوئے انگارے ان کے میٹھے لہجے اور نرم الفاظ سے غیر محسوس طور پر بجھنے لگے۔ انہوں نے خاطر مدارات کے لئے اسے نسوار کی ڈبی پیش کی تو اس نے چٹکی بھر نسوار لے کر ہونٹ سے دبالی۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ لوگ اس کے برابر والے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اس کی مدد کی خاطر ٹال کے مالک نے لکڑیاں چیرنے اور لاد کر گھر گھر پہنچانے پر اسے رکھ لیا۔ اس قربت سے اب اسے یہاں کچھ اطمینان میسّر آیا تو اس نے سکھ کا سانس لیا اور ایسے میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے وسیع سمندر میں بے سہارے کی حالت میں اچانک اسے کوئی کشتی ہاتھ لگ گئی ہو۔ یہاں اُسے اس محنت کے صلے میں دو وقت کی روٹی اور روزانہ معمولی سی اجرت مل جاتی۔ وہ محنت سے جی چرانے والا نہیں تھا کیونکہ وہ ایسی محنت کیا ہی کرتا تھا۔ وہ اپنی پیٹھ پر یا کبھی سائیکل کے پیچھے رکھ کر لکڑیوں کا گٹھا کسی کے گھر پہنچانے جاتا تو اس مکان کو دیکھ کر اس کا جی بھی چاہتا کہ کاش ایسا ہی مکان اس کا بھی ہو مگر ردعمل کے طور پر اس کے دل میں ہُوک سی اٹھ کر رہ جاتی۔ لکڑیاں یا کوئلہ زیادہ تر لوگ خاص موقعوں پر ہی سلگاتے کیونکہ اب ایندھن کے طور پر گیس استعمال ہونے لگی ہے۔ ٹال کا مالک اس کے سامنے کئی بار اپنے اس دکھ کا ذکر کر چکا تھا کہ مٹی کے تیل اور گیس کی وجہ سے اس کی آمدنی میں بہت فرق پڑ گیا ہے اور بیٹھے بیٹھے اس روز کا انتظار کرتا رہتا جب ملک میں ان دونوں چیزوں کا کال پڑ جائے گا۔

ٹال پر کام کرتے کرتے اس کے پاس زیادہ پیسے جمع نہ ہو سکے وہ تین چار ماہ کے بعد ہی کہیں اس قابل ہوتا کہ اپنی بیوی بچوں کے لئے کچھ روپئے بھیج پاتا اور اب تک ٹال سے تھوڑی دور اسی چوراہے کی گھاس پر رات کو جانا پڑتا کیونکہ ٹال کے مالک کے کہنے کے مطابق ٹال میں اب گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہاں پہلے ہی اس کے رشتہ داروں کے علاوہ اس کے بیوی بال بچے ٹال کے ایک کونے میں بنی ہوئی جھونپڑی میں رہائش پذیر تھے۔ چوراہے

گیا

پلیٹ فارم پر سوتے ہوتے اب اسے ویسے بھی کوئی پریشانی نہیں رہی تھی اور اپنے آس پاس سونے والے ساتھیوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی اب گھبراہٹ کے علاوہ اس کی اجنبیت بھی جاتی رہی تھی اپنے ان ساتھیوں کی باتیں سن سن کر شہر کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں ساتھیوں میں سے ایک نے جس سے اس کی دوستی زیادہ تھی اس سے پوچھا کہ یار تم اتنی محنت کب تک کرتے رہو گے تو اس نے کہا کہ میں تو اس محنت کا عادی ہوں حالانکہ یہاں پر محنت کرتے ہوئے وہ کئی بار یہ سوچ چکا تھا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح بوٹ پالش اور جوتے گانٹھنے کا کام لے کر کہیں بیٹھ جائے جو اپنا خود کا کام ہوگا۔ مگر اس کے لئے ضروری سامان خریدنے کے واسطے پیسے اور کوئی ٹھکانا نہ ہونے کی وجہ سے چپ ہو لیتا۔ اس وقت اس کا جواب سن کر اس کا دوست اس کی سادگی پر خوب ہنسا اور کہنے لگا کہ ایسی محنت گاؤں میں ہوتی ہے۔ یہاں شہر میں کہاں ہوتی ہے۔ شہر میں تو بغیر محنت کے روپیہ کمایا جاتا ہے۔ وہ اس بات پر بہت حیران ہوا اس کی حیرانی دیکھ کر اس کے دوست نے اس سے کہا کہ تمہیں کسی ویگن میں کنڈکٹری پر لگوا دوں گا۔ وہ یہ سن کر ذرا سٹپٹایا تو جواب ملا کہ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے وہ بھی محض زبانی یہ بات اس کے پلے بالکل نہ پڑی۔ یہ دیکھ کر اس کے دوست نے سمجھایا کہ مسافروں کو ذرا دھمکا کر چپ کراؤ۔ ویگن میں جتنے آدمی ٹھونس دو گے اتنے ہی کامیاب کنڈکٹر کہلاؤ گے اور مالک اتنا ہی تم سے خوش ہوگا۔ اس کے باوجود اندر سے وہ اپنے آپ کو اس کام کے لئے تیار نہ پاتا لیکن اپنے دوست کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ ڈرتے ڈرتے ویگن کے مالک کے پاس پہنچا تو مالک بھی اتفاق سے اسی کے گاؤں کا رہنے والا نکلا۔ جو اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور اسے اپنی ویگن میں لگا دیا۔ اس کی کئی ویگنیں چلتی تھیں اور خود پولیس کا ملازم تھا۔ ویگن میں کنڈکٹری کا یہ تجربہ اس کے لئے [illegible] انوکھا تھا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا اس کے لئے دلچسپ ہوتا گیا تھا۔ پسند بھی آیا۔ کیونکہ اس میں نہ جسمانی محنت ہوتی اور نہ دماغی، ہلدی لگتی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آتا۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی دیکھا دیکھی مالک کے ہی خرچ پر خوب کھاتا پیتا ساتھ ہی ڈرائیور کے کہنے پر ٹکٹ نہ دے کر اس نے پیسے بنانے بھی شروع کر دیئے جس میں دونوں شریک ہوتے۔ یہ احساس حقیقت بن کر اس کے ذہن میں جگہ بنانے لگا کہ وہ خوب کھا پی کر اگرچہ فربہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور چہرے پر زردی کے بجائے سرخی آتی جا رہی ہے مگر اس کے جسم کی قوت کا حصہ کاہلی اور ہاتھ پاؤں میں پھرتی کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن جب وہ گیٹ پر کھڑے ہو کر آواز لگاتا تو اس وقت اس کے اس احساس کے بجائے بھی اندر سے ابل ابل کر خوشی باہر نکلتی اور اپنے کو بڑی حیثیت کا مالک سمجھتا اور جوش میں آ کر مسافروں کو پکڑ پکڑ کر اندر کرتا اور اترنے والے کے اچھی طرح اترنے سے پہلے ہی ڈبل کر دیتا۔ یوں کوئی مسافر لڑکھڑا کر گرتا کوئی ویگن کے ساتھ ہی گھسٹتا ہوا چلتا اور کسی کے کپڑے کسی چیز میں اٹک کر پھٹ جاتے۔ ایسی صورت میں وہ مسافر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہ جاتا اور اس پر غصیلی نظریں ڈالنے کے سوا کچھ نہ کر پاتا اور وہ جواباً اس پر قہقہہ لگاتا ہوا گزر جاتا۔ [illegible] جگمگاتے شہر کے پر رونق بازاروں کی چکنی سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی

ویگن کے دروازے پر کھڑا ہوا اپنے اندر سے خوشیاں پھوٹتی ہوئی محسوس کرتا اور بازاروں میں بھاگتی ہوئی کاروں، لمبی گاڑیوں کو یوں دیکھتا گویا کچھ دن بعد یہ سب کچھ اسی کا ہو جائے گا۔ لیکن دوسرے لمحے ٹکٹ لیتے وقت مسافروں سے مخاطب ہوتے ہوئے اس کی یہ ساری خوش مزاجی جاتی رہتی اور لہجہ کرخت ہو جاتا، چہرے پر سختی آ جاتی اور وہ ارادی طور پر بدمزاجی کا خول پہن لیتا۔

اب وہ ہر طبقے اور ہر قسم کے شہری کو خوب پہچاننے لگا تھا اور اسے ان سے باتیں کرتے ہوئے پہلی جیسی جھجک قطعی محسوس نہ ہوتی۔ بلکہ وہ ان سے ایسے لہجے میں بات کرتا جیسے انھیں غیر اہم سمجھ رہا ہو اور خود پر تعجب بھی کرتا کہ مسافروں سے بھری ہوئی ویگن کو تنہا کیسے قابو کر لیتا ہے۔ اول تو کسی مسافر میں اسے ٹوکنے کی ہمت نہ ہوتی اور کوئی مسافر اُسے غصے سے دیکھتا یا اس سے اونچی آواز میں بات کرتا تو وہ گرج کر اسے ڈانٹ دیتا وہ مسافر محض گھور کر چپ ہو لیتا۔ ایسے لمحوں میں وہ دل ہی دل میں ان مسافروں کی یہ حالت دیکھ کر خوش ہوتا کہ یہ بابو قسم کے لوگ اوپر سے جیسے نظر آتے ہیں اندر سے ویسے ہی بزدل نظر آتے ہیں اور یہ سوچ کر ان پر حقارت سے نظر ڈالتا۔ دراصل اس کے اندر یہ ہمت کچھ تو اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر اور کچھ اپنے مالک کی حوصلہ افزائی سے آئی جو کہتا کہ پرواہ مت کرو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ ادھیڑ ڈالوں گا۔

وہ اب اپنے آگے پیچھے بھاگتے ہوئے لمحوں کو پکڑنے لگا تھا اور اس کے دن اچھے گزرنے لگے تھے اس کے پاس پیسے بھی خاصے جمع ہونے لگے تھے اور ہر ماہ اچھی خاصی رقم اپنے گاؤں بھیج دیتا جس کے جواب میں اس کے بیوی بچے اسے لکھتے کہ ہمیں بھی شہر بلا لے مگر ابھی کہیں سر چھپانے کی جگہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ خود تو گھاس پر سونے کا اب عادی ہو چکا تھا اور ذاتی طور پر اسے کسی مکان کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن کسی طرح انھیں بلا کر کہیں بسانے کی فکر میں اب مصروف ہو گیا۔ اس کا تذکرہ اپنے ساتھی کنڈکٹروں سے کرتا تو وہ ہنستے ہوئے کہتے کہیں بھی جگہ گھیر کر جھونپڑی ڈال لو وہ یقین نہ کرتا کیونکہ ایسا خود اس کے گاؤں تک میں ممکن نہ تھا اور اس لئے جھجک کر رہ جاتا تو وہ لوگ ہنستے ہوئے کہتے کہ ہم نے بھی اپنی پسند کی جگہ پر جھونپڑیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ کوئی مائی کا لال مٹانے والا نہیں آتا۔ اس شہر میں یہ سب چلتا ہے۔ یہ سن کر اس کی کمر مضبوط ہوئی اور وہ کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ اس دوران اس نے دیکھا کہ پاس والے محلے میں ایک بڑا میدان خالی پڑا ہے۔ بچوں کے کھیلنے کی جگہ سے ہٹ کر اپنے دوستوں کی مدد سے وہ جھونپڑی ڈالنے لگا۔ میدان میں کھیلنے والے چند لڑکوں نے جھونپڑی ڈالنے پر اعتراض کیا۔ اس نے انہیں ذرا سی مصنوعی گھڑکی دی تو وہ دوبارہ نہ آئے۔ وہ ان پر زہریلی ہنسی پھینکتا ہوا اپنی جھونپڑی بنانے میں اسی طرح مصروف رہا۔ اسی روز شام کو کچھ لوگ اس کی جھونپڑی کے پاس آ کر اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی حالانکہ ساتھ ہی دل میں وہ ڈر

کہ یہ تھا۔ پھر ایک دن شام کو وہ کام سے واپس آیا تو دیکھا کہ وہاں دو پولس والے کھڑے ہیں۔ انہیں دیکھ کر محلے والوں کی اس حرکت پر وہ پریشان ہوا اور ان سے سہمے سہمے انداز میں نہایت نرمی سے بات چیت کے دوران جب یہ پتا چلا کہ وہ اُس کے گاؤں کے رہنے والے ہیں تو اس کے لہجے کا سہما پن جاتا رہا اور یہ معاملہ پس پشت ڈال کر پولس والے اس کے ساتھ بیٹھے نسوار لگاتے رہے مگر اس کی جھونپڑی کے بارے میں کوئی بات نہ کی بلکہ جاتے وقت یہ کہہ گئے کہ کوئی کام ہو تو بتانا۔ اس بات سے اس کی ہمت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ محلے والے اس پر غصیلی نظریں ڈالتے ہوئے گزرتے اور بچوں کی نظروں میں بھی نفرت ہوتی یہ بھاری لمحے سماجی حقیقت بن کر اس کے ذہن پر ہر وقت چوٹیں مارتے رہتے۔ پھر ایک روز انہیں پولس والوں نے اسے بتایا کہ ان کا تبادلہ کسی دوسرے تھانے میں ہو گیا ہے اور محلے کے لوگ تھانے دار کے پاس شکایت کرنے آئے تھے اور یہی ہوا کہ اس کی جھونپڑی کے بکھرے ہوئے بانسوں، چٹائیوں اور سرکنڈوں کو سمیٹ کر ایک جگہ کیا اور حفاظت کے لئے اس پر اپنا پلنگ رکھ کر لیٹ گیا۔ لیکن کسی صورت یک سوئی نہ ملی۔ مایوسی اس کے اعصاب پر تہہ بہ تہہ جمنے لگی۔ اس کے اعضاء اتھل پتھل ہونے لگے اور اس جوار بھاٹے سے اسے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور وہ شیشے کی کرچیوں کی طرح بکھر گیا۔ اپنے بچوں کو بلانے کا ارادہ اب دلدل میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ اب اس عرصے میں اس شہر کے مزاج، ماحول اور یہاں کے لوگوں کی فطرت سے اچھی طرح آشنا ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود اس پورے معاملے پر رات بھر سوچتے سوچتے وہ پریشان ہوتا رہا۔

منہ اندھیرے وہ ایک نئے جذبے اور ایک نئے خیال سے اپنے موٹے بالوں والے پلنگ سے اٹھا اس نے قریب ہی چھوٹے چھوٹے پتھر لائن میں رکھ رکھ کر کچھ جگہ گھیری اور ایک گتے کے ٹکڑے پر "نماز پڑھنے کی جگہ" کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھ کر اسے ایک لمبی سی لکڑی میں اٹکا کر زمین میں گاڑ دیا اور اذان کے بعد خود تنہا نماز پڑھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی دیکھا دیکھی ادھر ادھر کے دو تین قسم کے لوگ آکر وہاں نماز پڑھنے لگے۔ وہ اس روز خوشی خوشی اپنے کام پر چلا گیا مگر دن بھر کام کرتے رہنے کے باوجود اس کے ذہن میں یہی خیال رچا بسا رہا اور اسی لئے روزانہ سے جلدی واپس آتے ہوئے مغرب کا وقت ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ دو ایک لوگ پہلے ہی سے وہاں نماز پڑھ رہے تھے۔ وضو کر کے وہ بھی ان نماز پڑھنے والوں میں شامل ہو گیا۔ پھر محلے کے اکا دکا لوگ بھی اس جگہ نماز پڑھنے آنے لگے یہ دیکھ کر اس نے ریت اور سیمنٹ ملا کر اس جگہ دو دو بلاک رکھ کر ایک احاطہ سا بنا لیا۔ شام کو وہ اپنی ویگن پر اپنی ڈیوٹی ختم کر کے واپس آیا۔ تو اس نے اس احاطے میں چٹائیاں بچھی ہوئی دیکھیں۔ اسے وقت اسے اس بات کی زیادہ خوشی ہوئی کہ اس کی اسکیم کامیاب ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس مرحلے پر اس نے وہی بانس اور سرکنڈوں کی چٹائیاں کھڑی کر کے اندر اپنا بینگ رکھ دیا۔ بستر اور ضرورت کی اشیاء بھی لے آیا۔ پھر صبح اور عشاء کی اذان تو خود دیتا اور اپنے چلے جانے کی وجہ

[illegible] ظہر اور عصر کی اذان کے لئے اس وقت وہاں آنے والے مزدوروں سے کہہ دیتا، یوں پانچوں وقت [illegible]
[illegible] ہونے لگی۔ مغرب کے وقت وہ کوشش کرکے خود واپس پہنچ جاتا کیونکہ اکثر محلے کے بچے کھانا لے
جاتے اس طرح رات کے کھانے کے پیسے بھی بچ رہتے۔ اپنی جھونپڑی کی حفاظت کی فکر میں وہ دکان
کے مالک سے کہہ کر [illegible] ڈیوٹی کرنے لگا۔ مغرب اور عشاء میں جب چند نمازی جمع ہو جاتے تو اقامت
خود ہی کرتا۔ دیکھتے تو [illegible] غیر قانونی مسجدوں کی طرح یہ مسجد بھی نمازیوں سے اکثر خالی ہی رہتی اور گھری
ہوئی اتنی وسیع جگہ میں بس چند نمازی شریک ہوتے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ چند قدم پر ایک
اور مسجد پہلے ہی موجود تھی لیکن یہ فرق اسے صاف نظر آتا کہ وہاں کے لوگوں میں اس کے خلاف جو نفرت
تھی اب اسے نظر نہ آتی اور اس میدان میں کھیلنے والے بچوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ ویسا نہ رہا
تھا بلکہ ان کی گیند وہاں آجاتی تو وہ مسکین بنے اس کے پاس آتے [illegible] سے بات کرتے اور
اگر کبھی گیند مسجد کے احاطے میں چلی جاتی تو وہ مجرم اور گنہگار سے بنے [illegible] رہتے۔ وہاں موجود محلے
کا کوئی بڑا آدمی انھیں ڈانٹتا پھٹکارتا، مسجد کے متبرک ہونے کا احساس دلاتا اور لڑکوں کے ماں
باپ تک بات پہنچا دی جاتی۔ ایسی صورت میں نہ صرف لڑکے بلکہ ان کے ماں باپ اس سے آکر معافی
مانگتے۔ گویا اس کا معاف کر دینا بے حد ضروری ہو۔ وہ ان سب کو دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر خوش
ہوتا۔ اس میں زیادہ خوشی اس بات کی ہوتی کہ اب اس کی جھونپڑی پر کوئی اعتراض نہ کرتا اور نہ کوئی
پولس والا اسے گرانے آتا۔ وہ مسجد کو بھی اب اپنی جھونپڑی کا ایک حصہ ہی سمجھنے لگا تھا اس لئے
اب اسے ضرورت کے لئے جھونپڑی سے باہر کسی کھنڈر یا جھاڑی کے پیچھے نہ جانا پڑتا۔ نہ اب کھلے آسمان
کے نیچے بالٹی رکھ کر اور نہ کسی حمام میں پیسے دے کر نہانا پڑتا بلکہ مسجد کے غسل خانے کو استعمال کرتا
اور گرمیوں کے دنوں میں جھونپڑی کے اندر سونے کے بجائے مسجد کے کھلے صحن میں چٹائی پر مزے سے
سوتا۔ کبھی دوپہر کو جلدی آجاتا یا کام پر نہ جاتا تو وہیں لیٹتا۔ اللہ کے گھر کا احترام [illegible] کے احساس
میں خوب رچا بسا ہوا تھا اس کے نتیجے میں مسجد کے صحن پر جوتے اتار کر جاتا اور اس کی طرف سر ہانا کرکے
سوتا۔

وہاں کے ماحول، لوگوں اور ان کی فطرت سے آگاہ ہو جانے کی وجہ سے اب اس نے چندہ اکٹھا
کرنے کی غرض سے ایک صندوقچی بھی مسجد میں رکھ دی۔ اس چندے سے اس نے مسجد کے احاطے کی دیوار
اونچی کر دیں۔ اور فرش پختہ کر دیا۔ اس چندے میں اس نے اپنی جھونپڑی کی حالت بھی سدھارنی شروع
کر دی۔ اس چندے سے اس نے مسجد کی چھت بھی ڈال دی اور رفتہ رفتہ اس کی جھونپڑی پکے مکان
کی شکل اختیار کرنے لگی۔ اور ساتھ ہی قریبی مکان سے بجلی کا کنکشن لے کر لاؤڈ اسپیکر بھی [illegible] کر
دیا گیا۔ یہی کنکشن وہ اپنے مکان میں لے گیا۔ اس نے اس روشنی میں اپنے وجود اور گھر کی دیگر چیزوں کو
روشن دیکھا تو اسے اپنا پورا وجود دوسرا ہی لگا۔ اس نے جھٹ شیشہ اٹھا کر اس میں اپنا چہرہ دیکھا

یا زندگی میں پہلی بار اپنے چہرے کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنے مکان کی ہر ہر چیز کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھا ن کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ اس روشنی میں اس کے بچے اور اس کی بیوی بالکل دوسری مخلوق لگیں ے۔ اور خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے مکان میں اچھل کود کرے اور شی سے زور زور سے چلائے مگر اس نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھالا۔

وقت کے ساتھ ساتھ محلے کی مختلف مذہبی اور رفاہی انجمنوں کی جانب سے مدد ہونے لگی تو ہ ایسی رفتار سے اپنے مکان کی حالت بہتر سے بہتر بناتا چلا گیا۔ اس نے اپنی موجودگی میں بڑے شوق سے دیواریں پختہ چھت آر سی سی کی اور فرش موزیک کا بنوایا۔ جیسے جیسے مکان کی حالت سدھرتی بلی گئی۔ اس کے اندر خوشی کے سوتے پھوٹتے اور وہ اپنے آپ میں نہ سماتا کیوں کہ اب اسے اپنے مکان کی طرف سے کوئی فکر لاحق نہیں رہی تھی۔ اس خوشی اور بے فکری کے عالم میں وہ جھوم جھوم کر لاشعوری طور پر کبھی دیواروں کو چھوتا کبھی موزیک کے فرش پر اپنا ہاتھ پھیر کر اس کے چکنے پن کو محسوس کر کے دیوانہ ہو جاتا اور کبھی چھت کو دیکھ دیکھ کر اس کے اندر ہر طرف سے حفاظت کا احساس انگڑائی لیتا۔ اس لئے اس طرف سے بے فکر ہو کر اس نے اپنے بال بچوں کو اپنے پاس ہی بلا لیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے بچے بھی مسجد کو اپنے گھر ہی کی طرح استعمال کرتے، مسجد کے غسل خانے میں نہاتے، چٹائیوں پر کھیلتے رہتے وہ اگرچہ اپنے بچوں کو ان باتوں پر نہ ٹوکتا مگر مسجد کا لحاظ رکھنے کی تلقین گھڑی گھڑی ضرور کرتا رہتا۔ پردے کی سخت پابند ہونے کی بنا پر اس کی بیوی خود مکان سے باہر نہ نکلتی لیکن دروازے سے لگی بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی اور ساتھ ہی انھیں مسجد کی مختلف چیزوں کو ہاتھ لگانے سے ٹوکتی رہتی۔ بچے کھیلتے کھیلتے گھر میں داخل ہوتے تو ان پر ہر ہر لمحے نظر رکھتی کہ کہیں فرش اور دیواریں گندی نہ کر دیں ورنہ کوشش کرتی کہ یہ باہر ہی جا کر کھیلیں۔

اب وہ خود بھی شہر کے لوگوں میں اچھی طرح گھل مل گیا تھا۔ اسے کسی طرف سے کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ اور اس کی زندگی میں اب اعتبار ہی اعتبار تھا۔ مسجد کی یہ حالت تو اس کے بعد بھی جوں کی توں ویسی ہی رہی مگر اس کا مکان پکا، مضبوط اور اچھا تعمیر ہو کر مکمل ہو چکا تھا۔

★

نجم بیگ

حبس

وہ پہلو میں لیٹی ہوئی تھی اور فضا محوِ سفر
میں جب بھی اپنی داستان شروع کرتا وہ کھکھلا
ں پڑتی ۔۔ دور تک گھنٹیوں کے راگ اس کے چہرے
مار میں لئے رہتے ۔ ایک سلسلہ دیر تک پشیمانی کا
بنا رہتا ۔ اس رات میں نے رواداریوں کو ملحوظ
ہوئے اپنی بے ہیبتی کا اظہار کرنا چاہا ۔ مگر وہ
ادوں کے عظیم تصور پر بضد تھی جب کے گھر
ہونے کا دھواں اس کی آنکھوں میں جلن کا
ب ہوتا ہے ۔ ماں ہر وقت اپنی سفیدی کو
رنے کے لئے میرے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی ہے ۔
کہوں کہ اب میرے لئے رنگوں میں کوئی دل
ہیں ہے ۔ ایک شام ہوائیں اسی قدر سازش
تھیں کہ دریا کے کنارے چلنے کے باوجود
ت چھلانگ لگاتے ہی بن پڑی کہ بارش نے آلیا
جب تھکن سے چور باہر نکلا تو پیشانی پر قطرے
ہے تھے ویسے میں تکمیل آدمیت کے احساس
سے بھی سرشار تھا ۔

اب جب کبھی میں رات کے سایوں کی بات
کرتا ہوں وہ چاندی کا منور چہرہ نظروں کے سامنے
بکھیر دیتی ہے ۔ کب نہ جانے اس نے رات کے آخری
پہر دروازے پر دستک دی کہ جھروکے سے چاندنی
ٹکٹکی باندھے مضطرب ٹہل رہی تھی اور دھڑکنیں قدموں
کے طواف پر ۔ مائیں تھیں رات کے آخری ساعت اس کی
آنکھوں میں ٹک تھرتھرا کے رہ گئی اور میں بے ساختہ
چاندنی کی اور کھینچتا چلا گیا ۔ صبح دم بیدار ہوا تو کمرے
گرد بے حیائی اپنی آنکھیں لٹکائے گھر کو تکتے جا رہی تھی
اور گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا کہ رات کوئی آخری
پہر کمرے کا بوسیدہ حصہ منہدم ہو چکا ہے ۔

میں گم سم آہٹوں کو سنتا رہا ۔ اس بات سے
بے خبر کہ آہٹیں ساعتوں کو اپنے کاندھوں پر لادے چلی
آرہی ہیں ۔ ایسے میں جب میں نے ایک نئے باب کو
شروع کرنے کی کوشش کی تو سب نے میرے ہاتھ
سے کتاب ہی چھین لی اور میرے ہاتھ میں ایک سی
کا سرا تھما دیا جو گھر کے ایک تاریک کمرے میں چلی گئی تھی ۔
میں روکتا ہی رہ گیا کہ میرے ہاتھ زنگ آلود ہیں اور
میں کسی بوجھ کو سہارنے کے قابل نہیں ہوں ۔ پر سب
نے اس کو میری خوش دلی پر محمول کیا اور ہنستے
ہوئے اپنے اپنے بستروں کی طرف چل دیئے ۔

پتہ نہیں کیسے یہ خیال ذہنوں میں سرایت
کر گیا تھا کہ بے نکیل گھوڑا فصل کے لئے تباہی کا
باعث ہوتا ہے ۔ اور اس کی آزادروی فصل میں
رفتہ رفتہ سڑن داخل کر دیتی ہے ۔ پر وہ تو بڑی
دیر سے آنسوؤں کو ساڑی کا پلو میں باندھے
دروازے پر منتظر کھڑی ہے اور دہلیز پر بیٹھا ہوا

ناگ سُرخ زبان نکالے اس کے پستانوں کے جانب نگراں ہے۔ سارے گھر میں فقط ایک لاٹھی کے لئے دوڑتا پھر رہا ہوں۔ ایسے میں بائیں جانب کے کمرے سے حقّہ کی گڑگڑاہٹ عہدِ وسطیٰ کے اتالیق جیسی لگتی ہے۔ واپس لوٹا تو نظروں نے اس منظر کو سمیٹ لیا کہ ناگ پستانوں سے لپٹا ہوا ہے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ سایہ فگن ہے۔ میں جھنجھلاہٹ میں اپنی بے زبانیوں کو ہی کوستا رہ گیا۔

ماں! تم سمجھتی کیوں نہیں کہ کوئلہ کی دلالی میں ہاتھ کالے ہو ہی جاتے ہیں اور تم ہو کر لباس پہ پڑے دھبّے پر چیخنے چلانے لگتی ہو۔ تمہاری ان ہی گھبراہٹوں سے گھبرا کر بھائی نہ جانے کن ساعتوں میں اپنے کمرے کو روشن کرنا بھول گیا اور جب تم ٹٹولتی ٹٹولتی کمرے میں داخل ہوئیں تو لٹکتے تار نے تمہارے رگ و ریشہ میں لرزے کو جاری کر دیا تب ہی تم نے لاٹھی کو اپنے لئے لازمی جان لیا کہ وہ تمہارے راستے کی ساتھی بھی رہے اور دلیل بھی۔

پھر کی ساری شکلوں کو سنوار کر بھی میں ہاتھ روم کی جانب بڑھ رہا ہوتا ہوں کہ نل تھم کی تیکھی آواز مجھے ہال میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دیتی ہے اور برتن مجھ کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور صبح دم ماں کی چہان بین شروع ہو جاتی ہے کہ بتاؤ یہ تمہارے سے حیوانی لب تک ہوتے رہیں گے۔ کیا عزت نے اس گھر سے اپنے سارے رشتے منقطع کر لئے ہیں۔ سب کی نگاہیں میری جانب بے ساختہ پھر ناک کڑنے لگتی ہیں اور ایسے میں میں غلاظت کا ٹوکرا لئے ڈسٹ بن کی طرف چل دیتا ہوں کہ گھر سے یہ آواز میرا پیچھا کرتی ہے کہ پتہ نہیں کب میونسپلٹی اس ڈسٹ بن

کو ہٹا دے۔ دور سے فائر بریگیڈ کے انجن کی آواز سنائی دے رہی ہے کہ محلہ کے ایک مکان میں محض ایک چنگاری نے سارے مکان کو خاکستر کر دیا۔ یک بیک مجھ کو کمرے میں حبس محسوس ہوتا ہے اور میں گھبرا کے کمرے سے باہر نکل جاتا ہوں کہ پتہ نہیں ....!

★

بچے

... ایک عظیم فلسفی شاعر کے یہ اشعار فی البدیہہ نکل پڑے۔ آپ بھی پڑھیے۔

تمہاری دعفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں (یا بچہ ۔۔؟؟)
اس کی امید یں قلیل اس کے مقاصد جلیل،
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

★

یوسف عارفی

ایک غیر ضروری آدمی

"کیا تم اس بات پر احتجاج نہیں کروگے کہ تم سے تمہارے لفظ چھینے جا رہے ہیں۔ ورثہ چھینا جا رہا ہے اور رگوں میں دوڑتے لہو کی تازگی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔"

"ہاں حضرت میں احتجاج کروں گا ۔۔۔ ضرور احتجاج کروں گا ۔۔۔ احتجاج!"

وہ ہڑبڑا کر جاگ پڑا اور پھٹی پھٹی نظروں سے ٹیبل پر رکھی گھڑی کو دیکھا۔ صبح کے سات بج رہے تھے، وہ ماتھا سکوڑ کر سوچنے لگا۔

"خواب دیکھنے کا یہ بھی کوئی وقت ہے" پھر وہ جا بجا کمرے میں بکھری کتابوں سے مخاطب ہوا۔

"یارو ۔۔۔ آج بھی وہ سبز عمامہ والے بزرگ آئے تھے۔ مگر اس بار ان کے سر پر عمامہ نہیں تھا۔ کہنے لگے ۔۔۔ لیکن بھلا ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے مجھے عادت سی ڈال دی گئی ہے کہ میں نیند سے بیدار ہو جاؤں تو ٹیبل پر رکھی اس گھڑی کو دیکھوں پھر ۔۔۔ دن بھر کی مصروفیت میرا مقدر بن جاتی ہے

کاش یہ سبز عمامہ والے بزرگ دن کے کسی وقت میں دکھائی پڑتے تو میں گذارش کرتا ۔۔۔ یا حضرت چند متحرک لمحے میرے ہمراہ بھی گذار لیجئے گا ۔۔۔ تاکہ آپ کو با آسانی سمجھ میں آسکے کہ میری وہ کون سی مجبوری ہے جو آپ کے حکم کی تعمیل میں مانع ہو رہی ہے۔ اور یہ جو آپ فرماتے ہیں کہ چھینا جھپٹی کچھ زیادہ ہی ہونے لگی ہے تو میں اس سلسلے میں یہ عرض کردوں کہ اب ہمارے پاس رہا بھی کیا ہے ۔۔۔

فصیلیں ابھی ٹوٹی نہ تھیں، حبیب اللہ کا عرس ابھی نافذ نہ ہوا تھا، ہنومان جی کی جاترہ میں کھیر بنائی جانے والی بڑی کڑھائی کو ابھی چھید نہ پڑی تھی ۔۔۔ تب ہی ہمارے گھر کے صدر دروازے کی چھت شق ہو گئی تھی ۔۔۔ مگر گری نہ تھی۔

ایک پل کے لئے اس نے بکھری کتابوں پر سرسری نظر ڈالی اور لمبی گہری سانس لے کر سوچا۔

"کاش صدر دروازے کی چھت گر گئی ہوتی تو اس غیر اہم کردار کا وجود بھی نہ ہوتا ۔۔۔ سلسلہ یوں نئی پرانی کتابوں، نئے پرانے وقتوں، نئی پرانی عادتوں اور نئے پرانے چہروں کے تعاقب سے نکل جاتا ۔۔۔"

رات اس نے پڑھا تھا۔

دلی کے اردو بازار سے ملحقہ خانم کے بازار کی چوڑی سڑک پر پھانسی ڈالی گئی تھی۔ خواجہ سرائے کی لکھائی گئی فہرست کے مطابق [illegible] کے عالم میں ہانپتے کانپتے نوجوانوں کو زبردستی [illegible] کرلایا جاتا ۔۔۔ اور چند مسخرے قسم کے سوال کئے جاتے ۔۔۔ اور ۔۔۔

گیا

آخر تم اتنی بدمزہ چائے تم کب سے
بنانے لگی ہو؟ [illegible] اور رسوئی
گھر کی دہلیز پار کرتی بیوی [illegible]
ایڈیٹ! تم سے ہزار بار کہا [illegible]
"ابھی وہ چائے کی [illegible]
ہونے لگی ہے" بیوی نے بکھری [illegible] سمیٹتے ہوئے
جواب دیا۔ "گویا بے گناہی آج بھی ہم سب کا پیچھا
کر رہی ہے۔ لیکن یہ سزا پھانسی کے پھندے سے
[illegible] تکلیف دہ ہے کہ تب پل بھر میں چھٹکارا مل
جاتا تھا۔ لیکن اب پل سے پل تک کی اذیت برداشت
کرنی ہوگی۔ کتنا لطف آتا ہے اس اذیت کو برداشت
کرنے میں!

بیوی نے اسے بڑی اجنبی نظروں سے دیکھا۔
اور بڑی بے اعتنائی سے بکھری کتابوں کو ٹیبل پر
سجانے کے بعد چلی گئی۔

"شکر ہے کہ تم دولت مشترکہ کا مطلب نہیں
سمجھتیں، اقوام متحدہ کیا ہے۔ ابر کیا چیز ہے، ہوا
کیا ہے" وہ [illegible] انداز میں بڑبڑاتا رہا۔ اور وقفہ
وقفہ سے ٹیبل پر سجی کتابوں کو دیکھتا رہا جو اس
کے یہاں تک قتل ہونے کا جواز بنتی رہی تھی۔

"لیکن میں تمہیں اپنا قاتل ہرگز نہیں گردانوں گا کہ تم
میری لٹتی، مٹتی اور جاگتی آنکھوں سے یہاں تک کہ ٹیبل
پر سجی ان کتابوں سے اور اس سے بڑھ کر اس زبان
سے جو نہ صرف میرا مذہب ہے بلکہ میری شناخت بھی ہے۔
تم اتنا سب سے اتنی دور ہو کر میں کبھی خود پر جھلاتا ہوں
ہنستا ہوں اور بے بسی سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں"

"آپ سے میں نے کتنی بار کہا ہے، گھر
میں سوتے بچوں سے بات ہرگز نہیں کرنی چاہیے

پیار ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ اور پاگلوں کی طرح نہیں
بڑبڑانا چاہیئے۔"

اچانک اس نے بیوی کے تمتماتے چہرے کی حدت
اپنے قریب محسوس کی۔ اس نے چپ چاپ گہری نیند
میں سوتے اپنے ننھے معصوم بیٹے کو دیکھا — پھر
مجرموں کی طرح سر جھکائے اٹھا۔

نیم گرم پانی
پھیکا میٹھا — نامعقول ناشتہ
بند بوتل والے مشکوک دودھ کی چائے
روزمرہ کا وہی گھسا پٹا لباس
سستے قسم کے سگریٹ
بغیر پالش کے جوتے —
رات اس نے پڑھا تھا —

دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے، پلاؤ، بریانی
مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقرخانیاں کی طرح
سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، دہی بالائی،
غرض کے ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔"

اس نے آتش تُرے میں انتہائی جھلاہٹ کے
عالم میں سگریٹ بجھادی۔ اور بغیر پالش کے بدصورت
جوتے پہنتا بیوی کی جانب دیکھا اور کہا۔

"امراؤ جان ادا بکتی تھی!"

"ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے
کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے، کبوتروں کو کھول کر دانہ
دیتے تھے۔ ایک دو ہوائیوں میں اڑاتے تھے، اتنے میں
اماں جھاڑو وغیرہ سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی
تھیں۔"

اور ہم تم! — سچ سچ کہو — تم نے اور
میں نے کتنے گھنٹے وظیفہ پڑھنے کا اہتمام کیا، کتنی نماز پڑھیں

ڑھیں، کتنی قناعتیں کیں، کتنا ایک دوسرے کو نوچا
کھسوٹا اور کتنی ایک دوسرے کو گالیاں دے کر گھونٹ
ہ بہلایا اور کتنا ـــــ مزیدار سالن بنا کر کھایا۔"

اب مجھ میں وہ پارسائی نہ رہی کہ میں تم سے
رب حاصل کرنے کا ارمان دل میں بساؤں کہ دلربائی
د ایک نا معقول لفظ ہے

نہ جانے کس نے کس کو کہا ـــــ

دروازہ کھلتا ہے۔ ننھی منی پیاری بچی اپنی چمکیلی
نظروں سے اس غیر اہم آدمی کو دیکھ رہی ہے ـــــ جو
یہ دیر میں، اس دروازہ سے باہر نکل کر اس بچی
ی گلابی ہتھیلی کو چومنے والا ہے ـــــ پھر یہ دروازہ
شام تک بند رہے گا۔

"اور سر شام تمام باغ میں چھڑکاؤ ہوتا ہے،
رختوں کی ایک ایک پتی دھوئی جاتی ہے۔ جا بجا
نوس روشن کر دیئے جاتے ہیں، صحن میں چبوترہ پر
کرسیاں بچھائی جاتی ہیں ـــــ غزلوں کی بیاض
سامنے رکھی جاتی ہے ـــــ ایک کرسی پر ارگن باجا
رکھ دیا جاتا ہے ـــــ اور نگاہیں دروازہ کی طرف
لگی رہتی ہیں ـــــ"

میں آج شام تک نہیں لوٹ پاؤں گا۔ موسم ورک
کے بعد بچوں کو باہر ہرگز نہ چھوڑنا، آجکل بستی میں
غنڈے بہت شور مچانے لگے ہیں، اور ہاں بیڈ
بہت ضرور جلائے رکھنا" میں تمہارے ٹیوشن کا جلد بست
کرتا ہوں ـــــ تب تک تم ـــــ تم ـــــ تم"
اس نے مضطرب انداز میں دیدے گھمائے۔

"ابا جی آجکل بہت ادھوری باتیں کرنے لگے
ہیں" ننھی منی لڑکی نے اسے معصوم نظروں سے دیکھا۔
معصومیت ـــــ خاموشی ـــــ سناٹا!

وہ ننھی سی پیاری بچی کی گلابی ہتھیلی پر بڑی بے صبری
کے عالم میں جھپٹ پڑا۔ پھر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی
کو دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل پڑا۔

میں ـــــ یہ سڑک ـــــ یہ آتی جاتی صورتیں۔
ـــــ یہ جسم ـــــ خواب میں گیا صورتیں شکلیں کے پنہا ہوگئیں۔
سیلونی پلیسہ! اس نے ناک پر ڈھلتی عینک
درست کی اور ٹٹول ٹٹول کر جیب سے ریزگاری نکالی
اور کنڈکٹر کے حوالے کرنے کے بعد سوچنے لگا ـــــ دفتر
جانے میں آج بھی دیر ہوگئی۔ پہلے یوں تھا کہ دفتر کو
دیر سے پہنچنے پر ڈانٹ پڑتی تھی، مگر اب تنخواہ میں
کٹوتی ہوتی ہے۔ اس کٹوتی کے باعث بچی کا دودھ اور
بچے کی فیس کے لئے روپیہ کم پڑ جاتا ہے ـــــ روپیہ
ـــــ روپیہ ـــــ روپیہ

"آگے بڑھو ـــــ!" پیچھے سے کسی نے اسے دھکا
دیا۔

"چلتی بس میں کھڑا آدمی اپنا توازن جلد کھو دیتا
ہے بھائی! دھکے مت دو۔

"آگے بڑھنے کے لئے دھکا ہی آج کا سب سے
کارآمد حربہ ہے۔" اس نے اپنے سارے جسم میں جھرجھری
سی محسوس کی ـــــ

مجھے اور کتنی مسافت طے کرنی ہے ـــــ؟
محل نما محفوظ حویلیوں میں، میں نے تیراکی سیکھی
تھی۔ فجر کی نماز کے بعد گھر کے پچھواڑے میں بندھی ہاتھی
گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر اس ندی تک جاتا
تھا ـــــ اس وقت سر پر نیلے آسمان کا سایہ ہوتا تھا
اور چاروں سمت سلونی صبح کی مسکراہٹ!

"گڈ مارننگ سر!"
"بکواس!!" اس کے دل کی گہرائیوں سے

ایک مہک سی اٹھی — محل نما باولیاں سمار کردی گئی ہیں، گھر کے پچھواڑے کو نیست و نابود ہوئے ایک عرصہ بیت گیا، باغی گھوڑی — وہ تو کب کی مرکھپ چکی اور سلونے دن کی مسکراہٹیں میری بینائی کی طرح معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔

اس نے ڈھونڈھ کر حاضری کے رجسٹر میں اپنا نام تلاش کیا۔ بزرگوں کا عطا کردہ پیارا اور خوبصورت نام خوشخطی کی کاپیوں میں دفن ہو چکا ہے — اس نے اپنے مختصر اور بالکل غیر اہم نام کے سامنے دستخط لگائے اور اپنی میز تک پہنچ گیا — اور میز کے کناروں سے بچتا، گھومتا کرسی میں دھنس پڑا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے، آنکھیں موندے — دادا حضرت اور ابا صاحب کا رٹایا ہوا کلمہ پڑھنے لگا —

"بسم اللہ الرحمٰن ...."

"ٹرنگ — ٹرنگ" اچانک میز پر رکھا ٹیلیفون بج اٹھا۔ اس نے بھویں سکیڑ کر سوچا۔

میں نے ابھی میز کی دراز نہیں کھولی ہے —

کلمہ ختم نہیں کر پایا ہوں —

"ہیلو"!

"سر آپ کو منیجر نے بلایا ہے۔"

"خدا نے بلایا ہے — خدا — خدا — خدا"

وہ کرسی میں — آج بھی، اب بھی اور شاید کل بھی دھنسا پڑا ہے، اور اس کی آنکھیں — معدوم ہوتی بجھتی آنکھیں — اس سبز عمامہ والے بزرگ کو تلاش کرنے لگتی ہیں جو ایک غیر ضروری آدمی کے خواب میں اکثر چلے آتے ہیں۔

★

منظر علی خاں (پاکستان)

"ڈیوڑھا درجہ"

تیسرے اور دوسرے درجے کے درمیان سرکار انگلشیہ نے اپنی ریل گاڑی میں ایک درجہ اور بنا رکھا تھا جسے ڈیوڑھا درجہ کہتے تھے۔ سوار اس میں سفید پوش مڈل کلاس والے ہوتے تھے جنہیں میاں خیرو کے ساتھ سفر کرنے میں سبکی محسوس ہوتی تھی اور نواب خیرالدین کے ساتھ سفر کرنے کی نہ ہمت رکھتے تھے اور نہ استطاعت لہذا ڈیوڑھا درجہ مڈل کلاس والوں کی شناخت بن کر رہ گیا۔ سوچتا ہوں ڈیوڑھے درجہ پر گفتگو کرنے سے پہلے بات مڈل کلاس کی شروع کی جائے تو کچھ بیجا بھی نہیں کہ یہ دونوں سکے کے دو رخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چلئے بات مڈل کلاس کی پہلے ہو جائے۔

ہمارے درمیان اب بھی ایسے بزرگوار موجود ہیں جن کے مڈل پاس کرنے پر خاصی دھوم مچی تھی۔ شیرینی تقسیم ہوئی تھی کچھ گانے بجانے کا اہتمام بھی ہوا تھا کہ عموماً ان دنوں مڈل کلاس تک پہنچتے پہنچتے لڑکے سُر تال سے کچھ نہ کچھ آشنا ہو جاتے تھے۔ خوشی کے اس موقع پر بزرگوار کے ساتھ سارا محلہ شریک ہوا کرتا تھا کہ مڈل کلاس تک پہنچنا اور پھر پاس کر جانا بڑی عالی ہمتی کی دلیل ہوتی تھی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ کچھ ایسا ہوا کہ اسکولوں سے مڈل کلاس غائب ہوتا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر لوور کلاس (Lower Class) غالب آ گیا۔ کچھ دل جلوں کے خیال میں اسے اپر کلاس Upper Class کی نظر لگ گئی۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو اب اسکولوں میں مڈل کلاس کی اہمیت ہے نہ شناخت ہی باقی۔

مڈل کلاس کی بات اسکولوں سے یوں شروع کی ہے کہ عموماً اسکولوں میں جو کچھ بویا جاتا ہے قوم اسے بعد میں کاٹتی ہے۔ قوم سے مراد تمام اقوام عالم ہیں جن میں ہر چند ہماری اپنی قوم بھی شامل ہے لیکن اپنی مخصوص ساخت کی وجہ سے یہ اقوام عالم میں شامل ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ مثلاً دوسری قومیں بچوں کو

اسکول میں جس زبان کی تعلیم دیتی ہیں اسی زبان میں ان کے بچے جوان ہو کر دفاتر اور کارخانوں میں مختلف امور کی بجا آوری کرتے ہیں۔ ہمارا معاملہ الٹا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو شروع سے انگریزی زبان کی تعلیم دیتے ہیں اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ جوان ہو کر یہ بچے قومی زبان میں امور مملکت چلا لیں گے۔ آپ پورے ملک کی سیر کر لیں اخبارات میں اردو کے قومی زبان ہونے پر جتنا اصرار کیا جاتا رہا ہے اس قدر انگریزی اسکول ملک کی گلیوں اور کوچوں میں کھلتے گئے ہیں۔ ان اسکولوں میں ہر اس آدمی کا بچہ زیر تعلیم ہے جو بزعم خود اردو زبان کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ جَو بو کر گندم پیدا کرنے کی اس سے بہتر مثال اگر کسی قوم نے پیش کی ہو تو بتائیے۔ یوں قومی زبان بے شک اردو ہے رہی سرکاری زبان تو اس کے اردو ہونے پر مت اصرار کیجئے کہ "سرکار" کا قوم سے واجبی سا ہی لگاؤ ہوتا ہے

بات تھی مڈل کلاس کی اس موضوع کی طرف یوں متوجہ ہونا پڑا کہ پھر خبر گرم ہے کہ ریل گاڑی سے ڈیوڑھے درجے کے بعد اب سکنڈ کلاس بلکہ فرسٹ کلاس بھی اٹھا لیا جائے گا۔ کلاسوں کے غائب کرنے کا عمل اب زمین سے اٹھ کر فضا میں بھی پہنچنے والا ہے۔ کلاسیں وہاں بھی کم کی جا رہی ہیں۔ اب ہوائی جہاز میں سنا ہے کہ صرف ایک ہی کلاس ہوگی۔ رئیس کلاس کو کیا کہیں گے یہ تو ارباب پی۔آئی۔ اے جانیں، ہمیں نہ صرف اندیشہ بلکہ یقین ہے کہ مڈل کلاس یعنی ڈیوڑھا درجہ بہر حال نہیں کہیں گے کہ یہی وہ کلاس ہے جس سے دوسرے کلاس والوں کے علاوہ خود اس کلاس کے لوگ بھی الرجک ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ کسی بھی درخت کو دیکھیں۔ لوگ بات اس کی جڑوں کی کریں گے یا پتوں کی ہریالی کی جن کے قریب پھول اور پھل ہوتے ہیں۔ مڈل کلاس یعنی تنوں کی بات کوئی نہیں کرتا۔ ہاں وقت پڑنے پر اس کی کھال ضرور اتار لیتے ہیں۔ لہذا مڈل کلاس والے عموماً اپنی کھال بچاتے ہی دیکھے گئے ہیں۔ سفید پوشاک سے نیچے اگر موقع ہو تو جھانک دیکھئے جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی دکھائی دے گی۔

بات تھی ریل گاڑی کے کلاسوں کی۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اب سے پہلے ایک درجہ ہوا کرتا تھا جسے ڈیوڑھا درجہ کہتے تھے۔ سچ دیکھئے اس کی تیسرے درجے جیسی تھی ہاں یہ ضرور تھا کہ ہم جیسے مڈل کلاس والے اس میں بیٹھ کر خود کو "اشرف المخلوقات" میں شمار کرتے تھے۔ ویسے "اشراف" کے بیٹھنے کے لئے جو درجے ریلوے والوں نے بنائے تھے اس کی بات اور تھی جو ماشاء اللہ اب بھی برقرار ہے۔ تیسرا درجہ ہو یا ڈیوڑھا درجہ کراچی سے لاہور پہنچتے پہنچتے دونوں کے مسافروں کا نہ صرف لباس سیاہ ہوتا تھا بلکہ چہرہ بھی۔ رہے اونچے درجوں والے تو ان کے رخ زیبا کی حفاظت کے لئے ریلوے والے ہمیشہ مستعد دیکھے گئے ہیں۔ اب رہا قلب کی سیاہی کا معاملہ تو اس پر کسی کی نگاہ گئی ہے۔

درجہ بندی اپنے معاشرے میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ اب اس سے مفر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سنا ہے اپنے مولانا بھی اب قسم اول اور قسم دوئم کا تعویز دینے لگے ہیں۔ خدا جانے قسم دوئم کے تعویز میں کیا لکھا ہوتا ہے، اللہ ہم سب کے حال پر رحم کرے۔ (آمین)

بات حضرتِ مولانا کی ہو یا جناب مسٹر کی درجہ بندی دونوں کے مسلک میں روا ہے۔ درجہ بندی سے اس سیلاب میں جس درجے کا کوئی پرسانِ حال نہیں وہ ہے ڈیوڑھا یا درمیانہ درجہ یا مڈل کلاس۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ یہ نہ تو مقبول اکبریؔ یوں میں ہے نہ ہی شیخ یوں میں سرور میں آتا ہے تو خود کو اپر مڈل کلاس بتاتا ہے اور زور اپر (upper) پر ڈالتا ہے۔ قنوطیت طاری ہوتی ہے تو لور مڈل کلاس بتاتا ہے رشتہ جوڑتا ہے۔ پذیرائی اس کی نہ اپر کلاس والے کرتے ہیں اور نہ لور کلاس والے۔

ارتقائی مدارج طے کرنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ لیکن اس خواہش کی شدت اور تکمیل آرزو کے لئے نت نئی کاوشیں جو ڈیوڑھے درجے یعنی مڈل کلاس میں نظر آئیں گی اس کا نظارہ اور کہیں ممکن نہیں۔ ایسے کسی خاندان میں تشریف لے جائیں اگر اس گھر کا بچہ آپ کو بتائے کہ پپّا گھر پر نہیں یا ممّی شاپنگ کے لئے گئی ہیں تو سمجھ لیجئے کہ اب یہ گھرانہ لور مڈل سے اپر مڈل کی طرف مائل پرواز ہے۔ ہر چند کے پپّا اور ممّی ابّا اور امّی کے ہم قافیہ ہیں لیکن قافیئے کی "ایکائی" سے کیا ہوتا ہے۔ یوں تو لیڈر کا ہم قافیہ رہبر ہے لیکن کسی لیڈر کو اخبار والے کبھی رہبر نہیں کہتے کہ مبادا ہتک عزت کا دعویٰ دائر نہ ہو جائے۔ اللہ برے وقتوں سے سب کو بچائے۔

جس طرح خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اسی طرح ڈیوڑھے والے ایک دوسرے کو دیکھ کر خاصہ گہرا رنگ پکڑتے ہیں۔ یہاں تک تو خیر تشویش کی کوئی بات نہیں لیکن خربوزہ جب تربوز کا رنگ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو صورتِ حال ذرا قابو سے باہر ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسی صورت میں تمام افرادِ خانہ ارتقائی مدارج طے کرنے کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر افرادِ خانہ کے پرانے ناموں کو مسٹر ٹامسن کی جیکٹ اور مس نینا کے گاؤن سے چھپایا جاتا ہے۔ رہن سہن، بول چال لباس کی وضع قطع کے علاوہ انداز فکر میں بھی ایک ماڈرن انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اب گھر والے خریداری کے لئے لالو کھیت نہیں جاتے گرچہ مکان ان کا لالو کھیت سے قریب ہوتا ہے اور اکثر دوکانداروں سے ان کی دیرینہ شناسائی بھی ہوتی ہے جن سے اب وہ آنکھ بچا کر نکل جاتے ہیں۔ ماضی قریب میں مانا کہ ملباری کے ہوٹل میں گھنٹوں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے لیکن اب فائیو اسٹار ہوٹل سے نیچے اترنے کو تیار ہی نہیں۔ رہا بے چارہ ملباری تو ہر چند کے اس کی قسمت کا ستارہ خاصا درخشاں ہوتا ہے لیکن ہوٹل اس کا فائیو تو کیا ون اسٹار کا مالک بھی نہیں لہذا "ترقی پذیر" حضرات کی توجہ کا مستحق کیسے ہو۔ مانا کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ وہیں گزرا تھا۔

مرد حضرات کے لئے ترقی کے مدارج طے کرنا بہر حال زیادہ مشکل نہیں۔ نہ لباس کے لئے تگ و دو کرنی ہوتی ہے اور نہ میک اپ کے کھڑاگ کی ضرورت۔ بس ڈیوڑھے درجے سے نکلنے کے لئے ممکن حد تک لہجہ بگاڑنا ہوتا ہے تھوڑے انگریزی الفاظ گفتگو میں شامل کرنے ہوتے ہیں۔ ایک، آدھ درجن غیر ملکی فلاسفروں کے اقوال زرّیں ازبر ہوں تو بہت ہیں۔ چند شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے صرف نام ہی یاد رہیں تو کیا کہنا۔ اگر یگا سوؔ کی جگہ فرائڈ کا حوالہ دے دیں جب بھی چلے گا کہ آخر کو حیاتِ انسانی کو تجزیہ فرائڈ نے بھی کیا ہے موقلم سے

نہ سہی قلم سے سہی۔ مشاہیر کے اقوال سنانے کے لئے موقع محل کی تلاش بھی ضروری ہے کہ ایسے موقع کی تلاش سے کیا حاصل کہ جب موقع ہاتھ آئے تو حافظہ ساتھ چھوڑ جائے۔ خواتین کے لئے ہر چند کہ یہ راستہ خوشگوار ہے لیکن ذرا طویل بھی۔ "خوشگوار" میں نے تماشبین کی حالت سامنے رکھ کر کہا ہے اس لئے کہ ایسے میں لاؤڈسپیکر پڑوس والے روزنِ دیوار کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ روزن نہ ملے تو منڈیر تک پہنچنے میں بھی قباحت محسوس نہیں کرتے یہ اور بات ہے کہ انہیں زیادہ تردّد نہیں کرنا ہوتا ہے کہ جو کچھ تماشے ہوتے ہیں بر سرِ عام ہی ہوتے ہیں۔ خواتین کو بہرحال مردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ کاوش کرنی ہوتی ہے کہ واسطہ ان کا بیشتر اپنی ہی جنس سے ہوتا ہے جو بال کی کھال نکالنے کی ماہر ہوتی ہیں۔ اگر سامنے مرد حضرات ہوں تو انہیں مسحور کرنے اور ان سے اپنی منزلِ ارتقار پر پہنچنے کی سند لینے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ بس تھوڑا سا لباس کی وضع وقطع پر دھیان دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔" وضع" تو خیر یونہی ابھر آتی ہے بس قطع ہی قطع پر نظر رکھنا ہوتا ہے۔ یہ گریباں کی قطع ہو، آستین کی قطع ہو یا بلاؤز کی لمبائی کی۔ رہا معاملہ میک اَپ کا تو لوئر مڈل سے اَپر مڈل کی طرف سفر شروع کرتے وقت جب برقع وچادر سے پیچھا چھوٹا تھا تو میک اَپ کا ادراک بڑی حد تک ہو ہی گیا تھا۔ اب اس اہتمام میں " فارن آئیٹمس " کی آمیزش رنگ پختہ کرنے کے لئے بہرحال لازمی ہے۔ یوں معاملہ پکا سمجھئے۔ ایک ذرا شاپنگ کی عادت بھی ڈالنا ضروری ہے میرا مطلب واقعی کچھ خریدنے سے نہیں ہے۔ ہاں دوکان پر مول تول کرنے پر تو کچھ گرہ سے نہیں جاتا۔ چند جملے انگریزی کے اگر رٹ لئے جائیں اور ان کے سہارے کسی " بڑی بیگم صاحبہ " سے شناسائی ہو جائے تو سونے پر سہاگہ سمجھئے۔ اس ساری " ایکسرسائز " میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ لباس ہے کہ اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ چلمن کے گلابی ہونے پر کسی کے متبسم ہونے کا خیال آتا تھا۔ پردے سے عکسِ حسن کے چھن چھن کر آنے کا زمانہ تو کب کا لد چکا۔ اب تو آدم جی لون کی عملداری ہے۔ سراپا کی نہ صرف رنگت بلکہ حدّت بھی غالب کا مصرعہ گنگناتی نظر آتی ہے کہ ؎

" صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے "

" اور نکتہ دانوں " کی دلچسپی کی کھیپ نہ صرف اونچے درجوں میں بلکہ پائدانوں پر بھی پھیلی منتظر ہے۔ ایسے میں ڈیوڑھے درجے والیاں ترقی کے جتنے مدارج طے کر جائیں کم ہے۔ حاصلِ ترقی بس یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے درجے سے تو کسی نہ کسی طور نکل آتی ہیں ہاں اونچائی پر داخلے کی کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کا پورا کرنا اب اتنا آسان بھی نہیں۔

" تبدیلیٔ درجات " کے اس ریلے میں جب دیکھا کہ اپنے بھائی شرفو ٹس سے مس نہیں ہوتے تو آخر پوچھنا پڑا کہ بھیا قصہ کیا ہے؟ تھوڑی سی ترقی تم بھی کیوں نہیں کرتے؟ بھائی شرفو بولے آپ ہی اکیلی ترقی کیا کرتی ہوں گی تو پھر تھوڑی سی کیوں؟ عرض کیا چلئے بہت ساری کر ڈالئے۔ کہنے لگے پلان تو ایک عرصے سے بنا رہا ہوں لیکن مسئلہ تمہاری بھابی کا ہے۔ بتایا کہ بھئی اب کوئی مشکل مسئلہ تو نہیں درجہ تبدیل کرتے وقت

بہت کچھ تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ ذرا اکڑ بڑا کر بولے "بہت کچھ" سے اگر تمہاری مراد بیوی سے ہے تو تمہارے لئے تو شاید آسان ہو۔ پوچھا میرے لئے آسان کیوں؟ بولے ایک عرصے سے تمہارا خان صاحبوں میں شمار ہونے لگا ہے لہذا تبدیلیٔ درجات کے ساتھ تبدیلیٔ بیگمات کے مرحلے سے بھی گزر جاؤ گے۔ لیکن تم تو جانتے ہو کہ از کم تمہارے مقابلے میں میں کچھ تھوڑا شریف واقع ہوا ہوں۔ ایسے میں ایک کے بعد دوسری کا خیال بھی محال ہے۔ میں نے کہا چلئے کچھ "ورک" ان پر ہی کر ڈالئے۔ بڑی حسرت سے بولے بھیا اگر یہ اپنے ڈیوڑھے درجے سے نکلیں بھی تو تیسرے درجے کی طرف مراجعت کریں گی لہذا مجھے تو یوں ہی رہنے دو۔

وطن عزیز جس کی اساس کہتے ہیں اسلام ہے آج کل ڈیوڑھے درجے والوں اور والیوں کی سعی مسلسل کی لپیٹ میں ہے۔ سعی مسلسل جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آخرت کے درجات کا فیصلہ تو جب ہوگا تب ہوگا فی الوقت درجہ اول میں یہاں انہیں جگہ مل جائے اور "اشراف" میں ان کا بھی شمار ہونے لگے۔ بھولے بھٹکے حکمرانی کی دلیوں ان کے بنگلے بھی آنکلے۔ واقفان حال ویسے جانتے ہیں کہ مساواتِ محمدی کے فلک شگاف نعروں کے علی الرغم درجہ بندی سے مفر کی صورت نہ تو مستقبل قریب میں نظر آتی ہے اور نہ مختلف درجوں کے انضمام کا کوئی امکان ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی پلان حکامِ ملت کے ذہنوں میں ہوتا تو کراچی کی حد تک کلفٹن کے سبزہ زاروں اور ڈیفنس سوسائٹی کے گلزاروں میں ڈیوڑھے درجے والوں کے لئے بھی کچھ جگہ مخصوص ہوتی۔ ہاں جھگی ڈالنے کی جگہ بے شک متصل کے نشیبی علاقے میں چھوڑی جاتی ہے کہ تیسرے درجے کے لوگ قدموں تلے نہ ہوں تو درجہ اول کی پہچان کیسے ہو؟ رہے ڈیوڑھے درجے والے تو بھیا وہ اپنی شناخت سے مطمئن تو ہوں مگر بعد میں انہیں پہنچائیں گے۔

فصیلوں کے دائرے میں

——— الیس انصاری

وہ پہلی بارش کی سرد بوندوں سا بھیگا لمحہ
اس بھری شام کے کنارے
تمہارے خواہش زدہ بدن پر گرا تو ہوگا ؟
وہ لمحۂ دلگداز جب تم
مرے سریلے، شریر انگوں سے چوستی تھیں
طمع لذت
کھنچے ہوئے کسرتی بدن کی پناہ میں تھی تمہاری راحت
وہ لمحۂ جاں فریب جس میں
یہ سوچتے تھے
تمام دنیا حقیر تر ہے
اصول اور ضابطے، شرع گرد پا ہیں
جینے کی آرزو ہی عظیم تر ہے
تمہاری چاہت عظیم تر ہے
(۲) یہ کیوں ہوا ہے
کہ ایک ہی شہر کی فصیلوں کے دائرے میں
جہاں مرا اور تمہارا گھر ہے
میرے دریدہ بدن سے تم بے نیاز اس طرح جی رہی ہو
کہ جیسے میں سنگ میل ہوں گذری راحتوں کا
میں راستے کی طرح پڑا ہوں
کہ جیسے ہو انتظار اگلی مسافتوں کا
اس بھری شام کے کنارے
جہاں مرا اور تمہارا گھر اپنے دائروں میں سمٹ گیا ہے
وہ پہلی بارش کی سرد بوندوں سا بھیگا لمحہ
تمہارے خواہش زدہ بدن پر گرا تو ہوگا
★

کوئی دستِ اندمال

——— اسعد بدایونی

یہ حرف و صوت و رنگ کے تمام سلسلے
بس اک گمان ہیں، گماں کے سوا ہیں اور کیا
مری جبیں پہ ہزار زخم آچکے مگر
نگہ سے خواب دیکھنے کی عادتیں نہ جائیں گی
کہیں سے کوئی دستِ اندمال بھی نہ آئے گا
میں جانتا ہوں مژدۂ وصال بھی نہ آئے گا
میں ایک فرد اس معاشرے کا ہوں جہاں
ضرورتیں صداقتوں کو کھا گئیں
اصول بس کتاب کے سیہ حروف بن کے رہ گئے
منافقت کو ایک فن کہا گیا
لہو کی حرمتیں جہاں تمام ہو چکیں -
وہ پھول صورتیں کہ جن سے
خوشبوؤں کے سلسلوں کی رسم و راہ تھی
کبھی کی سو چکیں
مگر مجھے معاشرے سے اپنے کوئی بھی گلہ نہیں
کہ یہ تغیرات ناگزیر تھے
جو مدتوں سے اندرونِ جاں نمو پذیر تھے.
مگر مرے معاشرے کو مجھ سے ہیں شکایتیں
میں لکھ رہا ہوں آج تک وہی گھسی پٹی ہوئی شکایتیں
مرے قلم میں آج بھی قدیم ناشناسائی ہے
مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں اسی معاشرے کا ایک فرد ہوں
مگر جو فرق ان میں مجھ میں ہے
وہ یہ کہ مجھ کو خواب دیکھنے کا شوق ہے

اطہر نادر (پاکستان)

رات آنگن میں چاند اترا تھا
تم ملے تھے کہ خواب دیکھا تھا
اب کہ خود ہیں حصارِ ذات میں بند
ورنہ اپنا بھی زور چلتا تھا
شیشۂ دل پہ ایسی چوٹ پڑی
ایک لمحے میں ریزہ ریزہ تھا
اس کے کوچے کے ہو لئے ورنہ
راستہ ہر طرف [illegible]
رت جو بدلی تو یہ کبھی دیکھا ہے
پتہ پتہ زمیں پہ بکھرا تھا
ایک خوشبو ہے جو کہ پھیلی
اس خرابے میں کون رہتا تھا
موم کی طرح [illegible] پگھلتا گیا
وہ جو پتھر [illegible] لگتا تھا
اب کہ سنتے نہیں ہو بات مگر
پھر کہو گے کہ کوئی کہتا تھا
رات سنسان تھی مگر [illegible]
حشر سا دل میں ایک برپا تھا

★

ایم۔ اے۔ ضیا (گیا)

دھواں اڑا تو خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا
حیات و موت کا جیسے کہ فاصلہ ٹوٹا
جو عکس ابھرا ادھورا نظر ہی آتا ہے
دیکھا رہا ہے کوئی جیسے آئینہ ٹوٹا
وہ شاخ جس پہ پرندوں کا کھیل جاری تھا
زمیں پہ آج وہی ہے گرا پڑا ٹوٹا
تھکن کی بات تو چہرے سے جان لیتے ہیں
کسی نے آج تک دیکھا نہ حوصلہ ٹوٹا
وہ کون میرے تصور میں ہو گیا داخل
حصارِ ذات کا [illegible] دائرہ ٹوٹا
[illegible]
[illegible] ٹوٹا
ضیا یہ بات تو میری [illegible] سے باہر ہے
وہ روز ملتے رہے پھر بھی رابطہ ٹوٹا

★

عشرت قادری

عرصہ گاہِ جہد میں کیا کیا نہ تحریریں ملیں
طوقِ گردن میں پڑے قدموں کو زنجیریں ملیں

رات کے ماتھے پہ یوں لہرائی صبحِ زرنگار!
کہر میں لپٹے ہوئے سورج کی تنویریں ملیں

آزمائش، خاک و خوں، دریوزگی، زنداں، صلیب
خواب اک دیکھا تھا ہم نے، کتنی تعبیریں ملیں

چہرہ چہرہ کھل گیا، پڑھ لی کتابِ زندگی
خوں چکاں اوراق پر دل دوز تفسیریں ملیں

ایک اک کو دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں جانے کیوں
تجھ سے ملتی جلتی مجھ کو جتنی تصویریں ملیں

یادگارِ جشنِ عہدِ گل اڑا لائی —— صبا
خون سے لکھی ہوئی پتوں پہ تحریریں ملیں

یونس فرحت

زندگی سے اس قدر عاری نہ تھا
پہلے غمِ احساس پر طاری نہ تھا

پرسشِ احوال غیروں نے تو کی!
اس کو لیکن پاسِ غمخواری نہ تھا

جسم میں اپنے رہا برسوں میں قید
جب خیالِ گریہ و زاری نہ تھا

اُس نے یوں مجھ سے سنا ذکرِ وفا
جیسے کوئی قصۂ پارینہ تھا

آکے تیری بزم میں عقدہ کھلا
کچھ ہمیں کو شوقِ دل داری نہ تھا

زخمِ دل اس کی ملاحت پر نثار
جس پہ الزامِ دل آزاری نہ تھا

سب ہی قد آور تھے فرحت شہر میں
اک مجھی کو زعمِ فن کاری نہ تھا

فضا کوثری

ٹوٹ پڑتا ہے جو غم تازہ عتابوں کی طرح
اوڑھ لیتا ہوں تبسم میں نقابوں کی طرح
جب ... مانوس ازدیت بکھرے ملے ہیں اکثر
ہیں ہی شہر میں ہوں خانہ خرابوں کی طرح
درد کو وجہ سکوں، دھوپ کو سایا نہ کہا
... مصلحت آمیز جوابوں کی طرح
دیدار ... تیرا پیکر نہیں نہ سہی
... کبھی کوئی منظر نہیں خوابوں کی طرح
... احباب اگر ہو گے
... دیکھو کبھی چہروں کو کتابوں کی طرح
... ایک جسم کو دیتی مری ہر سانس زکوٰۃ
... زندہ رہوں گا میں حبابوں کی طرح
... کبھی ... سبزہ کی مانند ...
... زندگی ہے جہنم کے عذابوں کی طرح
... اوقات کی ہیں اب جو فضا
... مرے جذبوں کو ... کی طرح

ضیاء الانجم

لب کھولیں گے لفظوں سے نئی بات کریں گے
تحلیل ہم اپنے میں غم ذات کریں گے
گلدان کے پھولوں سے ملاقات کریں گے
لہجے بھی نئے ہوں گے نئی بات کریں گے
شوکیس میں رکھ آئے ہیں یادوں کے صحیفے
اب تازہ کہانی کی شروعات کریں گے
ویسے تو کئی دن سے کہیں رات نہیں کی
دوران سفر اب تو کہیں رات کریں گے
ذکر آئے گا جب بھی کبھی برسات کا یارو
سیلاب زدہ فکر مکانات کریں گے
کاغذ کی زمینوں پہ اترتے ہوئے الفاظ
باغی ہیں روایت سے الگ بات کریں گے
میں اپنی روش کا ہوں ضیا تنہا مسافر
سنتے ہیں کہ کچھ لوگ مرا ساتھ کریں گے

س. ن. فہمی (بنگلہ دیش)

زلفِ جاناں سے تھی یکجائی بہت
پھول نے کی نکہت آرائی بہت
ہے مری شئے اشک آرائی بہت
بڑھ گیا ہے خوفِ رسوائی بہت
وسعتِ صحرا کر آخر [illegible] ہوا
شہر میں پھرتے ہیں سودائی بہت
کون ہوگا اس کا پرساں میرے بعد
مضطرب ہے میری تنہائی بہت
پاؤں پھسلا تو نہیں ہے خیریت
جان لے لیتی ہے اونچائی بہت
بادِ صرصر سے نہیں کم کوئی رو
شاق ہے فرقت میں پروائی بہت
عشق پر ہوتی نہ جو غالب ہوس
اس قدر کی ہوتی رسوائی بہت
درد کی آواز تھی فہمی خفیف
اور تھی دل کی بھی گہرائی بہت

ایم کے اثر (کلکتہ)

جھانک چکا ہوں۔ چہرہ ٹوٹے
عکس [illegible]وں، آئینہ ٹوٹے
بات بتاؤں گا میں کس سے
بات کروں تو رشتہ ٹوٹے
خواہش در پر ٹانک چکا ہوں
گھر [illegible] سپنا ٹوٹے
ہاتھ پسار[illegible] ہے
کھڑکی کھولوں، پردہ ٹوٹے
صدیوں پر الزام لگاؤں
طیش میں آکر لمحہ ٹوٹے
ریت کا دریا بہتا کب تک
موج سے اپنی قطرہ ٹوٹے
پربت پربت سرگردانی
پستی پستی ذرہ ٹوٹے
پھیل گئی ہے آنکھ میں زردی
دور کا سارا نقشہ ٹوٹے
ٹوٹ رہا ہوں لمحہ لمحہ
شاخ سے جیسے پتا ٹوٹے

★

تبصرے

یہ لوگ .... (خاکوں کا مجموعہ)
مصنف .... ڈاکٹر محمد مثنیٰ
ناشر .... انڈین لنگویجز گیا
قیمت .... ۱۸ روپے
مبصر .... حسین الحق

خاکہ نگاری باضابطہ ایک فن ہے جس
اردو میں رشید احمد صدیقی جیسے بزرگ ادیبوں نے
ار بخشا، باوجودیکہ ہر صنف کی طرح اس میں بھی نقالچیو
بھیڑ ہے مگر قد آور شخصیتیں تو بونوں کی بھیڑ میں بھی
ایاں رہتی ہیں۔

مثنیٰ صاحب بھی نمایاں ہیں اور اس لئے نمایاں
اکہ ان کے یہاں شخصیتوں کے تصویری خاکے اتارنے
بدرجۂ اتم صلاحیت موجود ہے اور اس لئے بھی
یاں ہیں کہ خاکوں کے لئے شخصیتوں کا ہونا ضروری
ہے۔ حالانکہ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی نے "گندن"
کے ذریعہ اس مسلمہ کی نفی کر دی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ
مگر ظاہر ہے کہ انتشار پر فیصلے صادر نہیں کئے جاتے،
مجموعی صورتِ حال یہ ہے کہ خود شخصیتیں جتنی نمایاں
ہوں گی ان کے خاکے بھی قارئین کے لئے اپنے اندر دلچسپی
کے اتنے ہی اسباب پوشیدہ کئے رہیں گے۔

مثنیٰ صاحب بھی اس بنیادی رمز سے واقف
ہیں لہٰذا اس کتاب میں بھی، احتشام حسین، خواجہ غلام
السیدین، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، مظہر امام،
اور کلام حیدری وغیرہ جیسی اہم شخصیتوں کو مثنیٰ صاحب
نے اپنا موضوع بنایا ہے۔

ان کی کتاب پر اب تک متعدد تبصرے آ چکے
اور یقیناً اور بھی بہت سے آئیں گے اور آتے رہیں گے،
فن خاکہ نگاری کے پس منظر میں بہت ساری باتیں کہی
گئیں اور کہی جائیں گی، چبائے نوالے اگلنا مجھے پسند
نہیں لہٰذا جو خوبیاں بیان کی جا چکیں ہیں ان کے علاوہ
چند اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

اول تو یہ کہ مثنیٰ نے خاکے لکھے ہیں، خاکے
اڑائے نہیں ہیں، کہتے ہیں کہ اسٹائل از دی مین، ان
خاکوں میں آپ دوسروں کی تصویریں تو دیکھ ہی سکتے
ہیں، خود مثنیٰ صاحب بھی ان تمام لوگوں کے درمیان
آپ کو جھلکتے نظر آئیں گے، یہ مثنیٰ صاحب مہذب،
وضع دار، کسی کو تکلیف نہ پہنچانے والے، شائستہ
لہجے میں گفتگو کرنے والے، حتی الامکان تیز کلامی،
اور بے محابا گفتگو سے پرہیز کرتے والے مثنیٰ صاحب
ہیں لہٰذا وہ دوسروں کی بھی صرف خوبیاں تلاش
کرتے ہیں (شاید بایں آپ ایسے مواقع تلاش کر سکیں
گے جہاں وہ کسی کی غلطی کو غلطی کہیں: مثال، قاضی
عبدالستار) وہ مزہ جو ظ انصاری کے یہاں آپ کو

وہ مثنیٰ صاحب کے یہاں نہیں مگر ظ انصاری سر
اتے ہلاتے ایک ہاتھ رسید بھی کر دے سکتے ہیں، مثنی
احب کے یہاں اس کا خوف قطعی نہیں۔

دوئم یہ کہ مثنیٰ صاحب کی تحریر سے شخصیت
ء خارجیہ سے زیادہ شخصیت کا داخل ابھرتا ہے ، وہ
یت جو بعض خاکہ نگاروں کے یہاں بھی ہے مگر یہاں
ن آدمی کی شناخت ممکن ہے یہ وہ آدمی نہیں جو سامنے
ظر آتا ہے بلکہ وہ آدمی ہے جو اندر چھپا بیٹھا ہے البتہ
ں وہی بات جس کا تذکرہ میں کر چکا مثنیٰ صاحب بھی بہت
مارے بڑے اور شریف لوگوں کی طرح "خذ ما صفی
ع ما کدر" کے قائل ہیں لہٰذا برت جب اٹھاتے
ی ہیں تو اس طرف نظر ہی نہیں کرتے جدھر "اسفل
سافلین" جھلک رہا ہے اور اسی مقام پر وہ خالی
قی پسند ہوتے ہوئے بھی اخلاقی اور تعمیری ادیب
ہتے نظر آتے ہیں

سوئم یہ کہ شخصیتوں پر لکھتے ہوئے شخصیتوں کی
بعض ایسی خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے گذر جاتے
ہیں جو عامی نگاہوں سے عموماً پوشیدہ ہی رہتی ہے۔

بات اس وقت کی ہے جب عبدالمغنی صاحب کی
بنائی ہوئی ادبی انجمن "حلقۂ ادب" میں عبدالمغنی صاحب
نے مجھے ایک افسانہ پڑھنے سے روک دیا تھا اور اس
فسانے پر یہ الزام لگایا کہ اس میں عریاں نگاری اور
فحش نگاری سے کام لیا گیا ہے، ان کے غلط رویئے کے
خلاف ہم (میں اور شوکت حیات) اس محفل سے واک
آؤٹ کر گئے، پھر بات "مورچہ" کے صفحات تک پہنچی۔
ور میری اور عبدالمغنی صاحب کی حمایت اور مخالفت
میں متعدد خطوط آئے، مرحوم احتشام حسین صاحب نے
بھی خط لکھا اور عبدالمغنی صاحب کے رویئے کو غلط

کہا، پھر کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ احتشام صاحب تشریف
لائے ہیں اور اختر صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں
مجھے ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا ، میں انہیں اسٹیشن
تک پہنچانے گیا اور اس کئی گھنٹے کی ملاقات میں میں
نے ایک بات شدت سے محسوس کی کہ احتشام صاحب
مجھے سمجھاتے ہوئے جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں سمجھ نہیں
پا رہا ہوں تو یہ نہیں پوچھتے کہ "نہیں سمجھتے آپ ؟" بلکہ
یہ فرماتے کہ "شاید میں اپنی بات واضح نہیں کر پایا"
یہ بات میرے دل پر نقش تھی اور جب احتشام صاحب
پر مثنیٰ صاحب کا خاکہ پڑھا تو میری خوشی دوبالا ہوئی
کہ مثنیٰ صاحب نے بھی اس بڑے آدمی کی یہ خصوصیت
محسوس کی۔

مثنیٰ صاحب علیگ ہیں اور اس دور اور گروپ
کا ایک حصہ اور یاد ہیں جو ہم نئے اور چھوٹے آدمیوں کیلئے
اب Legend بن چکا ہے اس پس منظر میں مثنیٰ صاحب
کے یہ خاکے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے پڑھنے
سے علی گڑھ اور اردو ادب کا ایک ایسا زمانہ اور
محفلیں سر اٹھا کر جگنوؤں کی طرح جھلملاتی نظر آتی
ہیں جن کی اس جھل کھونٹ کپٹ بے ایمانی ، بے مروتی،
خباثت اور رذالت کے جنگل میں بالکل ویسی ہی اہمیت
ہے جیسے جنگلوں کے گھنے اندھیرے میں کسی راہب
کے چراغ کی۔

کتاب شائع کی ہے، اس کے
ناشر انڈین لنگویز گیا ہیں، قیمت ۱۸ روپئے ہے، کتاب
میں شوشاں نہیں ہے مگر اس کے باوجود اس کی سادگی
میں بھی ایک حسن ہے ، یہ حسن بھی ان کے خاکوں کی
طرح خارجی نہیں داخلی ہے ——!!

★

(خطوط)

سواد وصوت

- نسیم ستر کھی (پاکستان)
- محمد بدر الدین (بھاگلپور)

محترم جناب کلام حیدری صاحب۔ آداب
پرچہ پابندی سے پہونچ رہا ہے تہہ دل سے آپ کا شکر گذار ہوں ورنہ گھروں پر جاکر پڑھنا پڑتا تھا۔ اب اپنے گھر پر بیٹھ کر اطمینان سے استفادہ کرتا ہوں اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ ماہنامہ "آہنگ" اپنے قاری کو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، امریکہ، کناڈا اور انگلستان کی اردو ادبی تخلیقات کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے کچھ تحقیقی مضامین اور کچھ ایسے لکھنے والوں سے ہم آشنا ہوتے ہیں جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے ورنہ یوں ہم اپنے آئینہ خانوں میں عموماً اپنے خوبصورت البم کی تصاویر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں ہمارے ادیب تالاب کے ان مینڈھکوں کی مانند ہیں جو اپنے چھوٹے سے تالاب میں اپنی ٹرٹراہٹ ہی سنتے ہیں انھیں یہ قطعاً علم نہیں کہ پانی کے اوپر بھی کچھ ہے میں اپنے بیان کی گواہی میں شہزاد منظر کو پیش کروں گا۔ جون کے تازہ شمارہ میں ان کا مضمون "کرشن چندر۔ چند یادیں" تو آپ نے دیکھ لیا اب انتظار کیجئے ٹیگور کے ساتھ ان کی ملاقاتیں۔ میرے بھائی وہ یہاں کے عظیم اسکالر ہیں یہاں کے لوگ انھیں فلسفی دانشور، نقاد، مضمون نگار نقاد، افسانہ نگار، ناول نگار اور عظیم صحافی کہتے ہیں۔ ان کا ایک مرتبہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے فکشن گروپ کی سنگ بنیاد رکھی۔ اس گروپ میں صرف تین ماہرین فکشن شامل کئے گئے افسانہ پر یہاں تحقیق ہو رہی ہے۔ حیدر ملک عبادرت کے دفتر سے "چراغ راہ" کی پرانی فائیں تلاش کرکے لائے ہیں اور اس کھوج میں ہیں کہ مولانا مودودی نے افسانہ کے بارے میں کیا کہا ہے، ادھر صبا اکرام شاعری چھوڑ کر اس جستجو میں ہیں کہ علامہ اقبال نے کبھی کوئی افسانہ لکھا تھا واقعی اگر فکشن گروپ نے ان دو اہم موضوعات پر تحقیق مکمل کرلی تو یہ صرف فکشن کا کارنامہ ہی نہیں بلکہ تحقیق کا ایک نیا باب ہوگا۔

بقول آپ کے کہ شہزاد منظر کبھی ترقی پسند اور کمیونسٹ تھے۔ چلیئے ہم یقین کئے لیتے ہیں لیکن اب انھیں اپنے بارے میں ایسے الفاظ سن کر ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے ایک بچارے شہزاد منظر ہی پر منحصر نہیں بلکہ جس جانب نظر اٹھائیے تو ایسی شخصیات کی ریل پیل ہے۔ سفرنامے، آپ بیتیاں، ملاقاتیں لکھ کر اپنے آپ کو اہمیت دی جارہی ہے ہمیں بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سب سے بڑے ہیں اگر اس ملک میں کوئی چھوٹا شخص ہے وہ میں ہوں۔

ناچیز نسیم ستر کھی

محترمی و مکرمی ایڈیٹر صاحب، تسلیم و عزت
توقع قوی ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوں گے "آہنگ" اگست کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ تمام شمولات حسب معمول موثر اور دلکش رہے۔ لیکن جب ناچیز کی نظر ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا گوشوارہ سال ۱۹۷۸ء پر مرکوز ہوئی تو ایک خاصی بڑی غلطی نے دل کو بے چین سا کر دیا اور وہ یہ کہ مضمون بعنوان (جون آہنگ ۱۹۷۸ء) تمثیل کا مفہوم اور سب رس کے سامنے

(صفحہ ۹ پر)

ادریس سنہاروی

انتقال ہوگیا

میرے دوست ادریس سنہاروی کا ۲۵ر اگست ۱۹۸۴ء کو انتقال ہوگیا۔

ادریس سنہاروی نیا زمانہ بمبئی کے کاتب تھے اور یہ وہ سنہرا زمانہ تھا جب نیا زمانہ سجاد ظہیر مرحوم کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ ایڈیٹر، کام کرنے والوں اور کمیونسٹ تحریک سب پر نوجوانی تھی۔ ادریس پر بھی نوجوانی تھی اور بمبئی شہر تھا۔

بمبئی چھوڑنے کے بعد ——— یعنی بوشی کا زمانہ جب کمیونسٹ پارٹی میں ٹھنڈا پڑنے لگا تو ادریس بمبئی سے واپس ہوگئے

۱۹۵۲ء میں نوادہ سے اسمبلی کے الکشن میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے کیونکہ اس زمانے کے ساٹھ پینسٹھ ہزار روپے ان کو کسی وراثت میں ملے تھے۔ چند سو ووٹ لاکر ہار گئے۔

پھر بمبئی چلے گئے۔ اس زمانے میں الکشن میں پانچ سات ہزار ہی خرچ ہوا کرتے تھے، چنانچہ باقی روپئے کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور داد عیش دی۔

سہیل عظیم آبادی نے تہذیب نکالا تو ادریس کو مع روپیوں کے بلالیا اور وہ تہذیب کے فنانسر ہوگئے ——— ڈی لکس ہوٹل، رمنہ روڈ پٹنہ اور شام اور ادریس اور سہیل عظیم آبادی یہ ماحول تھا

پٹنہ سے ادریس نے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی ادارت میں زینت ہفتہ وار نکالا ———

پھلجڑیاں چھوڑنا اور لڈو لڑانا ادریس کا دلچسپ مشغلہ تھا، زینت یہی کام کرتا تھا۔

روپئے ختم ہوگئے ———

ادریس گیا آگئے۔ شمسی پریس میں کام کرنے لگے اور اس کے بعد ———

میں نے سہیل کے تین نمبر ترتیب دئے ——— جو چھپا اسکو ——— جمیل مظہری نمبر، افسانہ نمبر، بھاگلپور کا ادبی ماحول نمبر ——— اور اس کے بعد بھی سہیل نکلتا رہا۔ موریہ پریس سے وہ دو سال تک کے ہے اور اب میرا یہ دوست نہیں رہا ——— کبھی موقع ملا تو ادریس پر جی کھول کر لکھونگا

ادریس کے مرنے کا غم کرنے والے اسکے لڑکے بھی نہیں ہیں اسلئے تعزیت بھی اپنے آپ ہی کو پیش کر رہا ہوں۔!

ہائے ادریس! کہاں چلا گیا؟ کیوں چلا گیا؟

:- کلام حیدری

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. No. Gy 5/84
Phone—432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

اور

کلام حیدری

PRICE Rs 20/-



دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

قائم شدہ ۱۹۶۳

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے ——— ۳۶ روپے
ایک شمارہ ——— ۳ روپے

فون نمبر ۴۳۲

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹرز
نوشابہ حق   عبدالصمد

ناشر: شہزاد انجم قمر ——— طباعت: ہند لیتھو پریس گیا

محتویات

اداریہ

کشکول

ادبی رسالے کی حیثیت سے آہنگ اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں شریمتی اندرا گاندھی کے قتل پر سوگواری کا اظہار کرتا ہے اور اس قتل سے دنیا میں ہندوستان کی جو رسوائی ہوئی ہے اس پر اظہار ندامت کرتا ہے — اندرا گاندھی کی شخصیت اور ان کے کام کسی کو پسند آ سکتے ہیں اور کسی کو ناپسند بھی ہو سکتے ہیں مگر وہ ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک تھیں اور انہوں نے غیر معمولی کارنامے بھی انجام دیئے، اس سے انکار کوئی ایمان دار آدمی نہیں کر سکتا — ہم [illegible] گی کے اظہار کے لیے اپنی جمہوریت میں گولیوں اور تشدد کے استعمال کو کبھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سازش کے تحت ایسا ہوا۔ — یہ کہہ کر ہم اپنے نکمے پن، بودے پن اور ذمہ داری کے فقدان پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔ ہم کو اپنے غیر ذمہ دارانہ کردار کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہماری غیر ذمہ داری نے اتنی اہم سیاسی شخصیت سے ملک کو محروم کر دیا [illegible] وابستہ ہمارے ملک کی روح [illegible] کا تحفظ ہمارا نظام نہیں کر سکا — یہ شرمناک اور عبرتناک حقیقت ہے، اس پر پردہ ڈالنے کی ہر کوشش قابلِ مذمت ہے۔

ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے افق پر گہرا دھندلکا چھایا ہوا ہے اس دھندلکے کے پیچھے کیا ہو سکتا ہے، یہ بتانا اور جاننا ابھی ممکن نہیں ہے۔

اس المیہ سے ایک دوسرا المیہ جو شروع ہوا وہ کسی المیے سے کم نہیں ہے، مگر نیا نہیں ہے۔ کیوں کہ فرق صرف اتنا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں بربادی اور نسل کشی جیسی کیفیت سے مسلمانوں کو دوچار رہنا پڑتا رہا ہے، اس بار یہ عذاب سکھوں پر ٹوٹا۔ اس کا مستقل سدِ باب ہونا پہلے بھی ضروری تھا جس پر ہم نے دھیان نہیں دیا، اب اس کی ضرورت کا احساس شاید زیادہ تیز ہے۔ خدا کرے ہم اپنے اندر سے فرقہ پرست اور تشدد پسند حیوان کو باہر نکال کر ہمیشہ کے لیے ختم کر سکیں۔

— کہ ہندوستان سچ مچ جنت نشان بن جائے۔

— کلام حیدری

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا کے زیرِ اہتمام ایک سوگوار شام

"اندرا گاندھی کا سازشی طور پر سفاکانہ قتل ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرزم کو چیلنج ہے۔"

——— کلام حیدری

اکیڈمی کے زیرِ اہتمام اکیڈمی کے چیرمین جناب کلام حیدری کی صدارت میں ۲ نومبر ۸۴ء کو ایک تعزیتی جلسہ مدینہ ہاؤس کے ہال میں ہوا۔ یہ ماتمی جلسہ شریمتی اندرا گاندھی کے اس قدر بے وقت اور اچانک رخصت ہو جانے پر اپنے صدمے اور سوگواری کے اظہار کے لیے ہوا۔

جلسے میں جناب کلام حیدری نے سوگوارانہ لہجے میں دو منٹ کی تقریر کی۔ جس میں انھوں نے اندرونی اور بیرونی سازشی اداروں اور افراد کی اِس مذموم حرکت پر لعنت بھیجی اور اپنے ملک کے حفاظتی انتظامات کی شرمناک ناکامی پر صدمے کا اظہار کیا اور کہا کہ :

"اندرا گاندھی کا سازشی طور پر سفاکانہ قتل ہندوستان کی [جمہوریت] اور سیکولرزم کے لیے ایک چیلنج ہے۔"

انھوں نے بتایا کہ اگر سیاسی میدان کو غنڈوں اور لوفروں کے لیے کھلا [illegible] جائے گا تو ایسے المیے کب ہو جائیں اور سیاست میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھے ہوئے افراد کیا کر بیٹھیں یہ کوئی نہیں [کہہ] سکتا۔

کوئی حکومت ہو اگر وہ اپنے [illegible] کو محفوظ نہیں رکھ سکتی تو اُسے حکومت کہلانے کا حق نہیں ہے۔

چیرمین کی تقریر کے بعد ایک منٹ تک حاضرین نے خاموش کھڑے ہو کر اندرا گاندھی کے قتل پر سوگواری کا اظہار کیا اور اس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔

حفیظ بنارسی

روشنی

(وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کے سانحۂ ارتحال پر)

ابھی ابھی تو صبح تھی یہ شام کیسے ہو گئی
کہانی ایک دور کی
یہ ایک یگ کی داستاں
تمام کیسے ہو گئی
یہ کس نے آنکھیں موند لیں، یہ کس کو نیند آ گئی
کہ آفتاب چھپ گیا
ہر ایک سمت غم کے کالے کالے ابر چھا گئے
یہ کس نے چاندنی کے اجلے پنکھ کو جلا دیا
یہ کس کے [illegible] ہاتھوں نے
چراغ [illegible] دیا
یہ کس نے [illegible] شفیق ماں کے سر سے
اس کی [illegible] اتار دی
یہ شانتی [illegible] کا جسم کس نے چھلنی چھلنی کر دیا
گلاب کی سگندھ کو
یہ کس نے زخمی کر دیا
کفن اڑھا دیا یہ کس نے باغ کی بہار کو
یہ کون ہم سے لے گیا
کمل کی اور نہرو کی حسین یادگار کو!
یہ کس نے میکدے کی آبرو پہ وار کر دیا
دلوں کے آبگینوں میں لہو یہ کس نے بھر دیا
یہ کس کی سانس اکھڑ گئی
یہ بزم جاں اجڑ گئی
یہ کیا ہوا

کہ اک اناتھ ننھے بچے کی طرح
بلک رہی ہے زندگی، سسک رہی ہے زندگی
نفس نفس ہے سوگ میں نظر نظر اداس ہے
نگر نگر دھواں دھواں، ڈگر ڈگر اداس ہے
وہ روشنی دل نشیں
جو انجمن کی جان تھی
جو پیار اور امن کا حسین تر نشان تھی
وہ روشنی
کہ جس سے کل جہان میں
ہماری [illegible] بان تھی
وہ روشنی چلی گئی، وہ روشنی چلی گئی
نہیں نہیں! نہیں نہیں
وہ روشنی بجھی نہیں
وہ شمع نور بار تھی، وہ شمع نور بار ہے
وہ روشنی تو اور اجلی ہو گئی
دل و دماغ وقت پہ
وہ ایک نقش معتبر
کچھ اور گہرا ہو گیا
وہ روشنی، وہ دل نشیں
کہاں نہیں ہے اب مکیں
کہاں نہیں ہے اس کا گھر
وہ روشنی امر ہے اب، وہ روشنی امر ہے اب

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

آل احمد سرور — یادوں کے چند سائے

سرور صاحب کا نام سب سے پہلے میں نے اس وقت سنا جب اسکول سے نکل کر نیا نیا کالج میں داخل ہوا تھا۔ میرے کالج سے متصل دارالمصنفین کی خوبصورت عمارت تھی۔ میں خالی گھنٹوں میں اکثر وہاں چلا جاتا تھا اور لائبریری میں بیٹھ کر رسائل اور کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اس کے نگراں مولوی عبدالباری صاحب خود بڑے باذوق اور صاحب نظر انسان تھے۔ وہ نوجوان طلبا کی رہنمائی اور ہمت افزائی اس طرح کرتے تھے کہ اب اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی ایک کتاب انہی کے نام معنون کی ہے اور اپنی ادبی تربیت کے سلسلہ میں ان کا نام خاص طور سے لیا ہے۔ ان سے نئی کتابوں اور نئے مضامین کے متعلق بڑی معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔ ان کی وجہ سے وہاں مطالعہ میں بڑی آسانی ہوتی تھی۔ دارالمصنفین کی فضا بھی مطالعہ کے لئے بڑی سازگار تھی۔ چاروں طرف سکون ہی سکون تھا۔ عمارتیں حسن و نفاست کا پیکر تھیں، ہر چیز سے نفاست اور خوش سلیقگی جھلکتی تھی وہیں میں نے پہلی بار سرور صاحب کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ "تنقیدی اشارے" دیکھا۔ مجھے ادبی تنقید کی جانب راغب کرنے میں اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ اس دور کے لحاظ سے ان مختصر مضامین میں جو طرفگی اور تازگی اور انداز بیان کے اعتبار سے جو دلکشی اور رعنائی تھی اس نے تنقید میں میری دلچسپی بڑھائی۔ اس کے بعد سرور صاحب کے کسی مضمون کا ذکر سنتا تو تلاش کر کے پڑھتا۔ انہی دنوں ان کا مختصر شعری مجموعہ "سلسبیل" بھی پڑھنے کو ملا جس میں غالباً تخلیقات کشمیر کے بے پناہ حسن سے متاثر ہو کر معرض وجود میں آئی تھیں۔ مجھ پر ان نظموں کا قطعی اثر نہیں ہوا۔ ان کی نثر میں جو قوت، اثر اور خوبصورتی محسوس ہوتی تھی ان کا یہاں دور دور پتہ نہیں تھا۔ البتہ اس مجموعہ میں ان کی تصویر دیکھنے کو ملی جس پر وہی اثر ہوا جو ان کی نثر کا ہوا تھا۔ چہرے سے مزاج کی نرمی اور شگفتگی، نفاست اور خوبصورتی کا اظہار واضح طور پر ہو رہا تھا۔ ان سے ملنے کی خواہش شدت کے ساتھ پیدا ہوئی لیکن اس کا موقع کئی برس بعد نصیب ہوا۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے الٰہ آباد پہونچا تو سرور صاحب علی گڑھ سے لکھنؤ جا چکے تھے۔ میں نے ان کو بعض ادبی مسائل کے متعلق خط لکھا اور ان کی رائے معلوم کرنی چاہی۔ حیرت اور خوشی کی حد نہ رہی جب انہوں نے مفصل جواب لکھا اور خط لکھنے کی تاکید کی۔ میرے ایک ہم جماعت تھے عابد کاظمی۔ وہ یونیورسٹی میں یوں تو کرکٹ کے ایک اچھے کھلاڑی کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن

چونکہ مشہور ماہر تعلیم جناب اسرار اللہ کاظمی کے بھتیجے تھے اور انہی کے ساتھ رہتے تھے اس لئے گھر کی فضا کے اثر سے ادبی سرگرمیوں سے بھی کسی قدر واقف رہتے تھے۔ انہی سے سرور صاحب کا ذکر بہت سنا تھا اور ان سے ملنے کی تمنا روز بروز بڑھتی جاتی تھی ایک دن عابد کاظمی نے سرور صاحب کے مضامین کا نیا مجموعہ "نئے پرانے چراغ" لا کر دیا۔ ابھی یہ بازار میں نہیں آیا تھا لیکن اسرار کاظمی صاحب (مرحوم) کے یہاں تحفتہً یونیورسٹی سے پہنچ گیا۔ میرے امتحان ہو رہے تھے اور اگلے دن غالباً انگریزی شاعری کا پرچہ تھا لیکن میں اس سے بالکل بے نیاز ہو کر سرور صاحب کے مضامین پڑھتا رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انگریزی شاعری کے متعلق جواب لکھتے وقت مجھے ان مضامین کے مطالعہ سے بڑی مدد ملی۔ ہوسٹل میں ایک عزیز کے یہاں ضمیر الدین احمد نام کے ایک طالب علم کا بہت آنا جانا تھا۔ وہ علی گڑھ میں سرور صاحب کے اور گورکھپور میں مجنوں صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے اور اپنے دونوں اساتذہ کا ذکر بڑی [illegible] احترام سے کرتے تھے۔ ضمیر الدین احمد کی ذہانت اور صلاحیت کا مجھ پر خاصا اثر تھا۔ افسوس کہ انہیں بعض وجوہ سے ہوسٹل چھوڑنا پڑا۔ آگے چل کر وہ پاکستان میں صحافی بن گئے۔ لیکن ان کو اصل شہرت افسانہ نگار کی حیثیت سے ملی۔ اپنی تلون مزاجی کی وجہ سے وہ افسانہ نگاری کے میدان میں بھی زیادہ دن تک نہیں ٹھہرے حالانکہ بہت کم مدت میں ان کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی تھی وہ اچھے اچھے فنکاروں کے لئے باعث رشک تھی۔ ان کی زبان سے سرور صاحب کا ذکر سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اشتیاق بڑھ گیا اور اس کی نوبت اس وقت آئی جب میں علی گڑھ پہنچا۔

ایک دن سویرے سویرے خلیل اور باقر میرے کمرہ پر پہنچے اور کہنے لگے کہ سرور صاحب نے آپ کو رشید صاحب (پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم) کے مکان پر ملنے کے لئے بلایا ہے۔ جلدی جلدی تیار ہو کر بھاگا۔ خلیل اور باقر بھی ساتھ گئے۔ سرور صاحب اسی قدر شفقت اور محبت سے پیش آئے کہ ان لمحوں کا اثر لازوال بن گیا ہے۔ زیادہ تر میرے ادبی اور تعلیمی مشاغل کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میرے بارے میں احتشام صاحب سے ان کی گفتگو ہو چکی تھی۔ ان کو اس بات کا افسوس تھا کہ میں لکھنؤ جا کی غرض سے جا کر واپس چلا آیا۔ انہوں نے کچھ ایسے ادبی موضوعات کی طرف توجہ دلائی جن پر یا تو نہیں لکھا گیا ہے یا اتنا نہیں لکھا گیا جتنا لکھا جانا چاہئے تھا۔ ان موضوعات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر روشنی ڈالی اور ہم لوگوں کو ان پر کام کرنے کے لئے کہا۔ اسی گفتگو میں انہوں نے فانی مرحوم کا ایک دلچسپ لطیفہ بھی سنایا جس کی لذت سے ذہن آج تک سرشار ہے۔ فانی بدایونی سے حیدرآباد میں ایک صاحب ملنے آئے اور کہنے لگے حضور اب تو ہندوستان میں تین ہی غزل گو رہ گئے ہیں۔ آپ، جگر صاحب اور صاحبزادہ میکش۔ فانی نے بڑا ہی طنزیہ مگر دلچسپ جواب دیا۔ بھائی میرا نام تو آپ نے ناحق لے لیا میں کیا اور میری غزل گوئی کیا، جگر صاحب بھی کچھ یونہی سے لگتے ہیں۔ اب تو بس میکش ہی میکش ہیں۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا، ہم لوگ اجازت لے کر اپنے اپنے گھر واپس آئے۔ شام کو جب ہم لوگ اسٹیشن ان کو رخصت کرنے گئے تب بھی سرور صاحب مضامین لکھنے کی ہدایت کرتے رہے۔

اس کے بعد سرور صاحب جب بھی علی گڑھ آتے میں ان سے ملنے ضرور جاتا اور وہ ہمیشہ اسی شفقت و محبت سے پیش آتے۔ ایک بار انجمن اردوئے معلیٰ کے ایک جلسہ میں ان کو تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ میں بھی تقریر سننے چلا گیا۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ماہر طبیعیات ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی فرمائش پر سرور صاحب نے ترقی پسند نظریۂ فن پر تقریر کی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر کچھ دنوں کے لئے سائنسی تحقیق کے ڈائرکٹر کا

عہدہ قبول کرلیا تھا اور اقبال قادری صاحب کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ وہیں سرور صاحب کے چھوٹے بھائی اولاد احمد صدیقی (ابو شعبہ معاشیات میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہیں) رہتے تھے۔ اولاد صاحب ہم لوگوں کے بہت اچھے دوست تھے۔ شریف اور نیک انسان ہونے کے ساتھ علم و ادب سے بہت شغف رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے کمرہ میں رضی الدین صدیقی صاحب بھی آجاتے اور ادبی گفتگو میں شریک ہوتے۔ اکثر سوال کرتے بھائی یہ ترقی پسندی کیا چیز ہے۔ ذرا مجھے بھی تو سمجھاؤ۔ بہرحال سرور صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔ میں بھی اپنے موقع کا منتظر رہا مگر امید بر آنے کی جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو ناچار وہاں سے نکل کر ہوسٹل کا رُخ کیا۔ اتنے میں خلیل صاحب کی آواز سنائی دی۔ کہاں چلے حضرت، سرور صاحب بلا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ چلنا ہے۔ پھر تو راستہ بھر جی بھر کے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اسی دن ڈاکٹر رام بلاس شرما کے کسی تازہ ترین مضمون کے حوالے سے علامت اور استعارہ پر بات چیت ہوئی۔ ان کے وسیع مطالعہ اور گہری نظر کا اندازہ ہوا۔

لکھنؤ میں ایک دفعہ باقر مہدی کا مہمان تھا۔ ان کے ساتھ سرور صاحب سے بیربل روڈ والے مکان پر ملنے گیا۔ وہ نیا دور (بنگلور) کے مطالعہ میں محو تھے اور اس وقت اپنی تنقید نگاری پر عطا محمد شعلہ (مرحوم) کا مضمون پڑھ رہے تھے۔ میری نظر سے یہ مضمون گزر چکا تھا۔ شروع سے آخر تک سرور صاحب کی ادبی اور تنقیدی نظر کی سخت مخالفت کی گئی تھی اور اُن کو ادنیٰ درجہ کا نقاد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے اس مضمون کے بارے میں سرور صاحب کا ردِ عمل جاننے کی کوشش کی تو انہوں نے بس اتنا کہا کہ عطا محمد صاحب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ان کی باتوں سے کسی طرح کی تلخی اور ناگواری کا احساس نہیں ہوا۔ یہ توازن اور ضبط ان کے مزاج کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کیونکہ اس کے بعد بھی میں نے کئی موقعوں پر انہیں اس کا حامل پایا اگرچہ صورت حال ایسی تھی کہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ممکن تھا۔

بہت دنوں تک ان سے ملاقات کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ مشرقی یو پی کے ایک کالج میں لکچرار ہو چکا تھا اور ذاتی حالات کچھ ایسی شکل اختیار کر چکے تھے کہ غمِ دوران کار و بارِ شوق کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد لکھنؤ گیا تو احتشام صاحب (مرحوم) سے ملنے گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سرور صاحب کے مکان پر لے گئے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ تھا۔ سرور صاحب نے مجھے بہت دنوں بعد دیکھا تھا اس لئے ایک نظر پہچان لینا آسان نہیں تھا۔ احتشام صاحب مرحوم نے بتایا تو انہوں نے پاس بلا کر بٹھایا اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس جلسے میں مسز سروپ کماری بخشی نے کہانی پڑھی تھی جس پر ڈاکٹر محمد حسن نے اچھی خاصی تقریر کی تھی۔ سرور صاحب نے خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ جب تک لکھنؤ میں رہوں ان سے ملتا رہوں لیکن میری مشغولیت کچھ ایسی رہی کہ ان کی خدمت میں ایک دن بھی حاضر نہیں ہو سکا۔ چنانچہ چند ہی دنوں بعد اعظم گڑھ میں ایک ادبی جلسہ میں شرکت کے لئے جاتے وقت شاہ گنج اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہو گئی، کہنے لگے احتشام صاحب نے آپ کو اکبر پور ہی میں دیکھ لیا تھا اور یہاں لکھنؤ میں تو آپ اس دن کے بعد اس طرح غائب ہوئے کہ جواب نہیں۔ میں سر جھکائے اظہارِ ندامت کرتا رہا۔ اعظم گڑھ میں شبلی منزل میں جب ان لوگوں سے ملنے پہونچا تو فراق صاحب موضوعِ گفتگو تھے۔ فراق صاحب نے ان لوگوں کو خط لکھا تھا کہ سردار جعفری کے خلاف بیانات دیں ورنہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں گے۔ فراق صاحب بھی مشاعرہ کے افتتاح کے لئے آ چکے تھے۔ سرور صاحب اور احتشام صاحب دونوں فکرمند تھے کہ ملاقات ہوتے ہی وہ اس سوال کو اٹھائیں گے۔ میں نے فراق صاحب کی وکالت کرنے کی کوشش کی تو سرور صاحب نے واضح الفاظ میں پوچھا کہ سردار کی کس بات

سے آپ کو اختلاف ہے۔ میں کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکا۔ احتشام صاحب نے مجھے اردو میں فلسفۂ جدید کی ایک تاریخ آسان اردو میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہا چھپے گا کون؟ سرور صاحب نے کہا اس کے اہتمام کی ذمہ داری میری ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی ادبی اور علمی کاموں کی طرف توجہ دلائی لیکن اسے میری کم ہمتی کہئے یا حالات کی ناسازگاری کہ سارے خواب خواب ہی رہ گئے۔

ایک لمبے عرصے کے بعد سرور صاحب سے علی گڑھ میں اس وقت ملاقات ہوئی جب میں اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لے کر یونیورسٹی میں داخل کرنے کے بعد روزگار کے سلسلے میں چکر لگا رہا تھا۔ سرور صاحب اس زمانے میں صدر شعبہ اردو تھے اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری۔ ان سے مدد چاہی تو انہوں نے سید حسن صاحب کے نام ایک سفارشی خط دیا اور فلسفہ کے نامور پروفیسر ڈاکٹر این۔ کے۔ دیوراج سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اپنی حوصلہ افزا باتوں سے بھی انہوں نے اس بحرانی دور میں مجھے بڑا سہارا دیا۔ خلیل صاحب نے "ہماری زبان" کی ادارت کے لئے میرا نام لیا تو سرور صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میرے "بہتر مستقبل" کے پیش نظر مجھے اس کام میں الجھنا مناسب نہیں ہے۔ مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ ایک روز شام کے وقت گھر پر حاضر ہوا تو جواب ملا کہ یونیورسٹی میں ہوں۔ شہریار نے بتلایا کہ دیوراج صاحب سرور صاحب کے کمرہ میں باتیں کرتے نظر آئے تھے۔ میں نے فوراً وہاں پہنچ کر کمرہ میں داخل ہونے کے لئے اجازت مانگی تو انہوں نے کہا کہ کسی اور وقت مل لیجئے گا۔ ذہن میں ان کی ساری "حوصلہ افزا" اور "دلنواز" باتیں گھومنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر شئے بدلی بدلی سی نظر آنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہاں میرا گذر نہیں۔ دنیا ترقی کرتی جا رہی ہے اور میں وہیں کھڑا حیرت سے گذرتے ہوئے لمحات کو تک رہا ہوں۔ جہاں پہلے کھڑا تھا۔

کیا یاد کر کے روئیں اب اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

ڈاکٹر عبد المنان

مجروح سلطانپوری ــــ غزل کا ایک منفرد شاعر

تمام ترقی پسند شاعروں میں معتبر، باوقار اور پُراثر نام مجروح سلطانپوری کا ہے۔ مجروح سلطانپوری صاحب نے اردو غزل کو تیکھا پن اور طرحداری بخشی۔ ان کے یہاں طرحداری اور تیکھا پن زندگی سے گہری وابستگی سے پیدا ہوا ہے۔ حیات و کائنات کے تسلسل کا احساس اور تاریخی قوتوں کی کارفرمائی کا تصور مجروح کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ ان کا مقصد تجربہ کی معنویت کو آشکارا کرنا ہے لیکن اس عمل میں وہ فن کی نزاکتوں اور اس کے ارتعاش سے غافل نہیں ہوتے بلکہ انہیں احساس ہے کہ فن کی بڑائی فنکار کی اپنی نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے ایک مربوط اور پختہ تجربہ ہوتا ہے اور یہ تجربہ اپنے پہلو میں تہہ داری و متعدد لہریں رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کا مقصد تلقین و تبلیغ نہیں ہوتا بلکہ تخلیق ہوتا ہے۔ ادب کا مقصد فلسفہ کا اظہار، نہ مذہب کی تبلیغ اور نہ کسی نصب العین کا پرچار ہے۔ اگر یہ کسی آئیڈیالوجی، فلسفہ یا مقصد کے پرچار کا محض ایک آلہ بن کر رہ گیا ہے تو اس میں روح باقی نہیں ہے بلکہ محض نعرہ بازی یا اشتہار ہے۔ ادب کا مقصد تخلیقی تجربے کی ترسیل ہے اس کی اہمیت جمالیاتی حظ کی وجہ سے ہے۔ بڑی شاعری، بڑے نظریے یا فلسفے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان گلگفتہ کارفرمائیوں کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ بقول آلِ احمد سرور ـــــ

"ادب تلقین نہیں تخلیق ہے۔ یہ Saying نہیں ہے Making ہے۔ ادب کی قدر و قیمت اس بات سے متعین نہیں ہوتی کہ وہ صحیفۂ اخلاق یا سماجی دستاویز ہے۔ ادب خود اخلاقی ہے اور وہ اپنے طور پر سماجی بصیرت بھی دیتا ہے۔"

مجروح سلطانپوری کی غزلوں کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انہوں نے خیالی دنیا کی پرچھائیوں سے دور حقیقی دنیا کے نقوش ابھارے ہیں اور وہ ہر ممکن سماجی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اردو غزل جیسے گل و بلبل کی داستان سرائی کا ایک ذریعہ تھی، زلفِ یار کی الجھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ یا طولِ شبِ فراق کی پیمائش میں عمریں تمام کر رہی تھیں، نئے عصری تقاضوں کے بار کو برداشت کرنے سے بیگانہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے مزاج میں بدلتے ہوئے عصری تقاضوں کو اخذ کرنے کی پوری صلاحیت موجود تھی، وہی شعراء اس کا دم بھرتے تھے جو وقت کی رفتار کا شعور رکھتے تھے۔ اور اس کو

غزل کے دامن میں پناہ دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ ہر عہد اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے جو اقتضائے عہد کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ غزل ذاتی تجربے کی TEST کو داخلی تاثر کی صورت میں منکشف کرتی ہے۔ وہ تجربے سے حاصل شدہ تاثر کی کیفیت کو پیش کرتی ہے۔ مجروح سلطانپوری نے مذکورہ اصول سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں تجربے میں تہ داری ہے اور اس کے اظہار میں مکمل ہم آہنگی۔ انہوں نے اپنے معاشرتی اخلاقی معیار اور سماجی زندگی کو جس انداز سے ہچکولے کھاتے دیکھا، اس کا اظہار ایک ایسے صحافی کی طرح نہیں کیا جو جائے وقوعہ پر خود ہوتا ہے اور تمام واقعات کی رپورٹنگ کر دیتا ہے۔ بلکہ ایک ایسے فنکار کی طرح کیا جو جذبے اور تخیل کے نہاں خانہ کی آنچ میں پگھلا کر ایک نئی شکل عطا کرتا ہے جو تخلیقی صفت کی حامل بھی ہوتی ہے اور حقیقی دنیا کی پرچھائیں بھی۔

مجروح سلطانپوری نے حیات و کائنات کے تسلسل کا احساس اور تاریخی جبر و قدر کے تصور کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس تصور نے انسانی زندگی اور سماج کو مادی تسلسل کا نام دیا ہے۔ مجروح نے انسانی زندگی کے مادی تسلسل کا کامیاب اظہار کیا ہے ؎

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشانِ سربلندی — یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی قبائیں
نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروانِ حیات — یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

مجروح سلطانپوری کے یہاں عظمت انسانی کا شعور مکمل طور پر جاں گزیں ہے جو تاریخی شعور سے پیدا ہوا ہے۔ انہیں احساس ہے کہ انسان مادی حالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور وہ اپنی تقدیر کا خود معمار ہے۔ وہ اہل ثروت کے اور اہل اقتدار کے جبر و قہر کا شکار ضرور ہے لیکن مستقبل محنت کشوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جن حالات سے دوچار ہیں ان میں جبر و استبداد کی سیاہی بکھری ہوئی ہے۔ منافرت اور مایوسی کے جال پھیلے ہوئے ہیں۔ اور محنت کش طبقہ صاحب اقتدار اور سرمایہ داروں کے بنائے ہوئے زندانوں میں مقید ہے لیکن یہاں بھی روزن دیوار سے مستقبل کی کرن در آئی ہے۔ زندانِ استبداد کے دروازے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے آہنی قفل کو توڑنا آسان ہو جاتا ہے اور بالآخر یہ طبقہ دھرتی پر پھیل کر زمین کو مرقع کے بیچ بو دیتا ہے، نئی صبح کے ترانے گاتا ہے۔ اقتدار کے خلاف صدائیں بلند کرتا ہے اور جبر و قہر کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے۔ گو اس راہ دشوار سے گزرنے میں بڑی رکاوٹیں پیش آتی ہیں لیکن اس راہ کے مصائب میں تاریخ کا شعور رکھنے والے اپنی لگن کو ہی قائم رکھتے ہیں۔ وہ حال کے اندھیرے میں مستقبل کے اجالے کو دیکھتے ہیں۔ اللہ کے مظاہر ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور وہ ویرانے میں بھی پھول کھلانے چلے جاتے ہیں۔ مجروح سلطانپوری کی غزلوں میں ایسے بے شمار مضامین ملتے ہیں۔ لیکن ایسے روکھے پھیکے اور تیز و تیکھے مضامین کو غزل میں پیش کرنا اور کلاسیکی رچاؤ، مکمل نغمگی اور نرم سجاوٹ و رمزیت کے ساتھ بڑا مشکل فعل ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فنی بصیرت اور تخلیقی تجربے کی ترسیل چاہیئے۔ مجروح سلطانپوری کو قدرت نے یہ ملکہ ودیعت کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن ـــــ

" مجروح غزل میں کلاسیکی آئین و آداب کے قائل ہیں۔ نغمگی و مرقع سازی ان کا فن ہے اور اس کے لئے ساز و برگ وہ روایت کے عمیق نقش و نگار سے ساز کرتے ہیں۔ اس لئے سجاوٹ ان کی غزلوں میں محض تراکیب یا تشبیہ سازی سے عبارت نہیں ہے بلکہ ہلکے پن اور البیلے پن کا نام ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن صاحب مجروح کی شاعری کو جس سجیلے پن اور البیلے پن سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل ان کی کلاسکیت اور سیاسی رمزیت ہے جو نہایت ہی دردمندی و دل نوازی میں ڈوبی ہوئی ہے جہاں نئی توانائی اور عزم پیدا کرنے کا وصف اور نئے انقلابی نظریے کے لئے شعور کو غزل کی رمزیت میں سمونے کا کمال ہے۔ مجروح کی سیاسی رمزیت اردو کی کوئی نئی چیز نہیں۔ اقبال سہیل، جگر مرادآبادی، معین حسن جذبی اور فیض جیسے قادرالکلام شاعر برتتے چلے آرہے تھے۔ لیکن فیض اور مجروح کے یہاں اس تجربے کی نوعیت جداگانہ ہے۔ مجروح کے تجربے کی عمر مختصر ہے لیکن فیض کے تجربے کی عمر طویل ہے۔ اس لئے یہ تجربہ ان کے یہاں پوری زندگی بن گیا۔ مجروح کی اس نظریاتی شاعری کو سمجھنے کے لئے ترقی پسند نظریہ سے واقفیت ضروری ہوگی۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب جس سے ساری دنیا میں عوامی تحریک کے دھارے پھوٹ بہے اور ایشیا کے محکوم ممالک اپنی گہری نیند سے چونک اٹھے۔ دوسری جنگ عظیم جس نے پورے یورپ میں بے چینی کی لہر پیدا کر دی اور ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کی سرکردگی میں فاشزم نے سر اٹھایا اور پورے یورپ کو ایک سیاسی بحران سے گزرنا پڑا۔ اس کا اثر ہندوستانی طلبا پر بھی پڑا جو یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں اندرونی سطح پر استحصال، دربدری، منافرت اور طبقاتی کشمکش کا بازار جس انداز سے گرم تھا اس کا ہندوستانی عوام کی زندگی پر گہرا اثر پڑ رہا تھا اور انقلاب زیریں لہروں کی صورت میں انگڑائیاں لے رہا تھا لیکن اسے منظر عام پر لانے اور انسانی فلاح و بہبود کی خاطر استعمال کرنے کے لئے نوجوانوں کا ایک اہم عنصر چاہئے تھا جس میں جہان تازہ کی تخلیق کی پوری صلاحیت ہو۔ یورپ کے بڑے انقلابات کے اثرات ساری دنیا پر پڑ رہے تھے۔ یہ ایک ایسی سیاہ بدلی تھی جو نہ صرف یورپ کے آسمان پر چھائی رہی بلکہ اس کے مختلف ٹکڑے ہوا کے دوش پر ایشیا کے مختلف ممالک میں بھی پھیل گئے۔ ہندوستان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لہٰذا ایک نئی تبدیلی کے احساس اور ایک نیا معاشرتی نظام کی تشکیل کے خیال نے ہندوستان کے ادیبوں کو ایسے ادب کی تخلیق کی طرف مائل کیا جو زندگی کی صداقتوں سے پر ہو اور سماجی و تاریخی ماحول کی ایسی بھرپور عکاسی ہو کہ جس میں سچائیاں رقص کر رہی ہوں۔ اور اس کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت اور روحانی مسرت کی افادیت ہو۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ـــ

> "ہر اچھے ادب کی مشترک قدریں، صداقت، حسن اور خیر کے عناصر ہیں۔ ان حقائق کی تلاش و تحقیق میں زندگی کے نو بنو مظاہر تک رسائی حاصل کرنا، ان کی تہوں کو کھولنا اور ان سے پیدا شدہ ردعمل کو اپنی شخصیت میں جذب کر کے اپنی تخلیقی قوت سے ان حقائق کو ایک نیا پیکر دینا ہر اچھے فنکار کا منصب رہا ہے۔"

ترقی پسند تحریک ایک مثبت نظام حیات کا نام ہے جس کے آغاز کا مقصد انسانی فلاح اور سماجی نظام کی پرورش تھا۔ جن افراد نے ترقی پسند نظریات کو ادب کے دامن میں پناہ دی ان میں معدودے چند ایسے ہیں جو سماجی بصیرت، فکری نظام اور اجتماعی زندگی کا شعور رکھتے ہیں۔ مجروح سلطانپوری کا ان ہی لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے سماجی و سیاسی افکار کو نئے رمز و ایما کی قبا زیب تن کرا کے محفلِ ادب میں لا کھڑا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجروح کی غزلوں میں سیاسی نعرہ بازی اور جوش و ولولے سے بھرپور صداؤں کی تلاش بے سود ہے۔ وہ ہر گام پر تغزل کے دامن کو نہیں چھوڑتے۔ ان کا فن اپنے پورے شباب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ نجی تجربے کے عطر کو داخلی تاثر کا لباس عطا کرتے ہیں۔

ان کے ہاں تجربہ صرف تجربہ نہیں بلکہ تخلیق کا خوبصورت پیکر ہے جو مجروح کی شاعرانہ ہمدردی کا بین ثبوت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ترقی پسندوں کی صف میں اپنی متاع فکر لئے ایسے بیشمار شعراء ادبا بھی کھڑے ہیں۔ جن کی تخلیقات نے وقتی ہنگامہ خیزی کے اسباب مہیا کئے۔ نوجوانوں میں عارضی جوش و تموج پیدا کیا لیکن ایسی برق نہیں سموئی جو ہمہ وقت زندگی کی شادابی کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک براہ راست خطیبانہ انداز، سیاسی ہنگامہ خیز موضوعات اور وسیع تر حرکت کے بجائے وقتی طریق کار سے تعبیر کی گئی اور لوگوں نے اس کے منصب و موقف پر اعتراضات کئے۔ لیکن ذرا وسیع تر تناظر میں ترقی پسند تحریک کو دیکھنے کی کوشش کی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک نام ہے ـــ

[1] "فکر و احساس کے ایسے اظہار کا جو انسان میں سماجی تبدیلیوں کی خواہش بیدار کرے اور حیات و کائنات کو صحت مند طریقہ سے پرکھنے اور ان کی تہوں میں ڈوبنے کا عزم پیدا کرے۔ ترقی پسند تحریک نام ہے سماجی انجماد کو توڑ کر فرد کو صدیوں پرانے اور ظالم استحصال نظام سے نجات دلانے کا اور ایک ایسی آزاد فضا میں پرواز کرنے کا جہاں زندگی تمام جبر و اختیار اور قیود و بند سے آزاد ہوتی ہے۔"

ترقی پسند تحریک کے شباب کے زمانہ میں جب ہندوستان کے مختلف شہروں میں کانفرنسیں ہو رہی تھیں اور نوجوان ادیب و شاعر ایک پلیٹ فارم پر آکر سماجی زندگی کے منصب اور مقاصد کو اجاگر کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، رابندر ناتھ ٹیگور نے الہ آباد کانفرنس میں نوجوان ادیبوں کے نام اپنا پیغام بھیجا تھا اور ان کے حوصلہ افزا اقدامات کو سراہا تھا اور یہ لکھا تھا ـــ

[2] "قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سوگند جب تک ہر انسان نہ کھائے گا اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تم یہ کرنے کے لئے تیار ہو تو تمہیں پہلے اپنے متاع کھلے ہاتھوں لٹانی ہوگی اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دنیا کے کسی معاوضے کی تمنا کرو۔ لیکن اپنے کو لٹانے میں جو لطف ہے اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ.......... یاد رکھو تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی کو اتار دو۔ کلی کی طرح سمٹ ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کر دو۔ پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے۔ روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔"

صرف رابندر ناتھ ٹیگور پر ہی کیا اکتفا اس عہد کے تمام بیباک فنکاروں نے ترقی پسند تحریک کو سراہا اور اس کی صالح قدروں کی داد دی۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے پریم چند نے ترقی پسند ادیبوں کو بڑے حوصلے دئیے اور ادب کی غائت و غرض پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے بہ آواز بلند اعلان کیا کہ اب ادب کے حسن کے معیار کو بدل دینا چاہئے لیکن اس دور کے ترقی پسند نوجوانوں کے سامنے یہ بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے مخصوص نظریات کی وضاحت کے لئے کس انداز سے فنی تجربے پیش کئے جائیں۔ ظاہر ہے ادب کا بنیادی مقصد تخلیق ہے اور زندگی سے ہم رشتہ ہونے کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

ع۱ سجیلا غزل گو۔ مجروح سلطانپوری ـــ از محمد حسن ـ عصری ادب

ع۲ اردو میں ترقی پسند تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۶۴

ایسی صورت میں فنی رنگ و آہنگ کا عرفان اور ادبی لطافت و حسن کا ادراک اور آرٹ کے تمام تر لوازمات پر گہری نظر ادیبوں اور شاعروں کا پہلا فرض ہے جس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر عظیم ادبی شاہکار کی تخلیق ممکن نہیں۔ ترقی پسند ادیبوں میں مجروح سلطانپوری ایک ایسے کامیاب شاعر ہیں جنہوں نے اس تحریک سے گہری اور جذباتی وابستگی کے ساتھ ساتھ فن کی نزاکتوں کا خیال رکھا اور اسے کامیاب طور پر برتنے کا عمدہ ثبوت دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سیاسی افکار میں بھی شعریت، فنی حسن اور تغزل کی شان برقرار رہتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغِ راہ کیے خونچکاں جبینوں کو

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروح سلطانپوری نے شاعری کا آغاز ۱۹۳۵ء میں کیا۔ ابتدائی زمانہ میں چند روایتی غزلیں کہیں۔ ان میں تغزل کے پورے آداب برتے گئے اور روایتی شاعری میں ہنرمندی کا کمال دکھایا گیا۔ سیاسی اور سماجی موضوعات بھی پیش نہیں کئے گئے لیکن جب یہ کام منہ سے لگ گئی تو آج تک نہیں چھوٹ سکی۔ بلکہ اس میں روز افزوں ترقی ہوئی۔ اگر چھوٹ جاتی تو مجروح کے شاعرانہ ہنر کے جوہر ہم سے مخفی نہ ہوتے۔ ۱۹۴۲ء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے توسط سے علی گڑھ آئے اور باقاعدہ غزل کی ابتدا کی۔ ۱۹۴۵ء میں جگر کے وسیلے سے بمبئی فلم انڈسٹری تک رسائی ہوئی اور ۱۹۴۶ء میں باقاعدہ طور پر ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں شامل ہوئے۔ اتفاق سے بمبئی میں چند جیالے ترقی پسند مصنفین جمع تھے۔ اور اپنے انقلابی و ترقی پسندانہ نظریات پیش کر رہے تھے۔ مجروح ادب کے میدان میں اپنے کامیاب شعر کا ثبوت دے چکے تھے۔ انہیں جگر، رشید احمد صدیقی اور ... سے حوصلے مل چکے تھے۔ یہ حضرات غزل کے بے انتہا دلدادہ تھے۔ بمبئی کی فضا کا تقاضہ کچھ اور تھا۔ مجروح کے سامنے بڑا سوال تھا کہ وہ غزل کے ذریعہ نئے تقاضوں کا اظہار کس طرح کیا جا سکے گا۔ لیکن غزل کی کیفیت اور اس کی لطافت و نزاکت چونکہ مجروح کی طبیعت کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی تھی اور سیاسی و ترقی پسندانہ

نظریات سے وابستگی ایک اہم فرض تھا۔ اس لئے مجروح نے دونوں کے حسین امتزاج اور انضمام سے اپنی شاعری کے نگارخانے سجائے اور اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

"یہ وہ زمانہ ہے جب غزل کے خلاف ہر طرف سے حملے شروع ہو گئے تھے۔ الزام یہ تھا کہ غزل زندگی کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مگر میں نے میر، غالب کی روایات اور حسرت، مجاز اور جذبی کے اشارات کی روشنی میں سیاسی اور سماجی مضامین کو غزل بنا کر غزل میں پیش کرنا شروع کیا۔"

غزل اپنی لغوی اور اصطلاحی دونوں مفاہیم کے اعتبار سے جن تقاضوں کی متحمل تھی ان کو برتنے کے لئے مجروح کے سامنے ایک [illegible] اور بڑی رکاوٹیں تھیں۔ زمانے کا تقاضہ کچھ اور تھا اور غزل کی دنیا کچھ اور تھی۔ مجروح بہت سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور تھے کہ وہ کون سی راہ اختیار کریں کہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی تقاضوں کا اظہار غزل کے ذریعہ کریں۔ ان کے ساتھ حسرت، مجاز، جذبی اور جگر وغیرہ کی مثالیں تھیں۔ انہوں نے ڈوب کر اثر قبول کیا اور سیاسی موضوعات کے اظہار کا ایک منفرد انداز اختیار کیا اور اس میں انہیں جو کامیابی ملی وہ یقیناً ان کی انفرادیت کی پہچان ہے۔ مجروح لفظوں کے دروبست اور ان کی صوتی و صوری کیفیتوں سے آشنا ہیں۔ ہم آواز حرفوں سے ترنم پیدا کر کے تفہیم کی دنیا کو [illegible] مجروح کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ وہ سیاسی اور سماجی موضوعات یا فکری نظریات میں بھی لفظوں کے صوتی آہنگ اور ہم آواز حرفوں کے برمحل استعمال سے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بلا کی نغمگی، موسیقیت اور [illegible] ہے جو جذب و دل کے گریباں کو تھام لیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہاتھ پھیرتے آخر کب تک دستِ عزیزاں [illegible]　　　اسی کو سونپ کر ہم تو کلاہ نام و ننگ آئے

وہ تو گیا یہ دیدۂ خوں بار دیکھئے　　　دامن پہ رنگ پیرہن یار دیکھئے

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ مجروح نے اپنی شاعرانہ زندگی کی ابتدا غزل ہی کی ٹھنڈی چھاؤں میں کی۔ لیکن جوں ہی شعور و فکر کے صحن میں آئے اور رنگین نوائی اور دلربا رعنائیاں کچھ دیر دیوار سے آزاد ہوئے تو اپنے سامنے ہندوستان کے عجیب انتشار کے مناظر اور مختلف کیفیتیں دیکھیں جن سے فرار اختیار کرنا، ذہنی طور سے چشم پوشی کرنا تصور کیا۔ ترقی پسند تحریک کا غلغلہ بلند تھا اور اس [illegible] سے نکال کر پناہ لے رہے تھے۔ انہوں نے بھی پناہ لی لیکن ترقی پسند [illegible] کا اشتہار اور اس کے [illegible] کا پرچار ان کا مقصد نہ بن سکا۔ اس تحریک سے فرار اختیار کرنا بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اس تحریک سے گہرے طور پر متاثر بھی تھے اور [illegible] ادبیت کا اور اخلاقی قدروں کا وسیلہ بھی سمجھتے تھے۔ لیکن وہ اشتراکی نظریات، اعلیٰ انقلابی تصورات اور [illegible] کی متاع [illegible] انجمن ترقی پسند مصنفین کے دیار میں گنہگار کی طرح کھڑے نہیں رہے بلکہ وہ [illegible] دشمن میں [illegible] اور انہوں نے فن شاعری سے پوری طرح وفادار کی طرح ڈٹے رہے اور انہوں نے غزل شاعری سے [illegible] وفاداری کا ثبوت دیا۔ ان کی کلاسکی رچاؤ اور غزل کے نیا [illegible] طرح جلوہ [illegible] ہیں:

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیر بام و در　　　میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کیا نہ جائے

جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو — مجروح سے تو سارے کو قاتل کہا نہ جائے

ہٹ کے روش یار سے تزئین عالم کر گئیں — وہ نگاہیں جن کو اب تک رائیگاں سمجھا تھا میں

چند ایسی بھی غزلیں کہیں جو بعض مقامات پر مزدوروں کے جلسے میں پڑھی گئیں۔ چند غزل کے فارم میں گیت لکھے اور انہیں بھی مزدوروں کے جلسے میں سنائے۔ ان میں انھوں نے نظریات کو فوقیت دی اور کچھ اس انداز سے اظہار کیا کہ فن کے کم خوابی دامن تار تار ہوئے۔ یہاں مزدوروں کی حمایت کی آواز تیز ہوتی نظر آئی اور کسی منصب کے اظہار میں اس قدر کھو گئے کہ انہیں غزل کے مزاج کا خیال کم رہا۔ ایسی تخلیقات محض دال میں نمک کے برابر ہیں جن کی بنا پر مجروح کی خوبصورت شاعرانہ عمارت کے ستون نہیں گرائے جا سکتے۔ بظاہر مجروح جس نظریہ سے وابستہ تھے اور حکومت کے مظالم کا جو انداز تھا اس کا تقاضہ بھی تھا کہ وہ اپنی آواز تیز کر دیں۔

مجروح سلطانپوری واردات قلب اور عشق کی ہمہ گیر کیفیتوں کی ترجمانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ حسن و عشق کا خوبصورت مرقع پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں حسن کی تصویریں بڑی دلآویز ہیں۔ آلودگی، جنسی تلذذ اور نفس کی بھوک کا فقدان ہے بلکہ حسن مقصود حیات ہے اور جمالیاتی انبساط کا ایک ایسا معروضی انداز ہے جو محبوب سے محبت کرنے کا جذبہ تو پیدا کرتا ہے لیکن عاشق اور معشوق کے درمیان میں ایک باوقار فاصلہ برقرار رہتا ہے۔ ان کے یہاں سرمستی اور سرشاری کے باوجود آلودگی نہیں ہے۔ وہ حسن کو دور سے دیکھنا اس سے محظوظ ہونا اور اسے اپنی زندگی کا حاصل بنانا چاہتے ہیں لیکن رسوا نہیں کرتے۔

دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامنی — نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

وہ بعد عرض مطلب ہائے رے شوق جواب اپنا — کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

دور دور وہ مجھ سے اس طرح خراماں ہے — ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے

جذبات کی لہریں جب الفاظ کے ساحل سے ٹکراتی ہیں تو محبت کی داستانیں سنا جاتی ہیں۔ محبت ایک مقدس جذبہ اور ہر لمحہ اپنی آگ میں جلتے رہنے کا وسیلہ ہے۔ یہاں نگاہیں بڑی خاموشی سے اپنا افسانہ سنا دیتی ہیں۔ محبت کی انتہا یہ بھی ہے کہ عرض مطلب کے بعد شوق جواب کا حال یہ ہے کہ خاموشی بھی اپنی داستانیں سنا جاتی ہے۔ مجروح نے محبت کو رسوائی سے بچایا اور کبھی معشوق کی جواب میں خاموشی کی زبان سے ہزاروں داستانیں سنیں۔ محبوب کی اداؤں پر مر مٹنا بہتوں کو آتا ہے۔ لیکن ان اداؤں کو مقصود حیات بنانا بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ مجروح نے ادائے محبوب کی پرستش کی۔ یہ اور بات ہے کہ پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن ان کی لطف اندوزی کا جنس تلذذ کا پیش خیمہ نہیں ہے۔

مجروح سے قبل عشقیہ جذبات کی ترجمانی میں جن شاعروں نے اپنے فن کے ذریعے صداقت اور تجربے کی تمام تر تعلقات

پناہ دینے کی کوشش کی۔ ان میں غالب سے لے کر مجاز، جگر اور فیض تک ایسے اہم نام ہیں جن کے یہاں محبت کا ارضی اور مادی تصور پوری سچائی کے ساتھ ابھرتا ہے اور اس میں وسعت پیدا کی ہے۔ نیز تجربے کی صداقت کے اظہار سے اردو غزل کو خیالی دنیا سے ہٹ کر حقیقی دنیا کے قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجروح نے جن غزل گوؤں کی ٹھوس مثالیں پائی تھیں اور ماضی کی اہم روایتوں کے سہارے اسی دیار سے وابستہ رہ کر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی راہیں ہموار پائی تھیں لیکن انہوں نے بھی اپنی ایک الگ راہ نکالی تھی۔

مجروح جب باقاعدہ طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو اس تحریک سے وابستہ دیگر شعرا کی طرح کہیں کہیں اپنی آواز بلند کر دی۔ نتیجے کے طور پر فن کی جمالیاتی قدروں کو اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیا جس کی بنا پر سطحیت جلد نمایاں ہو گئی۔ بقول رشید احمد صدیقی: —

"جہاں کہیں یہ غزل کے آداب سے انحراف کرتے ہیں مضحکہ خیز حد تک بے سرے ہو جاتے ہیں۔ یوں مجروح کی غزلیں بڑی دلآویز ہوتی ہیں اور ایک زمانہ میں مجھے اس خیال سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ آگے چل کر وہ غزل گوؤں میں بڑا اونچا مقام پیدا کریں گے۔ لیکن ترقی پسند حلقہ میں پہنچ کر وہ غالب کے اس شعر کو فراموش کر گئے ؎

پیمانہ بر آن رند حرام است کہ غالب — در بے خودی اندازۂ گفتار ندانند "

مجھے اس بات پر اتفاق نہیں کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہنے سے اچھی شاعری تخلیق نہیں پاتی۔ اچھی شاعری کا تعلق بصیرت سے ہے جو مجروح میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ سیاسی موضوعات میں بھی شاعرانہ حسن برقرار رکھتے ہیں۔

مسانا احمد خاں (پاکستان)

بند دروازے ہوا کے ـــ ایک تنقیدی جائزہ

"بند دروازے ہوا کے" قمر عباس ندیم کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل یہ افسانے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو کر قمر عباس کی مقبولیت کا سبب بن چکے تھے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر جہاں خوشی کا اظہار کیا گیا وہاں اس کے پڑھنے والوں کی آنکھوں میں اشک بھی اتر آئے کیونکہ ان افسانوں کا خالق عین جوانی میں اس دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب قمر عباس ندیم کا فن میچورٹی MATURITY کی منزل پر پہنچ گیا تھا اور اگر وہ زندہ رہتا تو اس وقت جدید افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام حاصل کر چکا ہوتا۔ اردو فکشن کے ایک معروف نقاد شہزاد منظر نے لکھا ہے؛

"قمر عباس ندیم بڑے اچھے افسانے لکھتا تھا۔ وہ اگر طویل عمر پاتا اور اس طرح لکھتا رہتا تو اپنے بہت سے ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ جاتا۔ اس نے اگرچہ کم لکھا لیکن تیرہ چودہ سالہ ادبی زندگی میں جو کچھ لکھا وہ اسے جدید افسانہ نگاروں کی صف میں جگہ دلانے کے لئے کافی ہے۔ قمر عباس ندیم کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا تقریباً ہر افسانہ خواہ وہ روایتی طرز کا ہو یا علامتی طرز کا گہرے تاثر کا حامل ہوتا ہے اور پڑھنے والا افسانہ ختم کرنے کے بعد گہرے تاثر میں ڈوب جاتا ہے یہ ایسی خوبی ہے جو صرف کلاسیکی افسانوں میں پائی جاتی ہے۔"

جن لوگوں نے قمر عباس ندیم کے افسانوں کو غور سے پڑھا ہے وہ شہزاد منظر کی اس رائے سے اختلاف نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح معروف شاعر پروفیسر حسن عابد نے فلیپ پر رائے دیتے ہوئے کہا ہے؛

"قمر عباس ندیم ایک ذہین افسانہ نگار تھا۔ اس کے قلم میں تیزی اور نشتریت کے ساتھ ایک ایسی آواز ہے جس پر سماعتیں چونکیں اور آنکھیں متوجہ ہو جاتی ہیں۔"

انھوں نے مزید کہا

"قمر عباس ندیم کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'شیشے کی آبرو' ادبی شعور کے ابتدائی مراحل کی طرف بڑھتے قدم کی نشاندہی کرتا ہے۔ ادب سے اس کا لگاؤ تھا۔ زندگی اور انسانی رشتوں کو اس نے

جن جن نا آسودگیوں سے پرکھا تھا۔ اس نے اس [illegible] یہاں وہ خوف بھی پیدا کی تھی جو اچھے اور بڑے فنکاروں کا حصہ ہوتی ہیں۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب اس کا پہلا مجموعہ "شیشے کی آنکھ" منظر عام پر آیا تو اس نے لوگوں کو چونکایا۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ مجموعہ قبل از وقت شائع ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قمر عباس ندیم نے جو بھی افسانہ لکھا اسے پہلے چھانا، پھٹکا اور پھر چھپنے کے لئے دیا۔ اس طرح اس مجموعے کے چھپنے سے قبل ہی وہ قارئین سے داد حاصل کر چکا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ ادبی رسائل میں افسانے الگ الگ اور طویل وقفوں کے ساتھ پڑھنے سے قاری ایک مضبوط مربوط تجزیہ نہیں کر پاتا۔ گو کہ وہ افسانہ [illegible] باطن میں اتر جاتا ہے ایک چھوٹی موٹی رائے وضع کر لیتا ہے لیکن جب افسانے مجموعے کی شکل میں آتے ہیں تو قارئین اور ناقدین کو مجموعی تاثر وضع کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بالکل یہی صورت قمر عباس ندیم کے پہلے مجموعے "شیشے کی آنکھ" کی اشاعت کے ساتھ پیش آئی۔ اس مجموعے نے یہ تاثر دیا کہ قمر عباس ندیم ایک ابھرتا ہوا ذہن [illegible] ہے جو اپنے ادبی سفر میں بہت آگے تک جائے گا۔ اور یہ بھی ہوا کہ ان افسانوں نے قارئین و ناقدین [illegible] کو چونکایا اور آنکھوں کو متوجہ کیا — یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ قمر عباس ندیم کا زندگی [illegible] گہرا رشتہ تھا۔ وہ کمٹ منٹ کا افسانہ نگار تھا۔ اس نے زندگی اور اس کے مسائل کو گہرائی میں [illegible] پرکھا، جانچا اور جو کہانی پیش کی اس میں دردمندی کے ساتھ اس بات کو واضح کیا کہ جب تک انسان [illegible] اظہار رائے کی آزادی اور معاشی آسودگی نہیں دی جائے گی وہ مصائب اور رنج کے بھنور میں پھنسا رہے گا۔ دراصل قمر عباس ندیم انسانی مصائب اور دکھوں پر شدید دکھ کا اظہار کرتا ہے بلکہ پرزور احتجاج کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ مشتعل ہو گیا ہے لیکن احتجاج کا یہ استعمال اس کے فن کو مجروح نہیں کرپاتا۔ وہ اپنا نقطۂ نظر بڑے حسن کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ معاشرے کو بتا دیتا ہے کہ دنیا کا کوئی نظام جو فرد کو خوشیاں نہیں [illegible] پنپ نہیں سکتا۔

"بند دروازے ہوا کے" اس کا ٹائیٹل افسانہ ہے اور میرا خیال ہے اس مجموعے کی روح ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس افسانے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ لوگوں پر عزت نفس، آزادی اور خوشیوں کے دروازے بند ہیں اور اپنے اپنے بند ماحول میں انسان کی احتجاجی چیخیں برآمد ہو رہی ہیں۔ لیکن ان کی یہ آوازیں صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہیں۔ اس افسانے کا تھیم THEME عزتِ نفس کی [illegible] ہے۔ اس نے یہاں خوبصورتی سے یہ دکھایا ہے کہ دیواریں ہونے کے باوجود تحفظ کا پتہ نہیں چلتا اور پورا معاشرہ سراسیمگی کا شکار ہے۔

"ٹھٹھرتی ہوئی شام" میں مایوسیوں کو آشکار کیا گیا ہے اور یہ احساس دیا گیا ہے کہ وقت ختم ہو گیا ہے۔ شام ہونے میں نہیں آتی اور جب تک دکھوں کی، مایوسیوں کی شام ختم نہ ہو تو صبح کیسے آئے؟

"جلتا ہے جسم جہاں" میں مرکزی کردار اپنی بوڑھی ہوتی ہوئی بیوی اور اس کے جذبات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو گھر میں اجنبی تصور کرتا ہے۔ وہ اسے اونی شال لاکر دیتا ہے۔ جسے وہ مخالفت کر دیتی ہے۔ اس نے اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر رکھی ہے اور یہی عورت کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس افسانے کے آخیر میں عورت کی عظمت کے پہلو کو اُجاگر کرتے ہوئے قمر عباس ندیم نے بتایا ہے کہ عورت جو زندگی بھر سب کی خدمت کرتی ہے آخیر میں شوہر کے مقابلے میں مرکزِ امید اپنے لڑکے کو بناتی ہے۔

"چوتھی جہت" فکری افسانہ ہے۔ اس میں انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل کا المیہ دکھایا گیا ہے یہاں قمر عباس ندیم نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان ذہنی انتشار کا اس قدر شکار ہے کہ اسے راستہ نظر نہیں آتا۔ اور دنیا اب خوفناک بموں کی زد میں ہے۔ یعنی یہ کہ انسان نے اپنے اوپر حیوانی جبلت کو مسلط کر لیا ہے اور انسان اپنے آپ کو تباہی سے دوچار بالکل اسی طرح کر رہا ہے۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے اس تباہی کا دروازہ کھولا تھا۔ افسانہ نگار کی سوچ یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر پیغمبر آئے، گوتم بدھ جیسا مصلح آیا۔ لیکن انسان کی تباہ کاری والی فطرت وہیں کی وہیں موجود ہے!

"ہنیم کا چہرہ" افسانہ کم اور اسٹیٹ مینٹ STATEMENT زیادہ ہے! یہاں قمر عباس ندیم نے جدیدیت کا اثر قبول کیا ہے اور مختلف ٹکڑوں میں تاریخ سے حاصل شدہ دکھ، انسانی آزادی کے غائب ہونے اور وجود کے خطرے میں پڑ جانے کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے میں انسانی وجود سے اٹھنے والے سوالات ہیں۔ لہٰذا یہاں کہانی پر زور دینے کے بجائے قمر نے اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات یکجا کر دئیے ہیں۔ یہ افسانہ ان کے کہانی کہنے سے فرار کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن کچھ قارئین کے اچھی بیانات STATEMENTS میں کہانی چھپی ہوئی ہے اور کچھ قارئین اس میں یقیناً کہانی پن کا مطالبہ کریں گے۔ بہرحال یہ الگ بحث ہے کہ جس پر آج کل کی باتیں ہو رہی ہیں اور اختلافی مضامین لکھے جا رہے ہیں ـــــ

البتہ اس افسانے کے مقابلے میں "بے کل پرزے" میں قمر عباس نے واضح علامتی پیرایہ اختیار کیا ہے اس افسانے کی ہیئت اور تھیم دونوں دلچسپ ہیں۔ اس میں سائنسی عہد کی ستم ظریفیوں پر گہرا طنز کیا گیا ہے کہ لوگ ایسی بس میں سوار ہیں جو ڈرائیور اور کنڈکٹر کے زیرِ کنٹرول ہیں اور بالکل بے بس ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تباہی ان کا مقدر ہو اور وہ اس میں فرار حاصل کرنے میں معذور ہوں۔ یہ افسانہ انسانی بے چارگی کے المیے کو پیش کرتا ہے۔

قمر کے دیگر افسانے بھی تاثر سے بھرپور ہیں۔ اوپر کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ قمر عباس ندیم ہمیں زندگی کے کریہہ مناظر دکھا کر ہمیں جھنجھوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے افسانوں میں کرپٹ سسٹم CORR-UPT SYSTEM، شہر کی بے رحم زندگی اور سائنسی عہد میں وجود کے خطرے میں پڑ جانے کا دکھ موجود ہے۔ وہ اس بے انصافی پر ماتم کناں ہے کہ انسان سے عزتِ نفس چھین کر اسے بے آبرو اور بے توقیر بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ انسان کی بے بسی اور مایوسی پر احتجاج کرتا ہے۔ وہ انسان کے فکری تضادات، منافقتوں، ہوسِ دولت، غربت، مفلسی اور بھوک کی موجودگی پر اعتراض احتجاج کرتا نظر آتا ہے۔ کاش ایسا افسانہ نگار مزید زندہ رہتا۔ بہرحال قمر عباس ندیم ہمارے افسانہ کی دنیا میں ایک مقام پیدا کر گیا ہے۔ جب اس دور کے افسانہ نگاروں کی بات کی جائے گی تو اس کا تذکرہ کرنا لازمی ٹھہرے گا۔ مجنوں گورکھپوری ایسے نقاد نے کیا خوب لکھا ہے کہ:

"اردو افسانے کو زندگی کی نئی توانائیاں بخش گیا اور نئی نسل کو افسانے کے حوالے سے

بقیہ: بند دروازے ہوا کے ، ایک تنقیدی جائزہ

پرورش لوح و قلم کے لئے ایسی راہ دکھا گیا جو آج بھی روشن ہے اور آئندہ بھی روشن رہے گی۔
میں اس مضمون کو معروف نقاد محمد علی صدیقی کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں کہ "قمر عباس ندیم یقینی طور پر ایک ایسا فن کار تھا جس نے اپنی مختصر ادبی زندگی میں بڑی خوبصورت اور اعلیٰ کہانیاں تحریر کیں۔"

بقیہ: غُصَّہ

غصہ ڈارون کے کلیہ ارتقائے انسانی کو بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ اگر آپ غصے کا تجزیہ کریں یا غصے سے تپتے ہوئے کسی انسان کا مشاہدہ کریں تو نظریہ ڈارون پر آپ کو ایمان لانا پڑے گا۔ غصے کی حالت میں آنکھوں کی وہ چمک، دیدوں کے بگڑتے ہوئے وہ زاویے، سکوڑے ہوئے وہ ابرو، حرکت کرتے ہوئے وہ دست و پا، وہ بے ترتیب اچھل پھاند — یہ سب کچھ آپ کو اس دور کی یاد دلاتے ہیں جہاں سے نظریہ ڈارون کا ارتقائی سفر شروع ہوتا ہے۔

بقیہ: "ڈاکٹر ابن فرید ..."

س : ڈاکٹر صاحب! سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر بعض حلقے ادب کے مستقبل سے مایوس نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کا مؤقف کیا ہے؟

ج : ادب میرے نزدیک زندگی کی بڑی حقیقت ہے۔ کسی زمانے میں ادب فنا نہیں ہوگا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جتنی ترقی کرے گی ادب بھی اتنا ہی ترقی کرے گا۔ صنعتی معاشرے میں فرد جتنا بیگانگی کا شکار ہوگا۔ وہ اتنا ہی رشتوں کی تلاش کرے گا اور ادب اس کا سہارا بنے گا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ آدمی کا تخلیقی اور تخیلی سفر کبھی رک نہیں سکتا۔ جب تک آدمی کا وجود باقی ہے ادب کا وجود بھی باقی رہے گا۔

رحمٰن نشاط
پاکستان

سنگسار

رات کے کھانے پر جب اس کی بیوی نے ناریل کا شکر والا برادہ بھی سامنے رکھا تو عالم علی چونک پڑا۔

"یہ کہاں سے آیا ——؟" اس نے پوچھا۔

"قدیر بھائی کی اماں دے گئی ہیں۔ قدیر بھائی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔" اس کی بیوی نے بتایا۔

"اچھا ——!" عالم علی نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

اس کی بیوی منتظر رہی کہ شاید وہ کچھ اور بھی کہے لیکن وہ خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔

"بہت چہل پہل تھی آج قدیر بھائی کے گھر میں" اس کی بیوی نے سلسلۂ گفتگو جاری کیا۔

"ہوں ——!" عالم علی منہ چلاتا ہوا بولا۔

"عورتوں نے مل کر گیت گائے۔ سارے محلے میں شکر اور ناریل بانٹا۔ ان کی اماں بہت خوش تھیں۔"

"دادی جو ہیں!" عالم علی بدستور کھانے پر نظر جمائے رہا۔ وہ جان بوجھ کر بیوی سے نظریں چرا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس وقت کیا کہنا یا سننا چاہتی تھی۔ وہی گھسا پٹا فقرہ جو وہ گذشتہ سات برسوں کے دوران بے شمار بار دہرا چکا تھا۔ "اللہ کو یہی منظور ہے۔" وہ جانتا تھا کہ اپنی اور بیوی کی خواہش بلکہ آرزو کی تکمیل اور تشفی کے لئے یہ فقرہ ناکافی تھا۔ محض ایک عذر تھا۔ اپنی کوتاہی یا شاید بیوی کی کمزوری کا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس فقرہ کی ادائیگی کے بعد وہ گویا ہفتوں بلکہ مہینوں کے لئے بری الذمہ ہو جاتا تھا۔ اور اس کی بیوی بھی مطمئن ہو جاتی تھی۔ لیکن اس قسم کی خبریں بعض اوقات اطمینان اور تسلی کی ... مدت کو مختصر کر دیتی تھیں۔ اب اسی وقت وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر گزرتا ہے کہ اس کی بیوی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے گی اور اس کے آنسو گھنٹوں اس کے چہرہ کو بھگوتے رہیں گے۔ لیکن آج اس نے بھی تہیا کر لیا تھا کہ موضوع کو آگے نہیں بڑھنے دیگا۔ بلکہ بیوی کا سامنا ہی نہیں کرے گا۔ ہمت ہی نہیں تھی اس میں۔ کھانا ختم کرکے اس نے پانی کا گلاس اٹھایا اور پتھر کے ٹکڑے پر بیٹھ کر سرکنڈوں کی چٹائی پر کلیاں پھینکنے لگا۔

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں ——!" اس نے پانی کا گلاس گھڑونچی پر لٹکاتے ہوئے بولا۔

"کہاں ——؟" بیوی کے لہجے میں ویلا جھنجھلاہٹ چھپی نہ رہ سکی۔

"ذرا قدیر کو مبارکباد دے آؤں۔"

جواب میں اس کی بیوی نے کچھ کہا تھا لیکن لکڑی کا اور ٹین کے دروازے کے شور میں وہ سن نہیں سکا۔

قدیر اسی فیکٹری میں ملازم تھا جس کا عالم علی چوکیدار ... ٹوٹی چھوٹی جھونپڑیوں اور کچے مکانوں کی اس بستی میں اس کا مکان آخری سرے پر تھا۔ لوگوں سے ملتا ملاتا، سلام دعا کرتا۔ عالم علی جب

قدیر کے گھر پہنچا تو اچھی خاصی محفل جمی تھی۔ قدیر سب کے درمیان اس طرح بیٹھا تھا جیسے کوئی ملک فتح کر کے آیا ہو۔ حالانکہ یہ اس کا چھٹا بچہ تھا اور تیسرا لڑکا۔ لیکن مبارکباد وہ اس طرح وصول کر رہا تھا جیسے یہ اس کا پہلا بیٹا ہو۔

عالم علی کا استقبال بڑی گرمجوشی سے ہوا۔

"ارے آؤ بھائی عالم علی۔ ابھی تمہارا ہی ذکر تھا۔" اکبر بولا۔

"ابھی میں یہی کہہ رہا تھا کہ دیکھو خدا کی قدرت ہے۔ عالم علی بے چارہ سات سال سے اولاد کا انتظار کر رہا ہے اور قدیر کو چار سال میں تین بیٹے اور ایک بیٹی دے دی۔"

"[illegible] یار عالم علی تم اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے؟" [illegible] الدین بولا۔

"بھیا، اللہ کو یہی منظور ہے تو علاج اس میں [illegible]۔"

"بے شک بے شک" مولوی ابراہیم کی تائید نے عالم علی کو بڑا سہارا دیا۔ لیکن وہ دل میں سوچ ضرور رہا [illegible] اولاد بڑی نعمت ہے۔ اولاد اگر نہ ہو تو زندگی ویران اور بنجر ہوتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی گھر ہے۔ نہ پالنا، نہ [illegible] جوتے، نہ ٹوٹے ہوئے کھلونے ــــ نہ [illegible] اولاد بڑا سہارا ہے، خیر اللہ کو یہی منظور [illegible]۔

عالم علی اپنے مخصوص فقرے سے اپنے آپ کو مطمئن اور بیوی کو خاموش کرتا رہا۔ لیکن آج جب اس نے کسی بات کے جواب میں اس نے یہ فقرہ دہرایا تو اس کی بیوی نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ عالم علی نے چونک کر نوالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور بہت غور سے بیوی کے چہرے کو تکنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو اس طرح؟" بیوی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ک ک ــــ کچھ ــــ نہیں" عالم علی [illegible]

"اللہ کو یہی منظور ہے!" اس کی بیوی کے لہجے اور چہرے سے ہنسی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ کچھ نہ کہتے ہوئے خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا ختم کر کے اس نے حسب معمول دروازے کا رخ کیا۔ اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا کہ "میں ابھی آرہا ہوں" لیکن آج اس کی بیوی نے کوئی جلا کٹا جملہ نہیں کہا۔

قدیر کے گھر پر معمول کے مطابق رونق تھی۔

"مبارک ہو عالم بھائی۔ مجھے تو صبح اماں نے بتایا" عالم علی کو دیکھتے ہی قدیر نے نعرہ لگایا۔

"بھئی ہم نہ کہتے تھے۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔" علاؤالدین چاچا بولے۔

"یار کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ یہ کس بات کی مبارکباد دے رہے ہو" عالم علی حیرت سے ایک ایک کی صورت دیکھتا ہوا بولا۔

"ایں ــــ ابے تمہیں نہیں معلوم ــــ؟" اکبر حیرت سے بولا۔

"کیا نہیں معلوم ــــ؟" عالم علی کی حیرت بدستور قائم تھی۔

"ابے اُلو تم باپ بننے والے ہو۔" قدیر نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

رات کے وقت سورج نکل آنے کی خبر سن کر عالم علی اتنا حیران نہ ہوتا جتنا اس انکشاف سے ہوا۔ پہلے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ پھر جو وہ الٹے پاؤں دوڑا ہے تو ساتھی بھی پکارتے ہی رہ گئے۔

گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی۔ اور پھر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان نہ معلوم کہاں سے ایک خیال اس کے ذہن میں در آیا۔ اور وہ اس حقیقت

کے ساتھ کہ وہ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اسے اپنے ذہن سے نہ جھٹک سکا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟ سات برس تک تو کچھ بھی نہیں۔ اور یہ اچانک ایکدم۔ ؟" اس نے شدت سے پریشان کن انداز میں سوچا۔

"کہیں...... ؟" اور آگے سوچنے کی ہمت عالم علی نہ کرسکا۔ اس کے قدم سست ہو گئے۔ گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اپنے ذہن سے الجھنوں کو جھٹک دینے کی کوشش کی۔ اس کی بیوی نے بڑی دلآویز مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ مسکرایا تو عالم علی بھی تھا لیکن بڑی بے دلی اور احتیاط سے۔

اس کی بیوی کی مصروفیات بڑھتی گئیں ساتھ ہی عالم علی کی الجھنیں بھی۔ اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی اور اس کی بیوی کو بھی۔ لیکن وہ بیوی کے علاوہ ایک عورت بھی تو تھی۔ جس کی سب سے پہلی اور بڑی خواہش ماں بننا ہے ہو سکتا ہے کہ ___ مگر نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے گھر میں بہت خوش ہے۔ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ میری ہی خاطر ___!"

انہیں پریشان خیالیوں میں وہ دن بھر اپنی بیوی کو چھوٹے چھوٹے کپڑے اور سوئٹر موزے تیار کرتے دیکھتا رہتا اور دل ہی دل میں اس خیالی چور کو کوستا رہتا۔ جس نے اس کے خیال کے مطابق اس کے گھر میں چوری کی تھی۔

"مگر یہ چوری ہوئی کب۔ ؟ میں تو بہت چوکنا تھا۔" وہ سوچتا۔

پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دے لیتا۔ "میں رات بھر گھر سے باہر رہ کر فیکٹری کی چوکیداری کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی نے پیچھے سے چوری کرلی ہو۔ آنکھیں سامنے لگی رہتی ہیں پیچھے سے حملہ ہو ہی جاتا ہے۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ سات برس سے ہمارا ساتھ ہے۔ مگر یہ سات برس ہی تو بہت ہوتے ہیں۔ بغیر اولاد کے سات برس ایک عورت کے لئے کم نہیں ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ چوری کا جواز بھی بن جاتے ہیں۔" پھر ان خیالات نے اتنی شدت اختیار کی کہ عالم علی آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ چڑچڑا ہو گیا۔ بات بات پر لڑنے لگا بیوی اس تبدیلی پر بہت حیران تھی۔ ان سات برسوں میں عالم علی نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ بہت محبت کرتا تھا بیوی سے۔ بیوی کوشش کے باوجود اس کے رویہ کا سبب نہ جان سکی۔

عالم علی کا ذہن ہر وقت گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہتا۔ اس نے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا۔ بس ہر وقت اسی خیال میں غرق رہتا کہ ایسا کیونکر ہو گیا۔ لیکن اس میں اتنی ہمت [illegible] تھی کہ کھل کر اپنی بیوی سے کچھ کہہ سکتا۔ اور کہتا [illegible] کیا تھا اس کے پاس۔

ایک روز مولوی ابراہیم نے اسے [illegible]

[illegible] "کیا بات ہے عالم علی تم بہت روز نہیں آئے۔ ؟"

"ہاں مولوی صاحب ذرا مصروف تھا۔" [illegible] نے بے دلی سے کہا۔

"ہاں بھئی کیوں نہیں! باپ جو بننے والے [illegible]" صاحب نے محبت آمیز انداز میں کہا۔ عالم علی پھیکی سی [illegible] کر رہ گیا۔ مولوی ابراہیم بہت غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"کیوں کیا بات ہے۔ تم خوش نظر نہیں آرہے۔ کیا کوئی پریشانی ہے ؟" وہ جیسے بہت کچھ جانتے ہوئے بولے

"بات یہ ہے مولوی صاحب کہ ___ کہ ___ بس وقت نہیں ملتا تھا۔ اب آیا کروں گا۔"

عالم علی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ لیکن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ مولوی صاحب کو سب کچھ بتا دے۔ ان سے

مشورہ لے کر اسے کیا کرنا چاہیئے۔ آخر کوئی تو ہو جس سے وہ
اپنی الجھن کہہ سکے۔
"ویسے کچھ بات ضرور ہے عالم علی تم کچھ الجھے الجھے
سے دکھائی دے رہے ہو!"
مولوی ابراہیم بھی جیسے اس سے سب کچھ اگلوانے
پر تُل گئے تھے۔
"وہ ___ مولوی صاحب میں دراصل بچے کی وجہ
سے پریشان ہوں!" عالم علی رک رک کر بولا۔
"بچے کی وجہ سے..... ! وہ کیوں بھلا.....؟"
مولوی ابراہیم پھر انجان بنے رہے۔
"عالم علی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر ایکدم جیسے
پھٹ پڑا۔ "یہ کیسے ممکن ہے مولوی صاحب کہ سات برس
تو کچھ بھی نہ ہوا اور پیدا ہو گیا اچانک۔ ایکدم۔" عالم علی رک گیا
مولوی ابراہیم نے ایک طویل سانس لی۔ تو آخر ان کا خیال درست
نکلا۔ عالم علی کو ایک بے بنیاد شک پریشان کئے ہوئے تھا۔
وہ بولے۔
"عالم علی میں تمہیں اتنا کم عقل نہیں سمجھتا تھا۔ ایسے
بیوقوف، وہ بڑی قدرت والا ہے۔ اس کے کارخانے
میں سب کچھ ممکن ہے۔ چاہے تو بنجر زمین میں پھول کھلا دے
چاہے تو بہتے دریاؤں کو خشک کر دے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مولوی صاحب لیکن ساری
بستی کیا سوچتی ہوگی؟" عالم علی جیسے رو دیا
"بستی کی بات چھوڑو۔ خود تم کیا سوچتے ہو؟"
"میں ___ میں مولوی صاحب ___ کیا بتاؤں۔
میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" عالم علی نے دل کا چور ظاہر
کر دیا۔
"عالم علی کیا تم اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ
کہہ سکتے ہو؟" مولوی ابراہیم نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"کک۔ کیا مطلب ___؟" عالم علی ہکلایا۔
"تمہاری پیدائش کس طرح ہوئی تھی؟" مولوی
ابراہیم نے جیسے جلتا ہوا الاؤ عالم علی پر پھینک دیا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب۔ میری ماں
کے بارے میں۔" عالم علی نے احتجاج کیا۔
"تمہاری بیوی بھی تو کسی کی ماں بننے والی ہے"
مولوی ابراہیم نے اس کی بات کاٹ دی۔
"تمہارے باپ نے تمہاری ماں کا اعتبار کیا تھا اور
تم نے اپنے ماں باپ کا۔ تم نے اپنے بارے میں ان سے ثبوت
نہیں مانگا۔ کیوں ان کے کہنے پر یقین کر لیا؟ اس لئے کہ
یہ دنیا یقین پر ٹکی ہے اور شک ایک گناہ ہے۔ کبھی کسی پر
بے وجہ شک نہ کرو۔ اگر شک کرنے کی عادت پڑ گئی تو ایک
دن خدا کے وجود پر بھی شک کرنے لگو گے۔ یہ دنیا یقین ہی
پر قائم ہے۔ اگر یہ یقین ختم ہو جائے تو یہ گھر برباد ہو جائیں
دنیا ویران ہو جائے۔ یقین بہت بڑی طاقت ہے عالم علی
اسے ختم مت ہونے دو۔ اپنی بیوی پر یقین کرو۔ اس کو
شک کی نگاہ سے مت دیکھو۔ وہ تمہاری عزت ہے تمہارا
گھر ہے!"
"گھروں میں چوری بھی تو ہو جاتی ہے مولوی صاحب،
چور سب کچھ چرا کر لے جاتے ہیں اور کچھ ثبوت بھی نہیں چھوڑتے"
عالم علی اپنے خیال پر قائم رہا۔
"یہ کیسے ممکن ہے عالم علی، تم رکھوالے ہو، دوسروں
کی مال کی حفاظت کرتے ہو، پھر تمہارے گھر میں چوری کس
طرح ہو سکتی ہے!"
"دوسروں کے گھر کی رکھوالی میں اپنے گھر کی طرف
سے نگاہ چوک ہی جاتی ہے مولوی صاحب۔"
"جو دوسروں کے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ اس
کے گھر کی حفاظت اللہ کرتا ہے۔ جاؤ عالم علی اپنی بیوی

کی دلجوئی کرو۔ اس وقت اسے تمہاری محبت اور توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔ جاؤ ــــ اور ہاں شام کو بیٹھک پر ضرور آنا۔"

عالم علی سوچ رہا تھا مولوی ابراہیم ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وہ بڑی قدرت والا ہے۔ اس کے کارخانے میں سب کچھ ممکن ہے۔ لیکن خشک اور گرم ریت میں بارش کا پہلا قطرہ ہی جذب ہوتا ہے۔ بعد کی بوچھاریں تو بس اوپر ہی اوپر جل تھل کرتی ہیں۔ عالم علی کے ذہن میں تپتی ہوئی ریت کے شک، بارش کے پہلے قطرے کی طرح جذب ہو چکا تھا۔ اندر تک پیوست ہو گیا تھا۔ مولوی ابراہیم کی باتوں کی بوچھار بس اوپر ہی اوپر جل تھل کر سکتی تھی۔

کبھی کبھی شدید نفرت اور غصّہ سے خواہش کرتا کہ کاش بچہ مرجائے۔ عالم علی کی بیوی آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی اور عالم علی اپنی نفرتوں کی انتہا کی جانب۔

ایک روز موسم بدل گیا۔ اچانک بادل خوفناک انداز میں گرجنے لگا۔ بجلی کے کڑاکے گویا سر پر سے گزر رہے تھے اور موسلا دھار بارش نے بستی والوں کو گھروں میں ایک رہنے پر مجبور کر دیا۔ لالٹین کی روشنی مدھم کر کے عالم علی بیوی بستر پر لیٹا تو درد کی ایک اچانک اور شدید لہر نے اسے دہرا کر کے رکھ دیا اور پھر تو یہ درد لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی گیا۔ قریب ہی دوسرے بستر پر لیٹا عالم علی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ نفرت انگیز وقت آ پہنچا ہے۔

اس کی بیوی درد کی شدّت سے بے حال ہو رہی تھی کبھی لیٹ جاتی، کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتی، اس کے چہرے سے تکلیف کی شدّت کا احساس ہو رہا تھا۔ عالم علی گھبرا کر باہر نکل آیا۔ بارش اپنے زور پر تھی، بادلوں کی گرج اور بجلی کی تڑپ سے دل سہما جاتا تھا۔ عالم علی قدیر کے گھر کی طرف بڑھا۔ لیکن پھر اچانک اس کے قدم رک گیا بارش کا پہلا قطرہ ذہن کی گہرائیوں میں سے نکل کر اوپر آگیا ــــ وہ اپنے مکان کی کچی دیوار کے ساتھ ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سردی سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے اس کے جسم پر پتھر سے برسا رہے تھے۔ لیکن اس کے اندر اس سے کہیں زیادہ شدید اور اذیت ناک بارش ہو رہی تھی، جس سے اس کا ذہن کانپ رہا تھا اور اس کانپتے ہوئے ذہن میں بس ایک ہی خواہش پہلے قطرے کی طرح جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ کاش بچہ مرجائے۔ کاش بچہ زندہ سلامت نہ پیدا ہو سکے۔ بارش ہوتی رہی۔ عالم علی کا جسم اور ذہن کانپتے رہے۔ اندر اس کی بیوی کی دبی دبی سسکیاں اور چیخیں اندھیرے گھر میں پھیلتی رہیں۔

صبح کے ابتدائی آثار تک تینوں طوفان پوری شدت کے ساتھ جاری رہے۔ پھر جیسے آسمان اور عالم علی دونوں تھک کر چور ہو گئے۔ اندر عالم علی کی بیوی بھی شاید تھک کر سو چکی تھی۔ کیونکہ اب اس کی سسکیاں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ عالم علی نے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ صحن میں پانی بھرا تھا۔ بھاری بھاری قدموں سے پانی میں سے گزرتا۔ عالم علی کمرے کے دروازے پر پہنچا تو سامنے بستر پر اس کی بیوی ساکت پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ابدی سکون کے آثار تھے۔ جیسے شدید تکلیف کے بعد اچانک سکون مل گیا ہو یا جیسے بہت جاگنے کے بعد نیند آ گئی ہو۔ اس کے برابر ہی گوشت پوست کا ایک لوتھڑا سا ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر اپنی نحیف لرزتی سی آواز میں اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔

احمد سعدی

شب گزیدہ

شہر میں شام ہی سے کرفیو لگا ہوا تھا اور ہر شخص اپنے اپنے گھر میں دروازہ کھڑکی بند کئے ہوئے، دل میں انجانا خوف لیے سراسیمہ اور حواس باختہ بیٹھا ہوا تھا، ہر طرف گہری خاموشی اور موت کی سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی شاہراہ پر پولس کی جیپ تیزی سے گزر جاتی، چند لمحوں کے لئے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا پھر سکون مسلط ہو جاتا۔

شہر کے مشرقی علاقہ میں دوسرے علاقوں کی نسبت بہت کم آبادی تھی۔ دس پندرہ پختہ مکانات تھے۔ اور بیس پچیس جھونپڑیاں تھیں۔ جن کی چھتیں ٹین کی تھیں۔ درمیان میں دور تک دھان کے کھیت تھے اور ان کھیتوں کے بعد شہر کا مغربی علاقہ شروع ہوتا تھا، جس کی آبادی گنجان تھی۔

مشرقی علاقے کے آخری سرے پر جو پختہ مکان تھا اس کے بائیں طرف ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ جو اب خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد دھان کے کھیت تھے دائیں طرف ایک دو منزلہ عمارت تھی، وہ بھی اب خالی پڑی ہوئی تھی، اس عمارت کے مکین ہنگامے سے قبل ہی کسی دوسرے شہر میں چلے گئے تھے، یوں یہ مکان اس علاقہ کی آبادی سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا، جس میں تین کمرے تھے سامنے ایک خوبصورت سا لان تھا اور لان سے تقریباً دس گز کے فاصلہ پر شاہراہ تھی جو دو ضلعی شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتی تھی۔

باہر شور و غل کی آواز سن کر لڑکی نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا، لیکن باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا شاہراہ کے کنارے اس مکان کے سامنے جو آم کے دو پیڑ تھے، وہ بھی سیاہ لبادے میں لپٹے ہوئے بڑے پراسرار، کسی دیو قامت بھوت کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جو اپنے بازو پھیلائے تاریکی میں کھڑے ہوں۔

لڑکی تھوڑی دیر تک اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی، پھر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑی آہستگی سے کھڑکی بند کر دی۔

"باہر تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں اپنے باپ سے کہا ــ "پتہ نہیں یہ کیسا شور تھا" اس کے بوڑھے باپ کے چہرے پر بھی خوف کی پرچھائیاں صاف نظر آرہی تھیں۔

"یہ تو کسی کے چیخنے کی آواز تھی۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

لڑکی نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا، جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور سوالیہ نگاہوں سے کبھی لڑکی اور کبھی بوڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لڑکی نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور جب وہ پلنگ پر جاکر بیٹھ گئی تو لڑکا بے اختیار اس کے جسم سے لپٹ گیا۔

بوڑھے نے آہستہ آہستہ کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا — "یہ آواز کہیں قریب سے ہی آئی تھی، اس خالی عمارت سے پرے جو مکانات ہیں شاید وہیں کوئی واقعہ ہوا ہے؟"

"آواز بڑی دردناک تھی۔" لڑکی نے سہمے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

"اور خوفناک بھی۔" بوڑھے نے رک رک کر کہا۔ "جیسے کوئی کسی کو ذبح کر رہا ہو۔"

اتنے میں اچانک باہر رات کے سناٹے میں قدموں کی آوازیں ابھریں، یہ آوازیں بڑی واضح تھیں۔ دونوں باپ بیٹی اپنی سانسیں روک کر سمت کا تعین کرنے لگے۔ یہ آوازیں اس خالی عمارت اور اس مکان کے درمیان جو پتلا سا راستہ تھا، اسی پر چلتے ہوئے قدموں کی تھیں۔ کئی آدمی ایک ساتھ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ بوڑھے کے چہرے پر چھائی ہوئی خوف کی پرچھائیاں اور بھی گہری ہوگئیں۔ لڑکی کے چہرے پر زردی چھا گئی، لڑکے نے چونک کر پہلے باپ پھر بہن کی طرف دیکھا، اس کے بعد اس نے بہن کی آنچل میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

انھوں نے کمرے کی تمام بتیاں گل کر دی تھیں، صرف زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا، لیکن اس مدھم روشنی میں بھی دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے چہرے کو پڑھ سکتے تھے اور دل کی دھڑکنیں صاف سن سکتے تھے۔

چند لمحوں کے بعد قدموں کی آوازیں ان کے مکان کے قریب آگئیں، ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا، لڑکی نے پریشان ہوکر اپنے بھائی کو جسم سے علاحدہ کیا اور پلنگ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

بوڑھے نے گھبرا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر جوں ہی اسے کھولنا چاہا، بوڑھے نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کیا اور کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ اچانک رک گئے۔

وہ سب شاہراہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

قدموں کی آوازیں جب مکان کے احاطے سے دور چلی گئیں تو بوڑھے کے پریشان چہرے پر سکون کی جھلک دکھائی دی۔ خطرہ ٹل جانے کے احساس سے لڑکی نے اطمینان کی ایک سانس لی اور پلنگ پر واپس آکر بیٹھ گئی۔

شاہراہ پر جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ اور رات کے سکوت میں زبردست انتشار پیدا ہوگیا۔

لڑکی ایک دم ابھر کر پھر کھڑکی کے پاس پہنچ گئی اور آہستہ سے اس کا پٹ کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ باہر کی دنیا اسی طرح تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور تاریکی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک شاہراہ کے کنارے فضا میں آگ کی لپک پیدا ہوئی اور یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلیں، گولیوں کی آوازیں رات کے سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی مہیب چیخوں کی طرح دور دور تک گونج اٹھیں، لڑکی نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ جیپ تیزی سے شہر کے مغربی علاقے کی طرف چلی گئی۔

ایک لمحہ کے لئے لڑکی کا چہرہ سفید ہوگیا، جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اور وہ خوف سے کانپنے لگی۔ پھر اس نے اپنی ساری قوت مجتمع کرکے اپنے آپ کو سنبھالا، دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی پلنگ پر لوٹ آئی اور اپنے چھوٹے بھائی کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔

"یہ پولیس کی گاڑی ہے شاید؟" بوڑھے نے سرگوشیانہ لہجہ میں کہا — "حالات مجھے ٹھیک نظر نہیں آتے۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ خوفزدہ نگاہوں سے اپنے باپ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کی قوت گویائی چھن گئی ہو

تھوڑے وقفہ تک کمرے میں خاموشی طاری رہی
پھر لڑکی نے آہستگی سے اپنی گود میں بیٹھے ہوئے آٹھ سالہ بھائی سے کہا۔ "اب تم سو جاؤ، زیادہ رات ہو چکی ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" لڑکے نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔" لڑکی نے اس کے بالوں میں شانہ کرتے ہوئے دلاسہ دیا۔ "میں جو تمہارے پاس ہوں پپّی بھی تو ہیں۔"

"مجھے نیند نہیں آتی" لڑکا مچل گیا۔

لڑکی نے مزید اصرار نہیں کیا، وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے مزید باتیں کرنے سے گریز کر رہی ہو۔

بوڑھا ابھی تک بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ لڑکی نے ایک نظر باپ کی طرف دیکھا اور بڑے ادب سے بولی ــــ "آپ کب تک اس طرح کمرے میں چکر کاٹتے رہیں گے، ابھی تو رات بہت باقی ہے، بیٹھ جائیے!"

"تم جانتی ہو، میں کیا سوچ رہا ہوں؟" بوڑھے نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

"میں اس دو منزلہ عمارت کے مالک اور اپنے پڑوسی کے متعلق سوچ رہا ہوں۔" بوڑھے کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور اظہار غم بھی ــــ "اسے حالات کے خراب ہونے کا ضرور علم ہوگا، جبھی تو وہ چپکے سے عمارت خالی کر کے چلا گیا، جاتے وقت اس نے مجھ سے ملاقات تک نہ کی، حالانکہ ہمارے درمیان بہت اچھے اور دیرینہ تعلقات تھے۔"

"لیکن اب یہ سب سوچنے سے فائدہ بھی کیا ہے۔" لڑکی نے افسردہ لہجے میں کہا ــــ "گزرا ہوا وقت واپس تو نہیں آ سکتا۔"

"میں گزرے ہوئے وقت کی واپسی کی بات تھوڑے ہی کر رہا ہوں۔" بوڑھے نے بے بسی سے کہا۔ "انسانی رشتے اور انسانی تعلقات کی بات کر رہا ہوں۔"

"آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں کہ اب سارے رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور انسان بھیڑیا بن گیا ہے۔" لڑکی ملول ہو گئی۔

بوڑھا تھوڑی دیر تک خاموش رہا، پھر اس نے یادوں کے جزیروں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں اس علاقہ میں گزشتہ تیس سال سے آباد ہیں، تیس سال کا عرصہ کم تو نہیں، تین دہائی، بڑی طویل مدت ہے، اس وقت تم پیدا بھی نہیں ہوئی تھی جب اس کے یہاں پہلا لڑکا تولد ہوا تھا۔ لڑکے کے پیدائش کے بعد اس کی بیوی کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہمارا اس سے کوئی خونی رشتہ نہ تھا، لیکن ہمسایہ جیسے تعلقات تھے، بھائی چارگی تھی اور انسانیت کی بنیاد پر باہمی میل جول تھا۔ پھر بھی تمہاری مرحومہ ماں نے کئی مہینے تک زچہ خانہ میں اس کی تیمار داری کی تھی۔"

بوڑھا چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا، پھر اس نے دکھ بھرے لہجہ میں لڑکی سے پوچھا۔ "بیوی کی صحت یابی کے بعد جانتی ہو اس نے مجھ سے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا، اس بُرے وقت میں تم نے میرے لئے جو کچھ کیا ہے، اگر میرا سگا بھائی بھی ہوتا تو شاید نہ کرتا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا!"

"یہ تو بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔" لڑکی نے دھیرے سے جواب دیا۔ "آپ کیوں اپنا دل بُرا کرتے ہیں، اب تو حالات یکسر بدل چکے ہیں۔"

"حالات نہیں بدلے انسان بدل گیا ہے" بوڑھے نے کہا۔ "اگر وہ مجھے بتا دیتا کہ فضا مکدر ہونے والی ہے تو اس کا کیا بگڑ جاتا؟"

"اگر وہ بتا بھی دیتے تو کیا فرق پڑتا" لڑکی نگاہیں جھکائے فرش کو تکتے ہوئے بولی۔ "فضا تو بہت پہلے سے بگڑ چکی تھی۔"

"فرق کیوں نہ پڑتا۔" بوڑھے نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "میں بھلا اس کے ساتھ کیسا دوسری جگہ منتقل ہو جاتا!"

اب بھی لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش نگاہوں سے باپ کا چہرہ تکتی رہی۔

بوڑھے کے لبوں پر ایک زہرخند مسکراہٹ پھیل گئی۔
"جس روز صبح کو اسلم نے اپنی عمارت خالی کی، اسی رات کو میں اس سے مل چکا تھا، مگر اس نے مجھ سے شہر چھوڑنے کی کوئی بات نہ کی۔ اور چپکے سے بیوی بچوں کو لے کر چلا گیا، وہ مجھے بھی تو اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا!"

بوڑھا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔

وقفہ وقفہ سے باہر گولیاں چلنے اور لوگوں کے چیخنے کی آوازیں فضا میں بلند ہوتی رہیں اور رات ہر لمحہ سنگین ہوتی گئی۔ گولی کی آواز اور انسانی چیخ کی آواز سن کر وہ دونوں چونک پڑتے اور آوازوں کو سننے کے بعد سمت کا تعین کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس اندھیری رات میں باہر جو قیامت آئی ہوئی تھی، ان کے لئے اس کمرے میں بیٹھ کر اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

بوڑھا بار بار اپنی رسٹ واچ دیکھ رہا تھا، شاید اسے صبح کا انتظار تھا۔ اور وہ گھڑی میں وقت دیکھ کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ صبح ہونے میں کتنی دیر ہے، گھڑی میں رات کے بارہ بج رہے تھے، ابھی تو شب کا صرف نصف حصہ ہی گزرا تھا، نصف شب کا فاصلہ باقی تھا۔ دونوں باپ بیٹی کے چہرے پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی اور کسی ہلکی سی آہٹ پر بھی ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ رات لمحہ بہ لمحہ ڈھل رہی تھی اور انہیں ایک ایک پل ایک ایک سال کے برابر محسوس ہو رہا تھا، ایک ایک سانس میں بے یقینی کا کرب شامل تھا۔ ان کے ذہنوں میں ان گنت سوال ابھر آئے تھے۔ کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ یہ رات کبھی ختم ہوگی بھی یا نہیں؟ رات کے سناٹے میں ابھرتی ہوئی یہ چیخیں، آگ اگلتی ہوئی یہ گولیاں، رات کے سکوت کو زخمی کرتی ہوئی یہ آوازیں کب ختم ہوں گی؟ وحشت و بربریت کا یہ ناچ کب رکے گا؟ لیکن اس کا جواب دینے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

لڑکی بار بار اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی، جو اس کی گود میں سہما ہوا بیٹھا تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ گہری نیند سو گیا ہوتا، لیکن آج نہ جانے اس کی نیند کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ اس کی گود میں اس کے سینے سے چمٹا خاموش بیٹھا تھا۔ اور ایک ٹک کبھی باپ کبھی بہن کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔

رات کے دو بجے یکایک انھیں شاہراہ کی طرف سے آتی ہوئی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ ان کے مکان کے قریب ہوتی گئی۔ لڑکی نے بے اختیار اپنے چھوٹے بھائی کو بھینچ لیا اور بوڑھا خطرے کی بو سونگھ کر یوں کھڑا ہو گیا، جیسے کوئی پرندہ اڑنے سے پہلے پر تول رہا ہو۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا، چھت کی طرف دیکھا، پھر آنگن میں نکل گیا۔ چند ثانیہ بعد ہی وہ واپس لوٹ آیا جیسے سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے لوٹا ہو، اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے، جیسے ان میں جان باقی نہ رہی ہو۔ مکان میں کہیں بھی چھپنے کی کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ باہر نکلنے کا راستہ تو تھا، لیکن نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

تیز تیز چلتے ہوئے قدموں کی چاپ ان کے دروازے کے قریب آ کر رک گئی، پھر دروازہ پر زور زور سے دستک دینے کی آواز سنائی دی، جیسے کوئی دروازے کو ہتھوڑے سے پیٹ رہا ہو۔ دستک کی آواز سن کر ان کے دل اتنے زور سے دھڑکنے لگے کہ وہ سنے بغیر محسوس کر سکتے تھے، ان کے

جسموں میں رعشہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ لڑکی نے اسی عالم میں اپنے چھوٹے بھائی کو پلنگ کے اندر چھپا کر چادر نیچے کی طرف سرکا دی۔

دستک کی آوازیں کرخت گونج بن کر فضا میں پھیلتی رہیں اور اونگھتی ہوئی رات یکلخت بیدار ہو کر شور مچانے لگی۔ ہر لمحہ دستک کی آوازوں میں سختی آتی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے باہر زوروں کی آندھی چل رہی ہو۔ اور دو تین عمارتیں ٹوٹ ٹوٹ کر دروازے پر گر رہی ہوں۔

پھر ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دروازہ ٹوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اور دو رائفل بردار مکان کے اندر گھس آئے۔ چند لمحوں کے بعد ہی ان کے قدموں کی چاپ دونوں باپ بیٹی کے دلوں کو روندتی ہوئی، دوسرے کمروں سے گزر کر ان کے کمرہ تک آ پہنچی۔

رائفل برداروں نے اپنے چہروں کو سیاہ نقاب میں یوں چھپا رکھا تھا کہ ان کے چہرے جسموں سے غائب ہو گئے تھے۔ اور وہ بغیر سر کے نظر آ رہے تھے، کمرے میں پہنچ کر انہوں نے لائٹ آن کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے تینوں کمروں کی تلاشی لی۔ اور ہر طرح اپنا اطمینان کر لینے کے بعد بوڑھے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے، دونوں باپ بیٹی کے بے رونق سہمے ہوئے چہروں کو دیکھا پھر ایک نے بڑھ کر بوڑھے کے سینے پر رائفل تان دی اور دوسرے نے لڑکی کو پشت بازوؤں میں دبوچ لیا۔

بوڑھے کے لئے یہ منظر ناقابل برداشت تھا، وہ تڑپ اٹھا، اچانک اس کا جسم تن گیا [illegible] انجام کی پروا کئے بغیر اپنے سینے پر لگی ہوئی رائفل کو مضبوطی سے پکڑ کر رائفل بردار کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا، لیکن ابھی وہ لڑکی کے قریب پہنچا بھی نہ تھا کہ اس کے سر پر رائفل کے کندے کی بھرپور ضرب لگی اور وہ تیورا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اسی اثنا میں رائفل بردار نے اسے دبوچ لیا پھر اس نے بوڑھے کو کرسی پر بٹھا کر رسیوں سے جکڑ دیا اور رائفل کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

لڑکی اپنی مدافعت کی انتہائی کوشش کرتی ہوئی چیختی رہی، اس کی مسلسل چیخ رات کی خاموشی میں دور تک گونجتی رہی اور رائفل بردار کے ہاتھ اسے بے ستر کرنے میں مصروف رہے۔ چیتے اور ہرنی کا مقابلہ بھی کیا تھا، تھوڑی ہی دیر میں وہ بے دم ہو گئی۔

کمرے کی تیز روشنی میں باپ نے بیٹی کو بے حرمت ہوتے دیکھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پلنگ کے نیچے چھپا ہوا لڑکا روشنی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعہ سے بے خبر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا۔

وقت کا فاصلہ طے ہوتا رہا، بوڑھے کے سینے پر رکھی ہوئی رائفل کی [illegible] ہو گئی، رات دھیرے دھیرے ڈھلتی رہی اور نہ جانے کتنی گھڑیاں بیت گئیں۔ جب بوڑھے نے ذرا [illegible] سے اپنے ہاتھوں کو چہروں سے ہٹا کر ایک اچٹتی ہوئی نظر لڑکی پر ڈالی، سامنے کا منظر دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا اور اس کی روح کی گہرائی تک ایک تیز چھری سے اترتی چلی گئی اور ابھی وہ دوبارہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپانا ہی چاہتا تھا کہ لڑکی سے ہاتھا پائی کرنے والے رائفل بردار کے چہرے سے نقاب سرک کر نیچے آ گیا اور اس کے جسم سے چہرہ ابھر آیا۔ بوڑھے کی نگاہوں کے سامنے اچانک جیسے بجلی سی کوند گئی۔

دوسرے ہی لمحہ وہ چہرہ پھر نقاب کے اندر روپوش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دو گولیاں چلیں اور لڑکے نے پلنگ کے نیچے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے میں قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر ہر طرف مکمل سکوت چھا گیا۔

صبح کو جب لڑکا پلنگ کے نیچے سے باہر نکلا تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ اور بہن کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی فرش پر اوندھی برہنہ پڑی ہوئی [illegible]

شام بارکپوری (بنگلہ دیش)

ناموس کی چتا جلی

اگر دنیا کے مقابلۂ حسن کے سلسلے میں اسے نامزد کیا جاتا تو وہ اوّل انعام کا مستحق قرار دی جاتی۔ حسن و جوانی کا پیکر اور دلکش خدوخال کو دیکھ کر بہار کے شگفتہ پھول کا گمان ہوتا۔ دل پر بجلیاں چلانے والے تیکھے نقوش، چھریرا بدن جیسے لچکتی ہوئی ڈال۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں جیسے چھلکتا ہوا پیمانہ۔ لانبی گھنیری سیاہ زلفیں جیسے خلیج بنگال کی کالی گھٹاؤں کا کارواں۔ صبیح رنگ جسے دیکھتے ہی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے نمک کا چٹخارہ لیا جاسکے۔ ثانوی تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھی۔ مفلسی کے لباس میں ملبوس ... غربت و عسرت اس کے دامن سے وابستہ رہتے تھے۔

جب وہ کلی سے کھل کر پھول بنی تو والدین نے نصیحت کی تھی "چادر سے باہر پاؤں نہ پھیلانا اور اپنے کو ... سے نہ سنوارنا۔ اپنے محدود وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی کی راہ پر گامزن رہنا۔"

جب والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو گذر اوقات کے لئے زندگی کی ناؤ خود چلانی پڑی۔ بیچ منجدھار میں پتوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر موجوں کے ریلے میں بہہ گیا۔ وہ ریگزار میں تنہا کھڑی چشمۂ آب کی منتظر تھی۔ کوئی پرسان حال اور مددگار نہ تھا۔ سرمایہ بھی نہ تھا کہ زندگی اچھی نہج پر گزار سکے۔ رفتہ رفتہ گھر کا اثاثہ فروخت ہونے لگا اور مفلسی اس کے گھر کے چوکھٹ پر دستک دینے لگی۔ وہ ایسی کشتی تھی جو پتوار کے بغیر ہوا کے دوش پر بہتی جا رہی تھی۔ ساحل کی تمنا خواب کے دھندلکوں میں گم ہو چکی تھی۔

چہار دانگ عالم میں اس کی صورت و سیرت کا چرچا تھا۔ مگر اس کا گداز جسم لوگوں کی دلچسپی کا باعث تھا۔ اس کی جوانی کے دلدادگان کشاں کشاں اس کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کے شباب کے ارغوانی جام سے ان کا نشہ دوآتشہ ہوگیا۔ یکے بعد دیگرے کئی عشاق اس کے گرویدہ ہوئے۔ اس کی چاہت کا دم بھرتے ہوئے متاعِ دل لٹادی۔ اس کی محبت میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اس نے انہیں اپنا سچا عاشق اور حقیقی غمخوار سمجھا۔ چاہنے والوں نے اس کی رفاقت، خلوص، دلبری اور حسن کے ایسے گن گائے کہ وہ ان کی باتوں کے سحر میں کھو گئی اور انہیں اپنا ہمدرد اور مخلص سمجھنے لگی۔ انہوں نے عورت کی کمزوری اور نادانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جہاں ندیوں کا جال بچھا ہو، وہاں اس کی ہستی ندیوں سے سیراب ہو کر زیر و زبر ہونے لگی۔

انہوں نے مرغن اور لذیز غذاؤں سے اس کی بھوک مٹائی۔ اس کے مرمریں جسم کو ریشم و کمخواب کے کپڑوں سے سجایا۔ مگر عفت کی قبا کو ضرورت کے ہاتھوں تار تار کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ وہ بھونروں کی طرح شگفتہ پھولوں کے رس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جب پھولوں کی تازگی اور شگفتگی ماند پڑنے لگی تو اڑ گئے۔

چند روز تک اداسیوں کے سانپ اس سے لپٹے

رہیے اور وہ تنہائی کا زہر پیتی رہی۔ اچانک ایک دن خوابوں کا ایک شہزادہ اس کی تاریک زندگی میں فانوس بن کر نمودار ہوا اُسے غم واندوہ میں ڈوبا دیکھ کر اس کی دلجوئی کی۔

" خود غرضوں نے تمہاری پاکیزگی کو کفن پہنا کر درگور کردیا۔ تمہیں بر مالا پہنانے کی بجائے تمہاری گردن پر کانٹوں کا ہار ڈال دیا۔ وہ پھول جو دیوتا کے قدموں پر نچھاور کیا جاتا، اسے عیش کدے کی سیج پر پامال کردیا۔ بادہ خواروں نے مے پرستی کے ساغر و مینا توڑ دیئے۔ ایسے خود غرضوں اور بے وفاؤں پر ہمیشہ کے لئے اپنا دروازہ بند کردو۔" نئے محبوب نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ " میں تمہارے چہرے پر حزن وملال کی پرچھائیاں نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارا حسین چہرہ گلبن کی طرح ہے جسے گلدان میں سجایا جاسکتا ہے۔ میں تمہارے غم کا مداوا بنوں گا اور اپنی شریک حیات بناؤں گا۔"

وہ کئی روز تک اس کے حسن کا اسیر رہا۔ اس نے اپنی پیار بھری باتوں سے اس کا دل موہ لیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے دام فریب میں آگئی۔ آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ وہ اسے محبت کا سبز باغ دکھا کر غائب ہوگیا۔

لڑکی اپنے سینے پر کاری زخم لگنے سے تلملا گئی۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کرتی تھی۔ لڑکی کو اپنے والدین کی نصیحت یاد آئی۔ اگر آج وہ اپنے جسم کی نمائش نہ کرتی اور اپنے حد سے تجاوز کرکے مائل بہ پرواز نہ ہوتی تو اس طرح ذلیل و خوار نہ ہوتی۔ آج وہ ہڈی کی طرح کوڑے کی ڈھیر پر پھینک دی گئی تھی۔ وہ رسوائے زمانہ ہو چکی تھی۔ ایسا پھول جس میں خوشبو نہ تھی۔

جو اس کے نگہبان تھے، وہی اسے سربازار لے آئے تھے۔ اس کے جسم کی بازیگری نے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اس کی بے کسی اور کمزوری کا فائدہ اٹھانے میں کوئی بھی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس کے بارے میں زبان زدِ خاص وعام تھا۔ " یہاں داخل ہونے کے سینکڑوں راستے ہیں مگر نکلنے کے لئے ایک بھی راستہ نہیں۔" اب وہ راستوں کے درمیان بے ننگ ونام کھڑی تھی۔

رفتہ رفتہ وہ کھلونے کی طرح مختلف ہاتھوں میں بکتی رہی اور اپنے ناموس کی چتا میں جلتی رہی۔ وہ ایسا پھول جس کی خوشبو سے سبھی سرشار ہونا چاہتے تھے۔ وہ ان کی سیج کی سلوٹیں بن گئی تھیں۔ وہ بستر کی ایسی چادر تھی جو ہر صبح تبدیل کردی جاتی تھی۔

وہ جس مکان میں سکونت پذیر تھی۔ اب کھنڈر ہو چکا تھا۔ ایک کے علاوہ تمام کمروں کی دیواریں شکستہ ہو چکی تھیں۔ جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑ گیا تھا۔ چھت سے پانی ٹپکنے سے کائی جم چکی تھی۔ رنگ وروغن پھیکا پڑ گیا تھا۔ تار عنکبوت سے کمرہ بھر گیا تھا۔ کمرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ مکان اپنی خستہ حالی پہ نوحہ کناں تھا۔ دن عسرت میں گزرنے لگے اور رات تنہائی کا آگ پھنکارنے لگا تھا۔ گھر کا ایک ایک سامان فروخت ہوگیا۔ نوبت کپڑے اور زیور تک آگئی۔ مفلسی اور بھوک کے سائے نے پڑاؤ ڈال دیا یہاں تک کہ سر کوار دکے لئے دروازہ کھل گیا۔ اس کے سر کا آنچل ڈھلکے کی طرح مٹھی میں سمٹ آیا تھا۔

زندگی کو گھن کا مصائب کے کانٹے سے چیل رہی تھی چہرے کا نکھار ماند پڑ گیا تھا۔ گداز جسم مسائل کی تمازت سے جھلس گیا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ وہ دلال جو اس کی جوانی کی تشہیر کرتے اب اسے بھول چکے تھے۔ تنہائی عذاب بن کر ڈس رہی تھی۔ اب نہ کوئی چارہ ساز تھا، نہ غمگسار۔ وہ تپ دق کا مریضہ کی طرح گھلی جارہی تھی۔

غلط قدم تباہی وبربادی کی طرف لے جاتا ہے جس نے خود اپنے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکا لگایا ہو۔ اسے دنیا کے تمام سمندروں کا پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ اس کی حیثیت اس زمین کی تھی جو بنجر اور سیم کی وجہ سے ناقابل کاشت ہو۔

بقیہ صفحہ ۵۸

محمد طارق

حشر کی تصویریں

ایک بار زور کی آندھی نے شہر کے جھونپڑوں کو جو غریبوں کی زندگی کی اہم ضرورت تھی نیست و نابود کر دیا تب مجھے اس قدر افسوس نہیں ہوا تھا۔

کئی بار سیلاب آیا اور میرے بہت سارے ہموطنوں کو بہا لے گیا۔ اس وقت بھی اس قدر دکھ نہیں ہوا تھا مجھے۔ ہاں غصہ ضرور آیا تھا۔ اس بات پر کہ خدا نے اصلی مجرموں کی گردنیں کیوں نہیں دبوچی جو اپنی فلک بوس عمارتوں میں جو انہوں نے غریبوں کے خون پسینے سے بنائی ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں جن کا سیلاب بھی کچھ نہ کر سکا بلکہ انہیں شہرت کی تجارت کا ایک سنہری موقعہ دے گیا۔

آج مجھے بے حد افسوس ہو رہا ہے ...... آج میں بے حد غمگین ہوں اور خوف زدہ بھی۔ آج میں زندگی کے ہر لمحے میں دہشت، ہر پل میں خوف و ہراس ہے۔ ...... میرا گھر میرے لئے غیر محفوظ پناہ گاہ بن گیا ہے جس کی تعمیر میں کبھی بار ہا کی۔ جب بھی سیلاب بہا لے جاتا میں دوسرا گھر بنا لیا کرتا تھا ...... آندھی کے ہلکے سے تھپیڑے سے جب بھی ٹوٹ جاتا میں فوراً ہی اپنے لئے گھر کی تعمیر کر لیا کرتا تھا۔ لیکن آج جب کہ میرا گھر مٹی کا نہیں سمنٹ کی دیوار کا ہے اس میں رہ کر بھی میں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا ہوں۔ میں سیلاب سے بچ سکتا ہوں۔ زلزلے اور آندھیوں تباہ کاریوں سے بھی محفوظ رہ سکتا ہوں۔ کسی مہلک بیماری بچنے کا بھی جواز ہے۔ لیکن میں ان انسانوں سے کیسے بچ ہوں جن کی درندگی کی تصویریں دیکھ کر مجھے طیش آ جا ہے اور میں اپنی مٹھیاں بھینچ کر دانت پیس کے رہ جاتا ہوں اپنے ہی خون کا گھونٹ خاموش پی جاتا ہوں۔ حالانکہ میں خود جانتا ہوں کہ میرے سینے میں یہ بھڑکتی ہوئی آگ سوائے میرے ہی خون کے اور کچھ نم نہیں کر سکتی۔ میں کتنا مجبور ہوں اور بس! ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک مذبح خانے میں کھونٹے بندھا ہوا بیل ہوں جسے قصائی جب چاہے گا ذبح کر ڈالے گا ...... تب مجھے کوئی نہیں بچائے گا ـــ شاید کوئی ـــ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ کسی جگہ چلا جاؤں جہاں تہذیب نہ ہو، کوئی کلچر نہ ہو، کوئی سماج نہ ہو ـــ جہاں انسان کی چھایا تک نہ پڑی ہو۔ ایسی پاک، کنواری، جگہ چلا جاؤں، مگر ایسی جگہ مجھے دور دور تک نظر نہیں آ ہاں ایسی بہت سی جگہیں دکھائی دیتی ہیں جو میں تصویروں میں دیکھ رہا ہوں۔ اف! یہ ہولناک تصویر میں نے نجانے کتنی بار دیکھی ہیں ......

ـــ بہت سارے چھوٹے بڑے منہدم مکا ٹوٹی پھوٹی عمارتیں، جھونپڑیاں جلی ہوئی، ادھ جلی ز بوس، جن میں کئی خاندان کیسی کیسی پر مسرت امیدوں اور روشن خوابوں کو گلے لگائے جیتے رہے ہوں گے۔ سب نیست و نابود ہو گیا۔ کس نے صور پھونک دی اس برا شہر پر ...... ؟ شہر والوں نے یا شہر سے باہر ر

لون نے ...... کس کا ہاتھ ہے؟ اپنا یا پرایا ..؟؟
ز ہاتھ تو ہوگا انسان کا ہی.... انسان اتنا ظالم! ایسا بے رحم
مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ مگر مجھے یقین کرنا ضروری تھا۔
نکہ انسانوں کے کرتوت کی ساری تصاویر میرے سامنے
جود تھیں.......

دوسری تصویر میں — نیزے، بھالے، لاٹھیاں
کمان سے لیس انسان ہر بات سے بے خوف و خطر، بالکل
ر کرنے کی پوزیشن لئے جیسے درندے کا شکار کر رہے ہوں
بت ہی موذی جانور کا شکار ایسا ہی لگ رہا تھا۔ مجھے ان
چہروں کے تاثرات دیکھ کر —

اس کے بعد کی تصویر میں ایک عورت کی لاش ندی
کے کنارے پڑی ہے۔ پانی سے پھولی ہوئی اور اس کے سینے
ے ننھے بچے کی لاش چمٹی ہوئی ہے۔ جس کی پھیلیوں میں
پیوست ہے...... میرا بابا اپنی ماں سے ایسا ہی
لپٹتا تھا۔ جب کسی کتے کی بھونک کی آواز اس کے کانوں سا
ٹکراتی ہے، میں اس کی تصویر کو دیر تک دیکھتا رہتا ہوں
ر میری شعور کی آنکھیں میرے اطراف پھیلی ہوئی دنیا میں
سی جگہ تلاش کرتی ہیں جہاں میرا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے
ن کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا...... نہیں، میں اپنی بیوی
کو لے کر کہیں نہیں جاؤں گا — مگر میرا مستقبل کیا ہوگا؟
ان تصاویر میں سے کوئی ایک تصویر ..... نہیں....
ہیں۔ ایک گہری افسردہ دہشت نے میرے سارے وجود
جھنجھوڑ کر رکھ دیا....... میرے اندر منفی اور مثبت
یال کی کشمکش ہونے لگی.......

ہاں — نہیں — نہیں — ہاں ......
میں اندر سے بری طرح ٹوٹ جاتا ہوں اور نہ چاہتے
ہوئے بھی اس تصویر کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کس طرح بلبلا کر
ا ہوگا معصوم اپنی ماں کی لاش سے جب تیر اس کی نرم و

نازک پھیلیوں میں پیوست ہوا ہوگا۔ اور وہ انسان! وہ خود
قہقہے لگا رہے ہوں گے اُس کے گرد جیسے میرے محلے کے
آوارہ بچے پلّے کو پتھر مار کر اس کی کاؤں کاؤں سے لطف
اندوز ہوتے ہیں۔

کتنے بچے مرے ...... کتنی عورتیں.... آہ!
تین لمبی قطاریں بچوں کی لاشوں کی اور ایک عورتوں
کی لاشوں کی ..... ننگ دھڑنگ لاشیں ...... ننھے
منے بچے، دیش کے مستقبل، معصوم ان میں تو ایک بالکل چھوٹا
ہے۔ شاید ڈیڑھ سال کا ...... تمام ایسے لگ رہے تھے جیسے
ابھی سوئے ہیں ماں کی لوری سن کر ..... گہری نیند لگی ہے
انہیں .... بلا کی معصومیت ہے ان نونہالوں کے چہروں پر
...... انہیں موت کا مزہ کیسے چکھایا گیا ہوگا — بچے
تو موت کے سامنے بھی مسکراتے ہیں، کیوں کہ وہ کچھ نہیں جانتے
کیا کسی کا دل نہیں پسیجا ہوگا۔ کسی کو اپنی اولاد کا خیال
نہیں آیا ہوگا؟؟ !! جس طرح مجھے اپنے بچے کا خیال آرہا ہے
جو ابھی تنہا پلنگ پر سویا ہوا ہے۔ آسمانی کلر کی بش شرٹ
میں ملبوس مرا پڑا ہے۔ لاشوں کی دوسری قطار میں.....
مجھے اس تصویر کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے
لاشوں کا دسترخوان سجا ہے اور ابھی آدم خور درندے آکر انہیں
کھا جائیں گے ....

نہیں ابھی اتنی بھوک نہیں بڑھی ...... ابھی تو
انہیں بس ان کا خون ہی [illegible] تھا۔ میرے ذہن میں کوئی کہہ رہا
ہے ...... اور میں [illegible] پر جمی ہوئی تھیں لاشوں
کی قطار کے سامنے بڑا سا گڑھا کھدا ہوا ہے۔ اس کے کنارے
مٹی کے ڈھیر پر ایک شخص بچے کی لاش کو گڑھے میں ڈالنے
کے لئے اسے بے ڈھنگے پن سے اٹھائے کھڑا ہے۔ مجھے ایسا لگ
رہا ہے جیسے دیش کا مستقبل دفن کیا جا رہا ہے......
" یہی سلوک اگر تمہارے بیوی بچے کے ساتھ کیا

بقیہ صفحہ ۵۵

علی حیدر ملک
(پاکستان)

ڈاکٹر ابن فرید سے ایک گفتگو

ڈاکٹر ابن فرید کی زندگی مسلسل عمل اور جد و جہد سے عبارت ہے۔ عام طور پر ایسے لوگ انتہا پسندی کے شکار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت میں حیرت انگیز طور پر اعتدال اور توازن کا عمل دخل نظر آتا ہے۔

وہ تحریک ادب اسلامی کے اولین علمبرداروں میں سے ایک ہیں اور اس تحریک کے لئے انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی لئے اسلامی ادب کے حلقے میں انہیں ایک قائدانہ مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے حلقے بھی انہیں عزت و احترام کے ساتھ دیکھتے ہیں جس کا سبب ڈاکٹر صاحب کا خلوص و تحمل، وسیع مطالعہ اور علمی رویہ ہے۔ وہ ایک ایسے دانشور ہیں جو اپنے نظریے پر قائم رہتے ہوئے بھی اپنے مخالفین کی خوبیوں کی داد دینا جانتے ہیں۔ اس سادہ طبیعت اور راست فکر دانشور کی باتیں سوال و جواب کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔

س : ڈاکٹر صاحب! آپ نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ کبھی کبھی شعر گوئی بھی کی ہے۔ لیکن آپ بنیادی وسیلۂ اظہار کس صنف کو سمجھتے ہیں؟

ج : میں نے اپنے کیریر کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی تھی۔ میرا پہلا افسانہ ماہنامہ "شمع" میں اس وقت چھپا جبکہ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ پہلے افسانے کی اشاعت کے بعد خواہش پیدا ہوئی کہ اور افسانے لکھوں۔ کچھ افسانے لکھے بھی لیکن انہیں معروف اور بڑے پرچوں میں بھیجنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لہٰذا یہ غیر معروف رسالوں میں چھپے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۷ء تک باقاعدہ افسانے لکھے جو معیاری رسالوں میں شائع ہوئے۔ میرے لئے افسانہ فطری اظہار کا ذریعہ تھا۔ تنقید لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن جب میں "ادیب" کے ادارہ میں شامل ہوا جو کہ تنقیدی و تحقیقی پرچہ تھا تو تنقید لکھنی شروع کی۔ میں نے اپنا پہلا مضمون قاضی عبدالغفار کے بارے میں لکھا جو پسند کیا گیا۔ اس کے بعد کچھ اور مضامین لکھے۔ تنقید میں میری اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی کہ میں نقاد بن گیا۔ اب طویل وقفے کے بعد

میں نے دوبارہ افسانہ نگاری شروع کی ہے۔ افسانے لکھ کر مجھے ایک طرح کی تشفی حاصل ہوتی ہے۔

س : آپ نے جب افسانہ نگاری شروع کی تو کسی دشواری کا احساس ہوا یا نہیں۔ اس لئے کہ اس اثنا میں اردو افسانے میں ہیئت اور مواد کی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ مزید یہ کہ اپنے پہلے دور کے افسانوں اور دوسرے دور کے افسانوں میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج : میں نے ۱۹۵۷ء تک جو افسانے لکھے وہ میری نظر میں خام افسانے تھے۔ لیکن مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اب میں افسانے لکھ سکتا ہوں۔ اس احساس کے باعث مجھے افسانے لکھنے میں کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میرے شروع کے افسانے بیانیہ تھے۔ اس کے باوجود میں نے کوشش کی تھی کہ ہر افسانے میں تیکنیک کا کوئی نیا تجربہ کیا جائے۔ مثلاً ۱۹۵۴ء میں میں نے اسرائیلیات پر ایک افسانہ لکھا۔ جس میں شیطان کا کردار پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں "دامنِ یوسف" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ جس کا ڈکشن اردو بائبل کا ڈکشن تھا۔ یہ افسانہ میں نے ایک حدیث کی بنیاد پر لکھا تھا۔ پھر ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک میں نے بغیر کہانی کے افسانے لکھے بیانیہ اب بھی میرے ہاں موجود ہے لیکن اسے میں اسٹوری ٹیلنگ نہیں بننے دیتا۔

س : آپ نے اپنے مضامین میں فنی بحثوں کے علاوہ مختلف ساجی علوم سے بھی بحثیں کی ہیں۔ کیا آپ ادبی تنقید کے لئے اسے ضروری سمجھتے ہیں؟

ج : پہلے تو میں یہ عرض کر دوں کہ میں خود نقاد نہیں بنا۔ لوگوں نے مجھے نقاد بنا دیا۔ اسی لئے تنقید کے سلسلے میں میرا کوئی دعویٰ بھی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ "بوطیقا" کا ترجمہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ارسطو کے ہاں علم کی جو وسعت ہے وہ ہمارے تنقید نگاروں کے ہاں کیوں نہیں ہے۔ ادب کا مطالعہ دراصل گلوب کا مطالعہ ہے۔ جس میں ہر آدمی کا زاویہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ مغرب میں بین العلومی مطالعہ ادب کے مطالعے کے سلسلے میں بہت مقبول ہو گیا ہے۔ جس سے ادب کے مطالعہ کی کائنات وسیع ہوتی گئی ہے۔ میں نے بھی تنقید میں مختلف علوم سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ دوسرے لوگ کریں گے۔

س : اس نقطۂ نظر سے آپ اردو کے کن نقادوں کو اہم سمجھتے ہیں؟

ج : سب سے پہلے میں شیخ محمد اکرام کے "مطالعہ غالب" کا نام لوں گا۔ اس کے بعد میرا جی ڈاکٹر وحید قریشی، محمد حسن عسکری ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر ممتاز حسین اور محمد علی صدیقی کا۔ ہندوستان میں سید محمد عقیل اور ڈاکٹر محمد حسن نے بھی اسی اپروچ کے تحت لکھا ہے۔

س : آپ اسلامی ادب کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، اس لئے آپ یہ بتائیں کہ ادب میں مذہب سے وابستگی کا تصور آپ کے نزدیک کیا ہے؟

ج : آپ سرے سے آزاد کبھی نہیں ہو سکتے۔ کسی نہ کسی قسم کی وابستگی ضروری ہے۔ جو لوگ زبانی طور پر غیر وابستگی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔ معین احسن جذبی نے ایک بار کہا کہ میں تین دن دہریہ رہا لیکن یہ تین دن گزارنا میرے لئے دوبھر ہو گیا۔ یہ بات بھی آپ کو بتا دوں کہ میں نے اسلام کو محض اپنے آبا و اجداد کے مذہب کے طور پر قبول نہیں۔

کیا۔ میں نے خود اسلام کا مطالعہ کیا اور اس کے مثبت تصورات اور اقدار کا قائل ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب کی قدریں اور اس کی جمالیات اسلام کے حوالے سے تعمیر ہوتی ہیں۔ اگر ہم آسمانی صحیفوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں بہت سی ایسی چیزیں ملیں گی جن کی پیروی ادب میں کی جاسکتی ہے بلکہ کی جانی چاہئیے۔

س : آپ نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت ترقی پسند تحریک کا زمانہ تھا اس کے بعد جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اِن دونوں تحریکوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : ترقی پسند تحریک میں بیشتر لوگ ترقی پسند نہیں تھے بلکہ اشتراکی سیاسی تحریک نے انہیں زبردستی اس میں شامل کرلیا تھا مثلاً منٹو، بیدی، مجاز وغیرہ۔ ویسے ترقی پسند تحریک کا ادبی کنٹری بیوشن بڑا نہیں ہے۔ تنقید میں بھی غیر ترقی پسند نقاد نمایاں تھے مثلاً کلیم الدین احمد کے پائے کا نقاد کوئی ترقی پسندوں میں نظر نہیں آتا۔ جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے تو میں اس کا ستایا ہوا ہوں۔ وارث علوی نے میرے خلاف ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے جدیدیت کے حوالے سے ان لوگوں کے خلاف لکھا۔ جو منفی اقدار کو فروغ دے رہے تھے۔ جدیدیت پسندوں کا اصرار ادب اور فن پر ہے۔ یہ کوئی نظام فکر نہیں پیش کرتے۔ یہ ادب کے لئے زیادہ کارآمد نظریہ نہیں ہے۔ زبان اور ہیئت کے تجربے محض صناعی ہوتے ہیں فنکاری نہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بہتوں کو برباد کرکے خود کو بنالیا ہے۔ انہیں بھی اب یہ احساس ہوگیا ہے کہ ادب صرف فن کا اظہار نہیں ہے۔ یہ زندگی کا تجربہ اور تجزیہ ہے۔

س : جدیدیت پسندوں نے ادب کی کوئی خدمت نہیں کی؟

ج : ان کے ہاں تنقید کی اہمیت ہے۔ شاعری اور افسانے میں جو اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ وہ جدیدیت کے نسخے کے مطابق نہیں ہیں۔

س : آپ نے کہا کہ جدیدیت پسندوں کے ہاں تنقید کی اہمیت ہے۔ یہ اہمیت کن لوگوں نے قائم کی یا کن کی وجہ سے قائم ہوئی؟

ج : شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، فضیل جعفری اور مظفر علی سید ان کے اہم نقاد ہیں۔ جہاں تک افسانے کا تعلق ہے تو سریندر پرکاش کے پاس صرف دو افسانے ہیں۔ "بجوکا" اور "بازگوئی" انتظار حسین، خالدہ حسین، جوگیندر پال کلام حیدری اور غیاث احمد گدی مکمل طور پر جدیدیت پسند نہیں ہیں مگر ان لوگوں نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ یہی بات انور سجاد اور رشید امجد کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ملک صاحب! یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں۔ وہ یہ کہ میں آپ کو اور آپ کی نسل کے دوسرے لوگوں کو جدیدیت پسند نہیں مانتا۔ میں آپ لوگوں کو نئی نسل کہتا ہوں۔ آپ کی نسل کے یہاں شکست خوردگی کی بجائے حوصلہ نظر آتا ہے۔ اس میں POTENTIALITY بھی زیادہ ہے۔ جدیدیت محض ایک محدود عرصہ کا معاملہ ہے۔ جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک پر محیط ہے۔

س : اردو ادب کی بعض نئی اصناف مثلاً نثری نظم، آزاد غزل اور انشائیہ وغیرہ کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

ج : نثری نظم اردو زبان کی ساخت اور اردو کے شعری مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ آزاد غزل جس شکل میں پیش کی جارہی ہے وہ آزاد نظم کی شکل ہے۔ انشائیے لکھے گئے ہیں لیکن یہ ابھی اولین [illegible] تنقید کے مقام تک نہیں پہنچ سکے ہائیکو اور ترائیلے کے تجربے ویسے ہی ہیں جیسے کہ ایک زمانے میں سانیٹ کے تجربے کئے گئے تھے۔

بقیہ صـ ۲۲

اصغر امام

انشائیہ

غصّہ

ہنسنے اور رونے کی طرح غصّہ بھی ایک فطری اور انسانی فعل ہے۔ جس کا فاعل وقتاً فوقتاً اس عالمِ فانی کا ہر ذی ہوش بنتا رہتا ہے۔ غصّے کی دیوی عمر، رنگ، روپ، مذہب، ملک، مسلک اور پیشہ کے بلاتفریق ہر کسی پر مہربان ہوتی رہتی ہے۔ لیڈر ہو یا شاعر، ولی ہو یا شیطان، فلسفی ہو یا عالم، پروفیسر ہو یا ماسٹر، کالج کا اسٹوڈنٹ ہو یا اسکول یا مدرسے کا، رشی منی ہو یا چور گرہ کٹ، آفس کا آفیسر ہو یا مل کا مزدور، پارلیامنٹ کا ممبر ہو یا اسمبلی یا میونسپلٹی کا — غرض کہ ہر کس وناکس پر اس کا حملہ ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر حملے کی شدت کے نوعیت کے مطابق ہوتا ہے۔

رولنگ لیڈران کو اپوزیشن لیڈروں پر، شاعر کو شاعری سے بے بہرہ لوگوں پر، ادبا کو رسائل کے مدیران حضرات پر، چوروں اور اچکوں کو پہرہ داروں پر، گرہ کٹوں کو خالی جیبوں پر، طالب علموں کو امتحان کی سختیوں پر، ڈاکٹر کو صحت مندوں پر، وکلا کو گواہوں کی راست گوئی پر اکثر و بیشتر غصّہ آتا ہے۔

غصّہ رشی منی کا ہو یا شیطان ولی کا — اس کے اثرات ہمیشہ منفی و تخریبی ہوتے ہیں۔ ولیوں کا غصّہ تو اوّل درجہ کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو ان کو غصّہ آتا ہی نہیں ہے اور اگر آتا ہے تو بس ایک نظر جلا کر خاک کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

غصّے کی نوعیت کے مطابق اس کا اثر ذاتی، ملکی اور بین الاقوامی ہو سکتا ہے۔ غصّے کے اثرات کے یہ حدود ان باتوں پر منحصر کرتے ہیں کہ غصّہ کرنے والا کون ہے۔ اگر غصّہ کرنے والا کوئی ہمہ شمہ انسان ہے تو اس کا اثر اس کے گھر یا احباب کے حلقے سے زیادہ نہیں۔ اگر غصّہ اربابِ سیاست کا ہو تو اس کا اثر بین الاقوامی ہوتا ہے۔ گھر کی مالکن کے غصّے کا اثر ایک CHAIN REACTION کی شکل میں ہوتا ہے۔ بیگم غصّہ ہوں تو اس کا اثر سب سے پہلے صاحب پر پڑتا ہے۔ صاحب اس کا بخار آفس میں بڑا بابو پر نکالتے ہیں۔ بڑا بابو اس بوجھ کو کلرک پر جھٹکتے ہیں۔ کلرک اس بارِ گراں کو چپراسی کے حوالے کرتا ہے۔ چپراسی اپنے گھر جا کر اپنی بیوی پر برس کر اس دائرے کو پورا کرتا ہے۔

گھر کی مالکن کا غصہ نوکروں پر بڑا ہی رنگ لاتا ہے ۔ عموماً اس حالت میں وہ داغِ مفارقت دے جاتے ہیں ۔ مگر اکیلے نہیں جاتے ۔ گھر کی یادتازہ کرنے کے لئے گھر کے کچھ ساز وسامان بھی ساتھ لے جاتے ہیں ۔ اور ادھر شوہر بے چارے کو شام کو مارکیٹ کا طواف کرنا پڑتا ہے ۔ اس طرح بیگم کا غصہ خواہ کسی پر ہو ہدف تیر بے چارہ شوہر ہی بنتا ہے ۔

غصہ اور پیار میں بہت گہرا رشتہ ہے ۔ یہ اکثر ایک دوسرے کے آگے پیچھے رہتے ہیں ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے پیار پر غصہ آتا ہے اور کبھی غصے پر پیار ۔ کسی کے غصے پر پیار مرد کا طرۂ امتیاز ہے ۔ مرد بیچارہ روزِ ازل سے غصے میں پیار کا پہلو تلاش کرتا چلا آرہا ہے ۔ جب کہ آخری الذکر صنفِ نازک کے لئے مخصوص ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ غصے کی تعریف کیا ہے ؟ عالموں کے مختلف نظریے کیا ہیں ؟ آئیے ملاحظہ فرمائیے ۔

" علم مجبوریات " کی ایک تعریف کے مطابق ـــــ " جب انسان کچھ نہ کرپانے کی حالت میں ہوتا ہے اور اس وقت جو کچھ کر بیٹھتا ہے وہ غصہ ہے ۔ "

غصے کی ایک اور تعریف یوں کی گئی ہے ۔ انسان جس لمحہ خود کو کمزور سے کمزور اور بے بس سے بے بس تصور کرتا ہے بس اسی لمحہ وہ غصہ میں ہوتا ہے ۔

علم العصبیت میں غصے کی وضاحت کچھ اور دوسرے ڈھنگ سے کی گئی ہے ۔ اس کا تعلق آنکھوں سے بتایا گیا ہے آنکھیں جس کو دیکھتی ہیں اور جو کچھ عقل سلیم نہیں کرتی تو ذکاوت و بصارت میں جو جنگ چھڑتی ہے غصہ اسی کا ردعمل ہے ۔

غصے کی مختلف تعریفیں بیان کرنے کے بعد اس کی تشخیص بھی نہایت ضروری ہے ۔ کوئی شخص غصے جیسے موذی مرض کا شکار ہو گیا ہے اس کی آپ تمیز کیسے کریں گے ؟ ملاحظہ فرمائیے ۔

پلکیں تنی ہوئی ہوں ، آنکھوں کے زاویے بگڑے ہوئے ہوں ، نتھنے پھولے ہوئے ہوں ، منہ سے نرم ونازک الفاظ کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں ۔ ہاتھ حرکت میں ہوں اور ساری چیزیں منتشر کی جارہی ہوں تو آپ یقین جانئے کہ اس پر غصے کا دورہ پڑا ہوا ہے ۔

غصے کا کوئی سیزن یا وقت نہیں ہوتا ۔ دن ہو یا رات ، سردی ہو کہ گرمی ، سو رہے ہوں یا جاگ رہے ہوں ـــ غصہ کسی بھی وقت آسکتا ہے ۔ خواب کی حالت میں جو غصہ آتا ہے ۔ وہ بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے ۔ خوابیدہ حالت میں انسان انہیں ہستیوں پر غصہ کرتا ہے جن پر وہ حالت بیداری میں غصہ نہیں کرسکتا ۔ شوہر غریب اپنی رفیقۂ حیات پر ، آفس کا بابو اپنے صاحب پر اور چھوٹے لڑکے اپنے معلموں پر عموماً خواب کی حالت میں ہی غصہ کرتے ہیں ۔

وجوہاتِ غصہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جو بہت سارے کلیئے پیش کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غصہ جسم انسانی میں ایک گیس کی شکل میں پیدا ہوتا ہے جو اوپر اٹھ کر دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے ۔ اس کلیئے کو پیش کرنے والے اس کے حق میں یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ روزہ داروں کو روزہ کی حالت میں ہی سب سے زیادہ غصہ آتا ہے ۔ مگر بعض کسی قسم کے نقادوں نے اس نظریے کو باطل قرار دیا ہے اور توجیہ پیش کی ہے کہ عملاً مزدور بھی تو ... پیٹ رہتے ہیں ۔ مگر ان کو اپنے مالکین پر شاذونادر ہی غصہ آتا ہے ۔ اگر انہیں غصہ آتا تو دنیا بھر کے لیبر اداروں کی ضرورت ہی کیوں پڑتی ۔

بقیہ صہ ۲۲

بے ضمیری ؟

بلراج حیرت

نہیں میرے بھائی نہیں
یہ قبیلے نہیں
نسل و مذہب نہیں
رنگ و فرقہ نہیں
مُلک گیری نہیں
باغیانہ چلن بھی نہیں
اس پہ بندش بھی ہرگز نہیں
شہر کی روح اچھی طرح جانتی ہے
کہ ان سب کا ہے مقصد العین انسان کا شر

نہیں میرے بھائی نہیں
میں سمجھتا ہوں کیا ہے ضمیروں کی موت
آدمی کی ہوسناکیاں کیا جانتی ہیں
یہی سانحے چھین لیتے ہیں اولادِ آدم سے
ہر جو ہر آدمیت
انھیں سانحوں نے جلائے ہیں گھر دن دہاڑے
مگر بے ضمیری میں اتنی حرارت کہاں
آدمی کی ہوسناکیوں میں یہ شدت کہاں
جس سے عصمت دری شہر کی ہو

نہیں میرے بھائی نہیں
اس کا باعث حقیقت میں ہے،
ایک پاگل ہوا
ہاں میرے بھائی پاگل ہوا
روزِ اوّل سے ہے ایک پاگل ہوا
کارفرما
وہی تھی جو زندہ ضمیروں کی
آنکھوں میں تیزاب بھر کر
اڑا لے گئی شہر کو اس کی جڑ سے

نہیں میرے بھائی نہیں
شہر کی جڑ زمیں میں نہیں تھی
وہاں اس ہوا کے اثر میں
بزرگوں کی نوخیز نسلوں نے
کسی بے گناہ کا لہو رکھ دیا تھا

نہیں میرے بھائی نہیں
شہر کی روح اچھی طرح جانتی ہے
ابھی اس لہو سے بزرگوں کو
نجات نہیں ہے
ابھی وہ لہو اور اس کی تڑپتی ہوئی
روح بے کس
زمیں اور اس شہر کے درمیاں
حدِ فاصل بنے ہیں
ہر اک شخص سے خون بہا مانگتے ہیں

نہیں میرے بھائی نہیں
بے گناہ خون کا خون بہا ہے
اسے اس کا منصب دلانا
سر آنکھوں پہ اس کو بٹھانا
جو معصوم قاتل ہیں اس کے
انھیں بخشوانا
زمیں میں اب شہر کی جڑ جمانا

نہیں میرے بھائی نہیں
شہر کی روح اچھی طرح جانتی ہے
زمیں میں پہنچ کر جڑیں شہر کی کھا نہ جائیں کہیں
پاگل ہوا کو
ہواؤں کا مرنا تو ممکن نہیں ہے
ہوائیں امر ہیں
وہ پاگل ہوا پھر بھی چلتی رہے گی
مگر ہم جو اپنے بزرگوں کی مانند ٹھوکر نہ کھائیں
تو پاگل ہوا کے ارادوں کو جو اُس نے ہم کو
کہ پھر شہر پر ہاتھ چھوڑ دیں

نہیں میرے بھائی نہیں
یہ ممکن نہیں ہے
اگر شہر کی جڑ زمیں میں جمے
شہر کے پاؤں دھرتی پہ ہوں
شہر پاگل ہوا کو سمیٹے تو دیں پاس اپنے
یہ پاگل ہوا شہر کا راستہ بھول جائے
چلو شہر کے پاؤں دھرتی پہ رکھیں
اگر ہم بھی جو کے
تو پھر شہر کی روح بے جسم رہ جائے گی
شہر کی روح کو جسم دے دو

●●

نظمیں — صبح کی

نجم باگے

(۱)

میں تم پہ ہر سو چھایا تھا
تم مجھ پہ تھل تھل برسی تھیں
اب کے ساون گونگا جائے
میں ہاتھوں کے نین پسارے
اپنے سارے خواب سنوارے
بیل ادھوری پڑھتا جاؤں
تم آنگن کے کونے کھدرے
کل کے میٹھے بول چنو گی

(۲)

میں جاگوں گا
تم سوؤ گی
بات یہیں پہ ختم نہ ہوگی
دیکھو اپنی ضد کو چھوڑو
خواب کو تم کیسے روکو گی
رات بھر تو
تم میں رہتا ہوں

(۳)

تم تھکن کی رات پرانی
میری باتیں صبح سہانی
جاڑے کی راتوں میں جاگے
چھل چھل کوئی بات سیانی
ایک تھکن انگڑائی لے کر
پلٹو جب آنگن کی جانب
سرخ سپیدی ہر سو ہوگی

(۴)

ایک ذرا سی بات پہ تم نے
سارے رشتے ڈھانک کے رکھے
یہ تو سوچا موسم بدلے
شام ڈھلے بھی بارش ہوگی
تب میں شاید
کل کی سونی بات بنوں گا

(۵)

میں رستے کی گرد دیوانی
تم آنگن کی ریت پرانی
آنکھوں میں رستوں کو رکھنا
کروٹ کروٹ میں لوٹوں گا
ایک صبح جب تم جاگو گی
...ارا آنگن ہے [illegible] طے گا

فضا ابن فیضی

غزل

جو شاہیں تھے، کبوتر ہو گئے ہیں
ہوا کے ہاتھ خنجر ہو گئے ہیں

وہ موسم ہے کہ ہنستے بولتے لوگ
اداسی کا مقدر ہو گئے ہیں

دھوئیں کی شام، شعلے کا سویرا
یہ کیا لمحوں کے تیور ہو گئے ہیں

گھر آنگن، پیاس کے پہرے ہیں، لیکن
گلی، کوچے، سمندر ہو گئے ہیں

پشیماں ہیں اڑانیں بھرنے والے
شکستہ سارے شہپر ہو گئے ہیں

نشیمن ہیں، کہ افسوں گاہِ آشوب
پرندے گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں

جنھیں سونپی گئی عقدہ کشائی
وہ ناخن بڑھ کے نشتر ہو گئے ہیں

شفق چہروں پہ لکھتا ہے لہو کون
کہ سب زخموں کا محضر ہو گئے ہیں

چٹختی ہڈیاں، ادھڑے ہوئے گوشت
عجب ماحول و منظر ہو گئے ہیں

بدن پر گہرے سناٹے کی چادر
نفس، سینے کے باہر ہو گئے ہیں

اب ان آنکھوں کو رکھ آؤں کہیں اور
مہکتے خواب، پتھر ہو گئے ہیں

سلگتے ہیں کچھ آئینوں میں جوہر
کچھ آئینے مکدر ہو گئے ہیں

گھنی چیخوں میں ڈوبی ہیں اذانیں
صحیفے خون میں تر ہو گئے ہیں

چہکتے تھے جہاں معصوم بچے
وہ گھر، نوحوں کا دفتر ہو گئے ہیں

یہی پیوند اب سرمایہ اپنا
کسی مفلس کی چادر ہو گئے ہیں

نہیں ہمت، کہ چاک جسم دیکھیں
بہت دیوار میں در ہو گئے ہیں

فضا ہم پر جو گزری ہے نہ پوچھو!
ہزیمت خوردہ لشکر ہو گئے ہیں

گیا

زل

مُصَوّر سبزواری

ا اس جنگل میں رُکنا دھوپ جب جانے لگے
گے سورج کی کوئی لاش دفنانے لگے

ل ترکش سے بھی آجاتے ہیں زہر انگیز تیر
نے بھلانا اس قدر اس کو کہ یاد آنے لگے

، گرداب پسِ الفاظ سے اُبھرے گا اب
اپنی عظمتوں کے گیت سب گانے لگے

گئے سڑکوں پہ اک قربت کا سا سہما قدم
، میں بیٹھا پھر کوئی دیوارِ جاں ڈھانے لگے

بھر بھی آئینوں سے کل جُدا ہوتے نہ تھے
گھر کے آئینوں سے ہم سزا پانے لگے

ہی آہٹ کا پیچھا کرتے کرتے یوں ہوا
ہو سارا جسم تھے پھر سائے کہلانے لگے

غزل

ناصر بغدادی

ذکر اب ہو رہا ہے یہ کس کا
رنگ اُڑنے لگا ہے مجلس کا

ین کہ خلوت میں سامنے اُس کے
ذکر کرنے لگا ہوں کس کس کا

عشق وہ بھی امیر لڑکی سے
خواب دیکھو عجیب مفلس کا

زندگی کو سمجھ لیا میں نے
ہے بھرا جام یہ بِس کا

اُس نے پھر پیار سے پکارا ہے
نام بھولا ہوا تھا میں جس کا

سوشلزم کا دور ہے لیکن
حال دیکھو تو کیا ہے مفلس کا

زندگی مل گئی ہے جن جن کو
وہ نہیں جانتے مزا اس کا

غزل

رئیس الدین رئیس

میرا خلوص مجھ کو سبق ہو کے رہ گیا
دل اک کٹا پھٹا سا ورق ہو کے رہ گیا

آہیں پریشاں روحوں کی ایسی بلند تھیں
اچھا بھلا مکان بھی شق ہو کے رہ گیا

دولت نے آج کیسا کرشمہ دکھا دیا
قبضہ جو غاصبانہ تھا حق ہو کے رہ گیا

جب بھی خلوصِ دوستاں ہم نے بیاں کیا
چہرہ مرے غنیم کا فق ہو کے رہ گیا

نکلے تو کیسے نکلے رواں سی کوئی غزل
یہ قافیہ تو یارا دق ہو کے رہ گیا

پرچھائیاں یوں چرخ نظر پر پڑیں رئیس
عارض کا رنگ رنگِ شفق ہو کے رہ گیا

غزل

غلام مرتضیٰ راہی

نہ مرا زور، نہ بس، اب کیا ہے
اے گرفتارِ نفس، اب کیا ہے

میں ترے واسطے آئینہ تھا
اپنی صورت کو ترس، اب کیا ہے

رہا جب تک رہا سمتوں کا زوال
آئی آوازِ جرس، اب کیا ہے

کس ہوا میں ہے تو اے ابرِ کرم
اب برس یا نہ برس، اب کیا ہے

دانے دانے پہ نظر ہے تیری
آہ یہ دامِ ہوس، اب کیا ہے

غزل

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

ابر چھایا تھا فضاؤں میں تری باتوں کا
کتنا دلکش تھا وہ منظر بھری برساتوں کا

بجھتی شمعوں کے تعفن سے بچانے کو تو
میں نے آنچل میں سمیٹا ہے دھواں راتوں کا

کوئی شہنائی سے کہہ دو ذرا خاموش رہے
شور اچھا نہیں لگتا مجھے باراتوں کا

لاکھ دروازے ہوں چپ اور دریچے خاموش
چوڑیاں راز اگل دیں گی ملاقاتوں کا

دھوپ بھی تیز ہے، شبنم کا بھروسا بھی نہیں
وقت بھی باقی نہیں اب تو مناجاتوں کا

غزل

اطہر نادر
کراچی

باتوں سے بہلاتے ہو تم بھی اور یہ دنیا بھی
خواب سا اک دکھلاتے ہو تم بھی اور یہ دنیا بھی

اپنے حال سے جب کوئی سمجھوتہ کرنے لگتا ہے
جھوٹی آس دلاتے ہو، تم بھی اور یہ دنیا بھی

اپنوں سے بیگانہ رہنا کتنی بڑی نادانی ہے
پھر بھی دانا کہلاتے ہو، تم بھی اور یہ دنیا بھی

سب کے دل کو لبھانے کا کیسا طریقہ آتا ہے
کیا کیا چھب دکھلاتے ہو، تم بھی اور یہ دنیا بھی

مسئلہ دل کا کوئی بھی آج تلک تو حل نہ ہوا
جانے کیا کیا کہلاتے ہو، تم بھی اور یہ دنیا بھی

اپنی آگ میں جلنے کا جس کو سلیقہ آتا ہے
اس کو ہی اور جلاتے ہو، تم بھی اور یہ دنیا بھی

نادر دل کی بات کوئی جب بھی کسی سے کہتا ہے
اندیشے اس کو دلاتے ہو، تم بھی اور یہ دنیا بھی

غزل

واحد پریمی

ہمیں اسیر ہیں یاس و غم کے غاروں میں
گھرے ہوئے ہیں سبھی وقت کے حصاروں میں

وفا ہے جرم تو ہم مجرمِ محبت ہیں
بڑے ہی شوق سے چن دو ہمیں دیواروں میں

یہ زندگی کی مسافت ہے کتنی سخت و گراں
کہ پا برہنہ ہیں ہم تپتے ریگ زاروں میں

جنہیں تھا زعم کبھی اپنی سخت جانی پر
وہ برگِ گل کی طرح اڑ گئے غباروں میں

تمام شہرِ تمنا میں ہو کا عالم ہے
امیدیں دفن ہوئیں یاس کے مزاروں میں

خلوصِ سبزہ و گل کا مآل ہے واحد
جو ہم نے عمر گزاری ہے شعلہ زاروں میں

غزل

ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی

نہ در گرا، نہ گری چھت، نہ سائبان گرا
گرا غریب کے سر پہ تو آسمان گرا

کھڑی ہے اب بھی پرانی حویلیوں کی فصیل
جنوں کے سیل میں لیکن نیا مکان گرا

سمندروں کا سفر حوصلوں کی ورزش تھی
ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں بادبان گرا

جنون و ہوش میں گھمسان کی لڑائی تھی
خرد کا طبل گرا، شوق کا نشان گرا

ہوائے شوق کی لہروں میں دھارداری تھی
پرِ احتیاط کا طائر لہولہان گرا

تھی حادثات کا مرکز شکارگاہ جنوں
کہ جیسے شست بندھی ویسے ہی مچان گرا

ہمارے پیروں کے نیچے زمیں کبھی نہ ٹکی
اگرچہ سر پہ برابر ہی آسمان گرا

بچاؤ کا بھی کوئی انتظام کر نہ سکے
مکاں گرا بھی تو بے سان بے گمان گرا

لہولہان تھا سارا خیال کا پیکر
گرا جو بامِ تصور سے بے نشان گرا

غزل

صابر فخر الدین

سامنے دُور تک سمندر تھا
اور میں مدّتوں سے بے گھر تھا

مجمعِ عام میں نکل آیا
وہ جو تنہائیوں کا خوگر تھا

آگے تھا میں سفید کپڑوں میں
پیچھے رسوائیوں کا لشکر تھا

حادثہ پھر وہی تو پیش آیا
جس کا مدّت سے آپ کو ڈر تھا

ایسی آسانیاں ملیں صابر
جن میں دشواریوں کا پیکر تھا

غزلیں

تمام قضیہ مکان بھر تھا
مکان کیا تھا جہان بھر تھا

یہ شہر لا حد و سمت میرا
گلوب پر اک نشان بھر تھا

تمام دھرتی کے گمان بھر تھے
تمام ذرّا امتحان بھر تھا

طمانیت بالشتوں بھر جل تھی
جو فکر تھا سیان بھر تھا

جو خلق تھا [illegible] بھر تھا
جو ربط تھا مہمان بھر تھا

جو جست تھی آپ مشت بھر تھی
جو شور تھا آسمان بھر تھا

راشد جمال فاروقی

وہاں پہنچ کے ذرا اپنی خیریت لکھنا
جو سچ نہ ہو اسے سچا بنا کے مت لکھنا

مشاہدات سنانا فراخ دل ہو کر
طبق طبق پہ طبع ہو پر نہ ہمت لکھنا

ہیں شرق و غرب و شمال و جنوب نا کافی
تم اب لکھو تو نئی سی کوئی جہت لکھنا

ہزار سال سے طوفانِ نوح برپا ہے
نصیبِ شہر میں امسال عافیت لکھنا

سفر کا عزم ہے اور دھوپ چلچلاتی ہے
کسی ضعیف برگد کی عاطفت لکھنا

غزل

عقیل گیاوی

فصیلِ کرب سے نیچے اُتارتا ہے مجھے
مرا غنیم کچھ ایسے پُکارتا ہے مجھے

نہ جس سے کوئی مراسم، نہ رابطہ قُم
وہ حرف حرف ورق پر اُتارتا ہے مجھے

یہ کس کی ذات کا سورج ہے ضوفشاں مجھ میں
یہ کون دشتِ انا سے پُکارتا ہے مجھے

کوئی تو ہے جو اِس عہدِ زوال میں اکثر
بکھر بکھر کے ہر اک پل سنوارتا ہے مجھے

رہا نہ کوئی مخالف تو رات کا منظر
مخالفت کے لئے پھر اُبھارتا ہے

مرے لہو کی حرارت کچھ اور کہتی ہے
ہوائے یاس کا جھونکا دُلارتا ہے مجھے

عقیلؔ اس کے تصوّر سے جی لرزتا ہے
وہ ایک خواب جو بستر پہ مارتا ہے مجھے

غزل

ظفر ہاشمی

انجمن انجمن آج کہرام ہے
کیسے کاغذ پہ لکھا مرا نام ہے

اک نیا موڑ دیں، اک نیا سلسلہ
سر کہانی کا کوئی تو انجام ہے

سنگِ آتش لیے سر پہ ہے آسماں
ایک طوفان بھی میرے ہمگام ہے

گھر سے نکلا ہوں زخموں کی لے کر بہار
دوستوں سے ملاقات کی شام ہے

جب سے سونا سمندر ملا ہے مجھے
کرب، سوزش، گھٹن، شور، ہنگام ہے

میں کہ خوابوں میں آ کے ڈستا رہا
میرے سر آپ کا یہ بھی الزام ہے

اپنی تختی سے مجھ کو مٹانا ظفرؔ
کھیل بچوں کا ہے کاوشِ خام ہے

تبصرے

نام کتاب : صاعقۂ طور

صنف ادب : تنقید

مصنف : تاج پیامی، لکچرر جین کالج، آرہ

ناشر : اُردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد

قیمت : پینتالیس روپۓ

مبصر : کلام حیدری

مصنف نے کتاب کے نام کے نیچے بریکیٹ میں یہ لکھنا ضروری سمجھا ہے ـــ

(کلیم الدین احمد کے باطل تنقیدی نظریات کی تنقیح)

" صاعقۂ طور " اس تنقیدی کتاب کا نام ہے جس کے نام سے یہ گمان گذرنا غالباً غلط نہیں ہے کہ یہ شعری مجموعہ ہوگا۔ نام سے کتاب کا تعارف غلط طور پر ہو جاتا ہے۔

" پیش گفتار " کے عنوان سے مصنف نے چند باتیں لکھی ہیں ـ یہ عنوان بھی کتاب کے نام کی طرح غلط ہے کہ گفتار سے پہلے تو خاموشی ہی ہو سکتی تھی۔

مصنف کا کہنا ہے کہ وہ انشائیے کے توسط سے غزل کی خوبیوں سے واقف ہوئے اور کلیم الدین احمد نے غزل کو جو نیم وحشی صنف شاعری لکھا اُس [illegible] صنف انشائیہ ہی مصنف کی بنیاد بنی، خود غزل کے سرمائے پر غور کر کے وہ کلیم الدین احمد کے اس بدنام زمانہ الزام کے غلط ہونے کو محسوس نہیں کر سکے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، خود مصنف کہہ رہا ہے، ملاحظہ ہو :

" اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انشائیہ نگار مختلف خیالات میں مماثلت پیدا کرتا ہے۔ (غالباً مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ غیر مماثل خیالات میں مماثلت پیدا کرتا ہے۔ کلام حیدری) اُنھیں ایک رشتہ میں جوڑتا ہے اور حسنِ ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے، میں نے اپنے اسی خیال سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ غزل پر نیم وحشی صنف شاعری ہونے کا الزام غلط ہے۔ غزل بے ربط خیالات کا طومار نہیں، اس میں انشائیہ سے کہیں زیادہ حسنِ ترتیب اور پابندی کا احساس ہوتا ہے۔ "

برسبیل تذکرہ مصنف کا ایک اور قول نقل کرتا ہوں :

" انشائیہ کے لیے مجھے بیکن اور جانسن کے نظریات گمراہ کن لگے۔ "

بیکن کو انگریزی تنقید میں، اس کے ESSAYS (۱۵۹۷ء) کو BRIEF, DOOMETIC, APHORISTIC وغیرہ کہا گیا ہے۔ سولہویں صدی کے بیکن کے ESSAYS کو اُردو کے انشائیے کے ساتھ جوڑنا کتنا مناسب ہے؟ بیکن کے ' انشائیہ ' کے لیے کیا نظریے ہیں؟ یہ بتایا نہیں گیا ہے۔

اُردو کے انشائیے عام طور پر PLAYFUL ESSAYS قسم کے ہیں۔ دوسری قسموں تک یہ [illegible] پائے ہیں۔ مثلاً EASY ELEGENCE کس انشائیہ نگار کے یہاں ہے؟ قارئین معاف کریں، میں ایک معمولی اور عبث یا دمی بات کہہ کے کر کہاں جا پہنچا۔ مجھے انگریزی تو کیا اُردو بھی نہیں آتی۔ اس لیے " صاعقۂ طور " جیسے مصنف کی طرح بیکن اور جانسن دونوں کا ایک ہی سانس میں نام لینے سے خود اپنا دم

نکل جانے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے۔

اس مضمون کے گیارہ مضامین محنت اور لگن کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور ہر مضمون میں کلیم الدین احمد کے خیالات اور ان کی تنقیدی بصیرت پر سخت تجزیاتی تنقید کی گئی ہے۔ کلیم الدین احمد کی اُردو تنقید پر اس سے بھی سخت تنقید جناب مغنی صاحب نے کی ہے۔ مگر صرف اقبال کے سلسلے میں۔ مگر مغنی صاحب نے کلیم الدین احمد کے بے شمار جملے خود اُن کے لیے استعمال اس طرح کیے ہیں کہ جیسے منہ چڑا رہے ہوں۔ پیامی صاحب نے اپنی تنقید کو غصے اور برہمی کے باوجود "منہ چڑانے" جیسی کیفیت سے بچالیا ہے اور وہ اپنی تنقید میں مغنی صاحب سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔

پیامی صاحب نے نقاد ہونے کے لیے جتنی بڑی شرط لگائی ہے اُس پر شاید وہ خود بھی پورے نہ اُتریں۔ اگرچہ اُن کی تنقید توجہ چاہتی ہے اور اسے "دانش ورانہ ہمدردی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

پیامی صاحب کی شرط یہ ہے:

"ایک اچھے ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا میں جتنے علوم و فنون ہیں ان سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا ہو ـــ"

"کچھ نہ کچھ" کی حد کیا ہوگی؟ یہ پیامی صاحب نے نہیں بتایا۔ انھوں نے خود تنقید لکھی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بسم اللہ خاں کے فن سے اُن کی "کچھ" واقفیت ہے کہ نہیں اور یہ بھی جاننا مشکل ہے کہ وہ SPACE SCIENCE کے بارے میں "کتنا کچھ" جانتے ہیں۔

بہرکیف، اس کتاب کے مطالعے سے فائدہ پہنچے گا، نقصان نہیں۔

نام کتاب: تیسری دُنیا کے لوگ (افسانے)
مصنف: ابن کنول
قیمت: بیس روپئے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ، اُردو بازار۔ دہلی
مبصّر: کلام حیدری

- ابن کنول نے تخلیقی میدان میں اس مجموعہ کے افسانوں کے ذریعے پہلا قدم اُٹھایا ہے۔
- وہ آٹھویں دہائی کے افسانہ نگار ہیں۔
- انھوں نے اُردو کی داستانوں کے تہذیبی کردار پر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے۔
- اس سند کی بنا پر اُردو میں افسانے کی روایت کا شعور وہ اپنے ہم سنوں سے کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔
- انھوں نے متعدد کہانیوں میں تکنیک کے جو تجربے کیے ہیں اُن میں داستانی اثرات کی شناخت آسانی سے کی جاسکتی ہے۔
- الغرض یہ مجموعہ موضوع، تکنیک اور تخلیقی رویئے کے لحاظ سے تازگی اور تنوع کا حامل ہے۔

اس مجموعہ میں شریک افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس کے ذریعہ اس کتاب کے بیک کور پر یہ اطلاعات ہم تک پہنچی ہیں۔ اور اس کتاب سے الگ چند اور باتیں بھی ڈاکٹر قمر رئیس نے بتائی ہیں:

★ آٹھویں دہائی نے اُردو کو اُس کی محبوب متاع گم شدہ، یعنی افسانہ واپس کر دیا۔

★ نام نہاد جدیدیت نے افسانے کو چیستاں بنا کر اُن ہزاروں قارئین سے اسے چھین لیا تھا، جو افسانے میں انسانی مسائل کے تخلیقی افسانوی اظہار سے مانوس تھے اور اسی کو افسانے کا الوٹ

جانتے تھے۔

ان باتوں پر بغیر کوئی تبصرہ کیے میں براہِ راست ابنِ کنول کے افسانوں پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے کسی ڈاکٹر کی سند ضروری ہوتی ہے مگر فن کار کے مرتبے کا تعین کوئی ڈاکٹر نہیں کرتا، اُس کے قارئین کرتے ہیں اور ہم عصر نقادوں سے زیادہ مستقبل کے نقاد معتبر ہوتے ہیں ——— یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، ادب کی تاریخ بتاتی ہے ورنہ سو دو سو سال تک گمنامی بلکہ بدنامی کے اندھیرے میں پڑی کارسوئی تخلیقات کی عظمت کا احساس آج نہ ہوتا۔

"پہلا آدمی" افسانہ یہ بتاتا ہے کہ :

"جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ بے راہ کر دے تو آپ اس کے لیے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پاویں گے۔"

یہ افسانہ "عصری آگہی" میں شائع ہوا تھا۔ اور اس میں "اُردو افسانے کی روایت کے شعور" کی جو صورت ہے وہ "عصر" کے ساتھ جڑ نہیں سکتی ہے اور ارضی نہیں ہے، اور مارکسی یا ترقی پسند نہیں ہے۔

اور قمر رئیس کی اِس عینک پر نوحہ نہیں اُترنے کے باوجود اچھا افسانہ ہے۔ چوں کہ اِس کا تعلق ظاہر سے نہیں ہے بلکہ ظاہر پر دہ ہے اُس باطن کا جو تخلیقی جوہر رکھتا ہے۔ ابنِ کنول کا وہ شعور جس کا ذکر ڈاکٹر قمر نے کیا ہے خالق ابنِ کنول سے شکست کھا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابنِ کنول تیسری دنیا کو کسی ایک دنیا سے باندھنے کی بجائے اُسے آزادی بخش سکا ہے۔

نامحسوس طور پر خود ابنِ کنول نے 'حرفِ آغاز' میں کے آخر میں جو لکھا ہے اس کی اِس افسانے میں نفی کی ہے

دراصل حرفِ آغاز لکھنے والا ابنِ کنول وہ ہے جو قمر رئیس کو پسند ہے اور افسانہ لکھنے والا ابنِ کنول وہ ہے جو مجھے پسند آیا۔

جی تو چاہتا ہے کہ دوسرے افسانوں کی دل کشی "معنویت" تہ داری پر بھی بات کروں جہاں تک "عصری آگہی" کی پہنچ نہیں ہو سکی ہے مگر تبصرے میں اتنی گنجائش نکالنا مشکل ہے۔

ابنِ کنول کو اپنے اندر کے خالق کو جگائے رکھنا چاہئے جو دل میں رہتا ہے اور اُس کی 'دماغ' سے نہیں بنتی اور کبھی نہیں بنے گی کیوں کہ وہ ڈاکٹریٹ کی دنیا سے نکل کر ضابطوں اور قوانین کے حبس سے نکل آیا ہے اور گریباں چاکی سے بہت قریب ہو گیا ہے۔

یہ مجموعہ پڑھے جانے کے قابل ہے اور مستقبل سے بہتر اُمیدیں وابستہ کرنا غلط نہیں ہے۔

قارئین

سواد و صوت

شفیع منیری ——— بھوجپور

محترمی ، ہدیۂ خلوص

ستمبر ۸۴ء کا آہنگ باصرہ نواز ہوا۔ عنوان چشتی ، نیّر جہاں اور منیر سیفی کاتی سے زیادہ پسند آئے۔ حسین الحق نے "خضرِ راہ" کے تحت جو کچھ لکھا ہے صدفی صد درست ہے میری رائے تو یہ ہے کہ بہار اُردو اکیڈمی پر کمیشن بیٹھایا جانا چاہئے اور یہ آواز صرف آپ ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ ہاشم عظیم آبادی کے شعری مجموعہ پر بیدا ورنگ آبادی کا تبصرہ پڑھا ؎

بلبل کو کیا پسند ہو ماحول باغ کا
بالا ہو جب کہ .بون گلستاں میں زاغ کا

مصرعۂ ثانی یوں درست ہو سکتا تھا ؏

ہو بول بالا جب کہ گلستاں میں زاغ کا

؎

ٹوٹے جوتے کی طرح باچھیں کھلیں عاشق کی
آپ دکھلا دیں اگر چہرۂ خنداں اپنا

مبصر نے اس شعر کی نزاکت کو سمجھا ہی نہیں۔ ؏

میری بیگم کی ہمشیر آج میرے گھر میں مہماں ہے

فاضل مبصر کو شاید معلوم نہیں کہ "ر" کا گرنا جائز ہے۔ اور یہاں پر "ر" گر نہیں رہی بلکہ وصل کر رہی ہے۔

؏ شیخ کو راس نہ آیا اس بڑھاپے کا نکاح

"نہ" زائد نہیں ہے۔ مصرع یوں پڑھا جائے۔ ؏

شیخ کو نہ راس آیا اس بڑھاپے کا نکاح

؏ گھٹا ئے جا رہے ہیں وزن اپنا اور بوجھ اُس کا

فاضل مبصر کو وزن کا تلفظ بھی معلوم نہیں ہے۔ وزن ، بروزن حزن صحیح ہے نہ کہ بدن۔

تارا چرن رستوگی ——— گوہاٹی

مکرمی ! تسلیم و نیاز

آہنگ شمارہ اگست ۸۴ء میں "شمس الرحمٰن فاروقی اور میر کی شرح" کے تحت میر کے درج ذیل دو اشعار کی بابت آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ فی الواقع آپ کی ژرف بینی کا آئینہ دار ہے ؎

وصل و ہجراں دو جو منزل ہیں یہ راہِ عشق میں
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ شعر میں قابل داد ابہام ہے۔ آج کل "ابہام" بہ بُری طرح شب خون مارے جاتے ہیں مگر مال غنیمت معروف تنقیدی تصنیف SEVEN TYPES OF AMBIGNITY کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ ذرا آگے بڑھ کے مطالعہ کرنے پر پتہ لگتا ہے کہ ذرا آگے بڑھ کے مطالعہ کرنے پر پتہ لگتا ہے کہ ابہام کی سات اقسام نہ کہہ کر ایک ہی اصطلاح PLENRISI-GAATION - یعنی تعدد علامت و معنی ہی سب پر محیط ہو جاتی ہے۔ محولہ شعر میں کوئی ابہام نہیں ہے ، بلکہ اسے بیدا ابہام بت کر اہمال کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل شعر کا مطلب وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے۔ غریب کے معنی میر کے زمانے میں رہزنی ہوتے تھے۔

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے - کسی زمانے میں غریب رہزنی کے مفہوم میں مستعمل رہا - تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کے دور میں میر کا یہ شعر کسی دلکشی کا حامل نہیں رہا ہے -
دوسرا شعر ؎

کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اس کے کوچے میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا

اس شعر میں ڈرامائی انداز دور تک نہیں ہے بلکہ معنی پہنانے کی کوشش میں " جوکری " انداز کی ڈرامائی کیفیت ضرور اُبھرنے لگتی ہے - مطلب و معنی وہی ہیں جو آپ نے بیان کیے ہیں - میرا خیال تو بلکہ یہ ہے کہ اب اس قسم کے اشعار جاذبیت و معنویت سے عاری ہو چکے ہیں - کلیم الدین احمد مرحوم کا یہ جملہ " اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے " دل یزداں میں کھٹکتا تو رہا ہے مگر ہے صداقت پر محیط -

عنوان چشتی ــــــــ نئی دہلی

براد رگرامی کلام حیدری صاحب

سلام و رحمت

۹ / کو ماہ رواں کا عنایت نامہ ملا - آپ نے جو اداریہ تصوف پر لکھا ہے ، واقعی وہ بہت معنی خیز ہے - تصوف ایک بے کراں آئینہ خانہ ہے ، یہ اہل نظر پر منحصر کرتا ہے کہ وہ اس آئینہ خانے میں کس زاویے سے داخل ہوتا ہے ، اور عکس و شخص کا مشاہدہ کرتا ہے -
آپ کے اداریے سے ایسا محسوس ہوا کہ آپ باطن میں جھانکنے کے لیے بے قرار ہیں - آپ نے تصوف پر مجھے سند اور معتبر جانا - یہ آپ کا حسن ظن ہے - ورنہ ایاز اپنی حقیقت جانتا ہے -
یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے " اردو شاعری پر تصوف " نام سے ایک کتاب قلم بند کی ہے -

مُصَوّر سبزواری ــــــــ گوڑگاؤں

برادر محترم کلام حیدری صاحب

آداب و نیاز !

پچھلے دنوں " آہنگ " کا شمارہ اگست باصرہ نواز ہوا - آپ کا ' کشکول ' اور شمس الرحمٰن فاروقی اور میر کی شرح " جو لکھا ہے وہ بڑی ذہانت سے لکھا گیا ہے - دراصل دور میں تنقید کی تنقید کرنا ہر ایک کا کام نہیں - آپ جہاں بین کا وہ راستہ اختیار کر رہے ہیں جو کبھی پروفیسر حامد حسن قادری اساتذہ کے اصلاح شدہ کلام پر اس طرح کیا کرتے تھے کہ THINKING اور RE - THINKING کی ایک نئی راہ خود بخود کھل کر جاتی تھی - بہرحال انتقادی ادب بھی اب آپ کی توجہ اور دسترس سے باہر نہیں -

بقیہ : "حشر کی تصویریں"

گیا تو "کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہے، کہا حشر اگر تمہارے اپنوں کا ہوا تو ؟؟!!"

اس سوال کے جواب میں میں سرتاپا لرز گیا۔ نہیں ..

..... نہیں، میرے ساتھ کیوں؟! مجھے کسی سے نفرت نہیں، دشمنی نہیں، پھر کوئی مجھ سے نفرت کیوں کرے گا۔"

یہ سوال کوئی ان لوگوں سے جا کر پوچھے جو فساد کرواتے ہیں اور جن کے نزدیک چہرے، لباس، حلیے، نام اور ذات کے ساتھ عضو تناسل بھی وفادار وطن اور غدار وطن کی شناخت ہوتی ہے۔

نوٹ :- میں تعلیم کی طرف سے فساد زدگان کی امداد کے لئے گیا تھا۔ وہاں ایک جلے ہوئے گھر میں مجھے درج بالا تحریر ملی۔ اس گھر کے تمام افراد مارے گئے جن میں ایک ڈیڑھ سالہ کا بچہ بھی تھا۔

بقیہ : شب گزیدہ

تھی اور کرسی پر بیٹھے اس کے بوڑھے باپ کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا، کمرہ خون سے لت پت تھا۔

لڑکا چند لمحوں تک حیرت بھری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر اس کی نگاہ ایک انگوٹھی پر پڑی جو پلنگ کے قریب فرش پر پڑی ہوئی تھی، لڑکے نے انگوٹھی کو اٹھا کر دیکھا، وہ اس انگوٹھی کو کتنی ہی بار دیکھ چکا تھا اور جس کی وہ انگوٹھی تھی اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔

لڑکے کے معصوم ذہن میں بار بار ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا ___ یہ انگوٹھی یہاں کیسے آئی ؟

بقیہ "ناموس کی چتا جلی"

یہاں تہذیب و ترقی کا کوئی پودا پروان نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ملامت کی چتا اور میگھا بیلا بھی تھی۔



ہمارا خراجِ عقیدت ـــــ اتّحاد

"ہم سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں، جس کی بندگی ہم مختلف ناموں سے ادا کرتے ہیں۔ اس لئے، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے لازمی اتحاد کو محسوس کریں، اور انسانوں کے درمیان، چھوت چھات، برتری اور کمتری کے احساس کو ترک کر دیں"

ایسا کہا تھا مہاتما گاندھی نے جنہوں نے اپنی ہستی کمزوروں کے لئے مکمل طور پر وقف کر دی تھی۔ باپو "پورے سماج کی فلاح" کے علم بردار تھے۔ سماجی انصاف ہمارا قومی نصب العین ہے، جس کے حصول کے لئے ہم کئی ترقیاتی پروگراموں پر عمل کر رہے ہیں، خاص طور سے 20 نکاتی پروگرام پر۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے لفظوں میں، "ملک کی ترقی کے تمام منصوبوں کا مقصد، اقتصادی بنیاد کو مستحکم بنانا ہے، تاکہ ہم لوگ بتدریج، اور اگر ممکن ہو تو بتعجیل، اپنے ملک سے غربت کا خاتمہ کر دیں، اور اپنے سماج سے اقتصادی پسماندگی کو اکھاڑ پھینکیں"

ہمارا عزم ـــــ پسماندگی کا خاتمہ

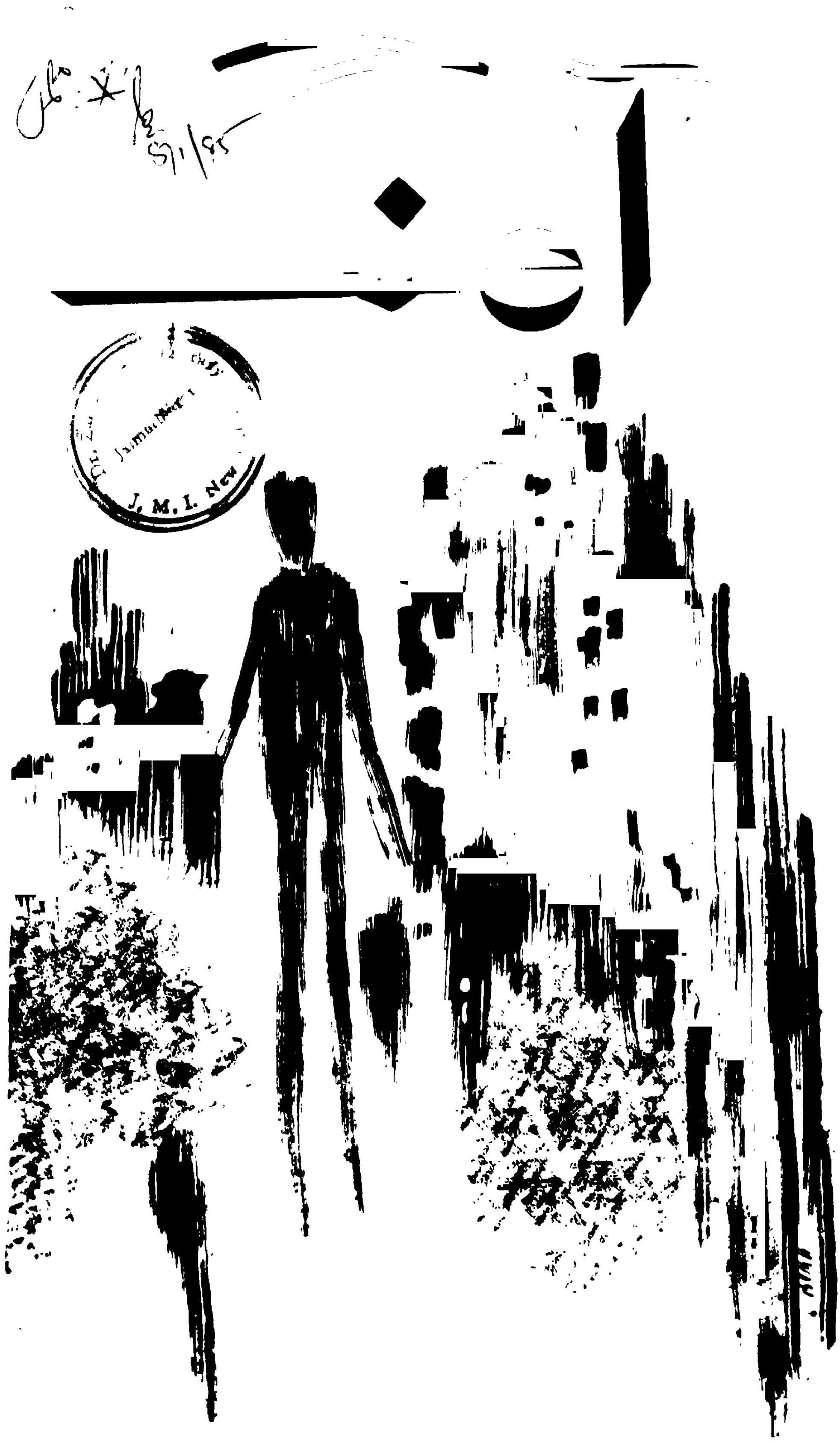
.. N Regd. 4253/64
.. T. Regd. No. Gy 5/84
Phone—432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

ادب اور تصوف

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-



دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری
ایک شمارہ
تین روپے

شرح خریداری
بارہ شمارے
چھتیس روپے

فون: ۴۳۲

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹرس
نوشابہ حق، عبدالصمد

دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا کی تمام مطبوعات (کتابیں، رسائل، پمفلٹ) میں شائع ہونے والی ادبی و نیم ادبی تخلیقات میں نام، مقام، واقعات، ادارے اور کردار سو فیصدی فرضی ہوتے ہیں۔ حقیقی افراد، مقام، واقعات، ادارے اور کردار سے اسکی مماثلت یا مطابقت محض اتفاقیہ ہے جسکے لئے دی کلچرل اکیڈمی (رجسٹرڈ) گیا کے کسی فرد، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، اراکین، معاون کارکن یا مصنف پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

کتابت محمد مسعود عالم امرولوی

محتویات

کشکول

مضامین

افسانے

انشائیہ

نظمیں

غزلیں

تبصرے

سواد و صوت

کشکول

"مجھے آج تک پتہ نہ چلا کہ میں کون ہوں ——" بیدی

یہ بیدی کا جملہ ہے۔ اور اس سے اگر کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ یہ عجز و انکسار کا اظہار تو یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ حد سے زیادہ انکساری کا اظہار کرنے والا ان کی نگاہ میں شاید زیادہ خطرناک انسان ہوتا ہے۔

بیدی نے "حد سے زیادہ" انکساری سے کام نہیں لیا اور نہ اس نے اپنے آپ کو کالی داس کا دوسرا روپ کہا۔ وہ تو بس جب قلم ہاتھ میں لیتا تھا تو اس کا قد اونچا ہو جاتا تھا۔ خیالات اور افکار کی بلندیوں اور تخیلوں کی اونچائیوں اور روشنیوں کے بل پر یہ زندگی کے اسرار و رموز کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔

مرنے کے لئے بیدی نے جس دن کا انتخاب کیا وہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے، کہ جب اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن —— سب ملک کی وزیر اعظم کے سفاکانہ اور بیکانہ قتل کی تفصیلات لوگوں تک پہونچانے میں مشغول تھے۔ اس وقت بیدی نے دنیا کو خیرباد کہا —— اور اس کی موت ایک معمولی سی خبر بن کر رہ گئی۔ حالانکہ بیدی عالمی ادب کا ایسا نام ہے جس کی حکومت کسی سرحد کی پابند نہیں۔ دلوں اور ذہنوں پر حکومت کرنے والا بیدی —— کتنی انکساری کے ساتھ معدوم ہو گیا۔

بیدی نے اردو زبان کے مرتبے کو بڑھا کر دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مد مقابل کھڑا کر دیا۔ مختصر افسانوں کے عالمی معیار تک پہونچنا دنیا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے جسے ایک لمحے کے لئے بھی بھولا جا سکے۔ بیدی نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ مختصر افسانوں کی بنا پر بھی عالمی ادب میں اپنی جگہ بنائی جا سکتی ہے، کوئی ضروری نہیں کہ ہزاروں صفحات کے ناول لکھ کر ہی کوئی پرش مہان ہو جائے۔

بیدی!

تم لاجونتی ہو یا لاجونتی کے شوہر ہو ؟

سچ تم نے ہمیں بھی یہ پتہ نہیں چلنے دیا کہ تم کون ہو؟

تم نے اردو افسانوں کے لئے اونچے معیار کی اتنی بڑی ذمہ داری ہم پر ڈال دی ہے کہ ہم تم سے بگڑے ہوئے ہیں اور تمہیں کوستے ہیں کہ تم اتنی بڑی ذمہ داری ہم پر ڈال گئے ہو کہ ہم سے اسے قائم رکھنا محال ہے بجائے یہ کہ ہم اسے اور اونچا کر دیں۔

بیدی صاحب!

آپ، ہمیں بتا تو جاتے کہ ہم آپ کے بعد کیسے جئیں؟ کیسے پہچانے جائیں کہ ہم آپ کے وارث ہیں؟

ہمارا سلام لیجئے اور یقین کیجئے کہ آپ چاہے اپنے بارے میں یہ پوچھئے کہ "آپ کیوں ہیں؟ یعنی کہ آخر کیوں؟"

مگر ہم جانتے ہیں کہ آپ کیوں تھے؟

البتہ ہم اپنے آپ سے پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ آخر ہم کیوں ہیں؟

—— کلام حیدری

فیضؔ ہم سے رخصت ہو گئے۔

ہم نے فیضؔ کو نہیں دیکھا۔

اُن کو دیکھنے والوں اور ان سے ملنے والوں پر ہمیں رشک آتا ہے!

مگر اُن کی شاعری سے ہماری ملاقات ہے بلکہ بڑی گاڑھی چھنتی ہے، یہ کوئی ہمارا کمال نہیں ہے، یہ فیضؔ کے لہجے میں کھینچ لینے والی صفت ہے۔

فیضؔ ترقی پسند تھے!

فیضؔ مارکسسٹ تھے!

فیضؔ دُنیا سے غربت کو ختم کر دینا چاہتے تھے!

فیضؔ انقلابی تھے!

فیضؔ نے جیل کی صعوبتیں جھیلی تھیں!

اِن میں سے ہر بات فیضؔ کی قدر دانی کے لئے کافی ہے۔

لیکن فیضؔ نے اپنی شاعری کو نہ انقلابی نعرہ بننے دیا نہ جیل اور جیل دینے والوں کو شاعری میں کوسا، شاعری کو فیضؔ نے شاعری رہنے دیا۔ شاعری کی نزاکتوں اور ملاحتوں پر زندگی کی کڑی دھوپ نہیں پڑنے دی۔

فیضؔ نے اُردو شاعری کو تخلیق کے مرتبے سے نیچے نہیں آنے دیا۔

۸۴ء نے اُردو کو کتنا غریب کر دیا ہے!

_______ کلام حیدری

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

اردو شاعری کا سرخ پھول ـــــ کیفی اعظمی

یہ بات بہت پرانی ہے، اتنی پرانی کہ اس کا خیال آتے ہی ذہن اسکول کی فضاؤں میں بھٹکنے لگتا ہے، میں اس وقت اسکول کی کسی جماعت کا طالب علم تھا، انہی دنوں اردو شاعری میں ایک سرخ پھول کھلا تھا۔ یہ بات سجاد ظہیر نے کیفی اعظمی کے لئے "جھنکار" کے دیباچہ میں اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہی تھی۔ اُن کی نظمیں اس زمانہ میں سمجھ تو کیا سکتا تھا مگر گنگناتا ضرور تھا۔ جب مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ ہم لوگوں کے بزرگ اور محترم عزیز جناب فتح حسین کے بیٹے ہیں تو ایک حیرت آمیز خوشی کا احساس ہوا کیونکہ وہ میرے والد کے دوستوں میں تھے۔ کالج میں پہنچا تو ان کے خالہ زاد بھائی سے دوستی ہوئی اور ان کی زبان سے کیفی صاحب کی زندگی اور شاعری کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ بمبئی کے ہفتہ وار قومی جنگ اور "نیا زمانہ" میں ہنگامی موضوعات سے متعلق اُن کی نظمیں اکثر شائع ہوتی تھیں اور مجھے وہ ان دنوں اچھی لگتی تھیں۔ آج اُن کی ادبی اہمیت کے تعین میں ان نظموں کا کوئی حصہ نہ ہو مگر ان کی ملک گیر شہرت کی تعمیر اور ان کے سماجی شعور کی توسیع میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کیفی صاحب کے والد نے ان کو لکھنؤ کے شیعہ عربک کالج سلطان المدارس میں عالم دین اور ذاکر حسین بننے کے لئے بھیجا مگر یہ حضرت جب وہاں سے نکلے تو اشتراکی خیالات سے متاثر تھے۔ بمبئی کے کمیونسٹ اردو ہفتہ وار میں کام کرنے کے لئے چلے گئے تو ایک مخلص کمیونسٹ کارکن کی حیثیت سے ابھرے اور ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے اہم اور نمایاں علمبرداروں میں ہونے لگا۔ ان کو پہلی بار دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب الہ آباد میں آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس میں وہ اپنے رہنما سجاد ظہیر کے ساتھ آئے۔ اس کانفرنس کی صدارت اس وقت کے نہایت بے خوف اور لاگ صحافی سید عبداللہ بریلوی کر رہے تھے، الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی دعوت پر سجاد ظہیر صاحب ہندی اردو ہندوستانی پر تقریر کرنے کے لئے آئے کیفی بھی ساتھ تھے تقریر کے بعد ان سے نظمیں سنانے کی فرمائش کی گئی انھوں نے "تاج" سنائی۔ ان کی آواز کی گمبھیرتا اور نظم پڑھنے کا [illegible] تک ذہن پر نقش ہے۔ ایسی پرکشش آواز اور پڑھنے کا ڈھنگ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ان کو دیکھنے اور ان کا کلام سننے کا موقع تو ملا لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ سعادت مجھے اس وقت حاصل ہوئی جب تین چار سال بعد بمبئی جانے کا اتفاق ہوا،

بمبئی میں ایک دفعہ شاہد لطیف صاحب کے یہاں گیا تو تھوڑی دیر تک ان کے ڈائننگ روم میں انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ اس وقت نہا رہے تھے بالکونی میں ایک جوان سال شخص کو گہرے خیالات میں محو دیکھا، بال بکھرے بکھرے، چہرے سے بے نیازی کا اظہار ہو رہا تھا، تھوڑی دیر تک ذہن پر زور دے کر پہچاننے کی کوشش کی کیونکہ شکل جانی پہچانی سی لگ رہی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اتنے میں شاہد لطیف صاحب آگئے اور تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ کیفی اعظمی ہیں۔ بڑی رسمی اور مختصر سی گفتگو کے بعد وہ پھر اپنی دنیا میں کھو گئے۔

چند روز بعد مغل مسجد کے پھاٹک پر کئی ادیب اور شاعر یکجا نظر آئے کسی دوست کے نکاح کی رسم میں شرکت کے لئے آئے تھے اور انتظار کی الجھن سے نجات حاصل کرنے کے لئے گپ بازی میں مصروف تھے۔ سردار جعفری پھاٹک پر کندہ کتبوں کے سلسلہ میں نادم سیتاپوری سے باتیں کر رہے تھے، کیفی صاحب سب سے الگ پاس کی ایک دوکان میں بیٹھے کسی سوچ میں ڈوبے نظر آئے۔ میرے ایک عزیز نے مجھے اُن سے ملایا تو وہ چار جملوں کے بعد پھر کہیں کھو گئے، میں نے سردار جعفری سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ان سے میرا تعارف کروانے کے بعد اپنی خاموشی کی دنیا میں پھر واپس چلے گئے۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ اُن کا جو خاکہ میرے ذہن نے بنا رکھا تھا اس سے اُن کے اس رویہ کا کوئی ربط نظر نہیں آتا تھا، مجھے یقین سا ہو چلا کہ حضرت خود ہیں اور لئے دئے قسم کے آدمی ہیں انھیں ان کے حال پر ہی چھوڑ دینے میں اپنی بھی خیر نظر آئی۔

ایک دن دشتی جون پوری ساتھ ظ۔ انصاری صاحب سے ملنے گیا۔ وہ آفتاب کے دفتر میں رہتے تھے وہاں علی گڑھ کے ایک ساتھی سے ملاقات ہوئی جن سے ملاقات محض دعا سلام تک محدود تھی۔ یہ تھے مسعود صدیقی جو میرے ہی زمانہ میں سرسید ہال میگزین کے ایڈیٹر تھے اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے کہنے پر میں نے بھی اس میگزین کے لئے ایک مقالہ لکھا تھا۔ وہ ان دنوں اخباروں کے لئے لکھتے تھے اور اسی سلسلہ میں آفتاب کے دفتر میں نظر آ رہے تھے، وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ پوچھا کیفی صاحب سے ملے ہو، میں نے تاثرات کا برملا اظہار کر دیا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر اندر چلے گئے۔ لوٹ کر آئے تو کیفی صاحب بھی ساتھ تھے معلوم ہوا کہ وہ بھی ان ہی کے ساتھ آجکل قیام پذیر ہیں، اس دن کیفی صاحب بہت کھل کر ملے میرے ذاتی حالات پوچھتے رہے اور میرے مسائل میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ بڑی قربت کا احساس ہونے لگا، اب اندازہ ہوا کہ متانت اور خاموشی ان کے مزاج کا فطری عنصر ہے بعد میں مجھے ان کے تحمل پر رشک آنے لگا۔ دوستوں کی باتیں جس صبر و سکون کے ساتھ وہ سنتے ہیں اور سن کر برداشت کرتے ہیں وہ کچھ انہی کا حصہ ہے، اُن کی شخصیت کا ہر وصف میں نے بہت کم لوگوں میں پایا ہے، وہ بات کم اور کام زیادہ کرنے والے انسان ہیں۔

کیفی بھائی کی تاکید پر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ شرکت کرنے لگا تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے بھی انجمن کے جلسہ میں مقالہ پڑھنے کے لئے کہا۔ مخدوم اُن دنوں جیل میں تھے انسان کی بھلائی کے لئے جد و جہد کا سلسلہ جاری تھا، اسی جد و جہد کے تحت مجھے بھی ان کی شاعری پر ایک مضمون لکھ کر جلسہ میں سنانا تھا۔ میرے پاس اُن کا کچھ بھی کلام نہیں تھا جب کیفی بھائی کو یہ بات معلوم ہوئی

تو انھوں نے ادھر ادھر سے ان کی بہت سی غزلیں فراہم کر کے میرے حوالے کر دیں اور میں مضمون لکھ کر جلسہ میں پڑھنا ہی چاہتا، راجندر سنگھ بیدی نے بھی اسی جلسہ میں ایک مضمون مخدوم کی شخصیت پر سنایا تھا جلسوں میں کیفی بھائی عام طور پر کم بولتے تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے اس میں یقین و اعتماد کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ ان کی بے غرض جد و جہد اور انتھک لگن کے باعث ہمارے ادیب اور فن کار انھیں احترام اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان کی پر وقار شخصیت کے اثر سے انجمن کے جلسوں میں خاصہ نظم و ضبط کا احساس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی رفعت سروش اور ان کے دوست جب موڈ میں ہوتے تو ظ۔ انصاری کو خاص طور پر اپنے طنزیہ فقروں کا ہدف بنانے کی کوشش کرتے۔ ایسے موقعوں پر کیفی صاحب کا ایک لفظ یا اشارہ ان لوگوں کو چپ کرانے کے لئے کافی ہوتا۔

بمبئی سے لوٹ کر آیا تو غم دوراں کی کشاکش نے غم پنہاں کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دی، ایک لمبے عرصہ تک کیفی صاحب سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی لیکن ان کے خیال سے غافل رہنے کا سوال بھی نہیں تھا۔ ان پر فالج کے زبردست حملہ کی خبر سن کر انتہائی دکھ ہوا اور موت کے منہ سے بچ کر اس طرح نکل آنے کا حال جان کر غیر معمولی خوشی بھی ہوئی۔ ان کے جیسے متحرک اور فعال انسان کا مفلوج ہو جانا عجیب سا لگا لیکن حقیقت تو اکثر عجیب ہی ہوتی ہے، جب گیا میں ترقی پسندوں کا کنونشن ہوا تو اچھے اچھوں کی ہمت چھوٹ گئی لیکن اس گرمی اور تپش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کیفی اعظمی بیساکھیوں کے سہارے اپنی رفیقۂ حیات شوکت کیفی کے ساتھ گیا پہونچ ہی گئے۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کو دیکھ کر انہی کا ایک مصرع یاد آگیا،

جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

کنونشن میں، باوجود اپنی جسمانی معذوریوں کے بھرپور حصہ لیتے رہے

کئی برس بعد بھوپال میں ان سے ملاقات ہوئی، آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگرام میں ان کے ساتھ ایک بات چیت کے پروگرام میں میں بھی شامل تھا، میں نے ان سے خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے موجودہ مسائل پر سوال کئے، جدیدیت کے میلان نے تحریک کے سامنے جو سوالات پیش کر دیئے ہیں، ان کے بارے میں ان کے تاثرات اور خیالات اور ردّ عمل کی وضاحت چاہی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا اس سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کے نظریات اور تصورات میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، تحریک کے ساتھ وابستگی میں پہلے ہی جیسی استواری اور استقامت موجود ہے لیکن جب انھوں نے اپنی نظمیں سنائیں تو میں ان کے طرز احساس و اظہار میں نمایاں تغیر محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کی نئی تخلیقات میں بڑی تازگی اور طرفگی کا احساس ہوتا ہے، اس سے ان کے زندہ احساس اور تابندہ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ آج جب ان کے بیشتر ہمعصر تھک کر اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں کیفی اعظمی نئی فضاؤں میں پرواز کرتے نظر آ رہے ہیں

کئی مہینوں پہلے ایک دن لکھنؤ میں عابد سہیل کی کتابوں کی دکان پر جا نکلا وہاں اچانک کیفی صاحب سے

ملاقات ہو گئی۔ کہنے لگے بھئی خوب ملاقات ہوئی ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ میرے ایک عزیز شاگرد ان کی شاعری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان سے ایک انٹرویو کی درخواست کی کہنے لگے ادھر جوان میں زیادہ رہوں گا اس لئے خط سے مطلع کر کے وہیں ان کو لے جاؤ تو اطمینان کے ساتھ انٹرویو دوں گا "جھنکار" آجکل دستیاب نہیں ہے اس وقت کا ذکر کیا تو بولے کہ کہیں نہ کہیں سے وہ بھی فراہم کر دوں گا۔ ادھر وہ اپنے تخلیقی عمل کی جانب یکسوئی کے ساتھ مائل ہو گئے ہیں اور فلمی مصروفیتوں سے آزادی حاصل کر کے اپنے اصل فن یعنی شاعری کی دیوی کو زیادہ سے زیادہ وقت اور توجہ دینا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ تبدیلی اردو ادب کے حق میں ایک نیک فال ہے

چند روز پہلے ٹیلی ویژن پر کیفی اعظمی کے فن اور شخصیت سے متعلق ایک اچھا فیچر دیکھنے کو ملا اس میں ان کی جو نظمیں سننے کو ملیں وہ بلاشبہ اُن کے ارتقائے شعور کا مظہر تھیں کاش! سجاد ظہیر صاحب زندہ ہوتے اور اردو شاعری کے سرخ پھول کی عظمت و تاب دیکھ کر خوش ہوتے۔ کیفی اعظمی نئی نسل کے لئے ایک INSPIRATION ہیں ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان میں خاموشی کے ساتھ کام کرنے کی جو لگن اپنے آدرش کے لئے استواری کے ساتھ جو وفاداری، اور اپنے فن کے ساتھ جو ایمانداری پائی جاتی ہے اس سے نئی نسل بہت کچھ سیکھ سکتی ہے'

صفحہ ۵ کا بقیہ۔ کیمل اگنڈی تال کا

پردہ ہٹ گیا تھا! وہ کمرے سے نکلنے سے قبل ایک لمحے کے لئے دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ اس وقت بھی اس کے کانوں میں حمیدہ کی آواز گونج رہی تھی۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد شاید وہ دعا مانگ رہی تھی

اے میرے مالک اس روٹی کے لئے تیرا بہت بہت شکریہ" اسکی آواز اظہار تشکر کی غماز تھی مجھے اس جہنم سے نکال دے میرے مولا! یہاں کی ہر چیز نرالی ہے یہاں کے عجیب و غریب بستر نے میرے جسم کو پھوڑا بنا دیا ہے ۔۔۔۔۔ میرے مولا مجھے یہاں سے نکال ۔۔۔۔۔ میرے ۔۔۔۔۔

کلن کے حکم کی تعمیل میں نوکر اسی وقت حمیدہ کی ماں کو بلانے دوڑ گیا۔ اب مزید تاخیر بیکار تھی۔ وہ اسکی موجودگی میں حمیدہ کو طلاق دینا چاہتا تھا۔ ابھی اور اسی وقت — تاکہ حمیدہ کو بھی معلوم ہو سکے کہ اس کی دعا کس قدر جلد مستجاب ہو سکتی ہے!!

صفحہ ۱۸ کا بقیہ

جا سکتی ہیں گر مضمون کی طوالت کے مد نظر، ان اشعار سے ایمائی کے لہجے میں احساس کو اجاگر کرتا ہوں ے

رہنمائی پہ ناز تھا جن کو،
کھل کے ایمان کی تو کہہ ڈالی،

وہ قدم بھی نہ میرے ساتھ گیا
ان کو کھلتی ہے میری بات کھلا

ڈاکٹر عبدالمنان

کلام حیدری کی تنقید نگاری

کلام حیدری اردو ادب میں ایک معتبر نام ہے۔ ان کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے۔ اور فن افسانہ نگاری کی مشاطگی میں زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ ظاہر ہے جس فنکار کا میلان طبع افسانہ نگاری کے کوچہ میں طواف کرکے نئے خیالات و افکار کے نگار خانے سجاتا ہو اور اپنی غایت توجہ سے اس فن کی آرائش کے فرائض انجام دیتا ہو وہ دوسری اصناف کا دعویدار نہیں ہوتا۔ لیکن اردو ادب کی دنیا میں ایسے بے شمار فن کار ملیں گے جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا جس صنف سے کی، غایت میلان نہ ہونے کی بنا پر کنارہ کش ہوئے اور اس صنف میں پناہ لی جہاں اپنے مزاج و افتاد کا جوہر دکھا سکتے تھے۔ کلام حیدری صاحب تقریباً ۳۵ سال سے ادب کی خدمت انجام دیتے چلے آرہے ہیں لیکن انھوں نے خاص توجہ افسانہ نگاری کیطرف صرف کی ہے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ "بے نام گلیاں"۔ "صفر"، "الف لام میم"، اور "گولڈن جوبلی"۔ یہ بحث بڑی طویل ہے کہ ان تینوں مجموعوں کے دوران افسانہ نگاری کی فکری و فنی سطح پر کتنی تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے مشاہدے کا کس طرح مظاہرہ کیا۔ فی الحال یہ میرا موضوع نہیں۔ مجھے یہ دیکھانا مقصود ہے کہ افسانے کی دنیا میں اپنے ذاتی مشاہدہ اور تجربے کی منزلیں طے کرنے والا فنکار جب تنقید نگاری کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اپنی قابلیت اور منفرد زاویۂ فکر سے اردو تنقید کو نئی سمت و جہت عطا کرتا ہے۔

کلام حیدری صاحب کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کیلئے ان مقالوں کیطرف توجہ مبذول کرنا ہوگی جو موقع بموقع مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اور آہنگ کے ان تمام شماروں کے اداریے کی ورق گردانی کرنا ہوگی جو ان کی ادارت میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آہنگ اردو ادب کا معیاری اور باذوق ادبی رسالہ ہے جو صرف کلام حیدری صاحب کی تسکین طبع کی وجہ سے پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے نہ تو پیسے کمانا مقصود ہے اور نہ ہی شہرت۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی دوست سے یہ درخواست نہیں کرتے کہ اس رسالہ کی سالمیت کے لئے اسے خرید کر پڑھنا ہے اور مزید خریدار بنانا ہے قدرت نے انہیں اردو ادب کی بے لوث خدمت کا جذبہ عطا کیا ہے اس لئے [illegible]

ذوقِ ادب کی تسکین کی خاطر آہنگ اور مورچہ نکالتے ہیں۔ آہنگ کے اداریہ میں اردو ادب کے مختلف گوشوں پر جس انداز سے بصیرت افروز روشنی دکھائی ہے اور دو ٹوک خیالات پیش کئے ہیں انھیں ایک مجموعی شکل بھی عطا کی گئی ہے جسے مزامیر کا نام دیا گیا ہے نوشابہ حق صاحبہ نے ترتیب دیا ہے۔ اور گزارشات مرتب کے عنوان سے چند خیالات بھی پیش کئے ہیں۔ مزامیر سے متعلق ان کے خیالات درج ذیل ہیں۔

" مزامیر میں نے مرتب کیا ہے اور پہلی بار یہ فخر مجھے ہی حاصل ہوا ہے کہ میں کلام حیدری کی تحریروں پر یہ پیش لفظ لکھ رہی ہوں جس سے ان کا شاید کچھ نہ بنے میرا بگڑ جائے۔ اسکا اندیشہ مجھے ہے، میں نے آہنگ سے صرف ان ہی تحریروں کو جو مزامیر کے عنوان سے خود کلام حیدری نے ادبی موضوعات پر لکھے جمع کیا ہے اور تاریخیں اس لئے دے دی ہیں کہ ہر تحریر کا صحیح پس منظر بھی قارئین کے سامنے رہے۔

مزامیر پھولوں کا گلدستہ ہے جس میں مختلف نظریات وخیالات کے پھول سجا دئے گئے ہیں۔ اور یہ اسلئے ممکن ہے کہ ایک مدیر نہ صرف مختلف فنکاروں کی تخلیقات کی اشاعت کو خاص سمجھتا ہے بلکہ کسی خاص عہد میں ادب کے مختلف اصناف میں پیدا ہونے والے رجحانات اور فنی تجربے سے آگاہ ہو کر اپنا نظریہ پیش کرتا ہے علاوہ ازیں ادب اور زبان کی تنزلی و ترقی کے جو شعور مختلف سیاسی سطح پر ہوتے ہیں ان کے اثرات کس طرح قائم ہوتے ہیں اور مستقبل میں علم و ادب اور فن و زبان کو کتنا فائدہ یا نقصان ہو سکتا ہے، اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ کلام حیدری کے اداریے کو اسی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ کون سا سیاسی نقطہ نظر جس پر اعتماد کیا جائے تمام نظروں میں ہوس کا دخل ہے۔ اور مصلحتوں کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ظلم کو ظالم نہیں کہا جاتا۔ غلط اب غلط نہیں رہا ہے۔

معیار نام کی چیز زندگی کے کس شعبے میں باقی ہے؟ سیاست اس سے عاری۔ اخلاق اس سے خالی۔ ادب اس سے عاری۔ سماجی و تہذیبی نقطہ نظر پر یقین نہیں رہا۔ کیونکہ تیزی کے ساتھ نقطہ نظر ختم ہو رہے ہیں۔ ان کی جگہ ایک بے نام سا خلا ہے جو آدمی سے اس کا حوصلہ " زندگی چھین کر اس طرح بکھیر رہا ہے کہ وہ خود کو سمیٹنا بھول چکا ہے .... شاعر کسی چیز کو خوب صورت شاعری بنائے جبکہ کسی چیز پر یقین نہیں ہے۔ شاعر اور فنکار کا اس میں کیا قصور ہے زندگی کی تیز رفتاری میں، راستے میں دونوں جانب تیزی سے دوڑتے ہوئے پیڑ پودے اور کھمبے کون دیکھ سکتا ہے، کہ پہچان سکے ...... رفتار کے ہاتھوں انسان کی جو بے بسی ہے اسکا اظہار شاعری میں بھی موجود ہے اور افسانوں میں بھی ہے۔ اس کے بکھرنے کی آغاز اور بکھرنے کے بعد شکل کھو دینے کی کیفیت جدید شاعری میں موجود ہے،

مذکورہ بالا اقتباس جون ۱۹۷۱ کے اداریہ سے لیا گیا ہے۔ میں نے مختصر طور پر اگلی جملوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جن میں مدیر کا نقطہ نظر سمٹ آیا ہے۔ یہاں ایک بھرپور مقالے کا اختصار یا تلخیص موجود ہے جو یہ طے کرنے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے کہ ہمارے عہد نے بڑی تیزی سے کروٹیں بدلی ہیں۔ قدریں ٹوٹتی بکھرتی رہی ہیں اور بھاگتے ہوئے تیز لمحوں کے ساتھ ہماری زندگی بھی رواں دواں ہے۔ بے سمت جہت۔ ایسی زندگی کا اظہار جدید افسانوں میں بھی ہے اور [illegible]

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہوں:۔

سچ کا بیوپار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسے کرنسی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اس کی تخلیق طمانیت بخش سکتی ہے۔ اسمیں کھو کر اپنے آپ کو پایا جا سکتا ہے۔ اس میں ٹھکرا اور اے دنیا ہوا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی تجارت نہیں کی جا سکتی۔ فرمانروائے وقت کے انعامات کبھی حاصل نہیں کئے جا سکتے...... سچ کی تخلیق ماضی بھی ہے حال بھی ہے، مستقبل بھی...... سچ کے گرد کوئی حصار نہیں کھینچا جا سکتا۔ نہ عمر کا۔ نہ مکان کا عصری ادب سے بڑھ کر جھوٹ دنیا کے ادب میں کوئی نہیں ہے۔ جھوٹ سے ادب کا تعلق ہی ہر چند کہ بعض مرتبہ رفع ذہنیت کے خیال سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ادب عصری ہوتے ہوئے ادب ہوتا ہے...... مگر سچ یہ ادب مفاہمت کا نام نہیں ہے توازن کا نام بھی نہیں ہے۔ ان حصاروں میں اسے بند کرنے کی نہ کوششیں نئی ہیں اور نہ ان کوششوں کی ناکامی نئی ہے (نومبر ۱۹۸۴ء)

مدیر کی ذمہ داریاں گوناگوں ہوتی ہیں۔ وہ بیک وقت ادب کی مختلف اصناف کے فن سے واقف ہونے کے علاوہ مختلف نظریات و تصورات سے واقف ہوتا ہے۔ اس کی نظر زمانے میں دبے پاؤں آنے والی تبدیلی اور انقلاب پر بھی ہوتی ہے۔ وہ کسی قوم کی بربادیوں کے منشور سے آسمانوں پر جس طرح ہوتے ہیں بڑی عمیق نگاہوں سے نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ اس کا منصفانہ تجزیہ کرتا ہے۔ یہ عمل ایک ایسی کاوش ہے جو فال نیک صورت اختیار کرتا ہے۔ یہاں یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ مدیر زمانہ کی سمت و رفتار اگر انسان سوز ہے تو اس کو روکنا اپنا فرض سمجھتا ہے علاوہ ازیں ادب میں نئے رجحانات و تحریکات کی صالح مثبت قدروں کو رواج دینے اور فرسودہ تخلیقات سے ادبی دنیا کو پاک رکھنے میں بڑی ہنرمندی اور ہوش ربائی کا ثبوت دیتا ہے۔ الغرض وہ ایک ایسا معمار ہے جس میں فن تعمیر کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ اس کی نظر تمام تر تخلیقات کے دلکشی اور فکر پر یکساں ہوتی ہے۔ وہ اپنی نظر کا وفادار اور تنقیدی بصیرت سے معمور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خیالات خلاؤں میں پرواز کرنے والے وائے نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کی تنقیدی بصیرت وہ ہاتھ ہوتے ہیں جو بیدار کر تخلیقات کے مندر کی گھنٹیاں بجاتے رہتے ہیں۔

کلام حیدری نے اردو ادب کے مختلف فکری و فنی تجربوں پر روشنی ڈالی مختلف رجحانات کا جائزہ لینا اور عصری ادب کے بارے میں بھی بلیغ خیالات پیش کئے۔ ہمارے نقاد کسی نہ کسی تحریک یا نظریہ سے وابستہ ہونے کی بنا پر اپنے نظریات سے مشکل خیالات پر حمد و ثنا پڑھنے اور دیگر تحریک و نظریات کی مذمت کرنے کو جز ایمان سمجھتے ہیں جو کبھی تو اتزان و تناسب سے عاری ہے۔ لیکن کلام حیدری کی تنقیدی نگاری کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو متناسب انداز ملے گا اور ایسی بصیرت افروز نگاہ جو تخلیق کی زیریں لہریں اور اصل محرکات تک پہنچ جاتی ہے۔

بقول کلام حیدری:۔ ANGRY YOUNG MAN زندگی کے ہر شعبہ کی طرح ادب میں بھی ہے یہ مستقبل کا مالک بھی ہے اور یہی ماضی سے متنفر حال سے ناآسودہ اور مستقبل سے مایوس بھی کرتا ہے۔ بڑا ادیب

جمالیاتی تسکین بخشتا ہے جمالیاتی تسکین کا یہ چشمہ کبھی خشک نہیں ہوتا، وقت گزر جاتا ہے لیکن اس چشمہ کا فیض جاری رہتا ہے۔ ایسے بے شمار موضوعات ہیں جن پر بے باکی کے ساتھ رائیں دی ہیں خواہ آپ کلام صاحب کی رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں۔ وہ اپنی آواز محض آپ کو خوش کرنے کی غرض سے پیش کرنا اپنے مزاج کے منافی سمجھتے ہیں۔

کلام حیدری کا تنقیدی موقف کھل "تفہیمات" میں سامنے آتا ہے "تفہیمات" آٹھ مختلف تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف ادبی موضوعات کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے یہ سارے مضامین ایک وقت میں نہیں لکھے گئے بلکہ مختلف سالوں کی پیداوار ہیں جن کے مطالعہ سے کلام حیدری کے خیالات کے طویل سفر کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سفر کے درمیان ان کے نظریات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ تنقیدی مضامین لکھنے والوں کی بھیڑ میں اپنے قد کی شناخت چھوڑنا بڑا دور دس اور دقت طلب فعل ہے۔
آج افسانہ اور شاعری کرنے والوں کی طرح تنقید کی طرف ہر کس و ناکس کا قدم لغزش کھا رہا ہے۔ یہ بوالہوسی ہے حسن پرستی نہیں اس لئے اعتبار شیوۂ اہل نظر ایک بڑا سوال ہو گیا ہے کسے اہم ناقد کہا جائے اور کسے دریا برد کیا جائے جس نے بوالہوسی کی اس نے ایسی زور آوری کی کہ زمانہ نے خوف سے نگاہیں جھکا دی مگر دل نہ جھک سکا تنقید بھی اگر تخلیقی فن ہے تو دل گداختہ کی کارفرمائیوں سے نکھر سکتا ہے اور اس کے حسن کا فروغ بصیرت کی لالہ کاری سے ممکن ہے۔

جن فروغ وسیع سخن دور ہے اسد ۔ پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی۔

کلام حیدری صاحب ناقد ہونے کے دعویدار نہیں۔ یہ ان کی منکسر المزاجی کا ثبوت ہے لیکن ان کے تنقیدی مقالات ان کے بلند موقف اور تنقیدی صلاحیت کے غماز ہیں۔ جن پر کسی بت یا ازم کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا ان کا جھکاؤ میلان ترقی پسندانہ رہا ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ ہر زمانہ کا ادب ترقی پسند رہا ہے شرط ہے کہ اس میں عصر و نظام حیات کے تمام تر نقوش و خطوط سمٹ آئے ہوں، کلام حیدری نے ہر تخلیقی فن اور ہر فنکار کے یہاں زندگی کی تلاش کی ہے اور ان کا فراخدلی انتہا تک کا سلسلہ جاتا ہے۔

کلام حیدری کے موقف سے آشنا ہونے کے لئے تفہیمات کے دیباچہ کو پڑھنا ضروری ہوگا جس میں انہوں نے واضح طور پر اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے ایک نئے ڈگر پر چلنے کی کوشش ہے اور بے لاگ نقد و تبصرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-
"میں نے شروع ہی سے اپنی الگ راہ بنائی ہے وہ چاہے پگڈنڈی ہی کیوں نہ ہو۔ شاہراہ بنانے کی اہلیت رکھتا ہوں کہ نہیں یہ فیصلہ کرنا مستقبل کا اور دوسروں کا کام ہے ہیں اپنے انداز نظر اور طریقۂ فکر کو حسین آئینہ پاتا ہوں۔ تقلید کرنے اور مرعوب ہونے کو ہمیشہ کفر جانا۔ عالم کا احترام کرنا، علم کی قدر کرنا اور صاحب نظر سے متاثر ہونا میرا مزاج ہے"

تفہیمات کا پہلا مضمون جوش کی انقلابی شاعری کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں مختصر تر تحلیل میں شاعری کے ارتقا کی سفر کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حالی کے اثرات کے نتیجے ادب زندگی کے حقائق کی ترجمانی میں معاون ثابت ہوا۔ جنگ عظیم کے بعد شاعری وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی اقبال نے

تصوف، مساوات اور محبت کا درس دیا اور اردو شاعری میں گہری فلسفیانہ باتیں پیش کیں ہندوستان کی بساط سلطنت پر انگریزی حکام نے اپنے مہرے چن دیے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہندوستان ظلم و استبداد سے گھبرا کر اسقاط سلطنت کے لئے نکلا تو اردو شعراء نے بھی اپنے قلم کو سنبھالا اور جذباتیت سے بھرپور خیالات پیش کرنے لگے۔ اقبال اور جوش کے یہاں سیاسی رجحانات غالب ہیں لیکن ان دونوں شعراء کے ہاں بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کے یہاں گہری مفکرانہ سنجیدگی ملتی ہے اور حیات و کائنات کے بلند تصورات نظر آتے ہیں جبکہ جوش کے ہاں انقلاب کا تصور کلام حیدری صاحب نے جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کو بلند و وسیع اور گہری سنجیدگی سے تعبیر نہیں کیا ہے۔ جوش حالات اور نتائج پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔ ان کے یہاں ایک نوع کا تخلیقی ابال ہے جو لفظوں کی گھن گرج کے ساتھ چڑھتا اترتا ہے۔ جوش کے یہاں شاعرانہ فن ان کی سطحی جذباتیت میں مجروح ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ گہری سنجیدگی اور بلند تصور پیش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ موصوف جوش کی انقلابی اور رومانی شاعری کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

فنکار اپنے فن سے اس وقت تک عوام کو متاثر نہیں کر سکتا جب تک اپنے تصورات کو موزوں جامہ نہ عطا کرے شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے مگر یہ کم اہم نہیں ہے کہ وہ اپنی بات کس طرح کہتا ہے جھنجھلاہٹ اور غصہ نے مل کر جوش کی شاعری کو خطیبانہ رنگ میں اس حد تک غرق کر دیا ہے کہ شعریت مردہ ہو گئی ہے وہ بیان اور انداز بیان انقلاب و شعر میں خوشگوار توازن قائم نہ کر سکے۔ وہ واعظ ہیں باغی ہیں مگر شاعر نہیں۔

کلام حیدری نے جوش کی انقلابی شاعری پر توجہ صرف کی ہے اور اس نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے کہ جوش کے انقلابی تصورات میں صرف جوش ہے اور کچھ بھی نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جوش کی شاعری میں جھنجھلاہٹ اور غصہ کی شدت ہے جو خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے مگر میں اس بات سے متفق نہیں کہ جوش شاعر نہیں ہے موصوف نے جوش کی شاعری کے ایک گوشہ کی طرف توجہ صرف کی ہے۔ جوش کی کل متاع ذکر و فکر میں ایسی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو شاعری کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کی جا سکیں گی۔ بہرکیف کلام حیدری صاحب نے جوش کے اس گوشہ پر خامہ فرسائی کی ہے جس پر جوش کی شاعری کے معتد بہ حصہ کی اساس قائم ہے لہٰذا کئی اہم پہلوؤں پر نگاہ نقد مرکوز کی ہے

"ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت" میں موصوف نے ولی کی شاعری کی جس ایک خصوصیت پر زور دیا ہے اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ولی کی شاعرانہ خصوصیات کا عطر سمٹ آیا ہے۔ وہ ولی کی شاعری کی ہندوستانیت پر زور دیتے ہیں

کرشن چندر، منٹو، پریم چند جیسے مشہور و معروف افسانہ نگاروں کے فکر و فن پر بھی گہری تحقیقی نگاہ ڈالی ہے اور بعض ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو مذکورہ فنکاروں کی تخلیقات کے مطالعے کے باب

روشن کرتے ہیں

تفہیمات" کے تمام مقالات کا تجزیہ کرنے کے بعد۔ اس نتیجہ تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے کہ ناقد کا اصل میلان کیا ہے اور ان کے تنقیدی نظریات کیا ہیں۔ کلام حیدری صاحب نے اپنے نظریات میں موقع بموقع تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ یہ تبدیلیاں OPPORTUNISM کے قطعی مترادف نہیں بلکہ خارجی حالات کے تغیرات کے نتیجے میں اردو ادب کی دنیا میں جس قدر تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور فکری و فنی سطح نے جتنی کروٹیں بدلی ہیں ان کا حسین روپ ہیں کلام حیدری کسی ایک مقام پر رکنا نہیں چاہتے۔ وہ حالات کے ساتھ ساتھ شعر اور ادب میں تبدیلی کے بھی قائل ہیں لہذا تنقید کے اصول میں تبدیلی کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالی کے بعد اردو تنقید نگاری میں واقعی اضافہ ہوا ہے اور مختلف رجحانات و تنقیدی اصول و ضوابط کے اثرات قائم ہوتے ہیں۔ مغربی افکار کا سیل رواں جب دنیائے ادبیات کو سیراب کرنے لگا اور تنقیدوں کے نئے ابواب روشن ہوئے تو اردو تنقید بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ نتیجے کے طور پر کئی اہم ناقدوں کے خیالات نے ادب کی نئی سمت و جہت کا تعین کیا۔ کلام حیدری صاحب کو ان میں یقیناً شمار کیا جا سکتا ہے ان کے یہاں جھلاہٹ اور اضطراب نہیں ہے لفظوں کی آرائش خیالات کو کھینچ کر بنا دیتی ہے اور ان کی تنقید میں تیکھا پن اور ایسی بے باکی ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ موضوع کی روح میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور فن کی زیریں لہروں پر نظر رکھتے ہیں ان کی حیثیت ایسے تماشائی کی نہیں جو سمندر کی لہروں کا معائنہ کرتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے بلکہ ایک ایسے غواص کی ہے جو غوطے لگاتا ہے اور کسی اہم موتی کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر ان کا انداز نقد اسی ڈگر پر چلتا رہا اور افسانے کے ساتھ ساتھ تنقید پر توجہ دی تو اردو ادب مستفیض ہوتا رہے گا اور ہم ان کے بلند و قیع وسیع اور فکر آموز خیالات سے روشن ہوتے رہیں گے۔

بقیہ موت کے بارے میں

کے اپنے بیٹے کے حوالے کرنا۔ یہ اپنی زندگی
"اپنی ملکیت ہے"
مجھ سید رضا زے کو یہ پٹھانی رویہ پسند
آیا انداب میں بھی موت کے بالمقابل افغان
تن کر کھڑا ہوں"

ڈاکٹر نجیب ایمان

◆ انشائیہ اور انشاء پرداز ◆ پروفیسر نارنگ کی نیرنگیاں ◆
◆ شاعری اور اسکے شیدائی ◆ فیض صاحب کی شاعری ◆

انسانی زندگی ایک آئینہ ہے۔ جس میں تخلیقی تبسم کے کچھ جلوے ہیں، ان میں ایک انشائیہ ہے۔ انشائیہ کے بھی مختلف موضوعات ہیں، جن میں طنز و مزاح زیادہ مقبول ہے، مصنف کی شخصیت تخیل کی نمازت اور شوخی کی شدت سے نمایاں ہوتی ہے۔

علی عرس کی مانند "شوفٹ" کے انشائیے بھیلے ہیں، ہرچند کہ چارس لیمب "کا انشائیہ غم کا المیہ ہے لیکن مزاح کی شعلیں اپنی جگہ اجاگر ہیں، "گارڈنز" کے انشائیے فطرت کے تجزیئے ہیں جن کی نگار میں دانشوری شامل ہے۔ ان کے علاوہ "ایڈی سن، ڈرائی ڈن، جانسن، کارلائل، رسکن" اور اسٹیل" کے انشائیوں میں ان کی تخلیقی شخصیت کا بھرپور رنگ غالب ہے۔ خصوصاً ایڈی سن اور اسٹیل نے رسالہ "سکپٹیٹر" کے ذریعہ اخلاقی قدریں ملتبد کی ہیں جنمیں انکا کردار نمایاں ہے۔

اسی طرح اردو ادب میں سرسید احمد خان۔ مولانا حالی، مولانا آزاد، مولانا عبدالحلیم شرر، مہدی افادی، سجاد انصاری اور علامہ حسن نظامی کے انشائیوں میں انکی شخصیتیں اجاگر ہیں،

انگریزی ادب میں جس طرح خالص انشائیے کم ملتے ہیں اسی طرح اردو ادب میں اصلی انشائیوں کی مثالیں نظر سے کم گذری ہیں، البتہ ملا وجہی کے "سب رس" میں انشائیہ کے کچھ نمونے ملتے ہیں لیکن یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ انشائیہ کی بنیاد سرسید احمد خان نے ڈالی۔ یوں تو انشائیہ کا اسلوب کسی حد تک غالب کے خطوط میں بھی ملتا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ کے انشائیے، نذیر احمد کی کہانی اور وصیت کی تعمیل ادب کے بہترین نمونے ہیں، علامہ حسن نظامی کے مضامین۔ دیا سلائی، آسمان کی آواز میں گلاب جبلا

اور کیکڑا ہمارا" بہت خوب ہیں۔ مولانا حالی کے بعض مضامین انشائیہ کے بہت قریب ہیں خصوصاً وہ جن میں موصوف نے اپنے ذاتی تجربات کا ہلکے پھلکے انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان مضامین میں سے کرشمہ قدرت اور فطرت کی بزم انشا کو انشائیہ میں شامل کر سکتے ہیں۔

میرے محترم استاد، رشید احمد صدیقی علیگ کا مضمون "امتحانات" انشائیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے جس میں رنگ ظریفانہ ہے اور یہی رنگ انہیں انشائیہ نگاروں کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ پطرس بخاری کو بھی انشائیہ نگاروں میں جگہ دی جا سکتی ہے، ان کے مضامین میں طنز و مزاح کی چاشنی ہے، "لاہور کا جغرافیہ" بہت خوب ہے اسی طرح مولانا چراغ حسن حسرت بھی ہیں جنکا انشائیہ "پنجاب کا جغرافیہ" خاص طور سے اس ذیل میں آتا ہے ان کے علاوہ، شوکت تھانوی، شفیق الرحمن، سید ضمیر جعفری اور ابراہیم جلیس کے انشائیے اردو ادب کے بہترین نمونے ہیں۔ لندن کے مقامی ادیبوں میں سید عاشور کاظمی، معین الدین خاں، مشتاق احمد یوسفی اور اطہر راز کی نگارشات بھی انشائیوں کی مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان مثالوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی ایک موضوع انشائیہ کیلئے مخصوص نہیں اس میں فلسفہ بھی داخل ہو سکتا ہے اور اخلاق بھی قہقہے بھی شامل ہو سکتے ہیں، آنسو بھی، حیات کا تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے اور کائنات کی تفتیش بھی، ماضی کی سیر بھی ہو سکتی ہے اور حال کی پرسان حالی بھی۔ اس کے باوجود ستائش باہمی کی کوئی گنجائش نہیں مگر.....

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نیرنگیاں ان ادیبوں سے الگ ہیں، انہیں اردو ادب کے استادوں، معاصر ملیحہ کی جان، ستعد مصنف، اور نامور نقاد ہونے کا شرف حاصل ہے، ان اوصاف کے باوجود "مہرِ دو نیم" کے مصنف افتخار عارف کے استادوں میں ایک استاد، ساقی "شمس الرحمن فاروقی" کے سخن راز کی سیر، شاعری کے شگوفے، سفر آشنا کے تذکرے، "مہر دو نیم" پر تبصرے تو جہ طلب ہو گا، اسلئے کہ خیال کی خوشبو، الفاظ کا انتخاب، جذبات کی جادو گری، اور افکار کی آرائش، اشعار کی اہمیت کا پتہ نہیں دیتے!

"دو نیم"، "شہر مثال" کی ترکیب قاعدے کے مطابق غلط ہے، "شہر" فارسی زبان کا لفظ ہے، اور "مثال" عربی کا، اسلئے غیر زبان کے لفظ کے ساتھ "اضافت" کا استعمال جائز نہیں" اگر شہر کے لفظ کو عربی زبان کے معنوں میں لیا جائے تو بھی "شہر مثال" کی ترکیب معنوی لحاظ سے مہمل ہو جائے گی البتہ "شہر خوباں" "شہر آب" یا "شہر خوشاں" لکھا جاتا تو اضافت کی ترکیب درست ہوتی!

اسی طرح "آن بتہ" کی اردو اختراع بھی عجیب ہے، محاورہ "آن کی آن" میں بامعنی اور برمحل ہوتا ہے۔ "لا مانوس تخلیق" کی جگہ "غیر مانوس" مناسب ہوتی اور "مثالیت" بھی کوئی لفظ نہیں "مثال" کی اسم فاعل ترکیبی، علامہ ماجد دریا آبادی کے نزدیک، "تلک" "تقریباً" اور "آفرینش" کی مانند غلط ہے، "سنیاسی" کی بجائے معنوی فضا لکھنا زیادہ صحیح ہوتا ان کے علاوہ افتخار عارف کے مرکبات،

معرکہ لہو" "عذاب گونہ" "میثاق تیرگی" کی تعریف بھی دانشوری کی دلیل نہیں، اس قسم کی غلط تشبیہیں اردو اور فارسی سے نابلد احباب کو متاثر کر سکتی ہیں لیکن ادب کا داعی تجاہل عارفانہ تصور کرنے پر مجبور ہوگا۔ حیرت ہے! ڈاکٹر گوپی چند نارنگ" شعر مثال کا درد مند شاعر" کے عنوان سے اردو نام [illegible] ڈائجسٹ" میں کس طرح رطب اللسان ہیں!! مانا کہ دوستی فطری جذبہ ہے، جس میں رنگ، نسل، اور مذہب کو دخل نہیں، تعلقات کی بنیاد تحسین سے مستحکم ہوتی ہے، مگر ادب کے دائرے میں خوبیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ خرابیوں کی نشان دہی لازمی ہے ورنہ خدا لگتی نہ ہوگی اور دوست نوازی کہلائے گی، مبصر کی آبرو پر حرف آئے گا اور ادبی بے ایمانی پر قارئین چاہئے گرفت کریں یا نہ کریں زیرِ لب ضرور مسکرائیں گے۔ مشکل الفاظ کا استعمال برمحل اور با معنی ہو تو نثر یا نظم میں چار چاند لگ جاتے ہیں، لیکن شعور کا فقدان اور شعری شناخت کی صلاحیت اگر مفقود ہے، غائب ہو تو مشکل الفاظ کے آئینے میں خامیوں کی پردہ پوشی "مذاق" کے مترادف ہوگی، اسلئے ایمان کے آئینے میں پروفیسر نارنگ کی نیرنگیاں جلوہ گر ہیں، جو ادب کیساتھ فکری دعوت دیتی ہیں

✤ شاعری اور اسکے شیدائی

مغربی مفکر ڈاکٹر جانسن شاعری کو "باوزن ادب" لکھتے ہیں جو ادراک اور افکار کی مدد سے مسرت کی کیفیت پیدا کرتا ہے مگر میرے تجربہ میں شاعری جذبات، خیالات اور افکار کی خداداد صلاحیت ہے جس میں احساس، تخیل اور ذہن کا [illegible] اہم ہے خیال کی ندرت اس دور میں خال خال نظر آتی ہے اسلئے کہ عشق اور عاشقی کے تمام تر خیالات [illegible] قدیم اساتذہ نے شاعری میں کوئی گنجائش باقی رکھی ہو، اس واسطے اس دور کی شاعری، عام طور پر الفاظ کی جامہ زیبی ہے جس طرح نئے نئے فیشن کے جامے تراشے جاتے ہیں، اسی طرح جدید شعراء الفاظ کی بندش و نئی تراکیب کا تانا بانا بنتے ہیں یعنی حسن کے دائرے میں توفیق دلوا [illegible]

کارلائل کی نظر میں خیال اور مترنم الفاظ کا دوسرا نام شاعری ہے، جیسے "شیلی" اظہار جذبہ کہتے ہیں، لیکن "ہزلٹ" شاعری کو جذبات کی زبان مانتے ہیں اور "لی ہنٹ" کے نزدیک شاعری اس شعور کا اظہار ہے جو صداقت اور حسن آفرینی پر مبنی ہو۔ مگر، کالرج " شاعری کو سائنس کی متضاد گردانتے ہیں، میرے خیال میں یہ متنازعہ قول ہے، شاعری میں سائنسی ارتقاء کا اظہار سچائی کیساتھ ندرت بیان اور تخلیقی مسرت کا باعث بن سکتا ہے، جیسا کہ "ورڈزورتھ" شاعری کو تمام علوم کی روح کہتے ہیں اور میتھیو ارنلڈ" بھی، شاعری کو جذبات اور خیالات کے اظہار کا بہترین آلہ مانتے ہیں۔ مگر، رسکن" پاکیزہ جذبات کے بیان کو شاعری نام دیتے ہیں، جیسے پروفیسر "کارتھوپ" مسرت کی کرن کہتے ہیں، تاہم میں یہ کہوں گا کہ تخیل تفکر، فن اور عمدہ الفاظ کے آہنگ سے شاعری معرضِ وجود میں آتی ہے جس کے لئے خون جگر جلانا اولین شرط ہے۔

مختلف مفکرین کے اقوال کی قدریں مشترک ہیں، جنہیں شاعری کی خصوصیات تو کہی جا سکتی ہیں لیکن جامع تعریف نہیں، اسلئے کہ شاعری دو اہم عناصر کی مرہونِ منت ہے، ایک جذباتی اور دوسری

تخیل، جذبے کے امتزاج سے شاعری وجود میں آتی ہے، تاہم ایسے عناصر نثر میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قدیم زمانے کی مقفیٰ نثر اور جدید دور کی نثری نظم۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی شئے ہے جس کے ذریعہ نظم اور نثر میں امتیاز پیدا کیا جا سکے؟ لیمل دانیت میجر بنا" اور انہا" کا فن ہے جیسے نغمہ شاعری کو پرکھا نہیں جا سکتا جیسا کہ "ی ہنٹ" کے نزدیک شاعری کی روح "وزن" کی پابندی ہے، کیونکہ حسن اور حرارت کا احساس اسکے بغیر مترنم ہو ہی نہیں سکتا اگر الفاظ کو کھینچ تان کر راگ راگنی کا مقصد پورا بھی کر لیا جائے پھر بھی ادھورا ہی رہے گا جسکی تکمیل کیلئے "وزن اور بحر کی پابندی ایک اچھے شاعر کی شاعری کے واسطے لازمی ہے۔

معنی نثر اور نثری نظم کی سرحدیں مخلوط ہیں، تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شعر کی شیرینی "وزن کی بدولت" نثر اور نظم کے مابین باقی رہتی ہے، جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاعرانہ خیالات اور متوازن زبان میں چولی دامن کا ساتھ ہے"، جیمز منٹگمری نے کیا خوب کہا ہے کہ "ملٹن اور شکسپیر" کے منظوم خیالات اگر نثر میں منتقل کر دیئے جائیں تو کم سے کم الفاظ کی ترتیب اور شاعری کا سلسلہ بھی کافور ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر شبنم کے قطرے اگر ہتھیلی پر رکھے جائیں تو خون کی حرارت سے ذرا سی دیر میں ہوا ہو جائیں گے مگر وہی قطرے غنچہ و گل کی زینت بنیں تو موتی کی مانند دمکتے رہیں گے، لہذا کسی شعر کے موزوں الفاظ کو اگر آگے پیچھے کیا جائے تو شعر کا مفہوم ہی خبط ہوگا بلکہ وزن، حسن، حرارت اور جذبات کی جادو بیانی میں بھی فرق آ جائے گا۔

فیض کی شاعری

کا تجزیہ اگر ان اقوال اور اصول کے آئینے میں کیا جائے تو گت کی معافی فیض صاحب "قلمی" شاعر ہیں، ان کی زندگی اور سنجیدگی کا اعتراف اپنی جگہ مگر علمی ادبی اور قومی لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کی مانند فیض صاحب کے کلام میں "پیغام" نہیں!!

لبوں پہ محالت اور سرخ سویرے کی حمایت قومی اور اعلیٰ شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتی، اسکے علاوہ فیض صاحب کے کلام میں خیال کی تشبیہ اور مصرعوں کی مطابقت بھی بکھری ہوتی ہے۔ مثلاً موصوف کی مشہور غزل کا مطلع۔

دو تو جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے

توجہ طلب ہے، دراصل مصرعہ اولیٰ صداقت سے بھٹکتا رہا ہیں، دنیا اور آخرت کے سوا تیسرا جہاں کونسا ہے جہاں عاشق زار
شب غم گذار کر جا رہا ہے؟

ذرا سی توجہ کرنا تھا پہلا مصرعہ یوں بھی کہا جا سکتا تھا۔
وقت سحر بجھا کے دیئے انتظار کے
اب ذرا مکمل مطلع کا حسن ملاحظہ فرمائیے!

وقت سحر بجھا کے دیئے انتظار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے!!

پھر بات بنتی اور دونوں مصرعے مربوط اور جاندار ہوتے، اس قسم کی کئی اور مثالیں قلمبند کی

ناصر بغدادی

[illegible]

[illegible]

اور پھر شادی کے دوسرے ہی دن اس کو پتہ چل گیا کہ شاہو جی [illegible] نے دنیا کے [illegible] ایسے [illegible] فعل کا ارتکاب کیا تھا [illegible]

[illegible]

وہ اپنے دل میں غم ناک [illegible] ... جیسے کسی لاش کے سرہانے کھڑی ہو! [illegible]

کیا بات ہے؟ اس نے ایک نظر بوا کو دیکھا اور پھر جلدی سے سر جھکا لیا۔ [illegible]

وہی پرانی خبر ہے گلن میاں! .. ایک انگلی ناک پر رکھ کر [illegible]

[illegible] نظروں سے بوا کو دیکھا۔

[illegible]

اور پھر اس کا چہرہ غصہ سے گلابی ہوگیا۔ عجیب لڑکی ہے۔ لاحول ولا قوۃ! تیس روز سے بھوکی پیاسی بھوک ہڑتال کرنے والوں کے پاس معقول جواز ہوتا ہے۔ تارا سنگھ نے سکھوں کے مطالبات منوانے کے لئے اڑتالیس دنوں تک بھوک ہڑتال رکھ کر ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اور بعض بھوک ہڑتال جان دے کر شمالی آئرلینڈ کی انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانا چاہتے تھے اور گاندھی جی کے بھوک ہڑتال کی وجہ ساری دنیا کو معلوم ہے!! مگر اس کمبخت کو اس وقت گاندھی جی کی تقلید کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟........

دھتّا "۔ وہ پھر خیال میں سر جھٹکا دے کر بولا "کیا اس نے کچھ کہا؟..."

یہ بھی تم نے خوب کہی میاں" بوا نے اپنی کمر پہ ہاتھ رکھ لیا "وہ اور بات کرے! توبہ کرو۔ اس نے تو کھانا اور بات کرنا خود پر حرام کر لیا ہے"

کس مصیبت میں جان پھنس گئی"۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

محبت کی شادی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے" اتنا کہہ کر بوا نے اپنی پشت گلن کی طرف کر لی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

یہ دلہن دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھی۔ انسان کا ذہن تو خیر بہت دور کی بات ہے شاید خدا بھی اسکی فطرت سمجھنے سے قاصر تھا۔ نہ معلوم کس مٹی سے بنائی گئی تھی۔ اک معمہ تھی، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

شادی کی دوسری صبح جب اس نے بغیر کچھ بولے دودھ اور جلیبی لینے سے انکار کر دیا اور منہ دوسری طرف کر لیا تو گلن کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی اس نے سوچا نئی نویلی دلہن ہے۔ اس کا جوان کڑیل شوہر اس کے سامنے موجود ہے اس لئے حیا مانع ہو گئی۔ اور جب دوپہر کو اسے بتایا گیا کہ دلہن نے ایک دانہ حلق میں نہیں ڈالا تو بھی اس کے سکون کی دیوار میں شگاف نہیں پڑا۔ بلکہ وہ بوا کو ڈانٹنے لگا۔

خواہ مخواہ اس کو کیوں تنگ کر رہی ہو۔ اس کے معدے میں کچھ گڑبڑ ہو گی" مگر میاں بہو تو کسی بات کا جواب بھی نہیں دیتی۔ بوا نے سرگوشی کی۔ تمہاری بیہودہ باتوں کا جواب دینے کیلئے اس کے پاس زبان نہیں"

کیا میں نے کبھی بیہودہ باتیں کیں؟

نہیں۔ تمہاری باتوں میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے" اس نے بیزاری سے کہا اب میرا مغز نہ چاٹو۔ وہ رہا دروازہ ـــــ

لیکن جب شام کو اسے معلوم ہوا کہ دلہن کا روزہ ہنوز نہیں ٹوٹا ہے تو وہ اچھل پڑا۔ اب ایسی بھی کیا معلوم کہ فاقے کا سلسلہ ٹوٹنے ہی نہ پائے لگ یہی رہا تھا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی الجھ گیا ہے۔ گلن بدحواسی کو ہم رکاب لئے کمرے میں داخل ہوا۔ دریچے کے قریب، پھولوں سے سجی مسہری پر وہ بت

[redacted]

بن بیٹھی تھی۔ شبِ زفاف گزرنے کے باوجود اس کے معصوم چہرے پر کلیوں کا سا نکھار اور خوبصورت رہباؤں کا سا تقدس تھا۔ وہ اس کے قریب مسہری پر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے اس کا مہندی رچا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور وفورِ جذبات سے مغلوب لہجے میں بولا

حمیدہ! تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟

جواب میں وہی خاموشی — سناٹا ... اس کی بات سن کر بھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر پیدا نہیں ہوا۔

بولو نا حمیدہ — کیا تمہیں یہاں کا پکا ہوا کھانا پسند نہیں .. اس بار بھی وہ خاموش رہی صرف ایک نظر اس کو دیکھا اور اپنا سر جھکا لیا۔

اگر تمہارے پسند کی کوئی چیز ہو تو مجھ سے کہو۔ تمہاری فرمائش ابھی پوری ہو جائے گی .. کا اس نے بڑی مشکل سے اپنے تحمل کو برقرار رکھا۔ اس کا بھی اسے جواب سے محروم ہونا پڑا۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصابی نظام پر منفی اثرات مرتب ہونے لگے تھے۔ دل میں پیچ و تاب کھانے کے باوجود اس نے خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بڑے عجیب قسم کی دلہن تھی اس کی باتوں کو درخورِ توجہ ہی نہیں سمجھ رہی جیسے وہ لجذوبیاں بڑ تھیں —— وہ جھلا کر وہاں سے چلا آیا۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر بعد جب انتڑیاں قل ھو اللہ پڑھنی شروع کریں گی تو وہ خود رسوئی کی طرف بھاگ پڑے گی۔

لیکن — تین دن گزر گئے اور اس نے کچھ نہیں کھایا تو گلن کی جھلاہٹ پریشانی میں تبدیل ہو گئی معاملہ سنگین ہو گیا تھا اس نے سوچا اگر اسکی بھوک ہڑتال مزید جاری رہی تو اس کی زندگی بچانے کے لئے دستِ مسیحائی روح کی آواز دینی ہو گی مگر اس پریشانی کے عالم میں بھی گلن حیرت زدہ تھا —— تین دن بھوکا رہنا بچوں کا کھیل نہیں۔ بڑے بڑے رستموں کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ نبض ڈوبنے لگتی ہیں۔ آنکھیں کھولے نہیں کھلتیں —— مگر اسکی تو ایسی حالت نہ تھی۔ اسکے چہرے پر اب بھی بہار کے سائے رقصاں تھے۔ وہ اب بھی گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ تھی۔ آنکھوں میں وہی مستی ... چہرے پر وہی بشاشت — کیا بھوک اس کے حسن کی تاب نہ لا سکی ہے رہی تھی؟

یہ شادی اس کو بہت مہنگی پڑی تھی .. مانگا کچھ تھا اور ملا کچھ! اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ شادی خانہ بربادی ثابت ہوگی ورنہ وہ چند لمحوں کی خوشیوں کے عوض آ جان کا روگ نہ مول لیتا۔ اس نے سوچا ممکن ہے یہ بزرگوں کی بات نہ ماننے کا نتیجہ ہے۔ ضروری بات ہے۔ ساری دنیا اس شادی کے خلاف تھی۔ سب کا کہنا تھا کہ اس شادی سے خاندان کی عزت داغدار ہو جائے گی .... بزرگوں کی ناک کٹ جائے گی —— گلن ایک شریف خاندان کا چشم و چراغ تھا

اس کے والد مولانا انتظام الحق شہر کی سب سے بڑی مسجد کے پیش امام تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی

[illegible] ...... نہ صرف مذہبی اور علمی حلقوں میں مقبول تھا بلکہ [illegible] تفہیم القرآن [illegible] تھا۔ یہ اور بات ہے کہ عائلی قوانین کے خلاف جب ملک کے علمائے دین نے احتجاجی نعرے بلند کئے تھے تو انھوں نے خاموشی اختیار کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ خدا کے ساتھ ساتھ وہ حکومت سے بھی ڈرتے تھے ۔۔۔ انھیں کی عظیم شخصیت کا واسطہ دے کر مدیرِ دین نے گلشن کو اس شادی سے باز [illegible] علیک بھی معلوم ہوتی تھی۔ ایک لڑکی جس کے باپ دادا کا کوسوں دور تک نہ تھا، اگر اچانک ہی انتظام ملق جیسے جید عالم کی بہو کہلانے لگتی تو ان کے فرزند گی بھر کے سارے مذہبی کار [illegible] ۔ ۔ ۔ کوئی خاندان ہی نہ تھا۔ وہ ایک [illegible]
تھی۔ اپنی برادری کے ہر فرد کی طرح وہ بھی گلی گلی کوچہ کوچہ بھیک مانگتی تھی۔ اپنے حسن کو چیتھڑوں میں چھپا [illegible] بھیک حاصل کرتی ہی اس کی ساری زندگی [illegible] حسن پرست جوانوں سے فریفتہ و شیفتہ ہو چکا [illegible] ایک بھی تھی، وہ گول میں جیسے ابھی گدڑی میں لعل جیسے [illegible] کو دیکھ کر ہی کھڑے تھے۔ اس کا حسن ایک ایسا چاند سا تھا [illegible] اس کے حسن کی مکمل تعریف نہیں ہو سکتا

تھا۔ [illegible] اس وقت اس کی ماں بھی اس کے ساتھ [illegible] ، [illegible] کی [illegible] دونوں کے متعلق بعض باری [illegible] کی [illegible] ، [illegible] دونوں چند ، اس نے مصمم ارادہ
کر لیا کہ وہ اس کیچڑ کے کنول کو اپنے گھر کی زینت بنائے گا۔ یہ فیصلہ کرتے وقت اس کو بخوبی علم تھا کہ ایک [illegible] مگر وہ بھی [illegible] حسن کا
[illegible]

[illegible] جب وہ بھیک [illegible] وہ لوگ کی مدد [illegible] میں لگا [illegible] ساتھ [illegible]
[illegible] میں اس کی بیچارگی [illegible] بیان کرنے لگا۔
[illegible] ماں بھی اس کے [illegible] متاثر [illegible]

لگی۔ گلشن سمجھ گیا کہ آمنہ بیگم کا مزاج بھی بڑی غضبناک ہے… اب زیادہ وقت گنوانا عبث تھا۔ موقع غنیمت تھا… فوراً مطلب پہ آ گیا۔ [illegible]

"[illegible] لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں [illegible]

لفظ پھر ہم [illegible] آگیا۔ طوفان آ گیا… ایک لمحے تک بڑی بی نے [illegible] سے پھیل

اور پھر اچھل پڑیں۔ اچھلنا تو شاید انہیں پہلے چاہئے تھا مگر کہنہ دماغ تھا… کمزور تھی اس لئے شاید [illegible]

[illegible] تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟" بڑی بی نے جھٹکے دار لہجے میں کہا۔ آواز تیز کرنے کی کوشش کی گئی

مگر [illegible] اس کی اجازت نہ دی۔

[illegible] وہ چھنال یہ چھان سے آئی ہے… دفن کر دوں گی… بد معاش… بے حیا… ناش —

شریفوں کے لڑکوں کو پھنسانے آئی ہے… اور تم کان کھول کر سن لو۔ اب اگر تو نے اس سے شادی

کا نام لیا [illegible]

تو پھر… پھر… پھر —"

پھر وہ کیا کریں گی وہ یہ نہ کہہ سکیں۔ ان کی سانس پھولنے لگی۔ جسم لرزنے لگا۔ دیدے گھومنے لگے۔

گلشن نے خالی خالی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ معلوم نہیں ہوتا

تھا کہ ماں کی باتوں کا کچھ رد عمل ہوا ہے۔ پھر اس نے [illegible] جیسے کہہ رہا ہے — دیکھو ں

گا [illegible]

[illegible] مولانا صاحب [illegible] کے چہرے کی طرف بڑھا۔

اس کا سکون برقرار تھا۔ کوئی ڈر نہیں۔ کوئی جھجھک نہیں۔ جیسے اپنے [illegible]

تھا — مولانا نے اس کے سراپا پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ اس کو جیسے [illegible] اس کی

روح تک کا جیسے انھوں نے [illegible] کر ڈالا۔ ان کے چہرے پہ ایک گہرا تاریک سایہ

[illegible]

[illegible] تم نہیں مانو گے [illegible] گلشن کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔

اس نے ان کی بزرگی کا خیال نہ کرتے ہوئے فی الفور نفی میں سر ہلا دیا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

اگر میں نے تمہیں عاق کر دیا تو؟" [illegible]

[illegible]

"وہ کیوں؟" [illegible]

اس لئے کہ اس صورت میں میں خودکشی کرلوں گا۔" گلن نے غور سے مولانا کے چہرے کے بدلتے ہوئے
رنگ کو دیکھا۔ تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ اس [illegible] کی سب سے بڑی کمزوری پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔
موت کا نام ہی سن کر ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ پھر ایسا آدمی اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کیسے
برداشت کر سکتا تھا! مولانا کا چہرہ اسوقت بے شمار منفی خیالوں کی پرچھائیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ان
کا ہر انداز ان کی اندرونی بے چینی کا مظہر تھا
اور گلن نصرت و کامرانی کو ہم رکاب لئے وہاں سے چلا آیا۔ ناکامی دم دبا کر بھاگ کھڑی
ہوئی تھی۔ راستے کی ہر قدغن کو وہ عبور کر چکا تھا ——— اور پھر یہ بات رشتے داروں میں پھیل گئی۔
محلے والوں کو معلوم ہو گیا۔ دوستوں کو پتہ چل گیا۔ خبر کیا تھی۔ جنگل کی آگ تھی کہ جس نے
سب کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خیر خواہوں اور ہمدردوں نے مولانا کی ایما پر یہ آخری بار اس سر پھرے
کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جذباتی اور نادان ٹھہرا کر اس کو اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ عزت کا واسطہ دیا۔ دنیا
والوں کے طعنوں سے ڈرایا۔ مگر اس کے دل دماغ پر سوار عشق کے طاقتور بھوت نے سارے منطقی
اور جذباتی دلائل کو مسترد کر دیا۔ بالآخر تھک ہار کر سب نے اس کو قسمت کے حوالے کر دیا!!
اس کے بعد اس نے اپنے چند قریبی دوستوں کی مدد سے شادی کا انتظام کیا۔ مولانا غیر جانبدار ہو
گئے تھے۔ بڑی بی کا منہ پھولا ہوا رشتے دار ناراض تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سب کچھ اسی کو کرنا پڑ رہا تھا۔
خوشی کی زیادتی کے سبب حمیدہ کی ماں کی عمر میں پندرہ سال کی کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے تو
وہ سب کچھ ہو رہا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ شادی سے چند روز قبل اسکے والد نے
اسکے کان میں سرگوشی کی
"محلے والے ہنس رہے ہیں!"
وہ جل رہے ہیں۔" یہ گلن کا جامع جواب تھا جس کے بعد ان کے ذہن میں کوئی اور سوال نہیں ابھرا۔
اور پھر شادی ہو گئی۔ اس نے سمجھا تھا کہ زندگی کا ہر گوشہ بہار کے بوقلموں رنگوں کا سجا سجایا ہوا
گلدستہ بن جائے گا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ دلہن ایک نیا شوشہ چھوڑ گئی۔ تین روز گزرنے کے باوجود دلہن
ابھی تک کنواری بیٹھی تھی!
اس دن اس نے دلہن کی ماں سے بات کی۔ جب وہ سامنے آئی تو پہلی بار گلن نے اپنے دل
میں اس کے خلاف زہر آلود نفرت کو بیدار ہوتے محسوس کیا۔ وہ منحوس یقیناً نفرت کی مستحق تھی کہ اسکی منحوس
کوکھ سے حمیدہ جیسی مافوق الفطرت لڑکی نے جنم لیا تھا!
میں تم سے چند سوالات کروں گا۔ ٹھیک ٹھیک جواب دینا! گلن کی باتیں ہتھوڑوں کی طرح دکھنے
وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر بات کیا ہے؟

"کیا حمیدہ نے کسی سے محبت کی؟

"محبت!! کیا کہہ رہے ہو بابو؟" بوکھلاہٹ نے اسکے چہرے کے نقوش متبدل کر دیئے

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے اس نے ذرا تلخی سے کہا،

"نہ بابو اپنی برادری میں تو بڑی بات ہے" وہ سہم گئی۔" حمیدہ بہت اچھی لڑکی ہے

"ہوں! اچھا یہ بتاؤ کیا اس کو کوئی غم ہے؟ گلن کے چہرے پر ماہر نفسیات کی گمبھیر متانت براجمان تھی۔

"غم کس بات کا بابو؟

"پھر یہ بکواس کیا ہے؟ اس بیہودگی کا مطلب؟" وہ بری طرح برس پڑا"

"مگر اس نے کیا کہا ہے؟" حمیدہ کی ماں متوحش نظر آنے لگی"

"یہ اپنی صاحبزادی سے پوچھو! گلن نے بُرا سا منھ بنایا، لاحول ___ استغفار۔ میں تو اب پچھتا رہا ہوں، اس سے تو کنوارا مرجانا بہتر تھا!" وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے دن وہ آفس سے ذرا جلدی آگیا۔ اسوقت بھی اس کا ذہن مکڑی کے جالے کی طرح الجھا ہوا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ شادی کے فوری بعد ذہنی افکار کم ہو جاتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے حمیدہ کی آواز سنی وہ ٹھٹک کر دروازے کے قریب رک گیا آس پاس کوئی نہیں تھا۔ دوپہر کا وقت تھا سب لمبی تان کر سو رہے تھے۔ اس نے دیکھا حمیدہ طاق کے بالکل روبرو کھڑی تھی۔ چونکہ اس کی پشت گلن کی طرف تھی اس لئے وہ اسے آتا دیکھ نہیں سکی۔ وہ آہستہ آہستہ منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ گلن دبے پاؤں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اسکی آواز پر کان لگادیئے۔ وہ اپنے کام میں اس درجہ منہمک تھی کہ گلن تو کیا ارد گرد کی ہر شئے سے بے نیاز ہو کر رہ گئی تھی۔

اور پھر جیسے گلن کا وجود [illegible]ت کی فراوانی سے پگھلنے لگا۔ اسکی آنکھیں جیسے حلقوں سے باہر آنے لگیں۔ چہرہ متضاد رنگوں کی آماجگاہ بن گیا۔ حمیدہ طاق کے سامنے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا کر بھیک مانگ رہی تھی۔

"بابوجی اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ میں تین دن سے بھوکی ہوں بابو!۔ خدا تمہارے بال بچوں کا بھلا کرے گا۔ خدا تمہاری مرادیں پوری کرے گا ___ کچھ روکھی سوکھی بابو.... کچھ...... ۔" پھر اس نے طاق پر سے روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے اٹھائے اور یوں جلدی جلدی چبانے لگی جیسے بھوکا کتا ہڈی دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہے۔

اب گلن کے لئے وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو گیا۔ یکلخت اسکی نظروں کے سامنے سے جیسے کوئی۔

ممتاز احمد خان (پاکستان)

کم عملی

وہ کئی ماہ سے منکر نکیر کی مانند اس کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسی گھر میں وہ اور اس کے دو یعنی اسکی ماں اور نوجوان بیوی بھی اس کی راہ تک رہی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے کہ وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔

وہ اپنی سرگرمیوں کی بنا پر "صاحب" کو مطلوب تھا، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ "بڑے صاحب" کو مطلوب تھا جو فرمایا کرتے تھے کہ اسے زندہ یا مردہ حاضر کیا جائے ورنہ تو صاحب ہی دونوں کے قبضے کی خیر نہیں۔ وہ صاحب اپنے ماتحتوں پر انحصار کرتے تھے وہ جانتے تھے کہ مطلوبہ شخص تھا جو شکاری کتے کی طرح خوشبو سونگھ کر لوگوں کو زمین کی تہہ سے نکال لایا کرتا تھا۔

جب کافی عرصہ گذر گیا تو ان کا پارہ چڑھ گیا انہوں نے اپنے ماتحت کو طلب کیا اور برس پڑے۔

"علیم! تمہاری وہ کارکردگی کہاں تک پہنچی؟"

[illegible] کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ناکامی کی صلیب پر مصلوب ہو گیا ہو۔

"یہ ہو نہیں سکتا کیوں نہیں؟" اس بار "صاحب" اپنے جسم میں موجود [illegible] طاقت سے دہاڑے۔

"مجھے کچھ اور وقت چاہیئے"

"اچھا دفع ہو جاؤ"

اور وہ فوراً وہاں سے دفع ہو گیا۔

"صاحب" نے اس کی فائل نکالی جس میں اس مطلوب شخص سے متعلق خلاصہ تحریر تھا۔ ذہین فطین۔ قلندر صفت کسی کارخانے دار یا بیگر کسی سرمایہ دار کا تنخواہ دار؟ جس کے بارے میں تفتیش جاری ہے۔ سماجی انصاف ایسے بے ہودہ نعروں کا خالق اور جرم۔ "بڑے صاحب" پر بے جا تنقید۔

"صاحب" نے فائل بڑی احتیاط سے الماری میں کچھ اس طرح رکھی جیسے وہ مقدس چیز ہو اور بڑبڑائے ——— اس فائل کا ناگ کہیں مجھے ہی نہ ڈس لے۔

پھر جیسے کیلنڈر سے کئی ورق جدا ہو چکے تو "بڑے صاحب" نے "صاحب" کو طلب فرمایا اور الفاظ کے آخری تیر ان کی اس طرح چلائے کہ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے دل کی دھڑکن اب رک جائے گی۔ اور جواباً انہوں نے بھی اپنے ماتحت کو طلب کر لیا۔

ان کا چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے کانپ رہے تھے اور دونوں کی ذہنیت کا [illegible] بھی رہے تھے۔

"[illegible]" [illegible] "صاحب" [illegible] بیٹی کا [illegible] بتا چکا ہوں کہ [illegible]

"اسے کہیں۔ [illegible] نہیں مل رہا ہے [illegible] نہیں، میں بے بس ہو گیا ہوں" [illegible]

زیرو نوائیز ZERO NOISE روم ایئر
کنڈیشنر ٹھنڈی ٹھنڈی سنسناہٹ [illegible] کمرہ میں ہو رہا تھا
اس کے باوجود "صاحب" [illegible]
"اوف اس قدر گرمی ہے"
یہ کہہ کر وہ اٹھے اور روم ایئر کنڈیشنر کی
ناب KNOB آخری نمبر تک گھما دی۔
"تم مدینہ والے کے خلیفہ ہو" صاحب نے ہلکی
سی لگا دی۔
"بجا فرمایا" اس نے آہستہ سے کہا اور سر
جھکا لیا۔
خاموشی!!!
پھر اچانک فون کی گھنٹی جھنجھنا اٹھی ۔۔
وہ صاحب "بات کرنے لگے ۔ جی ۔ جی ۔ معافی
چاہتا ہوں ۔۔ یہی حکمت عملی ہے ۔ وہ نارمل ۔۔
بڑے صاحب آپ کتنے ذہین ہیں۔ ہمارے پورے
محلے کا تجربہ آپ کے ذہن کے آگے ہیچ ہے ۔ جی ۔
سمجھا دوں گا ۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا ہوا ہے
[illegible] حکمت عملی مزید [illegible] عمل ہو گا ۔۔ [illegible] فوراً
[illegible] گا ۔۔ خدا حافظ ۔
پھر صاحب نے [illegible] کے کان میں [illegible] حکمت
عملی کا [illegible] اور اسے رخصت کر دیا اور خود
[illegible] ساتھ [illegible] گئے۔
[illegible] دوپہر [illegible] بڑھا
ایک طویل القامت شخص [illegible]
فلک بوس بلند و بالا عمارت کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا
تھا، وہ "صاحب" کے سامنے جا کھڑا ہوا اور
دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ اچانک ایک کالا

بھجنگ۔ دور موٹا تازہ شخص تاریک بدبو دار وسیلن
زدہ کوٹھری نمبر [illegible] سے نکل کر "صاحب" کے پاس
آیا اور اشارے سے اپنی خصوصی کارروائی کے متعلق
بتایا۔ صاحب نے اپنے ہاتھ کے اشارے چلتا کر دیا
بعد میں کوٹھری نمبر دس کا دروازہ پھر کھلا جس میں
سے صاف رنگت اچھے نقش و نگار [illegible] دبلی پتلی
پژمردہ نوجوان [illegible] ہوئی۔ اس کے بال بکھرے
ہوئے تھے اور لباس پر لاتعداد سلوٹیں پیدا ہو گئی
تھیں اس کے چہرے پر سراسیمگی اور آنکھوں میں نفرت
کا طوفان اٹھا ہوا تھا "صاحب" اسے دیکھ کر مسکرائے
جواباً اس عورت نے حقارت سے زمین پر تھوکا۔
داڑھی بڑھائے طویل القامت شخص نے اس
عورت کو اتنی پیار سے دیکھا جیسے کہ کبھی اس نے قبل پہلی
رات کو دیکھا تھا۔
ادھر "صاحب" فون کا ڈائل گھمانے میں
مصروف تھے۔

[illegible]

[illegible] ایک آدھ [illegible] ہو کر لوٹ [illegible] تھا۔ [illegible]
گردن جھکی ہوئی تھی اور بار بار [illegible] زمین پر [illegible] رہا
تھا۔
[illegible] طرح [illegible] ہو گیا تھا
زعفرانی [illegible]
نے مڑ کر دیکھا تو [illegible] دونوں [illegible]
غائب تھے۔

مشرف عالم ذوقی

بٹوارہ

بابا کی آنکھوں کے دیکھنے کا سلسلہ یگ سے جاری ہے....

بابا کچھ بولتے نہیں۔ بس چپ رہتے ہیں۔ اور چپ چپ بولنے والے چہروں کا منہ تکا کرتے ہیں۔ کبھی اکیھتے ہوئے جذبات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کبھی پانیوں میں حرکت کرتی ہوئی مچھلیوں پر آنکھیں ٹھہر جاتی ہیں اور کبھی مچھلیوں سے جاری ہو کے فوارے پر... مگر بابا نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہے۔ ہوا مخالف ہو تو لب کیونکر بولیں گے۔ اور ہوا میں جب جنگ کے جراثیم گھل گئے ہوں تو بھلا بولیاں منہ سے کیونکر باہر آسکتی ہیں۔ بس کبھی کبھار موقع ملتا تو لاٹھی ٹیکتے ہوئے سفید پاجامے اور عبا زیب تن کرتے ہیں مولوی برہان الدین کے یہاں پہنچ جاتے۔ برہان الدین بھی اکثر چپ ہی رہتے۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا کہ جگجیت بابا کا اٹھ کر استقبال کرتے۔ پھر اشارے سے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتے۔ سبلا موں نکل کر باہر آتا تو دو چائے کا حکم بھی اشارے سے ہی دیکر chess نکال کر بیٹھ جاتے۔ شاید اخلاقاً یا ضروری انسانی تقاضے کی خاطر اندر کے انتشار اور کرب کو دباتے ہوئے بس اتنی سی آواز باہر نکلتی... کیسے ہو؟

اور بدلے میں دہی رٹی رٹائی صدا جگجیت بابا کے ہونٹوں سے پھسل پڑتی۔ بس جی رہا ہوں" اور بساط پر دو بوڑھے آنکھیں گڑائے زمانے سے بے خبر ہو کر بیٹھ جاتے کبھی کبھار بغل سے رام اوتار شاستری جی بھی ٹپک پڑتے۔ ڈنڈا ٹیکتے۔ آنکھیں گلوکوما کا شکار۔ ایک نمبر کے باتونی۔ جیسے chess پر پھیلتی نگاہیں ہوں ہاں کرتی ہو شاستری کی لمبی چوڑی باتوں کو سن رہی ہوتیں — اور شاستری زمانے اور محلے کے تمام دکھوں کی پوٹلی لے کر سلگ جاتے۔ بیچ میں کبھی کبھار برہان الدین اخلاق کو مجروح ہونے سے بچانے کے لئے ماچس کی ہلکی سی تیلی کا استعمال کرتے۔ اور بساط روک کر تینوں بوڑھے خاموشی سے سر جھکائے کمرے کی پر اسرار ویرانی کا ایک حصہ بن جاتے —

شاستری جی نے بھی زمانہ دیکھا تھا۔ گلوکوما نے آنکھیں لے لیں تو کیا ہوا، دھندلی دھندلی آنکھوں میں اب دیکھنے کو باقی ہی کیا بچا تھا۔ عمر کی اس منزل پر تھے جہاں زمانے کی تھکن اور تجربوں کی تلخیاں آنکھوں کی تمام رونق اڑا کر لے جاتی ہیں۔ وہ وہ اکثر کہتے " ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا۔ اب تھک گئی ہیں اور جسم کے بوڑھے کھنڈر میں آرام کرنا ہیں۔ بوسیدہ بدن کی کمزور عمارت پر اب بھی دو آنکھیں ٹھہری ہوئی ہیں مگر اب فقط انہیں دیکھتیں نہ گزرے کل کو تلاش کرنا چاہتی ہیں... بس ایک تھکن ہے جو ہمیشہ کے لئے اوڑھ کر سو جانا چاہتی ہیں،

اب عجیب سی خواہش پر مٹتی نسل کا بچہ تو چپ ہو جائے

گہرے فلسفے اور علمی عمر کے تجربے کو محسوس کر کے پریشان
ہو جائے گا۔ مگر بوڑھے ہونٹ صرف مسکرا کر رہ جاتے
ہیں۔ جیسے یہ عمر تو دیکھا بھالا ہے۔۔ اس حادثے سے تو بھلی
خوبی واقف ہوں۔۔۔۔ ؛

اور بساط سے نکلتی ہوئی باتیں۔ کبھی کبھی نئے اور
پرانے زخموں کی بھی حصہ دار بن جاتی ہیں۔ بساط پر ہاتھ
روک کر برہان الدین، جگجیت بابا سے پوچھتے ہیں" تمہارا
شہر تو سچ دھلا ہے۔ کہاں ہے وہ آجکل ؟

جگجیت بابا کے جھری بھرے ہاتھ بساط پر چلتے ہیں
پہلے کپڑوں والے نئے شوروم میں۔ روز روز بزنس
بڑھا رہا ہے۔۔۔،،

چلو اچھا ہے۔ بس اب ایک ہو رہے آؤ،،

جگجیت بابا کچھ بولتے نہیں۔۔۔ چپ چپ جذبات
سے عاری چہرہ لئے۔ پاؤں کے پاس پڑی ہوئی لاٹھی کے ہاتھ
کی گرفت ذرا سخت کرتے ہیں۔ کوئی مسکراہٹ نہیں ہے
ان چہروں پر صرف جھریاں ہیں۔ اور جھریوں میں کھوئی
ہوئی تاریخ ہے، تاریخ کے خون میں ڈوبے ہوئے
صفحات ہیں۔۔۔

کھیل آگے چلتا ہے۔۔۔۔ اور دھندلی دھندلی
آنکھوں کے تعاقب میں شاستری جی کے باتونی ہونٹ
بولتے رہتے ہیں۔۔۔ دنیا میں آنے کا ایک فائدہ تو
ہوا ہم نے انقلابات دیکھے۔ دوسری جنگ عظیم دیکھی۔
بدلتے ہوئے چہروں پر قوموں کے مرتے ہوئے خون کے
دھارے دیکھے۔ آنکھیں تب بھی تھکی تھیں مگر سوچتی
نہیں تھیں۔۔ بچوں سے بولتا ہوں تو ہنستے ہیں کہ
آنکھیں بھلا سوچتی ہیں۔۔۔ کیسے سمجھاؤں کہ یہ آنکھیں
تو جنم جنمانتر سے دیکھتی اور سوچتی آئی ہیں۔ جب

جب ان آنکھوں نے کچھ دیکھا ہے، تب تب سوچا ہے
دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں ابھی ان آنکھوں میں
چلتی ہیں جو لہو لہو سرحدوں میں ہمارے سامنے آئیں۔۔۔
جو انقلاب کی وجہ بنیں۔ اپنی غلامی یاد ہے۔۔۔ انگریزوں
کے ظلم یاد ہیں۔ تمہیں یاد ہے جگجیت بابا۔۔۔ ؟

بساط پر چلتے ہاتھ رک گئے ہیں۔ ایک ٹھہراؤ آگیا ہے
اور شاستری ویسے ہی بولے چلے جا رہے ہیں۔ تب
ہوٹلوں میں لکھا ہوتا تھا DOGS AND INDIANS ARE NOT
ALLOWED ہم میں اور کتوں میں فرنگیوں نے کوئی تمیز نہ کی۔
پر ہم نے کون تمیز کی۔ مگر جلاتے ہوئے ہاتھ کہاں آدمی
اور کتے کی تمیز کرتے ہیں۔ سڑک پر لوٹتے اور فساد کرتے
ہوئے ہاتھ کہاں جانوروں کی چیر پھاڑ کا موازانہ کرتے
ہیں۔ اب دو آدمی زور سے بولتے ہیں تو لگتا ہے کہ بھونک
رہے ہیں۔۔ ایک کتا ان میں سما جاتا ہے اور جانے کیوں
لگتا ہے۔۔ یہ کتا اب کاٹے گا۔۔۔ اب کاٹے گا۔۔۔
اور سڑک پھر سے لہو میں نہا جائے گی۔۔۔،،

شاستری چپ ہوتے ہیں جانے کیا سوچ کر۔
ایک منٹ۔ دو منٹ۔ شطرنج پر بھاگتے ہوئے ہاتھ،
اس اچانک کی چپ سے رک گئے ہیں۔ شاستری کیوں
چپ ہیں ؟ شاستری کو چپ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی
بک بک میں زندگی ہے۔۔ وہ بس بولتا رہے۔ یہی خواہش
ہوتی ہے۔ مگر کون جانتا ہے۔ بولتے بولتے کب اپنا کچھ
یاد آجائے ؟ کچھ بھلا۔۔ کچھ پرانا۔۔ اپنے سے وابستہ کچھ
کہانیاں۔۔ جن میں کچھ سوغاتیں ہوں۔۔ اور سوغاتوں
میں سرخ رنگ چھپا ہو۔ سرخ رنگ اچانک آنکھوں
میں آجائے تو آنکھیں خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ پھر اتنا ہوتا
ہے کہ ایک کھٹ کی آواز ہوتی ہے اور جب تک بساط

کو گھیر کر بیٹھے ہوئے دو بوڑھے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے
ان کے درمیان سے ایک بھولا ہوا لمحہ نکلا ہوا دور جا
[illegible] کا ہوتا ہے [illegible]
[illegible] سرحد پار چلا گیا ہے [illegible]
کل وہ پھر آ جائے گا۔ اپنی پرانی بیویوں کے ساتھ
شطرنج کی بازی بغیر جیتے ہی سپرد کر دی گئی ہے
چائے حقہ لا کر کے ٹیبل پر رکھ دی گئی ہے۔ سرحد کا رہے
بے زبان سکالے ادا ہو رہے ہیں۔ اندر اس بیچ بولے
ہونٹوں سے بس [illegible] باہر نکلتی ہے... اپنے بچے
ہم پہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ہم پرانے ہیں۔ ہم انہیں
سمجھے نہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان فرق ہے۔
وہ کیا جانیں کہ ہم نے کبھی کچھ سالم ہوا دیکھا ہی نہیں
جب دیکھا تو کٹا پھٹا ہوا۔ جب سے سنگ کے جنگل۔
انہیں اپنوں کی یاد آتی ہے برہان ؟ بلجیت
سوال کرتے ہیں۔

یاد ہو کر اٹھتی ہیں۔ کون اپنا دور تھے مجھ سے
میرے دل ملے۔ سب تو اتنا قریب نہیں۔ لگتا ہی نہیں
کہ دور چلے گئے تو ... پاکستان بنا تو گھر کا بٹوارہ
ہوتا۔ یہ بوڑھا اپنے چھوٹوں کو رخصت ہوتا
ہوا دیکھ رہا ہے۔ منجھلے بھائی اکرم نے انتقال
کی خبر سن کر بچپن کی شرارتیں یاد آئیں۔ [illegible]
کتنا چھوٹا تھا۔ ابھی ٹھیک طرح سے بھائی سے گلے
بھی نہ مل پایا تھا کہ دونوں بھائیوں کو لے کر
پاکستان چلے گئے۔ میری ضد پر مجھے چھوڑ گئے۔ اکرم
کا انتقال بھی دو سال پہلے گزر گیا۔ اس کو خوب ایک
دو بار ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ سننے میں آیا
ہے کہ باہر کو کینسر ہو گیا ہے اللہ بچائے۔ [illegible]

دے کے بھی نہیں تھی۔ یہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان
جا بسی یقین تھے نہیں۔ صرف ایک لڑکی کی شادی ہوئی
اور ہو جاتے تو [illegible] بیٹی تھی بس یہی سوچ سوچ کر
ادھ مرا ہوا جاتا ہوں کہ ان لوگوں نے کب پاؤں لگایا
کبھی نہیں ؟
بلجیت چپ ہو گئے ہیں۔

شاید یہ لوہ داستان ہے جو ایک خاص عمر کے
بعد شروع ہوتی ہے۔ داستان بلجیت کا بچہ ایک خاص
عمر میں پھوٹتا ہے۔ تلاش معاش اور دیگر ضرورتیں
رشتے ناطوں کے بیچ اس طرح اثر پذیر ہوتی ہیں
کہ پل میں سب ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور
پھر ایک کہانی مختلف واقعات اور مختلف حادثات
کی شکل میں سامنے آتی ہے...

بلجیت بس اتنا کہہ پاتے ہیں... برہان الدین
یہ غم صرف تمہارا نہیں ہے۔ میرا بھی ہے... شاید
[illegible] ہے اور جانے کس کس کا ہے...
آہستہ سے اٹھتے ہیں بلجیت بابا۔ لاٹھی تھامے
[illegible] ڈھال قدموں سے گھر چل پڑے۔

لاہور کی یادیں دلوں میں اب بھی تازہ ہیں
کون بھلا سکتا ہے انہیں۔ وقت کی آندھی نے بابری
کی عظیم الشان عمارت کو تو ہلا دیا مگر اوراق پارینہ
[illegible] نہ لے جا سکیں۔ پنجاب کے بٹوارے کا
ایک زخم دل میں چھپا۔ [illegible] سے وطن کی تیز [illegible]
رخصتی کے وقت لاہور [illegible] بار بار قدم
[illegible] بھی [illegible] کرتے [illegible]
سے آنکھوں میں جیسے خواب [illegible] دیکھ رہا تھا۔ تم بھی
چھوڑ جاؤ گے بیٹا...

یہ وہی لالی ہے آسمانی چھتوں پہ منڈلاتے
ابھر کر انکھوں میں اتر آئی جی بھر کر دیکھا۔ کبھی
چھوٹ گیا لال جو ڈھونے والی ہوں۔۔ ہائے ہائے شیرا۔۔
بلکے ہائے میرا۔۔۔۔
بھیا۔۔ جیسے کوئی دامن پکڑ کر بیٹھ گیا ہو
ایسی نظر سے ہم سب کو دیکھا۔ بھرّائے گلے سے آتی
آواز باہر نکلی۔ یہاں کون عزیز ہے بیٹی۔ یہ اب ہتیار
کی چھری جسم میں اتر گئی ہے۔ اب یہاں دل نہیں
لگتا ہے۔

وہاں سے آرہ تک کا سفر بیک لمبا سفر ثابت ہوا
وقت کبھی زخموں کو بھر دیتا ہے مگر بعض گہرے زخم بھرنے
کی بجائے ناسور بن جاتے ہیں۔ پنجاب کا زخم گوردوارہ
مارکیٹ میں بتا ملا۔ اور پھیلتی ہزنس کے پھیلنے
اور کپڑے کے کاروبار کے پھیلنے تک باقی رہا بلکہ
وقت کے ساتھ اور پھیلتا گیا گہرا ہوتا ہو گیا۔
لاہور کی گلیوں کے ہنگامے، موہن بھن کے بیاپے
کی درد ناک فضا امرتسر کا خون میں ڈوبا ہوا
جسم۔۔ بھیا کی بھری ہوئی کوکھ، اور ایک
وحشت بھرا ماحول۔۔۔۔ بھتی آنکھوں میں اب
بھی ایک زندہ منظر بچوں کی آنکھوں کی تازگی
اور ملال پیدا ہونے لگے نئے نئے خواب کبھی
کبھی کچھ بھلانے میں کامیاب ہوتے مگر گہری
خاموشی ہیں گرنتھ صاحب کا مطالعہ کرتے ہوئے
ساتھ ٹھہر جاتے گرو تیغ بہادر اور گوبند سنگھ کی
یادوں سے الجھا قافلہ پنجاب کے پیٹ میں
اترتے ہوئے قصاب کے چاک کو دیکھنے لگتا
اور آنکھوں میں پھر وہی طرف تاریخ رینگ جاتی۔۔

۔۔۔ جب باری آتی دین حقیقی وقت کی دہ رسی کا چرچا
کرنے کے پیچھے تھے خلافت کے خلاف کے نذر کر دی اور پس
ہو جاتے۔۔ دماغ وقت ترک کرنے خلافت کی تبلیغ اک
کر دی۔ ایک عجب کیفیت میں سب بیک سے چہرے
تھا کتنا اچھا لگتا تھا۔۔
جگہ بہ جگہ آنکھوں میں کچھ پرانی تصویر
زندہ کر لیتے۔ آج سے ۲۸۵ سال قبل یعنی ۱۶۹۹
میں گرو گوبند سنگھ نے بیساکھی کے دن خالصہ کی بنیاد
ڈالی تھی۔۔۔ ایک سے لباس میں سیبیلکا سے
چہرے پر ایک مخصوص لباس جس میں سب دور
سے پہچانے جائیں
منظر یہ تھا کہ کنگھی ہو جائے ہر مسلمان بھر پور
ٹک جائیں۔ ہر مقابلہ کے بڑے بڑے کبھی چھوٹے بھائی
امریندر کی یاد تازہ کر دیتے۔ ویسا ہی قد اور جسم بھی
تھا امریندر کے، خاص پنجاب کا جہد دل نما تھا اس
میں۔ کھلا ہوا سونت چہرہ تنے ہوئے بازو۔ ہاکتا
لمبا نوجوان ہے عمر کے چھوٹے بال پنجاب کی گزری
کہانیوں میں اور نقش بھیا کو تلاش لیتے جو پہلی
بار سپرے، اور بیساکھی کا تیوہار جی بھر کر ان کا ساتھ
دیا کرتے۔ بچہ صاحب کے یہاں جاتے، نانک
جی کی پیدائش کے موقع پر گھر کے سارے لوگوں کو
ان کے یہاں بھیج دیتے اور پہلی کے موقع پر
سارا جسم رنگوں میں کھو جاتا لڑکا بنا دیا
سہیلیاں لگے خالصے دا ہر ملائے
اسلام نے گورو کے بعد وقت کے ساتھ
سب کچھ ختم ہو گیا۔ یہ یادیں لاہور کے سانحہ ہی
دفن ہو گئیں۔ مگر نہیں۔ شاید یہ پہلی ہوئی تھی

عجب وہ اداس تھے ۔ بدن میں نشتر چبھے ابھی دن ہی
کتنا ہوا تھا۔ کرائے کے مکان سے باہر ہولی کھیلتے ہوئے
بچوں اور جوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ تب تک
دو جوان قدم آگے بڑھے۔ خوبصورت چہرہ۔
تنا ہوا سڈول جسم۔ آکے رنگوں سے شرابور کر دیا انہیں
اچانک اس والہانہ محبت سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔
سب کچھ بھول کر دونوں کے گلے لگ گئے۔
ہم آپ کے پڑوسی ہیں بھائی ۔ محبت کے رنگوں
کا آپ نے برا تو نہیں مانا"
جگجیت سنگھ نے گلے لگا لیا۔ آج تو تم نے زخم
بھر دیئے دوستو ۔ نہیں معلوم تھا ۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں
جہاں میں "میرا نام شاستری ہے ۔ رام اوتار شاستری
ہے یہ ہیں میرے دوست برہان الدین"
جگجیت ایک بار پھر گلے لگ گئے ۔ برہان کے
چوڑے چکلے سینے میں عجب سی تمازت اور گرمی کا
احساس ہوا ۔
بھائی ہم تمہارے قریب ہیں ۔ جب ضرورت
پڑے"
آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیئے وہ لپکتے قدموں
سے اندر آئے ... مہندر .. مہندر ...
آنکھیں ٹھہر گئیں ... شلوار جمپر میں مہندر ممتا
بن گئی ہے .. مہندر ہوئی زندہ ہے ... وقت اگر زخم
دیتا ہے تو زخم بھرنا بھی جانتا ہے
مہندر بازوں میں ڈھل گئی رنگوں سے شرابور ہو کر
اچانک وہ پھر سے گنگنا اٹھے ... لو کان دیاں ہولیاں
نے فاصلہ دا ہو لائے ... لو کان دیاں ہولیاں "
بچے بڑے ہو رہے ہیں ۔ بچوں کو ایک ساتھ

بڑا ہوتا ہوا دیکھ کر کتنا اچھا لگتا ہے ۔ پاکستان کے
بٹوارے نے آنکھیں نم کیں ۔ برہان الدین کا بھرا پورا
خاندان خالی ہو گیا ۔ خاندان کے زیادہ تر لوگ پاکستان
جا بسے ۔ آنکھوں سے گنگا جمنی ہی گئی ... اب لگتا
ہے کہ بوڑھا ہو چلا ہوں ... کل تک احساس نہیں تھا
بھائیوں اور بہنوں میں وہی لاڈلا بنا عمر کے احساس
سے دور رہا گیا تھا ۔ اب گھر میں بسری ہوئی لمبی
خاموشی اچانک تنہائی سے نکل کر بڑے ہوتے ہوئے
بچوں میں سما جاتی ہے ... ادھیڑ عمر کا احساس اندر
پلنے لگتا ہے ۔ گھاؤ کی طرح ۔ کل مل پاؤں گا ان
سے یا کبھی نہیں ... شاید کبھی نہیں ۔
شاستری کی مسکراہٹ میں طنز چھپا ہوتا ۔
وہ دیر تک اس مسئلے پر دل کا غبار نکالتے رہتے ...
برہان الدین بساط کھینچ کر بیٹھ جاتے ... اور وقت آہستہ
آہستہ آگے بڑھتا رہا
جگجیت، برہان الدین کے زخم سے واقف تھے ۔
برہان الدین نے اپنے بھائی اور بہن کی محبت کی جو
تصویر سامنے رکھی تھی اس نے کئی خون آشام جنگوں
کو ڈھک لیا تھا ۔ کرائے کی مکان کی زندگی اب
بوجھ لگنے لگی تھی ۔ دکان جم گئی تھی ۔ سرداروں کی
اچھی خاصی بلکہ شہر میں قائم ہو گئی تھی ۔ سردار پارٹی
میں سکھوں نے اچھی خاصی زمین خرید لی تھی اور وہاں
مکانات بننے لگے تھے ۔ برہان الدین کھاتے پیتے گھر کے
تھے سیکڑوں بیگھا زمین ۔ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ
تھی ۔ رئیسانہ شان آج بھی قائم تھی ۔ شاستری بھی
اچھے گھر کے تھے ۔ ڈی ۔ او آفس میں ہیڈ کلرک تھے
شام کے وقت ڈیرا برہان الدین کے گھر جمتا ۔

شو روم میں بچوں کو بیٹھا کر جگجیت بھی وہاں پہنچ جاتے۔ باتوں کا ایک لمبا سلسلہ چل پڑتا۔ برہان زیادہ تر چپ رہتے۔ شاستری بولتے رہتے... اور جگجیت کی نگاہیں CHESS پر دوڑتی رہتیں۔ اس دن جگجیت خوش تھے۔ آہستہ سے بولے۔

بھائی لوگو! سردار باڑی میں میرا مکان بن گیا ہے۔ پرسوں شاندار دعوت رہے گی۔۔

بھول مت جانا جگجیت۔ اب تو برسوں کا یارانہ لگتا ہے۔"

کیسی باتیں کرتے ہو یار لوگو! جگجیت آہستہ سے بولے۔ پنجہ صاحب کی قسم۔ تم لوگ بھولنے کے لائق نہیں ہو۔ ٹرماں والیاں، بختاں والیاں ہمیشہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔۔

آنکھوں میں چند آنسو سمٹ آئے۔ نہ معلوم یہ آنسو کیسے تھے۔ شاید برسوں بعد محلہ چھوڑنے کے غم میں بہہ گئے تھے یا برسوں بعد یاروں سے کچھ درد جاننے کے خیال سے آ گئے تھے...

اور اس دن جب جگجیت کا سامان اپنے نئے مکان کے لئے ڈھویا جا رہا تھا۔ شاستری ہچکیوں میں رو رہے تھے۔ برہان الدین اور جگجیت دونوں چونک پڑے۔ دوست کے کندھے پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔ شاستری نے گلے لگا لیا۔

دوسری جنگ عظیم میں بھی یہ آنکھیں اسقدر نہیں بھیگی تھیں۔ ایک تسلی ملی تھی۔ اپنے گھر کی بیوی بچوں کو تسلی۔ بیوی کے غم نے بچوں کے لئے رونے سے منع رکھا تھا۔ پاکستان کے بٹوارے کو آزادی کے خیال نے رونے سے روکے رکھا تھا۔ غم ضرور ہوا کہ بھائیوں نے اپنا ایک الگ گھر تعمیر کر لیا۔ مگر محلے میں آیا ہوا ایک

بھائی جیسے سارے غموں کو پا [illegible] لبا [illegible] محلے کا یہ گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جا رہا ہے [illegible] پا سکتا ہوں..."

اور اچانک جگجیت مسکرا اٹھے۔ بھائیا جی ہم ملتے رہیں گے.. بھائیا جی...!!"

برہان الگ کھڑے کچھ سوچتے ہے
غمگین اداس چہرے کے ساتھ
بساط کس قدر پھیلتی جا رہی ہے
بساط کسقدر پھیلتی جا رہی ہے

ہرمندر نے کپڑے کی نئی دکان کھولی تو شوروم کا افتتاح برہان الدین نے کیا۔ چشمے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں ہرمندر کو مبارکباد دے رہی تھیں۔ شاستری بھی خاموشی سے مسکرا رہے تھے، مگر جگجیت چپ تھے جانے کیسے لاوے تھے۔ جو اندر سلگ رہے تھے۔ پھر ایک نئے پنجاب کا خواب۔ ہرمندر کی آنکھوں میں جلنے والے خوفناک جانور کی آنکھیں۔ برہان الدین کو دیکھا۔ بولتے بولتے برہان الدین رو پڑے [illegible] بیوی کے غم نے برہان الدین کو توڑ دیا ہے [illegible] صدمات نے نڈھال کر دیا ہے۔ [illegible] میں بچے کو جنم دینے کے بعد [illegible] ہم حادثات میں جی رہے لوگ [illegible] میں گزرتا ہے۔ لوگ سمجھتے [illegible] برہان کو رلا دیا ہے۔ مگر وہ تو [illegible] چہرے میں برسوں کی [illegible] چشمے سے برسوں کی [illegible] ریٹائر ہو چکے تھے۔ بیوی [illegible] تھی۔ دو لڑکیاں [illegible]

سسرال جا بسی تھیں۔ ان سب کو اندر دابٹے رکھا تھا شاستری ۔ اندر کی چبھن دابے رہتا ہے۔ شاستری ۔ جب بچوں نے دکان سنبھال لی تو کسی قدر آرام کی سانس لینے کا موقعہ ملا تھا جگجیت کو مگر مہندر کور کی اچانک موت نے ایک ساتھ دو واقعات کو جنم دیا تھا۔

ہرمندر کہہ رہا تھا۔ بابوجی! اس گھر کی اینٹ اینٹ سے دو طرفہ مذہب کی بو آتی ہے۔ میں یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔ ماں کی زندگی تک ماں کا خیال کیا پر اب نہیں رہ سکتا...

تم چلے جاؤ گے..

ہرمندر کا سر جھک گیا۔ دوسرے موڑ پر ہرسر جھکائے کھڑا تھا۔

تم صرف جانا چاہتے ہو یا خون کا بنایہ رشتہ بھی توڑنا چاہتے ہو..

شاید دونوں ہی بابوجی"

ہرمندر کا صاف صاف جواب تھا۔

جگجیت بابا کے ہاتھوں میں لاٹھی کانپ گئی ریشے ریشے میں طوفان آگیا۔ شریانوں میں خون اچھلا۔ تم جاؤ گے۔ تم چلے جاؤ... چلے جاؤ..."

سامان جاتا رہا۔ جگجیت دیکھتے رہے۔ ہر بکھتا رہا۔ بچے اپنے پیروں پہ کھڑے ہو کر پیروں کی زمین کھود لیتے ہیں۔ اچھا بعد سب کچھ جان چکے ہیں صرف پہلا بھول جانا چاہتے ہیں۔ وہ جو پچھلا ہے وہ آج تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں ہرمندر جا رہا ہے..

ہنس کا تھا یہ تو چھوٹا بھائی امرمندر جا رہا ہے خون کا رشتہ بھولا کر آج بھی لاہور کی یاد دلاتی ہے۔

امرمندر.....

ہرمندر کی بدلی ہوئی کیفیت وہ کئی روز سے دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے خالصتان کی مانگ پر سرخ چہرے کے ساتھ اپنی جائز مانگ کا اعلان کیا تھا۔ وہ دبی دبی زبان میں بس اتنا ہی کہہ پائے تھے۔

بیٹا پاکستان کے بٹوارے نے بھی ہندوستان کے دل کے دو ٹکڑے کر دیے تھے۔ یہ میری ماتر بھومی ہے۔ جیسے کہ یہ میرا گھر ہے۔ اور میرے گھر میں میرے تمام بچوں کے الگ الگ کمرے ہیں۔ کوئی بچہ اگر لڑ جھگڑ کر اپنا ایک الگ کمرہ لے لے تو باپ کے دل پہ کیا گزرے گی۔ یہ اچھی مانگ نہیں ہے،

ہرمندر نے سخت جواب دیا تھا۔ بابوجی ہمیں کچلنے کی سازش قدم قدم پہ ہوتی رہی ہے ہم ظلم سہنے کے عادی بنا دئے گئے ہیں۔ ہر جگہ ہمارا استحصال ہو رہا ہے۔ جنگ میں ہم لڑتے ہیں قربانیاں ہم دیتے ہیں۔ یہ تاریخ گواہ ہے۔ ہماری شہادت سے ہندوستان کی تاریخ رنگی ہوئی ہے۔ مگر اس کا کیا پھل ملا ہمیں. ہندو ذات نے ہمیں کیا دیا ہے؟

"بیٹا" — اپنے کیس دھاری بیٹے کو دیکھتے رہ گئے تھے جگجیت۔

ہرسر جھکائے کھڑا تھا۔ اس وقت جی۔ اپنی عادت کی طرح خاموش۔ بھائی کی باتوں کو سنتا ہوا۔ ہرمن کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ہم ایک الگ دیش چاہتے ہیں۔ وہ ملنا چاہئے۔ یہ غیروں کی بستی ہے۔

"ہرمندر چلا گیا۔"

بساط پہ پھیلے ہوئے ہاتھ ٹھہر گئے۔ خاموش

بولتے بولتے چونک گئے۔ یہ بات الیسی لمبی لمبی سانس
بھرنے لگے۔ ہرمندر جاگیا تم نے خبر نہیں دی۔ ایسا خیر
سمجھا تھا۔ جھری بھرا چہرہ داستانِ غم بن گیا۔
بچے تاریخ بنانے لگے ہیں۔ اب جب ہو گئے ہیں
تا جگیت کے ہاتھ میں مہرے کانپ گئے۔
کھیل ٹھہر گیا ہے
پنجاب میں سکھوں کی بُری حالت ہو گئی
ہے بیساکھی کے دن اکال تخت میں اکالی لیڈروں
نے ۲۱۵۔ لوگوں کو کر دیا مارو کا شیشہ گرہن کرایا
سب کچھ سن رہا ہوں دوستو۔ ہرمندر کی زبان
تو بہت کچھ سنا۔ بڑے حاکم ستانا زیادہ
خنزے سکا ہے جگیت۔
پچھلے دنوں ہی جب ہرمندر اپنے چند سکھ دوستوں
کے ہمراہ [illegible] تھا تو اس کی تیز آواز
دروازے کے باہر کھڑے ان کے بوڑھے جسم میں اُبال
پیدا ہوئی تھی
• بیساکھی کا تہوار [illegible] رہے ہو گو
دال اور بھنڈراں والا نے کہا ہے۔ آج شہیدی
جتھے کا [illegible] ایک تاریخی ضرورت ہے۔ ہمارے گرو
کے بعد پنتھ کی گریا کو بنائے رکھنے کے لئے آج بیلا
کو ایک ماترکل دیا ہے۔ سکھوں پر پولس اتنا جار
رہی ہے۔۔۔ ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ پولس گردواروں
میں داخل ہونے کا ناپاک ارادہ رکھتی ہے۔
ہم مقابلہ کریں گے۔
آہستہ سے بولا تھا ہرمندر۔ بوڑھے سوہن لال
جواب دیا تھا دوستو۔ ست سری اکال
اور کانپ گئے تھے دروازے پاس جگیت

بابا۔ اپنے بوڑھے ہوتے ہوئے وجود کے ساتھ۔
کھیل چلتا رہتا ہے۔ باتیں ہوتی رہتی ہیں۔
شاستری کہہ رہے ہیں۔ پنجاب کی صورت
حال بے حد نازک ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں
نہیں آتا اس کا انت کتنا گمبھیر ہو گا۔ اب تو بھا گرگی
رنگ اختیار کر چکا ہے۔ سکھوں کی جماعتیں
فرقہ پرور اور شری گرنتھ [illegible] گن اور [illegible]
سے بھری ہوئی لوگ لوٹ لی۔"
" سنتے ہیں جگیت۔ کچھ بولتے نہیں۔"
" مال خانہ سے اسلحے چوری ہو گئے"
" پنجاب پولس سے سکھوں کو الگ کیا جانے لگا۔"
" مال خانہ سے کچھ نکالے جانے لگے۔"
" لوگ بغاوت پر آمادہ"
" پنجاب میں کرفیو!"
بساط پر چلتے ہوئے مہری مہرے ہاتھ [illegible]
اٹھے ہیں۔ پھر وہی شروعات۔۔۔!
بولتے بولتے شاستری دھندلی دھندلی آنکھوں
سے جگیت کو تکتے ہیں۔ تم ان کے بارے میں کیا سوچتے
ہو جگیت؟
بچے ہاتھوں میں گن اٹھا لیں تو کیا کرو گے تم؟
کون سا عمل دہراؤ گے؟
سوکھے ہونٹوں پر جمی پپڑیاں کانپ گئیں
فالج بلاؤں نے اب کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے
کے لائق نہیں رکھا۔ صرف ہونی کو دیکھ رہا ہوں۔۔
دیکھتا جا رہا ہوں ۔۔"
اس دن ہرمندر کا بچہ اسکول سے جگیت کے
گھر آیا تو لپک کر گود میں اٹھا لیا۔ لپٹایا۔ زور زور سے

سے پیٹنے میں بیٹھا ۔ کیسے ہے بہتر"
پتاجی ملنا چاہتے ہیں
یہ دروازہ تو ہمیشہ کھلا ہے۔ وہ خود الگ ہوا ہے
آنکھوں میں آنسو آگئے۔

شام میں ہرمندر آیا۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ جان بوجھ کر پنجاب کے مسئلے سے الگ ہٹ کر گفتگو [illegible] میں الجھے رہے۔ ایک بار بھی تو اس نے مہر کی خیریت نہیں پوچھی۔ یہی بات دل کو کھل گئی۔ مگر [illegible] ہوا۔ ہرمندر نے پھر وہی باتیں چھیڑ دی۔

پتا جی۔ پنجاب میں پریسیڈنٹ رول لگ گیا ہے۔ دنگائیوں کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہے۔ یہ دنگائی کون ہیں بابوجی۔ ہم ہیں یا آپ۔ وہ کون ہیں [illegible] ہے کہ ۱۹۶۵ کی طرح کچھ گھس بیٹھ بوڈر پار کرکے چلے آئے ہیں۔ کون آئے ہیں سیما پار کرکے بنگلہ دیش میں ہوئی فوجی بغاوت کیوں بھلا دی جاتی ہے... ؟

ہرمندر ہانپ رہا ہے۔ پنجاب سلگ رہا ہے بابوجی۔ اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔ گورو گوبند سنگھ کی قسم۔ خالصہ کی قسم ہمارا فرض ہے... اگر انہوں نے ہمارے پوتر استھان گندہ کیا تو... ؟

تو ؟

جگجیت بابا کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ خود کو دبائے رہے۔ سہن کرتے رہے پھر آہستہ سے بولے " بھی اُپدیش دینے آیا ہے [illegible] چلا جا۔ اخبار میں سب پڑھتا ہوں... [illegible] سے ہوتے ہوئے بہت کچھ بھی دیکھ رہا ہوں "

ہرمندر غصے میں سلگ گیا۔ جانے کیا کیا ادل فول بکتا ہوا دروازے کے باہر نکل گیا۔

آہستہ سے بڑبڑائے جگجیت۔ مہندر کور! تم نے کیسے بچے کو جنم دیا ہے۔ پنجاب کا گرم لہو تو میرے بدن میں بھی ہے مگر ماتر بھومی کی سوغات پر آنکھیں بند کرلوں۔ نا ممکن نا ممکن!

مہر نے آہستہ سے سر نکالا۔ پتاجی۔ بھائیا جی کی باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔ اب اس نے کچھ بولا تو...

تو کیا... وہ چونک اٹھے۔ تو بھی الگ ہو جا۔ آخر ٹھہرا تو بھی [illegible] خون... الگ ہو جا۔

مہر چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا۔

آنکھوں میں کتنی ہی تصویریں گھوم گئیں۔ مہندر کور، موران بہن، اوو شی بھیا، امریندر... خون کی سرخیوں میں میری آنکھیں کھوتی جا رہی ہیں لوگو!

•

لاکھوں [illegible] کانپ گئی ... !

" کل [illegible] کو دیکھا یا تھا"

شاستری کہہ رہے تھے۔ آنکھیں [illegible] کا شکار ہوگئی ہیں۔ بس دھندلا دھندلا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔ چشمہ لگاتے ہیں... پھر لیٹا ہوں... ڈنڈے کے سہارے... کل گرتے گرتے بچ گیا...

سب کچھ مسکراہٹ کے ساتھ ایک الگ [illegible] جیسے سچے بچے [illegible] ہیں شاستری جی۔ دیکھنا ہے ہم میں پہلے کون رخصت ہوتا ہے ؟

دیسا [illegible] ہاتھ پھر ٹھہر گئے ہیں۔ ہونٹ [illegible]

مسکراہٹ ابھر آئی ہے
"صدر راج کا نسخہ بے اثر ثابت ہوا... پولس
نے نقلی داڑھی اور مونچھوں والے سکھوں کو پکڑنا
شروع کر دیا ہے۔ کون ذمے دار ہے اس وحشت کے
ننگے رقص کا؟ اکالی پارٹی۔ دربار سنگھ یا گورنمنٹ
امرت سر کے گولڈن ٹیمپل میں اسلحے سے لیس لوگوں
میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بغاوت کی تربیت دی جا رہی
ہے۔ گورو نانک تو اس میں پولس نے چھاپا مار دیا
روز نئی نئی سرخیاں.. نئی نئی وحشتوں کا جنم..
سوچا بھارت خطرے میں پڑ گیا ہے۔ میں ٹکڑے
ٹکڑے ملک کو دیکھ رہا ہوں یعنی
UNITED STATES OF INDIA
کہہ کر ہلکی طنزیہ اداس ہنسی ہنسے شاستری۔
بساط پھر ٹھہر گئی۔ برہان کانپتے ہونٹوں سے
بڑبڑائے... تم نے ایک بات ٹھیک بولی شاستری
دیکھنا ہے ہم میں پہلے کون مرے گا... جو یہ بازی
جیت جائے سب سے لگی وہی ہے.. شاید اگر ایسا
موقع دیا جائے تو ہم تینوں ہی جلدی جلدی ہاتھ
اٹھا دیں گے۔
قہقہوں اور حادثوں سے الگ ایک تیز قہقہہ
ماحول میں شاید پہلی بار گونجا اور اس کا خاتمہ ایک
لمبی خاموشی پر ہوا۔
جگجیت بابا کو احساس ہوا تھا اس دن جب
معلوم ہوا تھا کہ آئین ۲۵ کو جلا دیا گیا ہے۔ ہر
کے چہرے پر بھی موت سا سناٹا پھیل رہا تھا۔ چہرے
پر کتنے سوال تھے۔ جگجیت کچھ بولے نہیں مگر
ویسا چلا آئے۔ گرنتھی صاحب پر حسرت سے نگاہ
ڈالی۔ وقت نے یہ رسم بھی توڑ ڈالی بچوں
میں او دیش بھیا رینگ گئے۔ پہلی بار بچوں کی نادانی
نے جگجیت بابا کو رلا دیا۔ شاید آئین ۲۵ نہیں جلایا
گیا۔ ہندو مذہب اور سکھ مذہب کے بیچ خلوص و محبت
کی جو عمارت تعمیر کی گئی تھی، چند نا سمجھ بچوں نے
پاگل ہو کر اسے پتنگ پارٹی کو دی تھی۔
"ہر... ہر..."
پکارنا چاہا۔ پر حلق سے آواز باہر نہیں نکلی،
اندر اندر گھٹ گئی تھی آواز.. مبہم صدا ساعد سے؛
اس دن ہر کہہ رہا تھا.. بابا بڑا عجیب لگتا ہے۔ جیسے
اپنے لوگوں کے بیچ اجنبی بن گیا ہوں۔ ہر مندر آنکھیں
بھولا۔ آتا رہا۔ وہی برق جولانی طبیعت ہے۔ وہ
کیا منع کرتے۔ کیا کہتے۔ بچوں کے ایک سے رنگ۔
ہر مندر کہتا رہا... دیکھا پتا جی! پنجاب کے واقعات
نے ہمیں ہریجن بنا دیا ہے.. شہر کا متوسط طبقہ
ہمیں بیک ورڈ سمجھ کر ہنستا ہے... ہم پر پھبتیاں کستا
ہے۔ سن سن کر دماغ جلنے لگتا ہے... لوگ لطیفے
کرتے ہیں... بھنڈراں والا اور لونگووال کے نام
سے ہماری پگڑیوں اور مخصوص لباس کا مذاق اڑایا
جاتا ہے۔ اب خون کھولتا ہے پتا جی...."
بساط بچھی ہے۔
برہان الدین کانپتے ہونٹوں سے کہہ رہے ہیں
کل پاکستان سے خط آیا ہے۔ ناصرہ مر گئی۔ ناصرہ چلی گئی
بزم میں بس یہ بوڑھا بیٹھا ہے.. اپنے چھوٹوں
کی رخصتی کا تماشہ دیکھنے کے لئے۔ بچپن میں ناصرہ کے
ساتھ کتنی ہی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ لے دے کر یہی
ایک بہن تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی۔ [illegible] گھر میں

بھرتی ۔ طوفان اٹھائے رہتی ۔ تب کتنی رونق تھی گھر میں ۔ گھر کے ہر فرد کی جہتی ۔ جانے وہ کون سا غیر محفوظ جذبہ تھا جو سب کو پاکستان کھینچ کرے گیا ۔ بامرہ کے دولہا بھی وہیں بامرہ کو لے گئے ۔ اب بتاؤ کون بچا ہے ۔ لے دے کر یہ بوڑھا ۔ جو عزیز گئے آخری آرام گاہ تک پہنچاتے ، وہی قبل از وقت رخصت ہو گئے ۔"

آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے ہیں ۔

جگجیت بس آہستہ سے اتنا بول پاتے ہیں "

ہم وقت کی بربادیوں کے شکار ہو گئے برباد ۔ جب بہت گھبراتا ہوں تو لاہور میں لوٹ جاتا ہوں ۔۔"

مہرے بساط پہ پھیلتے جاتے ہیں ۔

" پنجاب میں دنگائیوں اور دہشت پسند عناصر کے پھیلتے رجحان سے گھبرا کر حکومت نے وہاں ملیٹری حکومت قائم کر دی ہے ۔ فوج اور گرفتیوں میں زیر دست جھڑپ چل رہی ہے ۔ پولس مندر میں داخل ہو گئی ہے ۔ ہنگامہ پسندوں نے کئی جگہوں پر آگ لگا دی ہے ۔۔ گولیاں اور تعبنڈراں جاری ہے "

شاستری اخبار کی تازہ سرخیوں میں کھوئے دھندلی دھندلی آنکھوں سے دونوں بوڑھے مہرے تکے جا رہے ہیں ۔۔

تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہو ؟

جگجیت کی آنکھوں میں شکتہ

برہان کے ہاتھ کانپ گئے ہیں

جانے کن جذبوں کے تحت ۔۔۔

شاستری نے ڈنڈے پر اپنی گرفت سخت کر لی ہے ۔ لوگوں کی شکار آنکھیں آواز کی جانب اٹھ گئی

ہیں ۔"

تمہارے بارے میں ۔ مطلب تمہاری قوم کے بارے میں ۔۔ اچھا سوال کیا ہے جگجیت تم نے شاید بہت سارے شک آلود نگاہوں سے گھبرا کر تم نے یہ سوال میری جانب کیا ہے کہ ایک دوست کی کیا رائے ہے ۔۔ اسکا جواب تم بہتر دے سکتے ہو ۔ اس لئے کہ پاکستان بننے کے وقت بھی تم یہیں تھے ۔ پولس نے جب جب تفتیش کرنی چاہی ہے ، جواب مندر کی چھتوں سے برستی گولیوں سے ملا ہے ، دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ۔ کچھ لوگ اگر پاگل ہو جائیں تو ہم ساری برادری کو پاگل نہیں کہہ سکتے "

ایک ٹھنڈی سی جگجیت کو چلتے وقت مہرکو سمجھائیں گے ۔ ہر مندر کو بچائیں گے ۔۔ وقت کے گہرے پانی میں کچھ لوگ باقی ہیں جو اچھا سوچتے ہیں ۔ تحریک کہنہ اور نہیں ہوتی ۔ ماحول کی ایک سوئی دیکھ کر اس پر پتھر چلانے کا حربہ بہت پیدا ہو چکا ہے چہرہ پر غور سوچنے والی ذہنیت پہ عزیزوں کی مہر لگی ہوئی ہے ۔ لوگ سوچتے کب ہیں ۔ خالصہ تو ایک فرض کا نام ہے ۔ ملک کے لئے آتم بلیدان کا نام ہے ۔ مگر کسی نے [illegible] ۱۹۴۷ کی خونی شروعات کے نام پر خونی تاریخ لکھنے کی بربریت کر [illegible] پیج ادا جاتی ہے ۔۔۔

بھٹک گئے جگجیت ۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں چل پھر نہیں سکتا ۔ ورنہ میرا من [illegible] پشاور [illegible] ۔ [illegible] ۔ کون جانتا ہے کب [illegible] ہنگاموں کے درمیان کب [illegible] ۔ اچھا ہے ۔ آنکھیں [illegible] ۔ [illegible] بھی ہندو [illegible] ۔ ہندو ۔۔۔

گھر آئے تو اچانک خیالوں کے سارے تانے بانے بکھر گئے۔ مہر اپنی تبدیلی کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں کھڑا تھا۔۔

بابوجی! مجھے بھی جانا ہوگا۔

اچانک وہ سُن سے ہوگئے۔۔

مہر نے نظریں نیچی کرلیں۔ بات آگے بڑھانی روز روز ہو رہی جھجک سے اب تنگ آگیا ہوں ہرمندر کی بات میں تو گلے سے نیچے اتار لینا ہوں پڑتی نہیں اتار پاتی۔۔۔ اب میرا بھی چھوٹا بیٹا ہے ایک پوری فیملی ہے۔ سکھ پارٹی میں آپ نے میرا جو مکان کرائے پر اٹھایا تھا اسے خالی کروا لیا ہے۔ کچھ سامان بھجوا دیا۔۔۔ "

ڈرتے ڈرتے ٹوٹے ٹوٹے لفظوں میں مہر کہہ رہا ہے۔۔ وہ جیسے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو گئے ہیں۔۔ کیا جواب دیں۔ کیا کہیں۔۔۔ دل میں چبھے ایک نشتر کے بعد دوسرا چبھنے والا یہ نشتر کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بیٹا مت جاؤ۔ دل پر پہلے ہی ایک زبردست چوٹ لگ چکی ہے۔ مگر بیٹا خود بنائے گئے حالات کی گرفت میں پھنس چکا ہے'

کیا مان جائے گا؟

ممکنات۔

پھر بھی ان تمام سمجھوتوں کے باوجود انکے ہونٹوں میں جنبش ہوتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے ایک نظر مہر کی تھکی تھکی شکل اور بچے پر ڈالتے ہیں۔۔

تم سب چلے جاؤ گے؟

آواز گلو گیر ہو گئی ہے۔ ہرمندر پہلے ہی چلا گیا۔ اب تم بھی۔ اب تو میں خالی خالی ہو گیا ہوں

سوچا بھی نہیں۔ اس بوڑھے کا کیا ہوگا؟ تم لوگوں نے بوڑھے کو تو دو حصوں میں بانٹ دیا مگر تم کیا جانو۔ دو حصوں میں بانٹے جانے والا یہ بوڑھا (اندر ہی) اندر کتنے حصوں میں بٹ چکا ہے۔

گھر میں تنہائی ہے۔ تنہائی کے شب و روز میں جگجیت سنگھ خلا میں اٹھنے والے بادلوں کے ہجوم میں کبھی کبھی پیدا ہوتی شکلوں میں ان نقشوں کو کھوجا کرتے ہیں جو لاوارث سی دکھائی دیتی ہیں۔ سب جو صاحب پڑھتے پڑھتے آنکھوں سے لہو جاری ہو جاتے ہیں۔ بساط بہت دن سے سونی ہو گئی ہے۔ کبھی دروازے پر بیل بجتی ہے تو دو چہرے دکھنے میں آتے ہیں۔ خمیدہ کمر والا بوڑھا برہان الدین، گلوکوں کی ماری آنکھیں لئے شاستری۔ شام کے وقت اکثر خاموش چہروں کے سامنے نظر آتا ہے۔۔۔ ہرمندر۔ مہر۔ اس کے بچے۔ مگر اب ایک سمجھوتا ہے۔ فاصلوں کا۔

بدلتے ہوئے وقت نے کتنے نشتر اندر گھونپ دیئے زمانے اور حالات نے پیٹھ میں کیسے کیسے خنجر بھونکے ہرمندر کی آنکھوں میں شعلے ہر نئے واقعات کے بعد کچھ اور یہ بے حس بوڑھا اپنی گھریلو بے تعلقی کی بنا پر بس ہی کیا کرتا۔ صرف سنتا رہا۔ کہ گولڈن ٹیمپل میں پولس اور انتہاپسندوں میں زبردست جھڑپ ہوئی۔ کئی روز تک لگاتار گولیاں چلتی رہیں۔ بھنڈراں والا مارا گیا۔ ونگو والا پولس کی حراست میں۔۔۔ سارا پنجاب جل رہا ہے۔ سلگ رہا ہے۔۔۔ ہرمندر کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک ہے۔ ہر حادثے اور واقعات کے بعد ایک نیا تیور۔۔۔ سکھ رجمنٹ سے کھلبلی

...ہوت کر گئے......
...ک سے ہو گئے ہیں جگجیت۔ آرمی میں ایسی
بات... سر جھک گیا.. واقعات کیا کیا گزرتے رہیں گے
کون کون سی زہر بھرے جام پلائیں گے؟ اب طاقت
نہیں ہے گرنتھ بابا...

واقعات کی زیور شن نے ہرمندر کو بوکھلا دیا ہے
...بابا اب سارے چہرے اجنبی لگتے ہیں.. وہ چہرے
جو ... پاس بستے ہیں وہی چہرے ہمیں گھور کر تکتے ہیں
ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ بسوں اور گاڑیوں میں صرف
ہمیں روک کر چیکنگ کی جاتی ہے... ہم یہاں خود
کو غیر محفوظ سمجھ رہے ہیں بابو جی... ہمارا سکون اڑ گیا
جاتا ہے... ہم پر فقرے کسے جا رہے ہیں...."

جگجیت بابا کو کھانسی آ گئی۔ پھر کھانستے
چلے گئے.. کھانستے کھانستے بے دم ہو گئے.. آنکھیں
سرخ ہو گئیں۔ کیا کہتے۔ کس نے اجنبی بتایا تم کو۔
خود ہی اجنبی بن کر اجنبی سے بنانے کا رونا کیوں روتے
ہو..... پھر کھانسی اٹھی.. بے دم سے ہو گئے
شاید اب نہیں بچوں گا۔ حالات نے کسی لائق نہیں
چھوڑا۔ آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے
چکر آ رہے ہیں۔ پیروں سے سارا خون غائب ہو
گیا ہے ہرمندر یا جھکے ہاسے بستر پر گر گئے ہیں۔ بغل
میں بسنتم کھڑا ہے.. پہرا لو کر۔

بسنتم! بھائی اور دوستوں کو خبر کر دو... اب
... ہوں۔

آنکھوں کے حلقے گہرے ہو گئے ہیں۔ ایک
... سب گرنتھ ... آنکھوں میں چھا گئے ہیں۔
... بھی۔ امریندر، ہرمندر اور سب کے سب۔

آنکھیں ڈوبتی جا رہی ہیں....."

ہر خیریت پوچھنے آیا ہے۔ ہرمندر اپنی بیوی
بچوں سمیت آیا ہے.. بسنتم نے جا کر سب کو خبر کیا۔
شاید بابا صاحب اب نہیں بچیں گے سب کھڑے
ہیں.. پائینتی کے پاس بریان اور شاستری بھی کھڑے
ہیں اداس پریشان.. آنکھوں میں وہی سوالات لئے
بوڑھے! کیا بازی تم ہی ہار جاؤ گے؟ سب سے تھکے
تم ہی ہو.....

دھندلی دھندلی آنکھوں سے بوڑھا اوجھل
ہوتے ہوئے چہروں کو تک رہا ہے... کیا کہے...
میرے دل کے کئی ٹکڑے ہو چکے ہیں دوستو۔ اتنے
نشتر چبھے ہیں۔ اتنے نشتر گن نہیں سکتا۔ نہ تمہیں
دکھا سکتا ہوں۔!

شام بارک پوری
بنگلا دیش

آواز کا ماتم

میدان میں لوگوں کا جم غفیر تھا۔
لوگ دائرے کی شکل میں کھڑے تھے شور و غل سے فضا گونج رہی تھی، کوئی تالیاں بجا رہا تھا تو کوئی شاباشی دے رہا تھا، ماحول گرد سے اٹا ہوا تھا،

عوام کے دائرے کے درمیان دو شخص مرغ لڑا رہے تھے، لوگ سامعین بنے داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے، دونوں مرغ باز بڑے جوشیلے اور جنگجو نظر آ رہے تھے پسینے سے شرابور ہاتھ اٹھا اٹھا کر چلا رہے تھے،

دونوں ماہر مرغ باز تھے۔ مرغ بازی ان کی کمائی کا ذریعہ تھی، وہ نہ صرف اپنے فن میں یکتا تھے بلکہ مرغ کی فطرت سے بھی واقف تھے،

مرغ کافی توانا اور ہٹے کٹے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ اُچک اُچک کر وار کر رہے تھے۔ اپنے اپنے پر پھڑ پھڑا کر چونچوں سے حملہ آور تھے۔ کبھی ایک، دوسرے کو پچھاڑ دیتا، کبھی دوسرا اس پر حاوی ہو جاتا، غیض و غضب جنوں کی حد کو پار کر چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی تکا بوٹی کر دینا چاہتے تھے۔ غصے کے مارے ان کی گردن کے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں ایک کا رنگ سرخ تھا اور دوسرے کا سفید!

دونوں مرغ باز اپنے اپنے مرغ کو کھلا پلا کر کافی تگڑا اور طاقت ور بنا چکے تھے۔ وہ انھیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے شہہ دے رہے تھے۔

”میرا مرغ شیر کی طرح بلوان ہے۔ ہے کوئی مائی کا لال اس کے مقابلے کا؟!!
”ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کس میں کتنا دم ہے!“
”میں نے اپنے مرغ کو زبردست ٹریننگ دی ہے!“
”میرا مرغ ڈنکے کی چوٹ پر اتنا زور آور ہو گیا ہے کہ کوئی اس کے مد مقابل ٹھہر نہیں سکتا“
”ارے میاں جاؤ۔ شاید تمہیں میرے مرغ کی جانبازی اور کرتب کا اندازہ نہیں“
”وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ ابھی حقیقت سامنے آ جائے گی“
”ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، دیکھنا تمہارا مرغ گیدڑ کی طرح دم دبا کر بھاگ جائے گا۔“
”میرا مرغ کوئی ایسا ویسا نہیں، تمہارے مرغ کو دن میں تارے نظر نہ آئے تو کہنا“

اب دونوں مرغ باز اپنی اپنی آستین چڑھا کر ایک دوسرے کو آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ ان میں نوک جھونک شروع ہو گئی تھی، ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے، مگر کوئی بھی ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کو تیار نہ تھا،

دونوں مرغ لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے

مظفر

انشائیہ

کچھ موت کے بارے میں

طبیبوں نے موت سے فرار اور حکیموں نے موت کے اسرار پر محنت کی طبیب کا ہر راستہ موت
پر ختم ہوا اور حکیم کو ہر راز دے پر موت ایک ٹھوس حقیقت ملی۔ کہیں کوئی رخنہ نہیں، فرار اور پیکار کی
یہ کوشش تا حال جاری ہیں مگر رزم گاہ میں ہتھیار ڈال دینے والوں کی تعداد زیادہ ہے، بعض زیر تربیت
طبیبوں نے جب دیکھا کہ موت ناگزیر ہے تو نیم حکیم ہونے پر قانع ہو گئے۔ اس فعل میں ایک تو خوف کا عنصر
شامل ہے دوسرے خوشامد کا کہ اے موت! میں تیرا ایجنٹ ہوں۔ یوں تو ساری خلقت از خود تیرے پاس
چلی آرہی ہے مگر اٹھا کر تیرے قدموں میں لا ڈالتا ہوں۔ قبول فرما۔ موت کو ایسی ایجنسی کی ضرورت نہیں
ہوتی۔ اس لیے وہ با اختیار خوشامد پسندوں کی طرح متاثر نہیں۔ لہٰذا خوشامدیوں کو مہلت دیتی ہے
نہ زبردستی لا ڈالے گئے فریادیوں پر دروازہ کھولتی ہے۔ جس کا نمبر آتا ہے، اس کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے۔

موت کے تعلق سے فکر و اظہار اور تدبیر و تشہیر کا سلسلہ آفرینش سے جاری ہے۔ انفرادی اور
گروہی کوششوں کی حدوں سے نکل کر یہ عمل بین الاقوامی سطح تک پہنچا ہے مگر انفرادی، گروہی اور
بین الاقوامی سب کوششیں یو۔ این۔ او۔ (U.N.O.) کی کوششیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ جس
کا نمبر آتا ہے، ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں کہہ کر روانہ ہو جاتا ہے۔ لواحقین اس ساغر کو
تھام کر خوش ہو جاتے ہیں اور موت کو دعا دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ موت کو دعا گوئی کا منظر دیکھنا
کم ہی نصیب ہوتا ہے اکثر لوگ موت کو کوستے ہوئے ساغر توڑ دیتے ہیں کہ اس میں دھرا ہی کیا ہے

زندگی کی بہار و خزاں یوں تو آپ ہی اپنا جواز معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور کیجیے تو زندگی چابی کا
کھلونا ہے جسے موت نے چابی بھر کر میدان میں چھوڑ دیا ہے۔ سارے انسانی رویے اور جینے کے چلن
موت کی طرف آدمی کے رویے سے متعین ہوتے ہیں۔ رشوت لینے والا افسر ہو، ملاوٹ کرنے والا
تاجر ہو، پاکستان کی شہ رگ میں دانت ....

کاڑے خون پینے والا سرمایہ دار انہیں زندگی کا عیش بٹورتے دیکھ کر مجھے لگتا ہے یہ سب اس شخص کے مانند ہیں جو چوری چھپے باغ میں گھس پڑا ہے اور دانت سے آنت تک بڑی سرعت سے اس خوف کے زیر اثر مصروف کار ہے کہ باغ کا رکھوالا اپنے ڈنڈے کے ساتھ کوئی دم میں آنے کو ہے۔ موجودہ مفت خوروں سے سابق مفت زوروں تک سب کا حال ایک سا ہے کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

انسانوں کا ایک طبقہ ان عیش کوشوں کی ضد ہے اور یہ قلندروں پر مشتمل ہے یہ منظر بھی دیدنی ہے قلندر نے آنکھ کھولی اور ایک انگڑائی لیکر کھڑا ہو گیا۔ موت نے اپنا چابی کا گھوڑا کہ زندگی جس کا نام ہے آگے بڑھا دیا۔ چابی کا گھوڑا چھن چھن کرتا آگے آیا۔ قلندر نے ایک عارفانہ قہقہہ لگایا اور ڈگ بھرتا آگے نکل گیا۔ اب افق سے افق تک آگے آگے قلندر کا قہقہہ ہے اور پیچھے پیچھے چابی کے گھوڑے کی چھن چھن۔ بالآخر موت نے اپنا گھوڑا اٹھا لیا اور قلندر افق کے اس پار! ۔ واللہ! لطف آ گیا! مگر غور کیجیے کہ اگر زندگی چابی کا گھوڑا نہ ہوتا تو ؟ اور جو کچھ بھی ہوتا مگر یہ سچ ہے کہ قلندر نہ ہوتا۔

انسانوں کا تیسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو گویا قلندر اور عیش کوش کا کاک ٹیل ہے۔ یہ پہلے تو باجے گاجے سے شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور پھر گردن سے جوا پھینک کر مسجد کا گوشہ سنبھال لیتے ہیں۔ ان میں نہ عیش کوشوں کا حوصلہ ہوتا نہ قلندروں جیسا ضبط۔ گویا خواہش کے برخلاف مالی کے ڈنڈے سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر دل! اس میں تو "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" لہٰذا اپنی [illegible] سے بھاگ کر حور و غلماں کے حصول کے لئے ہانپ ہانپ کر وظیفے پڑھنے لگتے ہیں۔ ایک ایسے ہی خانماں برباد کی بیوی سے اس کی پڑوسن نے پوچھا کیوں جی! سنا ہے تمہارے میاں اب گھر بار چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ رہے ہیں۔ جواباً عرض کیا گیا اجی ہاں! وہ کہتے ہیں اب اہلیں بھول جاؤ ہم تو حور و غلماں کے ہو رہے ہیں ان کے تو عیش و عیش وہاں کہاں! وہاں تو ہر جمعہ کو آواز ملتی ہے —— بھائیو! دل کھول کر چندہ دو موذن صاحب کی تنخواہ نہیں نکل رہی ہے

بھیڑ سے نکل کر زندگی پر نظر ڈال جائے تو لگتا ہے دنیا کی حالت اس قیدی کی سی ہے جسے موت کی سزا سنائی گئی ہو اور پھانسی کے اونچے چبوترے پر کھڑا کر کے آخری خواہش کے طور پر پوچھا جا رہا ہو بتا تیری رضا کیا ہے!

ہم نے یہاں تک لکھا اور اپنے ایک پٹھان دوست کو سنایا تو وہ کہنے لگے —— میاں! ہوش کی بات کرو! ہم بھی وہ خاک ہیں کہ موت بھی توبہ کرے گی۔ میں نے پوچھا کیا تم موت کو شکست دے سکتے ہو؟ فرمایا۔ نہیں نہ جیتنا ہے نہ ہارنا ہے مگر زندگی ایک بار پٹھان کے قبضے میں آگئی ہے تو اسے [illegible] کا [illegible] موت آئی تو اس کے ساتھ نہیں۔ فوجدار خان۔ جاؤں گا۔ میری زندگی نہیں۔ یہ زندگی بیٹے فوجدار خان کے حوالے کر دوں گا کہ بیٹا! اس کی پوری حفاظت کرنا اور اس میں اضافہ کر

نصر قریشی

دعا

دشت جاں میں موسم گل کا پیمبر بھیج دے
پیاس کے صحراؤں میں بہتا سمندر بھیج دے

سایۂ دیوار سے محروم ہے سورج کا شہر
دھوپ میں ننگے سروں پر بھیگی چادر بھیج دے

بے نواؤں کا نہیں ہے کوئی ہمدم، ہمنوا
غمزدوں کے واسطے ہمدرد لشکر بھیج دے

یہ سفر مسدود راہوں کا، بھٹک جائیں نہ ہم
خضر صورت بے ریا ہو، ایسا رہبر بھیج دے

روشنی ظلمت کدوں میں قید ہو کر رہ گئی
اس پرندے کے لئے آزادی کے پر بھیج دے

شاہراہیں، قتل گاہیں ایک سی لگنے لگیں
بجھتی آنکھوں کے لئے خوش رنگ منظر بھیج دے

ایک سیلاب بلا ہے ہر طرف پیچھے لگا
کوئی گوشہ عافیت کا اس زمیں پہ بھیج دے

نصر آزردہ ہوا کھا کر فریب دوستاں
کوئی سچا مونس و غمخوار، دلبر بھیج دے

نفیس بانو



(انسانی درندے)

درد سے کراہتی ہوئی
ایک نڈھال جان
نحیف و ناتواں
آنکھیں ویراں
زلف پریشاں
زندگی گریاں
موت خنداں
مسیحا حیراں

سن رسیدہ
کمر خمیدہ
بڑھیا بے سہارا
زرد چہرے پہ جھریوں کی باریک چادر
شکن آلود
میلی میلی
یا —
کسی دریا کا سوکھا ہوا سینہ
جابجا دراڑیں
یا —
کسی بچے کا غبارہ۔ مسلا ہوا۔ سکڑا ہوا
کانپتے تھرتھراتے لبوں پر
زہر آلود تبسم رقصاں
جابجا ہونٹوں کی کھال ادھڑی ہوئی
جیسے کسی دلدل کی تہہ دھوپ سے اکھڑی ہوئی
پھر بھی نیلے ہونٹ پر مسکراہٹ بکھری ہوئی
آہ!
تقدیر کی سیاہی لبوں پر اتری ہوئی
یہ کون ہیں اس کے ارد گرد؟
منڈلاتے ہوئے لاش پہ جیسے گدھ!

یہ وہ ہیں! یہ وہ ہیں!
جنکو اس نے جنم دیا۔
جن کو اس نے خون پلایا
جنکو اسنے پروان چڑھایا۔

ماں کی دولت کے بھوکے۔
یہ انسانی درندے۔
ماں دم توڑ رہی ہے۔
دولت بیٹوں میں بٹ رہی ہے۔

نیر جہاں
(کینیڈا)

ایک بات

اس سے پہلے کہ یہ گنگناتے قدم
منزلوں کے تصور سے سرشار ہوں
دوست ایک بات سن
میرے ماضی کے سائے ہیں اب تک جواں
میرے چہرے پہ لکھے اندھیرے نہ پڑھ
اور یہ نہ سمجھ
مجھ سے پہلے فضا خانۂ دل میں انوار و نکہت کے سیلاب آئے نہ تھے
مجھ سے پہلے محبت کی لذت سے یہ گوش و لب آشنا ہی نہ تھے
دل کو اک دوسرے دل کی دھڑکن سے نسبت نہ تھی
میٹھے خوابوں سے آنکھوں کی گودی بھری ہی نہ تھی
دل اکیلا مسافر غریب الوطن۔ راحت ہمسفر کا شناسا نہ تھا
فرق اتنا ہے لیکن کہ اس مرتبہ
دل میں روشن ہوئی ہے جو چھوٹی سی لو
اس کے جلنے کا انداز کچھ اور ہے
جیسے درگاہ پر جل رہا ہو دیا

اسعد بدایونی

اجنبی منظروں کے درمیاں

ساربان
اب کے تو نے یہ کس دشت میں
ناقۂ ناتواں لا کے ٹھہرا دیا
چار جانب جہاں ایک اسرار ہے
یہ کیسی خموشی ہے — جس میں
کوئی بولتا لگ رہا ہے
یہ کیسی ہوائیں ہیں
ان میں عجب باس ہے
یہ کیسے مناظر ہیں
جن کو مری آنکھ سے واسطہ
کوئی پہلے نہ تھا
یہ ندی: کہ جیسے کوئی اژدہا سا پڑا ہو
یہ اشجار: گویا کہ بدمست ہاتھی کھڑے ہیں
مکڑیوں، بچھوؤں کی طرح لگتے ہیں
فرش پر جتنے پتے پڑے ہیں
یہاں میرا خیمہ نہ استادہ کر
پشتِ ناقہ سے اسباب مت کھولنا
یہ زمیں مقتلِ دوستاں لگ رہی ہے
یہ ہریالی مجھ کو خزاں لگ رہی ہے

نظمیں

حمید الماس

ابواب

آنسوؤں سے
رات دن لکھی ہوئی، نظموں پہ تم
رحم مت کھاؤ
دعائیں دو کہ
ان نظموں میں
میری زندگی کے مختلف ابواب ہیں

عادل ادیب

حاصلِ سفر

جوان خوبصورت سجل اور شگفتہ
نکلتے ہوئے روز و شب کا تسلسل
محبت مسرت کے سیال موتی
حسین شوخ لمحوں کے تابندہ ذرے
ہے کتنا درخشاں
سفر زندگی کا !

فضا کوثری

تخلیق کا بدن چھلنی

برقِ الفاظ کی جو کوندی ہے
آج ٹکرا گئی ہے فکروں سے
زلزلہ سا دیارِ ذہن میں ہے
شہرِ تخئیل گرد گرد ہوا
انگلیاں ہیں شعور کی زخمی
چہرۂ فن پہ آ گئی ہے خراش
حرف کی دسترس میں ہے اظہار
دائروں میں ہیں قید صوت و صدا
کوئی لفظ زیر و زبر میں الجھے گا
جب ہو تخلیق کا بدن چھلنی !

مصطفیٰ مومن

انجان خوف سے
اپنی دسترس سے باہر
اونچے لمبے پیڑوں کے جسم پر
ایک کالا سایہ
قرنوں پرانا
وقت کو للکارتا ہوا
بارش میں بھیگتا ہوا
سر پہ اوڑھے ہوئے گردِ سفر
بے جان و بدحال
درختوں کے چہروں کو تکتا تھا

غزلیں

حامدی کاشمیری

(۱)

چمکے گی آیت جبیں آخر — آئے گا ان کو بھی یقیں آخر
کبھی پرچھائیوں کا غلبہ تھا — [illegible] راہوں پہ سب مکیں آخر
لکھتے ہیں خون سے فلک [illegible] — ہوں گے آسودہ زمیں آخر
پھٹی موج ہوا سے رک کے رکے — سن ہی لو گے صد آفریں آخر
ان چٹانوں کی خامشی پہ نہ جا — ہو گی یہ محشر آفریں آخر
تیری منزل کہاں ہے دشت نورد — ہم پہنچ جائیں گے کہیں آخر

(۲)

خواہش صبح نور کریں گے — یہ اگر ہے تصور کریں گے
بے اثر ہوں گے ان کے منصوبے — فاصلے کس کو دور کریں گے
کتنے کوہ گراں عبور کئے — ایک یہ بھی عبور کریں گے
ہو گا پرچھائیوں سے کیسے مفر — آئینے چور چور کریں گے
کتنے برسوں سے رت بدل نہ سکے — اب بحر بھی عبور کریں گے
ہے خبر ان کو شعلہ خواری کی — آزمائش ضرور کریں گے

مخمور سعیدی

وہ ملے بھی تو ہم سے بچھڑنے کے لئے
دل کا آنگن جو بسا بھی تو اجڑنے کے لئے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں کچھ خواب ہوئے ہیں میرے
تتلیاں رات کے جنگل میں پکڑنے کے لئے
ٹھنڈی چشموں کی طلب لے کے چلے آئے ہیں ہم
ایڑیاں، جلتی زمینوں پہ رگڑنے کے لئے
رنگ، کچھ ایسے بکھرے خاک جہاں میں ہم نے
کوئی تصویر بنی بھی تو بگڑنے کے لئے
بھربھری ریت کے مانند تھی ہر سخت زمیں
ہر شجر تھا کسی آندھی میں اکھڑنے کے لئے
اپنا انجام سفر کیا تھا بکھرنے کے سوا
ہم ہواؤں سے چلے آئے تھے لڑنے کے لئے
آپ اپنے ہی سے مخمور جھگڑتے رہے یوں
کس کو فرصت تھی زمانے سے جھگڑنے کے لئے

غزلیں

شاہد لطیف

کسی کی نظر میں بس گئے ہیں اداس منظر سراب چہرے
کسی کی آنکھوں میں جھلکتے ہیں مسرتوں کے گلاب چہرے
ہمارے اندر بھی جل رہی ہے اک آگ دوزخ کی آگ جیسی
ہمارے جسموں پہ رکھ دیئے ہیں زمانے کس نے عذاب چہرے
تمہارے جاتے ہی آندھیوں نے ہماری بستی کا رخ کیا تھا
کبھی جو آؤ گے دیکھ لینا ورق ورق ہیں کتاب چہرے
ہمارے چہروں پہ خاک ملتے ہیں زندگی کے کئی تقاضے
میں جانتا ہوں سوال دن کا نہ دے سکیں گے جواب چہرے

شاداب رضی

ہر گھڑی سنگِ ملامت خود پہ مت پھینکا کرو
بے دلی بڑھ جائے گی خود سے نہ یوں الجھا کرو
کیا حقیقت ہے تمہاری خود عیاں ہو جائے گی
ایک ناقد کی طرح خود کو کبھی پرکھا کرو
چاند میں دھبا ہے لیکن چاندنی بے داغ ہے
وصف کی میزان میں ہر شخص کو تولا کرو
تلخیوں کی راکھ میں لذت کی چنگاری بھی ہے
یہ حقیقت ہے اسے تم لاکھ جھٹلایا کرو
حادثہ کیسا ہوا جو لوگ پتھر بن گئے
تم بھی میرے ساتھ اس موضوع پر سوچا کرو
تم بھی پوجے جاؤ گے شاداب [illegible]
شخصیت کی روشنی ہر سمت پھیلایا کرو

غزلیں

خورشید طلب

ف سوکھے بدن پہ زیور نیا نیا سا
قی آنکھوں میں قید منظر نیا نیا سا
س گونگی علامتوں کو زباں عطا کر
ش دستِ ہنر سے پیکر نیا نیا سا
ا جب بھی سیراب ہو کے نکلتا ہوں اس کی جا
بانے لگتا ہے کیوں سمندر نیا نیا سا
لسی میں بھی تازگی کی رمق نہیں تھی
تو آتا تھا ہر کلینڈر نیا نیا سا
پرانے نہ ہوں مراسم مرے تمہارے
شہ مجھ کو لگے ترا گھر نیا نیا سا
شعور کی راہ ہموار کر رہا ہے
ب تمہاری غزل کا تیور نیا نیا سا

شاہد بہاگری بھوپال

مہ و نجوم ہیں سورج کے گھر میں رہتا ہے
تمہارا حسن تو سب کی نظر میں رہتا ہے
ہر ایک مسافرِ ہستی سفر میں رہتا ہے
خیالِ گردشِ شام و سحر میں رہتا ہے
وہی خلوص ہو باہم گھروں میں کانٹوں میں
وہ ربطِ خاص جو دیوار و در میں رہتا ہے
بھٹک کے جا نہیں سکتا کہیں کبھی دیوانہ
ترے خیال تری رہ گذر میں رہتا ہے
اندھیری رات کا شکوہ نہیں مجھے لوگو
ایک آفتاب سا چہرہ نظر میں رہتا ہے
میں آسماں کی حدیں چھو کے لوٹ آیا ہوں
یہ آسماں تو مرے بال و پر میں رہتا ہے
رہِ طلب میں بھی شاہد مسافرِ ہستی
تھکن سے چور ہے پھر بھی سفر میں رہتا ہے

صابر فخرالدین

...ل

چھوٹی چھوٹی دیواریں تھیں
سستے کرائے کی چائیں تھیں

بازاروں سے کیا لائے ہم
بازاروں میں ہڑتالیں تھیں

گھر پہ سبزہ اگا ہوا تھا
ہری بھری سی دیواریں تھیں

تہواروں کے شبھ اوسر پہ
ہاتھوں میں بھی کرپانیں تھیں

اوٹ کی پرچی کا حاصل تھیں
آتی جاتی سرکاریں تھیں

سورج گہن تھا جب تک صابر
ویراں ویراں سب سڑکیں تھیں

انیس انصاری

یہی بہت ہے

یہی بہت ہے کہ تم میرے پاس بیٹھ کر مسکرا رہی ہو
مجھے شرارت سے چھیڑ کر زیر لب یونہی گنگنا رہی ہو
جھکی نگاہوں سے چھن رہی ہیں ابھرتے سورج کی نرم کرنیں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے تھکے بدن کو دبا رہی ہو
کہ تم سے پہلے کے میرے ساتھی سیاہ گلیوں میں کھو گئے ہیں
پرانے رشتوں کے سب مکاں رات کے اندھیروں میں
وہ پھول چہرہ جو میری خاطر چراغ روشن کئے ہوئے تھے
کڑے دنوں کی مسافتوں میں تھکن سے خود چور ہو گئے ہیں
دھنک کی مانند چند لمحوں میں غالباً ڈوب جاؤگی تم
پڑھی کتابوں کی شکل الماریوں میں مجھکو سجاؤگی تم
یہی بہت ہے کہ جل رہی ہو ابھی لہو میں چراغ بن کر
شفیق چہروں میں تم کو ڈھونڈا کروں گا اور مل جاؤگی تم
یہی بہت ہے کہ تم میرے پاس بیٹھ کر مسکرا رہی ہو
مجھے شرارت سے چھیڑ کر تم نہ جانے کیا گنگنا رہی ہو
جھکی نگاہوں سے گر رہی ہے پھوار شبنم کی قطرہ قطرہ
نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے مجھ میں سما رہی ہو
یہی بہت ہے، یہی بہت ہے کہ تم میرے پاس آ رہی ہو

تبصرے

نام کتاب : رسوا سر بازار
مصنف کا نام : فضل حسنین
کتاب کی قیمت : آٹھ روپئے
ملنے کا پتہ : کتابستان ۳۰ چک آلہ آباد
مبصر : اسرار گاندھی

اردو ادب میں طنز و مزاح نگار کی کمی ہمیشہ محسوس کی گئی ہے ایسے میں جب اس میدان میں کوئی نیا نام سامنے آتا ہے تو اس کی تخلیقات کو پڑھنے کے لئے اپنے آپ ایک جذبہ بیدار ہوتا ہے ایک خواہش پیدا ہوتی ہے۔

ایسی ہی خواہش اس مجموعہ کے سلسلہ میں بھی پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس مجموعہ کے خالق فضل حسنین اس میدان میں اتنے نئے نہیں ہیں جتنے معروف ہیں وہ لکھتے ہیں — "سچ پوچھئے تو اس مجموعے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ بیشتر مضامین مختلف جرائد میں شائع ہو کر پہلے ہی رسوا ہو چکے ہیں لیکن کچھ خیر خواہوں کا خیال تھا کہ بغیر مجموعہ شائع ہوئے کوئی بھی تخلیق کار مستند نہیں سمجھا سکتا (اسی لئے) یہ مضامین "مجموعی رسوائی" کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں"۔

اور یہی مجموعی رسوائی "طنزیہ او رمزاحیہ ادب میں ایک اضافہ بن کر سامنے آتی ہے۔

ان مضامین میں فضل حسنین نہ تو مشتاق احمد یوسفی کی بلندی کو چھو پاتے ہیں اور نہ ابھی ان کے قلم میں مجتبیٰ حسین جیسی تیزی اور تندی آتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی شناخت ضرور بنا تے ہیں۔

ان کے یہاں مزاح بڑے فطری انداز میں نمودار ہوتا ہے چاہے وہ اس مزاح کو سچویشن سے پیش کر رہے ہوں یا لفظوں سے کھیل رہے ہوں۔ اسی طرح وہ جتنا دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اپنا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں۔ اور یہیں ان کی پوری ذہانت نظر آتی ہے۔

فضل حسنین اپنے مزاح کا نشانہ ایسے واقعات کو بناتے ہیں جو ہر کسی کی زندگی میں روز مرہ ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں واقعات کو مزاحیہ ڈھنگ سے بیان کرتے کرتے اچانک طنز کے ایسے تیر چلاتے ہیں جو کبھی گہرا زخم لگاتے ہیں اور کبھی تیر نیم کش کا مزہ دیتے ہیں۔ صدارت سے افتتاح تک میں آج کی سیاست پر اپنے تیر یوں چھوڑتے ہیں۔

انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ صدر صاحب سے ہی افتتاح کرا دیا جائے، صدارت تو کوئی بھی کرے گا۔ چنانچہ صدر صاحب کو بھی اس فیصلہ سے آگاہ کیا گیا۔ موصوف نے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا کیا مجھے بھی کوئی وزیر سمجھ لیا ہے کہ جب چاہا صدا

تبدیل کر دیا۔ میں تو صدارت ہی کرونگا"

اسی طرح فضل حسین نے انسانی نفسیات کی تصویر کشی بھی جگہ جگہ بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ مثلاً قصہ ادیب بننے کا میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ـــ

ایڈیٹر خط بھی آگیا کہ ہمارا افسانہ عنقریب شائع ہونے والا ہے، بس اب کیا تھا ہمیں تو منھ مانگی مراد مل گئی........ ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں سے ملاقات کرتے اور بات گھما پھرا کر اس موضوع پر لے آتے۔ مخاطب کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک اڈیٹر کا وہ خط اس کے سامنے آئینے کی طرح نہ کر دیتے۔ اس خط کو ہم ہر وقت سینے سے لگائے رکھتے تھے ـــ

یہ جملے ہر اس نئے ادیب کے اندر چھپے اس جذباتی ہیجان کو پیش کرتے ہیں جس کی پہلی تخلیق شائع ہونے والی ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں پندرہ مضامین شامل ہیں، لیکن ہر مضمون کی دنیا ایک دوسرے سے الگ جھلک نظر آتی ہے۔ کبھی وہ اس دور کے اساتذہ اور طالب علموں کا مذاق اڑاتے دکھائی پڑتے ہیں تو کبھی سٹی بسوں کے نظام کا۔ کبھی مختلف قسم کے ڈاکٹر اور ان کے دواخانوں کی دلچسپ تصویر کشی کرتے ہیں، تو کبھی ایسی مصیبتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اچانک اس طرح آ جاتی ہیں کہ انسان سسکنے اور رونے کے بیچ معلق رہ جاتا ہے۔

قصہ ادیب بننے کا، مصیبت در مصیبت رسوا سر بازار، (انگریزی فلم کا چکر)، رفیقہ سٹی بس بنام پیدل، بیگم کا اسکول، معتبر اور مشورے" وغیرہ اس مجموعے کے بے حد دلچسپ اور اچھے مضامین ہیں۔ میرے خیال میں خواہ مخواہ ایک بے حد اچھا اور خوبصورت مضمون ہو سکتا تھا اگر اسے غیر ضروری طور پر DRAG نہ کیا جاتا۔ اس مجموعے کے بعض مضامین تخلیق کار کے ابتدائی دور کے مضامین ہیں جو کمزور ہیں اگر انہیں اس مجموعہ میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

مجموعی طور پر رسوا سر بازار، طنز و مزاح کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اچھے گٹ اپ اور خوبصورت کور والے اس مجموعے کی قیمت اتنی کم رکھی گئی ہے کہ خریدنے کے بعد بھی لگتا ہے کہ جیسے مصنف نے آپ کو یہ کتاب تحفہ کے طور پر دی ہے۔

سطور و حرف

برادرِ مکرم! تسلیم

اگست کے آہنگ میں میرؔ کے کلام کی تشریح و تفہیم میں آپ نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے زیادہ سلجھے ہوئے تنقیدی نقطۂ نظر سے کام لیا ہے۔ فاروقی صاحب واقعی الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اکثر دور کی کوڑی لائے ہیں۔ انہوں نے بعض الفاظ کے معنی بھی گنجلک انداز میں پیش کئے ہیں

ستمبر کے آہنگ میں عنوان چشتی نے محترم اعجاز صدیقی صاحب کی شخصیت پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے، اس چھوٹے سے سادہ و پاکیزہ و نفیس مضمون نے دل موہ لیا۔ اعجاز صاحب کا پُر خلوص پیکر نظروں میں پھرنے لگا۔ واقعی وہ بہت متین و شیریں اور دوست دار انسان تھے انھوں نے کم و بیش وہ نظرِ التفات مجھ پر بھی کی جس کا ذکر بڑے چاؤ اور محبت سے عنوان چشتی صاحب اپنے سلسلہ میں کیا ہے۔ اعجاز صاحب دکھی دل کے لئے اور مجھ جیسے دکھی دل والے لوگوں سے بڑی

محبت کرتے تھے۔ "شاعر" کے جرعات اردو تحریک اور اردو زبان کے فروغ و ارتقاء کے لئے جد و جہد کی ایک روشن، تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ جرعات اب اسی گہری بصیرت اور بیباکی و جراءت کے ساتھ اعجاز صاحب کے لائق فرزند افتخار امام صدیقی لکھ رہے ہیں

سید احمد شمیم کا مضمون "جمشید پور میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" بڑی دل چسپی سے پڑھا۔

سید احمد شمیم نہ صرف اچھے شاعر بلکہ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے جمشید پور کے ادبی ماحول کی جھلکیاں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہیں،

ڈاکٹر محمد غنی صاحب کا مرتبہ آہنگ میں شائع شدہ گوشوارہ بڑے شوق سے پڑھا۔ ان کی محنت و ریاضت کی داد دیئے بغیر خط بند کرنا ظلم ہوگا۔ ان کو میری طرف سے دلی مبارکباد پہنچا دیجئے۔

پروفیسر انیس احمد دوراں

مکرمی! تسلیم

چند روز قبل ایک صاحب نے آپکا بھیجا ہوا تحفہ تذکرہ شعرائے گجرات کی ایک کاپی لاکر دی۔ میں آپ کا بہت ممنون و متشکر ہوں کہ آپ نے مجھے اس تحفے سے نوازا، میرے نزدیک کتاب کا تحفہ دنیا میں سب سے زیادہ گرانقدر تحفہ ہے۔ اسلئے آپ کا مرسلہ تحفہ میری الماری کی زینت بنے گا،

اس ضمن میں ایک امر کی اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی سابق لکچرر اسمٰعیل کالج اندھیری بمبئی نے سخنورانِ گجرات کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے، جس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے اسے ترقی اردو بورڈ دہلی نے شائع کیا ہے آپ

کے مرتبہ تالیف میں بعض معلومات زیادہ ہیں اس لحاظ سے دونوں کتابوں کے باہم مطالع سے گجرات کے اردو شعرا کا صحیح اور مکمل علم حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ کی مولفہ کتابت پر رائے دیتے ہوئے میں نے اس امر کی وضاحت کردی ہے،

خلاصہ یہ کہ آپ کی تالیف اردو شعرا کے تذکروں میں ایک مفید اضافہ ہے اور آپ لائق تحسین ہیں۔

خیراللہ دیشی

پروفیسر سید حسن پٹنہ

محترمی! تسلیم

"آہنگ۔ اکتوبر ۸۴ء کا شمارہ نظروں سے گذرا۔

"یہ لوگ"، پر حسین الحق صاحب کا تبصرہ پڑھا۔ موصوف نے اپنے تبصرہ میں جن باتوں کو خاکے کی خوبی گردانا ہے، وہ دراصل خامی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مثنیٰ صاحب کی تحریر سے شخصیت کے خارجہ سے زیادہ شخصیت کا داخل ابھرتا ہے۔ وہ کیفیت جو بعض خاکہ نگاروں کے یہاں بھی ہے۔ مگر یہاں جس آدمی کی شناخت ممکن ہے یہ وہ آدمی نہیں جو سامنے نظر آتا ہے بلکہ وہ آدمی ہے جو اندر چھپا بیٹھا ہے .... یہ حسن بھی ان کے خاکوں کی طرح خارجی نہیں داخلی ہے —"

حسین صاحب داخلی پہلو پر زیادہ زور دیتے نظر آتے ہیں، اور شخصیت کے خارجہ سے زیادہ درون (داخل) کے ابھارنے کو، مثنیٰ صاحب کے خاکے کی خوبی قرار دیتے ہیں۔

اگر مثنیٰ صاحب کے خاکے میں بقول حسین الحق صاحب کسی شخصیت کے صرف اندرون کو ابھارا گیا ہے تو یہ ان کے خاکے کی خوبی نہیں بلکہ خامی ہے۔

اچھے خاکے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی خاص فرد کا اندرون و بیرون سب کچھ قلم بند ہو جاتا ہے، یعنی اس کا SUBJECTIVE اور OBJECTIVE دونوں OBSERVATION اس میں شامل ہوتا ہے۔

حسین صاحب کے تبصرہ میں ایک پیرا گراف ایسا ہے جس کا "یہ لوگ"، سے کوئی تعلق نہیں۔

شعری حصہ میں اسعد بدایونی کی نظم نے متاثر کیا۔

محترم! آپ کسی نمبر کا اعلان کرنے والے تھے؟

خورشید حیات

The AAHANG URDU MONTHLY - DEC - 84



"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ہر قطرہ، اس قوم کے فروغ میں کام آئیگا، اور اسے مستحکم اور متحرک بنانے میں کارآمد ثابت ہوگا۔"

30 اکتوبر 1984ء — شریمتی اندرا گاندھی

اور

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-

THE CULTURAL ACADEMY, (Regd.) GAYA